
129


ہمیشہ استعمال کیجیے!
نیوٹرین کریم رجسٹرڈ
کیل۔ چھائیوں۔ بدنما داغوں پھوڑے پھنسیوں
بھورے تِل مہاسوں۔ داد چنبل خارش اگزیمہ
اور جلدی جراثیمی بیماریوں کا مکمل علاج ہے
اور
نیوٹرین سنو
چہرے کی خوبصورتی و ملاحت کو
قائم رکھتی ہے!
کیمیکل مینوفیکچرنگ کمپنی لاہور کراچی
ایجنٹ:۔ اے جہانگیر جی اینڈ کمپنی،
۱۷۔ ایچ نسبت روڈ، لاہور
۵/۱ ٹیونیشیا لائنز، کراچی

(۱۲)

جلد — شمارہ

بانی چودھری برکت علی مرحوم

شعبہ فون ۲۰۰۹

منیجنگ ایڈیٹر

چودھری

زر سالانہ

پاکستان میں — روپے

غیر ممالک میں — ۱۲ روپے

فی پرچہ — روپے

منظور شدہ برائے مدارس کراچی و مغربی پاکستان

بموجب سرکلر نمبر ۵/۵۲۱/۵۰۶-۸۳ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۴ و ۹۰۹ مورخہ

.... بموجب نمبر ۲۲۱۵ مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۵۵ء

مکتبہ اردو لاہور

افتخار علی چودھری پرنٹر پبلشر نے اردو ... لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

[illegible] منظومات

مسلسلین

غزل

ڈراما

متفرقات

غزل

○

پیش آغازیہ

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اقبالؒ

احمد فراز

فنکاروں کے نام

تم نے دھرتی کے ماتھے پہ افشاں چُنی
خود اندھیری گپھاؤں میں پلتے رہے
تم نے دُنیا کے خوابوں کی جنت بُنی
خود فلاکت کے دوزخ میں جلتے رہے
تم نے انساں کے دل کی دھڑکن سُنی
اور خود عمر بھر خوں اُگلتے رہے

○

جنگ کی آگ دُنیا میں جب بھی جلی
امن کی لوریاں [illegible] رہے
جب بھی تخریب کی تُند آندھی چلی
روشنی کے نشاں تم دکھاتے رہے
تم سے انساں کی تہذیب پھولی پھلی
اور تم ظلم کے تیر کھاتے رہے

○

تم نے شہکارِ فن جگر سے سجائے
[illegible] کے عوض ہاتھ کٹوا دیے
تم نے [illegible] کے چشمے دکھائے
پر خود زہرِ قاتل کے پیالے پیے
تم مرے تو زمانے کے ہاتھوں مرے
تم جیے تو زمانے کی خاطر جیے

○

تم پیمبر تھے [illegible] کے بھی
تم نے دُنیا سے دُنیا کی باتیں کہیں،
تم نے ذروں کو تاروں کی تنویر دی
تم سے گو اپنی آنکھیں بھی چھینی گئیں،
تم نے دُکھتے دلوں کی مسیحائی کی،
اور زمانے سے تم کو صلیبیں ملیں،

○

کاخ و دربار سے دامنِ دار تک
کل بھی تھے آج بھی ہیں وہی سلسلے،
جیتے جی تو نہ پائی چمن کی مہک
موت کے بعد پھولوں کے مرقد ملے
اے مسیحاؤ یہ خودکشی کب تلک
ہیں زمیں سے فلک تک بڑے [illegible]

جدید اردو تنقید

(نفسیاتی دبستان)

[illegible] سے تنقیدی نظریات کے پڑھانے، ادبی اقدار کے تحلیل و تجزیہ اور تنقید میں ایک نئے شعور کو پیدا کرنے کے سلسلہ میں ترقی پسند [illegible] نفسیاتی تنقید کی اہمیت ظاہر ہے اگر ترقی پسند تحریک نے ہمیں یہ شعور عطا کیا کہ ادب زبان و بیان کی خوبیوں سے آگے بڑھ کر [illegible] کی سیاسی اور سماجی کشمکش کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور ہمیں اپنے ادب پاروں میں اس کشمکش کے آثار دیکھ کر ان کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ کرنا [illegible] نفسیاتی تنقید نے ہمیں یہ بتایا کہ ان ظاہری اور سوشل یا اقتصادی عوامل کے پیچھے بہت سے شخصی اور اجتماعی محرکات کی ایک وسیع دنیا کارفرما ہوتی ہے جو نوعیت کے اعتبار [illegible] تر غیر شعوری ہوتے ہیں۔ انہی عوامل کی تفہیم خواہ وہ غیر شعوری ہی کیوں نہ ہوں۔ ادب کو معنوی حسن اور تاثیر بخشتی ہے نقطۂ نظر کی وضاحت اور [illegible] و جستجو کی جہت یہاں بھی ترقی پسند تحریک کی طرح معین تھی۔ اس کے علاوہ جس طرح ترقی پسند نقطۂ نظر کو ایک خاص اعتدال کی حد تک مجموعی طور پر ہر طبقے اور ہر دبستان کے ادیبوں اور نقادوں نے قبول کر لیا، اسی طرح نفسیاتی تنقید کے اصول کو بھی من حیث المجموع تخلیق اور تنقید دونوں میدانوں [illegible] مقبولیت حاصل ہوئی ادب کے مطالعہ میں ایک تاریخی شعور، ماحول کے اثرات اور ادب کی زندگی کے باہمی تعامل کو اگر ہم ترقی پسند تحریک کے [illegible] اچھی تنقید کا جزو سمجھتے ہیں تو نفسیاتی تنقید کے زیر اثر جنس جیسے عالمگیر عوامل شاً جنس لبعض نفسیاتی الجھنیں مثلاً ایڈی پس کامپلکس، احساس کمتری [illegible] نفسیاتی گمراہیاں مثلاً ایذا پرستی یا لذتیت وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کے مظاہر ادب میں بالعموم نظر آنے لگے ہیں۔

[illegible] نفسیاتی تنقید نفسیات کے ایک علیحدہ شعبے کی حیثیت سے شاید ابھی مغربی ممالک میں بھی کسی خاص کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی اسے ہم وہ ترقی [illegible] (APPLIED [illegible]) کی ایک شاخ قرار دے سکتے ہیں اور نفسیات سے بھی یہاں ایک علم و دبستان یعنی تحلیل نفسی مراد لیا جا سکتا ہے۔ مغرب میں بعض ایسے نقاد نظر آتے ہیں جنہوں نے ایک عام یا ایک مجموعی نفسیاتی نقطۂ نظر سے ادبی مسائل، ادبی محاسن اور ادبیت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ادب کو اظہار و ابلاغ کی ایک صورت قرار دے کر ان تمام مسائل کا جائزہ لینے کی کوشش جو ادبی تنقید میں اہم ہیں [illegible] طور پر آئی اے رچرڈز اور اس کے ساتھی سی کے آگڈن کے ہاں نظر آتی ہے وہ ہر شے ادبی مسئلے پر اس طرح بحث کرتے ہیں کہ وہ تمام مختلف [illegible] جو اس سے متعلق ذہنوں میں آ سکتے ہیں ان کی نفسیاتی توضیح اور توجیہ سے ایک صحیح نقطۂ نظر تک رسائی ہو سکے۔ یہ بحث اصولی تنقید تک محدود [illegible] علیحدہ طور پر بعض ادب پاروں کے متعلق غیر پیشہ ور نقادوں کے ردعمل کو حاصل کر کے ان کی مدد سے بعض تنقیدی غلط فہمیوں کو نمایاں کرنے [illegible] کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ آج تک کوئی ایسا نقاد اردو کو میسر نہیں آیا جس کا مطالعہ [illegible] نفسیات کے متعلق اتنا وسیع اور عمیق ہو جتنا ان مصنفین کا ہے علاوہ ازیں یہاں تحقیق کے لئے اتنی سہولتیں، ذرائع اور وقت بھی میسر نہیں آتا جتنا مغرب میں ممکن ہے اس [illegible] میں یہ امر قابل افسوس ہے کہ علم معانی و بیان کے متعلق مشرق کے سرمایۂ علم میں جتنا [illegible] مغرب کے علم تنقید کے حصے میں

[illegible] کرٹسزم — سلہ میکنگ آف لٹریچر — سلہ پریکٹیکل کرٹسزم

نہیں آتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے تمدنی [illegible] سے تنقید کا جزو ہی خیال نہیں کرتے اور اس کی بنا پر کسی تحقیقی کام کو تعمیری [illegible] میں لا سکتے۔ جہاں تک علم و ادب کے خارجی مطالعے کا تعلق ہے علم معانی و بیان میں وقتِ نظر، معلومات کی وسعت اور وسائل کو منظم اور باقاعدہ صورت میں پیش کرنے کی کوشش یقیناً ضروری ہے [illegible] نفسیاتی تحقیق کے لئے از حد مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح مغرب میں بعض اور مصنفین بھی ہیں جنہوں نے فنی مسائل کی بجائے ادبی انہماک [illegible] ہیں پیمانوں کو نفسیاتی تحلیل و تجزیہ کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے غالباً اس ضمن میں سب سے پہلی [illegible] فرانسیسی کے ہاں نظر آتی ہے ایک کتاب جس میں اس نے مضحکات اور تمسخر کے پہلوؤں کا تجزیہ کیا ہے لیکن شاید اس ضمن میں سب سے زیادہ [illegible] اعتبار سے ایک [illegible] کو اجاگر کرنے کی کوشش پروفیسر ڈاؤنی کی کتاب [illegible] IMAGINATION میں نظر آتی [illegible] درست ہے کہ [illegible] مثالیں اور اپنی حیثیت ہی رکھتی ہیں اور [illegible] دوسرے لوگ ادبی تنقید کے [illegible] کوئی خاص مقام پیدا نہیں کر سکے۔

اس مسئلے کے دو پہلو ہیں (۱) وہ کون سے محرکات یا عوامل تھے جن کے باعث ایک عام تخلیقی ادب پارہ معرضِ وجود میں آیا۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں داخلی اور خارجی دونوں قسم کے محرکات کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ اور فنی تخلیق چونکہ بالآخر اس داخلی صورت کا ایک پرتو ہوتی ہے جو یہ محرکات فنکار کے ذہن میں اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لئے فن کار کے شخصی میلانات، نفسیاتی رجحانات اور مخصوص الجھنوں کی بحث ناگزیر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ادبی تنقید میں تحلیل نفسی کے وضع کردہ اصول و قواعد کی پابندی لازمی ہو جاتی ہے۔ تحلیلِ نفسی میں خوابوں کی تحلیل اور نفسیاتی مریضوں کے معالجے کے سلسلے میں [illegible] تمثیل اور تصاویر کی مدد سے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ بھی براہِ راست فنی تخلیق کی تنقید پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے [illegible] مشکل مصنف کے شخصی حالات کی فراہمی ہے۔ وہ بھی اس نقطۂ نظر سے جس نقطۂ نظر سے تحلیل نفسی کا ماہر اپنے مریض کے حالات کو جمع کرتا [illegible]

(۲) دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک خاص تخلیق میں یا ایک خاص تخلیقی فن میں یا مجموعی طور پر تخلیقی فنون میں جن فنی ذرائع یا تکنیک کی جن چابکدستیوں کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ان کا مطالعہ کیا جائے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ ان کی رو سے شعور اور لاشعور پر کون سے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ [illegible] کی تاثیر اور کامیابی کے لئے ضامن قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ انگریزی ادب میں ڈیوی، رچرڈز وغیرہ نے اس دوسرے نقطۂ نظر سے ادب پر تنقید کی [illegible]

انگریزی ادبی تنقید میں یہ ماننا پڑے گا کہ زیادہ معروف اور زیادہ مؤثر گروہ ان مصنفین کا ہے، جن کا تعلق پہلے دبستان سے ہے اور ویسے بھی تنقید کی زیادہ تر یہی صورت مروج ہے۔ تحلیلِ نفسی کا اثر دورِ جدید مغرب میں محض طبی تشخیص و معالجہ یا ادبی تنقید تک ہی محدود نہیں۔ عام زندگی سے لے کر فلسفیانہ تحقیق تک ہر میدان اور ہر مرحلے پر تحلیل نفسی کا اثر نمایاں ہے۔ بقول پروفیسر جوڈ انگلولوگ فرائڈ کے نظریات سے آشنا ہیں وہ احساسِ کمتری کے مریض ہیں۔ اپنی خواہشات کے اتقاع کے قائل ہیں اور اعصاب زدگی کا شکار ہیں۔ وہ نوجوان جبلی مجبوری کی طرف سے معذرت، رد عمل کا اظہار کرتا ہیں۔ اسے اپنی (REPRESSION) سے آزاد ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ چنانچہ نفسیاتی اصطلاحوں کا یہ عالم رواج اس کے وسیع اثر کو ظاہر کرتا ہے جہاں تک اس عہد کے خیالات اور رجحانات کا تعلق ہے۔ اسی مصنف کے قول کے مطابق، جبریت اور [illegible] پسندی اس کے دو [illegible] ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ جہاں افلاطون سے لے کر آج تک اکثر حکماء کے نزدیک جبر خارجی قوتوں اور خارجی قوانین کے عمل کا نام تھا اب یہ جبر خود انسان کے نفس میں ان لاشعوری قوتوں کے عمل سے پیدا ہوتا ہے جن کی طرف تحلیل نفسی نے ہماری رہنمائی کی ہے بہر حال چونکہ ہمارے ان نفسیات [illegible]

A guide to modern thought [illegible] Wit and witticism

[illegible] نہیں کیا گیا اس لئے غالباً یہ کہنا [illegible] ہو جائے گا کہ ادبی تنقید میں نفسیات اثر و نفوذ کسی علمی یا اتفاقی رد عمل [illegible] تھا جو تحلیل نفسی کے نظریات کے زیر اثر [illegible] بھی کچھ غلط نہ ہوگا کہ ادبی تنقید ہی محض ایسا ادارہ تھی جس نے [illegible] کے منکر تحلیل نفسی کی طرف راغب کیا ہو [illegible]

[illegible] نفسی کا بانی فرائڈ ہے اور آج اس کا نام ہمارے [illegible] غیر معروف نہیں ہے۔ فرائڈ نے انسانی ذہن کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک [illegible] شعور کا نام دیتا ہے ان دونوں کے درمیان ایک عبوری طبقہ ہے جسے اس نے تحت الشعور کا نام دیا ہے۔ اب وہ خواہشات [illegible] جنہیں شعوری سطح پر بعض مروجہ آداب کی بنا پر ہم قبول نہیں کر سکتے وہ شعور کی اتھاہ گہرائیوں میں غائب ہو جاتی ہیں۔ یہ خواہشات [illegible] یا غیر مہذب، شدید طور پر جذباتی اور بے حد خود غرضانہ ہوتی ہیں یہ ہر وقت اپنی تسکین کی جستجو میں لگی رہتی ہیں [illegible] کی نوعیت اکثر جنسی ہوتی ہے۔ [illegible] اس کے ساتھ ہی یہ مسلسل شعوری سطح تک رسائی کے لئے بھی کوشاں رہتی ہیں۔ لیکن مروجہ آداب کا شعور احساس [illegible] [illegible] کی شکل سے تشبیہہ دیتا ہے انہیں ابھر آنے سے مسلسل روکتا رہتا ہے چنانچہ یہ خواہشات بھیس بدل کر اور بعض نئے عوامل یا مظاہر کے روپ [illegible] اور اتفاقی صورت میں شعوری سطح پر ظاہر ہو سکتی ہیں۔ یہ ارتفاع یا ترفع ظاہری طور پر اس غیر شعوری خواہش کو اس حد تک بدل دیتا ہے اور اسے [illegible] ایسے مظاہر سے منسلک کر دیتا ہے کہ اس کی پہچان ناممکن ہو جاتی ہے۔ وہ غیر شعوری خواہشات جنہیں CENSOR مسلسل دباتا رہے اور جو ترفع کے ذریعہ اظہار پر قادر نہ ہو سکیں وہ اندر ہی اندر گھٹ کر بعض نفسیاتی الجھنوں کی مریضانہ صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً ہسٹریا، اعصابی کمزوری، توہم اور [illegible] فرائڈ کے نزدیک ہمارے مختلف شعوری مظاہر نہ صرف جذبات و احساسات بلکہ آرزوئیں، خواہشات پسند و ناپسند اور میلانات، اعتقادات اور خیالات تک غیر شعوری عوامل سے اسی طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح فسیاتی تحسن کے متعلق سمجھا گیا۔ اور رد عمل، مذہب کا تصور اس کے نزدیک ایک آسمانی باپ [illegible] جو بڑے ہونے پر ارضی باپ کا نعم البدل ثابت ہو سکے۔ ٹی اس لئے ایجاد کیا گیا کہ انسان اپنے لئے فریب کے ایسے ذرائع پیدا کر سکے جن کے ماتحت وہ حقیقت کے ناقابل برداشت تصورات سے رہائی حاصل کر سکے۔ فن اس طرح محض ایک جنون یا ایک ہنگامی فرار کا ذریعہ رہ جاتا ہے۔

فرائڈ کے علاوہ اس کے دو اور شاگرد اور ہمعصر ماہرین نفسیات کا ذکر بھی ضروری ہے جنہوں نے فرائڈ کے نظریات سے اختلاف تو شاید نہیں کیا [illegible] کہ انسانی معاشرے کے بعض دوسرے پہلوؤں پر بھی حاوی کرنے کی کوشش کی ہے یعنی اڈلر [illegible]

[illegible] میں سب سے زیادہ عام فہم اور معاشرے کی اہمیت کا قائل ہے اپنی مشہور کتاب مقصد زندگی کے آغاز میں اس نے [illegible] کا ذکر کیا ہے [illegible] وہ طبعی قوانین کا عالم ہے۔ دوم معاشرے کی ضروریات اور تقاضوں کا احترام اور سوم جنسی [illegible] کا [illegible] کی نفسیاتی کشمکش کا سبب یہی ہے کہ وہ طبعی قوتوں کے سامنے اپنی کمزوری کا احساس کر کے ایک احساس [illegible] سے خوراک، حفاظت اور گرمی سردی کے اثرات کے مقابلے کے لئے اپنے بڑوں کا مرہون منت رہتا ہے۔ ان [illegible] اس کے بزرگ نفسیاتی طور پر بھی اس پر حاوی ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک بہتر قوت ایک وسیع تر علم تجربہ اور زندگی گزارنے میں ایک خاص [illegible] کے حامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس احساس کمتری سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے وہ مسلسل کوشش کرتا ہے۔ اور اس کوشش میں ناکامی

WHAT LIFE SHOULD MEAN TO YOU

[illegible] ہے، یہ وہ اپنی خیالی دنیا میں کھو جاتا ہے جہاں اسے ہر چیز پر تصرف اور قدرت حاصل [illegible] ت کے لئے
کو ساز و اپنی اختیار کرتا ہے [illegible] اس کے مستقبل کی تعمیر اور تخریب کے لئے ذمہ دار ہے چنانچہ ہمارے اعمال صرف خارجی عوامل [illegible] تحریکات کے
طور پر ہی ظاہر نہیں ہوتے بلکہ اس مقصد کی نسبت سے منطبق ہوتے ہیں جس کا حصول ایک فرد اپنی زندگی کا لاشعوری مقصد [illegible]
نفسیاتی آدرش کے علاوہ ایک مجموعی روش بھی ہر شخصیت کے پیش نظر ہوتا ہے خواہ وہ شعوری طور پر کبھی اس سے آگاہ [illegible]
[illegible] طریق کار [illegible] کا ہیولیٰ تیار دیتا ہے۔ ہر وہ نفسیاتی تجربہ خواہ وہ ایک ہی تصور، تحریک یا جذبہ، جو اس ہیولیٰ سے ہم آہنگ [illegible]
اسے اپنی زندگی میں [illegible] سے انکار کر دیتے ہیں چنانچہ ہم خارجی عوامل میں سے صرف انہیں کا عمل قبول کرتے ہیں جو ہمارے آدرش اور [illegible]
[illegible] ہم آہنگ [illegible] قوت اور اقتدار کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے اور انسان کا عمل یہاں اشتراکی عمل کی بجائے اکثر جارحانہ ہوتا ہے۔ وہ [illegible]
[illegible] انسان کی انفرادی کمزوریوں کا ایک حل ہے۔ چنانچہ شخصیت کے مسائل کا حل خیالی پاؤں پھیلانے کی بجائے اپنی ذات سے توجہ
ہٹا لینے [illegible] ایک قسم سے ینگ میں مضمر ہے۔

ینگ کے نظریات بنیادی طور پر کچھ زیادہ مختلف نہیں لیکن جس طرح اڈلر نے اپنی بنیادی تصورات کی اساس پر اپنا علیحدہ نظام قائم کیا اسی طرح ینگ نے بھی اپنا ایک علیحدہ نظام ترتیب دیا۔ ینگ نسبتاً زیادہ وسیع النظر، زیادہ گہرا اور زیادہ بلند فلسفیانہ نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے۔ [illegible] کے ہاں زیادہ گہری مناسبت پائی جاتی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ ذہن کو ایک متحرک قوت کے طور پر پیش کرتا ہے [illegible] نفسیاتی قوت [illegible] خواہش تصور کا حامل ہے۔ اڈلر اور فرائیڈ کے ہاں اس کے مقابلے میں ذہن ایک متحرک عمل کی بجائے ایک ایسا عمل بن جاتا ہے جہاں ذہنی عمل توضیح پذیر ہوتا ہے اسی قوت کی پیش قدمی یا پسپائی مختلف مثبت اور منفی نفسیاتی اعمال کے لئے ذمہ دار ہے۔ اسی طرح یہ قوت داخلی منطقوں میں بڑھتی یا گھٹتی رہتی ہے۔ نفسیاتی قوت اس کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہے اور اس طرح مادہ اور روح کی قدیم ثنویت کے تصور کے قریب تر پہنچ جاتا ہے۔ اقبال کے ہاں اس سے ملتا جلتا ایک تصور فطرت اور انسانی خودی کی اصطلاحوں میں ظاہر ہوا ہے۔ اسی طرح ینگ شخصی لاشعور کے علاوہ ایک اجتماعی لاشعور کے تصور کا بھی قائل ہے جس میں انسانیت کے تمام تاریخی تجربات کا ماحصل محفوظ ہے۔ نفسیاتی اعمال میں ینگ فکر، جذبہ، احساس کے ساتھ وجدان کا بھی قائل ہے اور جس طرح اقبال کے نزدیک مذہبی تجربے کی حقیقت کے لئے یہ دلیل کافی ہے کہ براہ راست اس کا تجربہ ہوتا ہے اسی طرح وہ بھی ذہن [illegible] نفسیاتی اعمال کو اسی تجربے کی بنا پر قائم ہے۔ ینگ کا ایک اور اہم نظریہ نفسیاتی TYPES کا ہے جو اپنی نفسیاتی اعمال کی بنا پر متعین کئے جاتے [illegible] سلسلے میں اس کی تقسیم داخلیت پسند (INTROVERT) اور خارجیت پسند (EXTROVERT) کافی مشہور ہو چکی ہے اور ادبی تنقید میں ینگ کا نظریہ بہت حد تک متعارف ہو چکا ہے۔ دراصل ینگ کے ہاں دو حریف نفسیاتی قوتوں کے جوڑے ملتے ہیں اور یہ ثنویت اس کے نظام کا ایک اہم جزو ہے لیکن جتنا کسی شخص کا تعلق لاشعور سے گہرا ہوگا اتنا ہی اسے مختلف TYPES میں سے کسی ایک کے ساتھ منطبق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور فنی کا تعلق لاشعور کے ساتھ سب سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ چنانچہ فنکار حسی تصورات کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور اسی طرح ان کے مطالب ہزار گونہ معنویت [illegible] ہیں وہ جو ابتدائی تصورات کی زبان میں گفتگو کرتا ہے گویا ہزاروں زبانوں کا مالک ہے وہ اپنے موضوع کو نہ صرف اپنی گرفت میں لے آتا ہے بلکہ اسے [illegible] ہو جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی اسے ایک انفرادی اور ہنگامی مقام سے اٹھا کر ایک دوامی مقام تک لے جاتا ہے انفرادی کیفیت کو انسان کی اجتماعی کیفیت کا روپ [illegible] اسی طرح وہ ہم سب میں ان مددگار قوتوں کو ابھارتا ہے جن کی مدد سے انسان کو مصائب سے نجات اور زندگی کی تاریک طویل رات بسر کرنے کی [illegible]

[illegible] فنکارانہ تاثیر کا راز یہی ہے

[illegible] کا خصوصیت سے تذکرہ ہے۔ [illegible] اور تنقید کو [illegible] نہیں ہوتا۔ اجتماعی شعور کو سمجھنے کا [illegible] اہم ہے جس کا اظہار ہمیں اساطیر اصنامی، مذہبی معتقدات میں ہوتا ہے [illegible] اساطیر کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے انسان [illegible] کے لئے مشترک اہمیت کے مالک ہیں [illegible] (ARCHETYPE) کے لفظ سے یاد کرتا ہے یہ [illegible] کی چیزوں کا ایک [illegible] البتہ لاشعور میں کئی ماجرا ہوتا ہے اور اسی طرح وہ شخصی تجربات جو شعور [illegible] ان کے ساتھ مکمل مل جاتے ہیں اور پھر جب لاشعور سے یہ چیزیں شعور پر اثر انداز ہوتی ہیں تو ان کے ساتھ ان مجموعی یا (ARCHETYPE) [illegible] ہے۔ چنانچہ انسان کا اجتماعی لاشعور مسلسل اس کے انفرادی اعمال پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ ینگ کے نزدیک لاشعور کی زبان حسی تصورات [illegible] انہیں حسی تصورات کے روپ میں شعوری سطح تک صعود کرتے ہیں اس طرح ادب میں استعارہ، تشبیہ، مجاز اور کنایہ وغیرہ کے لئے [illegible] جو ادبی [illegible] تنقید کے اعتبار سے ینگ کا جذباتی صدمے کا نظریہ بھی اہم ہے۔

[illegible] نفسی کے بانیوں کے نظریات کا خلاصہ اس قابل تو نہیں کہ اس سے ادبی تنقید میں کسی خاص بصیرت کی امید کی جا سکے لیکن اس سے کم از کم ان تین [illegible] کے اختلافات کا احساس تو ہو جاتا ہے۔

[illegible] نفسیاتی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ مختصر مقالوں تک محدود ہے ان مقالوں کو ہم تین مجموعی گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) [illegible] جن میں بعض انفرادی تخلیقات کا نفسیاتی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا گیا ہے۔

(۲) وہ مقالے [illegible] مصنف کی جملہ تخلیقات پر نفسیاتی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے ساتھ مصنف کے نفسیاتی اور ذہنی رجحانات کا کھوج لگانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

(۳) [illegible] ایک خاص نفسیاتی مسئلے کو سامنے رکھ کر ادب میں بحیثیت مجموعی یا کسی خاص مصنف کے ہاں اس کی مثالیں وغیرہ تلاش کی ہیں مثلاً وحید الدین احمد کا مقالہ "ہیرو گریز" ہیرو ورشپ کے برعکس یہاں پر نقاد نفسیاتی مسائل کو پہلے لیتے ہیں اور ان کے علاوہ ہیں جہاں سے بھی مواد مل سکتا ہے [illegible] ایسے مقالوں میں بعض اوقات ادب کے عمومی رجحانات سے اور بعض اوقات الگ الگ لکھنے والوں سے مثالیں لے لی جاتی ہیں۔

[illegible] غالب مجموعی تاثر یہی ابھرتا ہے کہ جس طرح تخلیقی ادب میں نفسیات کے زیادہ گہرے اور زیادہ مثبت رجحانات کی بجائے [illegible] مصنفین [illegible] کی طرف زیادہ راغب ہیں، اسی طرح تنقید میں بھی عموماً انہیں مسائل کا سہارا لیا گیا ہے۔ جن کو ذہنیت مریضانہ [illegible] نفسیاتی تجزیے [illegible] جہاں ایک طرف وسیع علم اور طویل عملی تجربے کی ضرورت ہے وہاں یہ بھی ہے کہ عام قارئین کے ہاں دلچسپی پیدا [illegible] اسی لئے تخلیق اور تنقید دونوں میدانوں میں مصنفین کی توجہ زیادہ تر جنسی موضوعات پر مرکوز رہی اور صحت مند عمل، تجزیے کی بجائے [illegible] رجحانات ہی کو پیش کیا گیا۔

[illegible] نفسیاتی تنقید کو اردو میں متعارف کرانے کا سہرا میراجی کے سر ہے۔ میراجی نے اس کا آغاز غالباً ادبی دنیا میں ان مضامین سے کیا جنہیں وہ مختلف نظموں [illegible] وہ عام طور پر ان بیانات سے جو اس کی جنسی نظموں میں نظر آتے ہیں بچا سکا۔ ان لکھے چھپے اور [illegible] نظم کے حسن کو ان نفسیاتی محرکات کو کرکری طرح سے اجاگر کر دیتا ہے جنہیں اس کے حسن و تاثیر کے لئے ذمہ دار قرار دیا جا سکتا [illegible] رفیع الزماں، وحید الدین احمد نے بھی کچھ کام کیا ہے لیکن بدقسمتی سے [illegible] نفسیاتی نقطۂ نظر کو پیش کرنے [illegible]

کے علاوہ اردو میں کامیاب نفسیاتی تنقید کا وجود ہمیں ضمنی طور پر بعض مقالات میں ملتا ہے۔ شبلی کی حیاتِ معاشقہ میں اگرچہ تحلیلِ نفسی کے اعتبار سے کوئی خاص رجحان موجود نہ تھا شبلی کے ہاں تلاش نہیں کیا گیا۔ لیکن ایک معمولی اور صحت مند جنسی ردِعمل کو جس طرح اس مقالے میں اجاگر کیا گیا ہے وہ نفسیاتی سوجھ بوجھ کی ایک مثال ہے۔

شروع میں عرض کیا گیا تھا کہ نفسیاتی تنقید کی ایک ممکن صورت یہ بھی ہے کہ مروجہ ادبی اقدار کی تشریح و توضیح نفسیاتی نقطۂ نظر سے کی جائے۔ اس ضمن میں اردو تنقید کا دامن تہی ہے۔ البتہ بعض نقادوں کے ہاں مصنفین کے ذہنی رجحانات کا پتہ لگانے کے لئے ان کی تشبیہات بالخصوص استعاروں کی جو تشریح و توضیح کی جاتی ہے، انہیں نفسیاتی تنقید کے تحت منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اس قبیل کی مثالیں ہمیں فراق، ڈاکٹر عبداللہ وغیرہ کے ہاں بکثرت مل جاتی ہیں۔ فراق مصحفی پر لکھتے ہوئے اس کی بعض زمینوں میں اس قسم کی کیفیت جہاں کوئی چیز مکمل ہوتے ہوتے رہ گئی ہو کی طرف بالخصوص اشارہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، میر، شبلی، سرسید وغیرہ کے متعلق اسلوب کا تجزیہ کرتے وقت ان کے خاص الفاظ کے استعمال سے ان کے ذہنی رجحانات اور شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس قسم کی چیزیں دوسرے مصنفین کے ہاں بھی مل جائیں گی۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک فلسفیانہ نفسیاتی رجحان بھی نظر آتا ہے جس کے ماتحت ہم ایک خاص دور کے رجحانات کو اس دور کے ادب کی بناء پر متعین کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ نے اپنی کتاب "بیسویں صدی کی اردو نثر" میں ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے انگلستان اور ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہندوستانی فضا میں ایک خاص مماثلت کی بناء پر اپنے تجسس کی بنیاد رکھی ہے۔ لیکن یہ رجحان نفسیات کی نسبت فلسفے سے زیادہ قریب ہے اور اردو تنقید میں ابھی کچھ زیادہ واضح بھی نہیں ہو سکا۔

اردو ادب اور تنقید کے سلسلے میں اوپر عرض کیا گیا تھا کہ سطحی نفسیاتی مطالعہ اور ہیجان خیز نفسیاتی مسائل ہی یہاں بار پا سکے ہیں۔ یہ مغربی ممالک کے ادب پر بھی صادق آتا ہے اور اس اعتبار سے اردو تنقید کو کچھ زیادہ مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کمزوری کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے کہ ہمارے نفسیاتی تنقید نگار عموماً اس علم سے خود کما حقہٗ واقف نہیں وہ اپنے نتائج سطحی علم کی بناء پر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری خامی یہ ہے کہ ادب اور ادیب کے متعلق پوری معلومات حاصل کئے بغیر کچھ جلد بازی کے باعث اور کچھ ذرا انوکھی بات کہنے کی کوشش میں یہ لوگ بعض ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو نہ تو علمی اعتبار سے ثقہ ہوتی ہیں اور نہ ہی ان سے ادب کی تفہیم میں کوئی خاص مدد ملتی ہے۔ فرائڈ نے ایک مختصر رسالہ میں ایک ناول کا جائزہ لیا ہے لیکن اس جائزے میں اس نے سنسنی پیدا کرنے والی باتوں کو ڈھونڈنے کی کوشش بہت کم کی ہے۔ اس کے حاصل کردہ بعض نتائج کو تو شاید ہمارے ہاں کسی بھی کام کا نہ سمجھا جائے گا۔ مثلاً اس ناول میں جب ہیرو کو کھنڈرات میں ایک بت ملتا ہے تو اس بت کے لئے جو کشش وہ محسوس کرتا ہے اس کا سلسلہ وہ ہیرو کے شہر کے ایک خاندان کی خواتین کے اندازِ رفتار سے ملاتا ہے اور خواہ مخواہ کسی سنسنی پیدا کرنے والے واقعے کی تلاش نہیں کرتا۔ ینگ نے اپنی کتاب (PSYCHOLOGY OF THE UNCONSCIOUS) کے شروع میں تقریباً ... صفحات میں ایک شاعر خاتون کی بعض نظموں کا تجزیہ کیا ہے۔ جن میں اس نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جس جہاز میں وہ سفر کر رہی تھی اس جہاز کے ایک اطالوی افسر کی طرف اس کا میلان ان نظموں کی اساس ہے لیکن اس میلان کو اس نے خواہ مخواہ مریضانہ یا ہیجان انگیز جنسی ردعمل ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ صحیح نفسیاتی تنقید کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی قدیم ادبی روایات کو مذہبی اور ثقافتی اقدار کے پہلو بہ پہلو جانچیں۔ مثلاً تصوف ایک بڑی اہم روایت ہے تصوف کو محض جنسی گمراہی قرار دے کر آگے بڑھ جانے سے بات نہیں بنتی۔ تصوف کے عام پہلوؤں کا نفسیاتی اصولوں کے ماتحت جائزہ لینے کے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ صوفیانہ شاعری میں وہ کون سے رجحانات کارفرما تھے جو اس کی تاثیر اور مقبولیت کا باعث قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں ابھی صرف فرائڈ سے آشنائی پیدا ہوئی ہے۔ حالانکہ ایڈلر اور بالخصوص ینگ اس ضمن میں ہماری زیادہ رہبری کر سکتے ہیں۔ ینگ کے نظام مکاشفت میں مذہب اساطیر اور اجتماعی لاشعور کو جو اہمیت ہے اس کی بناء پر ہم تصوف کے صوفیانہ ادب کی نفسیات سے قریب تر پہنچ سکتے ہیں۔ فرائڈ کا مطالعہ شاید ہمارے لئے اس حد تک کارآمد نہیں ہو سکتا لیکن بدقسمتی سے یوں نظر آتا ہے — جیسے ہمارے نقادوں نے ینگ کا مطالعہ بہت کم کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ینگ نے نفسیات کو فلسفے کے قریب تر پہنچا دیا ہے۔ اس کے نظام کو سمجھنا اتنا آسان نہیں جتنا فرائڈ، ایڈلر، اسٹیکل کی توضیحات کو، تاہم ہمارے اپنے ادب کی روایات اور ہماری مشرقی تہذیب و تمدن کے پیشِ نظر ہمیں تنقید میں جس حد تک ینگ سے مدد مل سکتی ہے وہ شاید اور کسی سے نہیں مل سکتی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

میر تقی میر اور نقاش کا فن

نیں صورت پذیر نقش اس کا ۔۔۔ یونہی تصدیع کھینچے ہے بہزاد

میر تقی میر کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد خاصی ہے جن میں مصوری و نقاشی کا ذکر آیا ہے۔ میں نے ان اشعار کو جمع کیا اور ان کو بار بار پڑھا۔ اس سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ میر کو فنِ مصوری کے متعلق معلومات اچھی خاصی حاصل تھیں۔ کیونکہ وہ تصویر وغیرہ کا جب بھی ذکر کرتے ہیں محض شاعرانہ طور پر یا بے خیالی سے ذکر نہیں کرتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فنِ تصویر کے گہرے رموز سے باخبر تھے۔ یوں کسی شاعر کے کلام میں اگر دس بیس اشعار ایسے نکل آئیں جن میں کسی خاص علمی موضوع کے متعلق کچھ اشارے مل جائیں تو یہ بات چنداں توجہ کے لائق نہ ہوگی مگر میر نے فنِ مصوری کے متعلق جس غیر معمولی ادراک و بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کو ہم محض اتفاقی ذہنی لہروں کا درجہ نہیں دے سکتے۔ وہ تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ مصوری کے متعلق ان کی کسی باقاعدہ تربیت کا نتیجہ ہے جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ذہنی اور علمی دونوں لحاظ سے مصوّری کے فن سے ان کو اچھا خاصا ربط تھا۔

جہاں تک میں دیکھ سکا میر کے تذکروں میں ان کی اس تربیت یا استعداد کا کوئی تذکرہ نہیں مگر ان کے کلام سے اس کی پوری پوری تائید ہوتی ہے ـــــــ ہندوستان میں اکبری و جہانگیری زمانے میں فنونِ لطیفہ پر جو بہار آئی تھی وہ محمد شاہی عہد تک تقریباً ڈھل گئی تھی۔ مگر یہ بھی تاریخی طور پر غلط نہیں کہ محمد شاہ کا عہد فن کی مثبت قدروں کے انحطاط کے باوجود فنون سے ہمہ گیر دل چسپی کا عہد تھا، چنانچہ اس زمانے میں موسیقی، راگ، رقص اور مصوری ـــــ کا بڑا چرچا رہا۔ یہاں تک کہ ناٹک سے بھی دل چسپی لی گئی اور ایک آدھ سنسکرت ناٹک کا ترجمہ بھی ہوا۔

ظاہر ہے کہ میر تقی جیسے اثر پذیر شخص نے اس فضا سے ضرور اثر لیا ہوگا ـــــــ ان کی شاعرانہ مصوّری میں مادیات کی مصوّری کا جو عنصر ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر خود مصوّری کے فن سے اعتنا کے بھی ناقابلِ تردید ثبوت ان کے کلام میں موجود ہیں ـــــ غزل میں مصوّری کے متعلق کافی اشارات و تصریحات موجود ہیں مگر انہوں نے قصیدوں میں بھی اپنے اس پسندیدہ موضوع کو فراموش نہیں کیا۔ چنانچہ اپنے ایک قصیدے میں گھوڑے کی تصویر نقاش سے یوں کھنچوائی ہے:۔

اک مصوّر نے اسے دیکھ کے دوڑایا خیال
دیکھوں اس باد کی مجھ سے بھی سکے شکل نکل
سرو سینہ کو کمر تک تو بنایا رکھ ہاتھ
اڑ گیا صفحۂ کاغذ پہ سے چھوتے ہی کفل

ایک اور قصیدے میں گھوڑے کی تصویر کھنچوانے کا یوں اہتمام کیا ہے:۔

نظر جو ایک مصوّر کی آگئیں جاتے
یہ اُن نے ریجھ کے چاہا کہ کھینچئے تصویر

اس کے بعد جزئیات و تفصیلات دی ہیں۔ ان کے قطعات کو لیجئے ان میں بھی وہ فنِ تصویر کی دلفریبیوں سے دامنِ دل کو چھڑا نہیں سکے۔ آغا رشید خطاط کی تعریف میں جو قطعہ لکھا ہے اس میں خط کے حُسن کو نقاشی کی اصطلاحوں میں پیش کیا ہے۔ آغا رشید خطاط بھی ان کے نزدیک ایک نقاش یا مصوّر ہی تھا جو

ـه

وہ تصرف کہیں جو کرتا ہے
شکل نقاش رنگ بھرتا ہے
حیرت افزا ہے حسن ہر تحریر
مشقِ اس کی ہے قطعۂ تصویر

اس کے بعد کے اشعار میں حروفِ ابجد کی اشکال کو تصویر کی اشکال سے تشبیہ دے کر خط اور نقاشی کی مماثلتوں کی ایسی توضیح کی ہے جس پر علامی ابوالفضل کے بعض انتقادی نظریوں کا عکس معلوم ہوتا ہے چنانچہ خطبۂ مرقع پادشاہی میں ابوالفضل نے لکھا ہے۔ "خط قسمے است از تصویر چہ آں شبیہ ایں عاری و سفلی است ..." "خط تصویر خاص است صور حروف را کہ بطرز خاص نقش می کنند"۔ میر کے اس قطعے کو ابوالفضل کی اس تصویر کی تفسیر سمجھ لیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

بہرصورت میر کو مصوّری کے فن سے نظری اور ذہنی طور پر خاصا لگاؤ تھا۔ میر کے اشعار کا تجزیہ بتلاتا ہے کہ انھوں نے مصوّری کے فن کو سرسری نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اس کی بنیادی حقیقتوں پر گہرا غور کیا ہے اور اس فن کے فلسفیانہ اور جمالیاتی اصولوں پر ایسی نظر ڈالی ہے جس کے بغیر فنِ مصوّری کی ماہیت کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا اور بعض بصیرتیں تو میر کو ایسی حاصل شدہ معلوم ہوتی ہیں جو اس زمانے کے اعتبار سے جب فنون کے متعلق فلسفیانہ اصول بندی کا رواج ہی شاید نہ ہوا تھا ہمارے لیے اتنی حیران کن ہیں کہ ان کی بنا پر میر کو ہندوستان میں فنِ مصوّری کا پہلا نقاد کہہ دینے کو جی چاہتا ہے یا کم از کم سب سے پہلا (اور شاید سب سے بڑا) اُردو شاعر جس نے شاعری اور مصوّری کی مفاہمتوں کا شعوری اعتراف کیا ہے۔ ——— اور یوں یہ تو مسلّم ہے کہ میر نے اپنی شاعری میں مصوّرانہ بصیرت سے غیر معمولی فائدہ اُٹھایا ہے، وہ شاعرانہ پیکر آفرینی میں بھی موسیقی نواز سے زیادہ مصوّر ہی ثابت ہوتے ہیں اور مجموعی لحاظ سے ہم اُن کو "کان" کے شاعر سے زیادہ "آنکھ" ہی کا شاعر قرار دے سکتے ہیں ——— ان کی سامعہ ـه کی حِس تو خاصی اُلجھی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور وہ اس کی لذتوں سے کچھ زیادہ محظوظ ہوتے نظر نہیں آتے ——— وہ شاعر ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی ہوتے تو شاید مصوّر ہی ہوتے۔

مجموعی لحاظ سے مصوّری کے متعلق میر کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ آرٹ کا ذوقِ تخلیقی رُوح کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہ ذوق ایک ایسی حقیقت ہے جو خارجی پیکر میں مضمر نہیں (کیوں کہ وہ تو ایک مظہر ہے) اس کے باطن میں مضمر ہے اور روح کے اندر موجود ہے۔ فن پارہ دراصل ایک علامت ہے ان معانی کی جو اپنے ظہور کے لیے خارجی وجود تلاش کرتے رہتے ہیں۔

ـه میر کا ذوقِ سامعہ الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ سامعہ میں انہیں یا تو بلبل کی فریاد سے دلچسپی ہے یا پھر شور و غوغا سے خوش نما پرندوں کی آوازوں یا ساز و آواز کی موسیقی سے ان کی رغبت سرسری معلوم ہوتی ہے:

(دیکھیں صفحہ ۱۵ کے نیچے)

ـه

یہ تصور صوفیا کے عالمِ ظاہر اور عالمِ باطن کے تخیل سے متاثر ہے جن کے نزدیک حسن بھی ایک ایسی قدر ہے جس کی حقیقت باطن میں چھپی ہوئی ہے، خارج میں جو کچھ ہے اس کا صرف عکس ہے ـــ ان صوفیا کے نزدیک سارا نظامِ کائنات محض اعتباری و اضافی ہے۔ ان خیالات میں میرؔ عام صوفیا سے متفق ہیں اور ان کی طرح وہ بھی بُود (دُنیا) کو محض نقش و نگار مانتے ہیں یعنی اس کو عکسِ حُسن سمجھتے ہیں، ورنہ صورت اور عالمِ صورت ان کے نزدیک دونوں اعتباری ہیں۔ ؎

بود نقش و نگار سا ہے کچھ　　　صورت اک اعتبار سا ہے کچھ

میرؔ کے نزدیک ؎

گل و رنگ و بہار پردے ہیں　　　ہر خیال میں ہے وہ ہاں تک سچ

میرؔ نے اسی بنیادی تصور کے مطابق اس خاکدان (دنیا) کو "عالمِ تصویر" کہا ہے۔ گویا یہ کائنات تصویر کی طرح حُسن تو رکھتی ہے مگر اس کا حسن محض علامت ہے، یہ افلاطون کے اس خیال کے قریب ہے کہ "فن عکس کا عکس ہے" یعنی حسنِ کائنات عکس ہے کسی جمالِ حقیقی کا جس کی شعاعوں کے انعکاس سے جمالِ ظاہری کی یہ روشنی مختلف شکلوں میں ضیا بار ہو رہی ہے

دُنیا کی اعتباریت اور اضافیت کا یہ تصور عام صوفیا کی طرح میرؔ کے ذہن پر بھی نقش ہے۔ وہ دُنیا کو "صفحۂ تصویرِ بے ہوشاں" سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ یعنی ایک تو تصویر اور اس پہ بے ہوشوں کی تصویر ـــــ بے خودی در بے خودی ـــــ یہ بھی اس خیال کے قریب ہے کہ دُنیا عکس کا عکس ہے ؎

زمیں اک صفحۂ تصویرِ بے ہوشاں سے مانا ہے
یہ مجلس جب سے ہے اچھا نہیں کچھ رنگ صحبت کا

اس قسم کے اشعار سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ میرؔ تصویر کو پیکرِ حُسن نہیں سمجھتے۔ انعکاسِ حُسن سمجھتے ہیں اور وہ اُن کے خیال میں معانی اور رموزِ جمال کی مستقل ترجمان نہیں بلکہ ایک ساکن و خاموش "پیکرِ خطوط" کا نام ہے۔ جس میں زندگی کی ترجمانی اتنی ہی ہے جتنی کسی تصویرِ بے ہوشاں میں ہو سکتی ہے۔ مگر ان کے اشعار کا غائر مطالعہ اس خیال کی تائید نہیں کرتا، ان کے کلام سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ میرؔ مصوری کی مستقل اظہاری اور معنوی صلاحیتوں میں گہرا عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ کائنات کو ایک صفحۂ تصویرِ بے ہوشاں ہی سمجھتے ہیں مگر اس کے اندر حسن کی سب قدروں کا اعتراف کرتے ہیں۔ انہی میں عالمِ تصویر بھی ہے جو حسن اور معنویت کی خاص شان رکھتا ہے۔ ؎

(ص۱۲ سے آگے)

ہے خبر یں نالیدن اس کا نغمۂ طنبور سا
خوش نوا مرغِ گلستاں اندا غاتی ہے میاں

ایک مثنوی کا آغاز یوں ہوتا ہے: ؎

آؤ ساقی شراب نوش کریں　　　شور سا ہے جہاں میں گوش کریں

آصف الدولہ کی تقریبات سے متعلق مثنویوں میں ساز و آواز کے تذکرے ضرور ہیں مگر ان میں بھی غنا و نغمہ کی لطافتوں کے وہ باریک امتیازات نہیں ملتے جو باصرہ سے متعلق اشیا کے تذکرے میں ملتے ہیں، آوازوں سے زیادہ تو رقص اور زنِ رقاص اور نقلِ معقول "(ڈراما۔ ناٹک)" سے انھوں نے اعتنا کیا ہے۔ ان میں وہ بس یہی کہہ سکے کہ "شور سا ہے جہاں میں گوش کریں۔" یا ؎

عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب　　　یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات

اگر ساکت ہیں ہم حیرت سے، پر ہیں دیکھنے لائق
کہ اک عالم رکھے ہے عالمِ تصویر بھی آخر

اور اس میں کیا شبہ ہے کہ "عالمِ تصویر" بھی ایک مستقل عالم ہے جس کی کیفیتیں اور دلآویزیاں اسی طرح دیکھنے کے لائق ہیں جس طرح حسن و جمال یا معانی کے کسی اور عالم کی کیفیتیں دیکھنے کے قابل ہوتی ہیں —— میرؔ نے تصویر کی جس صفتِ خاص کو مختلف پیرایوں میں بار بار ابھارا ہے وہ ہے اس کی صفتِ حیرت جس سے مراد وہ معنیٔ خاص ہے جو تصویر میں حرکت اور زندگی کا قائم مقام ہوتا ہے —— یہ تو واضح ہے کہ "عرفی سکوت" تصویر کی ماہیت میں داخل ہے مگر مصوّر کے دستِ قدرت میں یہ اعجاز ہوتا ہے کہ وہ اپنی صناعی سے تصویر کے پیکرِ خاموش میں گویائی (معنی) کی ایسی صورت پیدا کر دے کہ تصویر بزبانِ حال وہ کچھ کہہ دے جس کو شاعر لفظوں کے ذریعے زبان کی مدد سے ادا کیا کرتا ہے۔ تصویر کے اسی اعجاز کو میرؔ نے "حیرت" سے تعبیر کیا ہے۔ مصوری اور شاعری کے متعلق ایک پرانا مقولہ ہے:-

Painting is dumb poetry
and poetry is speaking painting

مگر مصوری کو گونگی شاعری قرار دینے کی رسم اب کچھ زیادہ مقبول نہیں رہی —— یہ صحیح ہے کہ اس مقولے میں مصوری کو شاعری کہہ کر تصویر کی اظہاری صلاحیتوں کا کچھ اعتراف کر لیا گیا ہے۔ مگر مصوری کو گونگی شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو خطوں اور رنگوں کی زبان سے ادا ہونے والی شاعری ہے جس کو نطقی لحاظ سے ساکت و خاموش تو کہا جا سکتا ہے مگر اس کو گونگی کا خطاب نہیں دیا جا سکتا۔ اور واضح ہے کہ ساکت اور خاموش آدمی ضروری نہیں کہ گونگا ہی ہو۔

میرؔ کی مرغوب اصطلاح "حیرت" بھی کسی قدر تجزیے کی محتاج ہے۔ یہ تو بیان ہو چکا کہ مصوری لفظوں کی بجائے خطوں اور رنگوں سے کام نکالتی ہے اس لیے اس کی زبان اس کے خط اور رنگ ہیں —— مصوری اجسام کی صرف نقل ہی نہیں بلکہ ان تاثرات و معانی کی بھی مصوّر و ترجمان ہے جو خاص اشیاء و اجسام کی خاص حالتوں سے وابستہ ہوتے ہیں —— محض اجسام کی جسمانی ترکیب و ترتیب کو پیش کرنا نہ مصوّر کا مقصد ہے نہ اس کا کارنامہ —— وہ تو حاصل ان تاثراتِ متعلقہ اور احساساتِ ملحقہ کو پیش کرتا ہے جو ان اجسام و اشیاء کے نفس میں موجود ہوتے ہیں۔ جن کا تصویر کے مجموعی ترکیب کے اندر پیدا ہونا اور پیدا کرنا مصوّر کا اصلی نصب العین ہے۔ میرؔ نے انہی معانی و احساسات کی نمود کو حیرت کے نام سے یاد کیا ہے اور یہ حیرت یا حیرانی ان تمام اندرونی طوفانوں یا اندرونی موجوں اور لہروں کی خارجی ترجمان ہے جو کسی معین جسم کے اندر (جس سے مصوّر متاثر ہوتا ہے) موجزن ہوا کرتی ہیں۔

فن کے مشہور جرمن نقاد لیسنگ (Lessing) نے لی آکوَن میں شاعری اور مصوری کی اس حیرانی یا حیرت کو ایک طرح کا چھلاوا یا فریبِ نظر (Illusion) قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ (*Both deceive and that deception of both is pleasing*)

مگر کیا سچ مچ شاعری خصوصاً مصوری کی یہ معنی خیزی فریبِ خیال یا فریبِ نظر ہے[۱]؟ کیا سچ مچ تصویر محض دل خوش کن سراب ہے؟ اور اگر یہ سب سچ ہے تو کیا تمام آرٹ کی معنی آفرینی اور نقش بندی بے اصل اور بے بنیاد ہے؟ مصوری کی خاصیتوں کے متعلق لیسنگ کے بعد اہلِ نقد و نظر کے نظریے بہت کچھ بدل

---

[۱] علامہ ابوالفضل کو بھی یہی شبہ ہوا ہے۔ وہ تصویر کی ماہیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"عالمِ تصویر از بدائع نگارخانۂ موجودات است و حسنِ گوناگوں در طرازِ ہستی او جلوہ دارد و حضرت پادشاہ صورت و معنی .... فرمودہ اند .... کہ صنعتِ تصویر آدمی زاد را چناں شبیہ می نگارد کہ بینندہ در حیرت فرو می رود لیکن آں جانِ گرامی و آں گوہر دریافت و آں حرکاتِ دلفریب نتواند از نہاں خانۂ اظہار آورد (دفترِ سوم خطبۂ مرقعِ پادشاہی)

گئے ہیں اور اب یہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ تصویر عکس اور ظل ہونے پر بھی اتنی بے اصل اور بے بنیاد شے نہیں کیونکہ جن حقیقتوں کی یہ ترجمان ہے وہ حقیقتیں بے اصل نہیں ترجمان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اصل کی کامیاب ترجمانی کرے اس لیے ترجمانی کو سراب نہیں کہا جاسکتا یہ تو سچائیوں کی کامیاب رہنمائی کرتی ہے اور شاید بعض صورتوں میں اس میں نیچر سے بھی زیادہ رہنمائی کی صلاحیت ہوتی ہے۔ نیچر یا نقاشِ ازل کا نقش تو شاید اس اصل کی نقل ہے جو مثالی دنیا میں ہے مگر نقاش کا نقش اس نقل کی تکمیل یا اس کی "معقول تر نقل" ہے جس میں وہ معانی بھی منعکس ہوئے ہیں جو جمالی حقیقتوں کو زیادہ دلکش اور زیادہ معنی خیز بنا دیتے ہیں۔ ایک فن کار اس بے نظمی، بے ربطی اور بے ترتیبی کو جو فطرت میں ہر جگہ نظر آتی ہے اپنے شعور اور وجدان کی مدد سے عموماً رفع کر دیتا ہے اور جمال کے وہ نمونے تیار کرتا ہے جو نیچر کے جمال سے زیادہ جمیل ہو سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ تصویر یا فن محض سیمیا اور پرتو فریب نہیں اس میں مستقل معانی ہوتے ہیں جو حقیقتوں کے قائم مقام ہوتے ہیں ——— ابوالفضل نے تصویر کا اثر یہ بتایا ہے کہ وہ دیکھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتی ہے یعنی اس کو سوچنے اور اس سے محظوظ ہونے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے مگر میر نے تصویر میں جس حیرت کا ذکر کیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ تصویر میں ایک طرح کی گویائی ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ اپنے فن کے جذبات بہ کمالِ کامیابی ظاہر کر سکتی ہے۔

میر کے نزدیک تصویر کی حیرت کوئی جامد یا موہوم صفت نہیں بلکہ یہ اس سوزِ زندگی کی ترجمان ہے جو جذبہ و احساس کے ضمیر میں ایک ایسی آگ لگائے رکھتی ہے جو اگرچہ سچ مچ خارج میں شعلہ زن ہو جائے تو دنیا شمع کی طرح پگھل پگھل کر بہہ جائے۔ اسی لیے تو غالب کو کہنا پڑا تھا کہ ؎

عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اور میر نے کہا :- ؎

عشق آتش بھی جو دیوے تو نہ دم ماریں ہم
شمعِ تصویر ہیں خاموش جلا کرتے ہیں

(۲) تصویر کی سی شمع خاموش جلتے ہیں ہم
سوزِ دروں ہمارا آتا نہیں زباں تک

یہ تسلیم ہے کہ مصوری کی فطرت میں ہی کچھ کوتاہیاں موجود ہیں جن سے وہ نجات نہیں پا سکتی۔ مثلاً زبان میں حرکت اور بعض جزو کی عکاسی۔ مگر کوتاہیٔ قسمت تو شاعر اور مصور دونوں کے مقدر میں رہا ہے وہ دونوں اپنا اپنے فن کی اظہاری صلاحیتوں سے کسی نہ کسی شکل میں مطمئن ہوتے ہیں بلکہ ہر فنِ لطیف اپنی اپنی حد میں بعض کوتاہیوں کا شکار ہے پس صرف معانی کی کامیاب ترجمانی شاعری کی اظہاری صلاحیت سے کیوں کر کم تر سمجھی جا سکتی ہے بہرصورت میر نے تصویر کی صفتِ حیرت کو بڑی اہمیت دی ہے اور اپنے تصورات کو اسی زبانِ بے زبانی کے اردگرد جمع کر دیا ہے وہ جہاں تک میں سمجھ سکا مصور اور شاعر دونوں کو اپنی اپنی حدود میں یکساں طور پر معانی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ شاعر اپنے کنایات و استعارات سے اشارے مہیا کرتا ہے اور معانی کا تصور دلاتا ہے۔ مصور اپنی تصویر میں حیرت کا عنصر پیدا کر کے تخیل کی رہنمائی کرتا ہے۔ سچائیاں دونوں جگہ ہیں، فریب یا سراب کسی جگہ نہیں۔

یہ ایک عام تصور ہے کہ نیچر خدا کی صنعت ہے اور اس لحاظ سے خالق کو صانعِ ازل اور نقاشِ ازل قرار دیا جاتا ہے۔ یہ عام خیال شاعروں اور صوفیوں کے اقوال میں بھی ہر جگہ ملتا ہے۔ مگر میر کے یہاں نقاشِ ازل کی فن کاری کے متعلق عجیب و غریب خیالات ملتے ہیں۔ ان کے استدلال کے بنیادی خیالات کچھ اس طرح مرتب ہوتے ہیں :-

مثلاً یہ تمام عالم خالقِ کردگار یا صانعِ ازل نے بنایا ہے :-

یہ دُنیا ایک تصویر خانہ ہے ۔ خدا ایک بے مثل مصوّر ہے جو پردے میں بیٹھ کر عجیب عجیب صورتیں بناتا رہتا ہے ۔

عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصوّر بے مثل
ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں

بصانع کہ یہ نقاشیاں ہیں سب اس کی ، زمیں ہو یا ہو فلک یا حجر ہوں یا اشجار ،

اب صانعِ ازل یا نقاشِ ازل کی اس فنکاری کی بھی دو سطحیں ہیں اعلیٰ اور ادنیٰ ——— اعلیٰ فن کاری وہ ہے جس میں نقاشِ ازل نے اپنی ساری "محبّت" یا "نورِیت" یا "جمالیت" منتقل کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے وہ جمال کی مکمل تصویر ہے ——— یہ پیکرِ انسانی ہے جس کی تخلیق یا مصوّری میں خلاقِ عالم نے اپنی تمام خلاقانہ صلاحیتیں (شاید) ختم کر دی ہیں ۔ اور یہ وہ پیکرِ جمال ہے جس کی کامیاب تخلیق یا کامیاب ترین نقالی "اور شبیہ آفرینی کسی مصوّر کے بس کی بات نہیں گویا اس ایزدی مصوّری کے مقابلے میں انسانی مصوّری ناقص و نا تمام ہے ۔

کیا کیا شکلیں محبوبوں کی پردۂ غیب سے نکلی ہیں
منعفت ہو ٹک لے نقاشاں لیسے چہرے بناتے تم

میر کے نزدیک خدا کی فن کاری کی دوسری سطح نیچر (کائنات) کا حسن ہے جو ان کے خیال میں انسانی حسن کے مقابلے میں دوسرے درجے کا حسن ہے یہ تصوّر میر کی "نیچر شاعری" میں ہر جگہ پایا جاتا ہے کہ انسان نیچر سے اعلیٰ اور برتر مخلوق ہے اور اس کا حسن برتر اور فائق حسن ہے ۔ چاند، تارے، پھول، گل، شمس و قمر سب الگ الگ بھی اور مل کر بھی حسنِ انسانی کی جمالیت حاصل نہیں کر سکتے ۔

ہم نہ کہتے تھے کہ نقش اس کا نہیں نقاش سہل
چاند سارا لگ گیا تب نیم رخ صورت ہوئی

——— اور پھر وہ محبوب جو میر کے دل کا محبوب ہے اور اس کے دل میں ایسا ہوا ہے وہ تو اتنا کامل ہے کہ اس کا مثیل و شبیہ تو صانعِ ازل نے بھی پھر نہ بنانا چاہا کیوں کہ وہ جمال کی تکمیل کا مظہر ہے :-

عجب نقشا ہے نقاشِ ازل نے کوئی ایسا نہ چہرہ پھر بنایا

نقشا عجب ہے اس کا نقاشِ ازل کے مطبوع ایسا چہرہ کوئی نہ پھر بنایا

بہر صورت میر کے خیال میں نیچر کی مصوری ہے تو خدا کا فن مگر دوسرے درجے کا فن ہے ——— ان ایزدی پیکر تراشیوں کے متعلق میر کے یہاں کچھ تذبذب بھی ہے ، کہیں تو وہ کائنات کو خدا ہی کا فن کہتے ہیں مگر کبھی اس کو محض عناصر کی شعبدہ بازی قرار دے کر اس کا درجہ گھٹا دیتے ہیں ——— وہ باغِ عالم کے حسن کے متعلق یہ رائے بھی رکھتے ہیں کہ یہ حسنِ انسانی ہی کا ایک بگڑا ہوا روپ ہے ، یہ صورتیں ان کے خیال میں ان صورتوں سے تیار ہوئی ہیں جو مر کر کبھی مٹی میں دفن ہو گئی تھیں ۔ پھر ان ہی کی تحلیل و تبدیلِ احوال سے قدرت نے ایک دوسری شکل میں ان کو از سرِ نو نمودار کر دیا ۔ غالب نے بھی اس تبدیلِ ماہیت کے متعلق اسی طرح کا خیال ظاہر کیا تھا ۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یہ خیال غالب سے پہلے کی فارسی شاعری میں کئی شاعروں کے کلام میں ملتا ہے۔ حکیم عمر خیام نے بھی اپنی کئی رباعیات میں حسنِ کائنات کی تعبیر اسی طرح کی ہے۔

پیش از من و تو لیل و نہارے بودہ است — گردندہ فلک برائے کارے بودہ است
زنہار قدم بخاک آہستہ نہی — کاں مردمکِ چشمِ نگارے بودہ است

خارے کہ بزیر پائے ہر حیوانے است — زلفِ صنمے و ابروئے جانانے است
ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانے است — انگشتِ وزیرے و سرِ سلطانے است[1]

میر کے یہاں خیام کی سی توضیح تو نہیں مگر یہ خیال کہ حسنِ کائنات حسنِ انسانی ہی کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے برابر ملتا ہے ؎

ہر قطعۂ چمن پہ ٹک اک گاڑ کر نظر کر — بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنا ہے

گل و سنبل میں نیرنگ تفاوت سرسری گزرے — کہ بگڑے زلف و رخ کیا کیا بنے تب اس گلستاں کو

اوپر جو کچھ بیان ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میر مصوری کے فن کو اعلیٰ فن (شاعری کے برابر اور کبھی کبھی اس سے بھی بڑا فن) سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک خالقِ کردگار بھی ایک مصور و نقاش ہے اور کائنات اس کی نقاشی ہی کا نمونہ ہے اور انسان تو اس کا وہ بے مثال شاہکار ہے جس پر اس کے مصور کو خود بھی ناز ہے۔ ؏

نقش پر اپنے مصور کو بھی سو سو ناز ہیں

میر نے خدا تعالیٰ کو مصور اور نقاش کہہ کر فنِ مصوری کو شانِ تقدیس بخش دی ہے اور اس طرح فنِ تصویر کو وہ درجہ دیا ہے جس سے اس میں الوہیت کے نقش و نگار منعکس ہو گئے ہیں۔ میر نے کئی موقعوں پر تصویر کو مثالی یا بے مثل یا مطلق حسن و خوبی کا مظہر قرار دیا ہے۔ مثلاً

صورتوں سے یہ خاک واں اک عالمِ تصویر ہے
بولیں کیا اہلِ نظر خاموش ہیں حیرت سے یاں

گویا دنیا میں حسن و جمال کی وہ تجلیاں ہیں کہ ہر طرف "عالمِ تصویر" کا سا سماں پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے نزدیک عالمِ تصویر حسنِ مثالی کا

---

[1] خیام کی چند اور رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

ایں کوزہ چو من عاشقِ زارے بودست — دربندِ سرِ زلفِ نگارے بودست
ایں دستہ کہ در گردنِ آدمی بینی — دستیست کہ در گردنِ یارے بودست

ہر سبزہ کہ بر کنارِ جوئے رستہ است — گویا ز لبِ فرشتہ خوئے رستہ است
پا بر سرِ سبزہ بخواری نہ نہی — کاں سبزہ ز خاکِ لالہ روئے رستہ است

کامل نمونہ ہے ۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اس شعر میں بھی تصویر کو مثالی حسن کا پیکر بنایا گیا ہے ۔

تنگ بھی تجھ سے ہی تصویر کا سا عالم
بیدردی فلک نے ذمے نقش سب مٹائے

حیراں ہوں اس قدر کہ اگر اب کی جلیئے
پھر منہ ترا نہ دیکھیے تصویر کیوں نہ ہو

دیکھ رہتا ہے جو دیکھے ہے اُسے
دل رُبا آئینہ رو تصویر ہے

ان سب اشعار میں "تصویر کیوں نہ ہو" کا پیرایہ یہ صاف صاف ظاہر کر رہا ہے کہ تصویر کی تجریدی حقیقتوں اور برتر لطافتوں میں میر کے نزدیک حسن لا مثالی کی شان پائی جاتی ہے مگر میر کے اکثر اشعار سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ انہیں فنِ مصوری کی ان کوتاہیوں سے بھی پوری آگاہی تھی جو زمان و مکان کی قیود نے تصویر کی ماہیت میں داخل کر دی ہیں ۔

لیسنگ اور اُن کے تتبع میں بعض دوسرے نامور نقادوں نے مصوری کی ان کوتاہیوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے، مصوری کی سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ وہ زمان کی محض ایک "آن" میں مقید ہوتی ہے اور وقت کی حرکت و رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح مکان میں بھی وسعت پیدا کرنے اور بیک وقت مکان کی مختلف اطراف کو اپنے اندر سمیٹنے کی غیر محدود صلاحیت اس میں موجود نہیں، وہ منظر کے لحاظ سے بھی محدود رہی ہے۔ مصوری رفتارِ واقعات کو ظاہر کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتی Progressive action . وہ زیادہ سے زیادہ مختلف افعال کو اپنے کینوس میں بیک وقت مختلف سطحوں پر ظہور میں دکھا سکتی ہے اس سے زیادہ دکھانا اس کے بس کی بات نہیں ۔

مصوری کی اس بنیادی کوتاہی کو میر نے کئی صورتوں میں بیان کیا ہے مثلاً ان کا خیال ہے کہ حالتوں کے تنوع اور گوناگوں تغیرات کو پردۂ تصویر پر "یک جا" بیان کرنا تصویر کی قدرت سے باہر ہے، اس حقیقت کو ایک خوبصورت شعر میں یوں بیان کیا ہے ۔

نہ کھنچے تجھ سے ایک جا نقاش
اس کی تصویر وہ ہے ہرجائی

مکان و زمان میں پھیلی ہوئی حیاتی کیفیتوں کو جن کو میر نے "ہرجائی" کی ترکیب سے ظاہر کیا ہے نقاش ان کا کبھی "یکجا" تصور بھی نہیں کر سکتی ——— یہ تو شاعری کا خاص دائرہ عمل ہے کہ ایک ہی نظم میں بلکہ ایک ہی شعر (بلکہ ایک ہی ترکیب میں مثلاً ہرجائی ہی کو دیکھ لیجئے) زمان و مکان میں پھیلے ہوئے تغیرات کا احاطہ کرے اور شاعری کا یہ وہ خاص تفوق ہے جس میں مصوری اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو شاعر بھی اصولاً مصور ہی ہوتا ہے

(نوٹ :- اگلے صفحہ پر دیکھیں)

مگر وہ اپنے فن کی ماہیت کے اعتبار سے اپنی تصویروں کو "آنِ واحد" کی جمالی کیفیتوں کے اظہار تک مقید کرنے پر مجبور نہیں اس کو یہ اختیار ہے اور اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ کسی "شے" کی تصویر ایک ہی نظم میں (بلکہ ایک ہی شعر میں) اس طرح کھینچ دے کہ اس کے تمام بدلتے ہوئے افعال اور کوائف و حالات کو دکھا سکے ——— ان مناظر کو زمان کی رفتار پر قدرت حاصل ہونے کے سبب شاعر ایک ہی نظم میں پیش کر سکتا ہے مگر مصور مجبور ہے کہ ان میں سے ہر منظر کے لیے کئی پردے اور نئے تصویر استعمال کرے یا مختلف سطحوں پر ایک ہی پردہ تصویر پر ان کو "حد بند" کر دے۔

میتھرؔ نے مصوری کے اس فطری کمال کو تسلیم کیا ہے کہ وہ اشیا کے مجموعی "جسم" یا صورت کو کمال خوبی یک جا پیش کر سکتی ہے ——— اس حد تک کہ دیکھنے والا ——— "آنِ واحد" میں سارے جسم کو اس کی ساری کیفیتوں کے ساتھ اس کے تمام ناز و کرشمہ کے ساتھ، اس کی بھرپور اداؤں کے ساتھ بیک نظر دیکھ کر اس سے محظوظ ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے مصوری ناظر کو زیادہ کامیابی اور آسانی کے ساتھ "اصل منظر" تک پہنچا سکتی ہے اور مجموعی تاثر پیدا کرنے میں وہ کام کر سکتی ہے جو شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اسی لیے یہ کہا گیا ہے کہ مصور کا اصل فن "آنِ واحد" کی کیفیت اور "مکمل اجسام" کی باز آفرینی ہے اور شاعر کا اصل فن زمان کی رفتار میں بدلتی ہوئی کیفیتوں کی باز آفرینی اور جسم و صورت کی الگ الگ خوبیوں اور کرشموں کو پیش کرنا ہے ——— کبھی کبھی یہ دونوں فن ایک دوسرے کے دائرے میں زبردستی گھس آتے ہیں۔ مگر اس کے لیے ان کو اپنے طریقے اور رویے کچھ بدلنے پڑ جاتے ہیں ——— شاعری کسی رمز کے ذریعے "جسم" کا مجموعی تصور دلانے کی کوشش کرے گی اور مصوری کسی خاص pose کے ذریعے حرکت اور رفتار کا تصور دلائے گی۔

فنِ تصویر کے لیے مشکل ترین مسئلہ ——— ادا کی باز آفرینی ہے۔ شاعری اپنے اشارات و استعارات کے ذریعے فی الفور خیال کو "ادا" کا تصور دلا دیتی ہے ——— فنِ تصویر کو بھی اپنی صورت یا "مورت" میں ادا سے زندگی پیدا کرنی ہوتی ہے کیوں کہ اس کے بغیر صورت یا مورت محض کھلونا یا نقوش کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ مگر تصویر میں "ادا" آفرینی کوئی آسان بات نہیں فنِ تصویر کے لیے یہ تو ممکن ہے کہ وہ جسم کو مجموعی شکل میں پیش کر کے اس میں ادا کی اجمالی کیفیت پیدا کرے مگر شاعر کی طرح ادا شناری اس کی قدرت میں نہیں (اس کے مقابلے میں شاعر کسی مجموعی "جسم" کو بیک وقت پیش نہیں کر سکتا (اس طریق سے کہ بیک نظر ناظر کی گرفت میں آ جائے۔) اس لیے اس کو بھی ادا کی مکمل کیفیت پیدا کرنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ ادا کی الگ الگ صورتوں کو تو وہ آسانی سے پیش کر لیتا ہے مگر مجموعی صورت دکھانا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو فہرست اور رمز کے سہارے ڈھونڈنے پڑتے ہیں اور وہ بھی یہاں

سلہ (پچھلے صفحے کا بقیہ) یہ بحث بڑی تفصیل طلب ہے۔ شاعری اور مصوری کے مماثلتوں کا پورا حال لی آکون اور لی آکون جدید (Babbitt) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ شاعر بنیادی طور پر مصور ہے مگر اس کے فن میں مغنی کے کمالات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اصلاً وہ تصویریں ہی بناتا ہے مگر اس کی تصویریں بزبانِ حال نہیں بزبانِ موسیقی گفتگو کرتی ہیں لی آکون میں لیسنگ نے یہ پر معنی فقرہ لکھا ہے

paint for us, ye poets, the delight, the affection, the love, the rapture, which beauty produces, and you have painted beauty itself.

مگر یہ تو جذبات و کیفیات کی تصویروں کا ذکر ہے جو شاعر کا میدانِ خاص ہے ——— شاعر اس سے آگے بھی بڑھ سکتا ہے وہ مادیات کی تصویریں بھی بنا سکتا ہے اگرچہ مادیات کی جزئیاتی اور تفصیلی تصویر سازی (جو مصوری کی ماہیت میں داخل ہے) شاعر کے بس کی بات نہیں مگر شاعر کو ان جزئیات میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے وہ تو چند معنی سے لبریز [illegible] بات کا [illegible] کر لیتا ہے اور تخئیل [illegible] مکمل جزئیات کے نقشے خود بخود ابھرتے ہیں۔ — (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر دیکھیں)

تک پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں کہ

ع یار ما آں دارد و ایں نیز ہم

یا پھر ؎

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

شاعری کے پاس ان کیفیتوں کو ظاہر کرنے کے لیے بس یہی "آں" اور یہی "ایں" رہ جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بھی اظہار کی کوتاہی کے سوا کچھ نہیں، میرے شعور کو شاعری اور مصوری کے ان اوصافِ مختلفہ کا ادراک حاصل تھا جن کو انہوں نے مختلف اشعار میں پیش کیا ہے۔ مثلاً مصوری اور کسی حد تک شاعری کی کوتاہیوں کو ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔ ؎

نقاش کیونکہ کھینچ سکا تو شبیہِ یار
کھینچوں ہوں ایک ناز ہی اس کا میں تابکے

مگر میں کہتا ہوں کہ میرؔ اور ان کے شاعر عمر بھر "ناز" کھینچتے چلے جائیں۔ تب بھی مجموعی ادا آفرینی جو شبیہ یا مکمل تصویر کے ساتھ ہی نمایاں ہو سکتی ہے ان ناکامیوں میں سے ہے جو شاعر کے مقدر میں ہے ہی نہیں —— شاعر تو ان کا محض اشارہ کر سکتا ہے یا محض ہلکا تصور دلا سکتا ہے۔ ناز کی تصویر نہیں کھینچ سکتا اور نہ مکمل شبیہ بنا سکتا ہے۔ مگر اس کو کیا کہیے کہ مصور سارا جسم بنا چکنے کے بعد ادا آفرینی کر بھی لے تو ابھی اس میں حرکت کا تصور پیدا کرنا جوئے شیر لانے کے مرادف ہے۔ ؎

کوہ کن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر پیدا نہ ہو وے آشنا

تاہم مصور ادا آفرینی میں شاعر پر سبقت لے جاتا ہے مگر ناز یا ادا کی تصویر بنانا مصور کے لیے موت و حیات کی کش مکش کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ ادا بھی زندگی کی ایک "حرکت" ہے اور مصور حرکت کی باز آفرینی پر اصولاً قادر ہی نہیں اس لیے یہ اس کی بڑی سخت آزمائش ہے۔

(پچھلے صفحے کا باقی حاشیہ) تصویر کو اولاً آنکھ کے ذریعے مخاطب کرنے کی ضرورت ہے اس لیے آنکھ تو اس قطع و برید جزئیات سے مطمئن نہیں ہوتی جن کی قطع و برید کی شاعر کو اجازت ہے —— یہ سب شاعر کے امتیازات فائقہ ہیں اور ان کوتاہیوں کی تلافی کی صورتیں ہیں جو "مکان" نے شاعری میں پیدا کر دی ہیں۔ وہ شاعر جو مادیات میں محض جزئیات کی مکمل جمع آوری سے Description کی کوشش کرتے ہیں، مصور کا حق چھیننے کی سعی لا حاصل میں اپنی شاعری کی خیال انگیزی کو کھو بیٹھتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے)

Aspect of 18th century nature poetry by C. V. Deane,
Chapter IV, V

[1] غرائب اللغات (عبدالواسع ہانسوی) ادا کا معنی لکھتا ہے۔

"کیفیتے باشد معشوقاں را کہ بتقریر در نہ آید و ذوق آں را در یابد بمعنی آن"۔ خانِ آرزو نے نوادر الالفاظ میں لکھا ہے "ادا ہر چند لفظ عربی است لیکن اکثر فارسیاں بمعنی حرکت موزوں استعمال کنند مثلاً ادائے ابرو و چشم کہ حرکت ایں ہا موزوں نماید و گوئند کہ ہے بمعنی مطلق حرکت، چنانکہ ادائے خارج بمعنی حرکت خلافِ ظاہر و نامناسب خواہ فعل باشد خواہ قول ——"

میرؔ نے جابجا مصوری اور شاعری کے تقابلی امتیازات کی طرف بھی اشارے کیے ہیں۔ کہیں باہم مقابلہ کرکے، کہیں الگ الگ ——، اور اشعار میں بار بار مصوری کے اس عجز کا احساس دلایا ہے کہ وہ اجزا سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی نہ اجزا سے کُل کے تصور کی تخلیق کر سکتی ہے۔ مثلاً صرف آنکھ یا کان یا ناک بنا دینے سے کوئی تصور پیدا بھی ہوگا تو بہت پھیکا۔ نظر کو کُل کی تلاش ہوگی، شاعری کے برعکس کہ اس میں چشمِ سرمگیں یا دستِ حنائی کہہ دینے سے تمام متعلقاتِ کُل سامنے آجاتے ہیں۔ چنانچہ میرؔ کے مندرجہ ذیل اشعار سے اس کی تصدیق ہوگی۔ جب دیکھئے نقاش ساعدِ سیمیں کی تصویر کھینچنا چاہتا ہے، مگر اس کا فن قاصر ہے۔ ؎

خوبی کو اس کی ساعدِ سیمیں کو دیکھ کر ،
صورت گروں نے کھینچ رکھا ہاتھ کے تئیں

اسی طرح لمبے بالوں کی تصویر تو ممکن ہے مگر انفرادی زلفِ پریشاں کی تصویر ناممکن ہے اس لیے مانی جیسا نقاش ان کی انفرادی تصویر سے کُل کا تاثر پیدا کرنے سے پریشان و حیران ہی رہتا ہے۔ ؎

کن نے لمبے بال دکھلائے ترے مانی کے تئیں
ان نے جو اس طول سے کھینچی پریشانی کے تئیں

؎ صورت گر کی پریشانی نے طول نہایت کھینچا ہے
ہم نے کیوں بستار کیا تھا اس کے لمبے بالوں کا

کسی مکمل شبیہ میں دامن کی تصویر بھی بن سکتی ہے مگر دامن کی علیحدہ تصویر کشی سے کوئی کیا بات پیدا کر سکتا ہے۔ ؎

اپنا تو دست کوتہ تک بھی ٹک نہ پہنچا
نقاش سے کہیں وہ دامن کشیدنی ہے

میرؔ کا یہ بھی خیال ہے کہ مصوری اعلیٰ سطح پر پہنچ کر بھی وہ معانی بیان نہیں کر سکتی جن کا تعلق داخلی کیفیتوں سے ہے۔ مثلاً محبوب کی بدخوئی کا صحیح نقشہ بنانا کسی نقاش کے بس کی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ماتھے پر بل[1] ڈال کر غیظ و غضب کا اظہار کر دیا جائے مگر اس سے بدخوئی کی بدلتی ہوئی حالتیں کس طرح ظاہر ہو سکیں گی، غرض میرؔ کا عقیدہ یہی ہے کہ عام مصوری اس کی اہلیت نہیں رکھتی کہ داخلی کیفیتوں کو خارجی صورت میں پیش کر سکے۔ ؎

کہاں وہ طرزِ کیں اس کی کہاں چینِ جبیں اس کی
لگا کر بارہا اس شوخ سے تصویر[2] چیں دیکھی

خیر یہ بھی اگر ممکن ہو جائے کہ محبوب کی جو رنگ جو طبیعت کے اظہار کے لیے کچھ ظاہری علامتوں سے مدد لے لی جائے اور کچھ نہ کچھ تصور پیدا ہو جائے —— مگر یہ بتائیے کہ کوئی مصور کسی کی مستی اور خمار کا نقشہ کیسے پیش کرے گا۔ ؎

---

[1] لی آکرون میں داخلی جذبات کی تصویر کشی کی بڑی اچھی بحث آئی ہے۔ مثلاً کسی اندرونی کرب کے زیرِ اثر چہرے پر جو آثار نمایاں ہو سکتے ہیں اور آنکھوں میں جو کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اس کا اظہار اعضا کے سکڑ، سمٹ یا پھیلاؤ یا بدن کے تناؤ یا ڈھیلا پن یا قد کی خمیدگی جھکاؤ یا تناؤ سے —— یا ... کی مختلف صورتوں سے ہو سکتا ہے۔ (۲ اگلے صفحے پر دیکھیں)

مستی میں شکل ساری نقاش سے کھچی پر
آنکھوں کو دیکھ اس کی آخر خمار کھینچ

اور اس سے بھی آگے آپ کوئی مصور بھلا انتظار کی تصویر کیسے کھینچے گا۔ البتہ شاعر اس کا تصور دلا سکتا ہے۔

نقاش دیکھ تو میں کیا نقش یار کھینچا
اس شوخ کم نما کا نت انتظار کھینچا،

یہ سب طبعی کوائف یا مجرد احوال ہیں ان کی تصویر کشی محالات میں سے ہے۔ چند علامتوں سے اتنا تو ممکن ہے کہ کچھ اشارہ سا مل جائے مگر کامل مصوری نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح مصور ناز و کرشمہ کو بھی پیش نہیں کر سکتا اس لیے کہ تصویر زیادہ سے زیادہ کسی حسین کو ایک "شکل" کی حیثیت سے پیش کر سکتی ہے اس میں ناز و ادا کی کیفیتوں کو جو بدلنے والی (زمان اور حرکت سے وابستہ) حالتیں ہیں، ان کو کامیابی سے نمودار نہیں کر سکتی۔ یہاں تک کہ "چینی" کا نقاش بھی جس کی مصوری اپنے کمال کے لیے شہرت رکھتی ہے، ان کیفیتوں کو پردے کا ریا "بروئے یار" نہیں لا سکتا۔ [۵]

ناز و ادا کے ساتھ وہ دلبر شکیل ہے
تصویر چیں کی، رو برو اس کے ذلیل ہے

(شعر میں "کے ساتھ" کا معنی یہ ہے کہ محبوب کے پاس شکل یعنی تناسب اعضا بھی ہے اور ناز و ادا بھی ـــــ اس لیے مجموعی حسن و خوبی کی نقاشی مصور کے فن کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے۔ چین کا مصور صرف شکل بنا سکتا ہے ناز و ادا نہیں بنا سکتا۔)

میرؔ نے جو اصطلاحیں حسن کے اظہار کے لیے استعمال کی ہیں ان میں ایک اصطلاح "پرداز" بھی ہے اور یہ "پرداز" "شکل" کے علاوہ حسن و خوبی کے دوسرے اضافات اور پوشیدہ لطافتوں کا نام ہے جن کی بدولت تصویر "ابتدائی شکل" سے نکل کر سچی تصویر کی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ میرؔ کا خیال ہے کہ تصویر میں "پرداز" کی خوبیاں پیدا کرنا بھی مصور کے لیے مشکل ہیں۔ یہ تو شاید ممکن بھی ہو جائے کہ کوئی مصور کسی ایک ادا کا عکس تصویر سے مگر وہ اداؤں میں زندگی کیسے پیدا کرے گا جو "پرداز" کی تکمیل کے لیے لازمی ہے۔ میرؔ کے نزدیک بہزاد جیسا ماہر فن بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا۔ [۵]

ادا کھینچ سکتا ہے بہزاد اس کی،
کھچے ایسی صورت تو یہ ہم نے مانی
بے اختیار شاید آہ اس سے کھنچ گئی ہو
جب صورت ایسی تیری نقاش نے نکالی
نقاش دیکھ کر کھینچ سکا تو شبیہہ یار
کھینچ سکے ہے کس ایک ناز پی اس کا ابتدا تک،

(پچھلے صفحے کا بقیہ) [۱] چینی مصوری کی پرانے ادیبوں اور شاعروں نے بڑی تعریف کی ہے۔

[۲] مغربی مصوری کے بعض نمونوں میں ایسی تصویریں مل جاتی ہیں جن میں ماحول اور فضا کی مدد سے اسی طرح کھڑے ہونے یا نشست کے انداز سے انتظار یا کسی آمد کا تصور پیدا ہو جاتا ہے۔

میر نقاشی کے فن سے خود واقف نہ ہوں لیکن تصویروں سے ان کی دلچسپی کا پتہ ان کے کلام سے چلتا ہے جس کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں تصویر یا اس کے متعلق الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ آئینے کی تمثال میں بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ محبوب کی تصویر کو اپنے پاس رکھنے کا شوق انہیں اکثر ستاتا ہے اور یہ تمنا تو عمر بھر ساتھ رہتی ہے کہ کوئی ایسی تصویر کھینچ سکے جس میں محبوب کو دیکھ سکیں۔ لیلیٰ مجنوں کی ایک تصویر بھی ان کے تخیل میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے اور گروپ کے لیے تو میر تخیل یا گروہ کے بعض حصوں کی طرح شوق بے تاب رکھتے ہیں۔ انہوں نے خود اپنی لفظی مصوری میں بھی گروپ کے لیے خاص دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ انہیں فطرت میں جہاں بھی اس چیز کا مشاہدہ ہوتا ہے اس سے ان کی طبیعت میں ایک اہتزاز پیدا ہوتا ہے — چنانچہ ذیل کے اشعار میں یہ احساس خاص طور سے نمایاں ہے۔

ہم بھی فصلِ گل میں چل کر ٹک تو پاس دیکھیں
سر جوڑ جوڑ کیسے کلیاں نکلتیاں ہیں!

نکلی ہیں لب کی کلیاں اس رنگ سے چمن میں
سر جوڑ جوڑ جیسے مل بیٹھتے ہیں احباب،

یوں اہرِ گل سے اب کی جھکے ہیں نہالِ باغ
جھک جھک کے جیسے کرتے دو چار یار بات

یہ اس میر کے تصورات ہیں جس کو خلقِ خدا نے "بد دماغ" اور مردم بیزار قرار دیا ہے۔ اصل حال تو اللہ کو معلوم ہوگا یا ان لوگوں کو جو ان کے زمانے میں تھے، مگر ان کی شاعری سے ان کی آرزوؤں کی جو تصویر بنتی ہے وہ یہی ہے جو مندرجہ بالا اشعار میں نظر آتی ہیں — بہرحال میر اس قسم کی محفل کے بہت مشتاق ہیں جس میں

[illegible] تصویر کی مانند لگے در ہی سے گزری — مجلس میں تیری ہم نے کبھو بار نہ پایا

[illegible] بات مجلس میں تری ہم بھی کہا کرتے تھے چپکے — جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

[illegible] پیر تیرے آئینے کی تمثال ہم نہ پوچھو — اس دشت میں نہیں ہے پیدا اثر جاتا

[illegible] آہ کب تک رہے صورت گراں حیراں پھروں ہی جانئے کیا
نقش اس کا کھینچ رکھنے کی کوئی صورت کرو

[illegible] صورت اس کی مری کھینچی تھی لگتے ہوئے
سو جفا کار نے نقاش کو گردن مارا

[illegible] تصویر قیس و لیلیٰ ٹک ہاتھ لے کے دیکھو
کیسے ہیں عاشقی کے حیران کار دونوں

سرو شمشاد جیسے درختوں میں احباب کی کیفیت ہوتی ہو —— رفاقت و مجلس سرت کا تصور تصویر سے متعلق اشعار میں بھی موجود ہے لیکن چھوٹی ہو گیا ہے۔ میر نے اپنے احساسات کی تصویر کشی میں بھی تصویر کے استعارات وکنایات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اپنے دل کے گھٹنے، چشم کی حیرانی اور سرگردانی کے اظہار کے لیے بھی انھوں نے تصویر کی تشبیہوں کو استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے غنچۂ تصویر کا موزوں استعارہ ان کا استعمال کیا ہے جو ان کی دلی کیفیتوں کے لیے ایک مستقل علامت بھی ہے۔ ؎

یوں ہی حیران و خفا جوں غنچۂ تصویر ہوں
عمر گزری پر نہ جانا میں کہ کیوں دلگیر ہوں

گل تو بھی حیران کی خاطر بہت کرتا ہے لیک
وا نہیں ہوتا ہر گز غنچۂ تصویر میں

میر کا تصویر کے فن سے اتنا اعتنا اس بات کا ثبوت ہے کہ میر اس آرٹ کی ماہیت سے بھی باخبر تھے اور اس کی دلچسپیوں اور باریکیوں اور اصطلاحوں سے بھی آشنا تھے —— وہ تصویر کو ایک مستقل جہان مانتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ

ع اک عالم رکھے ہے عالم تصویر بھی آخر

ان معلومات سے میر کی عظمتوں میں یقیناً بڑا اضافہ ہوتا ہے۔ وہ اور شاعروں سے بالکل منفرد اور ان سے برتر ذوق و شعور کے مالک معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے پہلے اور ان کے بعد بھی کئی شاعروں نے اپنے اشعار میں تصویر سے حاصل کردہ استعارات استعمال کیے ہیں، مثلاً ولی کے کلام میں اور بعد میں غالب وغیرہ کے کلام میں دیدۂ تصویر اور غنچۂ تصویر وغیرہ کی استعاراتی تشبیہیں مل جاتی ہیں مگر یہ استعمال عموماً تقلیدی یا محض شاعرانہ ہے، ان سے فن تصویر کے متعلق ان شاعروں کی کسی خاص واقفیت کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کے برعکس میر کے اشارات تقلیدی نہیں تنقیدی ہیں اور اس کا عرفان و بصیرت سے مالا مال ہیں جو اچھی خاصی تربیت کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں —— اور یہ تو سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میر نے فن اور صناعی کے الفاظ تقریباً اسی معنی میں استعمال کیے ہیں جس میں آج کل آرٹ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ میر خود کو بھی صناع کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ فن کار (صناع) عموماً سماج میں خوار و خستہ ہی رہتے ہیں —— میر نے رقص اور ڈراما سے بھی سرسری سی دلچسپی لی ہے —— چنانچہ ڈراما کے لیے بھی نقل معقول کی اصطلاح دی ہے جس کی بھرپور معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا —— تصویر کے متعلق بھی ان کا شعور اسی عام اور ہمہ گیر فنی دلچسپی کا نتیجہ ہے؛

---

1 فارسی کے بعض شعرائے متاخرین کی غزلوں میں بھی تصویر کا ذکر آیا ہے۔ آفرین لاہوری کا شعر ہے ؎

عدم شریکے کہ ما ہیم آلودہ دامنی نیست — ساز لب چو تصویر ندیم و پیمانیم

ایک اور شاعر سراج الدین سرآمد (تخلص) نے شعلۂ تصویر کی ترکیب اس طرح استعمال کی ہے :-

مزاج خورشیدی وا تواناں منتخب کردم — کشودم چشم تا بر شعلۂ تصویر تب کردم

ان کے علاوہ بھی فارسی شعراء کے یہاں مصوری سے لیے ہوئے استعارات وکنایات ہیں مگر یہ محض تقلیداً۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

غالب کی شاعری کے بنیادی عناصر

غالب اردو شاعری میں ایک نادر مظہر ہیں۔ ان کی انفرادیت اور عظمت اتنے متضاد پہلوؤں میں اُبھر کر ہوئی ہے کہ اُن سب کا احاطہ کسی ایک شخص کے لئے کسی ایک مضمون کی حدود و بساط میں کرنا مشکل ہے۔ فکر و سخن کی منزل میں ان کا مقام اور منصب سب سے الگ ہی نہیں، سب سے نمایاں اور بلند بھی ہے۔ غالب کی شاعری کا موضوع ان کے شدید قسم کے ذاتی تاثرات ہیں۔ ان کی امتیازی خصوصیت اُن کا تفکر یعنی ان تاثرات پر اُن کے بھرپور اور عمیق ذہن کا ردِ عمل ہے۔ غالب کا تجربہ واقعی اور غیر منفصل معلوم ہوتا ہے۔ جس میں گوناگوں کیفیات کی جلوہ گری نظر آتی ہے اور جس کے دوران میں ان کی شخصیت کے تمام نہاں در نہاں گوشوں میں ایک خود فراموشی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ غالب کے یہاں فکر اُن تمام تجربات کا اظہار ہے جنہیں ذہن نے قلمبند کیا ہے۔ اس فکر کی قدر و قیمت ان تجربات کا تجزیہ کرنے سے متعین ہوتی ہے۔ حسرت بھی بڑے اور دلپذیر شاعر ہیں۔ اُن کے یہاں بھی جذبات کی بوقلمونی اور فراوانی ملتی ہے۔ لیکن برنز (BURNS) کی طرح وہ خالص تجربہ سے آگے نہیں بڑھتے۔ ان کی شاعری حسیات کی شاعری ہے۔ وہ صرف حواس کو آسودہ کر کے ہی قناعت کر لیتی ہے۔ اور اس اعتبار سے کیٹس کی نہایت ابتدائی شاعری ہی تک پہنچ کر رہ جاتی ہے۔ غالب کے یہاں رنگارنگی اور فراوانی اتنی نہیں، جتنی ندرت، پیچیدگی اور تنوع پایا جاتا ہے۔ اُن کے یہاں جذبہ کی صداقت اور ذہن کی برق رفتاری بیک وقت ملتی ہیں۔ ان کی شاعری میں تعقل کا عنصر تمام دوسرے عناصر پر حاوی ہے۔

اقبال اور غالب میں ایک اساسی فرق ہے۔ اقبال نے اپنی شعری کائنات کو اس مرکزی اور مربوط نظامِ فکر سے سجایا جسے انہوں نے مختلف سرچشموں سے فیضان حاصل کر کے مرتب کیا ہے۔ وہ سرچشمے یہ ہیں: قرآن کریم، فارسی شعراء، اسلامی اور مغربی مفکرین، جدید علوم اور سائنس۔ غالب کے لئے کوئی نظامِ فکر یا زندگی کی کوئی تفسیر مکمل اور بصیرت افروز تجربہ نہیں بن سکی۔ اس لئے ان کی شاعری ان مجردات کا تعقلی بیان ہے جو انہوں نے اپنے تجربے سے اخذ کئے ہیں۔ یہ بڑی حد تک اس شاعری کے مماثل ہے جسے ہربرٹ ریڈ نے فکر کے جذباتی یا احساساتی ادراک سے تعبیر کیا ہے۔ اور جس کا مجموعی اثر احساسِ حیرت کے پھیلاؤ اور ادراک کے تناؤ کی آمیزش میں مضمر ہے۔ کیوں کہ غالب کا تفکر مطالعہ اور مشاہدہ کے لئے ایسی ہی غیر منفصل قوتِ تحریک رکھتا تھا جیسا کہ حسیاتی تجربہ۔ ایسی شاعری میں جو اعلیٰ ترین شاعری کہی جا سکتی ہے، فکر اور جذبہ کا امتزاج ہوتا ہے۔ انگریزی میں شیکسپیئر، بلیک، ورڈزورتھ، کیٹس اور شیلے کے یہاں ایسی شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔ غالب کی طرح ان سب کے یہاں محسوس فکر ملتا ہے۔ غالب کے استعارے شاعرانہ ہونے کے باوجود ان کے تفکر کا جزوِ لاینفک ہیں۔

غالب کو فلسفیانہ یا مابعد الطبیعیاتی شاعر ان معنوں میں تو ہرگز نہیں کہہ سکتے جن معنوں میں یہ اصطلاح ہم ڈانٹے، لکریشس یا اقبال کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ غالب نے کسی منظم یا منضبط فلسفیانہ نظام کو ہمارے سامنے پیش نہیں کیا۔ نہ ان کی شاعری کا محرک کائنات کا کوئی فلسفیانہ تصور ہے۔ غزل کی داخلی دنیا میں کسی ایسے تعمیری تصور کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کا آرٹ ذوقی اشارے کا ہے۔ غالب کے پاس کوئی متعین اور واضح اسکیم جیسی دانتے

سفیہ ٹامس سے پائی تھی، نہیں تھی۔ لیکن وہ عینیت پسند اور صوفی مشرب تھے ان کا متجسس اور خلّاق ذہن، کائنات اور انسانی زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا اور گو ان کے یہاں ان ہی فلسفیانہ نظریوں کا شعور اور بیان ملتا ہے، جو انہوں نے طوسی، بوعلی سینا، حزنی، عراقی جامی اور رومی سے حاصل کئے تھے۔ اور اُن کے کلام پر فلسفہ اور تصوف کے اُن مہتم بالشان مسلکوں کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں، جو فارسی شاعری کے خمیر میں داخل ہیں۔ تاہم ان کے فکر میں ذاتی انکشاف کی تازگی موجود ہے۔ غالب کے یہاں فلسفیانہ نظام نہیں، فلسفیانہ طرزِ فکر اور انداز بیان ملتا ہے۔

غالب کے کلام میں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن کی معنویت اور فنّی لطافت ذہنِ انسانی کو دعوتِ فکر دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں غالب زندگی اور کائنات کے بھید کو سمجھنے سمجھانے کے لئے بعض معینہ اقدار اور بعض ان تصورات کا سہارا لیتے ہیں، جو فارسی شاعری اور ہندو فلسفہ میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اور جن میں نو فلاطونی عقیدے بھی جذب ہو گئے تھے۔ ان اشعار کا تجزیہ کرنے سے پہلے دو امور کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ اوّل تو یہ کہ غالب نے ان بنیادی تصورات کو ایک فکری نظام میں ترتیب دینے اور سمونے کی کوشش نہیں کی اور دوسرے یہ کہ ان کا اثر غالب کی عملی زندگی پر گہرا یا نمایاں نہیں تھا۔ یہ عقیدے اور نظریے ان کے شاعرانہ شعور کا حصہ بن گئے تھے لیکن عمل کی خارجی دنیا میں ہمیں ان کی قوتِ تحریک کا اندازہ کہیں نہیں ہوتا۔

غالب کے لئے کائنات ایک مسئلہ تھی۔ اس کے اسرار و رموز کی عقدہ کشائی وہ کسی بندھے ٹکے نظریہ یا نظام کی مدد سے نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ ان کا حکیمانہ ذہن انہیں ان مسائل کو مختلف طریقوں سے حل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ان کا دل ایک جامِ جہاں نما اور ان کا تخیل عکس بین ہے۔ اگر وہ جمود یا روائیت پرستی سے مفاہمت کر سکتے تو ایک تنگ مذہبی نقطۂ نظر اختیار کر لینے سے یہ مہم سر ہو سکتی تھی۔ اس سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ تخیل محض کے شیدائی تھے۔ یا ان کے ذہن کی پیچیدگی اور اسلوبِ فکر کو تمدنی عناصر نے متعین نہیں کیا تھا۔ ان کے تفکر کا ایک تاریخی پس منظر ضرور ہے۔ ان کے مطالعہ اور ان عقلی اور ذہنی روایات نے، جو انہیں زیادہ تر فارسی شعرا سے ورثہ میں ملی تھیں۔ ان کے ذہنی عمل کی نشو و نما پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ کوئی مفکر یا شاعر خارجی اثرات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ لیکن مختلف تہذیبی عناصر کو ایک غیر شعوری انتخاب کے ذریعہ اپنے مزاج سے ہم آہنگ کر لینا اور بات ہے۔ اور کسی نظامِ فکر کو تمام و کمال قبول کر کے اس کے مطابق حقیقت کی تاویل اور تفسیر پیش کرنا قطعی مختلف عمل ہے۔ غالب کے کلام میں جو تفکر ہمیں ملتا ہے وہ ان مقدمات کا شاعرانہ اظہار بیان ہے۔ جو ان کے آزاد اور تیز ذہن نے انفرادی تاثر اور تجربہ کی بنا پر ترتیب دیئے ہوں گے۔ فلسفہ کا ایک معرکہ آرا مسئلہ یہ رہا ہے کہ محسوساتِ مادی دراصل کوئی وجود نہیں رکھتے۔ ہم ان کا ادراک بعض ان خواص کی بنا پر کرتے ہیں جنہیں ہم ان کے اندر منتقل کر دیتے ہیں۔ اور جو دراصل ہمارے ذہنی عمل کی کارفرمائی کا نتیجہ ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ ہستی یعنی مادہ کا وجود اعتباری اور نسبتی ہے، اور یہ اضافت انسانی ادراک اور اجسامِ خارجی سے متعلق ہے۔ ایک غزل کے ایک شعر میں جس کی فضا پر انسانی فکر اور انا کی عظمت کا احساس چھایا ہوا ہے غالب نے یوں اظہار رائے کیا ہے ؂

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

موجودہ طبیعات کی تحقیق بھی یہی ہے کہ جواہر لا یتجزیٰ نہیں ہیں۔ اُن کی تقسیم برقی لہروں میں کی جا سکتی ہے۔ برقی لہروں کی اگر مزید تحلیل کی جائے، تو ایتھر تک رسائی ہوتی ہے۔ اور اگر حلقہ ہائے ایتھر کھول دیئے جائیں۔ تو صرف خیال باقی رہ جاتا ہے۔ غالب آدمی کو "محشرِ خیال" سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ وہ خود بھی ذہنی دنیا میں رہتے تھے۔ مادہ اور خیال کے تقدم و تاخر کے سلسلہ میں وہ خیال ہی کی اوّلیت اور سبقت کو تسلیم کر سکتے تھے۔ جدید ترین نقطۂ نظر جو جدلیاتی مادیت میں یقین رکھتا ہے۔ ان کے قیاس میں بھی نہیں آ سکتا تھا اس لئے برکلے اور اسپنوزا کی طرح وہ یہی سوچ اور کہہ سکتے تھے کہ محسوسات

مادہ در اصل خیال ہی کی جلوہ نمائی کا عکس ہیں

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی　　ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

غالب کے یہاں فلسفیانہ خیالات کی بہت سی تہیں ملتی ہیں۔ اُن کے یہاں چونکہ تعقل پر زور ہے۔ اس لئے توحیدِ مطلق کا عقیدہ بھی ملتا ہے حقیقت کے مادی تصور سے اُس زمانہ کا فلسفہ آشنا نہیں تھا۔ کم از کم اسلامی مفکرین مادہ پر اتنا زور نہیں دیتے تھے، جتنا روح پر۔ اُن کے یہاں حقیقت دو خانوں میں منقسم ہی نہیں تھی۔ بلکہ اُس کا روحانی پہلو، مادی پہلو کی نسبت کہیں زیادہ اہم تھا۔ رواقیین کے نزدیک کائنات معقول اور خدا کا مظہر کامل عقلِ کل ہے۔ کائنات کا ادراک عقلِ ربانی کی مدد کے بغیر ممکن نہیں، انسانی عقل کی نارسائی اور ناامی اس معاملہ میں عیاں ہے۔ غالب بھی جب کائنات کی علتِ نمائی پر غور کرتے ہیں۔ تو وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں ؎

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے　　پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اٹھائے نہ بنے

آخری حقیقت کے ادراک کے لئے صرف عقلِ ربانی کی رہنمائی کافی نہیں بلکہ انانیت کی شکست بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ جب تک ہم معرفتِ نفس حاصل کر کے اپنی "انا" پر فتح نہیں پا لیتے، اُس وقت تک ہم بے تعلقی کے ساتھ حقائق پر غور نہیں کر سکتے، یہ احساسِ "انا" ہی در اصل ہمارے ادراک و شعور کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے ؎

ہر چند سبکدست ہوئے بُت شکنی میں　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

اور اگر معرفتِ نفس حاصل ہو جائے، تو پھر یہ احساسِ "انا" شکستِ انانیت میں تبدیل ہو جاتا ہے ؎

نہ گُلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

چونکہ فلسفۂ قدیم میں روح کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس لئے مادہ کو حرکت روح کے سبب سے ہے۔ یہ تصور کہ مادہ میں حرکت خود اس کے وجود سے پیدا ہوتی ہے، اور مادہ خود فعّال ہے، افکارِ حاضرہ کا آفریدہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے پہلی بار غالب کے کلام کی فلسفیانہ بنیادوں کا تجزیہ کیا اور بتایا کہ پرانے فلسفیوں کی طرح غالب کی رائے میں مادہ بے جان اور جامد شئے ہے۔ مادہ کو حرکت میں لانے والی قوت خدا ہے، کیونکہ خدا علۃ العلل ہے۔ اور حرکت کو معین کرتا ہے ؎

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے　　پرتو سے آفتاب کے ذرّہ میں جان ہے

مادہ نہ فعّال ہے اور نہ لافانی روح کا سفر غیر مختتم ہے۔ روح سے مادہ کا وصال فنا کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اس لئے موت ایک منزل ہے۔ اور فنا کا خیر مقدم لازمی۔ فنا کا لفظ غالب کے کلام کی تفسیر میں اشارتی زرخیزی SUGGESTIVE RICHNESS اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے۔ اسے ایک طرح کا تحت نغمہ (UNDER TONE) کہہ سکتے ہیں اس کا ایک سیاسی نشانہ بھی ضرور ہے۔ مگر یہاں ہمیں صرف اُس کے فلسفیانہ مفہوم سے غرض ہے۔ چونکہ ہستی مرکز یا مبداء سے علیحدگی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے وہ در اصل معرضِ خطر میں پڑ جانے سے عبارت ہے۔ قطرہ دریا سے علیحدہ ہو کر وجود میں آتا ہے۔ اس لئے وجود کا خاتمہ جاتا ہی در اصل اُس کی عشرت اور سعادت کا وسیلہ ہے۔ اور فنا ہی اشیائے عالم کی شیرازہ بندی کی ضمانت کر سکتی ہے۔ افلاطونی عقیدہ کے مطابق تمام اشیاء اپنے اصل یا مبداء کی طرف بازگشت کرتی ہیں ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کے لئے چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادپیمائی

غالب کے کلام میں جس حکیمانہ مزاج کا ذکر ہم نے کیا تھا، اُس کی تشریح اُن اشعار سے بخوبی ہوتی ہے جن کا تجزیہ ابھی کیا جا چکا ہے۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں شاعرانہ اندازِ بیان کو برقرار رکھا گیا ہے۔ خیالات یا مجرد تصورات کی شاعری عام طور پر سپاٹ اور بے مزہ ہوتی ہے، مگر غالب کے یہاں ایسے اشعار میں بھی جذبہ کی داخلیت، توانائی اور شدت موجود ہے۔ جس عظیم ترین شاعری کی طرف اشارہ اُوپر کیا گیا تھا۔ اس کی ایک بڑی خصوصیت ہمیں غالب کے یہاں نظر آتی ہے، اور وہ یہ کہ غالب جذبہ اور ذہنی تصورات کے درمیان رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ خیالات کو حسیات میں۔ اور مشاہدات کو ذہنی کیفیات میں تبدیل کر دینے کی صلاحیت بدرجہ اتم رکھتے ہیں۔ فکر اور جذبہ کا جیسا سچا اور حسین امتزاج اور تخیل پیکروں میں مینا کاری اور قوس قزح کی جو بہار ہمیں غالب کے یہاں نظر آتی ہے۔ اس کی مثال اُردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتی، اُن کے بہترین اشعار وہی ہیں۔ جہاں تجربات کا بیان ذہن کو متاثر کرتا چلا جاتا ہے۔ اور جہاں فکر اور جذبہ ایک دوسرے پر عمل اور ردِعمل کرتے ہیں ؎

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال خلد کا اک در ہے مری گور کے اندر کھلا

جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

ہوئے اس مہر وش کے جلوۂ تمثال کے آگے پر افشاں جوہر آئینہ میں مثلِ ذرہ روزن میں
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

اس کی بزم آرائیاں سن کر دلِ رنجور یاں مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی نگاہ مست بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں ، صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق آئینہ باندازِ گل آغوش کشا ہے۔

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو توڑا جو تو نے آئینہ، تمثال دار تھا

غالب کے یہاں عشقیہ جذبات فکر کے معمول میں سے گزرتے ہیں۔ اور ان کی تشکیل اور اظہار منطقی استدلال کے ذریعہ ہوتا ہے۔ غالب صرف جذبات کا تجزیہ ہی نہیں کرتے۔ بلکہ ان میں باہمی تعلق پیدا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، محبت اُن کے لئے کوئی ایسا جذبہ نہیں جو انتہائی فطری طور پر دلکش محاکات کی صورت میں ڈھل جائے۔ وہ ایک گرم اور تیز رو ہے، جو پوری شخصیت کے اندر انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ غالب صرف نرم و نازک اشاروں سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ انتہائی لطیف حسیات و کیفیات کا محاسبہ کرتے اور ان پر استدلال کرتے ہیں۔ اُن کی عشقیہ شاعری کے تانے بانے میں نکتہ آفرینی اور ندرتِ فکر کی جگہ جگہ ابسط نظر آتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان دونوں عناصر کی موجودگی خلوص اور احساس کو بھی منطقی استدلال کا تابع کر دینے سے خیال اور فکر کے لئے نئے افق کھل جاتے ہیں۔ اور روح میں ایک طرح کی بیداری پیدا ہو جاتی ہے جو عشقیہ شاعری میں فکر کی تجرید شاعر کے عدمِ خلوص کی دلیل ہرگز نہیں ہے، یہ اس کی ذہنی پیچیدگی کا ایک بین ثبوت ہے کیوں کہ شاعر زبردستی اپنے فکر کے سانچہ کو جذبات کی آزاد روانی پر عائد نہیں کر دیتا، بلکہ جذبات خود اس راہ سے گزرنے کی وجہ سے ایک نوع کی پختگی اور بلوغت حاصل کر لیتے ہیں۔ اُن کی ناہمواریاں اور خامیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ایک عقلِ کل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شاعری فلسفہ نہیں ہے۔ لیکن بڑی اور قابلِ قدر شاعری ہمیشہ فکر کو ابھارتی ہے۔ اگر شاعر کے مزاج میں تفلسف ہے، تو اس کے مزاج کا یہ رنگ منفرد اشعار کے علاوہ اُس کے محاکات، تخیلی پیکروں اور غزل کی پوری فضا کی تعمیر و تنظیم میں ظاہر ہو کر رہے گا۔ اس میں کچھ شعوری ارادہ کو دخل نہیں ہے۔ کیوں کہ شاعری کے لئے جس ارتکاز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف عناصر خود بخود ایک پُراسرار عمل کے ذریعہ ایک دوسرے کے اندر مدغم ہو جاتے ہیں۔ اور جب یہ عناصر ایک نئی صورت کی حیثیت سے الفاظ کے پیکروں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ تو اُن پر شاعر کے مزاج، اسلوبِ فکر اور نفسانی شعور کی چھاپ لگ جاتی ہے۔ شعر میں ہم مقدماتِ کبریٰ و صغریٰ قائم نہیں کرتے، لیکن اشعار کی تہ میں ایک سبک و نفیس جذباتی منطق ہوتی

سب جیسے سرسری مطالعہ چاہتا ہے نظرانداز کر دے۔ لیکن جب ہم شاعر کے جذبات اور خیالات کی باز آفرینی کی کوشش کرتے ہیں تو فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر غزل گو کے یہاں ایسی چیزوں کی تلاش و جستجو کریں۔ اور ہمیں کامیابی بھی ہو جائے۔ کیوں کہ جس طرح ہم مختلف ذہنوں کی اُن کے رجحانات کے مطابق ایک وسیع تقسیم کرتے ہیں۔ اسی طرح ادب اور شاعری میں بھی ہم مختلف نمونوں اور سانچوں کے ذہن پیش کر سکتے ہیں۔ اسی سے کسی شاعر کے شاعرانہ عمل کی تشخیص کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر کیٹس اور شیلے کی ذہنی ساخت اُن کے شاعرانہ تجربہ کا نمونہ اور ان کا شاعرانہ عمل ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں۔ یہی امتیاز براؤننگ اور ٹینی سن، رومانی شاعروں اور مابعد الطبیعیاتی شاعروں کے درمیان ہے۔ اور مابعد الطبیعیاتی شاعروں اور عہدِ جدید کے شاعروں کے درمیان جو مماثلت ہے۔ وہ محض اتفاقی نہیں ہے۔ اس میں ذہنی آب و ہوا کی یکسانیت اور ہم رنگی کو بھی دخل ہے۔ غالب کا شاعرانہ تجربہ اور شاعرانہ عمل میر اور حسرت کے شاعرانہ عمل سے حیرت انگیز طور پر مختلف ہے۔ ذرا ان اشعار کو پڑھئے۔ تو معلوم ہوگا کہ کس طرح قدم قدم پر استدلال کا یہ انداز جذبات و احساسات کو جِلا دیتا اور انہیں وسعت و معنویت عطا کرتا ہے ؎

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ   سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

دوست دارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم   آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے   زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول   آج ادھر ہی کو رہے گا، دیدۂ اختر کھلا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا   جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے   غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا   بے تکلف داغِ مہ مہرِ دہاں ہو جائے گا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یاد اسدؔ   جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال   دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی   اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

نہ پوچھ بیخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب   کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں   جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب   دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن　　غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں　　شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے　　ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل　　انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

ہاں وہ غرورِ عزّ و نازِ یاں یہ حجابِ پاسِ وضع　　راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے　　یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

نہ اتنا بُرشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ　　مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی　　تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور　　دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اُتر جائے　　نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ　　اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے　　رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لئے

غالب کے جس تعقلی رجحان کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ اس کا ایک مظہر تو وہ استدلالی اندازِ بیان ہے، جس کی وضاحت اشعارِ بالا سے ہو گئی ہوگی۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمیں اُن کے یہاں اکثر جگہ قولِ محال کا استعمال ملتا ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ کسی حقیقت کا اظہار اس صورت سے کیا جائے کہ بظاہر مفہوم عام رائے کے خلاف نظر آئے۔ اور بادی النظر میں قابلِ قبول نہ ہو۔ لیکن پھر جب غور کیا جائے، تو مفہوم مکمل اور معنی خیز ہو۔ یہ بھی ایک طرح کی ذہنی ریاضت ہے۔ اور جہاں اس سے شاعر کی قوتِ فکر کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ وہاں شاعر قاری سے بھی ایک نوع کی دماغی مشقت کا طالب ہوتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ دوئم درجہ کی صلاحیت رکھنے والے فنکار کے ہاتھ میں یہ ملکہ مقصود بالذات بن جائے لیکن کم از کم غالب کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ اس سے جہاں بعض لطیف حقائق کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے۔ وہاں شاعر حیرت و استعجاب کی کیفیت پیدا کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔ غالب کے یہاں شاعرانہ فکر کا یہ کرشمہ اس طرح نمایاں ہوتا ہے ؎

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب　　دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

وفورِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ — کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز — نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اس رجحان کا تیسرا پہلو وہ تشکک ہے، جو بحیثیتِ مجموعی غالب کی شاعری کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ میری رائے میں اس کا ایک ماخذ تو غالب کا وہ فلسفیانہ مزاج ہے، جو کائنات کے اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کسی خاص نظریہ کا سہارا لے کر نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ جو حقیقت کی ذاتی تاویل اور اقدار کی شخصی تشکیل کی جد و جہد میں مصروف رہتا ہے۔ جو علم کی بنیاد کسی قسم کی اذعانیت پر نہیں رکھتا۔ بلکہ فطرت کی کھلی ہوئی کتاب کو اپنے علم تجربہ اور وجدان کی روشنی میں پڑھنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ دوسرا ماخذ اس تشکک کا ہمیں غالب کے دور کے تاریخی تقاضوں میں تلاش کرنا چاہئے۔ غالب نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں، وہ انتشار، عدمِ توازن اور اچانک اور حیرت انگیز انقلابات کا زمانہ تھا۔ پرانا جاگیردارانہ نظام دم توڑ رہا تھا۔ مغرب کی لائی ہوئی سرمایہ داری آہستہ آہستہ اس کی جگہ لے رہی تھی۔ طبقاتی اختلافات اور امتیازات واضح اور گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ پرانے علوم اور عقیدوں کی جگہ نئے علوم اور عقیدوں کی ترویج و اشاعت شروع ہو گئی تھی۔ غالب اپنے دور سے ناآسودہ بھی تھے، نئی تبدیلیوں کا خیر مقدم بھی کرتے تھے، لیکن پھر بھی ان کے آئینۂ ادراک میں مستقبل کی تعمیری صورت پوری طرح جلوہ گر نہیں ہوئی تھی۔ انگلستان میں شروع سترھویں صدی کا زمانہ، انسانی فکر کی تاریخ میں ابتداء سے لے کر اب تک، اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ کیوں کہ اس دور میں انسانی فکر اور تجربہ کی حدود بہت وسیع ہو گئی تھیں۔ اور سائنس کی نئی ترقیوں نے پوری زندگی کے نقشہ کو یکسر بدل ڈالا تھا۔ ہندوستان میں بھی تاریخی شعور تیزی سے بدل رہا تھا۔ اور زندگی کی خاکستر سے ایک نیا شعلۂ جوالہ بلند ہو رہا تھا۔ لیکن یہ اندازہ لگانا آسان نہ تھا کہ آئندہ کیا شکل اختیار کیا ہوگا۔ شاعری میں اس انتشار و انحطاط کا نتیجہ ایک وحدت پسند ادراک کی صورت میں نمایاں ہوا۔ غالب کے یہاں جو تشکک ہے، اس کے عوامل بھی دوسرے ہیں ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے — لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع — گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

غالب کے یہاں احساس اور تخئیلی پیکر کے درمیان جو مکمل ہم آہنگی اور تطابق و توافق پایا جاتا ہے۔ اس کی تشریح ہم اشعار کے ذریعہ کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور خصوصیت ہے، اور وہ یہ کہ غالب نکتہ آفرینی کے بھی بڑے دلدادہ اور استاد ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنا بھی تیز ذہن کا خاصہ ہے۔ ذہن کو ایک خیال سے دوسرے خیال تک پہنچانا، اور مختلف تخئیلی پیکروں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط کرنا کہ اُن کا مجموعی تاثر وحدت کا تاثر ہو، آسان کام نہیں ہے نکتہ آفرینی بھی دو قسم کی ہو سکتی ہے، لفظی اور معنوی۔ لفظی نکتہ آفرینی کا محرک صرف اپنی سطحی قسم کی ذہنی برتری اور سلیقت کا احساس ہوتا ہے۔ معنوی نکتہ آفرینی کا مقصد تجربہ کے متضاد، متخالف اور پیچیدہ عناصر اور پہلوؤں کا ادراک کرنا اور انہیں اپنے شاعرانہ شعور میں سمو کر قاری کے ذہن کے گوشوں کو تابانی بخشنا ہے۔ غالب کے یہاں معنوی نکتہ آفرینی پر زور زیادہ ہے لفظی پر کم۔ اس معاملہ میں وہ مومن سے ممتاز اور برتر ہیں۔ جس طرح مومن کے تجربات، غالب کے تجربات کے مقابلہ میں کم وزن اور پُر تصنع معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح مومن لفظی صناعی یا نکتہ آفرینی پر زور دیتے ہیں۔ غالب معنوی نکتہ آفرینی پر۔ ایک خیال یا تاثر کے مختلف پہلوؤں کو پا لینا اور انہیں اس طرح اظہارِ بیان کی گرفت میں لانا، کہ کسی طرح کی تعقید پیدا نہ ہو، شاعر کی ذہنی فعالیت کی دلیل بھی ہے اور اس کی فنی پختگی کی بھی۔
اگر غالب اپنے معاصر دوستوں کے مشورہ اور اپنی طبیعت کے فطری اقتضا سے اپنے آپ کو بیدل کے اثر سے آزاد نہ کر لیتے، تو اُن کی نکتہ آفرینی میں وہ سلاست گہرائی اور معنویت پیدا نہ ہو سکتی۔ جو اُن کا طرۂ امتیاز ہے، بلکہ ان کے بیشتر اشعار ایک قسم کی ناگوار اور ناپسندیدہ ذہنی ریاضت کا عکس ہو کر رہ جاتے اس خاص میدان میں غالب نے جو نمایاں کامیابی حاصل کی ہے، اس کی وضاحت شاید ان چند اشعار سے ہو سکے۔

بسکہ ہوں، غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا — موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا — بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا — کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے — لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے — جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے — ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے — ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا — اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشہ کہیں جسے ویسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

بجا ہے گر نہ سُنے نالہائے بلبلِ زار کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

غالب کی شاعری پہلو دار شاعری ہے۔ اس سے میرا اشارہ ان اشعار کی طرف نہیں۔ جن کی خوبیاں سب سے پہلے حالی کی گہری بصیرت نے پہچانیں اور نمایاں کیں۔ اور جن کا ذکر عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ گو ایسے اشعار کو بھی جن میں ایک سے زیادہ مفہوم پیدا ہوں، غالب کی قوتِ گویائی کا اعجاز کہنا چاہئے۔ اس سے کلامِ غالب کے دلنشیں تنوع پر روشنی پڑتی ہے۔ میرا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ غالب کے یہاں ایسے اشعار بہت سے ہیں۔ جن کی تفسیر شیکسپیئر کی عظیم ڈرامائی شاعری کی طرح ہم مختلف سطحوں پر کر سکتے ہیں۔ غزل کی شاعری میں جو داخلیت ہوتی ہے۔ اُس کا اچھا یا بُرا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہم یقینی طور پر کسی واقعہ کو کسی شعر کے ساتھ کامل وثوق کی بنا پر تطبیق نہیں دے سکتے۔ لیکن غزل کی فضا، اُس کے زمانۂ تحریر اور خارجی مؤثرات کا وسیع روشنی میں مطالعہ کرنے کے بعد ہم حقیقت کے قریب قریب ضرور پہنچ سکتے ہیں۔ غزل گو شاعر کا شعور بڑا ہی پیچیدہ ہوتا ہے۔ اور غزل میں جو رمزیت ہوتی ہے۔ وہ تعبیر و تفسیر کے کام کو اور بھی مشکل بنا دیتی ہے۔ خارجی حقیقتوں کی، غزل گو شاعر کے ادراک اور شعور میں جذب ہو چکنے کے بعد کچھ ایسی قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے کہ اُن کا اصل رنگ پہچاننا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے بہت سے حجابات کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اور شاعرانہ اشاریت اور خارجی مؤثرات کے درمیان مطابقت قائم کرنے کے عمل میں توہم و احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ یہ تسلیم کرنا گوارا نہیں ہوتا کہ اُردو کے غزل گو شاعر اپنے عہد کے تاریخی، سیاسی اور معاشی میلانات اور تحریکات کا شعور نہیں رکھتے تھے۔ اور اُن کا کوئی عکس اُن کے کلام میں نظر نہیں آتا۔ اگر اس نقطۂ نظر کو صحیح مان لیا جائے۔ تو اُردو غزل کا پورا سرمایہ غرقِ مئے ناب کر دینے کے قابل ٹھہرتا ہے پھر غالب جیسے شاعر کے سلسلے میں تو یہ گمان بھی گناہ کے مترادف ہے۔ غالب کے خطوط سے اُن کے عہد کی ایک حد تک ذہنی اور بڑی حد تک سماجی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ شاعری جو نثر کے مقابلے میں کہیں زیادہ غالب کے حساس اور مرتعش ادراک کی تصویر ہے۔ فضا کی اُس اُداسی، بے چینی اور غمگینی سے مملو ہے جو ایک زوال آمادہ تہذیب نے پیدا کر دی تھی۔ غالب کے اُن اشعار کا تجزیہ جو اُن کے فلسفیانہ تصورات کی نمائندگی کرتے ہیں، اس سے قبل کیا جا چکا ہے، وہ اشعار بھی درج ہو چکے ہیں جن میں بالصراحت اُن کے عشقیہ جذبات اور وارداتِ قلبیہ کا بیان ہمیں ملتا ہے۔ لیکن غالب کے بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جن کی فلسفیانہ سیاسی

اور مخصوص تفسیر ہم بیک وقت کر سکتے ہیں۔ اور یہاں یہ اشعار گنوا رہی ہیں رکھتے ہوئے میں نے غالب کی شاعری کو پہلو دار شاعری کہا ہے۔ ایسے اشعار ان ترشے ہوئے ہیروں کی مانند ہیں جن کی آب و تاب اور دلربائی سے ہم ہر زاویۂ نگاہ سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یک طرفہ شعر کہنا، شاعری کی استعداد کی محدودیت کی، اور یک طرفہ تاویل پیش کرنا، تنقید نگار کی تہی مائگی اور کوتاہ بینی کی دلیل ہے۔ اور خاص طور سے غالب کے معاملے میں۔ صاف اور سادہ شعر کہنے میں خوبی ضرور ہے۔ برائی نہیں۔ خوبی اس لئے کہ شعر میں صفائی، سادگی اور مزہ اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب ایک طرف تو خیالات، جذبات اور مشاہدات سلجھے ہوئے ہوں ان میں پیچیدگی نہ ہو۔ اور دوسرے زبان کے لامحدود، پوشیدہ امکانات اور وسائل پر پوری قدرت حاصل ہو۔ لیکن شعر کی قدر و قیمت مواد کی معنی خیزی اور معانی شعور دونوں سے بیک وقت متعین ہوتی ہے۔ چھوٹے خیالات پر الفاظ کی قبا کا راست بیٹھ جانا، محلِ حیرت نہیں۔ گہرے خیالات، نازک احساسات اور خود بینی مشاہدوں کو ترشے ہوئے تخیل پیکروں میں اس طرح مقفل کر دینا کہ ان سے شاعرانہ اشاروں کی شعاعیں پھوٹ نکلیں یہی بڑی کامیابی اور باقی رہنے والی شاعری کی علامت ہے۔ پھر اس مواد میں ایسی جامعیت اور وسعت پیدا کر دینا کہ انہیں ہر دور میں مختلف صلاحیتیں، رجحانات اور علمی، سیاسی اور نفسیاتی شعور رکھنے والے اپنی اپنی پسند، قوتِ فیصلہ اور بصیرت کے مطابق سمجھ لیں اور سمجھا سکیں، یہ بھی معمولی کام نہیں ہے، اسی لئے کسی بڑے شاعر کے مطالعہ اور محاکمہ کے لئے نہ صرف علم کی ہمہ گیری، بلکہ نقطۂ نظر کی وسعت بھی ضروری ہوتی ہے۔ اگر اس معاملے میں ہمارا زاویۂ نگاہ صحیح مان لیا جائے۔ تو کیا یہ اشعار ان خصوصیات کے، جو ابھی گنائی گئی ہیں، آئینہ دار نہیں ہیں۔

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب — کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب — اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو — آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں — ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے — ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ — دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے — طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

کلامِ غالب کے تعقلی رنگ کا پتہ بعض اُن ترکیبوں سے بھی چلتا ہے، جو اُن کے یہاں تواتر اور تسلسل کے ساتھ استعمال ہوئی ہیں۔ اُن میں بعض یہ ہیں۔ وادیٔ خیال، دامانِ خیال، گذرگاہِ خیال، محشرِ خیال، جوہرِ اندیشہ، زانوئے تامل، پہلوئے اندیشہ، حیرت آبادِ تمنا، سرحدِ ادراک، برگِ ادراک وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان کا ذکر خاص طور سے اس لئے کیا ہے کہ اُن بہت سی شہادتوں کے علاوہ، جو ہم نے اب تک اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کی ہیں۔ ان ترکیبوں کا کلامِ غالب میں منتشر ہونا۔ ہماری دلیل کو اور محکم کر دیتا ہے۔ گو غالب نے اقبال اور دوسرے بڑے شاعروں کی طرح "جامۂ حرف" کی تنگی کی شکایت کی ہے۔ مگر چونکہ الفاظ ہی حقیقت کے ابلاغ کا واحد ذریعہ ہیں۔ اور پیرایہ اور اسلوب بیان کے عمل متوازی چلتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم کسی شاعر کے ادراک کے متعلق کوئی فیصلہ اس کی تراکیب کی اشارتی کیفیت کی بنا پر کریں تو یہ غالباً بے جا نہ ہوگا۔ اور اس بنا پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ غالب کے شاعرانہ فکر اور رنگ پر اُن کی مخصوص ترکیبوں کے استعمال سے کافی روشنی پڑتی ہے

غالب کی ایک اہم خصوصیت جو اُن کے اور سترھویں صدی کے انگریزی شاعر ڈن (DUNN) کے یہاں مشترک ہے۔ رمزِ بلیغ (Conceit) کا استعمال ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ کسی تاثر، جذبہ یا خیال کی تشریح کے لئے ایسی دو اشیاء کے درمیان مشابہت و مماثلت قائم اور ظاہر کی جائے، جو بادی النظر میں ایک دوسرے سے بے تعلق ہوں۔ لیکن جن میں غور کرنے پر ایک گہری اندرونی وابستگی متعین کی جا سکے، اور جس سے ذہن میں کشادگی اور وسعت پیدا ہو۔ رمزِ بلیغ کی تعریف ڈاکٹر جانسن نے یوں کی ہے "یہ غیر مشابہ تخیلی پیکروں کا مجموعہ ہے یا اُن اشیاء کے درمیان، جو بظاہر مختلف ہوں، مخفی مشابہتوں کی تلاش ہے"۔ رمزِ بلیغ میں ایک طرح کے تناؤ اور کشاکش کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہ اس حرکت کی بدولت پیدا ہوتا ہے، جو اُس کے مختلف عناصر کو بالمقابل رکھنے میں برتی جاتی ہے۔ جذبہ اور تخیلی پیکر کے درمیان خلافِ معمول رشتے قائم کرنے کے لئے شاعر اپنے وسیع حافظہ کے لامحدود خزانوں کو کنگھالتا ہے۔ اور دور و نزدیک کی اشیاء کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہے۔ اس طرح ذہنی عادتوں کی مستقل شکست ہوتی رہتی ہے چونکہ تخیلی پیکر کی تعمیر میں

تناسبِ باطنی کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا۔ اس لئے شعر کے پوشیدہ امکانات احساسِ حیرت کے ساتھ بروئے کار آسکتے ہیں۔ رمزِ بلیغ میں اشاریت، حسن آفرینی اور اختصار و بلاغت، تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔ رمزِ بلیغ کی ایک صاف اور سادہ مثال داغ کے اس شعر میں موجود ہے ؎

نہ پوچھئے مرے روزِ سیاہ کی ظلمت
چراغ لے کے جو ڈھونڈھا، تو آفتاب نہ تھا

اغراق تو رمزِ بلیغ کی ہیئتِ ترکیبی میں شامل ہے اور تناؤ بھی۔ مگر تناؤ (Tension) کے بعد ایک نوع کے ڈھیلے پن (Relaxation) کا بھی جو احساسِ حیرت کے ساتھ وابستہ ہے، اس میں پایا جانا لازمی ہے اور اس سے پڑھنے والے کے ذہن میں جو ایک طرح کی جودت اور تنزیہ پیدا ہو جاتی ہے، اور جو انوکھے رشتے اسے بظاہر بے میل اور بے جوڑ اشیاء کے درمیان نظر آنے لگتے ہیں۔ وہی اس کے استعمال کا جواز ہیں۔ باوجود اس کے کہ دور دراز کی اشیاء اور شاعر کی زبردست قوتِ متخیلہ و متفکرہ سے ایک سطح پر جمع کر دی جاتی ہیں، مگر شاعر کی نظر ان میں ایک بنیادی وحدت تلاش کر لیتی ہے۔ اور وہ مختلف تخیلی پیکر جس تانے بانے (Pattern) میں پیوست کر دیئے جاتے ہیں یا اس میں ایک طرح کی استواری پائی جاتی ہے۔ غالب کے کلام میں پیچیدہ مگر کامیاب رمزِ بلیغ کی مثالیں بہت سے اشعار میں ملتی ہیں۔ مثال کے لئے ان اشعار پر غور کیجئے ؎

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

خانہ ویراں سازیٔ حیرت تماشا کیجئے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

چمکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پہ آب
اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

لیکن اگر رمزِ بلیغ میں تخیل کی کارفرمائی پوری طرح موجود نہ ہو اور تخیلی پیکر اور احساس کے درمیان سچا امتزاج پیدا نہ ہو سکے، تو پھر وہ ایک طرح کی عالمانہ سخن سازی یا نکتہ رسی بن جاتی ہے۔ غالب کے یہاں اس تنزل یافتہ رمزِ بلیغ کی مثالیں بھی نایاب نہیں ہیں۔ گو اس سے ان کی قادر الکلامی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ چند مثالیں یہ ہیں

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

دلِ آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

مشابہت کا یہ وسیلہ اختیار کرتے ہیں جو ایک طرح کی صنعت کاری (Artifice) کو دخل ہے، اس سے اس قسم کی شاعری کے تعقلی رجحان کا پتہ چلتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسے کلام کی تہ میں سچی شعریت موجود ہو سکتی ہے۔ خود کالرج کے قول کے مطابق تخیل کے عمل کے لئے بیدار قوتِ فیصلہ درکار ہے۔ اور تخیل اور عقل کے طریقہ ہائے عمل اتنے متضاد و متخالف نہیں ہیں جتنے بظاہر معلوم ہوتے یا سمجھے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تخیل کے عمل میں عقل کی کارفرمائی موجود ہوتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے عقل کی انتہائی بلندیوں تک رسائی تخیل ہی کی مدد سے ممکن ہے۔ غالب اور ڈن دونوں کے یہاں عقل اور تخیل یا فکر اور جذبہ خلط ملط نظر آتے ہیں۔ وہ دونوں فکر کو براہِ راست احساس میں تبدیل کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، "اور فکر کا احساس طرح کرتے ہیں، جس طرح گلاب کی خوشبو کا"۔ اسی خصوصیت کو مشہور انگریزی نقاد ٹی ایس ایلیٹ نے عظیم شاعری کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ اور جب وہ ملٹن کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ادراک کی علیحدگی (Dissociation of sensibility) کا ماتم کرتا ہے، تو اس کا اشارہ بھی غالباً انہی دونوں قسم کی صلاحیتوں کے مابین عدمِ امتزاج یا عدمِ اشتراک کی جانب معلوم ہوتا ہے۔

ایسی شاعری ہمیشہ اس وقت ممکن ہوتی ہے، جب کہ شاعر کے تجربہ کا دائرہ بہت وسیع ہو۔ اور وہ ایک قسم کے تجربہ سے دوسرے قسم کے تجربہ کی طرف ذہنی سفر کر سکتا ہو جس طرح ڈن اپنی عشقیہ نظموں میں متکلمانہ دینیات، قانون، کلاسیکل علم الاصنام، متبرک اور ملوث محبت اور جدید سائنس سے استفادہ کرتا ہے اسی طرح غالب بھی متداول علوم یعنی اخلاق، فلسفہ، طب، قانون اور اسلامی دیومالا سے فیض اٹھاتے ہیں۔ یہ سب ماخذ اصلی اور براہِ راست تجربہ پر مستزاد ہیں۔ ایلیٹ کے بقول عام آدمی کے تجربہ میں انتشار، بے قاعدگی اور جزویت پائی جاتی ہے۔ شاعر کے تجربات، خواہ وہ کتنے ہی مختلف الانواع ہوں، کلیات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے شاعر کو مختلف ذہنی دنیاؤں کی آزادی حاصل ہوتی ہے، اور وہ — حسبِ دل خواہ مختلف علوم سے مستعار شدہ اصطلاحوں میں اپنے بنیادی تجربوں کو بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس سے اس کی شعری کائنات میں ایک نوع کی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے ذہن کی متعدد اور جذب و نفوذ کی استعداد کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور داخلی جذبہ کے گوشے سمٹنے کے بجائے اور وسیع ہو جاتے ہیں۔ ایلیٹ نے کہا ہے کہ شاعر خواہ کسی کی محبت میں اسیر ہو یا اسپینوزا کا مطالعہ کرے، اور چاہے ان تجربوں کا آپس میں یا ٹائپ کی مشین کے شور اور کھانے پکنے کی خوشبو سے کوئی علاقہ نہ ہو، لیکن شاعر کے ادراک میں یہ تمام انمل، بے جوڑ تجربات اپنی بے تعلقی برقرار نہیں رکھ سکتے۔ بلکہ برابر خلط ملط ہوتے رہتے ہیں۔ غالب نے ایک جگہ مادہ کی غیر فنا پذیری کے مسئلہ کو غزل کی زبان میں یوں

بیان کیا ہے ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اسی مفہوم کے بہت سے اشعار ہمیں عمر خیام کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ حیات کے ارتقا کے مسئلہ پر ڈارون سے بہت پہلے مسلمان مفکرین نے غور کیا تھا۔ چنانچہ فارابی، بو علی سینا، ابوالحسن اور مولانا روم کے نام اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔ مگر اُن کے نتائجِ فکر سائنٹفک صحت پر مبنی نہ تھے۔ تاہم انہیں اس امر کا وجدانی احساس ہو گیا تھا کہ حیات بالذات آمادۂ ارتقا ہے۔ تخلیقی ارتقا کا جدید ترین نظریہ فرانسیسی فلسفی برگساں نے پیش کیا ہے۔ جو عقل سے کہیں زیادہ وجدان کا قائل ہے۔ اقبال بھی اس کے نظریہ سے متاثر ہوئے ہیں۔ غالب نے اس سلسلے میں اپنی شاعرانہ بصیرت کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ایک اور شعر میں سائنس کے ایک مسلّمہ اصول سے فائدہ اٹھایا گیا ہے ؎

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

ایک اور جگہ ایک ادنیٰ مشاہدہ کو ذہن میں رکھ کر محبت کی کیفیت پر اس طرح استدلال کیا ہے ؎

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

غالب کو عقلی یا وجدانی طور پر اس کا بھی احساس تھا کہ فضائے بسیط سے اُس طرف اور بھی سیارے موجود ہیں۔ جہاں حیات اسی طرح ارتقا پذیر ہو سکتی ہے جیسے کہ کرۂ زمین پر ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

غالب کے افکار میں ارتقا کا تصور جس کا سلسلہ قدیم مسلمان مفکرین اور برگساں سے ملتا ہے اس کی طرف پہلے پہل عبدالرحمٰن بجنوری نے توجہ دلائی۔ بعض ایسے اشعار بھی غالب کے یہاں ملتے ہیں جن میں طب کے اصولوں سے مستفیض ہونے کی کوشش کی گئی ہے ؎

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل　　خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ　　کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گیا　　اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں　　ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

سب سے زیادہ دلچسپ وہ اشعار ہیں جن میں قانون کی اصطلاحوں میں حدیثِ دل بیان ہوئی ہے۔ ان اشعار کی اہمیت کا اندازہ سرسری مطالعہ سے شائد نہ ہو لیکن اگر ایک خاص پس منظر میں ان پر غور کیا جائے تو ان میں اس اصول کی تشریح نظر آئے گی جو ابھی بیان کیا گیا ہے۔ اصطلاحوں کا استعمال اتفاقی ہے، نہ نیا۔ دراصل ہمیں ان اشعار میں ان تجربوں کا پرتو ملتا ہے جو غالب کو اپنی پنشن کو جاری کرانے کے سلسلہ میں ہوئے تھے جو انہیں چچا کی جاگیر کے سلسلے میں ملی تھی۔ چونکہ اس معاملہ نے غالب کو تمام عمر امید و بیم کی حالت میں رکھا۔ اس لئے ان کے وحدت پسند ادراک میں انگریزی عدالتوں میں حاصل شدہ تجربے محبت کے شدید شخصی اور تخلیقی جذبہ سے مخلوط ہو کر ایک کل میں تبدیل ہو جاتے ہیں ؎

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز　　گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر　　زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال　　ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب　　اشکباری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا　　آج پھر اس کی روبکاری ہے

غالب کا کلام ہندی مغل تمدن کی روح کا عکس پیش کرتا ہے۔ اُن کے یہاں ہمیں انسان کی عظمت کا احساس، زندگی میں نئے امکانات کی تلاش کا جذبہ، تری اور معنی خیز احساسات کو اظہار بیان کی گرفت میں لانے کی کوشش اور کائنات کی دلفریب اور دلکش اشیاء سے لطف اندوز ہونے کی حرص پوری طرح نظر آتی ہے۔ مغلوں کے زمانہ میں یہ تمدن انتہائی بلندیوں تک پہنچ گیا تھا۔ اور اس کا اظہار زندگی کے مختلف شعبوں میں حیرت انگیز تکمیلِ حسن اور نفاست کے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن تاریخی ارتقا کے تقاضوں کے مطابق اس تمدن کے ہیئتِ ترکیبی میں انتشار کے عناصر بروئے کار آنے لگے تھے۔ غالب کے یہاں ہمیں اس تمدن کے انحطاط اور زوال آمادگی کا احساس بھی ملتا ہے اور اس افق کا بھی جس پر نئے مغربی تمدن کا آفتاب بلند ہو رہا تھا۔ غالب نے پرانی تہذیب کی شکست و ریخت کا ماتم بھی کیا ہے، اُن محفلوں کے منتشر ہو جانے پر آنسو بھی بہائے ہیں، جن سے ماضی کا وزن اور وقار وابستہ تھا، اُن بستیوں کے اجڑ جانے کا نوحہ بھی کیا ہے جن میں کبھی زندگی کا ہنگامہ گرم تھا۔ لیکن اس کے باوجود مجموعی طور پر ان کی شاعری کا لہجہ مائل بہ اُمید آفرینی ہے۔ کیوں کہ ایک طرف تو اُن کے مزاج میں وہ توازن اور احساس مزاح تھا، جو زندگی کے گرم و سرد اور محنت و شدت کو ہموار کر سکتا ہے۔ اور دوسری طرف مقبولیت کی وہ استعداد و ضبط کا وہ جوہر اور عینیت پسندی کا وہ سہارا تھا، جو ایک نئے آدم کے ظہور کا منتظر رہتا ہے، زندگی کی نئی تشکیل کو اپنا سکتا ہے، اور فضا کی اُداسی اور افسردگی سے اُمید کی کرنیں کو چھین سکتا ہے۔ غالب کی تصویر کو دیکھ کر دو تاثرات مرتب ہوتے ہیں اول تو یہ کہ اُنہیں اپنی خودی کا گہرا احساس تھا۔ اور وہ اُس زندگی کا شعور رکھتے تھے، جو اُن کے باطن میں ہنگامہ پرور تھی۔ اور دوسرے یہ کہ ان میں دلی زادوں جیسی فہم و فراست اور قوتِ فیصلہ تھی۔ غالب کے یہاں ہمیں جدید ذہن کا بڑا کامیاب نمونہ ملتا ہے۔ اس ذہن کی خصوصیات اس کی ندرت، پیچیدگی، ذہنی اور جذباتی کشاکش کے باوجود توازن، وحدت اور ترتیب قائم کرنے کی طرف میلان کا پایا جانا ہیں۔ اُن کی شاعری میں ایک ذہنی بیداری اور چوکنا پن نظر آتا ہے۔

وزیر آغا

اردو نظم کا مزاج

شعر نے ابتدائے تہذیب سے دو راستے اختیار کئے ہیں ——— ایک وہ جو جذبات کے خارزار سے نکلتا، شخصی میلانات و واردات کے بحرِ زخار میں گم ہو جاتا ہے اور دوسرا وہ جو ناظر کو خارجی زندگی کی تزئین و ترتیب سے روشناس کراتا اور زندگی کے ان گنت گوشوں کے بیانات و تجربات کے مختلف پہلو دکھاتا، ایک سیدھی لکیر کی طرح بڑھتا چلا جاتا ہے جو لوگ شاعری کے پہلے راستے پر گامزن ہوتے ہیں ان کے کلام کے اجزائے ترکیبی ایک نمایاں داخلی اندازِ نظر سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قلب کی گہرائیوں میں جھانکا اور اپنے محسوسات و جذبات سے بساطِ شعر کو سجایا ہے۔ ان کے برعکس جو لوگ شاعری کے دوسرے راستے پر گرم سفر ہوتے ہیں ان کے کلام میں داخلی یا شخصی اندازِ نظر کی بجائے جہانِ رنگ و بو کی مختلف کیفیات و مظاہر کی تصویر پیش کرنے کا ایک واضح رجحان کارفرما نظر آتا ہے اور انہوں نے حتی الامکان مشاہدات کو ذاتی ردِ عمل کی دسترس سے دور ہی رکھا ہے ——— ان کے علاوہ شعرا کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے ان دونوں راستوں کے بین بین سفر کیا ہے اور جس کے کلام میں داخلی اور خارجی اندازِ نظر کا ایک حسین امتزاج پیدا ہوا ہے ان شعرا کی عظمت کا راز یہ ہے کہ انہوں نے خارجی واقعات و تحریکات کو جذبات و احساسات کے آئینے میں سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ ادبِ عالیہ کی تخلیق زیادہ تر اسی گروہ کا کارنامہ ہے۔

ہر چند شعر کی یہ تقسیم محض رسمی ہے اور ایک ہی شاعر کے کلام میں مختلف زاویہ ہائے نظر کے نمونے بھی مل جاتے ہیں پھر بھی شاعری کے مطالعے میں اس تقسیم کی صداقت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ اور اگرچہ زیرِ نظر مطالعہ شاعری کی صرف ایک صنف یعنی نظم تک محدود ہے۔ تاہم جو بات کل پر صادق آتی ہے اس کا اطلاق بڑی آسانی سے "جزو" پر بھی ہو سکتا ہے۔

شعر کی اس تقسیم کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر اردو نظم کا مطالعہ کریں تو آغاز کار میں خارج کی شاعری کی بہتر اور خوب تر مثالیں ملتی ہیں بے شک اس زمانے میں لکھی گئی بعض مثنویاں کے حصے شاعر کے ذاتی ردِ عمل کے آئینہ دار ہیں تاہم اردو نظم کے اس ابتدائی دور کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ یہاں بحیثیتِ مجموعی خارجی زندگی کے اظہار و بیان کو زیادہ توجہ ملی۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں غزل نے احساسات و جذبات کے اظہار کا منصب تقریباً اپنا لیا تھا اور جب شعرا خود سے باہر جھانکنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے تو لامحالہ انہیں شاعری کی دوسری اصناف خاص طور پر نظم کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ چنانچہ یہ امر قابلِ غور ہے کہ جب اس دور کے عظیم شاعر میرؔ غزل کہتے تھے تو ان کا ازلی و ابدی غم شخصی واردات کا لبادہ اوڑھ کر رہ جاتا تھا۔ تاہم جب وہ "شہر آشوب" لکھتے تھے تو یہی غم ملکی، سماجی اور اخلاقی اقدار کے انحطاطی رجحانات پر طنز کی صورت اختیار کر جاتا تھا۔ یہی حال سوداؔ کا تھا جو غزل کے زیرِ اثر جب تک رہتے تھے تو

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کہتے اور کٹورا لئے پھرتے تھے لیکن جب وہ شہر آشوب یا ہجو لکھتے تھے تو ان کی طنز میں بلا کی نشتریت پیدا ہو جاتی تھی ——— بحیثیت ... میر نہاں خانۂ دل کے شاعر تھے اور سوداؔ کا قلم خارجی زندگی کی عکاسی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ غزل میں میرؔ کا مقام سوداؔ سے بلند ہے۔ اور

شہر آشوب کے میدان میں سوداؔ کو میرؔ پر سبقت حاصل ہے۔ بہرحال یہاں میرؔ اور سوداؔ کی شاعری کا تقابل مقصود نہیں کہنے کی بات صرف یہ ہے کہ اردو نظم اپنے آغاز میں خارج کی شاعری تھی اور اس ضمن میں میرؔ جیسا دروں بیں شاعر بھی اسی روش پر گامزن تھا۔ اسی دوران میں نظم کے اس خارجی رجحان کو نظیرؔ اکبر آبادی نے وسعت دی اور نظم کے دامن میں بہت سے نئے موضوعات کا اضافہ کیا۔ خاص ملکی تہواروں مثلاً ہولی، بسنت، دیوالی وغیرہ پر نظیرؔ نے ایسی بے شمار نظمیں لکھیں جن میں اجتماعی مسرت و بہجت کا اظہار تھا۔ یہ نظمیں داخلی انداز نظر کی ترجمان نہیں تھیں اور یہاں شاعر کی حیثیت محض ایک ناظر یا داستان گو کی سی تھی جو تصویریں پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ ان نظموں کے رنگوں میں شوخی اور صناعی تو ہے لیکن گہرائی کا فقدان ہے اور اس لئے یہ نظم کے اس خاص رجحان کا کوئی نہایت بلند پایہ نمونہ پیش نہیں کرتیں پھر بھی نظیرؔ اکبر آبادی کو یہ تاریخی حیثیت منفرد حاصل ہے کہ اس کے کلام میں پہلی بار نظم کی طرف ایک بھرپور رجحان نے جنم لیا۔

اردو نظم میں خارج کی شاعری کا رجحان کچھ اور صورتوں میں بھی نمودار ہوا مثلاً میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" یا شنکر نسیم کی "گلزارِ نسیم" میں ہمیں پہلی بار رومانی کہانیوں کو نظم کے قالب میں ڈھالنے کی لفیس کاوشیں ملتی ہیں۔ یہ نظمیں خارجیت کے زمرے میں اس لئے شامل ہیں کہ یہاں شاعر کے اپنے محسوسات کی بجائے زندگی کے دوسروں کرداروں کے جذبات و اعمال کی تصویر کشی کے نمونے ملتے ہیں اور خود شاعر کی حیثیت اس داستان گو کی سی رہتی ہے جو اپنی چرب زبانی سے ناظر کا دل موہ لیتا اور ایک دلکش فضا کی تعمیر سے اسے کیسو سہوت کر دیتا ہے۔ ان نظموں میں وہ سب کچھ ہے جو اس قبیل کی نظموں میں ہونا چاہیئے ——— جذبات نگاری، کرداروں کی پیش کش، داستان کا تسلسل اور بات کرنے کا ایک مخصوص انداز ——— وہ انداز جس میں ایجاز و اختصار کے علاوہ غنائیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے اور جس کا نغماتی زیر و بم ناظر کے احساسات کو آنِ واحد میں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

نظم میں خارجیت کے اس رجحان کے تحت منظوم کہانیوں کے علاوہ امانت لکھنوی کے ڈراما "اندر سبھا" کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ ڈراما میں کرداروں کی کشمکش، رجحانات کا تصادم اور واقعات کی ایک مربوط و مسلسل پیش کش شاعر کے غیر شخصی طریق کار ہی کی غماز ہے۔ بے شک منظوم کہانی یا منظوم ڈراما میں داخلیت کا رجحان اس حد تک موجود ہوتا ہے کہ یہاں دوسرے کرداروں کے احساسات و جذبات میں خود شاعر کے احساسات و جذبات کا پرتو دکھائی دیتا ہے تاہم بحیثیت مجموعی یہ شاعری، شاعر کی داخلی کیفیات کی بالواسطہ انداز سے مظہر نہیں ہوتی اور نتیجتاً اس کا مزاج خارج کی شاعری سے زیادہ ہم آہنگ ہوتا ہے۔

اردو نظم میں خارج کی شاعری کا دوسرا رجحان مرثیہ سید الشہدا کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ رومانی داستانوں کی طرح یہ مراثی بھی داخلی کیفیات کے آئینہ دار ہونے کی بجائے ایک خاص واقعے کو اس کی تمام تر تفاصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور ان کا دائرۂ عمل پس منظر کی تشکیل، کرداروں کے اعمال اور واقعے کے المیہ پہلوؤں تک محدود رہتا ہے۔ چنانچہ یہ مراثی ان مرثیوں سے قطعاً مختلف ہیں جو واقعے کی قربت کے باعث ذاتی نقصان کے احساس سے لبریز ہوتے ہیں اور جن کا بقول مولانا صلاح الدین احمد مرحوم "سرچشمہ عقیدت یا امید اجر و جزا نہیں بلکہ محض دل کی پکار ہے"۔ اردو میں مرثیہ سید الشہدا کے سلسلے میں میر انیس اور مرزا دبیر کے کارناموں کا از سرِ نو جائزہ لینے کی ضرورت نہیں تاہم اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ ان مرثیوں میں شوکتِ الفاظ اور لطافتِ بیان کے علاوہ ایک واضح ڈرامائی کیفیت بھی موجود ہے اور مرثیہ گو شعرا نے واقعات کربلا کے بیان میں پس منظر کی نہایت اعلیٰ عکاسی بھی کی ہے۔ خاص طور پر میر انیس کے کلام میں صبح و شام کے مناظر کا بیان خارج کی شاعری کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

سرسید احمد کی انقلابی تحریک سے قبل اردو نظم کے دامن میں خارج کی شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں وہ اگرچہ اجتہادی روش کی حیثیت رکھتے ہیں تاہم ان کا میدان عمل کچھ زیادہ وسیع نہیں اور نہ ان میں کسی باقاعدہ تحریک کے خدوخال دکھائی دیتے ہیں لیکن سرسید احمد کی قیادت میں قوم کے مزاج میں جو تبدیلی پیدا ہوئی اس کا لازمی نتیجہ نہ صرف اردو نظم کی تدریجی وسعت کی صورت میں نمودار ہوا بلکہ نظم نے غزل کی طرح ایک باقاعدہ ادبی تحریک کا انداز بھی اختیار کر لیا

اس ادبی تحریک کے معاون محمد حسین آزاد، مولانا حالی اور اسمٰعیل میرٹھی تھے اور اکابرِ علم و ادب نے جیسے جوش سے اخلاقی قومی اور فطری نظمیں لکھنے کا آغاز کیا۔ اور اس سلسلے میں بعض معرکے کی نظمیں بھی تخلیق کیں۔ لیکن چونکہ بنیادی طور پر نظم کی اس تحریک کے پس پشت زیادہ تر خارجیت کی روایت موجود تھی، لہٰذا ان نظموں کا موضوع اور انداز بھی داخلی کیفیات سے بیگانہ ہی رہا۔ لیکن شاید یہ زمانہ نظم کی ترویج و ارتقا کے لئے نہایت ساز گار تھا کہ سرسید کے مخالفین نے بھی کسی و کسی حد تک نظم کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے آلۂ کار بنایا۔ چنانچہ اکبر الٰہ آبادی کی نظموں میں (غزل سے قطع نظر) طنز کا ایک ایسا واضح رجحان نظر آتا ہے جو سودا اور میر کی طنز کی بہ نسبت ایک جداگانہ کیفیت کا حامل ہے اور شبلی کی نظموں میں حالاتِ حاضرہ اور سیاسی و ملکی معاملات کے شعر کے قالب میں ڈھالنے کی اجتہادی روش کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ سرسید کی تحریک سے متاثر ہو کر جو نظمیں منصۂ شہود پر آئیں یا اس تحریک کی مخالفت میں نظم کا جو سرمایہ معرضِ وجود میں آیا، بنیادی طور پر یہ خارج کی شاعری کا ہی ایک سلسلہ تھا۔ سیاسی نظموں کا تو خیر موضوع ہی غیر شخصی ہوتا ہے لیکن طنزیہ نظموں کے بارے میں بھی یہ بات قابلِ غور ہے کہ طنز نگار ہمیشہ خود کو ان افعال و حرکات سے بلند و بالا خیال کرتا ہے جنہیں وہ خندہ استہزا میں اڑاتا ہے اور تحریۂ واقعات و افعال کا جائزہ لیتے وقت اس پر جذب و کیف کی بجائے احتساب و تنقید کے رجحانات زیادہ غالب ہوتے ہیں۔ اس زاویے سے دیکھیں تو شبلی کی سیاسی اور اکبر کی طنزیہ نظمیں خارج کی شاعری ہی کے زمرے میں نظر آئیں گی۔

بیسویں صدی کے خمسِ اول میں اکبر الٰہ آبادی اور شبلی نعمانی کے علاوہ اردو نظم میں خارج کی اس شاعری کے سلسلے میں تین نام پیش پیش ہیں ——— ظریف لکھنوی، ظفر علی خاں اور جوش ملیح آبادی۔ ان میں سے ظریف لکھنوی نے تو اکبر الٰہ آبادی کے چراغ ہی سے اپنا چراغ جلایا اور اودھ پنچ کے دوسرے ادبا سے وابستہ ہو کر طنزیہ نظمیں پیش کرتے رہے ان کا روئے سخن مجلسی اور سماجی ناہمواریوں کی طرف تھا۔ دوسرے شاعر ظفر علی خان تھے جنہوں نے شبلی نعمانی کے تتبع میں سیاسی نظمیں لکھنے کا آغاز کیا اور دوسری جنگِ عظیم تک برابر لکھتے چلے گئے۔ تیسرے شاعر جوش ملیح آبادی تھے جو بیسویں صدی کے خمسِ اول میں ابھرے اور اس کے بعد سے لے کر آج تک اپنی مخصوص روش پر گامزن رہے ہیں۔ نظم میں جوش کو یہ امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ ان کے ہاں خارج کی شاعری کے تقریباً تمام رجحانات یکجا ہو گئے ہیں چنانچہ ان کی نظموں میں فطری مناظر کی تصویر کشی سے لے کر مجلسی اور سماجی ناہمواریوں پر طنز تک اور قومی و سیاسی مسائل پر تبصرے سے لے کر واقعاتِ کربلا کے بیان تک موضوعات کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے لیکن بالعموم شاعر کے ردِ عمل کی صورت داخلی نہیں ہے چنانچہ جوش کی ان نظموں کا مزاج بھی غیر داخلی ہے جو بظاہر جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لئے وقف ہیں۔ جوش کی نظم نگاری کا یہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کے کلام میں داخلی یا خارجی رجحان کا تسلط شاعر کی افتادِ طبع اور ذہنی ساخت پر منحصر ہوتا ہے اور وہ خود وہی نہج اختیار کرتا ہے جو اس کی فطرت اسے دکھاتی ہے۔

لیکن اس ضمن میں جوش کا کلام حرفِ آخر نہیں ہے کیونکہ جدید اردو نظم میں داخلیت کے ایک واضح رجحان کے باوصف ہمیں خارج کی شاعری کی بہت سی نفیس کاوشیں ملتی ہیں اس سلسلے میں منظوم کہانی کا احیا ایک نہایت قابلِ قدر اقدام ہے اور بعض جدید شعرا نے اس میدان میں نئے نئے تجربات بھی کئے ہیں۔ منظوم کہانی کے سلسلے میں قیوم نظر نے ایک قدم اٹھایا تھا۔ لیکن "پون جھکولے" کی تخلیق کے بعد وہ کچھ ایسے نادم ہوئے کہ پھر ان کے قلم سے کوئی منظوم کہانی نہیں نکلی۔ البتہ جدید اردو نظم میں طنز کا ایک بھرپور رجحان ضرور نمودار ہوا ہے۔ شاید حالات کی بیمابیت اور معاشرے کی لڑکھڑاہٹ اس کی نمود و ارتقا کے لئے سازگار تھی۔ کہ ہمیں اس دور میں بہت سی اعلیٰ تخلیقات دکھائی دیتی ہیں۔ راجہ مہدی علی خان، مجید لاہوری، سید محمد جعفری، محمود سرحدی اور ضمیر جعفری کے ہاں طنز کا مزاج بدل گیا ہے اور اس میں توازن اور اعتدال کے علاوہ ایک ایسی وسعت پیدا ہوئی ہے جو اس سے قبل مفقود تھی۔ جدید اردو نظم میں خارج کی شاعری کے کچھ اور اچھے تجربات بھی کئے گئے ہیں، مثلاً عام گھریلو واقعات کی تصویر کشی میں شاد عارفی اور علی منظور نے بالکل نئے انداز سے کچھ خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔

اور احمد ندیم قاسمی نے اپنی بعض نظموں میں بڑی چابک دستی سے خارجی منظر پر نا تمام کہانیوں کے نقوش واضح کئے ہیں۔ اسی طرح جہاں نثار اختر، علی سردار جعفری، ساحر اور دوسرے بعض شعرا نے نظم کے ذریعے مجلسی یا معاشی غیر ہمواریوں کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے۔ بے شک وہ کہیں کہیں خطابت کی حدود تک بھی جا پہنچے ہیں تاہم بحیثیتِ مجموعی ان کی نظموں نے شعر کے موضوع میں یقیناً وسعت پیدا کی ہے۔ پھر جعفر طاہر اور ابن انشا ہیں جنہوں نے غیر شخصی انداز میں تہذیبی اور فکری مسائل پر طویل نظمیں لکھنے کا آغاز کیا ہے۔ ان نظموں میں ڈرامائی کیفیت بھی ہے اور داستان کا تسلسل بھی۔ اس کے علاوہ یہاں پس منظر کی عکاسی بھی موجود ہے۔ اندازِ بیان میں بعض اوقات سامنتی شوکتِ الفاظ اور کروفر اور بعض اوقات داستان گو کا سادھیما پن اور تحمل عیاں ہے۔ بحیثیتِ مجموعی یہ تجربات اردو نظم میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

خارجی شاعری کے برعکس نظم میں داخلیت کا رجحان شاعر کی خالص شخصی واردات تک محدود رہتا ہے اور اگرچہ یہ اپنے ارتقا میں انسانی قدروں کے احساس و اظہار تک بھی جا پہنچتا ہے تاہم بنیادی طور پر اس کے دائرہ عمل میں وہی نظمیں شامل ہیں جو شاعر کے خالص جذباتی ردعمل کی پیداوار ہوتی ہیں اور جن کے ذریعہ وہ اپنے نہاں خانہ دل کی باتیں ناظر تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔ ایسی نظموں میں دیکھنے کی بات محض یہ نہیں ہوتی کہ شاعر نے اپنے مافی الضمیر کو کامیابی کے ساتھ منتقل کیا ہے یا نہیں بلکہ یہ بھی کہ اس کے احساسی تجربے میں عمق اور بہت کہاں تک موجود ہے؟ دوسرے لفظوں میں ایک کامیاب داخلی نظم کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ اس میں ناظر کو اپنے ہی احساسات و جذبات کی عکاسی نظر آئے اور اسے گمان ہو کہ جو بات کہی گئی ہے وہ پہلے ہی سے اس کے دل میں موجود تھی۔

مگر اردو نظم میں داخلیت کا یہ رجحان آغاز کار ہی سے نظر نہیں آتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی سے قبل کے دور میں ہمیں اس رجحان کے کچھ نشانات ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً مرثیے ہی کو لیجئے جو اس رجحان کی اولین صورتوں میں سے ایک ہے۔ مرثیہ سے مراد وہ مرثیہ نہیں جو واقعاتِ کربلا سے متعلق ہے بلکہ وہ جو شاعر نے کسی قریبی عزیز، دوست یا شخصیت کی موت پر لکھا اور جس کا محرک ذاتی نقصان کا شدید احساس تھا۔ اردو ادب میں اس کی اولین مثال مومن کا وہ شہرہ آفاق مرثیہ ہے جو اس نے اپنی محبوبہ کی موت پر لکھا اور جس کے پس پشت خلوصِ بے ریا کا ایک سمندر موجزن ہے۔ اس نوحے کے مطالعہ سے شاعر کے دلِ صد پارہ میں ہجومِ غم کا شدید احساس ہوتا ہے اور یہ بات اس کی بے نظیر کامیابی پر دال ہے۔ اس سلسلے میں اگلا مشہور نوحہ غالب کا ہے جو انہوں نے عارف کی موت پر لکھا اور جو ذاتی نقصان کے احساس سے یکسر لبریز ہے۔ اسی طرح غالب کی موت پر حالی کا لکھا ہوا مرثیہ ہے جو اپنی طوالت کے باوجود مرثیے کے اس خاص رجحان کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ حالی کے بعد نظم کی اس خالص داخلی رو کے بہت سے اچھے نمونے ملتے ہیں خاص طور پر سرور جہان آبادی، علامہ اقبال اور تلوک چند محروم کے مرثیے ہمارے ادب میں ابدی مقام حاصل کر چکے ہیں۔ مرثیہ کا یہ رجحان دورِ جدید میں بھی نظر آتا ہے۔ حفیظ ہوشیارپوری، علی منظور، حفیظ جالندھری، اور جگن ناتھ آزاد کے علاوہ اور بھی بہت سے شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور بڑی خلوص سے اپنے دل کے سوز و درد کو الفاظ میں منتقل کیا ہے۔

اردو نظم میں داخلیت کی دوسری صورت نیچر شاعری کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظم کے ابتدائی دور میں نیچر شاعری محض مناظر کی تصویر کشی تک محدود تھی اور شاعر کے شخصی اور ذاتی ردعمل کو نظم کے تاروپود میں کچھ زیادہ دخل حاصل نہیں تھا اور اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ اردو کی نیچر شاعری ایک عرصہ دراز تک اسی نہج پر رواں دواں رہی اور نیچر اور شاعر کے مابین کوئی ایسا جذباتی یا روحانی ربط استوار نہ ہو سکا جو نیچر شاعری کے لئے از بس ضروری ہے۔ تاہم اس سلسلے میں دو ایسی باتیں یقیناً سرزد ہوئیں جن کے باعث ہم بظاہر خارجیت کی اس رو کو داخلی رجحان ہی کے تحت مشتمل کرتے ہیں۔ ان میں سے پہلی بات تو نیچر شاعری کا وہ رجحانِ خاص ہے جو اپنے ملک کی سرزمین کے لئے والہانہ لگاؤ کے باعث معرضِ وجود میں آیا اور جس کے زیرِ اثر بعض شعرا خاص طور پر چکبست

سرور، اقبال، محروم، مہر، کرپال سنگھ بیدار اور اندرجیت شرما نے وطن دوستی کے جذبات کا اظہار کیا۔ بظاہر یہ نظمیں وطن عزیز کے زمینی حسن کی دلآویز تصویریں بھی ہیں لیکن دراصل ان کی قدر و قیمت شاعر کی جذباتی پیش قدمی ہی کے باعث ہے چنانچہ ان نظموں میں اردو شعرا نے محض اپنے وطن کی سرزمین — اس کے پہاڑوں، وادیوں، دریاؤں اور مرغزاروں کے حسن لازوال کی عکاسی نہیں کی بلکہ ان جذباتی روابط کی نقاب کشائی بھی کی ہے جو ان کے اور سرزمین وطن کے مابین استوار ہو چکے ہیں — دوسری بات اگرچہ بڑی دیر کے بعد پیدا ہوئی ہے تاہم یہ ہماری نیچر شاعری میں داخلی انداز نظر کی نمو پر دال ہے اور اس کے طفیل اردو نظم میں فطرت کی طرف شخصی ردعمل کے نقوش ابھرنے شروع ہو گئے ہیں۔ میری مراد اس نیچر شاعری سے ہے جو عباس بیگ محشر کی سعی سے معرض وجود میں آئی ہے۔ اور جس میں فطرت کے خارجی حسن کی عکاسی کے علاوہ نیچر کی حیات تابناک اور شاعر کی روح مضطرب میں ایک جذباتی اور روحانی رشتہ قائم ہوا ہے۔ نیچر شاعری کا یہ رجحان اب مقبول ہو رہا ہے اور بعض جدید نظم گو شعرا کے ہاں اس کے نقوش صاف نظر آنے لگے ہیں۔

اردو نظم میں داخلیت کا تیسرا رجحان ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور دراصل داخلی شاعری اپنی ابتدائی صورت میں محض اسی ایک رجحان کا نام تھا میرا اشارہ ان جذبات و احساسات کی طرف ہے جو محبت کی پیداوار اور تغزل کی جان ہوتے ہیں اور ان نظموں کی طرف ہے جن میں شاعر اپنی نرم و نازک آرزوؤں کا اظہار کرتا اور اپنے غموں اور مسرتوں میں ہمیں برابر کا شریک کر لیتا ہے۔ اس قسم کی نظموں میں دیکھنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ شاعر نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے ان کی نوعیت کہیں محض انفرادی تو نہیں؟ یعنی کیا ان جذبات میں عمومیت ہے یا ان کا دائرہ عمل یکسر محدود ہو کر رہ گیا ہے؟ کیونکہ اصل جذبات کا ایک محدود چار دیواری سے نکل کر انسانیت کی وسیع و کشادہ فضا میں آنا ہی ان کی ادبیت کا ضامن ہو سکتا ہے اور کوئی بھی ایسی داخلی نظم زندہ نہیں رہ سکتی جس میں ناظر کو اپنے ہی احساسات و جذبات کا پرتو صاف نظر نہ آ جائے

اردو شاعری کے طویل ابتدائی دور میں داخلیت کی یہ رو زیادہ تر اردو غزل کے تار و پود میں رچی ہوئی نظر آتی ہے اور خارجی عناصر کے مطالعہ کے لئے نظم کے حصے کی طرف ایک واضح رجحان دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں اگر رومان کی کوئی چاشنی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ کسی رومانی داستان کے بیان تک ہے اور اگر احساسات و جذبات کی ترجمانی ہے تو وہ داستان کے کرداروں کے جذبات و احساسات کی عکاسی تک ہے۔ لیکن ان نظموں میں شاعر نے براہ راست اپنی آرزوؤں، امیدوں یا مسرتوں اور شکستوں کا اظہار نہیں کیا۔ بے شک ولی یا میر کی مثنویوں میں بعض ٹکڑے اس کلیے سے مستثنیٰ نظر آتے ہیں لیکن ان کی حیثیت بھی کسی واضح رجحان کی سی نہیں۔ میری رائے میں نظم سے تغزل کے اخراج کا باعث آغاز کار میں تو یہ تھا کہ شعرا محض خارجی واقعات یا مناظر کے لئے نظم کو استعمال کرنا چاہتے تھے لیکن بعد ازاں سر سید احمد کی تحریک کے زیر اثر نظم کو انتقاماً بھی اخلاقی، سیاسی یا فطری موضوعات کے لئے وقف کر دیا گیا تا کہ شاعری کو غزل اور تغزل سے نجات مل سکے۔

نتیجۃً ہماری نظم ایک عرصہ دراز تک تغزل سے ناآشنا نظر آتی ہے۔ تا آنکہ عظمت اللہ، حفیظ جالندھری اور بعض دوسرے شعرا کے ہاں اس روش کے نقوش ابھرنے شروع ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں اختر شیرانی کی نظموں کا تذکرہ خاص طور پر ضروری ہے کہ ان کے ہاں پہلی بار اس رجحان نے بھرپور صورت اختیار کی اور شاعر نے دلی کیفیات کو بغیر کسی —— یا تصنع کے الفاظ کا لباس پہنایا۔ تاہم ان سب شعرا کے ہاں جذبے کی وہ گہرائی نظر نہیں آتی جو دور جدید کے بعض نظم گو شعرا کو حاصل ہوئی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ دور جدید کی پیچیدگیوں نے براہ راست شعرا کے اذہان پر نئے نئے اثرات مرتسم کئے اور ان کے جذبات محبت میں بھی سیمابیت اور پیچیدگی پیدا کر دی۔ چنانچہ فیض کے ہاں جو جذبے کی شدت ہے اور جس کا انہوں نے "انتظار" اور "خدا وہ وقت نہ لائے" میں اظہار کیا ہے۔ یا میراجی کے ہاں جو جذبے کی گہرائی اور پیچیدگی ہے وہ متقدمین یا متوسطین کی نظموں میں موجود نہیں اسی طرح دور جدید کی محبت پر قنوطیت نے جو تسلط قائم کیا ہے اور جس کے تحت اختر الایمان، یوسف ظفر، جذبی اور ضیا جالندھری کی نظموں میں ایک عجیب سی یاس انگیز کیفیت پیدا ہوئی ہے وہ بھی ہماری نظم کے میدان

میں ایک بالکل نئی چیز ہے۔

اردو نظم میں داخلیت کا یہ رجحان ایک اور صورت سے بھی نمودار ہوا ہے —— میری مراد اس صنفِ ادب سے ہے جسے اصطلاحِ عام میں "گیت" کہتے ہیں۔ بے شک بادی النظر میں گیت ایک علیحدہ حیثیت کا حامل ہے تاہم ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے اسے نظم ہی کے زمرے میں شمار کرنا چاہیئے ویسے گیت از خود ہمارے ادب میں نہیں آیا بلکہ بقول شاعر "لایا گیا ہے" اور یہ اردو پر ہندی کے اثرات کا مظہر بھی ہے علاوہ ازیں گیت اردو ادب میں لیرک (LYRIC) کی سادہ ترین اور خالص ترین صورت ہے اور یہ بنیادی طور پر مرد یا عورت کے ان جذباتِ محبت پر مشتمل ہوتا ہے جو زندگی کے دوسرے افکار و مسائل سے ملوث ہوئے بغیر منظرِ عام پر آتے ہیں۔ گیت لیرک (LYRIC) کے اس تقاضے کو بھی پورا کرتا ہے کہ اسے بنیادی طور پر موسیقی کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اردو شاعری میں گیت کی آمد کے سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہے کہ اول اول سٹیج اور ڈراما کا سہارا لے کر وارد ہوا تھا لیکن اس زمانے نے اسے ایک صنفِ ادب کے طور پر تسلیم نہیں کیا لہذا اس جب عظمت اللہ نے گیت میں نکھار پیدا کیا اور ساغر، حفیظ، اندرجیت شرما اور الطاف مشہدی نے اسے کومل جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا تو اس کے خلاف سارا جذباتی ردِ عمل از خود ختم ہو گیا۔ لیکن اس زمانے تک گیت میں وہ معنوی گہرائی پیدا نہیں ہوئی تھی جو اردو ادب کے دورِ جدید میں میراجی، مقبول حسین احمد پوری، طفیل ہوشیار پوری، عبدالمجید بھٹی، قیوم نظر اور مجید امجد نے پیدا کی اور یہ دراصل ان ہی شعرا کا حصہ ہے کہ ان کے ہاتھوں گیت کے خالص رومانی پیکر میں آفاقی رنگ پیدا ہوا۔ اور گیت نے شخصی غم یا مسرت کے علاوہ انسانی غم یا مسرت کی نقاب کشائی کا منصب بھی اپنا لیا۔

آخر میں مجھے خالص داخلیت کی اس رَو کا بھی ذکر کرنا ہے جس نے اردو نظم کے جدید ترین دور میں ایک بالکل نئی نہج اختیار کی ہے اور جس کے باعث اردو نظم میں ایک بنیادی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اس نہج پر بیشتر ایسی نظمیں نظر آتی ہیں جن میں شاعر نے اپنی زندگی کے کسی ایک تجربے کو اس کی تمام تر جذباتی اور احساسی کیفیتوں کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن اپنی پیشکش میں نظم کی شعریت کو فنا نہیں ہونے دیا۔ علاوہ ازیں ایسی نظموں میں جذبے کے تجزیاتی مطالعہ کا رجحان بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ جہاں عام نظموں کی مثال TWO DIMENSION FILM کی ہے وہاں یہ نظمیں 3 D FILM کی طرح ہیں چنانچہ ان سے پوری طرح محظوظ ہونے کے لئے ایک خاص قسم کے چشمے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات ایسی نظمیں غیر پختہ طریقِ اظہار کے باعث ابہام کی نمود کا موجب بھی بنی ہیں اور بعض بزرگوں نے بجا طور پر اعتراض کیا ہے کہ ان میں سے کئی ایک نظمیں شاعر کے مافی الضمیر کو ناظر تک پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ تاہم جب کسی شاعر کو اس ضمن میں کامیابی حاصل ہوئی ہے تو اس نے دنیائے ادب کے سامنے ایسی نظم پیش کر دی ہے جو اپنے قیمتی داخلی عناصر اور اپنے تجربے اور احساس کی پردہ در پردہ کیفیات کے باعث قطعاً منفرد دکھائی دیتی ہے۔ جدید ترین دور کی بعض نظمیں مثلاً میراجی کی "سمندر کا بلاوا" فیض کی "تنہائی" ندیم قاسمی کی "ناگزیر" راشد کی "خودکشی" اور یوسف ظفر کی "وحشت" اس ضمن میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

اور اب نظم میں داخلی اور خارجی عناصر کے امتزاج کا مسئلہ! غور کیجیے تو نظم میں امتزاج کی کیفیت کسی خاص دور تک محدود نہیں اور نہ کسی شعری تخلیق کے بارے میں یہ حکم ہی لگایا جا سکتا ہے کہ اس پر محض داخلیت یا محض خارجیت کا تسلط ہے۔ وجہ اس کی غالباً یہ ہے کہ شاعر کی داخلی دنیا اور خارجی ماحول میں کوئی نہ کوئی ربط ضرور موجود رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خود شاعر بھی بسا اوقات اس ربط کے وجود سے آشنا نہیں ہوتا۔ دوسرے حقائق یا کیفیات کی طرف شاعر کی پیش قدمی کسی محرک کے ردِ عمل سے اس حد تک مختلف ضرور ہوتی ہے کہ اس کا مزاج سراسر جذباتی ہوتا ہے اور شاعر تمام ارضی حقائق کو جذبات کے آئینے میں سے دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ تاہم جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا بعض نظموں میں جذباتی ردِ عمل اس درجہ ناتواں ہوتا ہے کہ نظم خارج کی شاعری کا نمونہ قرار پاتی ہے —— اور بعض نظموں میں جذباتی ردِ عمل کی شدت اس درجہ ہوتی ہے کہ انہیں داخلی

تحقیقات کہنا ہی پڑتا ہے ۔۔۔ مگر اس ایک نقطے سے قطع نظر آپ کو ایسی نظمیں بھی ملیں گی جن کا مابہ الامتیاز داخلی اور خارجی عناصر کا واضح امتزاج ہے اور جن کے مطالعے سے ناظر کو فرد اور ماحول کے ارتباطِ باہم کا احساس آنِ واحد میں ہو جاتا ہے۔ جدید اردو نظم میں یہ امتزاج بہت نمایاں ہے اور اس نے تین واضح صورتیں اختیار کی ہیں ۔۔۔ پہلی صورت تو وہ ہے جس میں شاعر نے خارجی ماحول کو بطور پردۂ تصویر (CANVES) پیش کر کے اس پر اپنے احساسات و جذبات کے آڑے ترچھے نقوش اجاگر کئے ہیں۔ ان نظموں میں شاعر نے بالعموم پہلے تو منظر کشی کی ہے اور اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے مناسب ماحول پیدا کیا ہے اور جب اس نے محسوس کیا ہے کہ ماحول کی منظر کشی ہر لحاظ سے مکمل و اکمل ہو گئی ہے تو اس نے اپنے جذبات و احساسات کے بند کھول دیئے ہیں اور ماحول اور جذبات میں ہم آہنگی استوار ہو گئی ہے۔ جدید اردو نظم میں نیچر اسی چور دروازے سے داخل ہوا ہے اور اس نے شاعر کی داخلی کیفیات کے اظہار کے لئے زمین ہموار کرنے کا کام سرانجام دیا ہے۔ یوسف ظفر کی نظم "ڈولے" اور منیر نیازی کی نظم "برسات" اس کی بہترین مثالیں ہیں ۔۔۔ امتزاج کی دوسری صورت وہ ہے جہاں شاعر نے داخلی کیفیات کے وسیلے سے خارجی زندگی کی ناہمواریوں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ ان نظموں میں شاعر نے پہلے تو ناظر کو اپنا ہم نوا بنانے اور اس کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور پھر جب اسے محسوس ہوا ہے کہ ناظر کے احساسات اس کی گرفت میں آ گئے ہیں تو وہ بڑی تیزی سے اپنے اصل موضوع یعنی خارجی زندگی کی ناہمواریوں کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ فیض کی نظم "رقیب سے" اور مجاز کی نظم "آوارہ" اسی زمرے میں شامل ہیں۔ البتہ ان دونوں صورتوں میں داخلی اور خارجی عناصر کا مکمل انضمام فنی چابکدستی اور مضبوط گرفت کا متقاضی ہے اور وہ اس ضمن میں کامیاب نہیں ہو سکے جنہوں نے نظم کے ان دو عناصر میں ایک فطری ہم آہنگی پیدا نہیں کی۔

نظم میں امتزاج کی تیسری صورت وہ ہے جس میں داخلی اور خارجی عناصر کا مکمل انضمام موجود نہیں ہوتا۔ بلکہ نظم کے سارے تار و پود میں یہ عناصر کچھ اس طرح گھلے ملے ہوتے ہیں کہ انہیں علیحدہ کر کے دکھانا ناممکن ہے۔ یہ نظمیں احساس و تجربے کی وحدت کا دلآویز نمونہ ہیں اور یہاں شاعر کی قلبی واردات میں عصرِ حاضر کی روح کروٹیں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ امتزاج کی یہ صورت اردو نظم کے کسی خاص دور تک محدود نہیں تاہم بیسویں صدی کے ہیجانی حالات میں نسبتاً زیادہ واضح ہوئی ہے ان حالات میں زمان و مکان کی حدود کچھ اس درجہ سمٹ آئی ہیں کہ ہماری زمینی تہذیب نے ایک مختصر سے خاندان کی صورت اختیار کر لی ہے نتیجتاً بعض شعرا شخصی حدود کو پار کر کے انسانی حدود تک جا پہنچے ہیں اور ان کے کردار میں ذاتی غم اور انسانی درد بڑے فطری طریق سے یکجا ہو گئے ہیں۔ علامہ اقبال کی کئی ایک نظمیں اسی تیسری صورت کی ترجمان ہیں۔ ان نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں حیات کی پیچیدہ وسعتوں اور حقائق کی تلخیوں کو ایک فلسفی کے زاویۂ نگاہ سے نہیں بلکہ ایک شاعر کے نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال کی ان نظموں میں فکر کا نمایاں عنصر مقصود بالذات نہیں بلکہ شاعر کی مخصوص افتادِ طبع اور جذباتی میلان کا حاصل ہے بے شک انہوں نے زندگی کے رموز و نکات کی تفہیم، ملک و قوم کے مسائل کی توضیح اور فطرت کے خارجی حسن کی عکاسی میں اپنے قلم کا سارا کمال صرف کر دیا ہے۔ تاہم انہوں نے اپنے قلم کی روشنائی خونِ دل ہی سے مستعار لی ہے اور نتیجتاً ان کی کئی ایک نظموں میں فکر اور جذبے کی آمیزش سے ایک بڑی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

لیکن اردو نظم میں امتزاج کی یہ کیفیت محض علامہ اقبال تک محدود نہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اقبال کے بعد اس کے نقوش دن بدن زیادہ واضح ہو رہے ہیں تو شاید اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہو گا چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جدید اردو نظم کے پچھلے پندرہ بیس برس میں بہت سی ایسی نظمیں تخلیق ہوئی ہیں جو بلاشبہ اس صورت کی بہت اچھی مثالیں ہیں اور جن میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں بڑے فطری طریق سے گھل مل گئے ہیں ان نظموں میں فیض کی نظم "میرے ہمدم میرے دوست" ن۔ م۔ راشد کی "رقص" اختر الایمان کی "نئی صبح" مجید امجد کی "کنویں کے منڈیر پہ" اور قیوم نظر کی "بے بسی" خاص طور پہ قابلِ ذکر ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان شعرا نے زندگی کی تلخیوں اور کرخت حقائق کی پیچیدہ وسعتوں کو پہلے اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب جانے دیا ہے اور پھر جب یہ حقائق ان کے اپنے جذبات و احساسات سے مل کر ملائم ہو گئے ہیں۔ تو انہیں شعر و نغمہ میں سمو کر ناظر تک منتقل کر دیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین

اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر

آپ یہ عنوان پڑھ کر چونک اٹھیں گے۔ ممکن ہے کچھ ناز روہ بھی ہو جائیں۔ اردو ادب پر فارسی ادب اور انگریزی ادب کا چرچا سنتے آئے ہیں۔ ترکی، فرانسیسی یا روسی ادب کے نقوش تلاش کئے جائیں تو کچھ اجنبی سے نہ معلوم ہوں گے لیکن اردو ادب پر ہندی ادب کا اثر خسترہ کا انمیل سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ عنوان کچھ ایسا ہی پُراسرار سا معلوم ہوتا ہے جیسا نیاز کے مضمون کا "ایران اور ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر"۔

اردو اور ہندی ہمسایہ زبانیں ہیں۔ دنیا میں کوئی دو زبانیں ایک دوسرے سے اتنی نزدیک، اتنی مماثل نہ ہوں گی جتنی اردو اور ہندی۔ ان میں مماثلت اس قدر ہے کہ بعض اوقات دونوں میں کوئی فرق اور تمیز کی ہی نہیں جا سکتی۔ کتنی ہی کتابیں ایسی ہیں جنہیں ہندی والے ہندی کا سرمایہ جانتے ہیں اور اردو والے اردو کی ملکیت مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں زبانوں میں مغائرت بھی منعقب کی ہے۔ ایک پورب کو دیکھتی ہے تو دوسری پچھم کو بھاگتی ہے۔ بڑے شہروں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ دو پڑوسی جو برابر کے مکانوں میں رہتے ہیں برسوں کی سکونت کے بعد بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ کچھ ایسا ہی حال اردو اور ہندی کا ہے۔ دونوں کی جان پہچان غائبانہ تعارف سے آگے قدم نہ رکھ سکی۔ مدت تک ان دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کا حریف اور رقیب سمجھا گیا حالانکہ ان کی مماثلت بعض گوشوں میں مطابقت کی حدیں چھو لیتی ہے۔ امیر خسرو کے بعض ہندوستانی اشعار کو ہندی والے اپنی طرف گھسیٹتے ہیں اور اردو والے اپنی جانب۔ انشا کی کیتکی کی کہانی۔ ولا کی بیتال پچیسی اور جواں کی سنگھاسن بتیسی اسی قدر ہندی ہیں جس قدر اردو۔

میری مراد ہندی ادب کے وسیع مفہوم سے ہے یعنی ہندی کی مختلف بولیوں کو یک جا کر کے ایک مجموعی تاثر میرے ذہن میں ہے۔ اردو ادب پر ہندی ادب کے اثرات خال خال ہیں۔ اردو کے آغاز میں یہ اثرات بالکثرت تھے۔ شروع شروع میں اردو اور ہندی کے درمیان کوئی امتیاز ہی نہ تھا۔ زبان یکساں۔ اردو اشعار کی بحر فارسی نہیں بلکہ ہندی تھی۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں۔ ہندی الفاظ کا بہ کثرت استعمال لازماً ہندی ادب کے اثر کی نشانی نہیں۔ الفاظ زبان کا اثر ظاہر کرتے ہیں نہ کہ ادب کا۔ موضوع، خیال، تلمیحات و روایات زیادہ ضروری علامات ہیں۔

امیر خسرو سے ایسی کئی چیزیں منسوب کی جاتی ہیں جن سے انہیں کوئی واسطہ نہیں بعد کے کسی دیاول نے اپنے افکار خامہ ان سے منسوب کر دیئے۔ لیکن ان کی ایک غزل جس کا پہلا مصرع فارسی اور دوسرا اردو کا ہے یقیناً انہیں کی ہے اور اس کے دوسرے مصرعوں کو اردو شاعری کی پہلی مستند مثال کہہ سکتے ہیں ان مصرعوں کے الفاظ ہندی لیکن بحر اور رسم الخط فارسی ہے اس لئے انہیں عرف اردو ہی کہا جائے گا۔ ان میں عشق کا بیان عورت کی جانب سے ہے جو خصوصیت ہندی شاعری کی ہے۔ دو مصرعے ملاحظہ کیجئے ۔

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
کبسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ں ہماری بتیاں

٭پنجاب میں اردو میں امیر خسرو کی ایک مثنوی بھی نقل کی گئی ہے۔ رسم الخط اردو نہ ہو تو اسے کسی طرح اردو نہیں کہا جا سکتا۔ زبان ہندی۔ خیالات ہندی

بحر ہندی، معلوم نہیں اس کے اردو ہونے کا کیا ثبوت ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

وہ گئے بالم وہ گئے ندیا کنار — آپے پار اتر گئے ہم تو رہے اروار
بھائی رے ملاحو ہم کو پار اتار — ہاتھ کا دیوں گی مندری گل کا دیوں ہار

چکوا چکوی دو جنے ان کوں مارو نہ کو — اوہ مارے کرتار کے رین بچھوڑی ہو

یہ اشعار ہندی ادب کا اثر نہیں، خود ہندی ادب ہیں۔ امیر خسرو کا جو بھی اردو کلام ہے وہ سب ہندی ادب کا جزو ہو سکتا ہے۔

"پنجاب میں اردو" میں شیرانی نے اور ان کی تقلید میں عبدالقادر سروری نے "اردو مثنوی کا ارتقا" میں بہت سے ہندی منظومات کو اردو شاعری کے قدیم ترین نمونوں کے طور پر پیش کیا ہے جنہیں کسی طور اردو کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا مثلاً کبیر کے دوہے۔ قطبن کی مرگاوتی اور شیخ عثمان کی چترا ولی ہندی شاعری کے مشہور جواہر پارے ہیں انہیں خواہ مخواہ اردو میں گھسیٹنا اردو ادب کی کوئی خدمت نہیں۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۸۶۱ھ تا ۹۴۵ھ) نے بھی مثنوی کے بعض ایسے اشعار کہے جن کا موضوع صوفیانہ لیکن زبان، اور بحر ہندی ہیں۔ ان میں ہندی ادب کی اصطلاحات سے کام لیا گیا ہے ؎

جان اجان سب کھیلنہار — بن پی کھیلے نہ کھیلا ہوئی
جان اجان جگ کھیلے ہے — ہو ہو ہو ہو ہولی رے
سبھ کھیلنہ سکھی سہیاں — سرب نرنتر پی پروان

ابتدا میں اردو اور ہندی زبان اور اردو اور ہندی کے شعرا کی تفریق نہ تھی۔ صرف رسم الخط ہی مابہ الامتیاز تھا۔ رفتہ رفتہ اردو پر فارسی اثرات غالب آ گئے اور بقول سروری "تھوڑے عرصے کے اندر اندر خود یہ زبان اس قدر ترقی کر گئی کہ اس کے بولنے اور پڑھنے والے اس کی اصل سے دور ہو گئے۔"

گجرات کے صوفی شاعر شاہ علی محمد جیو گام دھنی (المتوفی ۹۷۳ھ) کا اردو کلام بھی ہندی بحر میں ہے۔ زبان سراسر ہندی اور اسلوب بھی ہندی ہے لیکن موضوع متصوفانہ یعنی ہمہ اوست کی تفصیل ہے ؎

کبھیں سو ہوئے اندھیری راتا — سانجھ بتی کر لاوے دھاتا
ہو کر دیوا راتیں ساری — لا کر جوت دکھاوے بھاری

دیا، بتی اور جوت کا مضمون ہندی شاعری سے مستعار ہے۔ فارسی میں شمع و پروانہ کا ذکر ہوتا ہے چراغ کا نہیں

محض ہندی بحر یا ہندی الفاظ کی کثرت ہندی ادب کے اثرات کی دلیل نہیں۔ شاہ میراں جی شمس العشاق (متوفی ۹۰۲ھ) کا ارشاد نامہ۔ ان کے فرزند شاہ امین الدین اعلیٰ کی رموز السالکین، محبوب عالم شیخ جیون کا فقہ ہندی (۱۱۱۱ھ) اور محشر نامہ ہندی کے اوزان میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی زبان بھی ہندی ہے۔ بحر اور زبان ہندی ہوں تو دانستہ یا نادانستہ تشبیہیں، کنائے، اصطلاحات، اسالیب بیان بھی جا بجا ہندی ادب کا پرتو ہوتے ہیں اس طرح بالواسطہ ہندی ادب کے نقوش ابھر آتے ہیں۔

دکن کی غزل گوئی پر ہندی شاعری کی چھاپ نظر آتی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان شعرا نے فارسی غزل کی بجائے جذبات بھاشا کو مدنظر رکھا ہے۔ محبوب کے لئے پیا، پیو، سجن، ساجن، سریجن، موہن وغیرہ کا استعمال ہندی شاعری کا اثر ہے کیوں کہ یہ الفاظ عاشق عورت کی طرف سے محبوب مرد کے تخاطب کے لئے مخصوص ہیں۔ پیا اور پیو کا لفظ محبوب کے معنی میں دکن میں بہت مرغوب رہا ہے۔ پیا کے معنی ہی شوہر کے ہیں۔ پھر اس کے لئے سکھی کا لفظ لانا اور اسی سے خطاب کرنا واضح کر دیتا ہے

کہ متکلم عورت ہے ذیل میں غزل کے چند اشعار درج ہیں جن سے روشن ہوگا کہ دکنی غزل پر بھاشا کی شاعری کے اثرات کتنے گہرے ہیں۔ وجہی (۱۶۱۸ء کے قریب) کی دو غزلوں کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

نا پوچھوں کہیں جو سے کب ملنا پیو سوں ہو، اسے   غم بہا لب میں سورے نا جانے دکھ پیو کو کہہ
کیوں ناروں برہا جھال سکی ہیں سکتی ہوں سنبھال سکی   اب کیوں کہ پادوں لال سکھی جو بیٹھی ہت تجے کھو کہہ

کھانا برہ کہتی ہوں میں پانی انجھو پیستی ہوں میں   تج تے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا
ہر دم توں یاد آتا منج اب عیش نیں بھاتا منج   برہ دیو ستاتا منج تج باج تل تل رے پیا

سلطان محمد قطب شاہ (وفات ۱۶۲۴ء) کی دو غزلوں کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان کی روح بھی خالص بھاشا کی ہے ۔

بسنت کھیلے ہمیں ہور ساجنا یوں   کہ آسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

چلے چندنی میں جب ملک پیو ہمارا   اونن اس دیپے چندر تھے اپارا
سکھی پیو چنتا لگیا ہے ہمن کو   سجن بن نظر سے لے ہور کوئی تو ارا

ان ۔۔۔ سے یہ ثابت ہوگیا کہ ابتدا میں اردو غزل فارسی غزل کا نقشِ ثانی نہ تھی۔ اس میں مقامی تخیلات برتے گئے تھے۔ نہ صرف غزل میں بلکہ دکنی مثنویوں میں بھی متعدد ہندی تشبیہیں استعمال کی جاتی تھیں جو اب متروک قرار پا چکی ہیں لیکن جن کی حلاوت اور شیرینی میں شبہ نہیں۔

ہاشمی (وفات ۱۶۹۷ء) کو ریختی کا موجد کہا جاتا ہے لیکن اس کی ریختی میں اور رنگین و جان صاحب کی ریختی میں فرق یہ ہے کہ اس کے یہاں ہولناکی کے مضامین نہیں جو ریختی کا خاصہ ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی غزلیں دراصل ہندی شاعری کی صدائے بازگشت ہیں جس کی تقلید میں اس نے عورت کو عاشق مان کر مرد محبوب سے خطاب کیا ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ اس کے کلام میں کچھ شوخ معاملہ بندی بھی ملتی ہے ۔

سجن آویں تو پردے کے نکل کر بھار بیٹھوں گی   بہانا کر کے موتیاں کا پرو تی ہار بیٹھوں گی
اودو یہاں آ کہیں گے تو کہوں گی کام کرتی ہوں   اُٹھلتی ہور مٹھلتی جب گھڑی دو چار بیٹھوں گی

عاشق و معشوق کی جنس کا یہ تعین کچھ ہاشمی ہی کی اختراع نہیں ایسا قدما کے یہاں بھی ہے جیسا کہ محولۂ بالا مثالوں سے ثابت ہوا۔ بعض اوقات اس کی تقلید بعد والوں نے بھی کی۔ غالباً بعض پڑھنے والوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ولی کے یہاں بھی بعض غزلیں اسی طرز کی ہیں ایک دو غزل کے اشعار یوں ہیں۔

براگی جو کہاتے ہیں انہیں گھر بار کرنا کیا   ہوئی جوگن جو کوئی پی کی اسے سنسار کرنا کیا
سکھی تمنا کو ارزانی یہ کسوت اور زرینہ سب   ڈھیلے جی سوں جو بیزار اسے سنگھار کرنا کیا

ترے بن مجکوں اے ساجن تو یو گھر بار کرنا کیا   اگر تو ناچہے مجکوں تو یو سنسار کرنا کیا
تمیں ملنے سوں گر اپنے سہاگن نا کرو گے مجھ   تو جوڑا گھگری کا اور کریلا دھار کرنا کیا

گھگری اور کریلا دھار عورتوں کے جوڑے اور چوٹی کی وضع تھیں۔ مندرجہ بالا اشعار میں براگی۔ پی کی جوگن۔ سکھی۔ سنگھار۔ ساجن۔ سہاگن۔ جوڑا وغیرہ ہندی شاعری کی

اصطلاحیں ہیں - ان غزلوں پر فارسی غزل کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی - فارسی شاعری میں عاشق اور معشوق دونوں عموماً مرد ہوتے ہیں - ہندی میں دونوں کی جنس مختلف ہوتی ہے - ولی کے یہاں ایسی غزلیں بھی ہیں جن میں عاشق مرد اور معشوق عورت ہے جیساکہ اقتضائے فطرت ہے -

اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا ۔۔۔ تج چال کی قیمت سوں نہیں دل ہے مرا واقف
ٹک پاؤں کے بچھووں کی آواز سناتی جا ۔۔۔ اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں

دکن کی شاعری ہندی ادب سے قریب تھی - شمال میں ہندی عناصر کو ختم کرکے فارسیت کو بڑھاوا دیا گیا -

نظم کے برخلاف دکنی نثر پر ہندی ادب کا کوئی اثر نہیں - نثر کی مقدار بھی بہت کم ہے اور جو ہے وہ مذہبی اور متصوفانہ ہے - اس شعبے میں ہندی اثرات کی گنجائش نہ تھی - ابھی تک شمالی ہند کے شعرا میں سے صرف امیر خسرو اور شیخ جیون کا ذکر کیا گیا ہے - چند اور کے بارے میں لکھتا ہوں - شمال کی ایک قدیم ترین نظم بکٹ کہانی ہندی ادب کے زیر اثر لکھی گئی ہے اسے محمد افضل نے سنہ ۱۶۱۰ء کے قریب لکھا - اس میں ایک عورت اپنے شوہر کے فراق میں ہر ماہ کا ذکر کرکے کچھ کہتی ہے - بارہ ماہ خالص ہندی چیز ہے - بکٹ کہانی کی ابتدا یوں ہے -

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی ۔۔۔ بھئی ہوں عشق کے غم سے دیوانی

چیت کے مہینے کے ذکر میں کہتے ہیں :

سکھی ری چیت رت آئی سہانی ۔۔۔ ابھوں ام بدھ میری برنہ آئی
رہے ہیں بھونر پھولن کے گلے لاگ ۔۔۔ مرے سینہ جدائی کا لگا آگ
سکھی دن رین مجھ ناگن ڈست ہے ۔۔۔ پھروں رُو رُو ری تماشہ جگ ہنست ہے

یہاں پھولوں سے بلبل کا نہیں بھونرے کا وصال ہوتا ہے - بے قراری کی کیفیت کو ناگن کے ڈسنے سے تشبیہ دی ہے یعنی یہ محض نام کا بارہ ماسہ نہیں بلکہ اس میں قدم قدم پہ ہندی بارہ ماسہ کی روایات موجود ہیں - کاظم علی جوان نے بھی سنہ ۱۲۱۷ھ میں مثنوی بارہ ماسا لکھی - انیسویں صدی میں کئی غیر مشہور شعراء نے اردو میں بارہ ماسے کہے - سنہ ۱۲۷۰ھ میں منشی کنھیا لال طالب سیتاپوری نے بارہ ماسہ موسوم بہ بیوہ بارہ میں لکھا -

بیوہ النا س میں اپنا سناؤں ۔۔۔ سجن کو نیت کی مارگ بتاؤں

الٰہی بخش کاندھلے والے کا بارہ ماسہ سنہ ۱۸۶۶ء میں دلی سے شائع ہوا - شاہ جہاں پور سے سنہ ۱۲۸۶ھ میں وہاب اور مقصود کے بارہ ماسے شائع ہوئے ان کا پہلا شعر بالترتیب یوں ہے -

سکھی بچھڑی کہانی میں سناؤں ۔۔۔ کہ بارہ ماس پیو بن کیوں گنواؤں (وہاب)

خدا کا نام اوّل بولتا ہوں ۔۔۔ قفل اپنی زباں کا کھولتا ہوں (مقصود)

وہاب کا بارہ ماسہ ہندی میں بھی شائع ہوا - خیر اشاہ کا ہندی بارہ ماسہ بھی اردو رسم الخط میں چھاپا گیا - سنہ ۱۸۷۱ء میں نول کشور پریس سے بارہ ماسہ سندر کلی شائع ہوا - زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرانی تصنیف ہے - بیچ میں ہندی دوہے بھی ہیں -

اساڑھ آیا نپٹ گرمی پڑے رے ۔۔۔ نپٹ گرمی متی دہی جرے رے

اس کا ایک پر لطف ٹکڑا بھی دیکھتے چلیے :

بھار آیا دیکھن ہارا نہ آیا   مار گیا چکھن ہارا نہ آیا

مولانا محمد عبداللہ انصاری نے عشق حقیقی میں دو دوہا نی عرف بارہ ماسہ ربانی لکھا جو ۱۳۲۳ھ میں مکمل ہوا۔ بارہ ماسہ کا موضوع ہندی شاعری سے ماخوذ کیا گیا ہے شمالی ہند میں اٹھارویں صدی میں چند ایسی مثنویاں لکھی گئیں جو ہندی بحروں میں تھیں اور جن میں ہندی الفاظ کافی استعمال کئے گئے تھے لیکن چونکہ ان میں ہندی ادب کا اثر نہیں اس لئے ان کا ذکر نہیں کیا جاتا۔

شمالی ہند کے ابتدائی غزل گویوں میں ہندی کا صرف اتنا ہی اثر باقی رہا تھا کہ محبوب کے لئے سجن۔ ترجن۔ پیا۔ پتیم۔ موہن وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیے   کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گزری سو جگ بیتا (آبرو)

زندگی درد سر ہوئی حاتم   کب ملے گا مجھے پیا میرا

دیکھو موہن تری کمر کی طرف   پھر گیا مانی اپنے گھر کی طرف   تاباں

بعض اوقات ہندی الفاظ کے استعمال سے ہندی فضا پیدا ہو جاتی تھی۔

نین سیں نین جب ملائے گیا   دل کے اندر مرے سمائے گیا   آبرو

سودا نے بہت سے مرثیے اور پہیلیاں ہندی بحروں میں لکھی ہیں۔ ان میں کئی جگہ ہندی کے اسالیب سے کام لیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

گیرو سے کپڑے رنگے مکھ پہ بھبوت   پوچھیں بی بی فاطمہ کت گیو میرو پوت

جو میں ایسی جانتی بچھوڑ جائے گا وہ   تو ہنسے میں بیاہ کر پل بچھوڑتی توہ

دوسرا شعر ہندی کے اس مشہور دوہے سے ماخوذ ہے:۔

پریتم جو میں جانتی پریت کرے دکھ ہوئے   نگر ڈھنڈورا پیٹتی پیت کرے نا کوئے

دکنی شاعری پر ہندی ادب کا اثر بدیہی تھا۔ شمال میں متقدمین کے یہاں یہ محض برائے نام رہا میر و سودا کے دور میں اس کے نقوش بالکل فنا ہو گئے لیکن اسی عہد میں انشانے غزلوں میں کثرت سے ہندی ادب کی تلمیحات سے فائدہ اٹھایا۔ یہ چونکہ شمالی ہند کی کئی زبانوں کے ماہر تھے اور فطرت میں مستقل مزاجی نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے غزل میں ان تلمیحات کے استعمال سے دریغ نہ کیا۔ چند دلچسپ مثالیں پیش ہیں۔

نہیں کچھ بھید سے خالی یہ تلسی داس جی صاحب   لگایا ہے جو اک بھونرے سے تم نے آنکھ کا جوڑا
لپٹ کر کشن جی سے رادھکا ہنس کر لگیں کہنے   ملا ہے چاند سے ایلو اندھیرے ماکھ کا جوڑا

شو کے گلے سے پاربتی جی لپٹ گئیں   کیا ہی بہار آج ہے برھا کے رُنڈ پہ

کرشن اور رادھا ہندی ادب کے لیلیٰ مجنوں ہیں۔ ہاں شو اور پاروتی کا ہندی شاعری میں کوئی خاص مقام نہیں۔ اس قسم کی تلمیحات نظیر اکبرآبادی کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں اس نے اس موضوع پر مستقل نظمیں لکھیں چنانچہ اس کی مشہور نظم ہے:۔

کیا کیا کہوں میں کشن کنھیا کا بال پن   ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بال پن

ہر من کی ہوک موہنی اور چیت سہاونی　　نکلی جہاں دھن اس کی وہ میٹھی سہاونی
سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری　　ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

یا

جب آشا تشنا دور رہو ئی اور آئی گت سنتو کہ بھری　　سب چین ہوئے آنند ہوئے بم شنکر بولو ہری ہری

یہ نظمیں اسی والہانہ انداز میں لکھی گئی ہیں جس میں ہندی کے بھگتی کال کے کوی لکھتے تھے۔ میں یہاں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کسی ادبی تخلیق میں مقامی رنگ یا ہندو دیو مالا کا تذکرہ لازماً ہندی ادب کا اثر ثابت نہیں کرتا۔ اگر یہ بیان اس ڈھنگ سے ہے جیسے کہ ہندی ادب میں ہوتا ہے تب اسے ہندی عنصر کہہ سکیں گے۔

اب تک محض نظم کا ذکر تھا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں اگر نثر میں بھی کچھ ایسی تصانیف مل جاتی ہیں جو ہمارے کام کی ہیں۔ میری مراد بیتال، سنگھاسن بتیسی اور رانی کیتکی کی کہانی سے ہے۔ ان تینوں کتابوں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں چھپی ہیں۔ ہندی والے ان سے ہندی نثر کی ابتدا کرتے ہیں۔ اردو والے ان سے اپنے نثری ادب کا ذخیرہ بڑھاتے ہیں۔ جو کتابیں ہندی ادب کا حصہ تسلیم کی جاتی ہوں ان پر ہندی ادب کا اثر دکھانا تحصیل حاصل ہے لیکن اگر بالفرض انہیں خالص اردو کی تصانیف مان لیا جائے تو بھی ان میں قدم قدم پر ہندی ادب کے عناصر ملیں گے۔

انشا نے رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی ۱۸۰۳ء میں لکھی۔ وہ ایک جوگی کی موسیقی کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"سرسوتی جس کو ہندو کہتے ہیں آدشکتی۔ ان نے بھی اسی سے کچھ گنگنانا سیکھا تھا۔ اس کے سامنے چھ راگ چھتیس راگنیاں آٹھ پہر روپ بندھوؤں کا سا دھرے ہوئے اس کی سیوا میں ہاتھ جوڑے کھڑی رہتی تھیں۔"

اس عبارت کا ہر فقرہ پکار رہا ہے کہ میں اردو انشا پردازی نہیں ہوں۔ شادی کے موقع پر رانی کیتکی کے راج کی آرائش اس طرح ہوتی ہے۔

"جتنے راج بھر میں کنوئیں تھے کھنڈ ساروں کی کھنڈ سالیں لے جا ان میں انڈیلی گئیں۔ جتنی جھیلیں تھیں ان سب میں کسم اور ٹیسو اور ہار سنگھار تیر گیا اور کیسری بھی تھوڑی تھوڑی گھول دی گئی ۔۔۔ ۔۔۔ کہہ دیا گیا جو سوہی پگڑی اور سوہے باگے بن کوئی کسی ڈول کسی روپ سے نہ پھرے چلے۔"

اسی موقع پر کنور کے باپ کا فرمان یہ ہے۔

"سوہے رائے مجھوٹ کبھی کوئی نہ پہنا کریں اور سونے روپے کے کواڑ گنگا جمنی سب گھروں میں لگ جائیں۔ سب کے کٹھوں کے ماتھوں پر کیسر اور چندن کے ٹیکے لگے ہوں۔"

ان بیانات کا اور ایسے موقع پر اردو کے دیگر بیانات کا فرق ظاہر ہے۔ اردو میں بہت سے قصوں میں ہندو راجاؤں کی شادی کا بیان ہوتا ہے لیکن اس ڈھنگ کی آرائش کا مرقع کہیں نہیں ملتا کیوں کہ یہ اردو کی روایات سے علیحدہ ہے۔ محض اردو کا ادیب یہ باتیں سوچ نہ سکتا تھا۔ اس کے لئے ہندی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے ادب کی واقفیت ضروری ہے۔

اسی نوع کی دوسری کتاب بیتال پچیسی ہے جو مظہر علی ولا اور للو لال لاہوری کے اشتراک سے ۱۸۰۳ء میں لکھی گئی۔ یہ سنسکرت کا قصہ ہے جو اردو میں برج بھاشا کے واسطے سے آیا اس لئے ہندی ادب کے اثرات بہت غالب ہیں۔ ایک راج کماری کے حسن کا بیان دیکھیے۔

"اس کا مکھ چندر ما سا۔ بال گھٹا سے۔ آنکھیں ہرن کی سی۔ ناک تیر کی سی۔ گلا کپوت کا سا۔ دانت انار کے سے دانے ہونٹوں کی لالی کندوری کی سی۔ کمر چیتے کی سی۔ ہاتھ پاؤں کونپل کے سے۔ رنگ چنپے کا سا۔ غرض اس کے جوبن کی جوت دن بدن بڑھتی تھی۔"

کتنا لطیف بیان ہے۔ ایک ایک تشبیہ پر دھیان دیجئے۔ چہرہ اور آنکھوں کی تشبیہہ تو اردو میں عام ہیں باقی سب اردو کے لئے بالکل نرالی ہیں۔ ان میں ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے حسن کارانہ۔ نرم رو بیانات دیکھ کر شبہ ہونے لگتا ہے کہ اردو شعرا نے ہندی ادب سے قطعی بیگانگی برت کر کچھ کھو تو نہیں دیا۔

اسی کے ساتھ کی دوسری کتاب سنگھاسن بتیسی بھی اسی سال لکھی گئی۔ اس کے مترجم للو لال اور کاظم علی جوان ہیں۔ یہ کتاب بھی برج بھاشا کی معرفت سنسکرت سے آئی۔ اس میں ہندو دیومالا کا اثر بہت زیادہ ہے۔ اس کی ایک کہانی میں سے ایک تالاب کا سماں دیکھئے۔

"چاروں گھاٹ اس کے پختہ ہیں۔ ہنس بگلے اس میں پھرتے ہیں اور مرغابیاں، چکوریں، پنڈبیاں کلولیں کرتی ہیں۔ کنول کے پھولوں پر بھونرے گونج رہے ہیں۔ مور بول رہے ہیں۔ کوئل کوک رہی ہے اور طرح طرح کے پنچھی خوشی میں ہیں۔ پھولوں کی سوگندھ کے ساتھ پون چلی آتی ہے اور میوہ دار درختوں کی ڈالیاں جھکے کھاتی ہیں۔"

ہم نے ان میں سے بیشتر پرندوں کو دیکھا ہے نہ یہ کہ ساری عمر بلبل کی وکالت کرتے رہے لیکن کبھی بلبل کی صورت سے آشنا نہ ہوئے۔ یہ باغ کا منظر تھا۔ دو سطروں میں بہار کا لطف بھی لوٹتے چلئے۔

"ایک دن بسنت رت میں ٹیسو پھولا ہوا تھا اور سمے آیا ہوا۔ کوئل کوک رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ راجہ بکرماجیت اپنے باغ میں بیٹھا ہوا ہنڈول سنتا تھا۔"

اس عبارت کا لطف و کیف کتنے مرصع و مسجع بیانات پر بھاری ہے۔ یہ جاننے پر اور حیرت ہوتی ہے کہ اس بیان میں ایک بھی تشبیہہ اور استعارہ نہیں اس کے لطف کا صحیح اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہوں نے راگ ہنڈول سنا ہو۔ یہ راگ بہت خوشگوار و مترنم ہے۔ مذکورہ بالا مثالوں سے اردو کے ادیبوں کو ہندی انشاپردازی کا ڈھنگ بھی معلوم ہو گا۔

ان کتابوں کے بعد انیسویں صدی میں اردو ادب پر ہندی ادب کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔ تلاش کرنے سے شاذ و نادر کسی طولی کتاب میں کوئی مدھم نقش نظر آجاتا ہے۔

ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ شعرائے اردو کی طویل نظموں میں ہندی دوہے یا بعض پوری ہندی نظمیں کہہ جاتے ہیں۔ انہیں ہندی ادب کا جز کہتے ہوئے اس لئے پس و پیش ہوتا ہے کہ یہ تحریر خط خود خالص ہندی ادب ہیں۔ انہیں اردو ادب کیوں کہ کہیں۔ جرأت کی غیر مطبوعہ مثنوی کارستان الفت میں جابجا ہندی کے دوہے ہیں مثلاً۔

کیا کیا من للچائے ہے وہ ابھری ابھری گات
ہاتھ کہاں پر آلے ہے ملن نہ کیوں کر بات

امانت کی اندر سبھا میں کئی ہندی چیزیں ہیں۔ کرشن اور ان کی گوپیوں وغیرہ کے گیت ہیں واجد علی شاہ نے بھی بعض ٹھمریاں کہیں۔ ان کی بیگم بادشاہ محل عالم نے اپنی مثنوی میں دو ٹھمریاں لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے۔

سوچ سمجھ پگ دھریو رے رادے

دوسری کے دو شعر یہ ہیں:

برہا گشت سے بگر بستا سوری کروں تصور کہاں ورک بھا سے

لا دو رے بنا کو موسے رنگنا   پیا آؤن کی جو سگن بچارے

ایک غیر مشہور شاعر لالہ بانکے لال فرحت کی مثنوی فرحت افزا میں بھی ہر داستان کی ابتدا میں ہندی دوہے ہیں۔ یہ مثنوی [illegible] میں لکھی گئی اور [illegible] میں شائع ہوئی۔

[illegible] میں محمد قاسم علی بدایونی نے پدماوت کا منظوم ترجمہ اس التزام کے ساتھ کیا کہ جائسی کے ہر مصرع کے مقابل اس کا ہم معنی ایک مصرع لکھا اور ہر بند کی ٹیپ میں ہندی کا ایک دوہا تصنیف کر کے لکھا۔ اسی طرح جو مضمون ملک محمد کے یہاں پایا جاتا ہے وہی تمام و کمال اردو میں آگیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب سے زیادہ ہندی ادب کا اثر اور کس اردو تخلیق میں ہو سکتا ہے۔ یہ جائسی کی پدماوت کا صحیح چربہ ہے۔

حالی کی مناجات بیوہ میں ہندی بارہ ماسہ کی جھلک دکھائی پڑتی ہے۔ بارہ ماسہ میں ایسے شوہر کی برہا کا ذکر ہوتا ہے جو عارضی طور پر پردیس گیا ہو مناجات میں اس شوہر کا ماتم ہے جو ہمیشہ کے لئے جا چکا ہے چنانچہ بیوہ کہتی ہے۔

ایسے بدیسی کا نہیں سندیسہ کچھ   جس کو نہ ہو ملنے کی قسم کچھ

ردنا ان بن باسیوں کا ہے   دیس نکالا جن کو ملا ہے۔

دور حاضر میں حسرت موہانی نے خالص ہندی چیزیں لکھیں مثلاً

برہا کی رین کٹے نہ پہاڑ   سونی نگریا پڑی ہے اجاڑ

نردئی شیام پردیس سدھارے   ہم دکھیارن کو چھوڑ چھاڑ

کا ہے نہ حسرت سب کچھ سہت   تج بیٹھیں گھر بار کواڑ

عالم کی ٹھمری ہو کہ حسرت کا گیت جو منظومات خالص ہندی ہیں اور صرف اردو رسم الخط کی گناہ گار میں نہیں ہیں اردو شاعری میں شمار نہیں کر سکتے۔

اردو کے ابتدائی ناٹکوں میں ہندو دیومالا سے کافی حد تک استفادہ کیا گیا۔ امانت کی اندر سبھا کی ترتیب ہندو تخیلات پر مبنی ہے۔ ہندوؤں کے مشہور مذہبی قصوں اور روایات کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے مثلاً بیتاب دہلوی کا مہابھارت۔ آغا حشر کا سورداس، سیتا بن باس اور گنگا ترن وغیرہ۔ ان ناٹکوں کی زبان بھی ہندی آمیز ہے لیکن پھر بھی ان پر ہندی ادب کا کوئی خاص اثر نہیں۔ مولوی عزیز مرزا نے وکرم اروشی کا اردو میں ترجمہ کیا اور حال میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے شکنتلا ناٹک کو براہ راست سنسکرت سے اردو میں پیش کیا۔ اس کے بیانات سنسکرت کے انداز پر ہیں۔ ہندی ادب کے بیانات بھی اسی طور پر ہوتے ہیں لیکن اس کتاب کو ہم بجائے ہندی ادب کے سنسکرت ادب کا اثر کہیں گے۔ ہندوؤں کی مشہور مذہبی کتابوں مثلاً رامائن، بھاگوت، مہابھارت اور گیتا کے اردو میں متعدد منظوم ترجمے ہوئے لیکن ان میں سے کسی کو ہندی ادب کا نمائندہ نہیں کہہ سکتے۔

دور حاضر میں مضطر خیرآبادی نے ہندی میں شاعری کی۔ انہوں نے اپنی اردو شاعری میں بھی ہندی کے خیالات و جذبات کو نظم کیا۔ ذیل کی سطریں ملاحظہ ہوں۔

چھا رہی کالی گھٹا جیورا مورا گھبرائے ہے
سن ری کوئل باورے تو کیوں ملہاریں گائے ہے

او پپیہا آ ادھر میں بھی سراپا درد ہوں
ہم پر کیوں تم رہا جس بھی تو دل میں ایسا زرد ہوں

فرق اتنا ہے کہ مجھ میں رس ہے اس میں بانٹے ہے

یہاں بحر اردو ہے لیکن خیالات و اسلوب سو فی صدی ہندی اور ہندوستانی ہیں۔ کومل لہار، پپیا اور آم سب جانی پہچانی چیزیں ہیں اور ہمارے ذہن میں مخصوص جذبات سے وابستہ ہیں۔ یہاں نظم ہندی کی تقلید میں صورت ہے۔ گویا ہندی اثر کی تکمیل کر دی گئی ہے۔

اسی سلسلے میں اردو شاعری کی جدید صنف گیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ بارہ ماسہ کے علاوہ گیت ہی ایسی صنف ہے جو اردو میں براہِ راست ہندی ادب کے اثر سے آئی ہے۔ اردو میں گیت اتنی تعداد میں لکھے جا چکے ہیں کہ اب انہیں اردو شاعری کی ایک صنف ہی تسلیم کرنا ہوگا۔ نئے شعراء میں سے اکثر نے کچھ نہ کچھ گیت لکھے ہیں۔ بعض شعراء خاص طور سے گیت ہی لکھتے ہیں۔ یہ گیت عموماً اردو عروض میں نہیں ہوتے۔ ان میں ترنم و آہنگ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ قافیوں کا کوئی مقررہ نظام نہیں ہوتا بلکہ اس معاملے میں موسیقی کے تقاضوں کی رہنمائی پسند کی جاتی ہے۔ زبان ہندی آمیز ہوتی ہے اور اسلوب بھی جہاں تک شاعر سے ممکن ہوتا ہے ہندی جیسا ہوتا ہے۔ حفیظ جالندھری کا ایک گیت ہے۔

بنسری بجائے جا

کاہن مرلی والے نند کے لال

بنسری بجائے جا

برج باسیوں کے جھونپڑے بسائے جا

یہ سطور اردو کی بجائے ہندی شاعری کی معلوم ہوتی ہیں۔ مشریف کنجاہی کے گیت مایا جال کا ایک اقتباس دیکھئے؎

چاروں اور اجالا پھیلا مسکایا جگ سارا

پورب سے نکلا ہے سورج دھرتی ماتا جاگی

رین اماوس بھاگی

جیسے دیوتاؤں کے درشن سے پاپوں کا اندھیارا

کیا جانے کیا مدھر سندیسہ لے کر کرنیں آئیں

پھولوں کے بھی آنسو ڈھل گئے کلیاں بھی مسکائیں

مسکایا جگ سارا

جیسے ہنس اُٹھتے ہیں ہنستے تک کہ من کا پیارا

سورج ڈوبا رین ہوئی آکاش پہ چمکے تارے

تھرک تھرک کر ناچے

اندر لوک میں پریوں کے دل بن کر دھڑکے سارے

اور ادھر پیڑوں کے پیچھے

پتوں میں سے چھپ کر

چندرماں نے دیکھا جب وہ جھینپ گئے بچارے

جیسے اک نگری کے باہر جوبن ماتی ناریں
اپنے انتر بھاوں کی تاروں پر ناچ رہی ہوں
اور ماتھے میں نگر کا بانکا ۔ البیلا چت چور
جھرمٹ کو تک پائے ۔
کامن بن کر بندرابن کی سکھیوں کو شرمائے ۔

یہ گیت ہندی کا بھی ایک اچھا گیت ہو سکتا ہے۔ اس میں کئی تخیلات ایسے ہیں جو اردو ادب میں عام طور سے نہیں نظر آتے مثلاً نگر کے باہر جوبن ماتی، ناریں میں نگر کے بانکے چت چور کا آجانا اور ان عورتوں کا شرمانا۔ یہ خالص ہندی موضوع ہے لیکن اس موضوع کی ڈرامائیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔
اس گیت کی نرمی اور مٹھاس کسی غزل سے کم نہیں

مطلبی فرید آبادی نے ایک گیت انگھا کے انداز میں لکھا ہے

رو جو کوسن جان بھی ڈوبا نرمی نے اپنے پنکھ پھیلائے

ان سے پہلے ظریف لکھنوی دو آلہا لکھ چکے ہیں ایک طوعانی آلہا ۱۹۱۳ء کی پلیگ پر۔ دوسرا ۱۹۳۶ء میں مہاراجہ امیر احمد خاں تعلقدار محمود آباد کی گدی نشینی پر۔ اس کا پہلا شعر ہے :

کہے ظریف کبیر سب نے سنوارے بھیا بات ہمار
اے محمود آباد رہیا تہرے کرمن کے بلہار

ظریف کی نظموں میں اسلوب پر ہندی کی مشہور نظم کا اثر ہے ۔

موجودہ دور میں فراق نے محسوس کیا کہ اردو میں ایسی شاعری نہیں جسے ہم صحیح معنوں میں ہندستانی کہہ سکیں۔ جس میں بیان کی فضا کی ٹھنڈک اور گرمی ہو۔ ہندستان کی مٹی کی خوشبو ہو یہاں کی ہواؤں کی لپک ہو، اس کے لئے فراق نے تجویز کیا ۔

اردو کو سنسکرت اور ہندی شاعری دونوں کی قدروں سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ صرف بھاشا کی شاعری سے استفادہ کرنا اردو شاعری کو ہندستانی کلچر اور اس کی روح کا صحیح نمائندہ اور آئینہ دار نہیں بنا سکتا ۔

چنانچہ انہوں نے بڑی تعداد میں ایسی رباعیاں لکھیں جن کی روح ہندستانی ہے جن پر ہندی شاعری کا شعوری اثر ہے۔ فراق کو اردو شاعری پر یہ بھی اعتراض ہے کہ ہماری شاعری میں ہندستانی عورت بلکہ عورت کا صحیح تخیل نہیں۔ غزل اس معاملے میں بالکل ناکارہ اور مصنوعی ہے۔ فراق کی رباعیوں کی عورت یقیناً غزل کے محبوب سے زیادہ دلکش ہے۔ فراق کا یہ تجربہ قابلِ تحسین ہے۔ میں دو رباعیاں پیش کرتا ہوں ۔

نرمل جل سے نہا کے رس کی پتلی ‖ بالوں سے ارگج کی خوشبو لپٹی
ست رنگ دھنش کی طرح باہوں کو اٹھائے ‖ پھیلاتی ہے الگنی پہ رنگیلی ساڑھی

○

چھلکا گات اور اوستھا ہے کشور ‖ وہ چال کہ جیسے جل کے نا چیں گے مور
کرکے اٹھتی ہیں کہ لیں وہ کالی زلفیں ‖ منہ تکتا ہے چندرماں کے دھوکے میں چکور

ارگج کی خوشبو۔ مور۔ کوئل چکور یہ سب ہندی شاعری کی اصطلاحیں ہیں۔ فراق کی ان رباعیوں میں گاہ گاہ ایسے الفاظ منود آجاتے ہیں جو اردو میں نہیں

کم ہو سکے ہیں مثلاً دوسری رباعی میں "کشودہ ہوتا" ورنہ بیشتر مقامات پر ان رباعیوں میں ایک خوشگوار تنوع اور تبدیلیٔ ذائقہ کا احساس ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا جائزہ سے معلوم ہوا کہ ہندی ادب کے اثرات اردو ادب کے بعض چند گوشوں پر پڑے اور وہ بھی دھندلے اور مدھم۔ دکنی میں اردو کی ابتدائی شاعری اور حال میں نئے شعراء کے گیت اور فراق کی رباعیاں ہی ایسے مقامات ہیں جہاں ہندی ادب کا واضح اثر دکھائی دیتا ہے۔ گیتوں پر ہندی ادب کا جتنا اثر ہے اتنا کسی اور صنف پر نہیں۔ گیت خالص غنائی شاعری ہے۔ غزل سے بھی زیادہ۔ اس میں شاعری کی روح ہر جگہ جلوہ آرا رہتی ہے۔

اردو شعراء کے یہاں مقامی رنگ اور ہندوستانی روایات جگہ جگہ ملتی ہیں۔ ان میں سے اکثر ہمارے شعراء کے تخیل کی تخلیق ہیں اور بعض ہندی شاعری سے ماخوذ۔ اردو زبان فارسی اور شمالی ہند کی زبانوں کے امتزاج و اختلاط سے بنی۔ اگر اسی طرح اردو ادب میں بھی فارسی اور ہندوستانی کلچر اور روایات کا متوازن میل جول ہوتا تو آج اس کے خدوخال کچھ مختلف ہوتے اس کی شاعری کا دامن زیادہ وسیع اور اس کی مقبولیت ہمہ گیر ہوتی۔

○

"آدمی تو ہے پر کون آدمی ہے؟" راجہ آصف علی نے پھر پوچھا۔

"جناب والا! کہیں ہم ایک کوٹھریا کے دھوکے میں تھانے تو نہیں پہنچ گئے ہیں۔ کہیں اب ہم سے ہماری ولدیت تو نہیں پوچھی جائے گی؟"

ایک منٹ کے بعد میں نے راجہ صاحب کے مکان کے اس ہنگامہ خیز آہنی کھٹکے کے کھلنے کی گرج سنی جو گزشتہ کتنے برسوں سے صرف صبح کی نماز کے وقت کھلتا تھا اور جس کی ٹھن ٹھن سن کر لوگ اپنی گھڑیاں درست کر لیتے تھے۔ میں نے راجہ صاحب کی کمک کو پہنچنا ضروری سمجھا اور جب نیچے پہنچا تو شیخ جی کہہ رہے تھے "پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ ارے بھئی ہم کیا بتلائیں کہ ہم کون ہیں۔ کیا اس بھری دنیا میں کوئی بھی شخص اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتا سکتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کوئی مجھ سے اپنا تعارف کرا دے تو واللہ اس کے ہاتھ پر بیعت کر لوں۔ ارے آدمی کو تو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں، ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے۔ اور "شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے، نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے" ——— آہا! آہا! شکنِ زلفِ عنبریں۔ نگہِ چشمِ سرمہ سا ——— آہا! تو صاحبو، جب کوئی یہ بھی معلوم نہ کر سکا کہ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے تو وہ بیچارہ یہ کیسے بتلائے گا کہ وہ کیا ہے اور کون ہے۔ ویسے میرا نام شیخ رفیع الدین ہے، اور کام میرا اللہ کا نام لینا ہے۔ اور اس کوٹھریا میں جو تالہ پڑا ہے۔ وہ میرا ہے۔ ایک آدمی نے محرقے کا تعویذ لکھوایا تھا۔ تعویذ گھول کر پیا تو اللہ کی رحمت سے تندرست ہو گیا۔ بولا خدمت بتائیے۔ ہم نے کہا سر چھپانے کی کوئی جگہ دلوائیے۔ بڑے بڑے بنگلوں کے گیراجوں میں رہتے رہتے رگوں میں خون کی جگہ موبل آئل دوڑنے لگا ہے۔ سو اس نے اس کوٹھریا کا انتظام کر دیا۔ ہم دن کو آ جاتے پر آج ہمارے ایک مرید کے باپ کا چہلم تھا۔ سو یہ بات ہے۔"

سو ہماری گلی میں شیخ جی کیا آئے، چند مہینے پہلے کی ساری آبادیاں لوٹ آئیں۔ شام کے بعد کھمبے کا بلب تو خیر بجھا ہی رہتا لیکن شیخ جی جونہی اٹھتے گلی کے ہر گھر کا ایک نہ ایک نمائندہ ان کی خدمت میں پہنچ جاتا۔ شیخ جی چارپائی کے سرہانے کی طرف اور راجہ آصف علی پائنتی کی طرف آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور آس پاس پوری محفل سج جاتی۔ کوئی اپنے جوتے اتار کر انہی پر بیٹھ جاتا۔ کوئی پھٹا ہوا اخبار بچھا لیتا۔ نوجوان در و دیوار سے لگے کھڑے رہتے۔ پھر ایک روز شیخ جی کہیں سے دو چٹائیاں اٹھا لائے اور ان کی کوٹھریا اس گلی کی چوپال سی بن گئی۔ زیادہ وقت شیخ جی باتیں کرتے اور حاضرین صرف سوال پوچھنے پر اکتفا کرتے۔ آج تک نہ حاضرین کے سوال تھکے ہیں اور نہ شیخ جی کی باتیں ختم ہوئی ہیں۔ معلومات کا ایک دریا ہے جو کبھی تھمنے میں نہیں آیا۔

"ہا" شیخ جی گرج دار آواز نکالتے۔ "تحریکِ خلافت کی کیا پوچھتے ہو میاں۔ ایک شعلۂ جوالہ تھا جو پشاور سے برلن تک گھوم گیا تھا۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! بوڑھے سے بچے تک ہر شخص ترکی ٹوپی پہنے پھرتا تھا۔ عورتوں تک نے برقعوں پر چاند تارے سجا لئے تھے۔ ایمان تازہ ہو جاتے تھے یہ منظر دیکھ کر۔ ہم نے ایک روز مولانا محمد علی سے کہا "جوہر بھیا! تم اشارہ کر دو تو اس وقت سری نگر سے راس کماری تک بغاوت کی آگ بھڑک سکتی ہے۔ اور وہ انگریز جس نے ہمارے ٹیپوؤں اور سراج الدولاؤں اور بہادر شاہوں کو چبا لیا ہے۔ بصد ذلت عازمِ انگلستان ہو سکتا ہے۔ تم اس وقت کے اسرافیل ہو، صور پھونک دو تو حی و قیوم کی قسم۔ قیامت آ جائے۔" مگر مولانا بولے "شیخ جی۔ بغاوت کرنے سے پہلے بغاوت کی نبض دیکھ لینی چاہئے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ ہم انگریز کے پیچھے پڑ جائیں اور بعض ہمارے ہی بھائی بند ہماری ہی ماؤں بہنوں کو اچکتے پھریں۔" سو میاں ہم خلافتیوں کو یہی آبرو پر آنچ آ جانے کا خطرہ کھا گیا ورنہ آزادی آج سے تیس برس پہلے مل چکی ہوتی اور ہم اس کوٹھریا میں بند نہ پڑے ہوتے" ——— پھر وہ اپنے شاگرد خاکی کو پکارتے۔ "ارے بھئی خاکی میاں تم کہاں کھو گئے۔ آخر یہ کیا بدتمیزی ہے کہ جب تمہاری ضرورت نہیں ہوتی تو سر پر سوار رہتے ہو اور جب تمہاری ضرورت پڑ جائے تو عنقا ہو جاتے ہو۔" محفل میں گدگدی کی ایک رو دوڑ جاتی۔ اندھیرے میں بھی خاکی کے کالے چہرے پر اس کے دانت جھلملا جاتے۔ وہ پچیس تیس برس کی عمر اور صوفیانہ وضع قطع کے باوجود بچوں کی طرح سمٹتا ہوا اٹھتا اور شیخ جی کی چارپائی کے پائے سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ اور شیخ جی کہتے "مرزا نوشہ کی وہ غزل سناؤ جو کئی دنوں سے تمہیں رٹا رہا ہوں۔"

محمود یکھنا۔ تلفظ کی غلطی نہ ہو۔ تلفظ کی غلطی ہو جائے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی نے شعر کے کلیجے میں چھرا اتار دیا ہے۔" خاکی مناتا۔ "قبلہ شیخ جی وہ تو بڑی مشکل ہے۔ "تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں" سن لیجئے۔" شیخ جی کہتے۔ "ٹھیک ہے۔ وہ بھی ٹھیک ہے۔ اس میں بھی "مست کب بند قبا باندھتے ہیں" جیسے نشتر ہیں۔ پر بیٹھو مگر ہم تو خاکی سے وہ غزل سنیں گے :

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے

ظاہر ہے کہ لوگ بے جانے بوجھے شیخ جی کی تائید کر دیتے مگر خاکی بدستور رشتہ ناسکے ڈٹا رہتا۔ "جی نہیں قبلہ۔ بڑی مشکل ہے "۔

"مشکل ہے؟" شیخ جی گرجتے۔ "یہ شعر مشکل ہے؟ ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی۔ جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے۔ اور کیا یہ شعر مشکل ہے؟ کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں۔ آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے —— اور بھئی لوگو، تم کیوں کھیس کیا کر رہے ہو؟ ہائے شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے —— تو خیر، ہاں بھئی خاکی بسم اللہ کرو۔"

خاکی جھجک جھجک کر گاتا۔ پھر آہستہ آہستہ کھلنے لگتا۔ پھر محفل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ شیخ جی ہر شعر اور شعر کے ہر ٹکڑے پر واہ اور آہ کے نعرے لگاتے اور میں، اسے بھول جاتے کہ اس وقت اندھیری کھڑکیوں میں ان کی بہوئیں اور بیٹیاں جمع ہیں اور وہ بتوں کی طرح کھڑی خاکی کی سریلی آواز اور غالب کے اس مجرد شعر سن رہی ہیں۔ جو ذرا پڑھی لکھی ہیں وہ سوچ رہی ہیں کہ باغ میں بے حجابی کرنے اور نکہت گل سے حیا آنے کے درمیان کون سا رشتہ ہے۔ شیخ جی جھومتے جھومتے اچانک کڑک کر کہتے۔ "کیا کہا؟ بے حِجابیاں؟" پھر وہ خاکی کی خشخشی بالوں والی کھوپڑی پر تھپڑ مار دیتے۔ "حجاب کی ح بالکسر ہے چوند کہیں کے حجاب کی ح بھی بالکسر ہے اور نقاب کی ن بھی۔ بالفتح پڑھو گے تو یوں معلوم ہوگا۔ جیسے بے حجابیاں کرنے والا مرد ہے۔ زبر زیر کی لطافتوں کو پہچانو مستری کہیں کے سائیکلوں کی گھنٹیاں بناتے ہو کبھی ذوق کی گھنٹی بھی بجاؤ۔ ہاں تو کہو —— ہا —— ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی"——

ساری گلی میں شیخ جی کے گہرے تعلقات یا تو راجہ آصف علی سے تھے یا مجھ سے۔ راجہ صاحب سے اس لئے کہ ایک ہی دن کے بعد انہوں نے شیخ جی کے صبح کے کھانے کا مستقل انتظام کر دیا تھا اور پھر راجہ صاحب کو بھی مومن اور حسرت موہانی کے وہ بیسیوں اشعار یاد تھے جو محبوب کی آواز یا اس کے لباس کے توسط سے اس کے جسم کی رنگت سے متعلق ہو جاتے تھے۔ شیخ جی وضو کرتے ہوئے اچانک چلاتے "راجہ صاحب"۔ کھڑکی میں سے راجہ صاحب "قبلہ" کہہ کر جھانکتے اور شیخ جی کہتے "حسرت کا وہ شعر کیا ہے جس کا دوسرا مصرع ہے ؏ اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا" راجہ صاحب کہتے۔ "رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں" اور شیخ جی منہ پر پانی کا چھینٹا مار کر کہتے "اہاہا۔ کہاں کی بات کہاں جا کر نکالی ہے ظالم نے۔ اسے کہتے ہیں شاعری۔ یہ حسرت تو خلافت کے زمانے میں بھی ایسے تر ترا تے شعر کہنے سے باز نہیں آتے تھے۔ آہاہا"۔

مجھ سے ان کے تعلقات کی بنیاد میری چھوٹی سی لائبریری تھی جس سے شیخ جی روزانہ ایک کتاب کے حساب سے استفادہ کرتے رہے۔ پھر جب کتابوں کا ذخیرہ ختم ہوا تو رسالوں کی باری آئی۔ اور جب رسالے بھی ختم ہو گئے تو وہ روزانہ کا اخبار لے جاتے۔ جب وہ مولانا محمد علی ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں سے اپنے گہرے روابط کا ذکر کرتے یا پھر جب وہ نواب بھوپال، نواب رامپور اور راجہ محمود آباد کے محلوں کی یوں باتیں کرتے جیسے اپنی کوٹھریا کی کیفیت بیان کر رہے ہیں۔ یا جب وہ دلی کے انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس کو چاندنی چوک کے بیچ میں ہزاروں کے سامنے ڈانٹ دینے کا قصہ سناتے تو میں چپ چاپ سنتا رہتا کیونکہ شیخ جی کے انداز گفتگو میں آورد کا کبھی شبہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ یہ سب باتیں اس روانی اور بے تکلفی سے کرتے جیسے سچ مچ آپ بیتی سنا رہے ہیں۔ مگر ایک روز جب انہوں نے "لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر" پر آہاہا کا نعرہ لگایا تو میں نے بھری محفل میں کہہ ڈالا۔ "شیخ جی۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ آپ کو وہی شعر بھلے لگتے ہیں

جن میں انسان کے جسمانی حسن کا ذکر آئے ؟" اس پر شیخ جی ایک لمحے کیلئے یوں خاموش ہوئے کہ اس طرح پہلے کبھی خاموش نہیں ہوئے تھے۔ پھر بڑی گمبھیر آواز میں بولے "تمہیں رفتار کے لفظ سے دھوکا ہوا ہے میاں۔ ٹھیک ہے نا؟ پر دیکھو، خانہ ہونا۔ تم شعر کو سمجھے نہیں ہو۔ موج مے سے انسان کا دل مراد ہے اور رفتار سے شاعر نے پروردگار عالم کا کاروبار یا کائنات مراد لیا ہے اور اسی سے متاثر ہو کر کہا جلّ جلالہٗ العالمین ۔۔۔ لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر ۔۔ سمجھے؟ گر تم کیا سمجھو گے۔ تمہیں تو اس قسم کی شاعری پسند آتی ہو گی کہ تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے"۔۔۔ بد نصیب ہو۔ ہمارے زمانے میں پیدا ہوتے تو پتہ چلتا کہ شعر کیا چیز ہوتی ہے۔ آج کل تو جو اٹھتا ہے، دو شعر گھڑ کر ملک الشعراء بن جاتا ہے۔ سنا ہے تم بھی شعر و عر کہتے رہتے ہو۔ سناؤ تو دو ایک شعر۔ دیکھیں تو کتنے پانی میں ہو۔"

شیخ جی کو میری بات بری لگی تھی مگر صرف اس حد تک کہ وہ اس گفتگو کے بعد اداس سے ہو گئے۔ محفل خلافِ معمول بارہ بجے سے پہلے ہی ختم ہو گئی اور اس روز کافی عرصے کے بعد گلی والوں نے شکایت کی کہ کارپوریشن والوں نے کھمبے کا بلب کیوں نہیں بدلا۔

دوسرے روز ہماری گلی کی ایک لڑکی کی شادی تھی اور اس کے گھر نے صبح سویرے سے پوری گلی پر قبضہ جمانا شروع کر رکھا تھا۔ دیگچوں پر سے دیگیں اتر رہی تھیں۔ قناتیں لگ رہی تھیں اور بار بار گلی کے سرے پر تانگے آ کر رکتے تھے جن میں سے برقع پوش عورتیں زیور چھنچھناتی اور ریشم سرسراتی شادی والے گھر میں داخل ہو جاتیں۔ میں چائے پینے کے بعد دفتر چلا گیا۔ بارہ بجے کے قریب دعوت میں شریک ہونے آیا تو تمام راستے بند تھے۔ باراتی قطار اندر قطار کھانا کھا رہے تھے یا سگرٹ پی رہے تھے اور شیخ جی کی کوٹھڑیا کا دروازہ نیم وا تھا۔

میں نے کوٹھڑیا میں جھانکا تو شیخ جی نے اپنا میلا کچیلا کمبل پائنتی پر ترتیب قریب اٹھ دیا اور گرج کر بولے "کون ہے؟"

پھر مجھے دیکھ کر ان کے تیور سنبھلے اور بولے "آؤ میاں۔ آجاؤ۔ کھانا کھانے آئے ہو؟"

میں اندر چلا گیا۔ شاہ جی کی کوٹھڑیا کباڑ خانہ بن رہی تھی۔ مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتن فرش پر بکھرے پڑے تھے اور ان پر گرد کی تہیں جم چکی تھیں۔ کسی میں دال تھی تو کسی میں سوکھے ٹکڑے۔ مٹی کے ایک پیالے میں چند کھجوریں پڑی تھیں جنہیں چیونٹیوں نے چھلنی کر ڈالا تھا۔ کھڑکی میں زرد رنگ کی پرانی کتابوں کا ڈھیر اس طرح رکھا تھا کہ اگر اس پر چڑیا بھی آ کر بیٹھتی تو وہ زمین پر آ رہتا۔ چارپائی کے سرہانے کی طرف جو تکیہ رکھا تھا اس پر میل کا پلستر سا ہو چکا تھا۔ اور شیخ جی اسی پر کہنی رکھے، پائنتی پر سے اپنا غلیظ کمبل کھسکا کر میرے بیٹھنے کی جگہ بنا رہے تھے۔

میں بیٹھا تو اچانک فرش پر برتنوں میں حرکت سی ہوئی۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا تو شیخ جی بولے "کچھ نہیں میاں۔ چوہے ہیں۔" پھر وہ اٹھے۔ ننگے پاؤں چلتے ہوئے دروازے تک گئے۔ گلی میں دونوں طرف دیکھا اور دروازے کو بدستور نیم وا کر کے چارپائی پر آ بیٹھے۔ پھر بولے "معاف کرنا میاں ہم نے ذرا سختی سے پوچھ لیا تھا کہ کون ہے۔ آج صبح سے کوئی دس آدمی ہمارے پاس ایک ایک کر کے آ چکے ہیں کہ شیخ جی۔ چلئے کھانا کھائیے۔ اور ہم نے سب سے ہاتھ جوڑ کر درخواست کی ہے کہ ہمیں بخشئے۔ کل رات سے طبیعت کچھ بوجھل ہو رہی ہے۔ شادی کا مرغن کھانا کھا لیا تو کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ مگر وہ مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں ضرور آئیے۔ کھائیے نہیں تو آ کر ذرا سا بیٹھ جائیے۔ ان بدمذاقوں کو کون سمجھائے کہ ہماری ضرورت تو لوگوں کو چہلموں اور عرسوں وغیرہ پر پڑتی ہے۔ ہم شادیوں کی دعوت میں شریک ہوتے بھلے نہیں لگتے۔ تم ہی بتاؤ میاں۔ جس شخص نے خود شادی نہیں کی وہ دوسروں کی شادیوں میں کیا دلچسپی لے گا!"

"تو شیخ جی" میں نے حیرت سے پوچھا "آپ نے شادی نہیں کی؟"

"نہیں" وہ جیسے لاؤڈ اسپیکر پر بولے۔

"کیوں نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔

اور وہ ہنس کر بولے "اگر ہم تم سے یہ پوچھیں کہ کیوں میاں۔ تم نے داڑھی کیوں نہیں رکھی۔ تو تم سوائے اس کے کیا جواب دو گے کہ بس نہیں رکھی۔ سو ہم نے بھی بس نہیں کی شادی۔ مصروفیت زیادہ رہی۔ وقت نہیں نکال سکے۔ ہم تو ایک وقت میں ایک کام کرنے کے قائل ہیں۔ سو ہم یا تو خلافت کی تحریک چلاتے یا شادی کرتے۔ ہمیں خلافت عورت سے زیادہ بھلی لگی اس لئے شادی نہیں کی۔ تم نے شادی کی ہے؟"

"جی" میں نے کہا۔ "میرے بچے بھی تو آپ نے دیکھے ہوں گے"

"ہاں ہاں" شیخ جی بولے "ٹھیک ہے۔ دیکھے ہیں۔ ماشاءاللہ ماشاءاللہ"۔

گفتگو کا رجحان نجیات کی طرف ہو رہا تھا اس لئے میں خاموش ہو گیا۔ شیخ جی بھی خاموش بیٹھے، داڑھی میں انگلیاں ڈالے ٹھوڑی کھجاتے رہے۔ پھر اپنا چھوٹا تکیہ میری طرف بڑھا کر بولے "یہ لو میاں، آرام سے بیٹھو۔ جو بادی کھانا کھا رہی ہے وہ اُٹھ جائے تو چلے جانا"

میں نے تکیہ لے لیا اور شیخ جی سے رات کی گستاخی کی معافی مانگنے کے لئے مناسب الفاظ سوچنے لگا کہ اچانک شیخ جی بولے "کیوں میاں، تم نے شادی تو کر لی پر کبھی عشق بھی کیا ہے؟"

میں نے حیرت سے شیخ جی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ اس وقت ان کی آنکھوں کا میل بالکل غائب ہو چکا تھا۔ میں نے سوال کی نزاکت کے پیشِ نظر ہیر پھیر سے کام لینا چاہا سو پوچھا "کون سا عشق شیخ جی؟ حقیقی یا مجازی؟"

شیخ جی طنزاً ہنسے "حقیقی عشق تم کیا کرو گے میاں۔ دنیا دار آدمی حقیقی عشق نہیں کر سکتا۔ تم سے ہم نے مجاز کی بات کی ہے"۔

میں نے گھبرا کر کہا "جی کیا ہے۔ سب کرتے ہیں۔ کون ہے جس نے نہیں کیا؟"

اور شیخ جی بولے "مثلاً ہم نے نہیں کیا۔ قسم لے لو جو ان ہاتھوں نے کبھی کسی عورت کو بھولے سے بھی چھوا ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم جھوٹ بول رہے ہیں تو ابھی تمہارے سامنے ہماری انگلیوں کی پوروں میں سے کیڑے نکل پڑیں۔ بیس برس کی رہی تھیں تو اماں مرحومہ ہماری ایک عم زاد کا رشتہ ڈھونڈ لائیں۔ ہمیں سنا سنا کے کہنے لگیں کہ لڑکی پانی پیتی ہے تو شفاف جلد میں سے پانی اترتا ہوا دکھائی دے جاتا ہے۔ بتلانے لگیں کہ چپہ چپہ بھر لمبی آنکھیں ہیں اور ان پر چپہ چپہ بھر خمیدہ پلکیں ہیں غرض انہوں نے تو حد کر دی مگر ہم نے ابا مرحوم سے جا کر کہہ دیا کہ نہیں قبلہ۔ ابھی تو ہم داستان بوستان ہی کو سمجھ نہیں پائے۔ ابھی تو ہمیں علم کے کتنے مقامات طے کرنے ہیں۔ علم حاصل کر لیں تو بیوی بھی حاصل کر لیں گے۔ پھر چند برس بعد خلافت کی تحریک شروع ہو گئی۔ اس دوران میں ابا مرحوم کو ایک اور رشتہ سوجھا مگر اس مصیبت سے ہم اس طرح محفوظ رہ گئے کہ رشتے والوں کو ہماری درویشی پسند نہ آئی۔ پھر درس و تدریس میں الجھے تو کبھی یہ تک نہ سوچا کہ عورت نام کی کوئی جنس اس دنیا میں بستی بھی ہے"۔

شیخ جی یہ باتیں کچھ اس سنجیدگی سے کرتے رہے اور اس دوران میں ان کی سرخ و سفید رنگت پر کچھ ایسی زردی کھنڈی رہی کہ مجھے شیخ جی کی غلط بیانی کا یقین ہو گیا۔ میں نے سوچا جس شخص کے نقوش اتنے خوبصورت ہیں جس کی آواز میں اتنی جان ہے۔ جو علوم کا ذخیرہ ہے اور جسے حافظ اور غالب رٹے پڑے ہیں۔ اور پھر جو اس دنیا میں پچپن برس تک گھومتا رہا ہے جہاں کسی نہ کسی بھیڑ بھڑکے میں ایک آدھ بار ہر مرد اور عورت کا کھوے سے کھوا چھل ہی جاتا ہے وہاں شیخ جی نے کس مینار کا انتظام کئے رکھا ہے کہ وہاں پچپن برس تک بیٹھے رہے اور اب تک بیٹھے ہیں۔ یہ ناممکن ہے۔

میں نے شیخ جی سے کہہ دیا "نہیں قبلہ۔ یہ ناممکن ہے۔ میں نہیں مانتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ آسمان سے کوئی فرشتہ بھی اترے تو شادی کئے بغیر واپس ہونے کو اس کا جی نہیں چاہے گا"۔

شیخ جی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تو کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟ تمہیں ایک بار بتا جو دیا کہ ہم نے آج تک کسی عورت کو چھوا تک نہیں ہے"

پھر فوراً بولے: "جاؤ کھانا کھا لو۔"

یہ سنتے ہی کہ دروازہ کھولا تو خاکی اندر آ گیا اور شیخ جی بولے "خاکی کو بھی ساتھ لیتے جاؤ میاں۔ جاؤ بھئی خاکی۔ خوب ٹھونس کے کھاؤ اور کل شام تک کی چھٹی کر دو۔ ہم نہیں کھائیں گے۔ ہمارے مزاج ٹھیک نہیں ہیں۔" اور انہوں نے پائنتی کی طرف سے تکیہ اٹھا کر سرہانے کی طرف کھینچا اور کمبل کھینچ کر لیٹ گئے۔

دوسرے دن سے شیخ جی کے ہاں پھر وہی محفلیں جمنے لگیں۔ شیخ جی بڑے بڑے لیڈروں کے ساتھ کلکتہ سے پشاور اور بمبئی سے سری نگر تک کے دوروں، جلسوں اور جلوسوں کے قصے سناتے۔ خاکی سے غالب کی غزلیں سنتے اور رات کے بارہ بجے تک اندھیری گلی میں شعروں پہ داد و مرحبا کے ڈونگرے برساتے۔ دن بھر گلی کے بچوں کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتے پھر کسی بچے کو ننگ دھڑنگ گھر سے باہر نکلتا دیکھتے تو اس کی ماں یا بہن کو پکار کر کہتے "اے بی بی۔ اس مختار کو کس اکھاڑے میں اتارنے کے لئے تو نہیں بھیجا؟ یہ صاحب باہر گلی میں ننگے تشریف لے آئے ہیں۔ انہیں لے جاؤ۔" کوئی سودا بیچنے والا آتا اور اوپر کھڑکیوں میں سے جھانکتی ہوئی عورتیں اس سے نرخ پر جھگڑتیں تو شیخ جی فوراً گلی کی عورتوں کی مدد کو پہنچتے۔ خاکی بھی اب دن بھر کوٹھریا کے سامنے بیٹھا سائیکلوں کی گھنٹیاں بناتا بجاتا رہتا۔ ساتھ ساتھ وہ آہستہ آہستہ غالب کی غزلیں گنگناتا اور شیخ جی اس کا تلفظ درست کرتے رہتے۔

کوئی ایک مہینہ یونہی معمول کے مطابق گزر گیا۔ ان دنوں راجہ آصف علی محفلوں میں بہت کم شریک ہوتے کیوں کہ ان کی بیٹی کی شادی قریب تھی اور وہ ہر وقت اسی شادی کی تیاریوں میں لگے رہتے تھے۔ پھر جس شام کو گلی والوں کو معلوم ہوا کہ کل راجہ صاحب کے ہاں برات آ رہی ہے اور تمام گھروں سے کرسیوں اور دریوں وغیرہ کی ضرورت پڑے گی تو اس رات کو شیخ جی کے ہاں کی محفل سونی سونی سی رہی۔ شیخ جی کے بجائے کسی اور نے خاکی سے کوئی غزل گانے کو کہا۔ وہ غالب کی ایک غزل گانے لگا ع مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے۔ تیسرے شعر پر پہنچا تو شیخ جی نے اسے ایک غلطی پر اس زور سے ڈانٹا کہ محفل سناٹے میں آ گئی۔ تو پہلے انہوں نے خاکی کو چند گالیاں دیں پھر بولے "وضع احتیاط نہیں۔ وضعِ احتیاط۔ اضافت ہے۔ پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم" ——— ذرا سی خاموشی کے بعد وہ پھر کڑکے "بکو نا۔ بک رہے ہو تو بکتے جاؤ!"

خاکی مشین کی طرح گانے لگا۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

اور جب خاکی آخری مصرعے پر پہنچا تو شیخ جی نے اسے کچھ ایسی وحشت ناک آواز میں ڈانٹا کہ حاضرین دم بخود رہ گئے۔ کم سے کم مجھے احساس ہوا کہ خاکی نے ان اشعار میں تلفظ کی کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اور شیخ جی نے بھی جب اسے ڈانٹا تو اس کی کسی غلطی کی طرف کوئی اشارہ نہ کیا۔ بس عجیب بھیانک آواز میں کہتے رہے۔ "بکے جا رہا ہے۔ بکے جا رہا ہے۔ غزل کا ناس مار دیا تان سین کے سالے نے۔ بس۔ اب آج کے بعد یہاں کوئی نہیں گائے گا۔ اس کوٹھریا سے کسی کے گانے کی آواز نہیں آئے گی۔ بس۔"

خیر وہ لوگ قبل از وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور خاکی کوٹھریا کے ایک کونے میں جا کر گٹھری سا بن کر لیٹ گیا۔

دوسرے روز میں دوپہر کو دعوت میں شریک ہونے آیا تو گلی میں بلا کی رونق تھی۔ ساری گلی کو شامیانے سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور براتیوں کی ایک لمبی قطار میٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ راجہ آصف علی نے دور سے مجھے دیکھا تو لپک کر آئے اور بولے "بہت اچھا ہوا آپ وقت پر آ گئے۔ بس آپ بھلا اتنا کام کر دیجئے کہ شیخ جی کو منا لایئے۔ وہ ہم سے خفا ہو گئے ہیں اور اب تک یہ نہیں بتایا کہ کیوں خفا ہیں۔ آج صبح کی نماز میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ اندر کوٹھریا میں لیٹے ہیں۔ کہتے ہیں طبیعت بوجھل ہے۔ بزرگ آدمی ہیں۔ ان کا دعوت میں شریک ہونا ضروری ہے۔ ہم سب کو تو ڈانٹ دیا۔ اب آپ ہی قسمت آزمائی کیجئے۔"

کوٹھریا کا دروازہ بھنچا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولا تو لیٹے ہوئے شیخ جی تڑپ کر اُٹھ بیٹھے اور گرجے "یہ کون ہے؟"

میں نے اپنا نام بتایا تو بولے "آجاؤ میاں۔ آؤ۔ کھانا کھانے آئے ہو؟"

میں چارپائی پر چپ چاپ بیٹھ گیا تو وہ بولے "صبح سے راجہ صاحب جان کھینچ رہے ہیں کہ رکھی ہے سکتے میں دعوت میں ضرور شرکت کرو۔ اب بھی میں کیسے شرکت کروں۔ شادیوں کی دعوتوں میں شرکت مجھے کچھ بھلی نہیں لگتی۔ عرسوں میلوں کی دوسری بات ہے۔ شادی پر خوشی منانا تو میاں، میرے نزدیک بداخلاقی پر خوشی منانا ہے۔ راجہ صاحب کی اس لڑکی کو میں نے کھڑکی میں کھڑے ہوئے ہزار بار دیکھا ہے۔ ایسی بھولی بھالی آسمان کی حور سی لگتی تھی۔ اور اب راجہ صاحب اسے نہ جانے کس لونڈے کے حوالے کئے دے رہے ہیں یعنی یہ معصوم اب ایک غیر آدمی کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے کی طرح ڈال دی گئی ہے اور اب یہ بچے پیدا کرے گی اور ناس مار دے گی اپنا۔ اس بات پر اگر راجہ صاحب خوشی منا رہے ہیں تو منائیں۔ وہ مختار ہیں۔ پر ہم سے کیوں کہتے ہیں کہ آ کر شرکت کرو۔ بھئی نہیں مانتا جی۔ نہیں آ سکتے۔ قصّہ ختم!"

میں نے کہا "شیخ جی، آپ پسند کریں یا نہ کریں پر آپ کو شرکت کرنی چاہئے۔ آپ بزرگ آدمی ہیں۔ نیکوکار ہیں۔ آپ کی شرکت سے برکت ہوگی۔"

اور اچانک شیخ جی کے تیور عجیب غیر معمولی انداز میں بدل گئے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ٹھنڈے پسیجے ہوئے ہاتھ میں لے لیا۔ اور لیٹی اور رندھی ہوئی آواز میں بولے "تم کہتے ہو میں بزرگ ہوں، نیکوکار ہوں۔ تم مجھے احمقوں کی جنت میں لے جانا چاہتے ہو؟ نہیں میاں۔ میں نیکوکار نہیں ہوں۔ نیکوکار ایسے نہیں ہوتے۔ یہ اپنی گلی میں بجلی کے کھمبے کا بلب دیکھتے ہو؟ اس میں وہ سب کچھ ہے جو اس کے دوسرے بھائیوں میں ہوتا ہے۔ مگر اسے بلب کون کہے جبکہ یہ جلتا ہی نہیں۔ بلب وہی ہے جو جلے۔ نیکوکار وہی ہے جو نیک کام کرے۔ اور سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے خدا کی مخلوق کی خدمت کرے۔ پر میاں یہ بتاؤ۔ کیا عورت خدا کی مخلوق نہیں ہے؟"

میں خاموش رہا۔ اور میرے ہاتھ پر شیخ جی کے ہاتھ کی گرفت بہت سخت ہونے لگی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولے "اور اس روز جو ہم تمہیں بتا رہے تھے کہ ہم نے زندگی بھر کسی عورت کو چھوا تک نہیں تو ہم غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ ہمیں تو پتہ تک معلوم نہیں میاں کہ عورت کے جسم کو چھوا جائے تو کیسا لگتا ہے۔ تم ہمیں نیکوکار کہتے ہو حالانکہ ہم تو وہ بدنصیب ہیں کہ دنیا بھر کی عورتوں میں سے کسی ایک بیچاری کی بھی دلجوئی نہ کر سکے۔ تو ایسی حالت میں ہم کس منہ سے کسی عورت کی شادی میں شریک ہونے جائیں میاں۔"

پھر وہ ایک دم ٹوٹ کر رو دئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے "راجہ صاحب سے کہہ دو کہ ہمیں معاف کر دیں۔ ہم اس قابل نہیں ہیں۔ ہم کسی قابل نہیں ہیں۔"

* * *


عید
کے لئے یہ خوبصورت جُوتے خریدیئے
عید کی ضروریات کے لئے آج ہی اپنے اور اپنے
گھروالوں کے لئے یہ خوبصورت جُوتے خریدیئے ۔ یہ
جُوتے اعلیٰ قسم خام مال سے تیار کئے جاتے ہیں اور ہمارے
ماہرین کی زیرِ نگرانی بنائے جاتے ہیں۔ تاکہ
آپ کے پاؤں کے لئے آرام دہ ثابت
ہوں ۔ یہ جُوتے کم قیمت
اور دیرپا ہیں ۔
بریزی
Bata
باٹا
سُلطانہ
جونیئر
دُنیا بھر کے جفت ساز
KONTAK

B.S (.57-16.U


برماشیل یوم جمہوریہ پر
مبارکباد پیش کرتی ہے

انور عظیم

کھپریل

زرد چاندنی آہستہ آہستہ سانس لینے لگی۔ سلیم خاں نے اپنے ہونٹ کھول دیئے اور اپنے سینے میں سانس کے تلاطم کو دبانے کی کوشش کرنے لگا۔
دور سے گوالوں کے برہا گانے کی آواز آئی۔

"کنگر چن چن محل بنیئے ہو او او او"

اس کا دل غم کی چاندنی میں ڈوب گیا جس کا رنگ قمرن کے اداس اور فریادی گول چہرے کی طرح زرد تھا
آخر گھبرا کر اس نے گنگنانا شروع کر دیا لیکن بھاری آواز کے ان کمزور ٹکڑوں میں غم اور محرومی کے چڑھتے ہوئے دریا کو روکنے کی سکت کہاں تھی اس نے کپکپاتے ہونٹ کو خشک زبان سے چومتے ہوئے کھپریل کی طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے ایک موٹی سی گالی نکلی "سور کے بچے نے حرام خوروں کا پہرہ بٹھا رکھا ہوگا۔ لیکن یہ الو کی پٹھی قمرن بھی واقعی الو کی پٹھی ہے۔ خالی خولی محبت کرے کہ چاٹا کرو۔ اتنا نہیں جانتی خالی آگ سے کام نہیں چلتا۔ حقہ پیتا ہے تو چلم میں تمباکو بھی چاہیے" اس وقت اس کی آنکھوں میں قمرن کے باپ ملک رجب علی کی تصویر پھر گئی۔ جس کے آگے حقے کی چلم اس کے اپنے دل کی طرح دہک رہی تھی اور منہ سے ایک سپید دھواں نکل رہا تھا

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ درختوں کے پتے جھڑ کر اس کے قدموں میں آ رہے۔
برہا گانے والے مست گوالوں نے پھر ایک ہانک لگائی اور اس کے ساتھ ہی خنکی بڑھ گئی قبرستان میں پختہ قبروں کا رنگ اور سفید ہو گیا اور ان کے کتبے کچھ اکڑوں بیٹھے بوڑھے فقیر نظر آنے لگے۔ سلیم خاں کو ایک جھرجھری سی آئی ہوا کے جھونکے اس کے سفید کرتے سے عطر حنا اور بالوں سے آملا تیل کی خوشبو چرا لے گئے اس کے اپنے بدن سے کافور کی بو آنے لگی اور جب اس نے قبرستان کی طرف دیکھا تو اس کا دل دہل گیا۔ ایک سیاہ بھوت جھومتا جھامتا اور خشک پتوں کو چرمراتا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا
نیم شیم پیپل کے ٹھنٹھ کے پاس آ کر بھوت رک گیا سلیم خاں کے پاؤں تو نو من کے ہو گئے اور وہ بھاگ نہ سکا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں
"سلیم خاں ہیں تو بال بال بچی"
"قمرن کی بچی!" سلیم خاں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
"باغ کی چہار دیواری پھاند کر دوسری طرف سے قبرستان ..... "وہ اس کی سانس پھول رہی تھی ——— "تمہاری جان قسم کتا اتنا بھونکا اتنا بھونکا ..... روٹھے تو نہیں ——— دیکھو ہرن کے کباب لائی ہوں"
سلیم خاں کباب کھانے لگا اور قمرن نے اپنا سر اس کے چوڑے چکلے سینے پر رکھ دیا سلیم خاں نے جب قمرن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو مردہ سی زرد چاندنی میں جیسے دہکتی ہوئی سنہری رنگت کا خون دوڑ گیا۔ سلیم خاں کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے کباب کے روغن سے چپچپاتی ہوئی انگلی کو کرتے کے دامن سے صاف کرتے ہوئے قمرن کے کان میں کہا "گوالوں کا گیت سن رہی ہو میں تو اپنی شادی پر ان گوالوں سے برہا گواؤں گا"

"چلیے۔۔۔۔ بدھو" قمرن کا دل دھک سے رہ گیا "قبرستان کی طرف سے کوئی آرہا ہے ——— بھاگ جاؤ"

"نہیں میں نہیں بھاگتا"

"نہ بھاگو تو میرا مرا منہ دیکھو ——— سلیم میں بدنام "

سلیم خاں درختوں کی آڑ میں غائب ہو گیا۔ سوکھے پتوں کی چرمراہٹ ایک طرف دور ہوتی گئی اور دوسری طرف قریب

لیکن یہ حادثہ پرانا ہو چکا تھا۔ کتنی مرتبہ چاندنی راتیں آئیں، جاڑا گیا، پت جھڑ کے بعد جھکڑ کا موسم گرد و غبار کا طوفان اٹھا گیا اور اب تو آسمان میں بادلوں کا ڈیرا تھا اور گاؤں سے باہر ہر طرف جل تھل ہو رہا تھا۔ جھکے جھکے کھجور کے پیڑ اور آسمان سے باتیں کرتے ہوئے تاڑ تر و تازہ نظر آتے تھے اور دھان کی طرف برساتی نالے اچھلتے کودتے دوڑ رہے تھے۔

اکیلا سلیم خاں خاموش تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی آخری چاندنی رات لبی ہوئی تھی جب قمرن نے اس کے سینے پر سر رکھ کر، مہندی بھرے ہاتھوں سے اس کو ہرن کے کباب کھلائے تھے۔

اب وہ لوگوں کے چھیڑنے پر گالیاں بھی نہیں بکتا تھا۔ البتہ اس کی آواز دب جاتی تھی اور اس کی آنکھوں سے ایسا ضرور معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی جلتا ہوا نوالہ گلے میں اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔

آگ کی گیند پہاڑوں کے پیچھے چھپتی چلی جا رہی تھی دھان میں کھڑی ہوئی میلی کچیلی عورتوں کے ہاتھ رک گئے اور انہوں نے دن بھر کی تھکن کو اپنی پیشانی سے نچوڑ کر اپنی اپنی کمر سیدھی کی۔

ابھی سلیم خاں کی مٹھی میں نرم و نازک پنیریوں کی ایک گانٹھ موجود تھی اس نے جھجکے جھجکے محسوس کیا کہ اس پاس کے ٹھیوں میں لوگوں کے ہاتھ رک گئے ہیں۔ دور دور کے گیت بھی خاموشی میں ڈوب گئے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے دیر کی تو وہ سب سے پیچھے رہ جائے گا ——— اور اب کے دھان کی فصل گدرائی نہیں تو بڑی شامت آئے گی۔

اس کا بنیان گیرو مٹی کے رنگ کا ہو گیا تھا اور اس کی ٹانگیں پنڈلیوں کے مٹیالے پانی میں دھنسی ہوئی تھیں۔

"ارے او! سورج چھپ گیا بھائی۔ سر نہوڑانے سے کیا ہوتا ہے" گماشتے کی آواز میں جب معمولی تمسخر تھا "شہری بابو لوگ کھیتی کریں۔ ہوں۔ ای بیل تو منڈھے چڑھ چکے۔ ہوں"

سلیم خاں نے سنی ان سنی کر دی اور تیزی سے پنیریوں کو کھیت کی مٹی میں پیوست کرنے لگا جیسے کوئی بڑی مشاق عورت ریشمی کپڑے پر سوئی چلا رہی ہو "بس بس چلے تو یہ سب مجھے کھا جائیں۔ لیکن خیر۔۔۔۔" دیکھتے دیکھتے پنیریوں کی گانٹھ غائب ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے دونوں ہاتھ گدلے پانی میں ڈالے رہا۔ اس کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں ٹپکیں اور بلبلا بنائے بغیر پانی کے اندر تحلیل ہو گئیں تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا تو شام کا سرمئی رنگ گہرا ہو چکا تھا اور دھان کرنے والے مرد اور عورتیں کھیتوں سے نکل کر گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ وہ اسے بہت ہی خیالی اور دھندلے نظر آئے مینڈک زور زور سے ٹرا رہے تھے اور دور درختوں پر چڑیوں کی چہچہاہٹ خاموشی میں تالیوں کی طرح گونج رہی تھی ایک بیل گاڑی قریب ہی کیچڑ میں پھنس گئی تھی اور تین چار آدمی اس کے پہیوں کو گھمانے کے لئے زور لگا رہے تھے اور جوش و خروش کے ساتھ "ہے مارا ہے مارا" کا نعرہ لگا رہے تھے سلیم خاں کو یہ آواز گونجتی ہوئی تنہائی میں کچھ محسوس ہوئی اور وہ پانی سے نکل کر بوڑھے پیپل کے تنے پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے ہوئے

تھے اور اس کے جالی دار بنیان سے اس کے سینے کے بھیگے ہوئے گھنے بال باہر جھانک رہے تھے۔ "میں اسی طرح اس گدلے پانی میں اپنا خون پسینہ ایک کر دوں گا، اگاؤں گا اور دیکھوں گا، پھولوں کی اونچی ناک کب تک مجھے اپنی شیریں سے جدا رکھتی ہے؟ سالے ان کے پیچھے!" اندھیرا ہو چکا تھا اور گاؤں میں چراغ ٹمٹمانے لگے تھے۔ اس کے دل میں یادوں کے ان گنت چھوٹے چھوٹے چراغ جل اٹھے اور ان کی لرزتی ہوئی لوئیں اس کے دماغ کو گرمانے لگیں۔

بڑے پیر کے پچھلے عرس سے دو تین دن پہلے وہ کلکتے سے دو برس بعد واپس لوٹا تو گاؤں والوں نے بڑی سرد مہری سے اس کا خیر مقدم کیا۔ "جب باپ مر گیا تو لونڈا اس کی کھیت پہ قبضہ جمانے آن دھمکا۔" وہ خاموشی سے یہ سب سنتا رہا۔ "بیٹے صاحب شہر گئے تھے۔ بھائیو حاجی گھر لوٹ آیا!" "آخر یہیں تان ٹوٹتی" "باپ نے جھونپڑی چھوڑی ہے اس کو اور نئے پہننے پلے ڈالے گا۔ اور نکل جائے گا یہاں سے آوارگی کرنے۔"

لیکن وہ ان تمام تلخ اور بیزاری سے بھری ہوئی پیش گوئیوں سے بے پروا روز شام کے وقت اپنے باپ کی قبر پہ جاتا، خاموش کھڑا رہتا اور رات گئے اپنے گھر واپس آ جاتا۔ اس کی جوان بہنیں اس کا کھانا لاتیں اور لالٹین کی بتی تیز کرتیں۔ وہ جھنجھلاتا "بھئی بتی تیز نہ کرو۔" بتی پھر کم ہو جاتی۔ "بھیا! اتنی مدھم روشنی میں کھانا کیسے کھاؤ گے؟" وہ رکابی سامنے رکھے کچھ سوچنے لگتا۔ اس کے باپ نے آخری بار اس کے بھاگنے سے پہلے کھانے کی رکابی اس کے آگے سے اٹھا لی تھی "تو کھیت میں کام نہیں کرے گا تو کھائے گا بھی نہیں"

وہ غصے میں بھر کر کھڑا ہو گیا تھا "میں تو پڑھوں گا۔"

"چپ ... کھیرلی کے چھوکروں نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ مڈل پاس ہو گیا۔ بس بہت ہو گیا۔ آسمان پہ جائے گا تو اس زمین کا کیا ہو گا جو سات پشتوں سے ہمیں اپنا خون پلاتی رہی ہے۔" اس دن رحیم خان نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پہ اٹھا لیا تھا۔ ادھر رحیم خان نے کھانا شروع کیا اور ادھر سلیم خان گھر سے نکل راتوں رات اسٹیشن کی طرف چل دیا جو وہاں سے کوسوں دور تھا۔

سلیم خان ان یادوں میں کھویا ہوا جب گھر پہنچا تو اس کی کوٹھری اندھیری تھی۔ اس کی آہٹ پا کر سلیم خان کی بہن سکینہ لالٹین لیے لپکتی ہوئی آئی۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا بھی تھا۔ سلیم خان کو صحن میں اندھیرا نظر آیا۔ "سکینہ گھر میں اندھیرا کیوں ہے؟"

"گھر میں مٹی کا تیل نہیں تھا.... تم یہ لالٹین رکھو ادھر کام......"

سلیم خان نے زبردستی ڈانٹ کر لالٹین واپس کر دی۔ کنوئیں پہ سے نہا کر جب وہ لوٹا تو اس کو اپنی کوٹھری کے دروازے پہ مؤذن صاحب کا چھوکرا نظر آیا۔ اس نے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پرزہ تھمایا اور رفوچکر ہو گیا۔

سلیم خان کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی بہن سے لالٹین منگوائی اور جب وہ اندر واپس چلی گئی تو اس نے کوٹھری کا دروازہ آہستہ سے بند کیا اور وہ پرزہ پڑھنے لگا جو اب تک اس کی نم مٹھی میں مڑا پڑا تھا۔

"پرسوں بڑے پیر کی عرس کی رات ہے۔ کھنڈر کے پچھواڑے میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

اس کی رگوں میں خون جل اٹھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور گنگناتا ہوا گاؤں سے باہر ان کھیتوں کی طرف نکل گیا جہاں پانی میں بھیگی ہوئی مٹی مہک رہی تھی اور جھینگر بول رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ چاندنی کھیتوں پہ پھیلی ہوئی تھی اور دور درختوں کے جھنڈ میں ہوا سرسرا رہی تھی۔

کام کے بوجھ تلے چند دن سے اس کے دل کی آگ دب گئی تھی لیکن جب اس نے شام کے وقت آخری پنیریاں بھی کھیت کو سونپ دیں تو اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل ویران ہے۔ لیکن جب سے اسے قمرن کا پرزہ ملا تھا اس کے دل میں شہنائیاں بج رہی تھیں۔

زندگی کیسے کیسے روپ دکھاتی ہے۔ وہ دیر تک پیپل کے پیڑ تلے کھڑا، کھیتوں سے اٹھتی ہوئی مٹی کی سوندھی مہک اور فضا کی نمی کو اپنے اندر پیتا رہا۔

[illegible]

ابھی پچھلے برس جب [illegible] سادہ [illegible] جیسے سپاہی کی طرح اپنے گاؤں لوٹا تو [illegible]

کھل اٹھا تھا اسکول کے بچوں [illegible] خود اسے عجیب خوب قصے سنائے [illegible] زیادہ تر کھرل کے متعلق تھے [illegible]

کے میاں [illegible] ایک [illegible] نفرت سے بھی گئی تھی۔ کھرل [illegible]

[illegible] کے [illegible]۔ ہاں یہاں کہیں کہیں کھرل کے [illegible] نظر آتے تھے لیکن یہ کھرل کے [illegible]

کچھ نہ تھا اور کھرل والے اسے نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کھرل کے سب میں سے سلیم خان [illegible]

تھا۔ جب کبھی موقع [illegible] کی نوبت آتی تو وہ سپاہیوں کے سینوں پر چڑھ کر [illegible]

[illegible] سے آتا رہتا۔ حالانکہ اس کے بعد اس کے باپ، رحیم خان کی طرف سے اس کو بڑی [illegible] تکلیف دہ [illegible]

شامل تھا۔ ہاں اس نے بچوں کے [illegible] قبول کیا مگر منہ کا [illegible] کبھی [illegible] نہیں دیا۔

گاؤں کے لڑکے اس سے شہر کی لڑکیوں کے قصے سنانے کو کہتے تو بیچارہ اپنے لمبے بالوں کو پیچھے کی طرف [illegible]

اس کے تانبے جیسے چہرے پر گھبراہٹ پیدا ہو جاتی اور اس کی چھوٹی اور حنائی آنکھیں چمکنے لگتیں لیکن اس کی جوانی ایسے خوبصورت [illegible]

[illegible] خالی تھی وہاں بھوک پیاس، محرومی اور بیروزگاری کی دھول اڑ رہی تھی۔ آخر اپنے تصور کے [illegible]

اور حیران آنکھوں سے گھورنے والے اس کے پاس بیٹھے جنم جنم کے پیاسے دیہاتی لونڈے اپنی سانس کو قابو میں کرنے کے [illegible]

اور حسرت کی نظر سے دیکھتے اور پھر اپنی من گھڑت کہانیاں سناتے جن کے [illegible] کھرل کی [illegible]

[illegible] پریوں کی طرح نازک اور [illegible] ہوتی۔ بات کرتے اس کے منہ سے پھول جھڑتے، چلتی تو [illegible] پائل [illegible]

سے آسمانوں پر پورب سے پچھم تک دھنک کی رنگین [illegible] میں لہرانے لگتیں۔ اور جب [illegible] کی جنون انگیز مہک کا طوفان [illegible]

کرنے لگتا تو [illegible] میں [illegible] جاتیں پھولوں کی پنکھڑیاں [illegible] پریوں کی طرح اڑنے لگتیں اور [illegible] خوف زدہ تتلیوں

کی طرح بکھر جاتا۔

”یار تم کبھی شہر جاؤ تو معلوم ہوگا کہ یہ کتنا خوفناک دیو ہے“، سلیم خان کی اس بات سے سب سہم جاتے اور کہتے ”سلیم خان تو پھر تم بھاگ کر شہر کیوں چلے گئے تھے؟“

”یہی میں خود اپنے آپ سے پوچھتا ہوں؟ پتہ نہیں چلتا کیوں؟“

بڑے پیر کے پچھلے عرس کی رات، حسب دستور پورا گاؤں نئے کپڑوں، رنگا رنگ [illegible]، [illegible] کی خوشبوؤں [illegible]

ہوئے ہر طرف، [illegible] اور مرادوں کی دعاؤں اور قوالیوں [illegible] خواہشوں کی فضا میں گھری ہوئی [illegible]

سلیم خان بھی سفید ململ کے کرتے پر گردن میں ریشمی رومال باندھے ہوئے بڑے تیکھے انداز میں محفل کے اس گوشے میں [illegible]

[illegible] کھرل کے نوجوان بیٹھے تھے دوسری طرف برآمدے [illegible] کے پیچھے گاؤں کی لڑکیاں [illegible] رہی تھیں۔ جب [illegible]

تو سلیم خان کی آنکھیں اٹھتے ہوئے پردے کے پیچھے [illegible] کر ٹھٹک گئیں۔

”کھرل کی سب سے [illegible] ہے، خدا کی قسم“ کسی پٹھان [illegible] نے سلیم خان کا [illegible] ہوئے کہا۔

”پٹھان لونڈے [illegible] کون سا پٹھانوں کا قصہ ہے میری جان [illegible] گیا۔

[illegible]

[illegible] ہو چکا ہے۔ گاؤں کا [illegible] اچھا ہو رہا ہے؟

گاؤں والے تو [illegible] سلام۔"

[illegible] کے کمرے میں [illegible] سلیم نے دیکھا کہ وہ سب اس کی جانب دیکھ کر دانت نکال رہی ہیں اور اس نے [illegible] ہو جاتا ہے۔ اس نے [illegible] کی طرح سرخ اور [illegible] دانت کے [illegible] ہوئے سر جھکا لیا۔ سلیم خاں کو [illegible] ہوتی گیا [illegible] آ رہا ہو؟ اس نے رومال گلے سے کھول لیا اور پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگا۔

وہ [illegible] کی [illegible] سلیم خاں [illegible] اور پٹھان [illegible] کے [illegible] تھا اور [illegible] آسمان کی [illegible] گھومتے ہوئے [illegible] آ جاتا تھا

بچپن میں [illegible] سے [illegible] بھی سب [illegible] جب وہ [illegible] آتا جاتا تھا۔ اس میں دل کے دھڑکنے کی کیا بات ہے؟ ٹھیک!"

[illegible] سے [illegible] کی حویلی کے [illegible] دروازے [illegible] پہنچ گیا۔

[illegible] رحیم خاں [illegible] کا بیٹا سلیم خاں بڑی بیگم کو سلام کرنے آیا ہے۔"

بڑی بیگم کے سامنے سلیم خاں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ بڑی بیگم [illegible] پان سامنے [illegible] رہی تھیں ان کے [illegible] اور [illegible] ہیرے کی طرح سفید اور [illegible] رہی تھی۔

آہستہ [illegible] سعادت مند ہو گیا ہے۔ رحیم خاں کے اچھے [illegible] اپنا لئے [illegible]۔ واہ شاباش [illegible] پٹھانوں کے [illegible] کا ہے کہ [illegible] کریں [illegible] کمائیں اور [illegible] منہ پر [illegible] کریں۔ اچھا [illegible] بتائے [illegible] کھیت سنبھال لے گا [illegible] تیری بہنیں [illegible] خراب ہے [illegible] زمین کے جنجال سے نکل اور [illegible] کے ہاتھ [illegible] کر اور کسی کے ہاتھ میں دے ان کا ہاتھ۔"

بڑی بیگم کی [illegible] سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا لیکن چپ چاپ سب کچھ سن رہا تھا اور [illegible] سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ شاید کہیں وہ [illegible] نظر آ جائے۔

[illegible] کی آواز آئی [illegible] جھانک رہی تھی ابھی ابھی نہا کر آئی تھی بھیگے بالوں میں سے جھانکتی ہوئی آنکھیں مچھلیوں کی طرح [illegible] رہی تھیں۔ اور اس کا [illegible] سنہرا ہو گیا تھا۔

[illegible] پہچانا؟"

"وہ اپنے رحیم خاں کا بیٹا [illegible] ہے [illegible]" اس دن [illegible] سلیم خاں واپس آ گیا۔ وہ بڑی بیگم کی تمام باتیں [illegible] بھیگے [illegible] بال اور [illegible] ہوئی آنکھیں بار بار یاد آ رہی تھیں۔

[illegible] سے [illegible] کر بات چیت کی [illegible] "گھبراؤ نہیں [illegible] کام سنبھال [illegible] ہے۔"

[illegible] اپنے [illegible] کے بکس کی تلاشی لی اور اس میں سے کلکتے کے وہ تحفے نکالے جو اس کی دولت تھے، ایک بڑا سا رومال [illegible] جس کی پشت پر ایک عورت کی [illegible] تصویر تھی، اور [illegible] کے [illegible] کتابچے، ایک خالی عطر کی شیشی اور [illegible] کا فیتہ نکلا۔ [illegible] گیا شام تک اپنے [illegible] آ گیا۔ [illegible] کے بعد اس نے [illegible]

کمبخت سمجھتی کیا ہے تمہیں کھپریل سے کیا ڈر سکتا ہوں!"

اس نے بہت غور کیا بہت سوچا، لیکن آگے اسے کوئی راہ سجھائی نہ دی۔ دور سے چوکیدار کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے [illegible] اپنی کوٹھری سے باہر چلا آیا۔ کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا وہ کھپریل پہنچا اور پھر اس گلی میں جہاں سے قمرن کا دروازہ کو [illegible] تھا اس نے ادھر ادھر دیکھا اور جھٹ اچھل کر کھنڈر کے ٹیلے پر چڑھ گیا اور دیکھتے دیکھتے وہ سید رجب علی کی چھت پر تھا۔ اس نے پلٹ کر اس درخت کو [illegible] اوپر پہنچا تھا اور جس کی شاخیں اب تک ہل رہی تھیں۔ اچانک وہ بلیاں بڑی بیگم کے کمرے کے پاس لڑ پڑیں اور سلیم خان کا دل اچھل پڑا۔ وہ آہستہ آہستہ [illegible] کے کمرے تک پہنچ گیا۔ اس کی چیخیں ایک اور سرے پر منہ سے کھڑی تھیں اور قمرن کا سر تکیے کے اوپر نہیں بلکہ تکیے کے نیچے دبا تھا اس نے تکیہ اٹھالیا۔ قمرن اچھل کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ سے مثنوی زہرِ عشق کی جلد گر پڑی۔ اس نے سلیم خان کو پہچان لیا لیکن اس کے ہوش اب بھی اڑے ہوئے تھے۔

"تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ میں تمہارے کھپریل سے ذرا نہیں ڈرتا اور وقت پڑا تو میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا"

قمرن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اتنے میں بڑی بیگم کے کمرے کے پاس بلیوں کے غرانے کی آواز ختم ہو گئی اور کسی کے تیز تیز چلنے کی آواز آئی۔ سلیم خان جلدی سے کمرے سے نکلا اور درخت کی شاخ کو پکڑ کر نیچے کود گیا۔

قمرن کچھ دیر چھت کی کڑیوں کو گھورتی رہی اور پھر سو گئی۔ مثنوی زہرِ عشق زمین پر پڑی تھی اور اس کے ہونٹوں پر ابھرتی ہوئی مسکراہٹ اور پیشانی پر پسینے کے قطرے اس کی نیند کا بھید کھول رہے تھے۔

ایک دن سید رجب علی کی بیگم نے سلیم خان کو اندر حویلی میں بلوایا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر کیا بات ہے۔ لیکن بات کچھ نہ تھی۔ اسے ایک بہت ضروری خط لے کر شہر کے جلیل القدر ڈپٹی صاحب کے پاس جانا تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ بڑی بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر چلا آیا۔

"دھونس نہیں چلے گی میں کسی کا غلام نہیں ہوں"

اس کی اس باغیانہ بے پروائی نے کھپریل کی نظر میں اس کو خاصا خطرناک بنا دیا تھا۔ "یہ لونڈا پٹھان ٹولے والوں کا مزاج بگاڑ دے گا۔ ذرا دیکھنا برابری کی بات کرتا ہے"

اس نے موذن صاحب سے جب یہ بات سنی تو کہہ دیا "زمانہ لد گیا جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے"

سید رجب علی کے حکیم نما بیٹے نے کہا "زمانہ کبھی نہیں لدتا بھئی"

"آپ کو کیا معلوم آپ تو زمانے پر خود لدے ہوئے ہیں"

اس ایک بات سے پورے گاؤں میں آگ سی لگ گئی۔ اس کا بڑا چرچا ہوا۔

"تجھی اس چھوکرے کو سمجھ میں کرو ورنہ کیسے کیا ہو جائے گا۔ ہم تو کھپریل کے احسان تلے دبے ہوئے ہیں اور یہ چھوکرا خواہ مخواہ جھگڑا اکھاڑ رہا ہے سیدوں کا سایہ بڑی نعمت ہے" مولوی صاحب نے فتویٰ دیا۔

پٹھان ٹولے کے بڑے بوڑھوں نے بھی سلیم خان کی طرف سے اپنے دامن کھینچ لیے۔ لیکن وہ اور بھی سینہ پھلا [illegible] اپنی جگہ پر اڑا رہا اور اس کی ہمت [illegible] سے کھپریل کے بزرگوں کے سینے پر سانپ لوٹتے رہے۔

رات کا وقت، چند دن بعد سلیم خان کی کوٹھری کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور قمرن نے آ کر اسے سوتے سے جگایا۔ وہ ایک کالی چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں۔

"کیا غضب کرتے ہو سلیم خاں" اس کے ہونٹ تھرتھرائے "تم جھگڑا کیوں کھڑا کر رہے ہو!"

"جھگڑا کیسا ؟"

"اب تم بہت لالچی ہوتے گئے ہیں"

"تجھا کرو ہو ہو تا کیسں کر رہے ؟"

قمرن خاموش کھڑی اسے ملتجی نظروں سے دیکھتی رہی۔

"قمرن تم چاہتی ہو کہ تمہاری شادی کا پیغام لے کر میں ڈپٹی صاحبوں کے یہاں جاؤں ؟"

قمرن بڑے سوز و اثر کے ساتھ آئی تھی لیکن سلیم خاں طوفان کی طرح بپھر رہا تھا اور اس کی ضد پر کوئی کمزور چراغ کیا جل سکتا تھا۔

اس کے جانے کے بعد سلیم خاں دیر تک چوکیدار کی پکار سنتا رہا "جاگتے رہو ...... ہوہو ہوہا" اٹھ کر اس نے زور سے دروازہ بند کیا۔

"سو دیا جاگو دروازے کھلتے اور بند ہوتے رہیں گے ؟"

جیسے جیسے سید رجب علی اور کچہری کے دوسرے لوگوں سے سلیم خاں کا تنازعہ بڑھتا گیا، قمرن کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں مضبوط ہوتا گیا۔ کبھی کبھی سلیم خاں اس کو محض وہم سمجھتا۔ اور ایک دن تو اس نے قمرن کا ہاتھ دبا کر پوچھ ہی لیا تھا۔ "آخر تم اتنے اچھے گھر کی ہو کر اتنے پڑھے لکھے لوگوں کے ہوتے ہوئے، مجھے کیوں چاہتی ہو ؟"

"اچھا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے گن گاؤں ؟" وہ کھسیانا سا ہو کر ہنسنے لگا تھا۔ "دیکھو سلیم یہ سب بڑے گندے ہیں۔ یہ لوگ داؤں وغیرہ سے تھک جاتے ہیں تو پھر دلہن لا کر گھر میں ڈال لیتے ہیں۔ اور میں گڑیا بننا نہیں چاہتی ہوں"

یہ باتیں اس کی سمجھ میں بالکل نہ آتیں لیکن وہ قائل ضرور ہو جاتا اور غرور سے اس کا سینہ دھڑکنے لگتا۔

اور پھر وہ چاندنی رات جب قمرن اس کے لئے کباب لائی تھی۔ ......

* * *

یہ ساری تصویریں اس کے سامنے سے گذر رہی تھیں اس کی مٹھی میں موذن کے پھوکرے کا دیا ہوا پرزہ اب تک مڑا چڑا پڑا تھا۔ چاندنی کچھ میلی اور دھندلی ہو گئی تھی۔ ہوا البتہ کلف چڑھے ڈوپٹے کی طرح تازہ دم پیڑیوں اور درختوں میں سرسرا رہی تھی۔ اور ایک سوندھی اور میٹھی خوشبو کھیتوں سے ابھر کر اسے متوالا بنائے دے رہی تھی۔ وہ جب اپنی کوٹھری میں واپس آیا تو اس کے دل کی دھڑکن کم ہو گئی تھی۔ جذبات کا طوفان گذر چکا تھا۔ قمرن نے اب تک اس کو دل سے نہیں نکالا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات تھی ؟

عرس کی رات کے آنے تک وہ کئی بار مایوس ہوا اور کئی بار امیدوں نے اس کے پر لگا دیئے

سلیم خاں نے کچہری کی لڑکیوں کی بڑی بڑی رنگین داستانیں سنی تھیں۔ سنگھی اور دودھ میں پکنے والی لڑکیوں کا خون گرم ہوتا ہے۔ وہ تو اپنی پیاس بجھانے کے لئے کوئی نہ کوئی جام اٹھا لیتی ہیں، پھر ایک وقت آتا ہے جب وہ جام سفال پھینک کر سلو کا جام اٹھا لیتی ہیں اور ایک بڑا سا گھونگھٹ نکال کر آنسوؤں اور مرادوں کی اجنبی دنیا میں بھاگتی چلی جاتی ہیں۔ پلٹ کر دیکھتی بھی نہیں اور سامنے چلے جاؤ تو پہچانتی بھی نہیں ان میں تو نہ ہر عشق کی ہیروئن کی غیرت بھی نہیں کہ کچھ کھا کر سو رہیں ——— کمزور اپرے دھاگے اور وہ بھی ریشمیں بھلا ان سے کوئی کنڈیں بنائے گا اور تھامے گا ——— لا حول ولا ——— وہ تھا جو آ کر اٹھ بیٹھتا اور چھپروں کو مارنے کے بہانے اپنی ہی اچھی خاصی مرمت کر دیتا۔ "یہ زندگی بھی خوب ہے ——— کچہری ——— یہ سفید پوشی، آب سفال کی زندگی

اور سکراہٹوں کی منت، عجیب سا کچھ، لیکن وہ طوفان ——— کمی اور دھواں ——— قمرن اس گھٹن اور دھوئیں سے نکل بھی سکتی ہے جس کی وہ عادی
بن رہی تھی یا یہ حقیقت کی طرح قبول کیا تھا اور اس کے دل کے پرخچے اڑا دیتا تھا۔

اب کے عرس کی تیاریاں بڑے دھوم دھام سے ہوئی تھیں۔ ہر سال کی طرح اب کے بھی دھمال کی بڑائی کا کام عرس سے پہلے پورا ہو گیا تھا۔ ڈھول
اور چمٹے بجانے والے تیار ہو چکے تھے۔ سارا گاؤں لوبان اور عطر کی خوشبو میں بس گیا تھا۔ مٹھائیوں کی دو تین دکانیں کھل گئی تھیں اور شربت کا سلسلہ بھی
چل رہا تھا۔ رنگا رنگ اور حسینوں کی قوس قزح ہر طرف تتلی بکھری دکھائی دے رہی تھیں۔ اس شام سلیم خاں کو اپنی پیاری ماں کی بات یاد آئی کہ اس کے مرنے
پر بھی لوگوں سے کہتی ہوئی پائی گئیں ——— ہمارا سلیم ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک بار او ڈھنی کی ہوا لگی تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔

بڑے پیر کے مزار پر ہجوم تھا۔ کچھ عورتیں منت مان رہی تھیں اور کچھ مرادوں کے بر آنے پر مزار پر سجدے میں گری ہوئی ناک رگڑ رہی تھیں۔ قوالوں
کی بھاری پاٹ دار تانیں اور گھنگھریاں پوری فضا کو تھرتھرا رہی تھیں ——— "حاجت روا محمود، مشکل کشا محمود"۔ کچھ ملنگ کے کچھ ملی شاہ ملنگوں کو حال آ گیا تھا۔ وہ
مخمل والے ایک سرخ چادر پر پھڑک رہے تھے۔ بچوں کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور لوگوں کی آنکھوں میں ہیجان بھر گیا تھا ——— اب ایسے میں کس کو ہوش
تھا کہ قمرن لڑکیوں کے جھرمٹ سے ٹوٹ کر کھنڈر کے پچھواڑے پہنچ چکی تھی۔

"بھاگ چلو" قمرن نے آہستہ سے کہا۔ "اس وقت زیور، روپیہ پیسہ سب ہے۔ بھاگ چلو!"

دھندلی دھندلی چاندنی میں سلیم خاں نے اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی اس کی تیکھی ناک اور بڑی بڑی آنکھوں کا صرف مبہم سا اندازہ ہوا۔ ایسے میں وہ
کیا پڑھ سکتا تھا ان آنکھوں میں۔

"لیکن کھیڑل والے ——— تم کیا کہہ رہی ہو؟"

تھوڑی دیر سناٹا رہا۔ اچانک قمرن کا سایہ اٹھا اور ——— ٹیلے سے دور ایک طرف دیکھنے لگا۔ وہ رو رہی تھی سلیم خاں نے اس کو پکڑ لیا۔ لیکن قمرن نے
اس کو دھکیل دیا۔ "تو ایک پٹھان" وہ اٹھی اور تیز تیز بڑے پیر کے مزار کی طرف چلی گئی۔

عرس کی رات گزر گئی۔ کئی دن تک سلیم خاں کا بدن ٹوٹتا رہا۔ اندر سے اس کا دل گھبراتا رہا۔ کچھ لوگوں کے کانوں کو اس کی بھنک لگ گئی تھی اور وہ پھر ایک
بار اس پر پھبتی کسنے لگے تھے ——— "ایک تھا چندا۔ اس کے جی میں آئی کہ کسی چاند کو چھو لے۔ اس نے لی ایک سیڑھی اور چلا ———"

"اور وہ بندر تمہاری طرح بیٹھا تھا!" وہ آخر چل کر کہتا

جب چند دن بیت گئے اور قمرن کا دل موم نہ ہوا تو وہ پھر ایک رات درخت کی مدد سے اوپر چڑھ گیا۔ آہستہ آہستہ چل کر جب قمرن کے کمرے میں
پہنچا تو وہ اوندھے منہ لیٹی رو رہی تھی اور اس کا بدن آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا۔

"قمرو، میں پاگل ہو جاؤں گا!"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جلدی سے اس نے اپنے آنسو اوڑھنی سے خشک کئے، اور ڈٹ کر اسے گھورنے لگی جیسے وہ کوئی مجرم ہو۔

"تم یہاں کیوں آئے"

دیر تک وہ اسے بتاتی رہی کہ بڑی بیگم اس پر کتنا ظلم کر رہی ہیں اور کس طرح اسے کسی کے پلے باندھ کر سینے پر سے برف کی سل کھسکانے کی کوشش
کی جا رہی ہے۔

وہ رات تک اپنے ناخن کترتا رہا لیکن سمجھ میں کوئی ترکیب نہ آئی۔ "کھیڑل کی کسی بیٹی نے وہ نہیں کیا تھا جو تم نے کر دکھایا۔ کوئی پر جانے والا جی کہوں

ہے جس نے پاؤں میں پہنتے۔ لیکن پٹھان ڈسنے کا ایک اوارہ بھٹکا اور تم ——— بیٹی تو ندی ہو گئی ہے سید جب علی کو اس کی کیا خبر تھی کہ اندر حویلی میں کیا [illegible] رہی ہے۔

باتوں باتوں میں جب فجر کی اذان کا وقت آگیا۔ وہ قمرن کو گلے سے لگا کر واپس آگیا۔ "اچھا میں سوچوں گا"

"سوچنے کی فرصت نہیں۔ بس اٹھو گھٹڑی اٹھاؤ...... پھر...... " یہ آواز قمرن کے دماغ میں دیر تک گونجتی رہی۔

دوسرے دن سید جب علی کی حویلی کے پاس والا درخت کٹ گیا اور اس کا ایندھن بن گیا شام تک سلیم خاں کو اپنی بہنوں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قمرن کا بستر، بچھا سا آئینہ، کتابیں، کروشیا کا سامان ——— ساری چیزیں نیچے منگوا لی گئی تھیں اور بڑی بیگم منہ پھاڑ پھاڑ کر کسی کے لئے بد دعائیں نکال رہی تھیں۔
"اللہ کی مار ——— اللہ کی مار"

کئی مہینے بیت گئے فصلوں کے کٹنے کا زمانہ آگیا، کھلیان لگ گئے۔ رات رات بھر اناج آنے جانے لگے ——— لوگوں کے چہروں پہ رونق بڑھ گئی۔ اور گیتوں کا جنون تیز ہو گیا۔ لیکن سلیم خاں کے کھیت کے دھان کی سنہری بالیاں یونہی جھوم رہی تھیں۔ اس کے بازو شل تھے اور آنکھیں بے خوابی سے انگاروں کی طرح جل رہی تھیں۔ اس کی دونوں بہنیں بدحواس تھیں۔

"بھیا تم قمرن کو لے کر چلے جاؤ ورنہ وہ مر جائے گی" سکینہ کہتی ہے

"میں تم دونوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا"

"لیکن ہم اکیلے رہ لیں گے ———"

"پاگل نہ بنو۔ سید جب علی تمہاری بوٹی بوٹی نوچ لے گا۔ یہ ڈر نہ ہوتا تو ——— " اس نے تیزی سے دونوں بہنوں کو گھور کر دیکھا۔ وہ سہم گئیں "جاؤ سو جاؤ" اس نے لالٹین بجھا دی۔ اور خود اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے اپنے اجلے اور خوبصورت خوابوں کو دہراتا رہا

* * *

ایک دن جب اس کو قمرن کی شادی کی افواہ پہ یقین آگیا تو وہ دوڑتا ہوا اپنی بہن سکینہ کے پاس گیا۔

"بھیا اس کی شادی تو ایک بڈھے سے ہو رہی ہے"

"بڈھے سے؟"

"میں اس کو لے کر بھاگنے کے لئے تیار ہوں"

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ وہ سخت پہرے میں ہے"

اس نے ایک ——— ٹھنڈی سانس لی اور گھر سے باہر نکل گیا۔

برات آئی، باجے، ڈھول، شہنائیاں اور آتش بازیاں ——— پورا گاؤں تالیوں پہ اڑنے لگا۔ سلیم خاں اپنے گھر سے دور گاؤں کے باہر اپنے کھیت میں بیٹھا تھا۔ سنہری بالیاں دھان کی آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھیں اور وہ آسمان کے اندھیرے میں آتش بازیوں کے پھولوں کو بکھرتے اور پگھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

آتش بازیاں ختم ہو گئیں، حویلی میں گیتوں کی آواز تھک کر کہیں سو رہی۔ پنڈال کی روشنی زرد پڑنے لگی اور گاؤں کا نشاط بھی بجھ سا گیا۔ لیکن وہ جاڑے کی رات بھر کھیت میں بیٹھا رہا۔ اس کے بال شبنم میں بھیگ چکے تھے لیکن اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ بار بار اسے لگتا کہ ایک تیر اس کے سینے میں پیوست ہے۔ وہ اس جلتے ہوئے تیر کو نوچ کر ایک طرف پھینکنا چاہتا تھا لیکن اس کی چبھن بڑھتی ہی جاتی تھی۔

ابھی سویرے کی دھندلکے مجھے صاف ہونا شروع ہوئی تھی کہ بگیاروں کا کاروان اسٹیشن کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر غائب ہونے لگا۔ [illegible] سلیم خان درخت کے تنے کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور وہ خود اپنے دل کی دھڑکن سن رہا تھا۔ پیچھے دور سے ریل گاڑی کے آنے کی دھمک۔ پھر ایک سرخ شعلہ ابھرا، کھیتوں کے کنارے یہ سرخ پھول پھڑپھڑاتا سا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تتلی کی طرح چھٹا، چکیا، [illegible] اور کھیتوں کے پیلے لیکھ رہ گئے۔ ہر چیز بھائیں بھائیں کرنے لگی۔

اچانک سلیم خان اچھلا اور گاؤں کی طرف لپکا جیسے اسے اکھاڑوں پر ہو، دشنا پڑا ہو۔ اس نے رسی کا ایک ٹکڑا لیا، اپنی درانتی اٹھائی اور تہمد کو کمر پر باندھتا ہوا اپنے کھیت کی طرف بھاگا۔ اس کے پاس کے سارے کھیت کٹ چکے تھے۔ صرف اس کے کھیت میں دھان لہرا رہے تھے۔ افق پر خون کے پہلے چھینٹے ہی ابھرے تھے کہ اس نے پکے ہوئے دھان کے ڈھیر لگا دیئے۔ اس کے بازوؤں، آنکھوں اور نتھنوں سے آگ نکل رہی تھی۔

"تمہیں بالکل گرمی تھی لڑکی" قمرن کی آواز کہیں دور سے آ رہی تھی"۔ میں ہوتی اس کی جگہ تو طبیعت ہری کر دیتی سب کی"

اس کے ہاتھ اور تیز چلنے لگے اور اس کے سفید دانت گرد اور گرمی میں درانتی کے دانتوں کی طرح چمکنے لگے۔ وہ برق رفتاری سے سنہری بالیوں کی گردنیں اتارتا رہا۔

دور گراموں کی تان اب تک خاموشی اور تھکن کا دل چھید رہی تھی۔

کنگر چن چن محل ......"

* * *

جیلانی بانو

تلچھٹ

جس وقت اختر نواب راحت علی خاں ہال میں داخل ہوئی تو حسب معمول سب ہی آ چکے تھے۔ اور حسب توفیق سب ہی نے اٹھ کر اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ پہلی مایوسی تو اختر کو یہ ہوئی کہ وہ پروفیسر قناعت علی مرزا نہیں آئے تھے جنہوں نے اللہ اللہ کر کے اس کے فن پر مضمون لکھنے کی حامی بھر لی تھی۔ لیکن سب سے اچھی بات یہ تھی کہ خلیل ہما اپنے ساتھ یونیورسٹی کے بہت سے ہونہار شاگردوں کو گھیر لائی تھیں۔ اختر ان لڑکوں کو ہمیشہ لاؤڈ سپیکر کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ ایک ادائے خاص سے اس نے ہاتھ ہلا کر سب کے سلاموں کا، کورنشوں کا، ٹھک بیٹھک کا جواب دیا اور بڑی دیر تک کرسی کھینچتی رہی کہ کدھر جا کر بیٹھے۔

اختر کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ ادبی جلسوں میں وہ بے حد مخلص اور بے حد ادیب دکھائی دے۔ اس کشمکش میں ایک بات تو یہ ہوتی کہ وہ دمہ کے مریض لٹکاں صاحب اور اخبار بیچنے والے آوارہ ساقی تک کا مزاج پوچھ بیٹھتی۔ پھر ڈائس کے کسی صوفے پر اچھے سے پوز میں بیٹھنے کے بعد بڑے غرور سے، بڑے اطمینان سے ان عوامی خواتین کو دیکھا کرتی جن بچاروں کے لئے وہ لکھتی ہے۔ ان کے سائے سے وہ اتنی ہی واقف تھی جتنے عوام خود ناواقف تھے۔ دراصل یہ عوامی ادب والی ترکیب حال کی پیداوار تھی۔ جب سے لمبے لمبے بالوں والے دو چار لونڈوں نے (جو مشاعروں میں جوتیوں کے پاس بیٹھا کرتے تھے) اسٹیج پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ نوبت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ادب کا مستقبل بچانے کے لئے نواب تخیل یار جنگ اپنی ڈیوڑھی میں ایک ادبی محفل منعقد کرنے لگے تھے۔ یہاں صرف خاندانی نواب ایک دوسرے کو ارشادات عالیہ تقسیم کرتے تھے۔ بے حد شاندار اور مہذب محفل ہوتی تھی۔ انتہا یہ تھی کہ یہاں اس گندے ادب کا ذکر بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ جو حیدرآباد کی صاف شفاف سڑکوں پر گندگی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اب تو طالب علموں کے ساتھ ساتھ پروفیسر بھی سینگ کٹا کے بچھڑوں میں مل رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ وبا بھی دوسرے متعدی امراض کی طرح کچھ تو شمالی ہند سے آئی تھی۔ اور کچھ تلنگانے کے غنڈوں کی طرف سے۔ بیچارا اعلیٰ طبقہ جس کی آبرو کا چراغ ہمیشہ مخالف ہواؤں کی زد میں لرزاں کرتا ہے۔ اب بلیک اور آندھی میں پڑا کانپ رہا تھا۔

ایسے میں اختر نواب راحت علی خاں جیسی خوبصورت، نامور اور ادیبہ جو شعر و سخن کی محفلوں میں آنے لگی تو کم از کم دس بیس برس کے لئے تو ادب کے مستقبل کے ساتھ ساتھ یہاں بیٹھنے والوں کو اپنا مستقبل بھی جگمگاتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

حالانکہ یہاں ابھی جب وہ غریبوں کے دکھ درد کی کوئی کہانی سناتی تھی تو اس کے بعض جملوں پر سب ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک پڑتے اور اختر نواب کے ساتھ مسکرا دیتی۔ مگر وہ گردن ہلا ہلا کے یہی کہتی پھرتی کہ جیسی میں ترقی پسندی کے نظریوں کو بھی جانچنا چاہتی ہوں مگر اصل میں پچھلے دنوں اسے ہلکا سا [illegible] ترقی پسندی کا عارضہ بہت بھگتا تھا۔

ان دنوں غیر ترقی پسندوں کو گیٹ آؤٹ کہہ سکنے کی مہم زوروں پر تھی۔ یہاں تک کہ کوئی مشہور ادیب آ جاتا تو اس کے ارد گرد ترقی پسندی کی باڑھ لگا کر اسے محفوظ کر لیا جاتا۔ لیکن وہ شاعر اختر کے خوبصورت خلوص سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اختر کے آٹوگراف پر دستخط کر دیئے۔ ان کے ہاں دعوت کھائی اور اسے

بہت پہلی کا بھید نہ ہوا اور پھر جاتے جاتے دعا بھی دیتا گیا

"مجھے یقین ہے اختر صاحب کہ آپ زیادہ دنوں تک حقیقت کو نظر انداز نہ کر سکیں گی۔"

اس کے جانے کے بعد اختر نے پہلا کام تو یہ کیا کہ غزل گوئی پر لعن طعن لکھنا بند کر دیا۔ اور دوسرا کام آج وہ یہ کرنے والی تھی کہ اس بار کسی گمنام کی بجائے اس کی کہانی کے ہیرو بشارت چچا تھے۔ لیکن مشکل یہ تھا کہانی کے ہیرو بنانے کے لئے چچا کبھی یاد نہ آتے۔ مگر جب سے وہ تکیے کے نیچے سے پچاس روپے نکال کر لے گئے تھے اٹھتے بیٹھتے اسے غریبوں کی کسمپرسی پر غصہ آتا۔ اللہ جانے پچاس روپوں سے انہوں نے کیسے گھر کے اخراجات پورے کئے ہوں گے۔ یہی بات یاد کرتے کرتے وہ کہانی لکھنے بیٹھی تو پلاٹ سامنے دھرا تھا۔

کہانی لکھنے کے بعد اختر کو یقین ہو گیا کہ یہ اسپورٹ پر مطبوع سرور پہلا انعام دے سکتا ہے۔ اس کہانی میں اختر نے اپنا اسٹائل بھی بدل دیا تھا۔ یا تو وہ دوشیزگی کی گولائی دیکھ کر شروع ہوتی تھی۔ نہ چاندنی کے غسلِ سیمابی سے۔ کہانی لکھنے سے پہلے اس نے عبدالحلیم شرر کی دو چار ناولیں دیکھیں۔ "فسانہ آزاد" پڑھا اور راشد الخیری کے بہت سے جملے تو زبانی رٹ لئے۔ کرشن چندر کی کتابیں کوئی چرا کے لے گیا تھا۔ ورنہ وہ انہیں بھی ضرور دیکھ ڈالتی۔

خیال یار جنگ ہمیشہ اس سے کہتے رہتے تھے کہ "بی بی پاشاہ" یہ لوگ جو قومی ادب کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں ان سے بھی پہلے کہہ گئے کہ ملک کی یہ مثل بالکل سچ ہے "ایک کم ایک اور کتنی" (یعنی قوم تو ایک ہی ہے) اور وہ کورنش بجا لا کر عرض کرتی کہ چچا حضرت بس آپ دعا فرمایئے کہ میں ان بلاؤں سے محفوظ رہوں۔

اس بار کہانی ایک ہنگامہ خیز شعر سے شروع ہوتی تھی۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

"اے فلک کج رفتار حیف ہے تیری بے وفائی پر اور اے زمانہ ساز انسان لعنت ہے تیرے وجود پر کہ تیرے ہزاروں ساتھی ہوتے ہوئے روٹی کے ایک ٹکڑے کو ترس رہے ہیں۔ یہ کیسا انصاف ہے داتا" ——— (باری باری سب کے چہروں کا جائزہ لے کر اختر نے اپنے اوپر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی) ——— "یہ کیسا انصاف ہے ——— اگر دنیا اتنی پتھر دل ہے تو میں آج ہی اسے مٹانے کا عزم کرتا ہوں۔ (بے پناہ تالیاں) ——— سردی سے کانپتے ہوئے بشارت نے سوچا اور مٹھیاں بھینچ کر عزم کیا کہ آج وہ ان فلک بوس محلوں کو ڈھا دے گا۔" (حاضرین دم سادھے ہوئے ہیں) "آج میں امیروں کی تجوریوں کو آگ لگا دوں گا" ——— (بے پناہ جوش کے ساتھ نصرت کا نعرہ) کیونکہ میں اتنا بڑا شاعر ہو کر بھوکا سوتا ہوں ———

حالانکہ بشارت نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہ سمجھا تھا۔ یہ فلک بوس محل تو الگ رہے وہ بچارا تو بچوں کے ریت والے گھروندوں کو توڑنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ظلم کا پتھراؤ فلک کی رفتار سے ہوتا ہے۔ یا زمانہ ساز دنیا کی طرف سے۔

ظاہر ہے اس سوال کی جستجو ہوتی تو وہ اختر پاشا کے پاس ہی تو پوچھنے آتے۔

البتہ ایک بات سچ تھی کہ پیٹ کی پکار نے انہیں بغاوت کا دروازہ دکھلا دیا تھا۔

بشارت چچا کی کہانی دراصل ان کے باپ شوکت نواب کی شاعری سے شروع ہوتی ہے۔

یہ معشوقوں کی خوشامد کرنے والی، مشاعروں میں جھک جھک کر داد وصول کرنے، اور مداحوں کو کھلا پلا کے تالیاں پٹوانے والی شاعری نہیں۔ حالانکہ نوابوں کو شاعری کا خفقان اٹھتا ہے۔ زمین میں ہی حادثے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

شوکت نواب کا جسم بہت عالیشان تھا اور اس فلک بوس عمارت کو انہوں نے کارتوس، غصہ اور تعصب کے سامان سے سجا رکھا تھا [illegible] میں انہوں نے شاعری کو آخر بند کیا تو درد دل رکھا نہ گئے۔ جیسے سیکڑوں خونخوار شیروں میں بکری کا بچہ چھوڑ دیا گیا ہو۔ کچھ دن تو یہ خالی [illegible]

اپنا لوہا منوانے کے قابل کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ مگر کب تک ———— ! جب غزلوں پر غزلوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تو بپھرے ہوئے سمندروں کی طرح سب کو بہا لے گیا۔

وہ لوگ جو ریاضت کے ساتھ راگ رنگ کی محفلوں میں مونچھ اٹھا کے منہ اندھیرے چلے جاتے تھے۔ اب چلمن کے قالینوں پر بٹھائے جاتے تھے۔ فضا میں بارود کے دھماکوں کی طرح شوکت نواب کی آواز گونجا کرتی۔ ہر شعر ایک گونج بن کر ٹکراتا اور لوگوں کے کانوں سے ٹکرا کے پاش پاش ہو جاتا۔ کچھ شعراء [illegible] جل جاتے۔ بند گئے اور اُبلتی ہوئی آنکھوں سے لہو لہان ہو کر دم توڑ دیتے تھے۔

سنا ہے ایک دن کسی تقریب کے سلسلے میں بہت سے مہمان آئے تو شوکت نواب بھی اپنی بیاض لے کر جا بیٹھے۔ شعر کو کبوتر کی طرح فضا میں اڑا کے وہ جو اچھلے، تو سامنے بیٹھی ہوئی ایک دھان پان سی لڑکی چیخ مار کر گر پڑی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ چھوٹی خالہ کے کسی منشی کی لڑکی ہے۔ لیکن اس وقت تو شوکت نواب کے ہاتھوں سے اور بھی کتنے ہی پرندے چھوٹ بھاگے تھے۔ عورتوں نے جلدی جلدی اسے سنبھالا۔ دوسری لڑکیاں اور بچے اس حادثے کو غنیمت جان کر ادھر ادھر ہو گئے۔ بیاض ہاتھ سے رکھ کر شوکت نواب نے بھی اسے دیکھا۔ وہ اتنی لچکدار ذرا سی لڑکی تھی کہ مٹھی میں بند کر لو۔ سہمی سہمی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے پھانسی کے تختے سے نیچے آئی ہو۔ سب کے قہقہوں میں شوکت نواب بھی اپنا دھماکہ قہقہہ لگا کر اس کی جانب بڑھے۔ اس بار وہ لڑکی ڈر کے مارے بھاگی نہیں بلکہ پہلے بیہوش ہو گئی۔

بیاض پٹک کر انہوں نے قہر آلود نگاہوں سے اس لونڈیا کو دیکھا۔ جس نے ان کی شاعری ہی نہیں بلکہ ان کے حسن و جمال کا بھی مذاق اڑایا تھا۔

دوسرے دن وہ لڑکی اپنے گاؤں واپس چلی گئی۔ انہوں نے اچھی طرح پوچھ گچھ کر لی کہ وہ 'بکاؤ مال' نہیں تھی۔ اس کا باپ اتفاق سے کسی جاگیردار یا کسی دیسکھ کا قرض دار نہیں تھا۔ ہاتھی جب مست ہو جاتا ہے تو مرغی کے دڑبے میں گھسا دیجئے۔ شوکت نواب بھی اپنی پیٹھ پر سے خاندانی سطوت کی عماری اور شخصیت کے دوشالے جھٹک کر چوہیا کے بل میں گھس گئے۔

اب بھی آپ انہیں شاعر نہ مانیں تو یہ کیسی عظیم الشان حماقت ہوگی۔!

لوگ کہتے ہیں کہ ہر انسان کی فطرت ماں باپ کی فطرت ہوتی ہے۔ یہ دل و دماغ تو اسے دنیا میں آنے کے بعد ملتے ہیں۔

لیکن بشارت کو بنانے میں یہ توازن بری طرح بگڑ گیا تھا۔ اس کے جسم میں باپ کی شاعری گھولی گئی اور شاہانہ مزاج۔ اوپر سے ماں کی خوبصورتی اور نزاکت ملائی گئی۔ اور وہ بزدلی بھی جو کسی کی چیخ سن کر ہوش و حواس چھوڑ بیٹھتی تھی۔ پھر احساس کی شدت بھی اسے ماں سے ہی ملی تھی۔ جو کمزور جسم دماغ میں بھر دیتا ہے۔

بشارت کی لچکدار ماں کو جلتی بھرلی کر شوکت نواب نے دیکھا تو وہ پھر بے ہوش تھی، وہی پرانی عادت۔ لیکن اس بار شوکت نواب کی لاتیں بھی اسے ہوش میں نہ لا سکیں اور وہ نواب کے ذہن سے یوں کھسک گئی جیسے وہ صرف غیر محسوس طریقے پر ڈھل جاتی ہے۔ صرف ننھا سا بشارت اپنی ماں کی صدائے بازگشت بنا رہ جاتا۔

بشارت کو پوری طرح سب باتیں یاد نہ تھیں۔ ایک موہوم سی پرچھائیں تھی۔ یوں جیسے ایک کہانی سنائی جا رہی ہو، اور اس کے نامکمل کردار سننے والے کے ذہن میں ڈولتے پھریں۔

"وہ خاک کو حرامزادے کو ———— اب آواز تک تو گھونٹ دوں گا۔" ———— باوا جان دھاڑ رہے تھے۔ اور بشارت سہم کر یوں چپ ہو گیا تھا

بچے اپنی ماں کی نقل اتار رہا ہو۔ اس دن سے بشارت کی آواز کو ایک مستقل خوف نے دبا لیا تھا۔

زمین و آسمان سے ایک ہی بات سجھے سنائی دیتے۔ دفان کرو ـــــ دفان کرو ـــــ

بادلوں کے سرخ دھاری پہ بنی ہوئی، باوا جان کی یہ پہلی دستکاری تھی۔ جو اس کی یادداشت کا سرا بنی

ایک دن اس نے اپنے مولوی صاحب کی شان میں، مصرعوں میں پرو کر ایسی ایسی گالیاں پیش کیں کہ باوا جان پھڑک اٹھے۔

انہیں سوتے جاگتے یہ خلش تھی کہ پانچ بیویاں بھی مل کر اس راج دلارے کو جنم نہ دے سکیں۔ جو ان کے بعد قرض اور قرقیوں کی [illegible] اور گھن لگی ڈیوڑھی کا وارث ہوگا۔ پھر چپا لگ بھگ یہ ننھا سا ایک نشانی دے بھی گئی تو دفعہ۔ بھلا یہ منشیوں اور کسانوں کی اولاد نوابوں کے گھر میں کیا سجے گی ـــــ!

مگر آج ایک دم یہ خیال کہیں بغیر پروں کے اڑ گیا۔ انہیں بشارت بالکل نواب زادہ نظر آیا۔

اس دن سے بشارت پر سات خون معاف کر دیئے گئے۔ ویسے ان کے خاندان میں ہر ولی عہد پر معاف کر دیئے جاتے تھے اور یہ صداقت میں آ کر زندگی بھر پڑ جاتی کی آنچ بھی حرام ہو گئی۔ اس سے زیادہ فیاضی دکھانے کے اب دن نہ رہے تھے۔ اب تو وہ زمانہ آن لگا تھا جب عشرتوں نے باوا جان کو پسینا شروع کر دیا تھا۔ ان کی تازہ گرما گرم غزلوں کو سننے والوں کی تعداد صرف ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ ان کی محفل سے وصل وصل کر ڈیوڑھی کی ایک چھت بیٹھ جاتی کبھی ایک ستون سجدہ ریز ہو جاتا۔

لیکن اس گئی گزری حالت پر بھی وہ خاصے مرے ہاتھی تھے۔ یوں بھی خالی جیب میں ذرا سے سکے اچھلتے ہیں۔

ہار نہ ماننے والے کھلاڑی کی طرح انہوں نے بھی فیضِ عام کا سلسلہ بڑھا دیا تھا۔

ان جھگڑوں سے الگ پانچ برس کا بشارت آپا کی گود سے اترنے پر راضی نہ ہوتا تھا۔

"باوا جان! میرے کو چھوٹی سائیکل لے دو نا"

"باوا جان! برکے پھولوں کی چھتری لا کے دو"

دن بھر وہ فرمائش کرتا اور باوا جان گھسے ہوئے بدرنگے قالین پر کروٹیں بدل بدل کر اپنے بھائیوں کو گالیاں دیئے جاتے۔ جنہوں نے اچانک "تقسیمات" کا اعلان کر دیا تھا۔ یا پھر بشارت کو پیٹ پر بٹھا کر اس کی پیاری پیاری بکواس سنا کرتے

"باوا جان آپ کو باما جان کیوں بولتا ـــــ؟"

"باوا جان ابن اب حوروں کا ناچ کیوں نہیں دیکھتے ـــــ!"

"باوا جان ـــــ باما جان ـــــ"

بیکاری کا مشغلہ ڈھونڈ کر انہوں نے بشارت کی تربیت کی ٹھان لی۔ بہت سی زبان زد گالیاں سبق کی طرح اسے رٹا دیں۔ ایک چھوٹی سی بندوق تھما کر ہر چیز کو نشانہ بنانے کی آزادی دے دی۔ جھوٹ موٹ کے وعدے کر کے اسے ضد کرنا سکھا دیا۔ پھر جب اسے باپ کو مارنا اور بات بات پہ برتن توڑنا اور ذرا ذرا سی بات پر چلانا بھی آ گیا تو انہوں نے اپنے ہاتھ میں چھڑی اٹھالی۔

اگر آپا نہ ہوتی تو وہ اپنے بیٹے کو بہت پہلے ماں کے پہلو میں لٹا چکے ہوتے۔ کیونکہ بشارت کے ننھے سے جسم کے ساتھ ساتھ ذہن پر بھی [illegible] ناسور بن گئے تھے۔ بیٹھے بیٹھے انہیں خیال آتا کہ یہ منحوس لڑکا اتنی محنت کے بعد بھی نواب نہ بن سکے گا۔ پھر ان کے دل میں [illegible]

[illegible] بچے اچانک نے کر اٹھ بیٹھے

زمین پر کھڑی کی طرح گھر گھر کو چھانتا پھرتا، سارے ڈیوڑھی میں چھپتا پھرتا۔ اسے اپنے آس پاس خوف کا سمندر نظر آتا تھا۔ جب خوف کی بھنک بھی ہوتی تو وہ بھاگ کر [illegible] جاتی بیٹھ بشارت کو کسی ماں نے پچھاڑی سے لگا کر دودھ نہ پلایا تھا۔ وہ ہمیشہ تکیے سے لپٹ کر سویا۔ بدلوں کی بھاگنے کی آوازیں سن کر چپ رہتا۔ جب وہ ہر جگہ ماں کو [illegible] ڈھونڈتا پھرتا تھا تو یہ ماں کی طلب نہ تھی۔ اس کی طلب کیا تھی ——— وہ خود بھی نہ جانتا تھا۔ جب وہ دو دو گھر دیوار سے چپٹتا تھا۔ تو اس کا ننھا سا سایہ بھی اس کی باہوں میں جذب ہو جاتا۔ یہ کھیل اسے بہت پسند آیا۔ آپا کی نظر بچا کر جب وہ دیوار کا چونا چاٹنے لگتا۔ چونے کا پھیکا پھیکا ذائقہ اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو روح کو سرشار کر دیتی۔ سب کہتے نے پھیکے پھیکے دن پھر وہ خالی کمرے میں سرگوشیاں کئے جاتا۔

پھر ایک دن گیند سے ابھر کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس دن دیوار نے بالکل باوا جان کی طرح اس کے چانٹا مارا تھا۔ دوسرے دن سے وہ اس احتیاط سے چلنے لگا کہ کہیں دیوار سے نہ چھو جائے۔

ایک دن آنگن میں بیٹھے بیٹھے اس کی نظر آسمان پر گئی۔ جہاں بہت سے طوطے گاتے پھر رہے تھے۔ سب مل کر ایک دائرے میں گھومتے اور پھر ایک شریر طوطا دائرہ توڑ کے نکل جاتا۔ پھر سب اس کے پیچھے جا کے ایک اور دائرہ بنا لیتے ——— ٹیہوں ——— ٹیہوں ——— وہ بشارت کو بھی کھیلنے کی دعوت دے رہے تھے۔

ٹیہوں ——— ٹیہوں ——— اس نے بھی تالیاں بجا کر نیچے سے جواب دیا۔

دوسرے دن ایک پنجرے میں بند رنگین پروں والا طوطا باوا جان نے دے دیا۔ سنہرے پنجرے سے اس کی لمبی دم باہر نکل جاتی تھی۔ وہ گھوم گھوم کر بشارت کو ڈھونڈے جا رہا تھا ——— ٹیہوں ——— ٹیہوں۔

یہ وہی دائرے توڑنے والا شریر طوطا تھا۔ بشارت نے تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا۔ اور [illegible] دوست کی طرح سینے سے لگا لیا۔ طوطے نے بھی محبت کے جوش میں اس کے گال کو چوم لیا۔ پھر جلدی جلدی ڈاکٹر کو بلایا تو اس نے ٹانکے لگا کے زخم بھر دیا۔ اس دن بشارت نے بہت سے ٹوٹے پھوٹے خواب دیکھے جیسے باوا جان بھی طوطا بن گئے ہیں۔ اور اسے دھکے دے کر گرا رہے ہیں۔ پھر ایک بڑا سا پتھر آیا اور اس کے سارے کھلونے چکنا چور ہو گئے۔ وہ ہواؤں میں اڑتا پھر رہا ہے۔ دائروں کو توڑ توڑ کر بھاگ رہا ہے۔ پھر ایک بڑے طوطے نے اسے دیکھ لیا ——— دفان کرو ——— دفان کرو ——— طوطا چیخ رہا تھا۔

اور پھر وہ طوطا آپا کے پیچھے پڑ گیا ——— ساری ڈیوڑھی میں وہ بھاگتی پھر رہی ہے۔ اور باوا جان اس کے پیچھے ہانپتے کانپتے پھر رہے ہیں ——— اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ آپا باوا جان کو مار رہی تھی۔ دیوانوں کی طرح ——— چڑیلوں کی صورت۔ یہ آپا تو بالکل چڑیل ہے۔ اس نے کروٹ بدلی۔

صبح وہ بڑی دیر تک روتا رہا مگر آپا نہ آئی۔ دوسرے لوگ اس کا چہرہ دھلانے آتے۔ باوا دوڑے کر آئی۔ مگر وہ سب کو لاتیں مار کر چلاتا رہا۔

باوا جان اور ماں کی کتنی بیویوں میں بڑی زور دار لڑائی رہی۔ غصے کے مارے باوا جان نے ڈیوڑھی کے ہر قالین کے چار چار ٹکڑے کر کے بانٹ دیئے۔ ہر چیز کا برتن توڑ کے تقسیم کر دی۔ اور اس ہانڈی والا میں باوا جان تو دو بھی دو حصوں میں بکھر رہے تھے۔ دوپہر ہوتے ہوتے جب رونے کی تھکن نے بالکل نڈھال کر دیا تو وہ مسہری سے [illegible] پاؤں دھرا لیٹ گیا۔ اس کے ہاتھ زمین پر پھیلے ہوئے تھے۔ اور چہرے پر بڑی تابناک مسکراہٹ تھی۔ ہر طرف سکون تھا۔ کبھی کبھی باوا جان کی ہوا ان دھواں کھانسی سے گھر کے در و دیوار کانپ کانپ جاتے۔ یا پھر وہ کہیں سے لمبی لمبی آہوں اور گھٹی ہوئی کراہوں میں کسی بچے کی چیخ اور [illegible] بھرے ہاتھوں کے دھرکنے کی گونج اٹھتے۔

پھرات جان کی ایک پرانی خواہش نے ان سے اندھیرے کا شروع کر دیا۔ نوکری ضرب المثال نہ ہوتی۔ اور وہ شاک ختم ہوتے ہی ... کی اولاد کی طرح وہ پھر
چنگ بیٹا۔ وہ اندھے کنوئیں میں پڑا تھا۔ چاروں طرف چٹاپٹ اندھیرا۔ شاید کوئی اسے بھرے سے بھری ملک گیا تھا۔

سامنے جہاں سے وہ ستارے ہوتے بشارت چچا کی دوستی اختر پاشا سے کب ہوئی۔ کچھ ٹھیک سے یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد ہے کہ دوسرے لوگوں کے برخلاف انہیں وہ اختر کی سیڑھیوں سے کبھی نہ اترتے دیکھا۔ آتے جاتے لوگوں کی خوشامد کرنے پر ایک آدھ پیالی چائے مل جاتی۔ سیڑھیوں پر بیٹھے رہنے کا حق بھی پہلے ہی تک دے دیا تھا۔ نہ جانے کیسے اپنی خوفناک صورت کا خوف دور کر کے انہوں نے آس پاس کھیلتے ہوئے بچوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ اور کہانیاں سنانے لگے۔ بڑی مزہ دار نئی نئی کہانیاں جو اختر کے نشے سے دماغ میں جم کر رہ گئی تھیں۔ چچا کی کہانی میں اچانک لوٹ پھیرنے والی باتوں کی وجہ ضرور ہوتی تھی کہ بچے دم سادھے بیٹھے رہتے۔ مگر کلائمکس پر پہنچ کر وہ اپنے گوشے کے دوران بار بیڑی کی طلب کا رونا لے بیٹھتے۔ اختر نے اپنی فراسی تجربوں کی کسوٹی پر پرکھ کے بشارت چچا کو اتنے بڑے فن کار کا درجہ دے دیا تھا۔ جو شعوری طور پر وہ اپنے آپ کو اب نہ دے سکتی تھی۔

یہ نیا بھید بھی اختر پر چچا نے آشکارا کیا تھا کہ اس کے کانوں کے بے کار سوراخوں میں کوئی دوکان لگائے بیٹھا ہے۔ یہ دوکان دار صرف چچا ہی سے سودا چکاتا تھا۔ چچا آج برائی سے دیکھئے دوکان سے ـــــ وہ خوشامد کرتی۔ مگر ایسی ہیچڑ دوکان تھی وہ کہ جب دیکھو گڑ کی پٹی۔ مرمرے، بادام کے چھلکے گھنے والے چلے آرہے ہیں۔ بعض دن تو وہ خوب ضد کرتی۔ چچا بار بار دوکان میں جھانکتے " آج دوکان بند ہے ــــــ لے یقین نہ آتا تو آئینے میں کان کو جلدی جلدی کرتی۔ چپکے چپکے کان میں ہونے والی آہٹوں کو سنتی۔

یہی وجہ تھی کہ آج جب اپنی دانست میں اختر کی افسانہ نگاری سمندروں کی لہروں پر سوار ہو کر دور دور پہنچ چکی تھی۔ اس کی دوستی چچا سے اور بڑھ گئی تھی۔ بشارت چچا اپنی روح اور جسم کی ساری گندگیوں سمیت بجا اسی شعر کہتے۔ تو وہ بڑے صبر کے ساتھ ان کے پاس سیڑھیوں پر بیٹھی سنا کرتی۔ اور غزل کی گندھ کر عاشق کا جو سراپا بنتا ہے۔ بشارت چچا دہی تشنہ وہمی، سوختہ تن، نیم بسمل، گردشِ دوراں کے گھائل نامراد تھے۔ ان کے چہرے پر بھی وہ شبِ دیجور چھائی ہوئی تھی جس کی سحر عاشق کا وہم ہوتی ہے۔ ان کے جسم کا خون رنگ ہو کر کبھی کا اڑ چکا تھا۔ ہر شعر میں وہی چچوری ہوئی ہڈی جیسی گھناؤنی بات، جو اس سے پہلے والے شعر میں ہوتی۔ شبِ ہجر کی ظلمتیں ہیں تو معلوم ہو رہا ہے کہ ریل کسی غار میں سے نکل رہی ہے کہ کنارہ ہی نہیں آچکتا۔ اور جفا پرور محبوب ہے کہ کھیر کے کٹورے کی بجائے ان کے قتل پر نمک مرچ بُرک رہا ہے۔ مگر وہ ایسے سخت جان کہ قبر میں سے بھی بلک بلک کے جا رہے ہیں۔ پھر رقیبوں کی تعالی بھائی ہے کہ خالی ہجیم کو مات کئے دیتی تھی۔ دور دور کی ٹھوکروں نے انہیں اتنی بھی مہلت نہ دی تھی کہ سڑک پر خوبصورتی کے مفت بٹنے والے جلوے ہی دیکھ لیتے زندگی میں محبوبہ کی بجائے سادی روٹی بھی نہ ملی جس کا سراپا لکھتے۔ اسی لئے ان کی شاعری میں کوئی صاف تصویر نظر نہ آتی تھی۔ ایک ستم پیشہ طوائف تھی جو ان کے رقیبوں میں بیٹھی دار و رسن کے تحفے بھجوایا کرتی۔

اگر چچا کو ذرا وہم ہونے کے حواس ملتے تو شاید انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ دل کی پکار نہیں پیٹ کی سسکیاں تھیں۔ اختر پاشا کو سمجھانا بھی آسان ہو جاتا کہ وہ کون سی محبوبہ ہے جو رقیبوں کو بھر بھر کے جام دیئے جا رہی ہے۔ وہ کونسا جلوہ تھا جسے لبِ بام دیکھنے کے لئے ان کی نبضیں چھوٹی جا رہی تھیں۔ ایسی عبرتناک حالت میں محبوب کی جفاؤں کا رونا روتے دیکھ کر لوگوں کو غصہ آجاتا تھا۔

" شعر کہنے کی بجائے نوکری ڈھونڈو میاں، لوگ مشورہ دیتے مگر معمولی سے پڑھے لکھوں کو تعلق داری کہاں سے مل جاتی۔"

ایک بار سنا چپراسی کے لئے درخواست دے کر آئے ہیں تو مارن صاحب نے مارتے مارتے چھوڑا۔ دنیا کیا کہے گی۔ اپنا تو ناس مار ہی چکا ہے اب خاندان کی لٹیا ڈبوتے پھرتے ہیں۔

آ آ کی گود سے اچھل کر بھی انہیں تپتا ہوا صحرا ۔ دم توڑنے والے پرندے کی طرح وہ کبھی ادھر دوڑتے کبھی ادھر۔ ہر طرف پانی کی گنگناہٹ سنائی دیتی سوندھی سوندھی مٹی سے رہت کر پہنچے جاتے۔

محبت کرنے والے کنوارے لمحوں میں سے نظر آتے تھے جو محبت شب کی جلی ہوئی شمعوں کی طرح دلیل بنے ہوتے ہیں۔ خالی جام کا تلچھٹ۔ رسوائی خواری اور ذلت کے احساس نے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والوں کی طرح اتنا اندھا تھا کہ ان کے ویران چہرے سے مسکراہٹ کی ہریالی بالکل نہ اگتی تھی۔ انسان کی موت بھی صورت سکندر کی طرح ٹھکرا دی جاتی ہے۔ جس کی اور وجہ کہیں نہیں۔

جس دن آنکھوں میں چھایا ہوا غبار صاف ہو جاتا۔ خوشامد اور چاپلوسی سے کمائے ہوئے دانے تسبیح کے دانوں کی طرح اترا اترا کے ٹوٹنے لگتے تو ان کے دماغ میں بڑی خوبصورت باتیں جنم لینے لگتیں۔ وہ بڑے سے بڑے دکھ کو ان لمحوں میں بوتل میں بند کر کے ٹال جایا کرتے تھے۔

پندرہ برس ہو گئے جب شوکت نواب کی موت کے بعد انہیں ٹوٹے ٹھیکرے کی طرح ڈیوڑھی سے باہر پھینک دیا گیا تھا۔ دفن وہ ماموں، چچاؤں کے مال سمیٹتے پھرے۔ شکی ہوتے تو ایسے مروت کوئی نہ تھا کہ اتنے بڑے بڑے بنگلوں میں کہیں پناہ نہ تھی۔ ڈاکٹروں اور نوکروں کی فوجیں آخر چرا ہی گئی ہیں۔ مگر ان کا نام نواب بشارت علی خان تھا۔ وہ کسی جمعدار کو ماموں کہتے کسی کو بڑے بھائی پکارتے۔ اور ہر طرف سے فٹ بال کی طرح لوگوں نے انہیں ٹھوکریں لگائیں۔ ذرا نرم کرنے کو ہنس ہنس کے نواب بنے بیٹھے رہے۔ پہلو بھرم رکھنے کے لیے انہوں نے خوبصورت الفاظ کے دوشالے اپنے پیوندوں پر ڈال رکھے تھے۔ بس یوں کہو کہ بشارت چچا کی طرح ساری رونق ایسے ساتھ کی ہنسیا نہ ڈالتے پھرتے۔ لوگوں کی شراب پی جا چکی تھی۔ اور خالی شیشے بھرے دل سے سب بیٹھے تھے۔

دن بھر خالہ امی، خانیاں کوڑی پھیرا کرنے کے شام کو بھرتی کھلا دیتی تھیں۔ ایک پیالی چائے کے بدلے لوگوں کی دلیز پر جھک کر گھنٹوں مامیر قصائی، دشمن کی ہجو اور قصیدوں کو گالیاں تصنیف کر کے سنایا کرتے تھے۔

مسافر خانوں کے شہر میں یہ ویران جنگل اور مرگھٹ کے جزیروں میں راتیں کاٹنا پڑیں۔ تو شاعروں نے بھی دو دستوں کی طرح ہاتھ دکھا دیا۔ یاد بھی نہ رہا کہ دل نہ جانے کب کے پچھلے ہوئے اور بچے بیچے ٹیلے کسی شاعر کے کھنڈر ہیں۔

شراب مدے کے رسکے سرکہ بن جاتی ہے۔ شاعر شاعر نہ بن سکے تو مرثیہ گو بن جاتا ہے۔ مگر بشارت چچا کے خمیر میں اور چیزیں بھی ملتی رہیں۔ دور کی حسرتا ازلی بھوک اور توانائی دماغ کی نزاکت نے اس سرکے کو زہر ہلاہل بنا دیا۔ ایسا تیز کہ دور سے سونگھنے والا چکرا جائے۔ ان کا دل ابھی تک شاعر تھا۔ دماغ اپنی ناک کو اونچا رکھنے والا نواب اور پیٹ ایک ذلیل بھکاری۔ جب تینوں مل کر رونے بیٹھتے تو چچا اس زمین کی طرح تھرا جاتے جہاں اینٹوں کا بم گرا ہو۔ چہرہ شاعر کی زبان دو جو زندگی بھر کسی معشوق کے دیدار کے بغیر اس کے عشق میں جلا کرتی ہے انہیں بھیک کے دلنشیں پیرائے سکھا دیتی بیماری کی طرح اپنی کھکھیاہٹ کسی کے دھانسے پر جاتا تو ان کے دماغ کا نواب کونے میں دبکا آٹھ آٹھ آنسو بہائے جاتا تھا۔

مگر اس دل کی بدتمیزی پر لعنت ملامت کرتیں اور وہ بھول جاتے۔ ماموں صاحب سب کے سامنے ماموں کہنے سے منع کر دیتے اور وہ مان جاتے۔ ان کا چچا زاد بھائی فقط ماما کی آواز بنا کر اندر سے کہہ دیتا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں کے دوسرے دن جھٹی جھپٹی کوششیں وہ پھر ان سب کو دیکھنے کے لیے بیقراری سے دوڑے جاتے۔ پندرہ برس کے تجربے نے انہیں سکھا دیا تھا کہ کس گھر میں کون کیا کہتی ہے۔ اور کسے دیکھ کر دم دبا لینا چاہیے۔ عزیزوں رشتہ داروں سے بھی کیا شکوہ، اماں جان خدا کے یہاں بھی ان کی زندگی کا کوئی پروگرام نہ بنایا گیا تھا۔

جب کبھی جھوٹ موٹ انہیں گالیاں دے کر نکلوا دیتے۔ یا بڑی خالہ ماں ان پیسے کا جھنجھنا چرانے کا الزام لگاتیں تو وہ ایک دیا سلائی ڈھونڈتے

ننھی ننھی سی دیا سلائی جس سے ساری دنیا میں آگ لگائی جا سکے۔ ان کے اندر دم توڑنے والا شاعر جاگ پڑتا۔ وہ کاغذوں کے ڈھکنے پیچھے پاجاموں کی جیبوں میں
توکہاں کرسنے لگ جگہ سے وہیں نکال لیا جاتا۔

لیکن اس وقت وہ اکیلا سوں بار بار حسین ساگر کے کنارے پر دوڑ رہے۔

بس اب حد ہو گئی۔ بہتا پیسہ تو کوئی گرم زمین پر پاؤں جلانے والا لے جائے گا۔ اور پھٹی ہوئی شیروانی کرتی بیچارا اپنے بہ بچے کہ ان کے
منہ میں سرویاں کاٹ دے گی۔ خودکشی سے پہلے وہ ہمیشہ کپڑے اتارنے کا ارادہ کر لیتے۔ ہمیشہ یہی خیال آتا کہ ان کپڑوں کی ضرورت تو ابھی دنیا کو
پڑ سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ اس لئے مر رہے ہیں کہ یہ کپڑے کسی اور کی قسمت جلانے والے ہیں۔ کنارے کی رجگہ پر چلتے اس نعلے کا انتظار کرتے
جوان کا آخری لمحہ ہوگا عجیب عجیب باتیں یاد آتیں۔ کبھی سوچتے پارک کا ایک چکر لگا آئیں۔ یہاں تو آئے دن خودکشیاں ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کوئی کپڑا
یا جوتے چھوڑ گیا ہو۔ لیکن ہر بار ایسی ہوتی۔ مرنے والوں کو یہاں کبھی وراثت چھوڑنے کا خیال نہ آیا۔

ساگر کے پانی میں ڈوبنے والا سورج دوں کی انگلیں جگا دیتا۔ جہاں پہل بڑھ جاتی۔ کوئی تنہا کھڑی ہوئی لڑکی اپنی سہیلی کا ہاتھ تھام کر کہتی ——
اسے کلمی کتنا پیارا منظر ہے۔ ۔ ۔ سے کرشنا دیکھ لیتا؟

"تو کیا کرشنا کو بھی ساتھ لیتی آنا؟ اس کی سہیلی اطمینان دلا دیتی۔

تو کیا کل بھی سورج نکلے گا۔ کل بھی دنیا مسکرائے گی —— ! شاد اب کرن مرے —— بشارت کا شاعر مارے کاہلی کے ٹال جاتا۔ اس
وقت کو کچھ شعر پیچھے پڑ گئے ہیں۔ چل کر اختر پاشا کو سنا آئیں۔

اس دن اختر پاشا بہت خوش تھی۔ ایک مقامی رسالے نے اس کے مضمون کا معاوضہ پچاس روپے دیا تھا۔ اتنے پیسوں کا کسے پتا تھی۔ مگر
مضمون کی یہ قدر اسے اڑائے اڑائے پھر رہی تھی۔ صبح سے فون پر سب کو یہ خبر سنانے سنا کے ہاتھ دکھنے لگے تھے۔

اب ذرا جاموں میں کھانا کھانے میں وہ سب کو اپنے ادبی منصوبوں سے آگاہ کر رہی تھی۔ کہ بشارت چچا کا بلاوا آ گیا۔ اس بھرے ساتھ، جوش
اور خوشی کے بے پناہ جوش میں کام آتا ہے۔ اس نے امی کی جانب دیکھا۔ مگر ایک امی ہی کیا، سب کی طنز بھری نظریں اس کی ادبی شخصیت
کا مذاق اڑا رہی تھیں۔

"محترمہ اختر صاحبہ، غالباً آپ نے سن لیا ہوگا کہ گیٹ پر ہندوستان کا ایک مایہ ناز شاعر آپ کو یاد کر رہا ہے —— نادر بھائی نے چائے
کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیل کر اسے سنایا۔

"کھانے پینے وقت ان کا نام مت لو ہمیں۔ میری طبیعت مالش کرنے لگی"۔ نادر کی بیوی نے التجا کی، اس میں شکایت سے زیادہ یہ جتانا تھا کہ آج کل
ان کا جی متلایا کرتا ہے۔

"ہاں بھئی کھانے کی میز پر ایسی گندی باتیں مت کرو۔" چھوٹی بھابی نے بھی ناک سکوڑی۔

اختر پاشا اس کی ماں کی طرح عجیب سی بیٹھی تھی۔ جس کی اولاد ناخلف نکل آئے۔ اس بات کی سب ہنسی اڑاتے تھے کہ اختر بشارت چچا کو بہت
پیار کرتی تھی۔ اس کا بس چلے تو انہیں اپنے ساتھ کھانا کھلائے۔ اپنی جیب سے ان کی تنخواہ مقرر کر دے۔ ان کی شاعری پر ایک آدھ مقالہ لکھ ڈالے
بلکہ نادر بھائی تو یہاں بشارت کی خاطر مدارات کرتے دیکھ کر پیشین گوئی کر چکے تھے کہ اختر ضرور کمیونسٹ ہو جائے گی۔

ایک گھنٹے کے بعد جب اماں مرغیوں اور کتوں کے ناشتے سے بھی نبٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں تو اختر نے ایک ...

باہر دیکھا۔ بشارت چچا تیز دھوپ میں سیڑھیوں پر بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

کم از کم آج تو چچا کو یوں دھوپ میں سکھانا اچھا نہ لگا اور نہ وہ بچیاں ان کے پاس بیٹھنے کبھی جاتا۔

کوئی کہانی نہ سہی ان کی مصیبتیں سننے جائے۔ وہ جواب کا انتظار کئے بغیر اپنی سنائے جاتے ہیں

"میرے بال کھیان بچوں نے بکھرے ہیں بعض وقت تو بالکل سوجھائی نہیں دیتا —— کل ہی میں سائیکل کے نیچے آ گیا تھا۔ وہاں دو شخص ہو گئے مگر کوئی بھی نہ لا کر دیا اور بھر بیٹھتا —— ارے ہاں بیگم آپ نے کاغذ اور پنسل دینے کا وعدہ کیا تھا نا! تو رات کو بھی آپ کے ہاں بکھارے بیگن پکے تھے۔ قسم سے بھئی سعادت کو نیند تھوڑی سی آئی کہ جانے کیا کہا یہ بکھارا! ——"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

ان کے ہنسنے کی ہلکی ہلکی پھٹیں، پسینے اور میل میں اٹے ہوئے کپڑے اور اجڑے ہوئے سیاہ بالوں کی طرح جھاڑیوں میں ڈوبے ہوئے دانتوں کو دیکھ کر اختر کو بھی جھاڑی کی طرح ابکائیاں آنے لگتیں۔ اس لئے وہ ذرا دور بیٹھ کر سامنے پھیلے ہوئے درختوں کو دیکھا کرتی۔ بارگی نئی نئی دلہن کی طرح گننا کے جاتی۔ بشارت چچا کو یہ اطمینان بہت تھا کہ ان کے جی کی بجز اس بچی کے کوئی سن سکتا ہے۔ اور وہ دل میں نیت نیت کر رکھی ہوئی ساری پونجی لٹا دیتے

لیکن آج جو اختر سعادت پر اتری تو چچا کو اپنے کمرے میں بلا لائی۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا کہ اماں اور بگڑ لیں گی!

پھر ایک پیالی چائے پلا کر بھی وہ مطمئن نہ ہوئی تو چچا کو سعادت والی خوشخبری سنا ڈالی۔ مزید یقین دلانے کے لئے پانچ نوٹ لا کر چچا کے سامنے رکھ دیئے۔

بشارت چچا کو اپنی اس عزت افزائی کا رتی بھر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس سقے کی طرح گھبرائے جا رہے تھے۔ جسے ہمایوں نے اپنے تخت پر لا بٹھایا تھا۔ خوشی کے مارے ہلنے لگے۔ کئی بار آنکھیں چھپائیں اور ہونٹوں کا لرزہ نہ رکا۔ جب سے ہنسی نے ان کا ساتھ چھوڑا تھا۔ ان کی خوشی کا یہی عالم ہوتا۔

"بتلائیے چچا آپ کو کتنے روپے کی ضرورت ہے —— ؟" اختر کو یوں لگ رہا تھا جیسے آج سے پہلے وہ پیسے پیسے کو محتاج رہتی تھی۔

"آج تو ہم آپ کو انعام دیتے بیٹا —— " انہوں نے بڑی مشکل سے کہا

"ان روپوں پر آپ کے چچا کا حق نہیں ہے۔"

شاید یہ زندگی کا پہلا اتفاق تھا جب انہوں نے کوئی چیز لینے سے انکار کیا۔ وہ جلدی سے روپے تکیے کے نیچے پھینک کر باورچی خانے میں بھاگی کہ آج کوئی مزہ دار چیز پکا کر چچا کو کھلائے۔

لیکن واپس آئی تو چچا اور روپوں میں سے کوئی نہ تھا۔ صرف وہی تو تھی جو کبھی نہ مانتی کہ چچا چور ہیں۔ اپنی حماقت پر وہ پچھتانے لگی۔ اپنے وہ سب دعوے جونکے کی طرح منہ پر آن گرے۔ جو وہ دوسروں سے وہ کئے جاتی تھی۔ خیر اس نے بڑے بڑے ہوشیار جھوٹ گھڑ کر ایسی پیش بندی کر دی کہ لوگوں کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائی۔ ورنہ سب اسے طعنے دے دے کر مار ڈالتے۔

کئی دن گزر گئے —— اختر کو یقین ہو گیا کہ بشارت چچا کا پنڈ اب ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔

ان کی یہ عادت تھی۔ جب کبھی بھوک کی بے تابی انہیں مرنے مارنے پر آمادہ کر دیتی تھی۔ تو وہ کھانے کے ایسے وقت ڈرائنگ روم میں گھس بیٹھتے جب ابا حقہ پیتا کر وقت دیا کرتے ہیں۔ ان کی خاکسارانہ قدم بوسی کے جواب میں ابا بڑی سرد مہری کا جواب دیتے

"اندر جاؤ میاں، ابھی ذرا مصروف ہوں۔"

"مجھے ایک روپے کی ضرورت ہے بڑے بھائی۔ کل سے کھانا نہیں کھایا۔"

اس وقت بشارت چچا کو روپیہ قبول ہی جاتا اور ساتھ ہی انہیں نکالنے کی ترکیبوں پر غور کرتے۔ اپنے دوستوں کو بار بار یقین دلاتے کہ بشارت ان کا بھائی نہیں صرف ایک بے آسرا اتفاقی ہے۔

ان کے بعد وہ مہینوں منہ چھپائے پھرتے پھر ایک دن خبر آتی کہ کسی پل پر بے ہوش پڑے ہیں۔ فلاں مشاعرے پر ان کا چالان ہو گیا۔ یا کسی مسجد میں پڑے بخار میں بھن رہے ہیں۔ مجبوراً کسی نوکر کو ان کی پرسش کے لئے بھیجا جاتا۔ تھوڑی دیر کو سب ان کی نالائقیاں معاف کر کے اظہار ہمدردی کرنے لگتے کئی دن تک ان کی خاطر تواضع ہوتی جیسے ان کی دیکھ بھال خدا نے فرض کر دی ہے۔

زبردستی کھانا کھلایا جا رہا ہے۔ اور وہ شرما شرما کر بڑے تکلف سے انکار کر رہے ہیں۔ ان کی لاوارثی پر سب ایک دوسرے کو الزام دینے لگتے۔

کھانا تیار ہوتے ہی مانی بیگم اصرار کرتیں کہ بشارت میاں پہلے کھا لیں اور وہ اڑے رہتے کہ سب کے ساتھ کھاؤں گا۔ یہ ایک چھپی ہوئی بات تھی جو وہ نہ سمجھتے تھے۔ اور دل میں رکھتے۔ مانی بیگم بھی ایک کائیاں تھیں۔ نوکروں کے ساتھ ان کی اتنی رکابیوں میں بھی وہ چپکے چپکے خشکہ نکال کر ذرا سا سالن یوں ڈال دیتیں۔ جیسے پہاڑ کی چوٹی پر برف جمی ہو۔

اور سب کے ساتھ میز پر آ بیٹھتے تو ان کے بے چلے ہاتھوں کو کون روک سکتا تھا؟ مانی بیگم لاکھ چاہتیں کہ دسترخوان پر کوئی لمبی بحث چھڑ جاتے یا بشارت چچا کے تیز رفتاری سے دوڑنے والے انجن کو کچھ اسٹیشن بھی ملیں۔ لیکن وہ ہر بات کا جواب اشاروں میں دیتے یا سعادت مندی سے گردن جھکا دیتے۔ ہاتھوں کی رفتار میں کوئی فرق نہ آتا۔

سب کے اٹھنے کے بعد بڑی دیر تک وہ اکیلے بیٹھے انگلیوں کو چاٹ چاٹ کر صاف کرتے رہتے۔ خود ہی برتن اٹھانے کا ٹھیکہ لے جاتا۔ اور پلیٹوں میں لگے ہوئے چاول بڑی احتیاط سے دسترخوان کے کونے پر اکٹھا کرتے جاتے۔ دسترخوان کو سمیٹ کر وہ کسی کو مخاطب کئے بغیر سنا دیا کرتے تھے۔

دروازے پر مرغیاں چگتی ہیں انہیں ڈال آؤں۔ سب ہی جانتے تھے کہ چاول کون سا مرغ چگتا ہے۔

کہانی کی وہ تعریف ہوئی کہ تحصیل یار جنگ کی پرانی ڈیوڑھی میں چھپے ہوئے کبوتر اور چمگادڑ گھبرا کے باہر نکل آئے۔

سلیقے سے ہنسنے اور احتیاط سے داد دینے کے اصول نہ جانے کہاں بہہ گئے۔ لوگوں نے اختر کو اپنے حلقے میں گھیر لیا۔ اتنے ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھے کہ اختر گھبرا گئی کسے پکڑے کسے چھوڑے

گھر آتے آتے اسے یقین ہو گیا کہ وہ ان غیر فانی ادیبوں میں شامل ہو چکی ہے جو کبھی نہیں مرتے۔

کار سے اتری تو سیڑھیوں پہ بیٹھے ہوئے بشارت چچا اس کی راہ تک رہے تھے۔

ایک دم آسمان کو لگ جانے والے قد کو جھکا کر اختر نے دیکھا چچا انتہائی کمینے نظر آئے۔ دھوکے باز۔ ہم میں آئی آج تو ان کی پسلی پر لیکچر ہی دے دے۔ بھلا ان سے ملنے کے لئے وقت کہاں ملا کرے گا۔

کپڑے بدلے بغیر وہ سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔ بشارت چچا رعشے میں کانپ رہے تھے۔ الجھی الجھی سانسیں بتا رہی تھیں کہ وہ کئی دن کے بھوکے ہیں۔ کتنی بار جی کی بات ان کے ہونٹوں پر تھرتھرائی مگر باہر نہ نکل سکی

"پچاس روپے اتنی جلدی ختم ہو گئے چچا ـــــ" ان کی صورت پر بہتے ہوئے سوال کو دیکھ کر اختر سے نہ رہا گیا۔

کانپتے ہاتھوں سے انہوں نے چمڑے کی ایک میلی سی گانٹھ جیب میں سے نکالی۔ کئی تہوں کے اندر کاغذ کی ایک چٹ پیار رکھی تھی۔ پھر ایک کے بعد ایک تہہ کھولنے کی بڑی احتیاط سے۔ جیسے بچھو ڈنک کے لائے ہوں۔ ذرا سی بے احتیاطی سے نکل جائیں گے۔ اندر سے کئی تہوں میں لپٹے ہوئے میلے جلے ہوئے پانچ نوٹ تھے۔

"آپ کے روپے میں کہاں لے کر نہیں دے گیا تھا۔" انہوں نے بڑی شرمندگی سے کہا۔ آواز ہزار ٹکڑوں میں کٹ کٹ جاتی تھی۔

"اس وقت میں نے سوچا کہ پچاس روپے کوئی ہماری طول کا معاوضہ بھی دیتا۔ اور پھر میں نے ـــــ یہ روپے اپنی جیب میں ڈال لئے۔ جیسے وہ میرے ہی تھے۔"

اختر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چچا کا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔ جس پر سامنے پاگل پن کے اور کچھ نہ تھا۔

"مگر اختر پاشا آپ نہ جانے کیسے اتنے روپوں کا بوجھ اٹھا لیتی ہیں۔ میں تو ادھ موا ہو گیا ان پانچ دنوں میں۔"

کچھ دیر تک امید توٹ تا کتی تو وہ دیوار کا سہارا لے کر اٹھے اور بغیر سلام کئے ہی اختر کو دونوں ہاتھوں سے زندگی بھر کمانے کی دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔

پہلے تو اختر کو چچا پر ترس آیا۔ پھر اس نے سوچا ـــــ ہونہہ ـــــ اتنے احمقوں کی کہیں کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔

خلیل الرحمن

ولایتی آٹا

جمعہ کام سے واپس آ رہا تھا۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی آخری شعاعوں میں لپٹی ہوئی سیاہ سڑک تپ رہی تھی۔ گرمی سے تار کول پگھلنے کا احتمال ہو رہا تھا کہ اس میں پاؤں دھنس رہا تھا۔ اگرچہ دن ڈھل چکا تھا اور سورج غروب ہونے کو آ رہا تھا۔ لیکن فضا ابھی تک سلگ رہی تھی دہکتے ہوئے دن کا لاوا سا کھلا ہوا تھا۔ جس میں سے گرم گرم ہوا نکل کر چہرے کو جھلس رہی تھی۔ جمعہ نے اپنے خشک پپڑی جمے ہونٹوں پر زبان پھیری اور منہ سے خشک پسینے اور گرد کا ملا جلا نمکین ذائقہ محسوس کیا اس کے پیچھے پیچھے دوسرے مزدور بھی تین تین چار چار کی ٹولیوں میں سست سست چلتے ہوئے ٹانگیں گھسیٹتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ جیسے کوؤں کا غول کائیں کائیں کرتا ہوا شام کے وقت شہر سے جنگل کی جانب روانہ ہو چکا ہو۔ دہکتی ہوئی سیاہ سڑک سے دو میل کے فاصلے پر شہر کے تنگ و تاریک گلی کوچوں اور ٹیڑھے میڑھے بازاروں کے جال میں الجھ کر کھو گئی تھی۔ شہر کے اردگرد چند عمارتوں کی فصیل بنی ہوئی تھی۔ شہر کی حدود سے باہر اس طرف بائیں ہاتھ پر مہاجروں کی بستی پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے جرائم پیشہ خانہ بدوشوں کے کسی قافلے نے شہر سے باہر ڈیرا ڈال دیا ہو۔ چند ایک کچے مکان اور باقی ماندہ گھاس پھونس، ٹاٹ اور بوری سے تیار کی ہوئی جھونپڑیاں۔ جھونپڑیوں کے باہر گندے پانی کے جوہڑ اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اور ان پر مچھروں اور مکھیوں کے غول چھائے اور ناہموار گلیوں کے بیچوں بیچ سیاہ متعفن پانی کی ننھی ننھی نہریں۔ ان جھونپڑیوں میں اور اس گندگی اور تعفن کے درمیان یہ مہاجر سات سال سے رہ رہے تھے۔ اگر جیٹھ کی چلچلاتی ہوئی دھوپ اور لوئیں وہ کباب ہوتے تھے اور پورہ اگھن کے کڑاکے جاڑے میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر مرتے تھے اور جب ساون بھادوں کی جھڑیاں شروع ہوتیں تو ان جھونپڑیوں کے اندر اور باہر ایک ہی سا سماں بندھ جاتا تھا۔ ہر سال جھونپڑیاں گر جاتی تھیں مگر کچھ دن کے بعد پھر ویسی ہی جھونپڑیاں آن کھڑی ہوتی تھیں۔ آخر گھاس پھونس کی جھونپڑیاں ہی تو تھیں کوئی محل تو تھے نہیں کہ جنہیں بنانے میں مہینے اور سال لگ جاتے۔ وہ سب مہاجر تھے اور اس پر ستم یہ کہ غریب ان میں سے کسی نے فکری جائیداد الاٹ نہیں کرائی تھی، کسی کو چور بازاری یا ذخیرہ اندوزی کے فن میں مہارت حاصل نہیں تھی کسی کا عزیز یا رشتہ دار کہیں ڈائرکٹر، وزیر یا لیڈر نہیں تھا۔ کہ چند ماہ کے اندر جھونپڑیوں کی جگہ عالیشان محل کھڑے کر لیتے۔ وہ تو بے گھر بے ٹھکانہ اور بے آسرا لوگ تھے جنہیں تقدیر کے بگولے نے نجانے کہاں کہاں سے اٹھا کر لایا تھا اور یہاں ڈھیر کر گیا تھا۔ شروع کے چند سال تو ان پر بڑے تنگ گزرے تھے۔ بیکاری اور بھوک وبا بن کر اس بستی میں پھیلی ہوئی تھی۔ مگر گزشتہ ایک ڈیڑھ سال سے ان کی حالت قدرے بہتر ہو گئی تھی۔ کیونکہ انہیں روزی کمانے کا وسیلہ مل گیا تھا۔ وہ سب مزدور تھے اور قریب ہی جو نیا ہسپتال زیر تعمیر تھا اس میں کام کرتے تھے ——— عام مزدور کو دو روپیہ یومیہ ملتے تھے اور جنکے ہاتھ میں کوئی ہنر تھا، خلاً راج گیری یا بڑھئی کا کام، وہ چار پانچ روپے یومیہ تک پا لیتے تھے۔ اور یہی وہ خوش نصیب لوگ تھے جو بستی میں گنتی کے کچے مکانوں کے مالک تھے باقی سب ابھی جھونپڑیوں پر قناعت کئے بیٹھے تھے۔

چلتے چلتے جمعہ کو خیال آیا کہ گھر جانے سے پہلے راشن ڈپو سے آٹے کے متعلق پوچھ لے۔ ابھی آیا ہے یا نہیں ابھی کل وہ ڈپو سے خالی

کھانے کھاتے جیسے عادت سی ہو گئی تھی۔ صبح چاول، شام چاول اور آٹا ایسا غائب ہوا تھا گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ عبدو کو عذرا یاد آگیا کہ وہ ہفتہ ہوئے "بابو" نے کہا تھا کہ عنقریب ملایا سے آٹا آنے والا ہے جو مہاجروں میں مفت تقسیم کیا جائیگا۔ یہ خبر ساری مہاجر بستی میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ کئی ہفتوں سے مسلسل چاول کھا کھا کر اکتائے ہوئے مہاجر بڑی بے چینی اور بے صبری سے اس دن کا انتظار کر رہے تھے جب آٹے کی بوریوں سے لدے ہوئے ٹرک سامنے سڑک پر آکر رکیں گے اور ہر مہاجر کو ایک ایک بوری مفت دی جائیگی۔ اور مستقبل قریب میں آٹا ملنے کی اُمید پر چپ چاپ چاول پھانک رہے تھے۔ یہ نہیں کہ آٹا بالکل عنقا ہو گیا تھا۔ وہ تو اب بھی ملتا تھا اور کھانے والے اب بھی آٹا ہی کھاتے تھے لیکن چھ۔ سات یا آٹھ آنے سیر خرید کر۔ عبدو نے بھی دو تین بار مجبور ہو کر، محض اپنی دمے کی مریض بیوی کی خاطر "بابو" کی دکان سے ہزار منت سماجت اور گریہ زاری کے بعد سات آنے سیر خریدا تھا۔ لیکن روز روز اس قیمت پر آٹا خریدنے کی استطاعت کس میں تھی۔ خصوصاً اس شخص کیلئے جسے دو روپے روز ملتے ہوں اور سات نفر کھانے والے ہوں۔ دو میاں بیوی اور پانچ بچے!! اس کی بیوی کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی اور وہ اس قدر نحیف و لاغر ہو چکی تھی کہ اب اپنی شیر خوار بچی کو دودھ بھی نہیں دے سکتی تھی۔ دن میں کئی کئی بار اُسے دورہ پڑتا تھا۔ کھانستے کھانستے اسکی آنکھیں باہر کو نکل آتی تھیں، چہرے کی رنگت نیلی مائل سیاہ ہو جاتی تھی اور ماتھے کی رگیں پھول جاتی تھیں اور دورے کے بعد وہ اس قدر نڈھال ہو جاتی تھی کہ بہت دیر تک اس کے لئے ہلنا یا بولنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ویسے تو یہ مرض کئی سال سے اُسے چمٹا ہوا تھا مگر اب کچھ مدت سے زیادہ زور پکڑ چکا تھا۔ اور عبدو اسے چاول پر محمول کرتا تھا۔ ابتداء میں تو اس نے حکیموں سے رجوع کیا تھا۔ اور پیٹ کاٹ کاٹ کر اس کے لئے دوا خرید لیتا تھا۔ مگر کب تک!! آخر تھک ہار کر اس نے حکیموں کے ہاں جانا بھی چھوڑ دیا۔ وہ بے بسی اور لاچارگی کے عالم میں کبھی اپنی بیوی کی طرف دیکھتا تھا جو روز بروز گھلتی جا رہی تھی، سوکھتی جا رہی تھی۔ اور کبھی اپنے بچوں کی طرف جو مفلسی اور بیماری کے باوجود روز بروز بڑے ہو رہے تھے اور ان کے مطالبات اور ضروریات بڑھتی جا رہی تھیں۔ سب سے بڑی لڑکی تھی جسکی عمر پندرہ سال تھی۔ وہ بھی جوان ہو رہی تھی۔ سوچتے سوچتے کبھی عبدو کے ذہن میں اپنی بیوی کی موت کا خیال آتا تو وہ کانپ اٹھتا۔ اُسے اپنی تو کوئی فکر نہیں تھی مگر بچوں کا کیا بنے گا!! لیکن جس دن سے شہر کے باہر نئے ہسپتال کی تعمیر کا کام شروع ہوا تھا تو اسکی تاریک افلاس زدہ زندگی میں امید کی ہلکی سی کرن جاگ اٹھی تھی اور جیسے جیسے ہسپتال کی عمارت بلند ہوتی جا رہی تھی اسکی امید بھی پائیدار اور مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ صبح سے چلچلاتی دھوپ میں اینٹیں اور گارا ڈھونے کے بعد جب دوپہر کو تھک ہار کر سستانے کی غرض سے وہ دوسرے مزدوروں کے ساتھ کسی نیم یا شیشم کی خنک چھاؤں میں کھانا کھا کر نیم دراز ہو جاتا اور اپنے سامنے ہسپتال کی طویل و عریض مگر نامکمل عمارت کو دیکھتا تو چند لمحوں کے لئے اپنے افلاس اور دکھ درد کو بھول جاتا۔ وہ دل میں یہ تہیہ کئے ہوئے تھا۔ کہ جیسے ہی ہسپتال تیار ہو جائیگا۔ تو وہ سب سے پہلے اپنی بیوی کو اس میں داخل کرائے گا۔ چونکہ وہ ہر وقت اپنی بیوی اور اسکی بگڑتی ہوئی بیماری کے متعلق سوچتا رہتا تھا اور بیوی کو ہسپتال میں داخل کرانے کا خیال اس کے ذہن میں جڑیں پکڑ چکا تھا اس لئے کچھ مدت سے وہ یوں محسوس کرنے لگا تھا جیسے ہسپتال صرف اس کی خاطر تعمیر کیا جا رہا ہو۔ جیسے وہ "اس کا ہسپتال" ہو۔ لہٰذا ذاتی مفاد اور غرض کی بناء پر وہ اپنا کام بڑی نیک نیتی، تندہی اور جانفشانی سے کرتا تھا اور دوسرے مزدوروں کی کام چوری اور کاہلی اُسے بڑی کھلتی تھی۔ جیسے ان کی غفلت اور سستی سے اُس کا ذاتی نقصان ہو رہا ہو۔ ہسپتال اب قریباً قریباً مکمل ہو چکا تھا۔ صرف دو تین مہینے کا کام باقی رہ گیا تھا۔ اور عبدو کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی اپنی نجات کا دن قریب آرہا ہو۔

جہاں شہر ختم ہوتا تھا اور مہاجر بستی شروع ہوتی تھی وہاں سڑک کے دائیں ہاتھ "بابو" کی دوکان تھی۔ ایک دوکان نہیں بلکہ ایک قطار سے ملی ہوئی تین دوکانیں تھیں جن پر علی الترتیب "مہاجر راشن ڈپو" اور "مہاجر جنرل سٹور" اور "مہاجر ریسٹورنٹ" کے بورڈ آویزاں تھے اور اس کے

عقب میں گودام وغیرہ تھے۔ ان دو کانوں کا مالک ایک مہاجر ہی تھا۔ جو بستی اور شہر دونوں میں "بابو" کے نام سے معروف تھا اس کے اصل نام سے شاید ہی کوئی واقف تھا۔ بابو دراصل اسی بستی کا باشندہ تھا۔ شروع کا ایک سال تو اس نے اسی بستی کی ایک جھونپڑی میں کاٹا تھا۔ کیل جان تھی، نوجوان تھا، ہشیار اور محنتی تھا۔ اور تھوڑا بہت لکھ پڑھ بھی لیتا تھا۔ اس لئے کافی دوڑ دھوپ کے بعد اُسے پی ڈبلیو ڈی میں اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ کی ملازمت مل گئی تھی۔ اور پھر تین سال کے اندر اندر وہ اکاؤنٹنٹ کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ اور وہ مہاجر بستی کو چھوڑ کر شہر میں اٹھ گیا تھا جہاں اس نے ایک مکان الاٹ کرا لیا تھا ایک ڈیڑھ سال ہوا اس پر بڑی بھاری رشوت لینے کے سلسلے میں مقدمہ چلا تھا۔ مگر انجینئر اور ایس ڈی او وغیرہ کی مدد سے وہ صاف بری ہو گیا تھا۔ وہاں سے دل برداشتہ ہو کر اس نے نوکری چھوڑ دی تھی اور مہاجروں کی فلاح و بہبود کے مدِ نظر یہ دو کانیں کھول لی تھیں۔ اور اب اچھا خاصا کاروبار کر رہا تھا۔ مہاجرین کیلئے اُسے جو چینی کا کوٹا ملتا تھا اس میں سے نصف سے زائد چینی عموماً بچ جاتی تھی کیونکہ مہاجروں میں بہت کم ایسے تھے جو ایک روپیہ دو آنے سیر چینی خریدنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اس لئے جو چینی بچ جاتی بابو اُسے شہر کے حلوائیوں اور ہوٹل والوں کے پاس دو پونے دو روپے سیر کے حساب فروخت کر دیتا تھا۔ یہ کاروبار اسکی ہشیاری اور ذہانت پر دلالت کرتا تھا۔ بعض شرپسند اور عیب جو لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ دو کانیں بھی اُسے ایک ٹھیکیدار نے بنوا کر دی تھیں۔ وہی ٹھیکیدار جو پہلے پی ڈبلیو ڈی میں اس کا دوست تھا اور بعد میں اس نے ہسپتال کی تعمیر میں مزدور فراہم کرنے کا ٹھیکہ بھی لے لیا تھا۔ ابتدا میں عام مزدوروں کی اجرت ڈیڑھ روپیہ یومیہ تھی۔ چند ماہ تو مزدور چپ چاپ کام کرتے رہے۔ مگر ایک دن انہوں نے بابو کے اکسانے پر ہڑتال کر دی تھی۔ جس کے باعث تعمیر کا کام ایک ہفتہ کیلئے التوا میں پڑ گیا تھا۔ بابو مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت سے انکے اور ٹھیکیدار کے درمیان ثالث بنا تھا۔ اور کئی دن کی مسلسل گفت و شنید کے بعد مزدوروں کی اجرت ڈیڑھ روپیہ یومیہ سے بڑھا کر دو روپے کر دی گئی تھی۔ مزدور بہت خوش ہوئے تھے اور اپنی فتح کی خوشی میں انہوں نے بابو کو کندھوں پر اٹھا کر ساری بستی میں گھمایا تھا اور "بابو زندہ باد" اور "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگائے تھے۔ اس واقعہ کے چند روز بعد ہی بابو کی دو کانوں کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا تھا اور دو میانی دکان کی پیشانی پر جلی حروف میں "هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّی" لکھا گیا تھا۔ مہاجروں کی نظر میں بابو کی قدر اور وقعت اور بھی بڑھ گئی تھی اور وہ ان کے ہمدرد اور نمائندہ کے اعتبار سے معروف تھا۔ پوری مہاجر بستی اسکی ممنون اور احسان مند تھی۔ ایک طرف تو اسے مہاجروں کا پورا تعاون اور اعتماد حاصل تھا اور دوسری طرف شہر کے حکام پولیس، میونسپلٹی، سپلائی اور پی ڈبلیو ڈی کے محکموں میں اس کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ اس لئے مہاجروں کی بہتری اور سہولت کیلئے کوئی کام کرانے میں اُسے چنداں دقت نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا یہ اسی کی کد و کاوش کا نتیجہ تھا کہ میونسپلٹی نے مہاجر بستی تک پانی کا نل پہنچا دیا تھا اور جا بجا نلکے لگوا دیئے تھے اور بجلی کی لائین کی توسیع بھی بستی تک کر دی تھی۔ پانی آ جانے کے بعد مہاجروں کو بہت سہولت ہو گئی تھی گندے پانی کے جوہڑوں، مچھروں، مکھیوں، کیچڑ اور تعفن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اور رات کے وقت جب لوگ اپنے اپنے تاریک گھروندوں میں لیٹے ہوئے دور سڑک پر جلتی ہوئی بجلی کی زرد قمقموں کو دیکھتے تو احساسِ طمانیت و ممنونیت سے ان کے دل لبریز ہو جاتے۔ وہ خود کو تمام بلاؤں اور خطرات، چوروں اچکوں اور نقب زنوں سے محفوظ سمجھتے تھے۔ ان کی نظروں میں کھمبوں کی بتیاں پہریدار تھیں جو ساری ساری رات ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کی نگہبانی کرتی تھیں اور ان کے دل میں یہ خوشگوار اور اطمینان بخش احساس پیدا ہوتا کہ وہ اب خانہ بدوش نہیں رہے تھے بلکہ باقاعدہ شہری تھے۔ گویا بجلی اور پانی ملنے کے بعد انہیں شہریت کے تمام حقوق مل گئے تھے۔

یہ سب بابو کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ تھا۔ واقعی اگر اس شہر میں مہاجروں کا کوئی سچا ہمدرد اور بہی خواہ تھا تو وہ بابو ہی تھا۔ وہ خود مہاجر تھا اور ان

کے درمیان رہ چکا تھا۔ اس لئے ان کے گھریلو حالات، دکھ درد، تکالیف اور ضروریات کو اس سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اور وہی ان کی صحیح نمائندگی بھی کر سکتا تھا۔ ان مقاصد کے پیش نظر وہ میونسپلٹی کے آئندہ انتخابات میں مہاجروں کے نمائندہ کی حیثیت سے کھڑا ہو رہا تھا اور اس کی کامیابی یقینی تھی کیونکہ اس میدان میں اس کا حریف کوئی نہیں تھا۔

پہلے تو مہاجر صرف اس کے ممنون اور احسان مند تھے۔ لیکن اب دکانیں کھل جانے کے بعد اکثر اس کے مقروض بھی ہو گئے تھے اور اپنی اپنی استطاعت اور توفیق کے مطابق کسی نہ کسی طرح سے اس کا قرضہ چکانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ مہاجروں کے علاوہ کئی معزز شہری بھی اس کے مستقل گاہک تھے جو اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر اکثر آدھی رات کے وقت اپنی اپنی کاروں یا ٹیکسیوں میں اس کی دوکان پر آتے۔ ان کی گاڑیاں دوکانوں کے پچھواڑے کھڑی رہتیں اور بابو انہیں اپنی دوکان کے عقبی کمرے میں بٹھا کر خود روشن سڑک کو پار کر کے بستی کی تاریک بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد کار یا ٹیکسی سڑک پر نمودار ہوتی اور تیزی سے شہر کی طرف چلی جاتی تھی۔ اور پھر علی الصبح منہ اندھیرے وہی کار یا ٹیکسی ایک بار پھر شہر کی سونی اور خاموش گلیوں میں سے نکلتی اور بستی کا رُخ کرتی۔ بابو کی دوکان کے عقب میں کار کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آتی اور چند لمحوں کے بعد کوئی کار دوکان کے پیچھے سے نکل کر سڑک پر پہنچتی اور فراٹے بھرتی ہوئی واپس شہر کی طرف چل دیتی۔

عیدو نے راشن ڈپو میں داخل ہو کر نوکر سے پوچھا "بابو کہاں ہے؟"

"ساتھ والی دوکان میں،" نوکر نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ عیدو نے باہر نکلنے سے پہلے راشن ڈپو کے چاروں کونوں کا سرسری سا جائزہ لیا۔ ڈپو کو خالی دیکھ کر عیدو کو سخت مایوسی ہوئی۔ ایک کونے میں صرف چینی کی چند بوریاں رکھی تھیں۔ وہ راشن ڈپو سے نکل کر جنرل سٹور میں داخل ہوا۔ بابو سفید قمیص اور نیلی پتلون پہنے کھڑا تھا۔ اس کے لمبے لمبے کنگھی کئے ہوئے بال بجلی کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ میز پر رکھا ہوا بجلی کا پنکھا نیم دائرے میں گھوم رہا تھا۔ دوکان میں ایک برقع پوش عورت کھڑی تھی۔ عیدو نے اس کی شکل دیکھنے سے پہلے اس کے برقعے سے پہچان لیا کہ وہ اسکی ہمسائی رشیدہ تھی۔ دین محمد کی بیوی۔ اس بستی میں گنتی کی عورتیں برقع اوڑھتی تھیں۔ اور وہ بھی پرانی وضع کا خیمہ نما برقع۔ رشیدہ بھی ان چند عورتوں میں سے تھی اور اس نے حال ہی میں برقع بنوایا تھا۔ عنابی ساٹن کا نئی وضع کا برقع، جسے دیکھ کر بستی والے دنگ رہ گئے تھے۔ دینو کو بھی حیرت ہوئی تھی کہ آنا مہنگا برقع اس نے آخر کیسے بنوا لیا تھا! دینو اس کا خاوند کوئی امیر آدمی نہیں تھا وہ بھی عیدو کی طرح ایک معمولی مزدور تھا، اس کے ساتھ کام کرتا تھا اور اس کے برابر کی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ رشیدہ اگرچہ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ مگر تھی تیز، طرار اور ناز نخرے والی۔ رنگت سانولی تھی مگر ناک نقشہ اچھا تھا۔ بستی کی دوسری عورتیں اس کے ناز سنگھار اور سج دھج کو دیکھ کر جلتی تھیں اور اس چال چلن کی وجہ سے اس کے متعلق عجیب عجیب باتیں پھیلاتی رہتی تھیں۔ بلکہ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ دینو کی بیوی ہی نہیں تھی۔ اور مرد بھی اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ کیونکہ اسے دیکھ کر بڑے بڑوں کی رال ٹپک پڑتی تھی مگر عیدو کو اس میں کوئی عیب نظر نہیں آتا تھا۔ وہ زمانے عامر کے با وجود اسے اچھا سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ اکثر اس کے ہاں آتی جاتی رہتی تھی ہفتے میں ایک آدھ بار ضرور آتی تھی اور خالی ہاتھ کبھی نہیں آتی تھی۔ کبھی آٹا، کبھی چینی یا چائے کبھی بچوں کے لئے مٹھائی یا ٹولیاں وغیرہ کچھ نہ کچھ ضرور اس کے ہاتھ میں ہوتا اور کبھی کبھی اس کی بیوی کو کوئی دوا بھی دے جاتی تھی اس کے علاوہ وہ اسکی لڑکی کو سینے پرونے اور کشیدہ کاری کا کام بھی سکھا رہی تھی۔ وہ دیسے بھی کبھی کبھار آتا تھا اور وہ "عیدو بھیا" کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اسکے اچھے اچھے کپڑوں اور

بالو سنگھار کو دیکھ کر عبدو کو اچھا ضرور ہوتا تھا۔ گو شروع ہی سے جب کبھی مسلسل چاول کھا کر بیزار ہو جاتے تھے، تو اس کے چھڑنے کے بعد سے بالآخر وہ وقت روٹی پکنے کی آواز آیا کرتی تھی اور عبدو اکثر اپنی بیوی سے پوچھا کرتا: یہ لوگ آٹا کہاں سے خریدتے ہیں؟ مرچ اور تیکھی آوازیں بے اختیاری سے جواب دیتی: "تمہیں کیا پتہ! ایک ہی خریدتے ہوں گے۔ سب ہماری طرح غریب تھوڑی ہی ہیں؟" اس کے لہجے میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا۔ " اور پھر بچوں کو نصیحت بھی کر دیتی "تم نہیں مانگو گے۔" وہ تھوڑے توقف کے بعد کہتی اور عبدو کو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس غربت، بیماری اور افلاس کا ذمہ دار اور مجرم وہ خود ہو۔ اور موٹے موٹے ٹھنڈے چاول اس کے حلق میں اٹک کر رہ جاتے۔

"آؤ عبدو بھیا! چھٹی ہو گئی؟ دیر ہی آ گیا؟" اس کی ہمسائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ بھی آ رہا ہو گا۔" اس کی متحیر نظریں کاؤنٹر پر سجی ہوئی چیزوں پر جہاں کئی قسم کے چھوٹے بڑے ڈبے اور ایک طرف مٹھائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف صابن کی ٹکیہ تھی۔ دو بسکٹ کے ڈبے۔

"یہ رہا تیل۔" بابو نے ایک بڑی سی شیشی کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ساڑھے تین روپے!" اور پھر عبدو کی طرف مڑا: "آؤ عبدو کیسے آئے؟" عبدو چونک پڑا۔ ساڑھے تین روپے!! اس کی پریشان اور الجھی ہوئی نظریں بار بار کاؤنٹر پر ڈھیر کی ہوئی چیزوں کی طرف بھٹک رہی تھیں۔ ساڑھے تین روپے ایک شیشی کے؟! بابو کے سوال پر وہ گھبرا گیا۔ اپنی ہمسائی کے سامنے آٹے کے بارے میں پوچھنے میں وہ بڑی ذلت محسوس کر رہا تھا۔ آخر کچھ دیر ہچکچانے اور جھجکنے کے بعد اس نے رک رک کر منفعل سے لہجے میں پوچھا "بھیا۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ وہ۔۔۔ ذرا آٹے کا پوچھنے آیا تھا۔"

"آٹا ابھی نہیں آیا۔" بابو نے اپنی تلوار مارکہ مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اور پھر اپنی گاہک سے مخاطب ہوا۔ "اور کیا چاہیئے؟"

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ دوسرا صابن بھی۔۔۔" رشیدہ بابو کی طرف شریر لیکن قدرے مرعوب نظروں سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ بابو بھی مسکرا کر ایک شیشے کی الماری کی طرف بڑھا۔ عبدو مایوسی اور ناامیدی کے بوجھ سے شکستہ دوکان کے دروازے میں کھڑا سڑک کی دوسری طرف شام کے جھٹپٹے اور گرد و دھوئیں میں خفیف بستی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں کتوں کے بھونکنے، بچوں کے رونے اور عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہی تھیں اور مزدوروں کی ٹولیاں سڑک سے اتر کر بستی کی تاریکی میں بکھرتی جا رہی تھیں۔ عبدو گہری سوچ میں ڈوبا کھڑا سر کھجلا رہا تھا۔ دفعتاً اسے کچھ یاد آیا۔

"بابو، وہ واقعی آٹا کب آئے گا؟" اس نے مڑ کر پوچھا۔

"وہ آ گیا تھا آٹا! اسے کیا پوچھ رہے ہو عبدو بھیا!" بابو نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا "ہم غریبوں کی تو قسمت ہی کھوٹی ہے۔ ایک ہفتہ ہوا ملاتی آٹا آیا تھا۔ مگر رات ہی رات میں سٹیشن پر سے پانچ ہزار بوری چوری ہو گئی۔"

"چوری ہو گئی؟ کیسے؟" عبدو کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"بس ہو گئی۔" بابو نے قدرے بے پروا کر بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "جیسے چوری ہوا کرتی ہے۔ آدھی رات کے وقت سٹیشن پر کھڑے ٹرکوں میں بوریاں لاد کر لے گئے۔"

"کسی نے دیکھا نہیں؟" عبدو کے لہجے میں انتہائی مایوسی اور افسردگی تھی، اور حیرت بھی۔"

"تم بھی بہت بھولے ہو حمید بھیّا!" بابو رشیدہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ حمید کو یوں لگا جیسے اُسے گالی دی گئی ہو۔ جب رشیدہ بھی مسکرا دی تو وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ "حمید! تم دنیا کے کاروبار سے بالکل ناواقف ہو۔ پیسہ ایسی چیز ہے جو لوگوں کے منہ بھی بند کرتا ہے اور آنکھیں بھی۔ پھر تم مجھے ذرا مہاجر بستی میں پہنچنے دو۔" وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے بولا۔ "میں ان سب جھونپڑوں کا بجلی کھولوں گا۔" اور حمید منہ لٹکائے دوکان سے نکل گھر کی طرف چل دیا۔

"اور کچھ؟" بابو نے سب چیزیں ایک بڑے سے لفافے میں ڈال کر اپنی گاہک سے پوچھا۔

"بس۔ اور ہاں آٹا!" وہ جلدی سے بولی۔

"آج رات کو ایک بوری بھجوا دوں گا۔ اور چینی بھی۔ اور۔۔۔" وہ رک گیا کیونکہ دو مزدور دوکان میں داخل ہوئے۔

"کیوں بابو صاحب۔ کوئی آٹا واٹا ملنے کی اُمید ہے؟" ایک مزدور نے پوچھا۔

"نہیں بھیّا۔ ابھی آٹا کہاں!؟" بابو نے منہ بنا کر مایوسی سے کہا۔ دونوں مزدور اپنی قسمت کو کوستے ہوئے واپس چلے گئے۔

"میرا کام کیا؟" بابو نے رشیدہ سے پوچھا۔

"ہاں۔ مگر ابھی پورا نہیں ہوا۔ ماں تو کچھ کچھ راضی ہیں۔ آدمیوں کا ڈر ہے"۔ وہ رازدارانہ انداز میں بولی۔

"آدمیوں سے ڈرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ انہیں کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ کیسے ہیں کچے یا پکے؟"

"ایک ادھ کچا اور دوسرا بالکل پکا ہوا" وہ احتیاطاً باہر کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ "اچھا میں اب چلوں۔ دیر ہو گیا ہوگا" جیسے لفافہ تھماتے وقت بابو نے اس کے ہاتھ میں چٹکی بھری۔ "تم جلدی کرو۔ سنا؟ مجھے نئے مال کی ضرورت ہے اور جتنا آٹا اور چینی مانگو حاضر ہے"

"اچھا۔ ایک دو دن میں کچھ نہ کچھ ہو جائیگا" اور مسکرا کر دروازے کی طرف چل دی۔

"ادی سنو!" بابو دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "حمیدہ کا دانہ بھی تو ہے؟" اُس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو میرے ہاتھ میں ہے۔ مگر کچھ دن ٹھہر جاؤ۔ کمبخت کی ماں بڑی سخت ہے۔ اور بڑی نگرانی رکھتی ہے۔ وہ کسی کنارے لگ جائے تو۔۔۔" اس نے مسکرا کر بابو کو آنکھ ماری اور دوکان سے باہر نکل گئی۔

اکتوبر کی ایک خنک صبح تھی۔ پولیس کے سپاہی اپنی اُجلی اُجلی اکلاف وردیاں اور چمکتے ہوئے بوٹ پہنے ہاتھوں میں ڈنڈے لئے سڑک پر گشت کر رہے تھے۔ اور ہر آدھ گھنٹے کے بعد بابو کے ریستوران میں جا کر چائے کی پیالی، بسکٹ اور سگریٹ سے تازہ دم ہو کر پھر سڑک کی گشت شروع کر دیتے۔ کمیٹی کے بھنگیوں کی فوج ایک جمعدار کی نگرانی میں سڑک اور مہاجر بستی کی صفائی کرنے پر مامور تھی۔ مہاجر بستی میں گذشتہ سات سال سے جو کوڑا کرکٹ اور گند اکٹھا ہو رہا تھا لاریوں میں بھر بھر کر شہر سے دور بھیجا جا رہا تھا۔ بابو کی دوکانیں رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجی ہوئی تھیں۔ اور ایک لال رنگ کے کپڑے پر بڑے بڑے سنہری الفاظ میں "خوش آمدید اور پاکستان زندہ باد" لکھا ہوا تھا۔ دوکان کے باہر بابو اپنے نئے سوٹ میں ملبوس، نئی موٹر سائیکل کے پاس کھڑا شہر کے چند معزز شہریوں سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ بڑا مسرور اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ دو دن قبل وہ مہاجر حلقے میں بغیر کسی مقابلے کے کمیٹی کا ممبر منتخب ہوا تھا اور آج اُسے ایک اعلیٰ وزیر سے ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہونے کی اُمید تھی۔ وہ وزیر نئے ہسپتال کی رسم

افتتاح ہوا کرنے کے لئے آ رہا تھا۔ شہر کی تمام عمارتیں جو قلعی اور صفائیاں بھی وزیر کی آمد کے سلسلے میں تھیں۔ وہ بار بار بستی کی طرف دیکھ رہا تھا جس پر جھگیوں کے جھاڑ جھنکار سے اٹھتی ہوئی گرد اور دھول کے بادل اٹھ رہے تھے اور وہ ایسے سوالی کی کے انتظار میں امید باندھے خواب دیکھ رہا تھا۔ بستی کے بچے بوڑھے اور جوان رسم افتتاح دیکھنے کی غرض سے ہسپتال کی طرف جا رہے تھے جہاں انہوں نے سنا تھا کہ تقریب کے بعد مٹھائی تقسیم ہوگی۔ لہذا بستی مردوں سے تقریباً تقریباً خالی ہو چکی تھی۔

اُدھر ہسپتال میں خوب گہما گہمی اور افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ہسپتال کے وسیع اور خوبصورت لان میں شامیانے نصب کئے جا رہے تھے کناتیں لگ رہی تھیں اور معزز شہریوں کے لئے نشستوں کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ مزدور ہسپتال کے چاروں طرف پھیلے ہوئے وسیع باغ کو بھی صاف کر رہے تھے عمارت کے ارد گرد سے بجری کے ڈھیر اٹھا رہے تھے اور کھڑکیوں، دروازوں اور روشندانوں کے شیشے چمکا رہے تھے۔ چند ایک کمروں اور لمبی لمبی راہداریوں کے فرشوں کو دھویا جا رہا تھا۔ پوری عمارت رنگ برنگی کاغذی جھنڈیوں سے آراستہ پیراستہ کی گئی تھی۔ مزدور بڑی تیزی سے کام کر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر گرد اور شکستگی چھائی ہوئی تھی۔ کیونکہ یہ دن ان کے کام کا آخری دن تھا۔ اور کل سے پھر بیکاری، تنگدستی اور فاقے۔ کل سے انہیں پیٹ بھرنے کے لئے کوئی اور وسیلہ ڈھونڈنا پڑے گا۔ لہذا ان کے چہروں پر فکر اور اداسی کے تاثرات تھے۔ ان سب میں صرف ایک آدمی خوش تھا۔ صرف ایک مزدور تھا جو بار بار آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا۔ وہ اپنے ارد گرد کی بھاگ دوڑ اور شور و غل سے بے خبر اپنے امید افزا اور خوشکن خیالوں میں گم کرسیاں اٹھا اٹھا کر قطاروں میں لگا رہا تھا۔ اور کبھی کبھی عیدو اپنے کام سے رک کر سیدھا کھڑے ہو کر ہسپتال کی عالیشان عمارت کی طرف دیکھتا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ وہ خواب جو ہسپتال کی تعمیر کے ساتھ ساتھ بہت عرصے سے اس کے سینے میں پل رہا تھا، اب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اس کی مبہم امیدیں جو کئی مہینوں سے اس کے دل میں پرورش پا رہی تھیں اور ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکی تھیں، اب ان میں پھل لگنے والا تھا۔ عیدو خوشی سے جامے میں پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آج اُسے اپنی محنتوں اور کاوشوں کا صلہ ملنے والا ہو۔ بلکہ مل چکا ہو جیسے وہ سچ مچ عالیشان عمارت صرف اسکی خاطر بنی ہو۔ جیسے وہ اس کی ملکیت ہو۔ وہ تصور میں اپنی بیوی کو اس لمبی چوڑی عمارت کے ایک صاف ستھرے کمرے میں اُجلے سے بستر پر لیٹا ہوا دیکھ رہا تھا۔ گوری گوری سفید وردیوں میں ملبوس نرسیں صبح و شام اس کی خدمت کر رہی تھیں۔ اس کی بیوی کی مردہ بجھی ہوئی آنکھوں میں رفتہ رفتہ زندگی کی چمک پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے پچکے ہوئے زرد گال آہستہ آہستہ بھر رہے تھے۔ اس کے لاغر جسم میں دھیرے دھیرے صحت اور توانائی عود کر رہی تھی۔ اور وہ ....

"ابے او کھڑے کیا کر رہے ہو" کوئی اس کے پیچھے سے چلایا۔ وہ چونک پڑا۔ "جلدی کام ختم کرو"۔ عیدو پھر کرسیاں اٹھا اٹھا کر قطاروں میں لگانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کل صبح ہسپتال کھلنے سے پہلے اپنی بیوی کو وہاں لے کر پہنچ جائے کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ ہسپتال میں سب سے پہلا مریض جو داخل ہو وہ اس کی بیوی ہو۔ اسے صرف ایک چارپائی کی جگہ درکار تھی۔ کیا ڈیڑھ سال تک اپنا خون پسینہ اینٹوں اور گارے میں جذب کرنے کے بعد وہ ایک بستر کا حقدار بھی نہیں تھا؟ کیوں نہیں کیوں نہیں اس نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا میں اپنا حق لے کر رہوں گا۔ اگر میری حق تلفی ہوئی تو میں اسی دیوار سے سر پھوڑ لوں گا۔ اس نے اب تک یہ راز اپنی بیوی سے مخفی رکھا تھا مگر آج وہ گھر جانے کے لئے بے چین ہو رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ جلد یہ ہنگامہ ختم ہو اور وہ گھر پہنچ کر بیوی کو یہ خوشخبری سنائے۔

وزیر صاحب بجائے صبح گیارہ بجے کے شام کے چار بجے تشریف لائے۔ پولیس بینڈ نے ان کو خوش آمدید کہا۔ بستی کے باشندے جو صبح سے وہاں بیٹھے انتظار کر رہے تھے "زندہ باد" کے نعرے لگائے۔ وزیر صاحب نے سب سے پہلے ایک [illegible]

میں انہوں نے بتایا کہ یہ ہسپتال جو ملک کے بڑے ہسپتالوں میں سے ایک تھا، مہاجرین ہی کے لئے بنایا گیا تھا۔ اور آخر میں انہوں نے ان ٹھیکیداروں اور دیگر کارکنوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے اپنی محنت اور جانفشانی سے اس کی تعمیر کو انجام تک پہنچایا تھا۔ اور امید ظاہر کی تھی کہ وہ اب اس ہسپتال سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔ ان لوگوں نے عبدہ کی بہت زوردار بند صدائیں۔ تقریر کے بعد وزیر صاحب نے صدر دروازے کے سامنے لگے ہوئے فیتے کو قینچی سے کاٹ کر ہسپتال کا صدر دروازہ کھول دیا۔ جس پر لوگوں نے خوب تالیاں پیٹیں۔ اس کے بعد انہوں نے سارے ہسپتال کا معائنہ کیا۔ معائنے کے بعد ہسپتال کے ڈاکٹر، دیگر سٹاف اور نرسوں وغیرہ سے تعارف کرایا گیا۔ اس کے بعد نمائندگانِ شہر سے تعارف ہوا۔ اور پھر وہ چائے پینے بیٹھ گئے۔ پنڈال کے باہر لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ پاس ہی کی پرانی مہاجر بستی ٹوٹ پڑی تھی ان کے درمیان مٹھائی تقسیم کی گئی ہر ایک کو دو دو لڈو دیئے گئے

جب وہ اپنے حصے کے دو لڈو لے کر سیدھا گھر کی طرف بھاگا۔ سیاہ اور پیلی سڑک دھوپ میں چمک رہی تھی۔ سورج عیدو کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھا ہر طرف خلا پھیلی تھی۔ مگر وہ ارد گرد سے بالکل بے نیاز ہاتھ میں لڈو دبائے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اچھلتا جا رہا تھا۔ اور آپ ہی آپ مسکرا رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ جب وہ اپنی بیوی کو یہ خبر سنائے گا تو وہ کتنی خوش ہو گی۔ گرمی کی وجہ سے اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ مگر اسے نہ تو گرمی کا احساس تھا۔ اور نہ پسینے کا۔ جب وہ بستی میں داخل ہوا تو وہ بالکل بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ کہیں کہیں سے کسی عورت کے بولنے کی آواز آ رہی تھی گلیوں میں چند کتے پھر رہے تھے۔ بستی کو یوں خاموش اور ویران دیکھ کر عیدو کو کچھ تعجب سا ہوا۔ اس قدر خاموشی اور ویرانی اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ دفعتاً اس خاموشی میں موٹر سائیکل کی آواز گونج اٹھی۔ آواز قریب آتی گئی اور پھر کچھ دیر کے بعد ایک گلی میں سے بابو کی موٹر سائیکل نمودار ہوئی اور پھٹ پھٹ کرتی ہوئی اس کے پاس گزر کر سڑک کی طرف چلی گئی۔ عیدو ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں سے ہوتا ہوا اپنی جھونپڑی میں داخل ہوا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی کو بلایا۔ "رحمتے اور رحمت بی بی"۔ مگر رحمت بی بی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک کونے میں چٹائی پر اوندھی لیٹی سو رہی تھی۔ چولہے پر ہنڈیا میں چاول ابل رہے تھے۔ اور اس کے پاس ننھی بچی بیٹھی رو رہی تھی۔ عیدو نے آگے بڑھ کر اسے ہاتھ سے ہلایا۔ "رحمتے۔ او رحمتے!" اور رحمت بی بی ڈھلک کر چولہے کے پاس جا گری۔ اس کی آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں منہ کھلا تھا۔ چہرے کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ اور جسم بالکل ٹھنڈا۔ عیدو خوفزدہ ہو کر جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ اور اپنی بڑی لڑکی کو آوازیں دینے لگا۔ "روشن۔ او روشن!" روشن ہمسائے کی جھونپڑی میں سے ایک وزنی بوری کو گھسیٹتے ہوئے باہر نکلی۔ اس کے گال کچھ اس طرح دہک رہے تھے جیسے گلال ملا ہوا ہو۔ اور اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سی چمک تھی۔ ایسی ہی چمک جو شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھنے کے بعد حوا کی آنکھوں میں پیدا ہوئی تھی۔ اور روشن بوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "ابا۔ ابا۔ وہ بتی آٹا دے گیا ہے۔ یہ دیکھو آٹا آٹا!"

حمید اختر

یہ لوگ

مجھے عمر بھر ان لوگوں سے ملنے کی حسرت رہی ہے جو اونچی چھتوں والے محراب دار کمروں میں بیٹھ کر مغربی موسیقی ایرانی قالینوں اور فرانسیسی مصوروں کے متعلق باتیں کرتے ہیں، جن کے ڈرائنگ روم سے باہر برآمدے کے ستونوں پر عشق پیچاں کی بیلیں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور لان میں ریشمی گھاس کے تختے بچھے رہتے ہیں۔ جن کے باغوں میں سرو کے اونچے اور سجیلے درخت کچھ سوچتے کھڑے رہتے ہیں اور جن کی زندگی میں صرف خوشبوؤں اور نغموں کی چاشنی کا دخل ہوتا ہے، ایسے لوگ جن کے گال گلاب کے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح نرم و نازک اور شفاف ہوتے ہیں، آہ وہ لوگ جن کے سروں میں کوئی سودا نہیں ہوتا، جو اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں وہ جو اپنے گھروں میں ایرانی بلیاں پالتے ہیں اور یونانی صنم گروں کی باتیں کرکے دھندلی شاموں کو سنہرے خوابوں سے منور کرتے ہیں۔ یہ لوگ کہاں ہیں؟ ان کا ذکر کہانیوں میں ملتا ہے، یہ لوگ ناولوں کے صفحوں پر پھیلے ہوئے ہر شام، ہر رات مجھے نظر آتے ہیں اور کبھی کبھار سینما کے پردے پر ان کی صورتیں نظر آجاتی ہیں۔ میں مدتِ مدید سے تلاش کر رہا ہوں مگر یہ لوگ ہیں کہ کہیں نظر ہی نہیں آتے

جو لوگ حقیقی زندگی میں مجھے نظر آتے ہیں ان کی صورتیں مسخ ہو چکی ہیں، مجھے ان سے نفرت ہے، ان سے بھاگ کر ان سے پیچھا چھڑا کر میں دور چلا جانا چاہتا ہوں کیونکہ ان کے چہروں پر گزرے ہوئے حادثات کی واضح لکیریں کھلی ہوئی کتاب کی طرح پڑھی جاتی ہیں۔ میرے ملاقاتیوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے چہروں پر ان قدموں کی چھاپ صاف نظر آتی ہے جو انہیں روند کر گزر گئے ہیں۔

◆ ◆ ◆

روزانہ شام کو میں دفتر سے یہ سوچتا ہوا نکلتا ہوں کہ اس شام کے بوجھ کو کہاں لے جا کر پھینکوں، شام کتنے غم کتنی یادیں اپنے ساتھ لاتی ہے اور میں انہیں بھولنے کے لئے نت نئی ترکیبیں سوچتا ہوں مگر پہلے ہی موڑ پر مجھے اپنا پرانا دوست عزیز احمد ملتا ہے۔ اب اس کی کمر دوہری ہو گئی ہے، جب بھی میری اس کی ملاقات ہوتی ہے وہ پہلا سوال یہ کرتا ہے کہ میں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟ دوسرے سانس میں وہ اپنی بیوی کی چیرہ دستیوں اور چھ بچوں کے عذاب کا رونا روتا ہے۔ اسے محکمانہ امتحان دیتے ہوئے پانچ برس ہو گئے ہیں، ہر سال وہ دو تین نمبروں یا ممتحن کی سنگدلی کی وجہ سے اس امتحان میں فیل ہو جاتا ہے۔ شام کو وہ گھر سے دور کہیں نہیں جاتا۔ بلکہ آس پاس گھومتا رہتا ہے اور ایسے وقت میں اسے دیکھ کر ہمیشہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ گھر واپس جانے یا گھر کی واپس نہ جانے کا فیصلہ کرنے کی کشمکش میں گرفتار ہے، کبھی کبھی وہ ٹہلتا ہوا اپنے گھر کے پاس سے گزرتا ہے تو اس طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا بلکہ کوشش کرتا ہے کہ اس کی نظریں کہیں بھولے بھٹکے ادھر کا رخ نہ کر لیں۔ اس کی گفتگو کا آخری حصہ بالعموم امتحان پاس کرنے کی امید سے متعلق ہوتا ہے جس کے بعد اسے اگلا گریڈ مل جائے گا اور سالانہ ترقی ۵ روپے کی بجائے سات روپے ہو جائے گی۔ عزیز کا رنگ سیاہ ہے اور وہ اس طرح کھویا کھویا رہتا ہے جیسے یتیم خانہ کا کوئی یتیم منتظموں کی آنکھ بچا کر بھاگ آیا ہو لیکن اسے آگے جانے کا کوئی راستہ نظر نہ آتا ہو۔

◆ ◆ ◆

جس ہوٹل میں میں شام کی چائے پیتا ہوں وہاں میرے بڑے عزیز دوست موجود ہوتے ہیں، شاید مجھے ہر شام اس ہوٹل [illegible] کرنے میں ا

پر نشست پر بیٹھا نظر آتا ہے۔ وہ رات گئے تک وہیں بیٹھا رہتا ہے۔ شام کو کلب میں آنے والے اگر اس کے پاس بیٹھتے ہیں وہ کچھ دیر تک اپنی اپنی بات کہہ کر چلے جاتے ہیں۔ وہ سب کی سنتا ہے کبھی کبھی وہ مسکرا دیتا ہے لیکن بالعموم اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ بہرہ ہے۔ ہم دونوں کو کئی شام بیٹھے ہوئے دیکھا گیا ہے لیکن وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ گیارہ بجے رات کے بعد ہوٹل بند ہو جاتا ہے تو وہ سامنے کی لمبی سڑک پر نکل جاتا ہے آدھی رات کو شہر میں گھومنے والوں نے اسے اکثر اس سڑک کے کنارے کسی دیوار پر بیٹھا ہوا پایا ہے۔ معلوم نہیں وہ کہاں رہتا ہے، کب گھر جاتا ہے، جاتا بھی ہے یا نہیں۔ رات کی خاموشی میں کبھی کبھی میں اس کے برابر دیوار پر جا بیٹھتا ہوں اور اس کے چہرے کو غور سے پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر وہاں کچھ بھی نہیں، ایک شناک غم اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ خوفزدہ رہتا ہے۔ ایک رات میں نے اس سے پوچھا "شاد تم اتنی رات گئے تک کیا کرتے رہتے ہو، تم گھر کیوں نہیں جاتے ہو؟"

اس کی چمکدار اور روشن آنکھیں کچھ اور بھی پھیل گئیں اور اس نے اوہ جھوٹے ہاتھ کا سگریٹ پھینک دیا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "سلیم میرے دوست میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ جہاں میں رہتا ہوں جہاں میری ماں ہے بھائی اور بہنیں ہیں وہ بھی میرا گھر نہیں ہے۔ میں کہاں جاؤں؟" اس کے بعد مجھے کبھی اس سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

* * *

کبھی کبھار کسی دو پہری شام کے زہر کو دور کرنے کے لئے میں سڑک کے آخری کونے پر کلب میں چلا جاتا ہوں۔ گذشتہ برس میں جب کبھی میں اس کلب میں گیا ہوں میں نے چوہدری فخرالدین کو بار کے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے پایا ہے وہ کلب کے کسی دوسرے مشغلے میں شریک نہیں ہوتا۔ چوہدری فخرالدین کی عمر ۵۰ برس کے قریب ہے شہر میں اس کا بڑا کاروبار ہے، کئی صنعت بخش ٹھیکے پچھلے کئی برس سے اس کے پاس ہیں۔ اس کا مکان بھی بڑا عالی شان ہے اور وہ گیارہ خوبصورت بچوں کا باپ بھی ہے جن کی محبت کے لئے وہ ہر بڑے سے بڑا سماجی جرم کر سکتا ہے لیکن کلب میں ہر شام دو پیگ اُنگلی پینے کے بعد وہ چلاتا ہے "دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے، مجھے آج تک کسی نے نہیں سمجھا۔ یہ دنیا یہ خدا یہ انسان سب جھوٹ ہے فریب ہے" پھر وہ بار مین سے کہتا ہے "کلب میں جتنے آدمی ہیں سب کو ایک ایک پیگ ہسکی پلاؤ۔ پیؤ دوستو زندگی کو بھول جاؤ، یاد رکھنے کی چیز صرف خدا اور موت ہے۔ پیو اور اس کو یاد کرو یہ دنیا یہ خدا یہ کچھ فریب ہے۔"

چار پیگ پینے کے وہ زار و قطار روتا ہے اور ہر آدمی سے کہتا ہے "میں بڑا دکھی ہوں، مجھے میرے غموں نے پیس کر رکھ دیا ہے، میں یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں گا ـــــ دور ـــــ اتنی دور جہاں انسان اتنا جھوٹا، اتنا کمینہ اور اتنا پاجی نہیں ہوگا مگر میں کہاں جا سکتا ہوں میرے یہ بچے، یہ اُلو کے پٹھے مر جائیں گے اور میری بیوی ـــــ" پھر سات پیگ پینے کے بعد وہ بالکل خاموش ہو جاتا ہے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ساری دنیا کو اس طرح دیکھتا ہے، گویا وہ یکایک کسی اجنبی کے گھر آ نکلا ہے اور اب صاحبِ خانہ سے معذرت چاہ رہا ہے۔

میں کلب سے بھاگ نکلتا ہوں، یہاں میرا دم گھٹتا ہے، میں جو پھولوں اور نغموں کی تلاش میں پھرتا ہوں گھڑی بھر کی مسرت کے لئے مارا مارا پھر رہا ہوں اپنے دوست چوہدری فخرالدین کے ساتھ وقت نہیں گزار سکتا۔ اسے اپنی شامیں اور اپنے دل کی دھڑکنیں نہیں دے سکتا، اپنے غم نہیں دے سکتا۔ کلب سے نکلتا ہوں تو وہ چند قدم میرے پیچھے چلتا ہے "رک جاؤ" وہ کہتا ہے "تم مجھے چھوڑ گئے تو میں مر جاؤں گا" لیکن میں اسے بھی چھوڑ آتا ہوں ہر شام وہ زندہ رہتا ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ ابھی نہیں مرے گا! ابھی اس کے اندر اس کی روح کی گہرائی میں کسی پوشیدہ غم کا ابھرنا ہے اور بھڑکنا ہے وہ ایک شعلہ جو اس کے دل کو گھیر اٹھنے والی روشنی ہے ابھی کچھ دیر اور چلے گا، ابھی کچھ اور دھواں اٹھے گا!

ان دنوں مجھے ظفر سے مل کر بے پایاں مسرت حاصل ہوتی ہے، جب سے اس کا عشق ناکام ہوا ہے اس کی صحت بھی بدل گئی ہے۔ پہلے وہ بہت حد تک اس نے سنجیدہ بسر کر عشق کیا ہے۔ اس مدت میں اسے اپنا اپنی زندگی اور اپنے ارد گرد کی دنیا کا ہوش تک نہیں تھا۔ ہر وقت جیسے وہ کسی کھوئی ہوئی سی چیز میں کھویا رہتا تھا۔ وہ ہر وقت آہیں بھرتا تھا، زندگی کے تمام شوق صرف ایک نکتے پر مرکوز ہو گئے تھے۔ میں نے زندگی میں بہت کم لوگوں کو اتنے صدق دل سے محبت کرتے دیکھا ہے۔ لیکن جب سے اس کی محبوبہ بیاہی گئی ہے، اس میں حیرت انگیز تبدیلی آ گئی ہے۔ اب وہ شام کو ہوٹل میں بیٹھ کر لوگوں کو پوائیاں الٹ دیتا ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر فلک شگاف قہقہے لگاتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس میں ایک کھلنڈرا پن آتا جا رہا ہے اور جیسے اپنی بھولی ہوئی زندگی کو پھر سے دریافت کر رہا ہے اور گم شدہ زندگی کی ایک ایک تفصیل کا نئے سرے سے جائزہ لے رہا ہے۔ ان دنوں وہ شام کے وقت باقاعدگی سے سیر کرنے جاتا ہے اور دوستوں کو زندگی سے بھرپور طور پر لطف اندوز ہونے اور زندہ رہنے کے فلسفے پر لیکچر دیتا ہے۔ ان دنوں ظفر بالکل بدلا ہوا انسان ہے، جب بھی میری اس کی ملاقات ہوتی ہے وہ مجھے سیر کرنے کی ہدایت ضرور کرتا ہے "تم دن بھر کام کرتے ہو، شام کو سیر ضرور کیا کرو، چلو باغ تک ہو آئیں ان دنوں موسم بہار کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور ذرا دیکھو تو سہی موسم کس قدر شاندار ہے۔"

پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر ساتھ لے جاتا ہے اور شام کی اداس اور بوجھل فضا میں باغ کے ایک کونے میں جا بیٹھتا ہے۔ مگر وہاں پہنچ کر لطیفے بیان کرتے اور قہقہے لگاتے ہوئے وہ یکایک خاموش ہو جاتا ہے اور آس پاس سے کوئی پھول توڑ کر بیٹھ جاتا ہے، پھر وہ اس پھول سے اپنے گال سہلاتا ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں، ایسے موقع پر اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہتا وہ گم ہو جاتا ہے، کھو جاتا ہے کہیں دور نکل جاتا ہے اور جب میں گھبرا کر اس سے اٹھنے کے لئے کہتا ہوں تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے یوں دیکھتا ہے جیسے میں کوئی اجنبی ہوں، اس کا کوئی دشمن ہوں۔ ایسے موقعوں پر میں اسے باغ کے اسی کنج میں چھوڑ آتا ہوں۔ مجھے اس سے ڈر لگنے لگتا ہے۔

• • •

ہمایوں میرے دوست کو کسی عورت کی محبت نہیں ملی، اس کی عمر اس وقت ۴۵ برس کے لگ بھگ ہے، جیسے جیسے دن گزرتے جاتے ہیں یہ صدمہ جانکاہ اس کی جان کے لئے عذاب بنتا جاتا ہے، سڑک پر گزرنے والی ہر عورت کو دیکھ کر وہ یوں آہ بھرتا ہے جیسے یہ اس کا حق تھی جو اس سے چھین لیا گیا ہے کبھی کبھی وہ بڑے درد انگیز لہجے میں مجھ سے کہتا ہے "سلیم! زندگی یوں ہی گزر جائے گی! نہ کوئی آنچل، نہ کوئی رخسار، نہ کسی کی زلف گرہ گیر۔ بس زندگی ایک صحرا میں ملک رہی ہے جہاں میٹھے پانی کا کوئی چشمہ نہیں ہے، ہر طرف بادِ سموم کا زور ہے، تلخی ہے، کڑواہٹ ہے۔ وہ لطافت وہ نرمی اور ملائمت کہیں نہیں ہے جس کیلئے میں جنم جنم سے تڑپ رہا ہوں۔"

پھر وہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد میرے کان میں کہتا ہے "زندگی میں وہ میرا آخری موقع تھا جب میں کسی عورت کو اپنا سکتا تھا۔" وہ چلتے چلتے رک جاتا ہے اور بڑی حسرت سے کہتا ہے "پورے چار مہینے میں اس کے ساتھ ساتھ اسے کالج تک چھوڑنے جاتا رہا، وہ وقت مقررہ پر بس سٹینڈ پر آتی اور میں ہمیشہ وہاں وقت سے پہلے ہی موجود ہوتا، چار مہینے سردی گرمی آندھی بارش اور طوفان میں میں نے اس کا انتظار کیا اور وہ ہمیشہ آتی رہی اور میں اسے کالج تک چھوڑنے جاتا رہا۔ ایک دن اس نے تنگ آ کر برقعہ الٹ دیا اور مجھ سے وقت پوچھنے لگی، اس دن میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ مگر پھر بھی میں اندازے سے تو وقت بتا سکتا تھا۔ لیکن میرے منہ سے کوئی بات نہیں نکلی، اس دن وہاں کوئی دوسرا موجود نہیں تھا، اس نے خود ہی دوسری بات کی۔ کہنے لگی مجھے بس تو آج کہیں نظر ہی نہیں آتی اب کیا کروں؟ یہ سب سننے کے بعد بھی میں اس سے کوئی بات نہیں کر سکا۔ رات کو میں نے گھر جا کر سوچا مجھے تانگہ لے لینا چاہئے تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا وقت گزر گیا اور وہ پھر مجھے کبھی نظر نہیں آئی مہینوں میں نے اس کی جستجو کی اسے تلاش کیا مگر وہ ایک دم غائب ہو گئی، بس یہ میرا آخری موقع تھا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب

اسی طرح زندگی کٹے گی

میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہوں اور اسے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ لیکن اگلی رات کو وہ پھر مجھے کسی ہوٹل میں اکیلا بیٹھا ہے یا کسی گلی کی نکڑ پہ نظر آ جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ خیال آتا ہے کہ اسے کچھ کرنا چاہیئے وہ بہت بڑے بڑے کام کر سکتا ہے اسے بڑے کام کرنے چاہئیں لیکن اس کی زندگی کی بھاگ دوڑ کی تہائی کو دور کرنے والا کوئی نہیں ہے اسے کسی کی مدد کی کسی سہارے کی ضرورت ہے مگر اسے کوئی سہارا نہیں دیتا، میں اس کے غم میں شریک ہونا چاہتا ہوں مگر وہ اپنی ملکیت کا شریک غیر سے مانگ ہے وہ اس حصار میں کسی اور کو داخل کرنے پر راضی نہیں ہے

* * *

اشرف کی جب سے شادی ہوئی ہے وہ گم سم رہنے لگا ہے، میرا یہ دوست بڑا خوبصورت اور شوخ مزاج آدمی ہے، اس کے ساتھ میں نے زندگی کی کتنی ہی سہانی شامیں ادھر ادھر کی باتیں کر کے اور ہنستے کھیلتے گزار دی ہیں، اس کے ساتھ گزرا ہوا وقت میرے لئے کئی مصیبتوں سے اور کتنی ہی ذہنی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا تھا مگر اب دنوں اس کی عجیب حالت ہو گئی ہے، وہ چپ چاپ رہنے لگا ہے اور ہر وقت ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی لمبے سفر پہ روانہ ہونے کے لئے تیار بیٹھا ہے کبھی کبھی میں اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھٹک دینا چاہتا ہوں تاکہ اس کے سر سے یہ بوجھ گر جائے اور اس بوجھ کے نیچے سے وہ اپنی اصل صورت میں باہر نکل آئے، اس کی ہنسی اس کا کھلنڈرا پن لوٹ آئے اور وہ پھر پہلے کی طرح خوش رہنے لگے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اس کی سنجیدگی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، بوجھ جیسے بڑھتا جا رہا ہے، رات کے وقت کبھی کبھی وہ سر جھکائے اکیلا ٹہلتا ہوا نظر آتا ہے اور جب اسے اس کا کوئی دوست مل جاتا ہے تو وہ گھبرا کر اس طرح گھر کی طرف لپکتا ہے گویا ملنے والے نے اسے بھولا ہوا راستہ بتا دیا ہے۔

* * *

رفیق کو اپنے دفتر کے ہیڈ کلرک سے ازلی شکایت چلی آ رہی ہے وہ دنیا میں صرف ایک ہی آدمی کے خلاف باتیں کر سکتا ہے اور وہ اس کے دفتر کا ہیڈ کلرک ہے۔ بالعموم اس کے چہرے پر شگفتگی اور نرمی کے آثار رہتے ہیں، شام کو دفتر سے نکلنے کے بعد اس کی ساری کوشش دفتر کی یاد فراموش کرنے پر مرکوز رہتی ہے، وہ واحد آدمی ہے جسے میں اپنے دوستوں میں سے مثالی آدمی قرار دے سکتا ہوں اس میں خود فراموشی بلا کی ہے اور دوستوں کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے وہ ہنستا ہے جب اس کے پاس پیسے ختم ہو جاتے ہیں (اور یہ وقت عام طور پر مہینے کے پہلے ہفتے کے آخر تک آ ہی جاتا ہے) تب بھی وہ ہنستے ہوئے اس حقیقت کا اعلان کر دیتا ہے اور دوستوں میں پیسے ختم ہونے کی خبر کا اس طرح اعلان کرتا ہے گویا اسے کسی بڑی مصیبت سے نجات مل گئی ہے، اپنے دفتر سے فارغ ہو کر وہ سیدھا اسی ہوٹل میں آتا ہے جو میرا اور میرے دوستوں کا اڈہ ہے، وہ ہمیں اس طرح ملتا ہے گویا مدت کے بچھڑے ہوئے مل رہے ہوں۔ اس محفل میں اس کا چہکنا دیکھنے کے قابل ہوتا ہے، وہ خود فراموشی کی منزل تک پہنچنے کے لئے اپنے آپ کو بھولنے اور دوستوں کے کام آنے کے لئے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے لیکن ایسے موقعے پر اگر اس کے ہیڈ کلرک کا ذکر آ جائے تو اس کا نرم چہرہ پتھر کی طرح کرخت ہو جاتا ہے، وہ کلرکی سے اور کلرکوں سے شدید نفرت ہے اور گو برسوں کلرکی کرنے کے بعد اس نے اس زندگی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا۔ اپنے دفتر کے لوگوں اور اپنے دفتر کے ماحول سے وہ ابھی تک اپنے آپ کو علیحدہ اور الگ سمجھتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اطمینان بھی ابھی تک نصیب نہیں ہو سکا جو بہت سے کلرکوں کو حاصل ہے۔ [illegible] اس کی مالی حالت کچھ زیادہ ہی نازک ہو گئی ہے اور اسی وجہ سے اس کے دل میں اپنے دونوں بچوں کے مستقبل کے متعلق بڑے بڑے اندیشے پیدا ہونے لگے ہیں ان بچوں سے اسے انتہا محبت ہے اور جب سامنے نہیں ہوتے تو وہ ان کی زندگی ان کے مستقبل اور ان کی تربیت کے بڑے بڑے منصوبے [illegible] رہتا ہے، سوچتا ہے خود تکلیف اٹھا لے گا مگر جیسے ہی وہ اس کے سامنے آتے ہیں وہ انہیں ڈانٹ دیتا ہے اور اس طرح جھٹکتا ہے گویا ان کا وجود اس کے لئے ناقابل برداشت ہو

گیا ہو، یہاں بھی وہ بچپن سے اس کا آشنا سا شناسا کم ہی ہوتا ہے کیونکہ رفیق کا شمار بھی شہر کی ان مضطرب روحوں ہی میں ہوتا ہے۔ جو کسی گمنام منزل کی تلاش میں مارے مارے پھرتی ہیں۔ رات ڈھلنے کے بعد وہ گھر واپس جاتا ہے اور صبح اٹھتے ہی گھر سے باہر نکل آتا ہے، بچپن سے اس کی عادات کچھ ایسی ہی چلی آتی ہے۔ پھر بھی وہ ان کی غیر حاضری [illegible] محسوس کرتا ہے اور ان کے فکر میں ڈوبا رہتا ہے مگر اب اس کے سامنے آنے سے گھبراتے ہیں۔

مجھے رفیق کی بیوی بہت پسند ہے وہ طبعاً خاموش ہے، صورت شکل کے لحاظ سے بھی بری نہیں اور اس کا شمار ان عورتوں میں کیا جا سکتا ہے جو گھر بنانے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ رفیق کی شادی شدہ زندگی کے تمام دور میرے سامنے ہیں۔ شروع میں صبیحہ، اس کی بیوی نے گھر بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ ابتدا میں رفیق کی اصلاح کا خیال، اسے بہت تنگ کرتا تھا۔ اس کی خود فراموشی، کھوئے کھوئے سے رہنے اور رات کی غیر حاضری ہر چیز کو اس نے درست کرنے کی کوشش کی مگر آہستہ آہستہ اسے اپنی ناکامی کا احساس ہو گیا، وہ رفیق پر کوئی الزام نہیں لگا سکتی تھی پھر بھی وہ بڑی مدت تک اس کی عادتوں پر حیران رہی اس کا اضطراب، بے چینی اور پریشانی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا۔ کچھ دنوں اس نے مجھ سے بھی، امید لگائی کہ میں رفیق کو صحیح راستے پر لگانے کی کوشش کروں گا۔ مگر میں کافی کوشش کے باوجود یہ کام نہ کر سکا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں اسے اس کے کردار کی کس برائی سے آگاہ کروں، بلکہ مجھے تو اس کی زندگی اور اس کی عادتوں کے بگاڑ کا یقین سا ہو چلا تھا۔ اس یقین کا بھی کوئی واضح تصور میرے سامنے نہیں تھا لیکن یہ احساس بڑا غالب تھا کہ رفیق کو جو کچھ ہونا چاہئے وہ کچھ کر رہا ہے۔ رفیق اگر یہ نہیں تو اسے مطمئن کا یکجہ کی اس طویل قطار میں کھڑا کرنا پڑے گا جن کا وجود اور عدم وجود برابر ہے میں رفیق کو اس پستی تک لے جانے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔

اس کی زندگی کے اس تضاد سے نجات حاصل کرنے میں خود مجھے بہت دیر لگی۔ بالآخر کافی مدت کے بعد میں نے اس کے گھر جانے اور اس کی — بیوی سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس شام میں اسے اپنے ساتھ لے کر اس کے گھر گیا۔ اس سے ایک سال پہلے میں اس کے گھر گیا تھا۔ اب اس گھر کا نقشہ پہلے کے مقابلے میں بہت بگڑ چکا تھا۔ اگر میں شاعر ہوتا تو اس کا یہ گھر دیکھ کر "خانۂ آشوب" ضرور لکھتا۔ رفیق کا مکان دیکھ کر گھر کا تصور ہی پیدا نہ ہوتا تھا بلکہ یہ چند مسافروں کا عارضی اڈہ معلوم ہو رہا تھا۔ ہر چیز بے ترتیبی سے پڑی تھی۔ گندے برتنوں کے انبار جمع تھے، صحن میں کوڑے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اور چارپائیاں تک بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں، کہیں کوئی ہنڈیا اوندھی پڑی تھی تو کسی چارپائی پر بستر انتشار کے عالم میں نظر آ رہے تھے، کافی دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ صبیحہ اب اس منزل پر پہنچ چکی ہے جہاں کسی گلے شکوے کی ضرورت نہیں رہتی چنانچہ اس نے اب کی بار مجھ سے کوئی شکایت نہیں کی۔ حتیٰ کہ میرے اتنے دنوں تک گھر نہ آنے کا گلہ بھی نہیں کیا۔ میں چپ چاپ ایک کمرے میں بیٹھا ان دو انسانوں میں یگانگت اور مفاہمت پیدا کرانے کی ترکیبیں سوچتا رہا تاکہ یہ دونوں مل کر ایک دوسرے کا سہارا بن کر زندگی کا سفر طے کریں۔ مگر تھوڑی دیر بعد مجھے یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی سے نظر آنے لگے۔ یہ دونوں ایک چار دیواری میں رہتے ہیں لیکن ان کے درمیان کتنی نظر نہ آنے والی دیواریں ہیں ان میں مجھے اتنا تعلق بھی نظر نہ آیا جتنا دو راہ چلتے مسافروں کے درمیان ہوتا ہے۔ ہزار کوشش کے بعد بھی میرے ہاتھ میں مفاہمت اور یگانگت کا وہ سرا نہ آیا جس سے میں انہیں باندھ کر آگے چل سکتا تھا، بہت سوچنے اور بہت غور کرنے کے باوجود وہ ابتدائی قدم اور آغاز کی وہ منزل بھی مجھے نہ مل سکی جہاں سے ان دونوں کی نئی زندگی شروع ہو سکتی تھی۔ بالآخر مجھے ہار ماننا پڑی۔ یہ واقعہ کوئی ایک برس پہلے کا ہے مگر رفیق کی زندگی میں اس دوران میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی وہ اپنے گھر کا اور اپنی بیوی کے علاوہ ہر آدمی کا محبوب ہے، دوستوں کا دوست، یار باش، خود فراموش، بے غرض رفیق! رات کو وہ اب بھی اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوتا ہے۔

◆ ◆ ◆

شاعر مجھ سے ہر شام ایک ہی بات کہتا ہے "رک جاؤ یار ابھی کہاں جا رہے ہو؟" رات کے بارہ بجے ہوں، دو بجے ہوں یا سپیدہ سحر نمودار ہو رہا ہو شاعر چھٹکارا پانے والوں کا ماتم ضرور کرتا ہے۔ اس سے رخصت ہوتے وقت مجھے ہمیشہ محسوس ہوا ہے کہ کہیں گم ہو جانے کا کھٹکا ہو گا لیکن اس کے بعد وہ پھر کسی نہ کسی ہوٹل میں یا کسی گلی کی نکڑ پہ مل جاتا ہے اپنی تازہ نظم سناتا ہے جو نظم ابھی لکھی ہی نہیں گئی وہ بھی سناتا ہے۔

پھر چاندنی راتوں کی باتیں کرتا ہے جہاں کی خوشبو سونگھتا ہے اور فضا میں پرواز کرتا ہے وہ بروقت تڑپتا ہے، ہوا تیز چلے تو اس کی بیقراری بڑھ جاتی ہے۔ چاندنی کھلی ہوئی ہو تو بھی اس کی بیقراری میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ رات کے جادو کا دلدادہ ہے لیکن گھپ اندھیرا ہو تو وہ اندھیرے کی زبان و بے زبانی اور سرگوشیاں [illegible] کے باطن میں ملا ہوتا ہے اور ہر چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے؟ ان دنوں اسے بہت صدمہ پہنچا ہے، کچھ عرصے سے وہ ایک پہاڑی دوشیزہ کے عشق میں گرفتار تھا اس کے کھوئے ہوئے حسن، اس کی دراز زلفوں احساس کی نزاکت اور لطافت کے متعلق اس نے چند نظمیں لکھی تھیں "یار وہ کتنی سبک خرام ہے کتنی نازک اور لطیف ہے"۔ وہ دوستوں سے کہتا تھا میں نے اسے اپنے دل میں بسا لیا ہے۔"

شاعر اس معاملے میں سب دوستوں سے زیادہ خوش قسمت تھا، اس کی محبوبہ اسے چاہتی تھی وہ ہر شام اس سے ملتا اور نئی نظمیں نئے گیت گاتا لیکن گذشتہ ہفتے ایک شام اس کی محبوبہ نے شاعر کو حیرت کر کے رکھ دیا اس رات اس کے ماتھے پہ پسینے کے موٹے موٹے قطرے نمودار تھے سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ گھبرایا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"کچھ نہیں" اس نے کہا "دنیا قریب ہے ختم ہونے والی ہے اور کچھ نہیں تمہیں معلوم ہے آج کیا ہوا۔ آج وہ بتِ طناز وہ میری وہ محبوبہ دلنواز شام کی چائے پہ سیخ کباب کھا گئی وہ ابھی اور بھی مانگ رہی تھی لیکن میں اٹھ کر بھاگ آیا توبہ ہے"

میں نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کی وہ محبوبہ گوشت پوست کی زندہ مخلوق ہے وہ ابھی اور کباب کھائے گی۔ وہ پائے اور کلیجیاں بھی کھائے گی۔ لیکن شاعر کہتا ہے "کباب عشق کو، لطافت کو اور زندگی کی نرمی کو قتل کر دیتے ہیں اور سیخ کباب کھانے والی کوئی عورت میرے عشق کے قابل نہیں ہے۔"

ان دنوں وہ ہر وقت کچھ سوچتا رہتا ہے اور اپنے خیالوں میں گم رہتا ہے۔ گو اس کے چہرے پہ کرب اور پریشانی کے آثار کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو گئے ہیں میں وہ آثار اس چہرے پہ نہیں دیکھنا چاہتا ہوں شاعر کے سامنے پھول ہی پھول ہوں خوشبو ہی خوشبو ہو، نغمے اور روشنی ہو مگر اسے کچھ نہیں ملتا اور ملتا بھی ہے تو وہ منہ چھپا کر میدان سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

* * *

دراز قامت، گورا رنگ، آنکھیں بڑی بڑی، گھنگھریالے بالوں اور گہرے بھورے بال والی شیبا میری دوست ہے لیکن اس کا یہ تعارف ناکافی ہے اس کے سفید ملک میں پیچھے کی گلی کی چتیس کا ہالہ گا رہا ہے اور اس کے جسم کا بانکپن لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ پچھلے سال اس نے بی ٹی کا امتحان پاس کیا ہے۔ اسے میں کئی برس سے جانتا ہوں، جب تک اس نے انٹرمیڈیٹ نہیں کیا تھا وہ اس خیال کے سہارے جیتی تھی کہ انٹرمیڈیٹ کر کے وہ اپنے خاندان اور چند دوستوں کی نظر میں برتر حیثیت کی مالک ہو جائے گی۔ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد اسے یکایک یہ پتہ چلا کہ ابھی زندگی گزارنے کیلئے گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد کچھ دن تک وہ کھوئی کھوئی سی رہی اور آخر اس نے بی ٹی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بی ٹی پاس کرنے کے بعد اسے ایک سی ملازمت بھی مل گئی مگر دو ماہ بعد ہی اس ملازمت سے بھاگ کھڑی ہوئی "تمہارے بھی کوئی زندگی ہے، صبح و شام لڑکیوں کو پڑھانا۔ مغز مارنے اور پھر چار ٹکے [illegible] نہیں نہیں میں نے اس زندگی کے خواب تو نہیں دیکھے تھے"

"پھر کیا تم ہمالے سے لڑنا چاہتی ہو؟"

"پتہ نہیں"

"تمہیں ایک شوہر کی ضرورت ہے" میں نے اس سے کہا

"میں عمر بھر شادی نہیں کروں گی"

"کسی سے عشق کرو" وہ شرما گئی۔ گویا کہہ رہی ہو کس سے عشق کروں؟ شیلے اور کیٹس کی شاعری میں جن عاشقوں کا ذکر ملتا ہے وہ تو کہیں نظر نہیں آتے اب تک میرا کوئی پسندیدہ آدمی نہیں ملا نہ ہی وہ خود ابھی تک اپنی پسند کا فیصلہ کر سکی ہے، اس دوران ایک مدت سے زندگی کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ کچھ دنوں سے اس کے چہرے کی اداسی اور حزن بڑھ گیا ہے، وہ مایوس نظر آنے لگی ہے اور زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے خوابوں کی طرف لوٹ جانے کی کوشش میں ہے۔ اب وہ شاید اپنے فیصلے بدلنے کے متعلق بھی سوچتی ہے۔ مگر گذشتہ زندگی میں اس نے جہاں جہاں سر چھپانے کی کوشش کی وہاں سے اسے واپس جانا بھی منظور نہیں اور ابھی اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اور گھبرا کر کہتی ہے "یہ دنیا زندہ رہنے کی جگہ نہیں ہے" "بکواس بند کرو" میں کہتا ہوں "تم جوان ہو خوبصورت ہو لاکھوں میں ایک ہو کسی جوان رعنا سے دل لگاؤ اور بچے پیدا کرو" ۔۔۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رونے لگتی ہے "نہیں میں یہ نہیں کر سکتی" "پھر تم کیا کرنا چاہتی ہو؟" ۔۔۔ "مجھے نہیں معلوم"

◆ ◆ ◆

یہ سب لوگ اور کتنے ہی دوسرے ایسے لوگ میرے آس پاس رہتے ہیں۔ میرے ساتھ میرے گرد چلتے ہیں، میری زندگی میں ان کا بڑا دخل ہے۔ میں ان سے شدید نفرت کرتا ہوں ان سے بھاگنا چاہتا ہوں مگر پھر ان ہی کے درمیان جا کر پناہ لیتا ہوں جب بھی میں ان سے، ان گلیوں اور ان کے درمیان سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں تو یہ لوگ مجھے رات کی خاموشی میں شہر کے کسی نہ کسی موڑ پر کہیں نہ کہیں مل جاتے ہیں۔ اکثر شام اور آدھی رات کے درمیان ان سب سے میری مڈھ بھیڑ ہو جاتی ہے، سرِ شام عزیز کسی چوک میں سر جھکائے نظر آتا ہے۔ پھر نثار سگریٹ پھونکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کلب کے پاس سے گزرتا ہوں تو چوہدری فخرالدین کی فریاد کانوں تک پہنچ جاتی ہے اور آدھی رات کے وقت ظفر کہیں کسی دیوار پر بیٹھا ہوا نظر آ جاتا ہے، ہمایوں اور رفیق اور شاعر اور یہ سب لوگ جن سے مجھے نفرت ہے اور جن سے بھاگنے کی کوشش میں ہر شام کرتا ہوں ۔۔۔ کہیں نہ کہیں کسی کونے میں یا کسی گلی کی نکڑ پہ کسی رات، کسی شام وہ میرا پیچھا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان سے بچ کر بھاگنا چاہتا ہوں۔ مگر میرے پاؤں کی بیڑیاں مجھے پھر ان کے درمیان کھینچ لاتی ہیں میں ان کے چہرے نہیں دیکھ سکتا، ان کی آہوں اور ان کے دکھ درد کو بھولنا چاہتا ہوں۔ میں حسن کا متلاشی ہوں، نغموں کی جستجو میں لگا ہوا ہوں، پھولوں کا شیدا ہوں، زندگی، نشاط، مسرت اور خوشی کے پیچھے بھاگتا ہوں اور سرسراتے ہوئے ریشمی آنچلوں اور مہکتے ہوئے گلبدنوں کی تلاش میں ہوں لیکن اس جستجو میں ہر موڑ پر مجھے یہ مسافر لوگ نظر آتے ہیں جو بھرے گھروں میں تنہا رہتے ہیں جو اکیلے ہیں تنہا بھٹکتے ہوئے پریشان حال ہیں جو لاکھوں کے ہجوم میں بھی تن تنہا زندگی گزار دیتے ہیں۔ پوری زندگی سفر میں گزار دیتے ہیں، یہ جو مسرتوں کی تلاش میں، رفیقوں اور دوستوں کی تلاش میں کمر باندھ کر نکلتے ہیں۔ مگر آخر کسی ہوٹل میں، کسی بار میں، کسی چوراہے پر یا کسی چارپائی کی ایک دیوار پر بیٹھے کچھ سوچتے ہوئے نظر آتے ہیں، ان میں سے جن کے ہونٹ بھرے ہوئے ہیں وہ بھی بھوکے ہیں۔ جنم جنم کی پیاس نے ان کے ہونٹ خشک کر دیئے ہیں۔ مگر میں کدھر جاؤں؟ میری منزل کہاں ہے؟ میں جب ان آنکھوں کی جھلملاتی اس زلف کی گرہ سلجھانے اور اس جسم کی آنچ سے بچنے کے لئے اسے بھول جانے کے لئے اپنے آپ سے بھاگتا ہوں تو ان مسافروں کے درمیان آ نکلتا ہوں۔ یہ ہرگز میری منزل نہیں ہے، میری زندگی اور میری شاعری کا یہ منتہائے مقصود نہیں ہے۔ پھر میں یہاں ان قابلِ نفرت ان کمینے لوگوں کے درمیان کیوں آ جاتا ہوں کہیں میں بھی انہیں میں سے تو نہیں ہوں؟

عطا حسین

شعلوں کے سائے میں

دھان کھلیانوں سے کوٹھیوں میں پہنچ چکا تھا۔ سال کی تیسری فصل ربیع بوئی جا چکی تھی۔ مشرقی بنگال میں سال کا یہ حصہ بڑا خوشگوار ہوتا ہے۔ اس سمے دھوپ میں ایک مٹھاس سی آجاتی ہے۔ مسلسل بارش، آندھیوں اور بادلوں کے اندھیرے کے بعد اُجالا پھیل جاتا ہے۔ فضا میں ایک مدھم پر مدھم ٹھہراؤ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ آسمان کی نیلاہٹ نکھر جاتی ہے۔ کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ شگوفے مسکرانے کے لئے بیتاب ہو جاتے ہیں۔ قدرت اپنی پرانی کینچلی بدل کر رنگ و بو کا نیا لباس پہن لیتی ہے۔ سیتاکنڈ کے سلسلۂ ہائے کوہ پر ہریالی کی تازہ رو دائیں تا حدِ نظر پھیل جاتی ہیں۔ ہرنوں کے غول ہرے اور آملوں کی تلاش میں جنگل کی تاریکیوں سے باہر نکل آتے ہیں اور جنگلی مرغوں کی آوازیں دور دور تک وادیوں میں گونجنے لگتی ہیں۔ اور جب ہرنوں کی ڈار کسی پیڑ پر آن اُترتی ہے تو اُس پیڑ کی چھاؤں اور گھنی ہو جاتی ہے، خاموش پتوں میں سرسراہٹ پیدا ہونے لگتی ہے اور ٹہنیاں آہستہ آہستہ لرزنے لگتی ہیں۔ سال کا یہ نکھرا نکھرا، صاف و شفاف اور پُرکیف حصہ اپنی تمام رعنائیوں کا قافلے کر جب سیتاکنڈ کے پہاڑوں، میدانوں اور وادیوں میں آتا ہے تو وہاں کے باشندوں کے دلوں میں بھی سرسراہٹ ہونے لگتی ہے۔ امنگیں اور آرزوئیں کروٹ بدلنے لگتی ہیں۔ اس ماحول میں انسان کا کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے، گیت گانے کو، بانسری بجانے کو، تالاب کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں لگانے کو یا پھر مخملیں دوب پر لوٹنے کو۔

اس موسم میں لوگ سیر و تفریح کے لئے سیتاکنڈ آتے ہیں۔ آفتاب جب سیتاکنڈ پہنچا تو دیہات کی کھلی فضا میں پہلی سانس لیتے ہی اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس میں زندگی نئے سرے سے عود کر آئی ہو، جیسے وہ شہری زندگی کا شور و غوغا اور وہاں کی گنجان عمارتوں کی گھٹن بہت پیچھے چھوڑ آیا ہو۔ ڈاک بنگلہ کے برآمدہ میں آرام کرسی میں دھنسے ہوئے اُس نے مہاری پور کے بازار کی طرف جانے والے کچے راستہ پر سے نظریں ہٹا کر چندرناتھ کے مندر کی طرف دیکھا۔ تربوز، گنے، تمباکو، بینگن اور مرچوں کے کھیتوں کے اُس پار پہاڑوں پر سپید راستہ بلند ہوتے ہوتے ایک لکیر بن گیا تھا۔ وہ لکیر بل کھاتی ہوئی ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر چندرناتھ کے مندر تک چلی گئی تھی۔ ڈاک بنگلہ سے چندرناتھ کا مندر بہت چھوٹا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کسی سنگتراش نے پتھر کا ایک خوبصورت کھلونا تراش کر پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دیا ہو۔ مندر کے آس پاس درختوں کے جھنڈ ننھی ننھی جھاڑیوں کی طرح لگ رہے تھے۔ سپید لکیر ایک مقام پر دائیں جانب مڑ کر پہاڑوں میں گم ہو گئی تھی۔ آفتاب کو ٹھیک تین بجے اُس موڑ پر پہنچ جانا تھا۔ یونہی ٹہلتے ہوئے، ایک کاندھے سے کیمرہ اور دوربین اور دوسرے کاندھے سے تھرماس لٹکائے ہوئے، کچھ سوچتے ہوئے، اُسے سپید لکیر کے اُس موڑ سے ٹھیک تین بجے گزرنا تھا۔ اُس موڑ کی بلندی سے ہموار زمین کا وہ مدور قطعہ صاف نظر آتا تھا جسے سیاح دور دور سے دیکھنے آتے تھے۔ قدرت نے وہاں ایک چٹان کے سینے میں ایک چھوٹا سا غار بنا دیا تھا جس میں سے آگ کے دو شعلے نکلتے رہتے تھے۔ مدور قطعہ پر ہری ہری دوب اُگی ہوئی تھی اور اُس کے گرد اگرد چٹانوں کی دیواریں کھڑی تھیں۔ آفتاب نے اپنی رسٹ واچ پر ایک نظر ڈالی اور پھر کیمرہ، دوربین اور پانی سے بھری

ہوئی تھرماس کا ندھوں سے لٹکائے، چھڑی گھماتا ہوا کھیت کی منڈیر پر ہو لیا اور سپید راستے کی چڑھائی ختم کرتا ہوا ایک تین شاخہ موڑ سے آگے نکل گیا۔
اُس نے کھیتوں سے آگے ہری دُوب سے منڈھے قطعے کی طرف دیکھا۔ ایک خوب صورت نظارہ تھا۔ شبنم گلابی شبنمی ساڑھی کا آنچل سنبھالے کھڑی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ وہ ایک چٹان سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اُس کے سر کے سیاہ اور لانبے بال ہری ہری دُوب پر بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں آفتاب کا تعاقب کر رہی تھیں۔ شبنم کی بہن باتو دیسی لڑکی پتلی دبلی ہلکے زرد رنگ کی ساڑھی میں ملبوس کھڑی تھی۔ دونوں کا یہ منظر ایک تصویر کا فیصلہ دُور سے کیسے ہو سکتا تھا۔ شبنم کو تو آفتاب کی پلکوں کی نور بھری آنکھیں اُبھار کر دیکھ رہی تھیں۔ مگر باتو کا تو اُس نے صرف دو دن پہلے ڈھاکہ میں شبنم سے نام سنا تھا۔ اور اب اُس نے موڑ کی بلندی سے پہلی مرتبہ باتو کو دیکھا تھا۔ آفتاب جیسے جیسے چڑھائی چڑھتا گیا اُس کے قدم سست پڑتے گئے۔ پتوں کی سرسراہٹ اور پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ پائے قدموں کا گمان ہو رہا تھا۔ مگر اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ نظریں نیچی کئے، چھڑی گھماتا ہوا، کچھ سوچتا ہوا وہ آگے بڑھتا گیا۔

"اے راہی" عقب سے ایک آواز آئی۔

آفتاب نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ کسی گہرے سوچ میں ڈوبا ہوا چلتا گیا۔

"اے راہی" آواز بالکل قریب آگئی۔

آفتاب ٹھٹھک گیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ بنگال کی فضاؤں میں پلی ہوئی دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں پر لانبی لانبی اور گھنی گھنی پلکوں نے سائے کر رکھے تھے۔ سیتا کنڈ کا حدِ نظر تک پھیلا ہوا قدرت کا حُسن جیسے سمٹ کر ہلکے زرد رنگ کی ساڑھی میں ہانپ رہا تھا۔ اور ہوائیں جیسے گنگنا رہی تھیں "اے راہی، اے راہی" اور راہی جیسے اپنا راستہ بھول گیا ہو۔ وہ راستہ جو وہ شبنم کے ساتھ ڈھاکہ میں طے کر کے آیا تھا کہ وہ سیتا کنڈ کے ڈاک بنگلہ میں دس بارہ دن ٹھہرے گا۔ تیتیں نظمیں لکھے گا۔ شبنم اپنے ماموں کے ہاں رہے گی۔ باتو اُس کی بہن بیری بہن ہے۔ بالکل دیہاتن، پانچویں جماعت سے آگے نہیں پڑھ سکی۔ اس دن شبنم، باتو کو ساتھ لے کر چٹانوں سے گھرے ہوئے مخملیں دُوب کے قطعہ پر پہنچ جائے گی۔ پہاڑی راستہ طے کرنے کے بعد پیاس کی شدت بڑھ جائے گی۔ اتفاق سے تھرماس گر کر ٹوٹ جائے گی۔ کوئی راہی وہاں سے گزرے گا۔ اُس کے پاس پانی سے بھری ہوئی تھرماس ہوگی۔ شبنم پانی کے ایک گھونٹ کے لئے تڑپے گی۔ بالکل اوّل تو خود بڑھ کر راہی کو بلا لائے گی۔ نہیں تو شبنم ہی کہہ دے گی "وہ دیکھو راہی کے پاس تھرماس ہے۔ شاید اُس کے پاس پانی ہو۔ میری بہن باتو پانی پلا دو" اور پھر راہی اُن کا دوست بن جائے گا۔ بے وقوف باتو اس پلاٹ کو کیا سمجھے گی۔

باتو نظریں نیچی کئے کھڑی تھی۔ اُس کی ہلکے زرد رنگ کی ساڑھی کا بارڈر گہرا سُرخ اور کافی چوڑا تھا۔ اُس کے رخساروں میں گلاب کی سُرخی دوڑ رہی تھی۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ باوجود کوشش کے اُس کے منہ سے بات نکلنی دشوار ہو رہی تھی۔

"فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" آفتاب نے بالکل اُسی انداز میں کہا جس انداز میں وہ ایک دن پہلے کہا تھا جب وہ باہر نکل کر شبنم سے مخاطب ہوا تھا۔ مگر اُسے یوں لگا جیسے اُس کہنے میں اور اس کہنے میں فرق تھا۔ بہت بڑا فرق، جتنا فرق کہ پٹ سن کے کارخانے کے شور اور وائلن کے دلسوز نغمہ میں ہو سکتا ہے۔ ڈھاکہ میں جب پہلی بار وہ شبنم سے ہمکلام ہوا تھا اس وقت وہ تار کول کی سڑک پر کھڑا تھا اور سیمنٹ کی عمارتیں آس پاس چمک رہی تھیں۔ اب وہ پہاڑ کے سینے پر دوڑتے ہوئے سپید راستے پر کھڑا تھا اور وہ راستہ چند قدم کے بعد ایک موڑ پر گم ہو گیا تھا۔ تاحدِ نظر ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر آسمان کی نکھری ہوئی نیلاہٹ تھی اور اُس کے سامنے ہلکے زرد رنگ کی ساڑھی میں باتو ... شرم سے لجائی ہوئی

"مجھے بہت زوروں کی پیاس لگی ہے" بانو جس قدر تیز چل سکتی تھی، اتنا تیز چلی اور پھر ساڑھی کا پلو منہ میں لے کر چلتے چلتے اس نے اپنی انگشتِ شہادت تھرماس پر رکھ دی۔

"کہاں سے تمہاری دوری" آفتاب نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

بانو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ساڑھی کا پلو چباتے ہوئے نیچی نظروں سے آفتاب کے پاؤں کی طرف تکتے ہوئے اسی عالم میں وہ ایک قدم اور پیچھے ہٹ گئی، پھر ایک اور، ایک اور، یہاں تک کہ ایک پتھر سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچی۔ آفتاب کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

بانو پیٹ کر دوڑی اور راستے پر دوڑ پڑی اور پھر سپید راستے کے موڑ پر رک کر اس نے شبنم کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا، پھر ایک وحشی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی مخملیں دوب پر پہنچ کر بیٹھ گئی اور ہانپتی ہوئی ایڑی میں چبھا ہوا کانٹا نکالنے لگی۔

"بانو اتنی دیر لگا دی تم نے" شبنم نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں" بانو نے لاپرواہی سے جواب دیا اور پھر سینڈلیں پہن کر سر کے بال درست کرنے لگی۔

آفتاب سپید راستہ کے موڑ سے اتر کر مخملیں دوب کے قطعہ کی طرف بڑھتا نظر آ رہا تھا۔

"دیدی وہ دیکھو راہی آ رہا ہے" بانو نے شبنم کی کلائی پکڑ کر کہا۔

شبنم نے راہی کی طرف دیکھا۔

بانو سمٹ کر چٹان کے پاس بیٹھ گئی۔ آفتاب نے قریب پہنچ کر تھرماس کا ڈھکنا پانی سے بھرا اور شبنم سے مخاطب ہو کر بولا "آپ کو پیاس لگی ہے؟"

"جی ہاں، بہت بہت شکریہ، بانو پانی لے لو"

بانو نے بڑھ کر پانی سے بھرا ہوا تھرماس کا ڈھکنا تھام لیا۔

آفتاب نے فاختئی رنگ کی ہاتھ کی بنی ہوئی شرٹ پہن رکھی تھی جس کے اوپر کے دو بٹن کھلے تھے۔ اس کے سینے پر اُگے ہوئے ننھے ننھے بال نظر آ رہے تھے۔ بانو کا جی چاہا کہ وہ آفتاب کے سینے کے ایک بال کو چٹکی میں لے کر مسل ڈالے یا چپکے سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر آواز بدل کر پوچھے "بوجھو تو راہی میں کون ہوں؟"

شبنم سارا پانی غٹ غٹ پی گئی۔

"دیدی اور پانی؟" بانو نے پوچھا۔

"ابھی نہیں، تھوڑی دیر بعد" شبنم نے چٹان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر آفتاب سے مخاطب ہو کر بولی "آپ کو خواہ مخواہ پریشان کیا۔ آپ شاید چندر تال کا مندر دیکھنے جا رہے تھے؟"

"جی مندر تو دور سے بھی دکھائی دیتا ہے۔ میں تو مندر کے بتوں کو دیکھنے کے لئے نکلا تھا" آفتاب نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو تاریخ سے گہری دلچسپی ہے" شبنم نے ساڑھی کا پلو سر پہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"بہت معمولی، ہاں جیتی جاگتی زندگی سے گہری دلچسپی ضرور ہے" آفتاب نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

بانو چٹان سے ٹیک لگائے بڑی احتیاط سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے گھٹنوں کو بازوؤں کی لپیٹ میں لئے اجلی اجلی نظروں سے آس پاس تتلی کی طرف دیکھنے لگی۔ چٹانوں کے نچلے حصے میں کہیں کہیں کائی جمی ہوئی تھی۔ تتلی کبھی کائی کو چھو لیتی، کبھی اڑتی ہوئی اوپر چلی جاتی اور پھر اڑتی ہوئی نیچے آکر بانو کی ساڑھی پر دم لے کر پھر اڑ جاتی۔ تتلی کے پَر اودے رنگ کے تھے۔ اُن چمکیلے اور نرم و نازک پَروں پر قدرت نے سنہرے حاشیے اور نصف دائرے بنا دیئے تھے۔ بانو کو راہی کی موجودگی کا احساس تھا، نہ پلک جھپکتے میں تتلی کے پَر بانو کے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کی گرفت میں آجاتے۔ یوں پکڑنے سے اُن مخملیں پَروں کو ذرا سی آنچ بھی نہ آتی اور پھر وہ اُس تتلی سے کھیلتی ہنستی ہوئی دھوپ پر لوٹنے لگتی۔ یہی باتیں تو بانو کے ابا کو ناگوار گزرتی تھیں۔ بانو کا قد اس تیزی سے بڑھ گیا تھا کہ اُس کا باپ ابھی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ بانو سچ مچ جوان ہو گئی ہے کہ ابھی کمسن ہی ہے سو وہ اُسے تتلیوں سے کھیلنے سے روکے یا نہیں۔ اور اب بانو کی اُنگلیوں میں تتلی تڑپ رہی تھی۔ آفتاب بڑے اطمینان سے شبنم سے باتیں کر رہا تھا۔ بانو کو یوں لگا جیسے شبنم اور راہی کی اتفاقیہ ملاقات اُن دونوں کے لئے دلچسپ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ انگریزی کے بھاری بھرکم لفظوں میں گفتگو کر رہے تھے۔ تتلی پھر اُڑ کر بانو کی ساڑھی پر آبیٹھی۔ بانو لمحہ بھر کے لئے آس پاس سے بے نیاز ہو گئی۔ دفعتاً اُس نے اُودے اُودے، نرم و نازک، سنہرے حاشیوں اور نصف دائروں والے پَروں کو دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کی گرفت میں لے لیا اور پھر ایک معصوم بچے کی طرح فاتحانہ انداز میں پکار اٹھی "وہ مارا، اب کہاں جاؤ گی"۔ اور پھر شبنم کا قہقہہ سن کر جھینپ گئی۔ گو اُسی کو فوراً احساس ہوا کہ اس کا یہ فعل غیر مناسب تھا مگر اُس نے تتلی ہاتھ سے نہ چھوڑی۔ اُس کے رخساروں میں حیا کی شفق پھوٹ نکلی۔ لانبی لانبی اور گھنی گھنی پلکیں بڑی بڑی سیاہ آنکھوں پر جھک گئیں۔ اُسی حالت میں کیمرہ کی کلک کے ساتھ آفتاب نے بانو کا فوٹو لے لیا۔ پھر آفتاب کا بلند قہقہہ چٹانوں سے ٹکرا کر گونجنے لگا۔ بانو نے تتلی کو چھوڑ دیا۔ پھر ساڑھی کا پلّو سر پر ڈال کر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اور چٹان کے سینے سے لپکتے ہوئے دو شعلوں کی طرف تکنے لگی۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر اُس چھوٹے سے غار میں اپنا ہاتھ رکھ دے اور اُن اُنگلیوں کو جلا ڈالے جو ایک غیر مناسب فعل کی مرتکب ہوئی تھیں۔ کتنی سبکی ہوئی تھی اُس کی۔ راہی دل میں کیا سوچتا ہوگا؟ دیہاتن جو ٹھہری۔ یہ سوچتے ہوئے اُس نے دُزدیدہ نگاہوں سے پہلے شبنم کو اور پھر راہی کو دیکھا۔ دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ خدا جانے وہ انگریزی میں کیا باتیں کر رہے تھے۔ راہی تو ایک راہی تھا۔ خدا جانے کہاں سے آیا تھا۔ کہاں چلا جائے گا۔ اس حقیقت کے باوجود بانو کے دل میں خواہشوں کی ایک سنہری تتلی اڑنے لگی۔ اُس کا جی چاہا کہ راہی شبنم سے اور باتیں نہ کرے بلکہ چھڑی گھماتا ہوا سپید راستے کے موڑ سے آگے نکل جائے اور وہ ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے اور پھر اپنی روح کی گہرائیوں سے پکار کر کہے "اے راہی، اے راہی" اور راہی جب پلٹ کر دیکھے تو بانو ہونٹوں پر آئی ہوئی بات بھول جائے۔ بانو نے پھر آگ کے دو شعلوں کی طرف دیکھا۔ اب جیسے تین شعلے نکل رہے تھے۔ دو شعلے چٹان کے سینے سے اور تیسرا شعلہ اُس کے قلب کی گہرائیوں سے۔

دفعتاً چٹان کی دیوار کے عقب سے قہقہے کی آواز سنائی دی پھر قدموں کی چاپ قریب آنے لگی۔

"بڑی دلچسپ جگہ ہے" کسی مرد کی آواز آئی اور پھر شہری مردوں اور عورتوں کا ایک گروہ چٹانوں سے گھرے ہوئے قدرتی قلعہ میں داخل ہوا۔ اُن میں ایک ٹھگنی اور فربہ عورت تھی جس کے کانوں میں طلائی جھمکے لٹک رہے تھے۔ وہ بات بات پر قہقہہ لگا رہی تھی اور اُس کی توند پر چربی اچھل اچھل کر قہقہوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ ایک دُبلی پتلی عورت دھانی رنگ کا ریشمی غرارہ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے کانوں میں ہیرے کے ٹاپس چمک رہے تھے۔ وہ آگ کے شعلوں کے پاس بیٹھ گئی اور پھر جھانک جھانک کر غار کے اندر دیکھنے لگی۔ ایک نوجوان اپنی بھاری

سے ٹیک لگائے عقب میں بیٹھ گیا اور پنسل سے نوٹ بک میں کچھ لکھنے لگا۔ ایک چپٹی ناک اور موٹے موٹے ہونٹوں والی کالی کلوٹی عورت گھور گھور کر آفتاب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کوئی چوکریٹ کھا رہا تھا۔ کوئی تھرماس کے پاس بیٹھا گرما گرم کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ قہقہے بلند ہو رہے تھے غرضیکہ شہری گروہ کی آمد سے بلا کی چہل پہل ہو گئی تھی

"سبحان اللہ کیا شعر ہوا ہے" نوجوان نے بانو کی طرف دیکھتے ہوئے نوٹ بک پر آخری خط تحریر کھینچتے ہوئے کہا۔

"تابھیا، میں تو شعر اُس وقت سنتی ہوں جب مرغن کھانا کھا لیا ہو" ٹھگنی عورت نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"آج بچاری نحافوں سے ہے۔ صرف دو مرغ مسلّم ہڑپ کر کے کر کے آئی ہے" ایک فرنچ کٹ داڑھی والے صاحب نے فقرہ کسا۔ ٹھگنی عورت کی توند پر چربی اچھلنے لگی اور اُس کے قہقہوں کی گونج یوں سنائی دینے لگی جیسے بہت سے نوکیلے پتھر آپس میں ٹکرا رہے ہوں

"دیکھو خالہ اِس وقت میں SERIOUS ہوں۔ آدہے۔ آدرو نہیں۔ سنو تو حُسنِ تابناک کی تعریف کیسے اچھوتے انداز میں ہوئی ہے" نوجوان نے نہایت سنجیدگی سے کہا اور پھر اپنا دایاں ہاتھ دل پر رکھ کر نہایت کرخت آواز میں ترنم سے گنگنانے لگا۔ جواباً بہت سے قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے، زندگی سے بھرپور قہقہے، جیسے چندر ناتھ کے مندر کی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ جیسے کسی آبشار کا صاف و شفاف پانی چٹانوں سے ٹکرا کر موسیقی بکھیر رہا ہو۔ اُن گھنٹیوں کی آوازوں اور آبشار کی موسیقی میں آفتاب، بانو اور شبنم کے قہقہے بھی شامل تھے۔ قہقہوں کے اشتراک نے اجنبیت کے بُعد کو دُور کر دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ دورانِ گفتگو میں ٹھگنی عورت نے شبنم کی تعریف کرتے ہوئے آفتاب سے مخاطب ہو کر کہا "ماشاء اللہ آپ کی بیگم بڑی سوشل اور ذہین ہیں"۔

"جی نہیں، معاف کیجئے، یہ ....." آفتاب فقرہ مکمل کرنے نہ پایا تھا کہ ٹھگنی عورت نے بات کاٹ کر کہا "جی ہاں معاف کر دیا۔ میں تو اِس شاعر بھانجے کو دن میں بیسیوں دفعہ معاف کرتی ہوں مگر یہ بھی اس کی غزلوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے" ٹھگنی عورت نے یہ کہتے ہوئے گھونسا دور سے ہوا میں گھما کر آہستہ سے نوجوان شاعر کے شانے پر مارا اور پھر گلا صاف کر کے، آواز بدل کر، باریک اور زنخے ہوئے لہجے میں کہنے لگی "خالہ ایک شعر ہوا ہے۔ آدرو نہیں۔ آدہے آدہ" قہقہے پھر بلند ہونے لگے۔ چندر ناتھ کے مندر سے واپس آنے والے مفلوک مزدور شہریوں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ سورج ابھی غروب نہ ہُوا تھا مگر مدور قطعہ کی چٹانوں سے گھری ہوئی بستی پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ آگ کے شعلوں کی روشنی لحہ بہ لحہ نمایاں ہو رہی تھی۔ سبز رنگ کے ٹڈے اِدھر اُدھر پھدک رہے تھے۔

جھینگروں کی آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ چٹانوں کے قدرتی دروازوں سے ہوائیں سائیں سائیں کرتی اندر آ رہی تھیں۔ اور بانو بڑی بیتابی سے انتظار کر رہی تھی کہ راہی ابھی اپنا فقرہ مکمل کرے گا۔ ابھی وہ سارا قصہ سُنا دے گا کہ شبنم سے آج ہی تو اُس کی ملاقات ہوئی ہے اور وہ بھی بانو کی وجہ سے۔ بانو اگر اُسے بُلا کر نہ لاتی تو وہ شبنم سے کبھی گٹ پٹ گٹ پٹ نہ کر سکتا۔ پھر وہ سوچنے لگی کہ اُس نے راہی کو پکارا ہی کیوں؟ اور پھر وہ بانو کو چھوڑ کر چلا کیوں نہیں گیا؟ لیکن اگر وہ یونہی چلا جاتا تو اسے کتنا دُکھ ہوتا۔ مگر یہ بے وجہ دُکھ کیسا؟ لیکن راہی اپنا فقرہ مکمل کیوں نہیں کرتا۔ وہ چپ کیوں ہے؟

اور جب وہ قافلہ مدور قطعہ سے نکل کر موڑ کی بلندی پر پہنچا تو پہاڑ کے عقب میں ڈوبتے ہوئے سورج کی زعفرانی شعاعیں پھیل رہی تھیں۔ پہاڑ پر بل کھاتا ہُوا راستہ شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے اور گہری ہریالی کے پس منظر میں اُبھر آیا تھا۔ پتھر کا ترشا ہُوا مخروطی کلونا پہاڑ کی چوٹی پر

[illegible]

آہستہ آہستہ سمندر کے میں ڈوب رہا تھا۔

شہریوں کا قافلہ خدا حافظ کہہ کر اسٹیشن کی طرف نکل گیا۔

آفتاب، شبنم اور بانو ڈاک بنگلے کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

"آپ کی سنگت میں وقت خوب گزرا" آفتاب نے چھڑی کی نوک سے زمین کریدتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا "دیکھئے نا اگر آپ کی موٹر راستہ میں نہ ٹوٹ جاتی تو ہماری ملاقات کیسے ہوتی۔ دراصل زندگی نام ہے حادثوں کے مجموعے کا اور آج کا حادثہ بڑا دلچسپ رہا۔ مجھے امید ہے کہ آپ کل چند باتوں کا مندرجہ دیکھنے ضرور جائیں گی۔ میں تو قریباً تین بجے یہاں سے چل پڑوں گا۔ اچھا خدا حافظ"

آفتاب نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ شبنم نے اپنا دایاں ہاتھ آفتاب کے مضبوط ہاتھ میں رکھ دیا اور پھر مضبوط انگلیوں نے نرم و نازک انگلیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"اچھا بھئی تو خدا حافظ" آفتاب نے اسی طرح بانو کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بانو نے سمٹ کر ساڑھی کے پلو سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ شبنم ہنس پڑی اور پھر وہ بانو کے ساتھ مہاویرپور کے بازار کی سمت جانے والے کچے راستے پر ہولی۔ اسٹیشن سے ٹرین چھوٹ کر دیرسرائے کی طرف نکل گئی اور ریلوے لائن کے اس پار کھیتوں میں گیدڑوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ مہاویرپور کے بازار میں کچے راستے کے دونوں طرف دکانوں میں لالٹینوں کی روشنی پھیلی رہی تھی۔ چائے کی دکان میں گراموفون ریکارڈ بج رہا تھا تنبولن پان کی گلوریاں بنا رہی تھی اور آنکھیں مٹکا کر ایک منچلے نوجوان کو کوئی قصہ سنا رہی تھی۔ بازار کے موڑ پر بنیا چوکی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور اس کی استری کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ بچے کو بائیں کولہے پر لٹکائے، دائیں ہتھیلی پر دال بھات سے پروسا ہوا تھال رکھے کہہ رہی تھی "ناگو، کھا، بر آسنے بھی"۔

مہاویرپور کے بازار سے نکل کر شبنم اور بانو گرینڈ ٹرنک روڈ پر آگئیں۔ وہاں سے کچھ دور شبنم کے ماموں کا گھر تھا جس کے صدر دروازے کی جھریوں سے پیٹرومیکس لیمپ کی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ وہاں پہنچنے سے پہلے شبنم بانو کو بہت کچھ سمجھانا چاہتی تھی مگر پہلے ہی دل میں فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ راہی کے متعلق کسی کو کچھ نہ بتائے گی۔ جیسے آج کا حادثہ اس کا اپنا راز ہو۔ چلتے چلتے ایک بار تو اس کے دل میں آیا کہ شبنم سے کہہ دے "دیدی راہی کی بات کسی سے نہ کہنا" مگر اس کے دل کی بات شبنم نے کہہ دی۔

"دیکھو بانو" تابی کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہنا" شبنم نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"تابی" ؟ بانو نے حیرت سے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے راہی کے بارے میں" شبنم نے زبان کی بے احتیاطی میں پیوند لگایا۔

"شبنم پیار سے آفتاب کو تابی کہہ کر پکارا کرتی تھی۔

"دروازہ کھولو ری دیدی" ایک نوجوان سڑک کے کنارے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

"آ رہی ہوں بھیا" اندر سے ایک نسوانی آواز نے ترنم بکھیرا۔

ان مدھ آوازوں میں بنگال کی شعریت، بہن بھائی کی محبت کی عظمت اور وہاں کے ذرے ذرے سے [illegible]۔

"راہی کی بات کسی سے نہ کہنا۔ ارے پگلی کچھ سمجھ میں آیا" شبنم نے کہا۔

بانو نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر دونوں سہیلیاں بانہوں میں بانہیں ڈالے تیز تیز قدموں سے [illegible]

آفتاب نے [illegible] پر کچھ عرصہ ہی تھیسز مکمل کر لیا تھا۔ اُس کے تھیسز کا موضوع تھا شیلے کی شاعری، عظمت اور اُس کے پیغام کی گہری اہمیت۔ اسی سلسلے میں اُس نے افلاطون کی روحانی حیثیت اور گوڈون کے نظریۂ سیاسی دولت کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا کیونکہ ان دو عظیم ہستیوں کے نظریات شیلے کی شاعری اور تخلیقی حد تک اثر پذیر ہوا تھا۔ اُس نے شیلے کے جلیل القدر معصروں، ناقدوں اور ترجمانوں کی تصنیفات سے اہم نکات اخذ کیے تھے اور اب اس سارے مواد کو نہایت خوبصورت طریقے سے پیش کرتا تھا۔ سلجھے ہوئے، صاف ستھرے اور آسان الفاظ میں قلمبند کرتا تھا۔ اور یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اُسے INSPIRATION کی ضرورت تھی۔ آج کل اس کی INSPIRATION کا سرچشمہ شبنم تھی۔ پچھلے سال پروین تھی۔ اُس سے پہلے کلثوم تھی۔ INSPIRATION کی یہ کڑیاں بدلتی ہوئی بہت دور تک جا کر ماضی کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی تھیں۔ اور ان کڑیوں نے آفتاب کو کچھ اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ اس کی کالج کی تعلیم کھینچ کر طولِ شبِ ہجر بن گئی تھی۔ دراصل اُسے کالج کی زندگی بے حد پسند تھی۔ وہ اکثر اس خیال کا اظہار کیا کرتا تھا۔ شاید اسی لئے وہ اس زندگی سے باہر نکلنے سے گریزاں تھا۔ یوں تو وہ بہت ذہین تھا۔ پروفیسر اس کی قابلیت کے معترف تھے۔ اس کی طرزِ تحریر کے مداح تھے۔ بایں ہمہ اُس کی آوارگی اور لاپروائی سے نالاں تھے۔ کئی طالبِ علم جو کسی زمانے میں اُس سے جونیئر تھے اب اسی کالج میں پروفیسر تھے۔ آفتاب کے چہرے سے تدبر ٹپکتا تھا مگر اُس کی حرکات و سکنات، طرزِ گفتگو اور نشست و برخاست سے کم عمری کی شوخی، طفلانہ لاابالی پن اور نوخیزی کی لپک جھپک پھوٹ پھوٹ پڑتی تھی۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اس لاپروائی کی زندگی کو طول دے رہا تھا۔ اس کے تھیسز ہمیشہ ادھورے رہ جاتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جس سال اُس کا تھیسز مکمل ہو گیا اُسے کالج چھوڑنا پڑے گا اور پھر کشور گنج کے بھرے بازار میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر اُسے بھی کھاتوں کے گورکھ دھندے میں پڑنا ہو گا۔ اپنے باپ کے کروڑوں کے بیوپار میں ہاتھ بٹانا ہو گا۔ پٹ سن کی مختلف قسمیں جانچنا پرکھنا ہوں گی۔ وقت اور موسم کے تیور دیکھ دیکھ کر سنہرا ریشہ بونے اور کاٹنے والے کسان کی مجبوریوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھانا ہو گا۔ جب کسان کی [illegible] سے ہو گی تو اُسے کچھ روپیہ پیشگی دے کر اُس کی ہری بھری فصلیں کوڑیوں کے مول خریدنی ہوں گی۔ اور آفتاب کو ان باتوں سے نفرت تھی۔ باپ کی دولت کا واحد مالک تو تھا ہی، اسے یہ دولت آخر خرچ بھی کرنا تھی۔ اُس نے متوقع عمر کے لمحات پر باپ کی دولت کو پھیلا کر دیکھا تو سونے چاندی کے انبار باقی رہ جاتے تھے اور زندگی بیچ راستے میں دفعتاً ختم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اُس نے ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے کا ایک راستہ نکال لیا تھا اور اس راستے کو طول دینے کا وہ تہیہ کر چکا تھا۔ ذہن کی اس روش نے اُس کی عمر کی سنجیدگی کو اس کے قریب نہ آنے دیا تھا۔ [illegible] زندگی کی ہر بات، ہر واقعہ اور ہر رُخ کا نہایت ہلکے پھلکے انداز سے خیر مقدم کرتا۔ ہر دن بیت کر یک لخت ماضی بن جاتا۔ کوئی حسین چہرہ قریب آتا تو دنیا گلزار ہو جاتی اور جب وہ چہرہ پس دیوار چلا جاتا تو اُس کی دور خشندگی و تابناکی آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہو جاتی۔ جب پر جیس [illegible] تو شاید اسی طرح [illegible] جس طرح کلثوم کی سنگت میں۔ شبنم کی دوستی بھی کم دلچسپ نہ تھی۔ وہ بڑی دیانت داری اور خلوص سے ہر حسین چہرہ سے پیار کرتا اور [illegible] میں کھو جاتا۔ بال روم میں جس عورت کے ساتھ رقص کرتا، اپنے بدن کی ساری آگ کو اس کے رو ئیں رو ئیں میں جذب ہونے کے [illegible] جیسے ہر جذبہ ہر عمل اور ہر تاثر کی نوعیت وقتی اور ناپائیدار ہوتی۔ صرف ایک عورت کے عشق میں دیوانہ بن جانا اس کے نزدیک [illegible] تھا کہ انسان کو بھوک لگتی ہے تو کھانا کھا لیتا ہے، پیاس لگتی ہے تو پانی پی لیتا ہے، اسی طرح جب اس میں کسی ساتھی [illegible] بے قرار ہوتی ہے تو وہ زندگی کے لمحات چند قہقہوں، مسکراہٹوں اور گرم گرم سانسوں سے سجا لیتا ہے۔ جس طرح [illegible] تھا یا کبھی کنوئیں، مٹکے یا چشمے کا پانی پیا تھا اسی طرح یہ یاد رکھنا [illegible]

[illegible]

کاش اُس کے ساتھ رقص کیا تھا اُس کے نرم و گداز بدن کو چھوا تھا ۔ مگر چٹانوں سے گھرے ہوئے مندر کے احاطے سے واپس آکر اُسے اپنے جذبات میں جھٹکے محسوس ہونے لگے ۔ تمام رات ہوائیں اسے راہیں دے رہی تھیں اور راہیں اسے نغمے گاتی رہیں ۔ وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پرانی لالٹین اور تنگ گلی کے سائے شب بھر اُبھرتے رہے ۔ اُس نے سوچا کتنی عظیم INSPIRATION اُبھر آئی ہے ۔ اُس نے دوایک بار ہی بیٹے کی کوشش کی مگر جب لالٹین لانی ہی سپید اور نرم و نازک انگلیوں میں آ جاتی اور نیلے اور پیلے روشن پتھر بجھانے لگتی اور دو پتلے پتلے ہونٹوں سے آواز آتی "مارا اب کہاں جاؤ گی" اور پھر سپید رخساروں پر حیا کی سرخی پھیل جاتی ۔ آفتاب کے بدن میں چنگاریاں سی دوڑنے لگیں اور وہ سوچنے لگا کیا انہیں چنگاریوں نے شیلے کو عظمت کی حدوں تک پہنچایا تھا ۔ یہی چنگاریاں سلگ سلگ کر آگ بن جاتی ہوں گی اور پھر اُس آگ میں پرانی عادت جل جاتی ہو گی اور پھر تباہ شدہ عمارت کی راکھ سے ایک نیا محل ابھرتا ہوگا ۔ شاید اسی طرح شیلے میں ایک عام انسان مر کر جب ایک عظیم انسان نے انگڑائی لی ہو گی تو موسیقی کے چشمے پھوٹ پڑے ہوں گے ۔ خزاں رسیدہ پیڑوں میں نئی کونپلیں پھوٹ نکلی ہوں گی اور پرندے زندگی کا ابدی راگ الاپتے ہوئے آسمان کی بلندیوں کی طرف اٹھ گئے ہوں گے ۔ یہ سوچتے سوچتے آفتاب خود بخود ہنس پڑا اور اُسے احساس ہوا کہ وہ جذبات کی رَو میں بہتا بہتا زندگی کے قائم کردہ اصولوں سے باہر نکل گیا ہے ۔

اُس نے سوچا زندگی میں کئی حادثے ہوتے ہیں ۔ آج کا حادثہ خاصا دلچسپ تھا ۔ بانو کو آج دیکھا ہے کل پھر دیکھیں گے ، پرسوں پھر دیکھیں گے جب تک یہاں رہیں گے روزانہ دیکھ لیا کریں گے ۔ کوئی سبیل نکل آئی تو فاصلہ کم ہو جائے گا اور پھر وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں قریب آجائیں گی ۔ مگر بانو اور شبنم میں کتنا فرق ہے ۔ شبنم پڑھی لکھی ہے ، الٹرا ماڈرن ہے ۔ والٹز ، رمبا ، سلو فاکس ٹراٹ اور کوکی ٹیسٹ میں ماہر ہے ۔ لیکن بانو میں ایک بات ہے جو محسوس کی جاسکتی ہے بیان نہیں کی جاسکتی ۔ شاید اُسے شیلے کی باغیانہ فرزانگی بھی نہ بیان کر سکتی ۔ شاید اسے کوئی شاعر قلمبند نہ کر سکے ۔ آفتاب میں ایک عظیم اعتماد نے انگڑائی لی ۔ وہ آج تھیسز کے اہم مراحل طے کر لے گا ۔ جیسے اُسے شیلے میں سلگتی ہوئی آگ کا راز مل گیا ہو ۔ وہ لکھنے بیٹھ گیا ۔ خوبصورت الفاظ ، نپے تلے ، آسان مگر وسیع و بسیط ، چُول پر چُول بیٹھنے لگی ۔ چنگاریوں نے دوڑ دوڑ کر سمندروں کو چھوٹے چھوٹے خوبصورت فقروں میں مقید کر دیا ۔ اگر تھیسز مکمل ہو گیا تو اُسے کالج چھوڑنا پڑے گا ۔ پھر اُسے کشور گنج کے ہر بازار میں گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر ہی کھاتوں کی چھان بین کرنا ہو گی ۔ مگر یہ آگ کیسے بجھ سکتی ہے ۔ اگر اُس نے ہاتھ روک دیا تو جیسے اس کا بدن جل کر خاک ہو جائے گا ۔ خیالات ، احساسات ، سلگتی ہوئی آگ ، وہ شیلے کے دل کی گہرائیوں میں کوندے بھرنے لگا اور جب مرغ سحر نے بانگ دی تو وہ اپنا سر مسودے پر رکھے سو رہا تھا ۔ اُس کے سر کے بالوں سے نسیم صبح کھیل رہی تھی اور اُس کے ریشمی کاغذ کا کا لرپھڑ پھڑا کر اُس کے بائیں کان کی لو کو چھو رہا تھا ۔

اُس کی دونوں مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں ۔ جیسے کسی عظیم خزانے سے انمول موتی اُس کے ہاتھوں میں آ گئے ہوں اور اس نے مٹھیاں بھینچ لی ہوں تاکہ وہ آئی ہوئی دولت نکل نہ جائے ۔

"آپ کے ہاتھ کی یہ لکیر بتاتی ہے کہ آپ کا دل بہت صاف ہے ۔ دولت کو تو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں ۔ ہر ایک سے بنا کر رکھتے ہیں لیکن آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ حسن کمالات میں گھلے رہتے ہیں ۔" آفتاب نے شبنم کے ہاتھ کی لکیروں کو غور سے پڑھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا ۔

آفتاب [illegible] [illegible] کے مندر کے سامنے گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے ۔ ذرا سا اندھیرا ہو گیا کہ جلدی چلیے ، سرمئی چٹانوں کا سایہ

اطلسی مندر کے ایک کونے میں گیان دھیان میں گم تھا۔ آج شبنم نارنجی رنگ کی ساڑھی زیب تن کئے ہوئے تھی۔ اُس کے کانوں میں طلائی آویزے لٹک رہے تھے جو ہلکی ہوا سے خم کھاتے ہوئے ہونٹوں کی طرف نکل گئے تھے۔ گلے میں چمکتے ہوئے موتیوں کا نکلس تھا۔ دائیں ہاتھ کی چھنگلیا میں سونے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ آج اُس کا پہناوا کل سے جُدا گانہ تھا۔ یہاں تک کہ ہونٹوں پر لگی ہوئی لپ اسٹک کا رنگ بھی ملا ہوا تھا۔ اوپر کے ہونٹ کے درمیان میں مصنوعی طور پر اُبھار کر ایک متوازن خم دے دیا گیا تھا۔ مصنوعی ابروؤں کی کمانیں ذرا وسیع کر دی گئی تھیں جن کی وجہ سے آنکھیں معمول سے زیادہ بڑی لگ رہی تھیں۔ بانو اُسی گہرے سُرخ اور چوڑے بارڈر والی ہلکے زرد رنگ کی ساڑھی میں کسی شاہانہ بیٹھی تھی۔ ساڑھی کی سلوٹوں میں لگ رہا تھا کہ وہی ساڑھی پہن کر وہ رات کو سوئی بھی ہوگی۔ نہ اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سُرخی تھی نہ رخساروں پر روج اور پاؤڈر کی آمیزش اس کے باوجود وہ یوں لگ رہی تھی جیسے اوس سے دُھل کر کوئی کلی نکھر گئی ہو اور سورج کی پہلی کرن نے اُسے جگمگا دیا ہو۔

"اور آپ کا بیاہ کسی اونچے گھرانے میں ہوگا" آفتاب نے شبنم کی آنے والی زندگی پر روشنی ڈالی۔

شبنم آفتاب کے اتنے قریب بیٹھی ہوئی تھی کہ اُس کے گھٹنے آفتاب کے گھٹنوں کو چھو رہے تھے۔ شبنم کا دایاں ہاتھ آفتاب کے بائیں ہاتھ میں تھا اور آفتاب کے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت شبنم کے ہاتھ کی لکیروں پر گھوم رہی تھی اور انگلی کی حرکت کے ساتھ ساتھ اُس کی پتلیاں لکیروں کی گہرائیوں میں غوطے لگا لگا کر آنے والے لمحات کو باہر نکال رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں ایک شوخ مسکراہٹ آفتاب کے ہونٹوں پر پھیل جاتی۔ اس وقت اُس کے گالوں میں دو گڑھے نظر آنے لگتے۔ بانو شبنم کے پہلو میں کچھ اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ آفتاب کبھی اُس کے چہرے کا نصف پورا حصہ دیکھ سکتا تھا۔ مگر بانو شبنم کی اوٹ سے جب چاہتی راہی کو دیکھ لیتی اور کم از کم اسے محسوس ہوتا کہ راہی نے اُسے یوں دیکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بیچ بیچ میں جب راہی کے گالوں میں دو گڑھے نمودار ہو جاتے تو اُس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے ہاتھوں کی دو انگلیاں اُن گڑھوں میں رکھ دے یا راہی کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہہ دے "راہی پوچھو تو میرے من کی بات"

"تمہارا خاوند بہت امیر ہوگا" یہ کہتے ہوئے آفتاب نے شبنم کے ہاتھ پر اپنی انگلی اس طرح نچائی جیسے وہ گدگدی کر رہا ہو۔

شبنم کھلکھلانے لگی۔

"لیکن بدقسمتی سے تمہارا خاوند کانا ہوگا" یہ کہتے ہوئے آفتاب نے دائیں آنکھ میچ لی۔

شبنم کا کھلکھلانا ہنسی میں تبدیل ہو گیا اور پھر ہنسی بلند قہقہوں میں بدل گئی۔ آفتاب بھی قہقہے مارنے لگا۔ بانو بھی ساڑھی کا پلو منہ میں ٹھونس کر ہنسی کو دبانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ جنگلی کبوتر اڑ کر مندر کے کلس پر جا بیٹھے۔ بوڑھے جوگی نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں کھول کر پھر نیا آسن جما لیا۔

"لاؤ بانو اب تمہارا ہاتھ دیکھوں" آفتاب نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا

بانو کی مسکراہٹ چہرے سے ہٹ گئی اور پھر اپنے دونوں ہاتھ ساڑھی میں لپیٹ کر شبنم کی پیٹھ کے پیچھے چھپ گئی۔ شبنم ہنستے ہنستے گھاس پر لیٹ گئی۔ پھر قہقہے لگاتے ہوئے اُس نے اپنا سر بانو کی گود میں رکھ دیا، بانہیں پھیلا کر بانو کے گلے میں حائل کر دیں اور بائیں کندھے کو اوپر اُٹھا کر ایک بھرپور انگڑائی لی۔ بانو کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، دو گرم گرم نقطے اُس کے چہرے پر دوڑنے لگے۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے راہی گھور گھور کر اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جب شبنم اُٹھ کر بیٹھ رہی تھی تو بانو نے آنکھوں کے کونوں سے راہی کی طرف دیکھ لیا۔ اُس کے دل کو ایک کچوکا لگا۔ راہی تو شبنم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ راہی کیوں اس طرح دیدی کی طرف دیکھتا ہے؟ کیوں اس طرح اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی اور پھر سوچتے سوچتے قریب ہی بیٹھ کر کتنی ہوئی گھری کی طرف دیکھنے لگی۔ اور نیلے آکاش میں سپید اور سُرمئی بادل دوڑ رہے تھے۔

بجاری تُلسی کے پودے پر پانی چڑھا رہا تھا۔

"میرا ہاتھ دیکھو نا راہی" جیسے بانو کی خاموش آواز مندر میں گونج رہی تھی۔

بانو نے سہم کر اپنے ہاتھ پھر ساڑھی میں لپیٹ لیے۔

"میرا ہاتھ دیکھو نا راہی" بانو کے دل کے مندر میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ بلند اور بلند۔ گھنٹیوں کا شور پہاڑ کی چوٹی سے اُٹھ کر گونج رہا اور وادیوں میں گونجنے لگا۔ بانو گھبرا گئی۔ کہیں راہی اس کے دل کی آواز سُن لے تو! مگر آفتاب اور شبنم اب انگریزی میں گٹ پٹ گٹ پٹ کر رہے تھے۔ بانو اُٹھ کر ایک درخت کے پیچھے چلی گئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے اُٹھی تھی۔ اگر راہی پوچھ بیٹھے کہ کہاں جا رہی ہو تو وہ کیا جواب دے گی۔ مگر راہی نے کچھ بھی نہ پوچھا۔ شبنم نے بھی لب نہ کھولے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہوئی مندر کی مغربی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے بلندی سے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ تاحدِ نظر سبزہ ہی سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ درخت، پودے، جھاڑیاں اور گھاس ہریالی کا ایک وسیع و بسیط دریا بناتے ہوئے نیلے آکاش سے مل گئے تھے۔ ہوا کے جھونکوں میں اُس کی ساڑھی اُڑی جا رہی تھی۔ بالوں کی لٹیں ماتھے پر بکھر رہی تھیں۔ اُس کے دل کے مندر میں گھنٹیوں کا شور آہستہ آہستہ دھیما پڑ گیا۔ وہ گھٹن جو چند لمحے پہلے محسوس ہو رہی تھی کم ہو گئی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی مندر کی دیوار کے پیچھے سے لوٹ آئی۔ اُس نے درخت کی اوٹ سے راہی کی طرف دیکھا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ شبنم راہی کے ہاتھوں کو چوم رہی تھی۔ بانو درخت کے تنے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی اور پھر نیلے آسمان کی طرف تکنے لگی۔ پھر اس کا دھیان اُس سپید راستے کی طرف چلا گیا جہاں سے پلٹ کر راہی نے پہلی بار اُس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ غور سے اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرف تکنے لگی اور پھر اُسے محسوس ہوا کہ یہاں سے گھر کا راستہ کتنا لمبا اور دشوار ہو گیا ہے۔ آتے وقت یہ فاصلہ کتنا تھوڑا تھا۔ نیچے، سپید راستے کے پاس بجاری لکڑیاں چُن رہا تھا۔ دور کچھ لوگ مندر کی جانب آتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ دو گلہریاں آپس میں گتھم گتھا ہو کر گھاس پر گر پڑیں اور پھر پر پھیلا پھیلا کر پیلی پیلی چونچوں سے ایک دوسرے پر جھپٹنے لگیں۔ ایک طیارہ گونجتا ہوا کلکتہ کی طرف نکل گیا۔

بانو کے ہاتھ کی لکیروں میں چنگاریاں دوڑنے لگیں۔

"اب میں تمہیں ہاتھ نہ دکھاؤں گی راہی" گھنٹیاں بولنے لگیں۔

"میں اپنے گھر جا کر گائے کو چارہ ڈالوں گی۔ دودھ دوہوں گی۔ دہی بلوؤں گی۔ تالاب میں ڈبکیاں لگاؤں گی۔ تیتریوں سے کھیلوں گی۔ پھر رات کو ایک طویل کہانی سنائیں گے اور میں سُنتے سُنتے سو جاؤں گی" یہ سوچتے سوچتے بانو کو یوں لگا جیسے وہ شبنم کے ساتھ [illegible] رہی ہے۔

"دیکھو دیدی میرا قد تم سے لانبا ہے۔ میرا جوڑا تمہارے جوڑے سے کہیں زیادہ بھاری ہے۔ اور دیکھو میں تالاب میں [illegible] تیر سکتی ہوں اور تم پانی کے نام سے ڈرتی ہو"

بانو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُس میں اُس معصوم بچے کے احساسات جاگ اُٹھے جس کا کھلونا اُس سے [illegible] اُس کے سامنے کھیل رہا ہو اور وہ پٹ جانے کے ڈر سے لبوں کو جنبش نہ دے سکے۔ لمحات اتنے طویل ہو گئے کہ بانو کو یوں [illegible] پہ چلتے ہوئے لوگ برسوں سے مندر کی جانب آ رہے تھے۔ جیسے اُن کے قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے پڑ رہے تھے۔

"اے بانو۔ اے بانو" شبنم نے پکارا۔

بانو اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک قدم اُٹھایا۔ پھر رک گئی۔ جیسے پاؤں میں سیسہ بھر گیا ہو۔ جیسے [illegible]

محبوب ذلتوں پر۔

"[illegible] پھر آواز آئی۔

[illegible] جھکائے، بیش مشتاق، جوں توں کر کے سامنے آگئی۔ جیسے اُس کی نگاہیں کہہ رہی ہوں" میں مجرم ہوں۔ میں عورت ہوں۔ پیار [illegible] سے [illegible] ہے۔ میرا مجھ تم سے بھاری ہے۔ میں تالاب میں ڈبکیاں لگا سکتی ہوں۔ میں تو گیت بھی گاتی ہوں۔ میرے پاس بھی اچھی سالیاں ہیں۔ گھنگھروں کی آوازیں پھر بلند ہونے لگیں۔ شبنم ہنستی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی اور پھر بانو کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر منڈیرے باہر نکل گئی۔ آفتاب اُن [illegible] ہو رہا۔ بیچاری کلیاں کا گھٹا لئے مندر کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ ہرنوں کی ڈار ایک پیڑ سے اُڑ کر دوسرے پیڑ پر جا بیٹھی۔ دوسرے پیڑ کی چھاؤں اور گھنی ہو گئی۔ ٹہنیاں آہستہ آہستہ لرزنے لگیں۔ سیتا کنڈ کے باسیوں کی اُمنگوں اور آرزوؤں کی طرح۔

دوسرے دن جب شبنم بستر پر اوندھی لیٹی، سامنے کھلی ہوئی کتاب پر نظریں جمائے، آنے والی شام کے سنہرے خواب دیکھ رہی تھی تو دفعتہً حادثے کی مخصوص آوازیں سنائی دیں۔ اُس نے اُٹھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ ہاتھی پچھلی بائیں ٹانگ کی سیڑھی بنا کر بیٹھ چکا تھا اور اُس سیڑھی سے شبنم کی خلیری بہن شکیلہ اتر رہی تھی۔ شکیلہ کی چھوٹی بہن عقیلہ اور اُن کی ماں ہودے میں سینڈل پہن رہی تھیں۔ بانو اور اُس کی ماں نے باہر نکل کر مہمانوں کا استقبال کیا۔ شبنم نے دروازے کی چوکھٹ پر خالہ کے پاؤں چھوئے۔ شکیلہ سے بغل گیر ہوئی اور عقیلہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اُس کا منہ چوم لیا۔ شبنم کی خالہ فاضل پور سے آئی تھی۔ اُس علاقہ کے تربوز مشہور تھے۔ اس لئے وہ شبنم کے لئے دو بڑے بڑے تربوز لے آئی تھی۔ صبح سے بانو کی طبیعت ناساز تھی۔ مہمانوں کی آمد سے اُس کی جان میں جان آگئی۔ چہرے سے بشاشت ٹپکنے لگی۔ شکیلہ اور عقیلہ شبنم کے گھٹنوں سے الگ کر بیٹھ گئیں۔ شبنم کی خالہ نے فاضل پور کے تربوزوں کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے ایک تربوز کاٹا اور ایک قاش شبنم کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولی "اپنے کھیت کا ہے، بالکل تازہ، ذرا کھا کر تو دیکھو!"

شبنم نے مسکرا کر سُرخ سُرخ گودے اور کالے کالے بیجوں کی طرف دیکھا اور پھر شرارت آمیز انداز میں منہ پھلا کر گودے کا بھرپور ٹکڑا منہ میں لے کر آنکھوں کے ڈھیلے گھما کر، گال پھلاتے "بڑا میٹھا ہے"۔ اس نے ناک سے آواز نکالی

شکیلہ اور [illegible] اُس سے لپٹ گئیں۔ بانو نے قہقہے لگاتے ہوئے جھک کر اپنے دونوں ہاتھ شبنم کے کندھوں پر رکھ دیئے، جیسے کہہ رہی ہو "بیٹی آج [illegible] تربوز کھاتی رہو۔ آج تم ماہی کے ہاتھوں کو نہ چوم سکو گی"

اور اُس [illegible] ہاتھوں کو نہ چوم سکی۔ خالہ ایک قصہ ختم ہونے پر دوسرا چھیڑ دیتی۔ گفتگو شبنم کے بچپن سے شروع ہو کر اُس کے شناختی نکیتن جانے [illegible] شکیلہ کے سے [illegible] کر چلی گئی اور پھر گٹ پٹ گٹ پٹ سیکھ کر بالکل بدل آئی۔ خالہ بہت باتونی تھی۔ مگر اُس کے طرزِ بیان میں [illegible] کہ سامعین بُت بنے بیٹھے رہتے۔ جب اُس نے شبنم کے بچپن کا ذکر کیا تو موزوں الفاظ میں معصومیت کا نقشہ کھینچ دیا۔ [illegible] سیکھ کر بناوٹی آوازوں سے انگریزی کی گٹ پٹ کی نقالی کی تو شبنم، بانو، شکیلہ اور عقیلہ مارے ہنسی کے [illegible] زمین پر لیٹ گئی۔ اُس کا بازو تربوز کے چھلکوں اور بیجوں پر جا پڑا اور چند کالے کالے بیج اُس کی گوری گوری کلائی [illegible] لگا جیسے کسی ماہر سنگتراش نے مرمریں مجسمہ کے سپید بازو پر سنگِ اسود کی پچی کاری کر دی ہو۔ شبنم کی معانی منہ میں [illegible] چلی گئی۔ باہر سے بیل گاڑی کے پہیوں کی آوازیں بلند ہو کر دالان کے بے ہنگم شور میں گم ہو گئیں۔ چودہ [illegible]

اُس میں گانے باندھ کر بیٹھ گیا۔ بچھڑا اچھل اچھل کر رسی تڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ چوہندوں کے آتے آتے گٹک گٹک کرتی ہوئی مرغی ایک بلی جو رنگی سے بھرے والی کوٹھڑی میں چلی گئی۔ سورج چندرناتھ کے مندر کے پیچھے چھپ گیا اور اطراف شعاعوں کے پس منظر میں تھپے ہوئے ... کا سایہ ساعت بہ ساعت تاریک ہونے لگا۔ خالہ اور جمانی چاول اور مچھلی دھونے تالاب پر چلی گئیں۔ شبنم بانو، شکیلہ اور عقیلہ چلی ... کے باہر نکل گئیں اور کھیت کی منڈیر پر چلتے چلتے ڈاک بنگلے کے پچھواڑے جا نکلیں اور پھر ناریل کے بلند و بالا درختوں کے نیچے بیٹھ کر ... کی باتیں کرنے لگیں۔

آفتاب لیمپ کی روشنی میں ٹیبل پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اُس کے کوٹ کے کالر پر ایک زرد رنگ کا پھول لگا رہا تھا وہ ایک بار اُس نے اپنی دستاویز پر نگاہ ڈال کر، ماؤں پور کے بازار کی طرف جاتے ہوئے پکے راستہ کی طرف دیکھا اور پھر کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"کوئی شہری معلوم ہوتا ہے!" شکیلہ نے سرگوشی کی۔

"ضرور گٹ پٹ کرتا ہوگا!" عقیلہ نے اظہار خیال کیا۔

ریل گاڑی دوڑتی ہوئی کومیرا کی طرف نکل گئی۔ اور ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے راستہ پر کسی مسافر نے گیت گانا شروع کر دیا۔ نہایت معصوم، سیدھا سادا، گھر کو لوٹتے ہوئے ماہی گیر کا گیت جس کی محبوبہ کسی پھونس کی جھونپڑی میں اُس کے قدموں کی آہٹ سننے کے لیے بے قرار بیٹھی تھی۔

"دیدی کالج میں تمہارے ساتھ لڑکے بھی پڑھتے ہیں؟" عقیلہ نے شبنم سے پوچھا۔

"ہاں"

"تم اُن سے باتیں کرتی ہو؟"

"ہاں"

"اُن سے باتیں کرتے ہوئے تمہیں ڈر نہیں لگتا؟"

"نہیں" شبنم نے ہنسی روک کر کہا۔

اور بانو کا جی چاہا کہ وہ باڑ پھلانگ کر راہی کے کمرہ میں چلی جائے اور اُس سے کہے "میرا ہاتھ دیکھو نا راہی، مجھے تم سے ڈر نہیں لگتا۔ تم نے سیدھا راستہ پر پلٹ کر میری طرف دیکھا تھا نا پر تم نے دیدی کو اپنا ہاتھ کیوں چومنے دیا۔ دیکھو میرا قد دیدی سے لانبا ہے۔ میرا جوڑا اس سے کہیں زیادہ بھاری ہے۔"

اُس رات شبنم آفتاب کو دور سے دیکھ سکی۔ اُس کا ہاتھ نہ چوم سکی۔ اس سے بانو کو ایک گونہ تسکین ہوئی۔ اُس نے دل ہی دل میں دعائیں مانگیں کہ دیدی کے ہوتے ہوئے مہمان لوٹ کر فاضل پور نہ جائیں۔

اور دوسرے دن مہمان لوٹ کر فاضل پور نہ گئے۔

جب بانو کی آنکھ کھلی تو سورج کی کرنیں مسہری کے پردوں سے چھن چھن کر اُس کے پہلو میں سوئی ہوئی عقیلہ کے ... شبنم

اور شکیلہ ایک دوسرے کو باہوں میں جکڑے، پاس ہی بچھے ہوئے پلنگ پر پڑی بے خبر سو رہی تھیں۔ شبنم پیازی رنگ کے ریشمی سلیپنگ سوٹ میں تھی۔ شکیلہ سفید ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اُن کے سر کے سیاہ بال سفید چادر پر بکھرے ہوئے تھے۔ پلنگ کے پاس فرش پر ڈھولک پڑی تھی۔ وہ رات بھر ٹپے ہی گاتی رہی تھیں۔ پنجاب کی وہ مخصوص فی البدیہہ شاعری جس میں لڑکیاں ڈھولک کے تال پر پہلے سب مل کر ٹپے کا مصرع گاتی ہیں اور پھر ان میں سے ایک التزاماً کسی دوسری پر فی البدیہہ چوٹ کرتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں، چپٹی ناک یا موٹے موٹے ہونٹوں کی ہجو کرتی ہے یا اُس کے نہایت بھدے اور بدصورت بالم کا منہ بگاڑ بگاڑ کر نقشہ کھینچتی ہے اور پھر ٹپے کے مصرع میں سب کے ساتھ شامل ہو کر مد مقابل کے جوابی تیروں کے وار سہنے کے لئے سینہ تان کر بیٹھ جاتی ہے۔ رات گئے تک یہ دلچسپ مشغلہ جاری رہا۔ بانو نے شبنم کے خیالی بالم کی ہڈی پسلی توڑ رکھ دی۔ شبنم نے بھی کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ دراصل شبنم "کوبی گان" میں بڑی مشتاق تھی۔ وہ ایک عرصے تک شانتی نکیتن میں رہ چکی تھی جہاں کی رومان انگیز فضاؤں میں ڈھولک پر "کوبی گان" ہر شب ہوا کرتے تھے۔

بانو نے عقیلہ کے کان پر ہونٹ رکھ کر گزشتہ شب کا ٹپے کا مصرع گنگنایا۔ عقیلہ نے ایک انگڑائی لے کر کروٹ بدل لی۔ بانو نے اُس کے ایک ہلکی سی چٹکی لے کر اُس کے نہایت بھدے اور بدصورت بالم پر چوٹ کی۔ عقیلہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شبنم اور شکیلہ کی باہوں میں بھی حرکت ہوئی۔ پیازی رنگ کا ریشمی سلیپنگ سوٹ اور سفید ساڑھی سرک کر جُدا ہو گئے۔ شبنم اور شکیلہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ رت جگے کے باعث اُن کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ شبنم کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اُن کے دبے ہوئے جذبات ابھر کر رات بھر خیالی مرغزاروں میں اُڑتے رہے تھے۔ "کوبی گان" میں انہیں ہر طرح سوچنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔

نہا دھو کر ناشتہ کرنے بیٹھیں تو خالہ نے جوانی میں گائے ہوئے "کوبی گان" کے قصے چھیڑ دیئے۔ اُن قصوں نے حسب معمول اتنا طول پکڑا کہ دن کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانا کھا کر سب نے قیلولہ کیا۔ پھر شبنم اپنی ممیری اور خلیری بہنوں کو ساتھ لے کر ٹہلنے نکل گئی۔ طے پایا کہ پولٹری فارم دیکھا جائے۔ ادھر کا رُخ ہوا۔ راستے میں ڈاک بنگلہ پڑتا تھا۔ آفتاب ڈاک بنگلہ کے برآمدہ میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھوں پر دُوربین لگی ہوئی تھی۔ بانو نے دو ایک بار آفتاب کی طرف دیکھا۔ شکیلہ اور عقیلہ نے اُسے خوب گھور گھور کر دیکھا۔ شبنم نظریں نیچی کئے تالاب کے کنارے کنارے چلتی ہوئی ریلوے لائن کی طرف نکل گئی۔ پولٹری فارم کے پھاٹک پر ایک سیاہ بورڈ لٹک رہا تھا جس پر سفید حروف میں لکھا تھا "پولٹری فارم کے احاطہ میں داخل ہونے سے پہلے اپنے جوتے کا تلا فنائل میں بھگو لیجئے"۔ پھاٹک کے قریب ایک حوض تھا جو فنائل کے بجائے نہایت گندے پانی سے بھرا ہوا تھا۔ شبنم نے نوٹس پڑھا، حوض کے گندے پانی کی طرف دیکھا اور پھر زیر لب مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔ پولٹری فارم کا انچارج بیوی بچوں سمیت وہیں ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ نسوانی آوازیں سن کر وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ چک کی اوٹ سے اُس کی بیوی نے جھانک کر باہر دیکھا اور پھر روتے ہوئے بچے کو بازوؤں کے جھولے میں جھونٹے دے دے کر چپ کرنے لگی۔ دفعتہً ایک بچہ چک سے جھانک کر باہر نکلا۔ وہ بڑی تیزی سے ٹھمکتا ہوا آنکھوں کے ڈھیلے گھما گھما کر چک کی سمت بار بار دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں پانچ چھ میلے کچیلے ننگ دھڑنگ بچے چک کے پیچھے سے نمودار ہوئے اور پھر بھٹکنے کے لئے چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ ہلڑ مچ گیا۔ بچے دوڑتے ہوئے رنگ برنگی ساڑھیوں کے گرد اگرد چکر لگانے لگے۔ پولٹری فارم کا انچارج غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ اُس نے ایک بچے کو پکڑ کر زور سے چانٹا رسید کیا۔ میلے کچیلے ننگ دھڑنگ بچوں کے پاؤں جہاں کے تہاں تھم گئے۔

"یہاں دیہات میں بچے کچھ آوارہ ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے نا جہاں تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ میرے بچے کسی طرح کالج ہی میں تعلیم حاصل کریں۔" پولٹری فارم کے انچارج نے پاسنگ شو کا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

سانت آرام اچیف

"اچھا جناب! ہمیں وہ مشین تو دکھا دیجئے جس کی حرارت سے انڈوں سے چوزے پیدا کئے جاتے ہیں" شبنم نے گفتگو کا رخ بدلا۔
"یقیناً" انچارج یہ کہتا ہوا آگے آگے چل پڑا۔
شبنم کے لئے انڈوں سے بچے پیدا کرنے والی مشین کوئی نئی چیز نہ تھی دراصل وہ چاہتی تھی کہ شکیلہ اور عقیلہ کا یہ تماشہ جلد ختم ہو جائے۔ پولٹری فارم پر ایسی کوئی قابل دید چیز وہاں نہ تھی۔ راجندر ناتھ کا مندر اور چٹان کے سینے سے نکلتے ہوئے آگ کے شعلے تو وہ کئی بار دیکھ چکی تھیں یہاں پولٹری فارم کے انچارج کی شخصیت قابل غور ضرور تھی۔ اس کے متعلق واپسی پر راستے میں شبنم کہنے لگی "دیکھا بھئی ویدی" شبنم عموماً شکیلہ سے چھیڑ کی خاطر ویدی کہہ کر پکارتی تھی۔ شاید اس لئے کہ شکیلہ کے سامنے کے بال کھچڑی ہو رہے تھے اور اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کے کونوں سے جھریوں کا پھیلاؤ رخساروں کو اپنی زد میں جیسے لیا ہی چاہتا تھا۔
"پولٹری فارم کا انچارج احساس کمتری میں مبتلا ہے" شبنم نے اپنی علمیت بگھارنا شروع کی۔
"وہ مارا۔ اب کہاں جاؤ گی" بانو نے ایک کالی تتلی پکڑتے ہوئے فاتحانہ انداز میں کہا اور پھر ساتھ ہی اس کا پاؤں کھیت کی مینڈ سے پھسل گیا اور وہ دھپ سے تمباکو کے کھیت میں جا گری اور پھر جھٹ پٹ ساڑھی جھاڑ کر کھڑی ہو گئی۔ شبنم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شکیلہ اور عقیلہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئیں۔ مقابل سے مدرسہ دینیات کے طالب علم ہاتھوں میں کتابیں لئے آ رہے تھے۔ عورتوں کو دیکھ کر وہ ایک طرف ہو گئے۔ پہلے شبنم ان کے قریب سے گزری پھر شکیلہ، عقیلہ اور بانو۔ جب وہ ذرا آگے نکل گئیں تو ایک نوجوان نے گانا شروع کر دیا۔

تُمیں اَرایک ٹی دن ھتا کو
سے چنچل جابرہ آگے
مور بنوتی راکھو "

ترجمہ: "تم ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔ او چنچل، جانے سے پہلے میری یہ التجا رکھ لو۔"

شبنم نے کہا "بڑے جاہل ہیں یہ لوگ"
شکیلہ بڑبڑائی "واہیات، بیوقوف"
شبنم کے دل نے کہا کتنا شیریں ہے یہ گیت۔ بس ایک دن اور ٹھہر جاؤ تاکہ پھر یہ اُنہیں چلی جائیں گی۔ اب تم دوربین لگانے مجھے دور سے دیکھ رہے ہو مگر جانتے ہو آخر یہ دیہات کا معاملہ ہے اور پھر یہ دونوں بہنیں بانو کی طرح بیوقوف نہیں۔"
شکیلہ کے من نے کہا "کہاں ہو میرے بالم! میں تو آنکھیں فرش راہ کئے بیٹھی ہوں۔ کیا یا تے خوبصورت دن اسی طرح بیت جائیں گے؟"
اور وہ خوبصورت شام بھی اسی طرح بیت گئی۔ شبنم اپنے بالم کے ہاتھوں کو نہ چوم سکی۔ اس لئے جب ڈھولک پر "کجلی گان" شروع ہوئے تو اس نے چپکے ہی اپنے بالم کے ہاتھ چوم لئے۔ جذبات کی آگ رات گئے تک سلگتی رہی۔ جب دلوں کا غبار نکل گیا تو وہ اپنی اپنی یادیں، اپنے اپنے خیال، انفرادی تمنائیں، امیدیں اور مایوسیاں سینوں میں دبا کر پلنگوں پر لیٹ گئیں۔ آہستہ آہستہ نیند سے پلکیں بوجھل ہو گئیں۔ شبنم، عقیلہ اور شکیلہ سو گئیں۔ بانو کو نیند نہ آئی۔ وہ سوچتی رہی ہزاروں باتیں۔ غنی کے متعلق، جس کا سرائے گنج میں چمڑے کا کارخانہ تھا، جس کے ساتھ اس کے بیاہ کی بات چیت ہو رہی تھی۔ سوچتے سوچتے مچھر اس کی ناک کے نتھنوں میں گھسنے لگے۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھی۔ مچھر دانی سے نکل کر اس نے کھلی کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ چاند نکل آیا تھا۔ درختوں کے سائے سیاہ دھبے بن کر لرز رہے تھے۔ تالاب کی سطح پر نقرئی مستقبل جھوم رہے تھے۔ کھیت کی وہ مینڈ جس پر چلتے چلتے وہ ڈاک بنگلے کے پچھواڑے میں جا نکلی تھیں، سنسان پڑی تھی۔

پندرہ کا چاند ڈھلنے کے لئے سمندر کی طرف جا رہا تھا۔

صبح ہوا تو دیکھو تاریخ بانو کے دل کے مندر میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔

کسی نے چپکے سے دروازہ کھولا۔ کوئی دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ اور پچھواڑے کی پگڈنڈی پر چلتے چلتے دفعتاً رک گیا۔ اس وقت بانو کو احساس ہوا کہ یہ میں ہوں میں نے دروازہ کھولا تھا۔ میں دبے پاؤں باہر نکل آئی۔ میں کھیت کی پگڈنڈی پر چلتے چلتے اب رک گئی ہوں۔ میں کہاں جا رہی ہوں۔ ملاحی قسمت دور ہے۔ وہاں بانو کبھی نہ پہنچ سکے گی۔ بانو کا باپ سراج گنج میں انتظار کرتا ہوگا۔ وہ چمڑے کے ایک بہت بڑے کارخانے کا مالک ہے۔ بانو جب وہاں جائے گی تو اردگرد پھیلے ہوئے چمڑے کے ڈھیروں کی بدبو دو چار دن میں ختم ہو جائے گی۔ اس کی ماں نے یہی کہا تھا۔ کہیں دور سے ٹھنڈا جھونکا پھر بیل گاڑی کے پہیوں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ بانو تیز تیز قدم اٹھاتے چلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ دروازہ بند کر دیا۔ پسینے میں شرابور بستر پر لیٹ گئی

منّی یا پھر اچانک شبنم خواب میں بڑبڑائی۔ اور پھر اس نے شکیلہ کو اپنے بازوؤں میں لے کر اس زور سے بھینچا کہ شکیلہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

کیا ہے شبو؟ شکیلہ نے گھبرا کر پوچھا۔

شبنم خراٹے لے رہی تھی۔

بانو آنکھیں بند کئے دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ مہمان کل لوٹ کر فاضل پور نہ جائیں۔

دوسرے دن جب شکیلہ، عقیلہ اور ان کی ماں پردے میں بیٹھ گئیں اور مہاوت نے ہاتھی کی ٹانگ میں آنکس چبھو کر مخصوص آواز میں روانگی کا اعلان کیا تو بانو پھر ایک عجیب و غریب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ شبنم نے اطمینان کی سانس لی۔ بانو منہ ڈھانپ کر پلنگ پر لیٹ گئی۔

جب بانو نے بتایا کہ اس کی طبیعت کچھ مضمحل سی ہے تو اس کی ماں نے بغیر سوچے سمجھے جھٹ کہہ دیا کہ یہ تو ملیریا کے آثار ہیں۔ یہ سن کر بانو کی جان میں جان آ گئی اور وہ بڑے اشتیاق سے ملیریا کا انتظار کرنے لگی۔ دوپہر ہو گئی۔ شبنم نے دو چار مرتبہ بانو کا بدن چھو کر دیکھا اور بخار کی تپش نہ پا کر مطمئن ہو گئی۔ چہل قدمی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ بانو جانتی تھی کہ شبنم اُسے باہر جانے کے لئے مجبور کرے گی اور اس کے لئے وہ ہرگز تیار نہ تھی۔ مگر زبان سے انکار کرنا بھی دشوار تھا۔ باوجود انتہائی کوشش کے بانو اپنے آپ میں اتنی ہمت پیدا نہ کر سکی کہ وہ شبنم سے صاف صاف کہہ دے "دیدی، میں باہر نہیں جاؤں گی۔" چنانچہ وہ کوئی ایسا بہانہ تلاش کرنے لگی جس کے پیش کرنے سے شبنم ناراض بھی نہ ہو اور باہر جانا بھی ملتوی ہو جائے۔ ادھر شبنم بن سنور کر تیار ہو بیٹھی۔ اس نے مرشد آباد کی پھولدار باریک ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جوڑے میں سفید گلاب کا پھول تھا، اونچی ایڑی کی سینڈل پہن کر اس کا قد لانبا ہو گیا تھا، کانوں میں چاندی کے ٹاپس چمک رہے تھے، لباس سے سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ بانو ایک عجیب مخمصے میں پڑ گئی۔ نہ ملیریا نازل ہوا نہ کوئی موزوں بہانہ تراشا جا سکا۔ مگر عین وقت پر بانو کی سہیلی عذرا فرشتۂ رحمت بن کر آ پہنچی۔ عذرا ایک طویل مدت کے بعد میکے آئی تھی۔ وہ بانو سے گلے لگ کر ملی اور پھر اس نے چھوٹتے ہی بچپن کے قصے چھیڑ دیئے۔ بات سے بات پیدا ہوتی چلی گئی۔ شبنم دل ہی دل میں جھنجھلا اٹھی۔ کوئی راہ نہ پا کر اس نے عذرا کو بھی باہر چلنے کی دعوت دی۔ عذرا نے ہاں تو کر دی مگر باتیں کرتی رہی۔ کچھ وقفے کے بعد شبنم نے اپنا ارادہ دہرایا تو عذرا نے پھر ہاں کر دی لیکن فوراً دوسرا قصہ لے بیٹھی۔ شبنم اکتا کر اکیلی ہی باہر چلی گئی۔ اس وقت بانو بے چین ہو گئی۔ عذرا کی باتوں میں اس کا دھیان نہ رہا اور وہ تصور کے تانے بانے میں شبنم کے قدموں کی آہٹ سننے لگی۔ وہ قدم جو ڈاک بنگلے کی سمت بڑھ رہے تھے، اُدھر چہرہ رہا ہی تھا، وہ اداسی جس کے گالوں پر ننھے ننھے گڑھے تھے، جس نے سپید راستے پر جب پلٹ کر بانو کی طرف دیکھا تھا تو وہ ہونٹوں پر اُتر آئی بات بھول گئی تھی۔ بانو کا تصور جب اس نقطے پر پہنچا تو اس کے انگ انگ میں ایک آگ سی دوڑنے لگی اور اس آگ میں برستے چلنے لگی بیتا گنتہ

[illegible] اور بے کیف

کی ہریالی و شادابی، ملن کا پُرشور کارخانہ، اُودے اُودے پھولوں والی تتلیاں، سب کچھ، اُس کی چھوٹی سی تمنا میں سمٹے ہوئے تھے اور جب اُسے معلوم ہوا کہ دل کی اس واردات پر اُس کا کوئی اختیار نہیں تو اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر ڈاک بنگلہ میں چلی جائے اور وہاں سے کہہ دے کہ میرا آفتاب دیکھو نا یہاں تم کتنے اچھے ہو اور تم کتنے بُرے ہو۔ تم جاتے تو کتنا اچھا تھا۔ تم یہاں نہ آتے تو کتنا بُرا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے وہ تو نہ جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی مگر اتنے میں شبنم کمرے میں داخل ہوئی۔

مرزا اجازت لے کر چلی گئی۔

شبنم کچھ اداس اُداس تھی، مایوس سی بے چین اور پریشان۔ وہ سیدھی جا کر بستر پر لیٹ گئی اور پھر اُس نے چھپر دانی کے پردے گرا دیئے۔ اُسے یوں دیکھ کر بانو کے دل میں سلگتی ہوئی آگ پر ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی اور پھر وہ ایک معصوم بچے کی طرح زندگی کے سمندر کے کنارے پر دوڑ دوڑ کر خیالات کی اجلی اجلی سیپیاں اور رنگ برنگے پتھر چننے لگی۔

تین دن گزر چکے تھے طویل، اُداس اور نہایت پھیکے دن۔ اور ان تین دنوں میں آفتاب کو احساس ہوا کہ گاؤں میں تنہائی کے لمحات کتنے تھکا دینے والے ہوتے ہیں۔ جب انسان شہر میں ہوتا ہے تو دیہات کی پُرسکون فضا کے خواب دیکھتا ہے لیکن دیہات کی فضا کتنی جلد بے کیف ہو جاتی ہے۔ یہاں تو زندگی جیسے رینگ رہی ہے۔ کوئی حرکت نہیں، کوئی آہٹ نہیں، کوئی مسکراہٹ نہیں، صرف سبزہ ہی سبزہ، نیلا آسمان اور تازہ ہوائیں۔ ان میں کوئی کب تک جی سکتا ہے؟ زندگی کی گرمی تو شہروں کے دم سے قائم ہے؛ جہاں رمیا ناچ کی شورشیں ہیں، تھیٹر اور سینما ہیں، شراب ہے، بریجیس ہے، کلثوم ہے اور ایسی ہی سیکڑوں لیلا ہیں۔ وہاں انسان کے ہاتھوں، زبان، جسم اور جذبات کو پوری پوری آزادی حاصل ہے۔ برعکس اس کے بیتا کنڈ میں وحشتناک حبس ہے۔ یہاں تو شبنم بھی اُس سے کھلم کھلا ملنے سے ڈرتی ہے۔ آج شام بھی وہ گھبرائی ہوئی آئی تھی اور صرف اتنا کہہ کر واپس چلی گئی تھی کہ بانو کے بغیر وہ زیادہ باہر نہیں ٹھہر سکتی۔ کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ گاؤں میں شبنم میرے ساتھ اکیلی چل پھر نہیں سکتی۔ لیکن آج بھی وہ نہ آتی تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ وہ تین دن سے انتظار کر رہا تھا، بانو کا، صرف بانو کا۔ مگر تین دن کی اُداس طویل اور پھیکی تنہائی کے بعد بھی بانو کو قریب سے دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ یہ سوچتے سوچتے اُس نے بستر باندھنا شروع کر دیا۔ کتابیں اُٹھا کر اٹیچی کیس میں رکھ دیں اور اگلی گاڑی سے ڈھاکہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ پھر آرام کرسی پر دراز ہو کر اُس نے سگریٹ سلگائی۔ ڈھاکہ جانے والی آخری ٹرین بھی نکل گئی مگر وہ سوچتا رہا۔

اُس نے اٹھ کر بستر کھول دیا اور اٹیچی کیس سے کتابیں نکال کر میز پر سجا دیں۔

دیہات کی پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چاند سیاہ بادلوں میں چھپ چکا تھا۔ کبھی کبھی گیدڑوں کے چلانے یا کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رات کے اندھیرے کو اور وحشت ناک بنا دیتیں۔ چٹا گانگ جانے والی آخری ٹرین شور مچاتی ہوئی ڈاک بنگلہ کے قریب گزری، چند لمحے اسٹیشن پر رُکی اور پھر تاریکی کو چیرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ بیتا کنڈ کا ذرہ ذرہ اندھیرے کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

آفتاب لیمپ بجھا کر بستر پر لیٹ گیا۔

کھلی کھڑکی سے "رات کی رانی" کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ آفتاب کے تکیے کے پاس پڑی ہوئی رسٹ واچ بدستور ٹک ٹک کر رہی تھی۔ رسٹ واچ کے ہندسوں اور سوئیوں کی ہلکی سبز روشنی نمایاں ہو کر تاریکی کا شدید احساس دلا رہی تھی۔

دفعتاً کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" آفتاب نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

کوئی جواب نہ ملا۔

"کون ہے؟" آفتاب نے دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔

"میں" ایک منمناتی آواز آئی۔

آفتاب نے عجیب کشمکش کے بعد دروازہ کھول دیا اور پھر جیسے ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

اُس کے سامنے بانو دایاں ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔

"میرا ہاتھ دیکھو نا راہی" بانو اُس کے قریب آ رہی تھی۔

آفتاب کے دل کے مندر میں گھنٹیاں زور زور سے بجنے لگیں۔

"میرا ہاتھ دیکھو نا راہی" بانو اس کے بالکل قریب آ گئی۔

فاصلہ کتنا کم ہو گیا تھا۔ آفتاب کو یوں لگا جیسے تمام کائنات سمٹ کر ایک نقطے پہ آ گئی ہو جیسے زمان و مکان کے بندھن ٹوٹ گئے ہوں۔ بانو اُس گہرے سُرخ اور چوڑے بارڈر والی ہلکے زرد رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اُس کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹوں کی نرم و گداز پنکھڑیاں کانپ رہی تھیں۔ وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نادان بچے کی معصومیت جھلک رہی تھی۔

"میرا ہاتھ دیکھو نا راہی"۔

آفتاب کے دل کے مندر میں گھنٹیاں اس زور سے بجنے لگیں کہ وہ خوف سے لرزنے لگا۔ اور اُس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر پہاڑ کی چوٹی پہ چلا جائے اور پکار پکار کر کہے "تم کہتے ہو ان نرم و گداز پنکھڑیوں کو نہ چومنا ظلم ہے، غیر فطری ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ آگ سلگتی رہے تاکہ پھول کھلتے رہیں اور شیلے کا پندار ایک نئے سورج کے طلوع ہونے کا مژدہ سنا سکے"۔

"حضور کیا بات ہے" چوکیدار کی آواز آئی اور دوسرے لمحہ بانو کانپتی ہوئی باہر نکل کر اندھیرے میں گم ہو گئی۔

دوسرے دن ڈاک بنگلہ سنسان پڑا تھا۔ راہی جا چکا تھا۔

بانو ڈاک بنگلہ کے سامنے ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور پھر اپنا ہاتھ پھیلا کر لکیروں کو غور سے دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" شبنم نے پوچھا۔

اور بانو کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے نکل کر اُس کے ہاتھ کی لکیروں پر لرزنے لگے۔

حمید امجد

مشرق و مغرب

نہ کوئی مشرق
نہ کوئی مغرب

بس اک مہکتی گداز مٹی
کی چادرِ سبز، جس کے دامن
میں کل تھے انبارِ گندم و جَو
اور آج انبارِ سیم و آہن

○

یہ کون سمجھے
یہ کون جانے
کہ اس تڑپتے ہوئے زمانے
کے سائے میں، ڈوبتی سی شمعوں
کی روشنی، جو پیالۂ گل،
صراحیٔ سنگ، کوزۂ مے
کو پا نہ کر، شہر و دشت و ساحل
سے اٹھتے گرز و سنان و خنجر،
پہ جم گئی تھی، وہ کاتبین کو
جو آج بھی طاقِ زندگی پہ

سب سنگ وہی ہے، اسی کا پرتو
جہانِ نو کے فروغِ منزل
میں ڈھل گیا ہے
عجیب قصّہ ہے، ضربِ خارا
سے ذہنِ فولاد جل اُٹھا ہے

○

نہ کوئی مشرق
نہ کوئی مغرب

مگر وہ اک زینۂ مراتب
جو اَن گنت بے زباں غلاموں
کی ٹوٹتی پسلیوں پہ کل بھی
ہزار کف در دہاں خداؤں
کے بوجھ سے کپکپا رہا تھا،
اور آج بھی اک وہی ترازو،
کہ جس میں زنجیر پوش روحوں
کے شعلہ اندام دست و بازو
بہ مثلِ یک اشک تل رہے ہیں
اگر یہی تھا نصیبِ دوراں،
یہ نالۂ غم، یہ اک مسلسل،
خروشِ انبوہِ پا بجولاں،
ازل کی سرحد سے نسلِ آدم
کی یہ کراہیں، جو روز و شب کے
عمیق سناٹوں سے پیہم

ابھر رہی ہیں، یہ چشم و لب سے
فسانہ ہائے سرشک و شیون
اگر مقدر یہی تھا اپنا
تو یہ مقدر اٹل نہیں تھا

○

یہی ہے مشرق
یہی ہے مغرب

وہ پارہ ہائے سفال و خارا
وہ عقلِ حیراں کی کارگاہیں،
وہ جنسِ نایاب، کل ہمارے
جہانِ صد ریزۂ خزف ہیں
ہماری دولت تھی، ہم خدا تھے
اور آج بھی یہ شرار پیکر،
حقیقتوں کے طلسمِ سوزاں
یہ وسعتِ بحر و بر میں مضطر
ضمیرِ آہن کی جلتی سانسیں
یہ ذرے ذرے کے قلبِ پیچاں
ہیں کھولتی قوتوں کے طوفاں،
زمانہ ہے جن کی رَو میں تنکا
جو آج بھی ہو وجود اِن کا،
ہماری مٹھی میں ہم خدا ہیں
سیاہیوں کے چھلکتے خُم سے
اچھلتی کرنوں کا حوصلہ ہیں

○

مقبول احمد سعید

شاعری

فکرِ خاموش کو فطرت سے ملا اذنِ کلام
کاخِ امید پہ نغموں کا علم لہرایا
اور جذبات نے الفاظ کا پیکر پایا!

بوئے گل بن گئی پیغامبرِ صبحِ بہار
برگِ گل بن گیا آئینۂ حسنِ گلشن،
قامت و روئے نگاراں ہوئے شمشاد و سمن

قطرہ آئینہ بنا شاہدِ قلزم کے لیے
یوں ملی ذرۂ بے مایہ کو عالم کی متاع
دلِ انسان کو جس طرح ملے غم کی متاع!

یوں کوئی آیا سرِ انجمنِ سیم بَراں
حیرتی سب ہوئے انداز و ادا بھول گئے
فتنۂ سرمہ و اعجازِ حنا بھول گئے

صدیقہ کلیم

لمحۂ جاوید

درد کے لمحۂ جاوید میں اے جانِ جہاں
یہ ترے ساز کی دھڑکن، یہ ترے جسم کا رقص
یہ تری رُوح کا نغمہ، یہ ترے پیار کا لوچ
جیسے گھُل جاتی ہے فن کار کے جذبات میں سوچ
اجنبی راہ پہ غم خوارئ ایام کو دیکھ!
سرد تھے راگ تو غم ناک تھی دل کی دُنیا
جسم کے ہوش سے کچھ دُور، بہت دُور کہیں
کس طرح ذہن میں بستی گئی دنیائے یقیں!
اپنی بے نام اُمنگوں سے اُبھرتا ہوا درد
دھیان کی لہر پہ بھی سازِ جنوں چھیڑتا ہے
شب مہتاب میں سورج کی تمازت کا نفوذ
ایک افسانہ ہے بے مہرئ ایام ہنوز
یہ ترے پیار کی تفسیر ہے اے جانِ جہاں
اس زمیں پر تو ستارے بھی اُتر سکتے ہیں
ابدیت تو اسی وصل کی تمہید سے ہے
روشنی درد کے اس لمحۂ جاوید سے ہے

شاد امرتسری

محبت اک سفر ہے

محبت اک سفر ہے تند خو دریا کی موجوں کا
یہ موجیں اپنے سینوں میں کروڑوں آبگینوں کو
جنم دیتی ہیں خود ہی توڑتی ہیں حیلہ سازی سے
کرشمے پھوٹتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں رہ رہ کر
مگر موجیں کہ جن کی برق پائی برق رفتاری
چٹانوں کی سلوں کو ریزہ ریزہ کرتی رہتی ہے
ازل سے آج تک دریائے تند و تیز کی تہہ سے
کوئی گوہر نہ لائی ہیں نہ لائیں گی کبھی شاید
یہ تند و تیز خو دریا محبت کے مسافر کو
پہاڑوں گھاٹیوں اور دامنوں کے دام میں گھیرے
طلسماتِ سحر میں اور سحرِ شام میں گم ہے
ہر انداز الجھاتا رہا ہے تازہ الجھن میں
یہ الجھن آج تک سلجھی نہ سلجھے گی کبھی شاید
محبت اک سفر ہے تند خو دریا کی موجوں کا

جلیل حشمی

ترے شہر کے لوگ

(دلِ دیوانہ ٹھہر، اے دلِ ناداں نہ مچل
دیکھ جاری ہے سلگتے ہوئے لمحوں کا عمل)

ہو گئیں اس کی جھیلیں بھی ابل کر دلدل،
اور وہ سپنوں کے لہراتے ہوئے نیل کنول!
کرچیاں تلوؤں میں چبھنے لگیں دھیرے دھیرے
وقت سے پہلے یہاں پر بھی کسی نے شاید
صبح کی آس پہ دھندلائے سے شیشے چن کر
شبِ تاریک میں تعمیر کیا شیش محل

تھاپ پڑتی نہیں ڈھولک پہ کہیں گلیوں میں
زخم آلود ہوئے دستِ حنائی جیسے
سوچتا ہوں، کوئی ہے بھی کہ نہیں گلیوں میں
رنگِ زریں گراں ہے نہ بسنتی کہاں؛
قصۂ خواب ہوئی تنگ قبائی جیسے
راستوں میں ہیں سراسیمہ سے سائے گرداں
جانے کیا حادثہ گزرا ہے حسیں گلیوں میں
آج دیوانوں کے رخ پر ہیں ترے شہر کے لوگ
کس سے پوچھوں ترے الطاف کے قصے آخر
کہ تراشے ہوئے پیکر ہیں ترے شہر کے لوگ
اپنے ہونٹوں کو ہلاتے ہوئے ڈر جاتے ہیں،
سائے کی طرح خموشی سے گزر جاتے ہیں،
اجنبی ہوں، یہی محسوس ہوا ہے مجھ کو،
دیکھ کس درجہ ستم گر ہیں ترے شہر کے لوگ
میری جاں! کیا کوئی پتھر ہیں ترے شہر کے لوگ

حنیف خوف

ہوائے شام

ہوائے شام سے غموں کا آئینہ چمک اُٹھا،
ابھی تو شب کی نواگری کا کھنکھنا رہا تھا مگر
ابھی مری نگاہ میں تھا آرزو کا اک نگر
ہوائے شام سے مگر یہ زخم کیوں مہک اُٹھا

ہوائے شام ہے شمیمِ نرم گام تو نہیں!
رواں سہی ہر ایک پل یہ شام رات میں ڈھلے
ذرا یہ در کھلے تو پھر چراغِ بادہ ہی جلے
ہواؤں میں گھلا ملا کوئی پیام تو نہیں!

حبیبِ جاں کی نکہتوں کی رازداں ہوائے شام
دیارِ رنگ و نور کی ہے داستاں لیے ہوئے
ہزاروں بے کہی ہوئی کہانیاں لیے ہوئے
مرے ہجومِ اشک سے ہے ضوفشاں قبائے شام

نفس کے مد و جزر سے سکوتِ جاں ٹھٹک اُٹھا
یہ غم غمِ حیات ہے کہاں بھلا سکو گے تم
یہ دائرہ ہے زیست کا نہ بچ کے جا سکو گے تم
ہوا کی نرم لرزشوں سے پھر جہاں جھنجھنا اُٹھا

بھٹکتے بادلوں کو ہے تلاشِ منزلِ قمر
انھیں ہے ڈر کہ تیرگی ضرور رنگ لائے گی
سیاہ منتروں سے اب فسونِ شب جگائے گی
بہت ہے تھوڑی روشنی کہ دُور ہے ابھی سحر

پلٹ چلیں کہ جگمگا تا جام تیرہ فام ہے
نشاط گوش قہقہوں میں رات بیت جائے گی
دریچہ ہائے ناز سے سحر نہ جھانک پائے گی
پلٹ چلیں کہ زیست کا بلند تر مقام ہے

جو رات سوانگ لائی ہے تو ہم لہو جلائیں گے
اُلٹھا دلوں سے جو دھواں اثر کی سمت چل پڑا
غموں سے کارواں بنا سحر کی سمت چل پڑا
سفر دراز ہی سہی قدم نہ ڈگمگائیں گے

گھنیری شب کی ظلمتوں میں ماہتاب لائی ہے
انوپ روپ زندگی کا جیسے جگمگا اُٹھے
ستارے پھیکے پڑ چکے، چراغ جھلملا اُٹھے
تمہاری یاد بھی سحر کا خواب بن کے آئی ہے

زباں کی وادیوں میں اب شگفتِ گل کی فصل ہے،
زمیں کی سرد خلوتوں کی داستاں بدل چکی
جنوں نواز چوٹیوں سے برف بھی پگھل چکی،
شبِ فراق ڈھل چکی، طلوعِ روزِ وصل ہے

خلیق احمد خلیق

سُلگتی ہوئی شام

اور شعلہ بار گلزاروں نے دھندلکوں کی ردا
دھوپ کے ہونٹوں پہ دبے پاؤں چڑھی جاتی ہے
شام چپ چاپ، پُراسرار، متفکر بہ نگہ
کسی مدقوق جواں سال حسینہ کی طرح
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتی ہوئی
کو بکو ایک متانت سے بڑھی آتی ہے

○

آہ یہ شام، یہ بے نور سلگتی ہوئی شام
پھر رگِ جاں میں کسی درد کے نشتر ٹوٹے
پھر اُٹھی جاتی ہے دل میں کسی یاد کی لَو
ذہن ویراں میں پھر افکار کے جھرنے پھوٹے

○

گدگدانے لگے رہ رہ کے ہوا کے جھونکے
ذہن میں کتنے دریچے ہیں کہ وا ہونے لگے
چشمۂ دید سے دھل دھل کے وہ نکلے چہرے
قیدِ ماضی سے وہ اصنام رہا ہونے لگے

○

وہ سرِ شاخِ سمن کس کی قبا لہرائی؟
کس نے مسکا کے وہ دانتوں میں دبایا آنچل!
وہ کمند زار گھنے ابرو، وہ رخسار پہ تل
یہ تو "شمسہ" ہے۔ وہی شوخ، شرارہ، چنچل
بادہ بن کر جو کبھی سینۂ یاراں میں رہی
خواب بن کر جو کبھی چشمِ جواناں میں رہی
اب سنا ہے کسی ایوان میں رہا کرتی ہے
خون اگلتی ہے بخاروں میں تپا کرتی ہے
رسمِ آبا کے جہنم میں جلا کرتی ہے"

○

سرو کی اوٹ سے وہ کون لجاتی نکلی
کسی اندیشۂ موہوم سے گھبرائی ہوئی
وہ جھکی جھکی ہوئی آنکھیں، وہ سنہری زلفیں
پھول سی جان پہ وہ جوبن کی گھٹا چھائی ہوئی

ہاں یہ "نازو" — وہی معصوم سی بھولی لڑکی
ایک تاریک سے گھروندے کا وہ تنہا دیپک
ایک بیوہ کے الم دیدہ جگر کی ٹھنڈک
کتنے اربابِ شریعت کی نظر تھی اس پر!
کتنے پیرانِ طریقت کی نظر تھی اس پر
آہ "نازو" — وہی معصوم سی بھولی لڑکی
آج کہتے ہیں کہ "بازار" کی زینت ہے وہ
کوئی سمجھے تو بڑی تلخ حقیقت ہے وہ

○

آہ یہ شام، یہ بے نور سلگتی ہوئی شام
جانے اس شام کے پیچھے کوئی مہتاب بھی ہے؟
چاندنی رات کا بپھرا ہوا سیلاب بھی ہے؟
آؤ اس شام کا دل چیر کے دیکھیں یارو!
اپنے کھوئے ہوئے مہتاب کو ڈھونڈیں یارو!

○

جمیل اسحٰق

چراغ اور زندگی

بارہا میں نے سوچا ہے ہنگامِ شب
کتنے فیاض ہیں راستوں کے دیئے

اجنبی رہروانِ سبک گام کے
سینکڑوں راز دل میں چھپائے ہوئے
جیسے نوخیز ٹہنی گلوں سے لدی!
بارِ نکہت سے گردن جھکائے ہوئے

وہ زمستاں کی رُت ہو کہ باراں کی رُت
فصلِ گل ہو کہ برگِ پریشاں کی رُت
میں نے دیکھا انہیں جگمگاتے ہوئے
اپنے سینے کی دولت لٹاتے ہوئے

بارہا میں نے سوچا ہے ہنگامِ شب
زندگی راستے کا دیا تو نہیں
آدمی اس جہاں کا خدا تو نہیں،

شاذ تمکنت

دیارِ نیم شبی

دیارِ نیم شبی، جلوہ گاہِ درد و نشاط،
ترے سوادِ فلک، تیرے ماہتاب کی خیر
تری فضا میں رچی ہے اُداسیوں کی مہک
ترے نجوم کے بیدار اضطراب کی خیر،
ملی ہے دولتِ چشمِ پُر آب ہر نگاہ،
دلِ نظارہ ترے دردِ بے حساب کی خیر

○

یہ خواب ساز فضا، یہ دُھلا دُھلا منظر
گلاب زاروں پہ ڈھلتے ہیں شبنموں کے گہر
لچکتی ڈالیاں تردامنی سے بوجھل ہیں
طراوتوں کی نقاب افسردگی سے بوجھل ہیں
نمیدہ نرم، ہری پتیوں کے ریشوں میں
تمام پگھلی ہوئی آگ کی ہیں قندیلیں
رسیلی، مدبھری خاموشیوں کی مست الاپ
یہ راگنی یہ قمر کے سنہرے پاؤں کی چاپ
یہ دشتِ گردوں، یہ بنجارے ابر پاروں کے
یہ سوتے جاگتے ارمان مدھر ملاروں کے
تنداسی شب کی نگاہوں کا یہ سہانا پن
یہ پختگی، یہ سجل روپ، یہ کنوارا پن،

○

دیارِ نیم شبی جلوہ گاہِ دردو نشاط
غریبِ شہرِ شبِ ماہ کو سہارا دے
بھلا چکے ہیں مجھے تیرے ماہتاب و نجوم
اب اُن کو یاد نہیں دردِ خاطرِ معصوم
مَیں نغمہ ساز ہوں پہچان لے مری آواز
وُہی کسک ہے، وُہی ہے لُٹا لُٹا انداز
وُہی لبوں پہ دعاؤں کے خون کا الزام
پلک پلک پہ وُہی تہمتِ چراغاں ہے
وہی ہے قلب پہ نشتر کے ٹوٹنے کا گماں
نباہنے کا وہی زندگی سے پیماں ہے

⊙

مَیں آج ڈھونڈ رہا ہوں خرابۂ دل میں
حنا بدست، گل اندام، صندلیں پیکر
نگاوٹوں میں نہاں حسرتِ شکیبائی ۔۔!
قبا سے لپٹی ہوئی نکہتِ شناسائی
کسی کا قُرب فقط دردِ آشنائی ہے
بس اک خلش ہے کسی کی نظر کچھ اور نہیں،
یہی کہا ہے شبِ التفات سنے مجھ سے
کہ نوکِ نشترِ غم ہے سحر کچھ اور نہیں،
کسی کے تکلف کے با وصف میں نے جانا ہے
نصیبِ عشق بجز چشمِ تر کچھ اور نہیں،

○

دیارِ نیم شبی سُن یہ مژدۂ غمِ رنگ
کہ اب تو یادوں کی اگلی سی شستگی بھی نہیں
نہ رتجگوں کا جنوں ہے، نہ آنسوؤں کا ہجوم
سحر کے ڈوبتے تاروں سے دوستی بھی نہیں
شکستگیٔ دل وجاں کا رنج کیا ہو گا
جو سچ کہوں تو کچھ ایسی مجھے خوشی بھی نہیں
دیارِ نیم شبی جلوہ گاہِ دردو نشاط
وہ میرے خواب، وہ میری وفائیں لوٹا دے
مجھے وہ زود پشیماں دعائیں لوٹا دے

⊙

سید رضی ترمذی

۱

ستانے میں
رنگوں، روشنیوں، خوشبوؤں کا واویلا
تاریکی میں
بجھی بجھی، افسردہ یادوں کی اندھی آنکھوں کے آنسو
ان طاقوں پر
جلے ہوئے خوابوں کے مدفن
کچھ بھی نہیں ہے !!

لیکن پھر یہ پتھر میں ترشی ہوئی آنکھیں
ماضی کے مانوس کواڑوں
مٹی مٹی دہلیزوں کے اندر کیوں ایسے جھانک رہی ہیں ؟

تم کہتے ہو کچھ بھی نہیں
اور میرے خشک لبوں پر اب تک
ایک سوال کی حسرت کا جو گہرا گھاؤ
شک رہا ہے ——؟!

منیر نیازی

مُدھر ملن

گھر کی منڈیروں پہ گھر آئی کالی گھور گھٹا
بوندوں کی رم جھم میں سارے شہر کا شور مٹا
بجلی نے نیلے پربت کو لہو لہان کیا

○

چھت پہ بانسریوں کی سُر کا اجلا پھول کھلا
ہندیا کے رنگوں میں دکھ کا ساگر ڈوب گیا
لاج کی خوشبو کا سندیسہ چاروں اور بڑھا

بجلی نے نیلے پربت کو لہو لہان کیا


دن بدن
صاف اور حسین جلد
کیڈل* آمیز رکسونا
سے اپنے اصل حسن کو
نکھرنے دیجئے
اپنی جلد پر نرمی سے ملیے
پھر دیکھئے آپ کی جلد دن بدن نرم
ہوتی جائے گی جس سے آپ کا حسن درخشاں
ہو جائے گا۔
★ جلد کو ملائم کرنے اور
مقوی جلد تیلوں کے ایک
خاص مرکب کا کیمیکل نام ہے
رکسونا
کیڈل آمیز واحد صابن


بالکل سفید، بالکل خالص لکس ٹائیلٹ صابن
کے استعمال سے بیحد تازگی محسوس ہوتی ہے"
میناشوری کہتی ہے
خالص و سفید لکس ٹائیلٹ صابن کو، جو
کہ بالائی دار جھاگ سے مالا مال اور تازہ پھول کی
طرح خوشبودار ہوتا ہے، پاکستان کی حسین عورتیں
اپنے حسن کی خاطر روزانہ استعمال کرتی ہیں۔
LUX
TOILET SOAP
LUX
TOILET SOAP
لکس ٹائیلٹ صابن
فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن

محمود نظامی

میکسیکو

علم النفس کے ماہر ہم سب کے ساتھ ایک عجیب و غریب کھیل کھیلا کرتے ہیں جسے وہ اپنی زبان میں (ASSOCIATION OF IDEAS) یعنی تسلسلِ خیالات کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جب وہ دیوار کہتے ہیں تو سننے والے کا دھیان اگر اس سے اینٹ یا دروازے یا پردے کی طرف جاتا ہے تو وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہ شخص کس قماش کا آدمی ہے۔ لیکن لیٹن امریکہ کے نام کے ساتھ جو تصور آپ کے ذہن میں آتا ہے اس سے کوئی ماہر علم النفس آپ کے بارے میں صحیح یا غلط اندازہ نہیں لگا سکتا۔ کیونکہ اکثر آدمیوں کے ذہن میں اس لفظ کے سننے کے ساتھ ہی لامحالہ ایک ہی خیال آتا ہے۔ اور وہ ہے انقلاب کا۔ کیونکہ لیٹن امریکہ ہے بھی انقلابات کی سرزمین اور واقعہ یہی ہے کہ سالہاسال سے وہاں انقلابات رونما ہوتے رہے ہیں اور آج بھی موقع ملے تو ان کا علم کبھی کبھی بلند ہو جاتا ہے

وہ بیس ممالک جنہیں مجموعی طور پر ہم لیٹن امریکہ کہتے ہیں۔ اپنی زندگی کے لئے ایک دو ایک انقلاب ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ اور اس اعتبار سے ان کے اندر انقلابی روایات کبھی سرد نہیں ہو سکتیں۔ چند برس گزرے کولمبیا میں انقلاب ہوا تھا پھر کیوبا کی باری آئی اور ابھی تھوڑا عرصہ گزرا ارجنٹائن میں پیرون کی حکومت کو ایک قسم کے ایسے انقلاب ہی کے ذریعے ختم کیا گیا تھا جس کی صدائے بازگشت ابھی تک سننے میں آ رہی ہے۔ حقیقت میں لیٹن امریکہ کے انقلابات کی یکسر طور پر مذمت نہیں کی جا سکتی۔ اکثر حالات میں وہ ملک کی ایک بہت بڑی اکثریت کی سیاسی خواہشات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ گو ان انقلابی روایات سے قطع نظر بعض اوقات دنیا کے بعض ممالک سے بے خبری یا غلط اطلاعات کی بنا پر کئی قسم کی الٹی سیدھی باتیں بھی چپک جاتی ہیں مثلاً لیٹن امریکہ ہی کے ممالک کے سلسلے میں برازیل کا خیال آتے ہی بعض آدمیوں کے تصور میں یہ خیال گھومنے لگتا ہے کہ وہاں لوگ شاید صرف کافی اگاتے ہیں کافی بھونتے ہیں اور کارمن مرانڈا قسم کی عورتیں پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح ارجنٹائن کا ذکر بھی بعض اوقات ڈکٹیٹر قسم کے عمدہ رخشہ انگریزی گھوڑے کھیلنے والے کروڑ پتی یا شہسوار گاؤشو کی عجیب الخلقت تصویر ذہن میں لے آتا ہے۔ اسی طرح میکسیکو کا خیال آتے ہی قدیم ازٹیک یا مایا تہذیب کے خون آشام انسانوں کی خوفناک شکلیں تصور میں گھومنے لگتی ہیں۔

لیکن لیٹن امریکہ سے محض گوشت اور تیل کافی اور اناج، ٹین اور تانبہ ہی باہر کی دنیا کو نہیں بھیجا جاتا۔ بلکہ بعض نہایت جلیل القدر سیاسی خیالات بھی یہیں سے براہِ راست دستیاب ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر دنیا کو سب سے پہلے اسلحہ کی حد بندی کا تصور اس صلح نامے کی دفعات سے ملا تھا جس پر ۱۹۰۲ء میں ارجنٹائن اور چلی کی حکومتوں نے اپنی باہمی جنگ کے خاتمے پر دستخط کئے تھے۔ پھر ۱۹۲۵ء میں پیرو اور چلی کے درمیان جب صلح کا معاہدہ ہوا تو انہوں نے اپنے سالہا سال کے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لئے یہ تجویز اس صلح نامے میں بطور شرط درج کی کہ دونوں ملکوں کے سکولوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ کی کتابوں میں سے ان تمام باتوں کو یکسر حذف کر دیا جائے گا جنہوں نے ہمیشہ تعصب اور غلط فہمیوں کو پیدا کر کے جھگڑوں کو طول دیا تھا۔

لیکن سیاست سے قطع نظر خود ثقافتی زندگی میں لیٹن امریکہ کے فنکاروں نے کیا نہیں کیا۔ میکسیکو کے مصور ریورا اور اوروزکو کے نام کس نے نہیں سنے جو ہو چکے ہیں۔ برازیل کے کمپوزر ولا لوبوس اور میکسیکو کے کارلوس شاویز کس سے چھپے ہیں؟ اسی طرح شعر و ادب کی دنیا میں بھی

کی نوبل انعام یافتہ شاعرہ گیبرئیلا مسٹرال، پیرو کے نامور شاعر سیزر ابسیدیا، وینزویلا کے امورکا ئے ... بلاشبہ لاطینی امریکہ کے ... کے ادباء کی صفِ اول میں نظر آتے ہیں۔ لیکن میرا شمار خود ان لوگوں میں ہے جو عام طور پر ہر دوسرے ملک کے بارے میں ... مستعار ... رکھتے ہیں چنانچہ جب ... کے شہر ... سے میرا جہاز میکسیکو کی طرف اڑا تو میرے تصور میں وہ فلمیں گھومنے لگیں جن میں میکسیکو کو ... دکھایا گیا تھا۔ جب قانون ... تو سوچنے لگا خدا جانے میکسیکو سٹی میں ان دنوں قانون شکنی کی کیفیت کیا ہوگی اور "ڈولا" اور "زپاٹا" کے ... میں ... لیکن پھر شام کے وقت دور سے دھندلی فضا میں وہ آتش فشاں پہاڑ نظر آنے لگے۔ جو میکسیکو کے قریب ہی واقع ہیں۔ اور جانے کیوں شام کے دھندلکے کی اس پر سکون فضا نے میرے دل کو ایسی تسکین بخش دی جس سے میں دفعتاً یوں محسوس کرنے لگا گویا میں دیکھے ہوئے لوگوں کی طرف جا رہا ہوں۔

جب مستقر کی کھلی فضا سے چل کر میں مسافروں کے ہال میں داخل ہوا تو سب سے پہلی چیز جس نے میری نظر کو اپنی طرف کھینچا۔ سامنے کی دیوار پر ایک بہت بڑی تصویر تھی جس پر لکھا ہوا تھا "فضا پر انسان کی فتح" اس تصویر میں رائٹ برادران سے لے کر امیلیا ایئرہارٹ تک ان تمام جرأت مند اور اولوالعزم انسانوں کے کمالات کی داستان درج تھی جنہوں نے ہوائی کرّے کی پنہائیوں اور وسعتوں کی انجانی دنیا کو فتح کر کے ارضی کرّے کے الگ تھلگ ملکوں کو آج ایک دوسرے کا ہمسایہ بنا ڈالا ہے تصویر اتنی حسین اور جاذبِ نظر تھی کہ میں دیر تک کھڑا اسے دیکھتا رہا اور یہ بات مجھ پر بعد میں کھلی کہ میکسیکو سٹی کے قیام کے دوران میں اس نوعیت کی تصویریں میرے لئے میکسیکو کی عظمت کو سمجھنے میں کس حد تک ممدو معاون رہیں گی۔

اتفاق سے میرے قیام کے انتظامات اقوامِ متحدہ کے ادارے کے ایسے نفاست پسند نمائندے کے ذمے تھے جس نے پاکستان سے وارد ہونے والے کم حیثیت اجنبی کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ اس کا مختصر سا قیام شہر کے سب سے گراں قیمت اور فیشن ایبل ہوٹل میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہوائی اڈے سے کار سیدھی مجھے ڈیل پراڈو ہوٹل میں لے کر پہنچی تو اس کی عمارت کی نفاست اور عالیشان کمروں کی تزئین اور سجاوٹ، روشنیوں کی چکاچوند، خدام کے ملبوسات کی زرق برق کو دیکھ کر مجھے احساسِ کمتری سے ذہنی الجھن سی ہونے لگا۔ اس ہوٹل کے پورے سات سو کمروں میں سے میرا کمرہ آٹھویں منزل پر واقع تھا۔ جس کی کھڑکیوں کے سامنے دور فاصلے پر ستاروں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے میکسیکو سٹی کے وہ شہرۂ آفاق وہ آتش فشاں پہاڑ تھے جن کی سفید برفانی چوٹیاں چاندنی رات کی خنک روپہلی روشنی میں دو سن رسیدہ انسانوں کے سفید سروں کی طرح ان کی عظمت اور بزرگی کی وضاحت کر رہی تھیں۔ نیچے ایک طرف کو وہ دلکشا باغیچہ تھا جس کے گھنیرے درختوں، گھاس کے تختوں اور پھولوں کی کیاریوں میں بکھری ہوئی برقی روشنیاں میرے کمرے کی بلندی سے جگنوؤں کی طرح چمک رہی تھیں۔ سامنے روشنیوں کا ایک بے پناہ سیلاب تھا جس میں شہر کے بازار اور گلی کوچے یکسر ڈوبے ہوئے میکسیکو سٹی کی کائنات شبینہ کو حرارت اور رنگینی بخش رہے تھے۔

شام کے کھانے کے لئے جب میں ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت سی ہوئی کہ چھتے ہوئے کمرے کا فرش گھاس کا ایک وسیع و عریض ہرا بھرا تختہ تھا۔ جس پر ہر طرف کھانے کی میزیں لگی ہوئی تھیں اور جس کو مہمانوں کے ہجوم اور خدام کی ٹولیاں اپنے پاؤں سے روند رہی تھیں۔ میں اپنی میز پر بیٹھ گیا تو میری نظر وہ کرفرش کی حسین گھاس پر گئی لیکن پھر جب میں نے غور سے دیکھا تو مجھے ایک نظر یوں دکھائی دیا گویا یہ گھاس نہیں کچھ اور ہی چیز تھی۔ رفعِ استعجاب کی خاطر میں اسے چھو کر دیکھنا چاہتا تھا مگر سوچتا تھا کہ دیکھنے والے ... کیا خیال کریں گے۔ آخر میں نے تجسس کے احساس سے مغلوب ہو کر لیکن اپنے پاؤں پر پھینکا اور جھک کر اسے اٹھانے کے بہانے جلدی جلدی دو تین مرتبہ ہاتھ سے فرش کی سطح کو چھوا تو مجھے پہلی مرتبہ اس امر کا علم ہوا کہ یہ گھاس کا تختہ نہیں بلکہ ایک بیش قیمت قالین تھا۔ جو ہوبہو گھاس کا ایک ایسا تختہ تھا کہ بصارت اور لمس کو اس پر ہر طرح گھاس ہونے کا شبہ گزرتا تھا۔

اس کمرے میں سامنے کی طویل دیوار پر لکڑی کے منقش چوکھٹے میں ایک سرخ بانات تنی ہوئی تھی، جس کی سادگی سے کمرے کے حسن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ بعض اوقات سادہ قسم کی عام چیزوں میں ذرا سا اجتہاد کتنا حسن پیدا کر دیتا ہے۔ میں ابھی یہ غور کر ہی رہا تھا کہ اگر کہیں اور جگہ ہوتی تو شاید کمرے کی تزئین کے لئے دیواروں پر پرانے استادوں کی تصاویر کے پرنٹ چوکھٹوں میں ڈال کر آویزاں کر دیئے جاتے کہ اتنے میں میرا مقامی ساتھی مجھے شہر کی سیر کے لئے لینے آ گیا۔ باتوں باتوں میں ڈرائینگ روم کے قالین اور دیوار کی بانات کا ذکر چھڑ گیا۔ میرے ساتھی نے مسکرا کر کہا وہ بانات محض تزئین کی خاطر نہ تھی بلکہ اس سرخ پردے کے پیچھے میکسیکو کا ایک ایسا فنی شاہکار پوشیدہ تھا جس کی موجودگی نے نہ صرف اس ہوٹل کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا تھا بلکہ ملک بھر میں قریب قریب فساد کی آگ لگا دی تھی اور پھر اس نے بتلایا کہ اس پردے کے پیچھے دیوار پر ایک بہت بڑی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جسے ۱۹۴۷ء میں میکسیکو کے شہرۂ آفاق مصور دیاگو ریویرا نے حکومت کی فرمائش پر تیار کیا تھا۔ اس تصویر میں جو میکسیکو کی معاشرتی اور سیاسی تاریخ کے ایک پہلو کی نظریاتی تفسیر ہے۔ ریویرا نے ملک کے جلیل القدر سیاسی قائد خوارز کے ایک مخالفِ کلیسا ساتھی کے ہاتھ میں ایک پرچہ کاغذ پر یہ حروف لکھ دیئے تھے: کہ خدا کا کوئی وجود نہیں شاید عہدِ سابق کے لوگ انہیں خیالات کے قائل ہوں گے۔ لیکن آج کے رومن کیتھولک میکسیکو کا اب کوئی شخص یہ فقرہ لکھ کر چاہے وہ سیاسی آزادی کی خاطر بھی زبان پر لا کر عوام کی یورش سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

چنانچہ میکسیکو کے آرچ بشپ نے ہوٹل کے افتتاح پر اسے اپنی دعاؤں کی برکت سے محروم کر دیا۔ شہر کے لوگ اس تصویر سے ایسے برافروختہ ہوئے کہ طلبا نے ہوٹل پر دھاوا بول دیا۔ فرنیچر توڑنے، پردے پھاڑنے اور ہوٹل کے املاک کو نقصان پہنچانے کے بعد فسادیوں نے تصویر میں سے معصیت اور کفر کے یہ الفاظ کھرچ ڈالے اور اس عمل میں خود ریویرا کی اپنی شبیہ بھی جو اس تصویر کے اندر تاریخی شخصیتوں کے جھرمٹ میں موجود ہے چھری سے کھرچ کر بگاڑ ڈالی۔ ہوٹل کو بچانے کے لئے منتظمین کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ فوراً تصویر پر سرخ بانات کا پردہ ڈال دیں اور اپنے الحاد پر اظہارِ تاسف کر کے معاملے کو خوفناک صورت اختیار کرنے سے بچا لیں۔

میں نے پوچھا کیا یہ تصویر کسی طرح دیکھی جا سکتی ہے۔ میرے ساتھی نے جواب دیا یہ بات مشکل نہیں لیکن اسے کچھ ایسا آسان بھی نہ سمجھو۔ دراصل اسے دکھانے میں ہوٹل کے منتظمین ہمیشہ تامل سے کام لیتے ہیں اور عام طور پر انکار کر دیتے ہیں لیکن اگر میں اپنے ذاتی رسوخ کو کام میں لاؤں اور تمہیں پاکستان کا ایک اہم فرد کہہ کر پیش کروں تو شاید وہ (تمہارے گھٹے ہوئے سر، فربہ جسم اور عجیب و غریب ہیئت کذائی سے تمہیں پاکستان کی کوئی جلیل القدر شخصیت سمجھ کر) مان جائیں۔ آزما کر دیکھنے میں کوئی ہرج نہ تھا۔ سو جب پندرہ منٹ کے بعد میرا ساتھی مسکراتا ہوا واپس آیا تو میں سمجھ گیا کہ بات بن گئی ہے اور ہوٹل والوں نے پاکستان کے ایک حقیر فرد کی عزت رکھ لی ہے۔ جب میں بانات کے سامنے اپنے ساتھی اور ہوٹل کے ایک کارکن کے ساتھ پہنچا تو میرے جذبات کی وہی حالت تھی جو کسی دلفریب تماشے کو دیکھنے سے پہلے بچوں کی ہوتی ہے۔ گھبراہٹ، خوشی، تجسس اور حیرت کے مشترک جذبات میں میرا دل ڈوبا ہوا تھا اور تعجب کر رہا تھا کہ اس پردے کے پیچھے سے کیا چیز برآمد ہو گی۔ ہوٹل کے کارکن نے ایک طرف کو لٹکی ہوئی سرخ ڈوری کو کھینچا اور بانات کھلتی ہوئی اوپر اٹھ گئی۔ سامنے دیوار پر ریویرا کا وہ شاہکار تھا جس نے اپنی آفرینش کے ساتھ ہی ایک ہمہ گیر ہنگامہ برپا کر کے خود موت کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

اس تصویر میں میکسیکو کی زندگی کے کئی پہلوؤں، کئی عہد اور کئی واقعات کی داستان موجود ہے۔ جن کے بیان کے لئے ریویرا نے بے شمار افراد کو اس تصویر میں سمو دیا ہے۔ اس ہجوم میں ڈاکو اور لیڈر، سیاسی قائد اور مذہبی پیشوا، مزدور اور غلام، فوجیں اور سپاہ، سوار اور پیادے، پولیس اور پہرہ دار، تاجر اور کاروبار کرنے والے، پھلوں کے فروش اور خوانچہ بردار، اخبار نویس اور مصور، شاعر اور ادیب، بچے اور بوڑھے، عورتیں اور مرد، رحمت اور موت کے فرشتے غرضیکہ

اتنی بڑی تصاویر میں افراد اور ہجوم کو یکجا کر دیا ہے کہ ایک نظر میں مختلف انسانوں کے چہروں پر جذبات کے آثار، جسموں اور اعضاء کی ترتیب و تقسیم، رنگوں کی آمیزش اور روشنی اور عکس کے امتزاج کسی پر بھی توجہ نہیں ٹھہرتی، اور نگاہیں ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف دوڑنے لگتی ہیں۔ جس کے ساتھ ساتھ خود نظر کو بھی [illegible] پھیلاتا ہے۔

تصویر کے بائیں جانب میکسیکو کے ہسپانوی فاتح کورتیز کی شبیہ ہے۔ جس کے ہاتھ اس خون سے آلودہ ہیں جو اس نے میکسیکو کی سرزمین اور ملک کے اصل وارثوں کے کشت و قتل سے بہایا تھا اور اس کے قرب میں وہ پادری ہیں جنہوں نے ازٹیک باشندوں کو عیسائیت کا پیرو بنانے کی ایک وسیع گیر تحریک چلائی تھی اور اس سے آگے جنرل انا میکسیکو کے ساتھ والے ٹیکساس کی چابیاں شکست کے بعد امریکی جرنیل کے حوالے کر رہا ہے اور ان کے قدموں میں چند فلاکت زدہ انڈین مرد عورتیں محنت مزدوری کی تھکن سے بے حال پڑے ہیں۔ ذرا آگے خوار نیرو ہے جس کے ہاتھ میں [illegible] کی صورت میں پکڑا ہوا ہے یہیں صفِ اول میں خود نیرو را کی شبیہ ہے جس کی ناک اور ماتھے سے [illegible] کا ایک حصہ بھی [illegible] ہاتھوں کھرچا ہوا جوں کا توں موجود ہے۔ اس سے آگے انقلاب کے ہنگامہ اور کشت و خون کا نظارہ ہے اور پھر وہ منظر ہے جس میں پولیس کے اہل کار ایک شریف طبع انڈین کو اس گناہ پر زدوکوب کر رہے ہیں کہ اس نے سرا لیما کے باغیچے میں قدم رکھنے کی جسارت کی تھی۔

یہ تصویر بھی دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ جس سے میکسیکو کی حکومت ملک کے افراد کو اپنے وطن کی تاریخ سے مستقل طور پر باخبر رکھنا چاہتی ہے۔ میرے ساتھی نے کہا ہمارے ملک کی ایک بہت بڑی بدقسمتی یہ تھی اور اب تک ہے کہ ہمارے ہاں ملک کے کئی حصوں میں لوگ تعلیم کی نعمت سے محروم ہیں ایسے لوگوں کو اپنے ملک کی تاریخ سے آگاہ کرانے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ انہیں اپنی تاریخ کے اہم واقعات مستقل تصویروں کی صورت میں جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں تاکہ ان کی معلومات ملکی تاریخ سے تہی نہ رہ جائیں۔ بعد میں میں نے خود میکسیکو سٹی کی سیر سے اندازہ لگایا کہ جس طرح لاہور کی دیواریں سینما اور مذہبی جلسوں اور دواؤں کے اشتہارات سے جگہ جگہ اٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح میکسیکو سٹی میں دیکھنے والے کو پبلک عمارات کی اندرونی دیواروں پر جگہ جگہ وہ تصویریں دکھائی دیتی ہیں جن پر مصوروں نے ملک کی ساری تاریخ بیان کر کے رکھ دی ہے۔ محکمہ تعلیم کی عمارت میں جائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک انچ جگہ بھی ان تصویروں سے بچ نہیں سکی۔ یہاں تک کہ سیڑھیوں کے ساتھ کی دیواریں بھی اپنی ہلکی روشنی میں انہیں تصویروں سے بھری ہیں۔ لائبریری، سیکرٹریٹ، دفاتر کے کمرے سب کی دیواریں میکسیکو کی تاریخ کے کسی نہ کسی واقعے کو آپ کے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں۔

یہ تصویریں زیادہ تر ملک کے انڈین باشندوں اور مزدوروں کی اس جدوجہد اور تگ و دو کو بیان کرتی ہیں جو انہوں نے صدیوں سے استحصال (EXPLORTATION) کے خلاف جاری رکھی ہے۔ ان میں دیہی رسوم و رواج، عوامی کام کاج، کھیل کود، ناچ گانے، پیدائش اور موت، شادی اور بیاہ کی تقریبات کے ساتھ ساتھ کانوں اور کارخانوں کی زندگی، سمندر، ہوا اور سڑکوں پر نقل و حرکت کے ساتھ اور جدید طرز طریقۂ فنون، صنعت و حرفت، گھریلو دستکاریاں، سائنس کی ایجادات سب کا حال ملتا ہے اور خود میکسیکو کی تاریخ کا کوئی باب ایسا نہ ہوگا جس کی تفصیل ان تصویروں سے حاصل نہ ہو سکی ہو۔ ملک کے اولین وحشی باشندوں سے لے کر عصر حاضر کے تمدنی معاشرہ کی پیش کش، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہوگا جس کی عکاسی نہ کی گئی ہو۔ یہ تصویریں میکسیکو کے افراد کی زندگی کا کچھ ایسا حصہ بن گئی ہیں کہ دکانوں کی دیواروں پر بھی یہ تصویریں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ چنانچہ میں نے بعد میں میکسیکو سٹی کی سب سے بڑی دکان سارنبرن میں بھی دیکھا کہ یہی تاریخ سے متعلق تصویریں ہر طرف دیواروں پر بنی ہوئی ہیں اور [illegible] اور فنی کوشش ہے کہ اپنی ضرورت کا خیال ان تصویروں کی دلکشی کے احساس کے نیچے دب جاتا ہے اور یاد نہیں رہتا کہ انسان [illegible] خریدنے کے لئے آیا ہے نہ کہ تصویروں کی دید کے لئے۔

میرے ساتھی نے کہا کہ ان تصویروں کے علاوہ ان پڑھ لوگوں کی بھی راہنمائی کی دوسری صورت یہ تھی کہ شہر کے بازاروں اور گلیوں کے نام مختلف ہنگامی قسم کے افراد اور بے معنی اشیاء ہی سے منسوب نہ کئے جائیں بلکہ انہیں ایسے نام دیئے جائیں کہ ان کے توسط سے ہماری تاریخ کے اہم ایام لوگوں کو بھی ذہن نشین ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہر کی سب سے اہم سڑک کا نام "پاسیو ڈی لا ریفارما" ہے۔ تاکہ اس کے ذریعے اس جنگ کی یاد تازہ رہے۔ جو اصلاحات کے لئے ملک میں لڑی گئی تھی اور "اوینیدا ڈیل کانستی ٹیوسیون" کا نام عوام کو اس دستور کی یاد دلاتا رہے۔ جو انہوں نے ایک خونی انقلاب برپا کر کے حاصل کیا تھا۔ ایک سڑک کا نام "سنکو ڈی مایو" ہے۔ اس فتح کی یادگار ہے جو میکسیکو نے ۵ مئی ۱۸۲۶ء میں فرانس کے غیر ملکی قبضے کو ختم کرنے کے بعد حاصل کی تھی۔ ایک سڑک کا نام ۵ فروری، ایک کا نام ۱۶ ستمبر، ایک کا نام ۲۰ نومبر ہے اور یہ سب کسی نہ کسی اہم تاریخی واقعے کی یاد تازہ کرتی ہیں ایک شارع کا نام "آرٹیکولو ۱۲۳" ہے۔ اور اس سے ملکی دستور کی اس اہم دفعہ کی طرف اشارہ ہے جس کا تعلق مزدوروں کی بہبودی اور نگہداشت سے ہے۔

ہم باتیں کرتے ہوئے نکلے تو ذکر معلوماتِ عامہ اور تعلیم کا چھڑ گیا۔ میں اپنے ساتھی کو بتانے لگا کہ کس طرح غیر ملکی حکومت نے میرے اہلِ وطن کو ڈیڑھ صدی تک تعلیم سے بیگانہ رکھا اور آج اس کے نتائج ہمارے ملک کی ترقی کے لئے کس قدر حوصلہ فرسا ثابت ہو رہے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اپنے ملک کے ان خوش قسمت لوگوں کے محدود زمرے میں ہوں۔ جو تعلیم کی نعمت سے بہرہ ور ہیں۔ اور میں نے اسے بتایا کہ اس زمرے کے افراد ایسے خطے کے باشندوں کی تعلیم کے لئے جن میں طبائع کے اختلاف، بولیوں کی افراط اور ثقافتی تنوع کی بھرمار ہے۔ کن روح فرسا مسائل کے حل کو تلاش کر رہے ہیں تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور وہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ بولا "یہ مسئلہ جس کی طرف آج آپ کی توجہ لگی ہوئی ہے، اپنے تمام تر ہولناک پہلوؤں کے ساتھ اب سے دس برس قبل ہمارے بھی پیشِ نظر تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اپنی بساط کے مطابق اس کا ایسا ایک عملی حل سوچ لیا جس کے نتیجے میں ہماری حالت بہت سدھر گئی ہے"

اور پھر اس نے مجھے اس مسئلے کا حال بتایا:۔

اگست ۱۹۴۴ء میں جب کہ دنیا کے دوسرے ملک جنگِ عظیم کے ہولناک ہنگامے میں ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے میکسیکو میں صدر مینوئیل اویلا کماچو نے اپنے وطن کے ایک ایسے خطرناک دشمن سے جنگ کا اعلان کیا جس نے ہسپانوی فتح کے زمانے سے میکسیکو کے عوام کو گھیر رکھا تھا اس نے اپنے اعلان میں لوگوں سے کہا "تمہارا سب سے بڑا دشمن جس کی ریشہ دوانیوں سے میکسیکو فلاکت و نکبت کے غار کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے، ہماری آدھی آبادی کی ناخواندگی کا مسئلہ ہے۔ لیکن اگر میکسیکو کا ہر پڑھا لکھا مرد، عورت اور لڑکا اس بات کا ذمہ لے کہ وہ ایک اور فرد کو لکھنا پڑھنا سکھائے گا تو یہ دشمن ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو جائے گا۔"

اس تحریک کا آغاز کسی بڑی مبارک گھڑی میں ہوا تھا کہ اس کے اعلان کے ساتھ ہی سارے ملک نے ایک نئے افتخار کے احساس سے صدر کماچو کی آواز پر لبیک کہا اور جہالت کے خلاف ایک مستقل محاذ ہر طرف قائم ہو گیا۔ شاید ہی کوئی آدمی ہو گا جس نے اس جہاد میں حصہ نہیں لیا۔ شہر کے دفتروں میں کام کرنے والوں نے دیہات کے کسانوں کو پڑھایا۔ آقاؤں نے ملازموں کو تعلیم دی۔ بچوں نے بزرگوں کے درس کا ذمہ لیا اس کے نتیجے میں وہی کھردری انگلیاں جو ابھی سے پہلے ہل سے ہٹ کر کسی چیز کو تھامنے کا تجربہ نہ رکھتی تھیں۔ قلم سے زندگی کی بے جان تصویروں میں حیات کے نئے نئے رنگ بھرنے لگیں۔ سڑکوں پر کھڑے ہوئے نشانات، اشتہاروں پر لکھے ہوئے حروف، کتابیں اور اخبارات جو اس وقت تک ایک بے معنی اور دور از کار چیزیں تھیں، اچانک زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں بن کر قاریوں کی ایک نئی قوم کی توجہ کو علم و ادب کی ایک جنتِ گم گشتہ کی طرف کھینچنے لگیں۔ سارے ملک

میں تعلیم و تعلم کا ایسا چرچا ہوا کہ وہ فرسکے تمام معیشی اور سیاسی مسائل اس کے سامنے ہیچ ہو گئے۔

مگر وہ حالات جنہوں نے اس تحریک کی طرح رکھی اپنی جگہ پر بڑے افسوسناک تھے۔ میکسیکو جس کی آبادی دو کروڑ باشندوں سے اوپر ہے ۱۸۲۱ء میں ہسپانیہ کی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے ساتھ ہی اندرونی سیاسی خلفشار، خانہ جنگیوں، انقلابات اور دوسرے ہنگاموں میں کچھ اس طرح الجھا رہا ہے کہ اس کے اربابِ نظم و نسق کو سو برس تک وہ اطمینان اور فراغت میسر نہ آسکے جس سے ملک کی تعلیمی ضروریات کی طرف متوجہ ہو سکتے۔ آج سے تیس پینتیس برس پہلے تک شاید اس کی ضرورت بھی کچھ ایسی زیادہ نہ تھی کیونکہ شہروں سے باہر بسنے والی آبادی اپنی ہی دنیا میں کچھ ایسی مگن تھی کہ اس کے لئے علم اور معلومات میں کوئی کشش نہ تھی لیکن پھر اچانک ریل گاڑی نے شمال اور جنوب کے فاصلوں کو کم کر دیا لیکن بیشتر بعید مقامات کو ایک دوسرے کے پاس لا کر ملا دیا۔ ہوائی جہاز اور ریڈیو نے مکان و زمان کی رہی سہی مشکلات کا حل بھی پیش کر دیا۔ اب چارہ نہ تھا کہ میکسیکو اپنی جاہل آبادی کی حالتِ زبوں کی طرف متوجہ ہوتا۔

میکسیکو کے اربابِ حکومت نے محسوس کیا کہ آج کی دنیا میں عزت کا مقام حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ صنعت کو فروغ دیا جائے صنعت کو فروغ دینے کے لئے انہیں تکنیکی ماہرین کی ضرورت تھی مگر انہیں باہر سے بلانے میں جو نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں اور جو گراں قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اس کا حال انہیں اپنی گذشتہ تاریخ سے معلوم ہو چکا تھا تو پھر اپنے ملک کے افراد ہی کو تعلیم سے کیوں نہ لیس کیا جائے؟ لیکن جوانوں کے علاوہ ان ان پڑھ بالغوں کا کیا جائے جو برسوں سے جہالت کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں اور جنہیں لکھنے پڑھنے میں کوئی کشش دکھائی نہیں دیتی ۔ ؟

آخر ۱۹۴۴ء میں تعلیم کا ایک ہمہ گیر پروگرام مرتب کیا گیا جس کی تکمیل کے لئے میکسیکو کے ایک جواں ہمت فرزند توریز بودیت کو قیادت کے فرائض سونپے گئے بودیت نے سب سے پہلے موجودہ سکولوں کی عمارات میں اصلاحات کا کام شروع کیا اس نے فیصلہ کیا کہ ملک میں وہی سکول تعلیم کا کام جاری رکھیں گے جو پڑھنے والوں کے لئے اپنی تعمیر اور تزئین اور آرائش کی وجہ سے باعثِ کشش ہوں گے۔ تمام سکول ہوادار، روشن، خوشنما اور مزین کئے گئے۔ نئے اسکولوں کے لئے نئے نقشے اور خاکے تیار کئے گئے جس میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ علاقے کے لوگ ان کی پرکشش نوعیت سے ایسے متاثر ہوں کہ وہ ان تعطیلات میں وہ انہیں ثقافتی سرگرمیوں کے لئے استعمال کرنے کی ضرورت محسوس کریں۔

پھر جب تک نئے اسکول تعمیر ہوں موجودہ سکولوں میں درس کے لئے تقسیم اوقات کا ایسا لائحہ عمل تجویز کیا گیا کہ دن بھر میں کئی جماعتیں شریک درس ہو سکیں۔ اور ایک ادارے کی بجائے کئی ادارے اسی جماعت سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کے بعد بودیت نے معلموں کی تنخواہوں کی طرف توجہ دی۔ ہمارے اپنے ملک کی طرح میکسیکو کے استاد بھی بڑی تھوڑی تنخواہ پر کام کرتے تھے۔ اس کی بنا پر ذہین اور موزوں لوگ اس کام کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ بودیت نے معلمی کو ایک باعزت اور پرکشش ذریعہ معاش بنانے کے لئے فیصلہ کیا کہ تمام استادوں کو فنِ تدریس کا ایک شش سالہ کورس طے کرنا چاہئے یہ کورس سکول یا کالج میں داخل ہونے کی بجائے گھر بیٹھے ڈاک کے ذریعہ مکمل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ پہلے سال کی کامیاب تکمیل پر استادوں کی تنخواہوں میں ۱۹ فیصدی اضافہ کیا گیا اور دوسرے پر مزید ۱۹ فیصدی اگیا چھ سال کے خاتمے پر استاد کی تنخواہ دگنی کر دی گئی۔

توریز بودیت نے ایک اور کام کیا کہ اس نے مصوری کے لئے ایک بہت بڑی درسگاہ کا افتتاح کیا جس میں اپنے ملک کے تمام نامور مصوروں کو تعلیم دینے کی ترغیب دلائی اور اس کے دروازے دنیا کے تمام لوگوں پر کھول دیئے اس اسکول میں شامل ہونے والوں کے لئے کاغذ، رنگ، ملال سب مفت مہیا کئے جاتے ہیں تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ حد یہ ہے کہ بیرونی علاقوں میں مناظر کی تصویر کشی کے لئے طلباء کے سفر کا خرچ بھی سکول

کا فرض ادا کیا جاتا ہے۔

گر بودیت اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھا کہ کوئی ملک اس وقت تک مہذب اور تعلیم یافتہ نہیں کہلا سکتا جب تک ملک کے اس طبقے کو جو سکولوں میں جانے کی عمر سے تجاوز کر چکا ہے۔ جاہل اور علم سے بے بہرہ رہنے دیا جائے۔ چنانچہ اسے تعلیم بالغاں کا خیال آیا اور اس کا ذہن اس مشکل کے حل کی تدبیریں سوچنے لگا تو اس نے ایک تجویز نکالی اور حکومت کو مشورہ دیا کہ فوراً ایک ایسا قانون نافذ کیا جائے جس کی رو سے ہر پڑھا لکھا شخص ایک ناخواندہ کو مقررہ میعاد کے اندر اندر پڑھانے کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔

قانون کے نافذ ہونے سے پہلے اس تحریک کے مقاصد اور اس کے فوائد سے ہر شخص کو آگاہ کرنے کے لئے ایک بہت بڑے پیمانے پر تبلیغ کا اہتمام کیا گیا۔ ریڈیو، اخبارات، اشتہارات، گھومنے والی ٹرکوں، سفری تماشوں، ڈاک کے ٹکٹوں غرض کہ ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو اس تحریک کی اہمیت سے آگاہ کیا گیا۔ اس کے بعد جیسے ہی قانون نافذ ہوا رجسٹروں میں ہر گھر کے پڑھے لکھے لوگوں کے ناموں کی فہرستیں بنائی گئیں۔ اور ان کے آگے ان لوگوں کے نام درج کئے گئے جنہیں پڑھانے کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی تھی۔ شرط یہ تھی کہ چھ ماہ کے اندر اندر ہر شخص اپنے شاگرد کو پڑھا لکھا کر تعلیم کے ایک معیار تک پہنچا دے۔ قانون کے نافذ ہوتے ہی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میکسیکو بذاتِ خود ایک درس گاہ کا نام ہے جہاں ہر وقت ہر شخص کتاب کھولے بیٹھا یا پڑھ رہا ہے۔ یا پڑھا رہا ہے۔ اور دونوں جانتے ہیں کہ چھ ماہ کے بعد جو امتحان ہونے والا ہے اس میں اگر طالب علم نے پڑھنے لکھنے کا کوئی ثبوت نہ دیا تو دونوں کی خیر نہیں۔ ایک مختصر سے عرصے میں حکومت نے ایک کروڑ کاپیاں چھپوائیں جو تعلیم بالغاں کے لئے خاص طور پر تیار کی گئی تھیں اس کے ساتھ لاکھ نوٹ بک اور پچاس لاکھ نقول اس ہدایت نامے کی تیار کی گئیں جو پڑھانے والوں کی راہنمائی کے لئے تصنیف کیا گیا تھا اور یہ تینوں کتابیں حکومت نے اپنے خرچ سے ملک بھر میں مفت تقسیم کیں۔

لیکن تھوڑے عرصے کے بعد ایک بہت بڑی عملی مشکل نے اس تحریک میں ایک الجھن پیدا کر دی۔ اور وہ مشکل یہ تھی کہ شہروں کے تعلیم یافتہ آدمیوں کی آبادی غیر تعلیم یافتہ افراد کی نسبت زیادہ تھی لیکن دیہات میں تعلیم یافتہ آدمی مقابلتاً بہت قلیل تعداد میں تھے۔ مثلاً میکسیکو سٹی کے بیس لاکھ افراد میں سے پندرہ لاکھ تعلیم یافتہ تھے۔ اس کے برعکس بعض دیہات میں پانچ سو کی آبادی کے مقابلے میں تعلیم یافتہ آدمیوں کی تعداد تین تین اور چار چار سے زیادہ نہ تھی۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ رضاکاروں کی جماعتوں کو دیہات میں بھیجا جائے جو چھ ماہ کے لئے وہیں سکونت پذیر ہو کر لوگوں کی تعلیم کا اہتمام کریں۔ ان سفری سکولوں کے ساتھ ساتھ ایسے مشن بھی بھیجے گئے جو لکھنے پڑھنے کے علاوہ دیہات کے لوگوں کو صفائی اور زراعت کے جدید اصولوں سے باخبر کریں۔ مکانوں کی تعمیر میں مشورہ دیں اور بیماریوں کا مقابلہ کرنے کے طریقوں سے آگاہ کریں۔ جب یہ بھی کر لیا گیا تو ایک اور مسئلے نے ٹوریز بودیت کی توجہ کو الجھانا شروع کیا۔ میکسیکو میں کوئی باون قومیں بستی ہیں ان میں اکثر اپنی مادری زبانوں کے علاوہ ہسپانوی بھی بول لیتی ہیں لیکن ملک میں تقریباً بارہ لاکھ باشندے ایسے ہیں جو ہسپانوی کا ایک لفظ نہیں جانتے۔ ان کا کیا کیا جائے۔ آخر فیصلہ کیا گیا کہ ان لوگوں کو پہلے اپنی زبان میں لکھنا پڑھنا سکھایا جائے اور پھر بتدریج ہسپانوی سکھائی جائے۔ اور یوں ایک تعلیمی پروگرام کے اندر ایک اور پروگرام شامل کیا گیا اور اس دوہرے پروگرام کی تکمیل کے لئے نئی کتابیں لکھائی گئیں۔ انہیں چھاپنے کے لئے ٹائپ ایجاد کیا گیا۔ اور سکھانے کے لئے معلمین تیار کئے گئے۔

مگر یہ تحریک جو در اصل حکومت نے چلائی تھی ایسی نہ تھی کہ سرکاری چیزوں کی طرح اپنی وقعت کھو بیٹھتی سارا ملک اس تحریک کے فوائد سے متاثر ہو کر اس میں شامل تھا۔ ناشروں کے ایک ادارے نے دنیا کی مشہور کلاسیکی تصانیف کو طبع کر کے کوڑیوں کے مول سارے ملک میں بکھیر دیا۔ ایک ماچس بنانے والی کمپنی نے مصوروں کے مشہور زمانہ شاہکاروں کو اپنی ماچسوں کے اوپر چھاپ کر عوام کو ان تولوں سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ ایک اور مالدار فرم نے بائیچوں

اور میرے ماہروں میں لاؤڈ اسپیکر لگا کر کلاسیکل موسیقی کی تربیت کا اہتمام کیا۔ غرضیکہ جو کچھ جس سے ہو سکا اس نے کیا۔ یہ تحریک ۱۹۴۴ء میں شروع ہوئی تھی۔ پہلے سال کے خاتمے پر پچاس لاکھ ناخواندہ بالغوں کو تعلیم کی سندیں دی گئیں۔ دوسرے سال کے خاتمے پر کوئی پندرہ لاکھ اور ایسے لوگ لکھنے پڑھنے کی سوجھ بوجھ حاصل کر رہے تھے۔ قیاس یہ تھا کہ آٹھ سال میں سارا ملک لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائے گا۔ آج اس تحریک کو کوئی آٹھ سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی بھی کئی ملین آدمی ایسے باقی ہیں جو ہنوز ناخواندہ ہیں۔ ان کی ناکامی کی وجہ میں خود ان کی ذہنی کمزوری کے علاوہ یہ بات بھی شامل ہے کہ بعض علاقوں کی مالی حالت اتنی خراب ہے کہ وہاں کے لوگ اپنی روز مرہ کی جانکاہ زندگی سے ہٹ کر تعلیم کی طرف وہ دل جمعی سے توجہ نہیں دے سکتے لیکن یہ کام جاری ہے اور یہ کام اس قدر عالی مرتبت اور عظیم الشان ہے کہ اگر اصل پروگرام کے برعکس اس کی مکمل کامیابی میں ابھی چند برس اور بھی لگ جائیں تو بھی اس کے برآمد شدہ نتائج شاید اس صدی کا ایک بڑا اور خوش کن معجزہ ہے۔

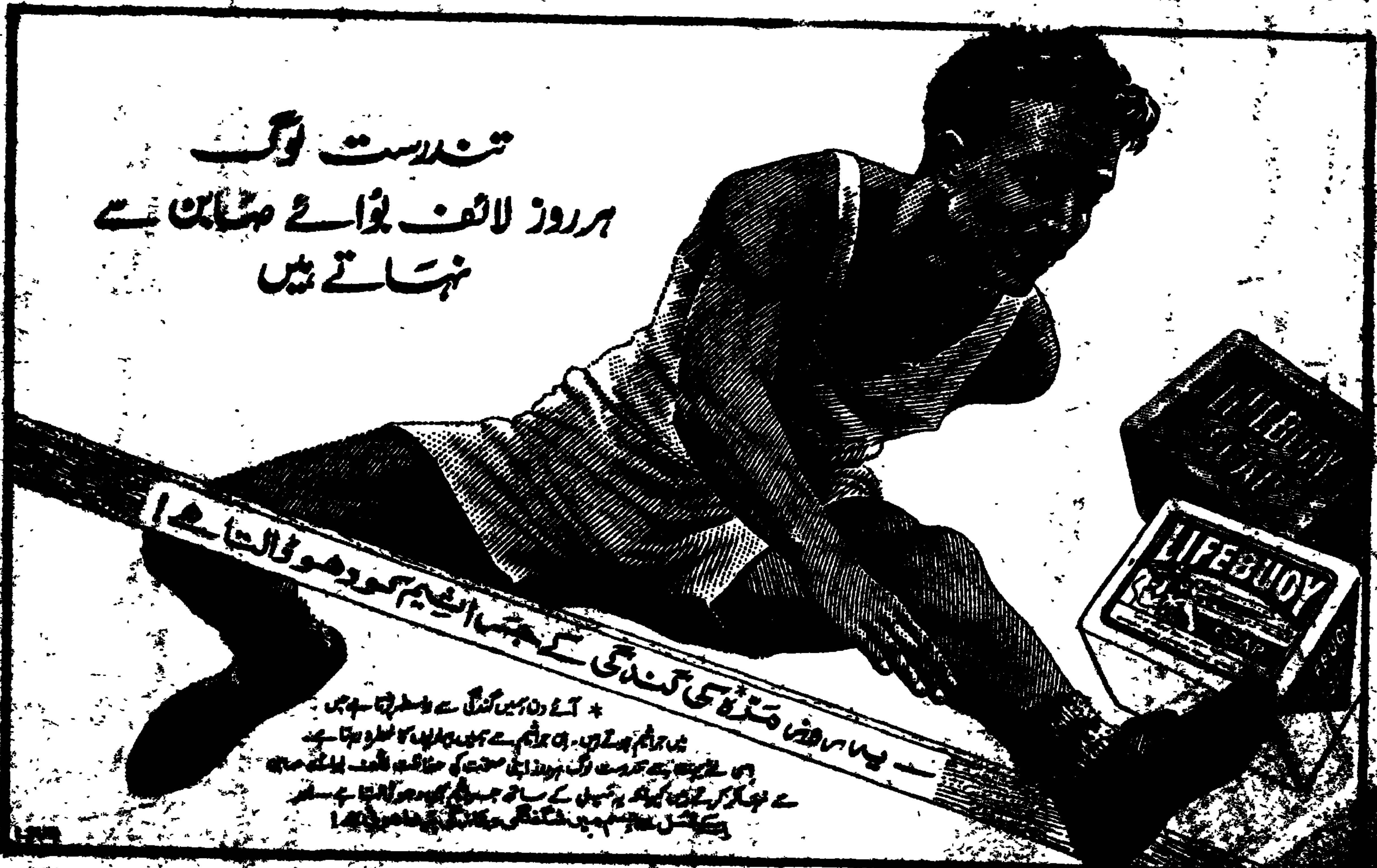
اس تفصیل کو سنانے کے بعد میرے ساتھی نے کہا اگر تم چاہو تو میں تمہیں محکمہ تعلیم کے دفتر میں لے چلوں جہاں تمہیں اس جماعت کے افراد سے ملنے کا موقع مل سکتا ہے جو ہفتے میں ایک تعلیمی مشن کی صورت میں ملک کے اندر ایک دور دراز علاقے میں وہاں کی ان پڑھ اور غیر تربیت یافتہ آبادی کی خدمت کے لئے جا رہے ہیں۔ ان دنوں یہ جماعت محکمہ تعلیم کے ایک حصے میں ٹریننگ لے رہی ہے۔

ہم دفتر میں پہنچے تو میرے ساتھی نے اس مشن کے فرد اعلیٰ سے میرا تعارف کرایا جو ڈاکٹر تھا۔ وہ مجھے لے کر باقی آدمیوں سے ملانے چلا۔ اس مشن میں ایک ڈاکٹر، دو معلم، ایک بڑھئی، ایک معمار، ایک موسیقار، ایک نرس، ایک ماہر زراعت یعنی کوئی دس آدمی تھے۔ اس جماعت کے سب افراد کم و بیش کم عمر افراد تھے۔ یہ جماعت میکسیکو سٹی سے کوئی دو سو کوس اندر کی طرف شمالی علاقے کو جانے والی تھی۔ جہاں اسے کم از کم ایک سال تک وہاں کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا تھا۔ جن کی تعلیم اور تمدنی حالات کو سنوارنے کی ذمہ داری اسے سونپی گئی تھی۔ ان دس افراد میں تین عورتیں بھی تھیں۔ جو زندگی میں پہلی مرتبہ ایسے اہم کام پر روانہ ہو رہی تھیں

مجھے ان سے مل کر دلی مسرت کا احساس ہوا اور میں نے سوچا کاش ہمارے ملک میں بھی کوئی پوریٹ جیسا عالی ہمت نوجوان پیدا ہو جو ہمارے ملک کے بے شمار ناخواندہ لوگوں کو ابتدائی تعلیم سے بہرہ ور کر سکے۔ اور ہمارے ملک کی تاریکی کو اجالے میں تبدیل کر سکے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ دس افراد اپنے ذاتی مفاد اور ذاتی منفعت کو بالائے طاق رکھ کر ملک کے کونے کونے میں علم کی روشنی مشعل لے کر جائیں گے اور صحیح معنوں میں خدمت خلق کریں گے۔ قومیں ایسے ہی جانباز افراد کی خدمتوں سے پھلی پھولتی ہیں۔ میں نے سوچا یہ لوگ کتنے خوش قسمت ہیں کہ میکسیکو کی تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قومی تقاضوں کے پیش نظر آرام اور آسائش کو خیرباد کہا اور ملک کی تعلیمی، ثقافتی اور تمدنی حالت کو بہتر بنانے کا بیڑا اٹھایا۔

آج میں یہاں ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میکسیکو کے یہ اور اس طرح کے کئی اور رضاکار قومی خدمت میں لگے ہوں گے۔ وہ قریہ قریہ اور بستی بستی پھر رہے ہوں گے۔ وہ ایک ایک گھر ایک ایک محلے اور ایک ایک گلی کوچے میں علم کی شمع روشن کر رہے ہوں گے اور کرتے رہیں گے۔


فوراً جھاگ دینے والا سن لائٹ صابن
کپڑے پٹکے بغیر سفید اور اجلے
دھوتا ہے
SUNLIGHT
سن لائٹ صابن
کپڑا بچاتا ہے • محنت بچاتا ہے • پیسہ بچاتا ہے


تندرست لوگ
ہر روز لائف بوائے صابن سے
نہاتے ہیں
گندگی کے جراثیم کو دھو ڈالتا ہے!
LIFEBUOY
SOAP

سہیل عبد حسین

قارئینِ کرام

واللہ مجھے آپ کی خوشامد مقصود نہیں، واقعہ یہی ہے کہ مجھے اپنے قارئینِ کرام سے والہانہ عقیدت ہے لیکن دقت یہ ہے کہ عقیدت مند خواہ کتنا ہی مخلص اور نیک نیت کیوں نہ ہو، اظہارِ عقیدت اگر کسی کے منہ پر کیا جائے تو تنگ نظر لوگ اسے خوشامد ہی تصور کریں گے۔ خود فرمائیے مجھے آپ سے کیا لینا ہے کہ آپ کی خوشامد کروں اور آپ کو کیا پڑی ہے کہ آپ میری نیت پہ شبہ کریں — بہرحال کوئی کچھ ہی کہے مجھے چونکہ عقیدت ہے میں اس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی بات ہے میں اسے کیوں چھپاؤں میرا جی چاہتا ہے کہ میں ہوں اور میرے پیارے قارئین۔ وہ میری تخلیقات پڑھتے رہیں اور میں ان کے ذوقِ سلیم کی داد دیتا رہوں — اور کوئی تیسرا اور دخل در معقولات کے لئے موجود نہ ہو۔

مجھے اپنے قارئین سے عقیدت کیوں ہے اور میں اس کا اظہار کیوں کرتا ہوں —؟ یہ خود مجھے بھی معلوم نہیں، میں ایک بار مبتلائے عشق ہوا تھا جب بھی میں نے اس واردات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا تھا۔ میں نے عقیدت کے بارے میں بھی اس "کیوں" کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ میرے بعض احباب ایسے ہیں جنہیں ہمیشہ میری دوستی سے زیادہ میرا نفسیاتی مطالعہ عزیز رہا ہے ان کا خیال ہے کہ میں اپنے قارئین سے عقیدت کا اظہار اس لئے کرتا ہوں کہ میں اپنے قارئین میں مقبول ہو جاؤں اور میری اہمیت بڑھے — حالانکہ غور کیا جائے تو غریب قاری میرا مطلب ہے معزز قاری کا ادیب کے اہم یا غیر اہم ہونے سے کیا سروکار ہے۔ ادیب خواہ کتنا ہی گھٹیا اور قاری کتنا ہی بد ذوق کیوں نہ ہو دونوں میں مفاہمت پیدا ہو سکتی ہے جو رفتہ رفتہ عقیدت کی صورت اختیار کر سکتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح دو بدصورت اشخاص میں آنکھ لڑ جائے اور عشق ہو جائے۔ عشق کے لئے حسن بانو اور شاہ بہرام ہی کا ہونا کیا لازمی ہے — آخر بات سی کالی لیلیٰ اور بیدِ مجنوں سے چلے مجنوں میں بھی تو عشق تھا نا — قصہ کوتاہ میں اس تجزیئے کے چکر میں نہیں پڑ سکتا۔ بات سیدھی یہ ہے کہ میں اپنے قارئین کا نیاز مند ہوں اور قارئین میرے کرم فرما۔ یہ ہمارا آپس کا رشتہ ہے اور کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ میرے اور میرے قارئین کے پھٹے میں ٹانگ اڑائے خواہ وہ ماہرِ نفسیات ہی کیوں نہ ہو۔ میری تو دعا ہے کہ ہمارے تعلقات زیادہ سے زیادہ خوشگوار ہوں اور خدا کرے کہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ادیب رہوں اور وہ ہمیشہ کے لئے میرے قارئین رہیں — آمین۔ ثم آمین —

اپنے قارئینِ کرام و صد احترام و والا شان سے مجھے جس قدر عقیدت ہے اس کی مثال تلاش کرتا ہوں تو مجھے سیاسی لیڈر یاد آ جاتا ہے جو اسمبلی کی رکنیت کا امیدوار ہو جس طرح وہ اپنے ووٹروں پر تن من اور خاص طور سے دھن نچھاور کرنے کے لئے بے قرار رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے گرد ہر وقت ووٹروں کا جمگھٹا لگا رہے اسی طرح میں بھی اپنے قاری کی خدمت کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہوں اور اس میں خاطر مدارت بھی شامل ہے۔ البتہ فرق ہے تو اتنا کہ لیڈر کا یہ جذبہ چند روزہ ہوتا ہے لیکن مجھ پر یہ کیفیت مستقل طور پر طاری رہتی ہے جس طرح لیڈر کو بظاہر اپنا ووٹر عزیز ہے خواہ وہ کتنا ہی غیر معتبر کیوں نہ ہو اسی طرح مجھے اپنا قاری دل سے عزیز ہے خواہ وہ کتنا ہی بد ذوق کیوں نہ ہو۔ لیڈر ووٹر کے بغیر اور ادیب قاری کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کوئی تسلیم نہ کرے تو الگ بات ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ووٹر لیڈر کو اپنا ووٹ نہ دے تو لیڈر، لیڈر ہونے کی بجائے خود زندہ باد کا نعرہ

رہ جائے۔ اسی طرح اگر قاری ادیب کی تخلیقات کی طرف التفات نہ کرے تو ادیب ادیب ہونے کی بجائے سکوں کے عوض کتابیں لکھا کرے۔ مختصر یہ کہ قاری ہی ادیب کو عزت بخشنے والا ہے اور وہی اسے ذلت دینے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ادیب کے دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ اے خدا مجھے میرے معزز قارئین کی نگاہِ التفات سے محروم نہ رکھ اور اسے میری تخلیقات خریدتے رہنے کی توفیق عطا فرما تاکہ پبلشر اور رسالوں کے ایڈیٹر خندہ پیشانی سے شائع کرتے رہیں۔ میں کس طرح اپنے قارئین کو یقین دلاؤں کہ اصل طاقت آپ کے ہاتھ میں ہے اگر آپ چاہیں تو ادیب بادشاہ بن جائیں رسالوں کے ایڈیٹر سکول ماسٹری کریں اور پبلشر گھوڑوں کی دلالی پر مجبور ہو جائیں۔

معلوم نہیں آپ نے کبھی غور فرمایا ہے کہ کتاب کے سرورق کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کسی لیڈر کے انتخابی منشور کو حاصل ہے۔ انتخابی منشور ہی سے ووٹ دینے والا جان سکتا ہے کہ اس کا لیڈر اسلامی دستور کا حامی ہے۔ غیر مذہبی طرزِ حکومت کا قائل ہے یا اشتراکیت کا حامی ہے۔ اسی طرح سرورق بتاتا ہے کہ ادیب اسلامی ناول پیش کر رہا ہے۔ رومانی قصہ بیان کر رہا ہے یا سرمایہ داری نظام کی چیرہ دستیوں کا رونا رو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتخابات کے وقت ہر لیڈر کو اپنا انتخابی منشور اپنے ووٹروں کی خدمت میں پیش کرنا لازمی ہے اس طرح ادیب کو بھی قاری کی خدمت میں کتاب سے پہلے سرورق پیش کرنا پڑتا ہے۔

اب آپ سے کیا چھپاؤں میرا یہ حال ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں اپنے قارئین کرام کے نیاز حاصل کروں۔ اگرچہ یہ کشش یکطرفہ معلوم ہوتی ہے تاہم کشش کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ آج تک میرے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ قاری نے مجھ سے ملاقات کے شوق کا اظہار نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ میرا پبلشر اکثر کہتا ہے میں ایسا ادیب ہوں جس کا کوئی قاری نہیں یا اگر کوئی ہے تو اس میں اتنی ہمت نہیں کہ سرِ عام یہ قبول کرے کہ وہ میرا قاری ہے اور میری تحریر سے متاثر ہو کر کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ آخر بعض انسان لاولد بھی تو مر جاتے ہیں اور اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد ان کا کوئی نام لیوا نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں ایسے سیاسی لیڈروں کی کمی نہیں جنہیں عمر بھر ڈھونڈے سے بھی روزمرہ کے استعمال کے لئے دو چار درجن عوام بھی نصیب نہیں ہوتے کہ وہ جلسے کی اسٹیج ہی پُر کر سکیں۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس کے لئے دوسروں کے دستِ نگر رہتے ہیں۔ جب کبھی عوام سے خوشحال لیڈر کے نام زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے تو وہ نعروں کی اس ریل پیل میں وہ ایک آدھ نعرہ اپنے نام کا بھی لگوا لیتے ہیں۔ اگر کسی خاص مقصد پر عوام کی ضرورت پیش آئے مثلاً اس وقت جب انتخابات کے ٹکٹ تقسیم ہو رہے ہوں یا امپورٹ لائسنس حاصل کرنے کی وقت کے پیشِ نظر کسی مظاہرہ کی ضرورت ہو تو وہ کچھ دن تک کے لئے کچھ عوام کرائے پر گزارہ کر لیتے ہیں سیاسی کاروبار میں لین دین تو رہتا ہی ہے یہی وجہ ہے کہ بعض دور اندیش اور صاحبِ ثروت لیڈر مستقل طور پر ذاتی عوام کی کھیپ رکھتے ہیں تاکہ وقت بے وقت کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔ یعنی دانشمند آجِر بکار کی مثال پوری ہو۔ اس کھیپ میں ہر نوعیت کے عوام ہوتے ہیں۔ مثلاً ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو نعرے لگوانے کے لئے فضا ہموار کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں بعض ایسے جو پُر زور اور فلک شگاف نعرے بلند کرنے میں مہارت رکھتے ہیں بعض ذہین قسم کے لیڈر ایسے عوام بھی پالتے ہیں جو اپنے لیڈر کے بارے میں حسبِ ضرورت کانا پھوسی کریں اور راز کی باتیں سینہ بہ سینہ عام کریں سیاسی جماعتوں کے عوام کو نیز چھوٹے بڑے تمام لیڈروں کے بارے ہاں کام آتے ہیں اس جماعت کا جب لیڈر چاہتا ہے، بلا کر لیتا ہے اور عوام کی کھیپ حاصل کر لیتا ہے۔

رسالوں کے ایڈیٹروں کو میری یہ بات شاید پسند نہ آئے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اپنے رسالے بھی اسی لئے شائع کرتے ہیں کہ قارئین سے محروم ادیبوں کے لئے ادیبوں یا ہمی کے اصولوں پر مشترکہ قارئین مہیا کئے جائیں فی زمانہ جب کہ قارئین کی شدید قلت محسوس کی جا رہی ہے ادیبوں کی باہمی اصولوں پر ہی قلت کا ازالہ کیا جا سکتا ہے اور مل جل کر وقت گزاری ہو سکتی ہے۔ ان دنوں قارئین کے حلقے میں ایک خاصے خوشحال قسم کے ادیب بھی ہیں۔ [illegible] سے نہیں ملتا کیونکہ چھٹے تو قاری بہرحال بھی کیا کرے ست شمع کے کس سے فرصت ہو تو افسانے تخلیق ہوتے۔ ایک زمانہ تک قارئین کی [illegible]

تھی لیکن اب بیشتر قارئین کے کہنے کے مطابق مقامی پیمانہ درہونے کے برابر ہے۔ صدر سے ان کی مقصد یہ ہے کہ اپنا پہلے پہ کچھ تھوڑی تھوڑی ہی سے کام چلا رہے ہیں۔ اُن میں بعض تو مختلف مضامین شعروں پر ہوتی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ تجربہ کار ادیب اپنے اشعار رسوخ سے قارئین کو کئی سکولوں اور کالجوں کے طلبا سے پیدا کر سکتے ہیں موجودہ زمانے میں ہر شخص میں اتنی استطاعت کہاں کہ کوئی نئے قارئین خرید لے۔ بعض پیشہ ور لوگ کئی قارئین پال لیتے ہیں اور کھلے بھوکے لوگوں کو مفت مہیا کرتے ہیں ـــــ رسالوں کے ایڈیٹر بھی تو ادیبوں کے گروں سے ہیں جنہوں نے رسالے پال رکھے ہیں تاکہ ... وہ محتاج ادیبوں کو بقدر ضرورت قاری مہیا کرتے رہیں

کوئی ادیب ایسا ہوگا جسے کسی نہ کسی وقت قاری کی ضرورت پیش نہ آئی ہو۔ بعض اوقات تو یہ ضرورت اس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ جی چاہتا ہے دوڑ کر کوئی بھی سا قاری ہاتھ آ جائے اور وقت ٹلے۔ یہ کیفیت جب شاعر پر طاری ہوتی ہے تو اس کی حالت بے حد نازک ہو جاتی ہے وہ غریب کچھ ہی کو قاری تصور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور شاید عام میں "قاری بُو قاری بُو" پکارتا نظر آتا ہے اور قاری بیچارے کہاں سے کہاں نکل جاتی ہے۔ بعض شاعر جو قہوہ خانوں میں پائے جاتے ہیں وہ اصل میں قہوہ خانوں کے رسیا نہیں ہوتے انہیں قارئین کی تلاش کشاں کشاں وہاں لے آتی ہے۔ ایک شاعر تو بجائے خود مستقل قاری ہوں مجھے راز بتایا تھا کہ قارئین میری ضرورت شعری پوری کرتے ہیں میں نے جب اس کا مطلب نہ سمجھا تو اس نے کہا غزل سنانے کے بعد ہی نکھرتی ہے اور کون نہیں چاہتا کہ اس کی غزل نہ نکھرے چنانچہ محض غزل کو نکھارنے کے لئے وہ قارئین کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور پھرتے پھرتے قہوہ خانوں میں گھس آتے ہیں اور قہوہ خانوں میں قارئین بڑی آسانی سے اور سستے بھی مل جاتے ہیں ـــــ چائے کے ایک آدھ سٹ سے ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔
قہوہ خانوں میں بعض اوقات امداد باہمی کے طریقے پر عمل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک ادیب یا شاعر نے چائے کے ایک سٹ کا بوجھ اٹھایا اور اپنے اور اپنے ادیب بھائی کے لئے قارئین کا بندوبست کر لیا۔ کبھی کبھی سٹ کا بوجھ بھی مشترکہ طور پر اٹھا لیا جاتا ہے۔ بعض محتاط ادیب ایسے بھی ہیں جو قہوہ خانوں میں اپنے قارئین ساتھ لاتے ہیں۔ وہ ایک قاری تو وہ ہر وقت ناگہانی ضرورت کے پیش نظر ساتھ ہی رکھتے ہیں۔ قہوہ خانے میں داخل ہوتے وقت وہ ایک اِدھر اُدھر سے پکڑ لیتے ہیں۔ گویا یہ ظاہر ہو کہ یہ ادیب ہر وقت قارئین سے لدے پھندے رہتے ہیں۔ قہوہ خانے میں پہنچ کر پہلے پانی اور پھر چائے کا آرڈر دیں گے۔ پانی پینے کے بعد کچھ گفتگو تے سنا دیں گے۔ ایک آدھ قاری غزل کی فرمائش کریں گے اور وہ غزل کے بعد نظم نظم کے بعد گیت اور گیت کے بعد پھر نظم اور نظم کے بعد غزل سناتے چلے جائیں گے اور قارئین کی ادیب نواز طبیعت سے فائدہ اٹھائیں گے۔ مانا چاہے بعض قارئین کی کمزوری ہے لیکن کسی کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا یقیناً ناشائستہ فعل ہے۔ بعض قارئین جو قہوہ خانے میں بطور سامعین اور مشاعروں میں بطور حاضرین استعمال ہوتے ہیں ادیب کو طرح بھی دے جاتے ہیں چائے پی اور ابھی حاضر ہوا کہہ کر جلدی سے دوسری میز پر سرک گئے۔ قارئین کے سلسلے میں خود ادیب ادیب کو جھل دے جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک ادیب نے چند قارئین کو جمع کیا، چائے منگائی اور شعر و شاعری کی بات چل ہی نکلی کہ ایک اور ادیب آن پہنچے بیٹھتے ہی تازہ غزل کا مطلع عرض کیا۔ پھر تازہ غزل ارشاد فرمائی اور سلسلہ ایسا چلا کہ ہفتہ بھر کی تازہ غزلیں سنا ڈالیں ـــــ غزل سنانا کوئی عیب نہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب غزلیں ختم کیں تو فوراً اٹھے اور ساتھ قارئین کو بھی لے کر چلتے بنے۔ اور بیچارہ مظلوم ادیب کبھی فاصلہ پیہ اور کبھی اپنے پیارے قارئین کی جانب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا۔
قارئین کی قلت کے باعث ایسے حادثات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دور اندیش اور تجربہ کار ادیبوں نے قارئین کا مستقل انتظام کر رکھا ہے وہ ہر اتوار کو ایک مقررہ وقت پر اور مقررہ مقام پر آپ ہی جمع ہوتے ہیں اور غریب ادیبوں کا بھلا ہو جاتا ہے۔ یہ انتظام سال ہا سال سے اعلیٰ پیمانے پر چلایا جا رہا ہے۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی ـــ میں اپنے قارئین سے شرف نیاز حاصل کرنے کی تدبیر کر رہا تھا لیکن ادھر کے قارئین تک رسائی ہی نہیں جو حق

کر رہا تھا۔ مجھے اپنے قارئین سے ملاقات کا بے حد شوق ہے۔ لیکن جرأت نہیں ہوتی کہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکوں شاید یہ ہے کہ میں ان کی خدمت میں عقیدت کے پھول پیش کروں اور وہ انہیں قبول کرنے کی بجائے الٹا برس پڑیں ـــــــ "تمہیں کیا حق ہے کہ ایسی تحریریں قلمبند کرو۔ جو ہم پڑھے لکھے عورت مرد تعلیم یافتہ، غیر تعلیم یافتہ، مہذب، غیر مہذب گورے کالے کسی کے بھی کام کی نہیں ـــ ہماری شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو ہم خوش ہیں تو ہمیں بے زبان سمجھتے ہو ـــ مدعیہ آزادیٔ سر بازار طب دیا بس لکھتے چلے جا رہے ہو ـــ خبردار!" ـــــــ سچ عرض کرتا ہوں اگر کوئی قاری مجھے اس طرح ڈانٹ دے تو میری ہمت نہیں کہ میں آزادیٔ تحریر کا نعرہ بلند کر سکوں۔ یہ درست ہے کہ قاری عام طور سے بڑا مہذب ہوتا ہے وہ اس طرح منہ زبانی جدل کی بات نہیں کرتا لیکن اگر ایسا زبان دراز قاری مل جائے اور سرِ عام مل جائے تو مہلک ثابت ہوتا ہے۔ مجھے ایک واقعہ نہیں بھولتا۔ جب بھی وہ منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو اب بھی ٹھنڈا پسینہ آنے لگتا ہے۔ یہ المناک حادثہ ان دنوں پیش آیا جب میرا ساڑھے چھ سو صفحے کا اسلامی ناول عمران وفا عرف اندلس کا مجاہد شائع ہوا تھا۔ اس کے نیچے پانچ رنگے سرورق پر عربی لباس میں ملبوس ایک عورت گھوڑے پر سوار دکھائی گئی تھی اور پس منظر میں ایک قلعہ تھا جس کی فصیل پر سے سپاہی کٹ کٹ کر گرتے نظر آ رہے تھے۔ اس سرورق نے دھوم مچا دی تھی۔ اور مجھے ایک دانش گاہ کی طرف سے بہترین ناول لکھنے کا انعام بھی ملا تھا۔ جو میں نے تمام کا تمام دانش گاہ کے افسرِ اعلیٰ کی دعوت پر خرچ کر دیا تھا۔ تاکہ وہ دوسرے ناول کے انعام کے لئے انہیں آمادہ کر لوں ـــ اس ناول نے خاص حلقوں میں اس قدر تہلکہ مچا دیا تھا کہ مجھے بعض احباب کے پُر زور اصرار پر "علامہ" کا لقب اختیار کرنا پڑا تھا جو اب کثرتِ استعمال سے میرے نام کا حصہ بن چکا ہے اور احباب کی رائے ہے کہ اگر اس کے استعمال کی یہی کیفیت رہی تو جلدی میرا اصلی نام غائب ہو جائے گا اور فقط علامہ رہ جائے گا ـــ بالکل اسی طرح جس طرح میرے ادبی نام کی مقبولیت کی وجہ سے خود مجھے بھی اپنے ماں باپ کا رکھا ہوا نام بھول چکا ہے۔ میرے ادبی نام کے فراموش کئے جانے کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔ اس لئے کہ بعض دوست مجھے علامہ یا ڈاکٹر کہہ کر پکارتے ہیں۔ تو میں اس ایک المناک حادثہ کا ذکر کر رہا تھا۔ مجھے اتفاق سے گاڑی میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ میں ڈبے میں بیٹھا اس کوشش میں مصروف تھا کہ کسی طرح حاضرین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی جائے اور جنہیں میری تصویر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا انہیں بھی معلوم ہو جائے کہ میں اس ساڑھے چھ سو صفحات کے ناول بعنوان "عمران وفا عرف اندلس کے مجاہد" کا مشہور و معروف مصنف علامہ ہوں جس کے دو دو ہزار کے تین ایڈیشن شائع ہونے سے پہلے ہی بک چکے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ حاضرین مجھے خراجِ تحسین پیش کر سکیں اور میرا سفر بھی اطمینان سے کٹ جائے گمنامی میں سفر کٹ جانا میرے لئے افسوس کا باعث رہتا ہے۔ عموماً میں ایسا شخص ہم سفر رکھتا ہوں جو یہ صورتِ حال پیدا نہ ہونے دے اور میری تصنیفات کا حوالہ دے کر بآوازِ بلند باتیں کرے۔ حاضرین کو تبادلۂ خیالات پر اکسائے تاکہ وہ میرے بارے میں لاعلمی کا شکار نہ رہیں۔ لیکن افسوس وہ شخص اس دفعہ میرا شریکِ سفر نہ ہو سکا تھا۔

وہ بھی ایک اتفاق تھا۔ ہوا یہ کہ ایک لیڈر کو ایک شہر میں ایک جلسۂ عام کو خطاب کرنا تھا۔ ان صاحب کو ایک روز قبل اس شہر میں بھیج دیا گیا تاکہ لیڈر کی آمد پر ریلوے اسٹیشن پر استقبال کے موقعے پر نعرے بلند کر سکے اور پھر شام کو جلسۂ عام میں بھی یہی خدمت انجام دے سکے۔ جلسے میں گڑبڑ کی وجہ سے کارروائی دیر سے شروع ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا وہ شخص وقتِ مقررہ پر واپس نہ پہنچ سکا اور میرے ہمراہ نہ آ سکا۔ اور کسی نااہل کو میں ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھتا تھا۔ لہٰذا اکیلا ہی ڈبے میں بیٹھ گیا ـــــ میں نے چونکہ زیادہ تر اسلامی ناول لکھے ہیں جن کا حلیہ تاریخ رکھا ہے لہٰذا حاضرین سے گفتگو شروع کرنے کے لئے مسلمانوں کی حالتِ زار کا رونا رونے کے بعد اسلامی تاریخ کا ذکر شروع کیا ـــــ باتوں باتوں میں اندلس کے مجاہد کا ذکر کر دیا جو میرے ناول کا ہیرو ہے۔ میں نے کہا علامہ موصوف نے اپنے نئے پانچ رنگا سرورق والے پندرھویں اسلامی ناول میں اسلامی کردار کی شان کو بیان کیا ہے ـــ

میں تھیلے میں سے وہ ناول نکال کر کچھ حصے سنانے ہی کو تھا کہ ایک صاحب چونک کے بولے —— صاحب کسی پڑھے لکھے شخص کا حوالہ دیجئے ——
علامہ ؟!!

میں سلے پر پوچھا کیوں صاحب وہ علامہ نہیں ہیں ؟! انہوں نے دو جن سے زیادہ ناول لکھے ہیں اور ان میں سے ایک سے ایک بڑھ کر اسلامی اور ایک سے ایک بڑھ کر تاریخی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انہوں نے اسلامی کردار کو واضح کرنے کے لئے اپنے زور بیان کے آگے تاریخ کو ٹھہرنے نہیں دیا۔ اور اسلامی شان کو ہمیشہ تاریخی الائشوں سے پاک رکھا۔ علامہ ایک سچے اسلامی ناول نگار ہیں میں جوش میں یہ فقرے کہہ گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کے بیان سے میں اپنے قلم کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا جس نے بڑے سے بڑے اعلیٰ پائے کے اسلامی کردار تخلیق کئے ہیں —— حقیقت یہ ہے کہ وہ میرا افسانوی معاملہ تھا میں چپ رہا۔ نہ کسی اور کے بارے میں وہ الفاظ کہے ہوتے تو میں نے علامہ ہونے کے باوجود ان صاحب کے گریباں پر ہاتھ ڈال دیا ہوتا یہی سوچ کے چپ ہو رہا —— علامہ یار۔ تم آخر ادیب ہو ادیب عوام کی ملکیت ہوتا ہے اور ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ اپنی ملکیت کو جس طرح چاہے استعمال کرے لہٰذا تمہیں دخل در معقولات کا حق نہیں —— ۔

یہ حادثہ تو گزر چکا۔ میں نے آج تک کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا البتہ اس وقت سے اب تک میں کسی ایسے خار مورے کی تلاش میں ہوں جس کے اطلاق سے مجھے فوراً معلوم ہو سکے کہ میں عالمی سوفیصدی سچے ہمدرد ہر تن گوش اور بے زبان قسم کے قاری سے ملاقات کر رہا ہوں۔ اگر کسی ادیب کو ان صفات کا مالک شریف النفس قسم کا قاری ہاتھ آجائے تو اس پر کیوں وہ تن من اور دھن تک نچھاور کرنا چاہے گا اور ادیب اسے کیوں اس طرح عزیز نہ جانے گا جس طرح لیڈر اپنے ووٹر کو عزیز جانتا ہے ؟



خواجہ محمد حسین

فنِ گداگری

گداگری ایک مستقل فن ہے۔ دنیا میں مشکل ہی سے کوئی فن اس کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے گا۔ ریاضی کا کوئی مسئلہ حل کرنا، فلسفے کی کسی گتھی کو سلجھانا یا شعر تخلیق کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا۔ دستِ سوال دراز کرنا تو ابتدائی فعل ہے۔ کامیابی کا اصل راز تو اظہارِ طلب کے طریقے پر منحصر ہے۔ اور یہی وہ نازک مقام ہے جب گداگری کے فن کی آزمائش ہوتی ہے۔ جو اس پل صراط سے گذر گیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا، جس نے غفلت برتی وہ مارا گیا۔ اگر کسی کو یقین نہ ہو تو آزما کر دیکھ لے۔

فرض کیجئے بازار بھرا ہوا ہے۔ کندھے سے کندھا چھل رہا ہے۔ آپ سے کہا جائے ذرا ایک پیسہ تو مانگ کر دکھائیے۔ تو ایسے عالم میں آپ کیا کریں گے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ میں اتنی جرات بھی نہ ہو گی کہ صرف ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہی ہو جائیں۔ بھیک مانگنے کے تصور سے ہی آپ لرز اٹھیں گے۔ یہ بہت صبر آزما فعل ہے۔ بہت کم اشخاص میں اتنی خود اعتمادی ہوتی ہے کہ ان کے پائے استقلال میں ایسے وقت لغزش نہ آسکے۔ یہ معمولی انسان کا کام نہیں۔

یہ ایک ایسا فن ہے جس کا ماہر کسی حالت میں ناکام نہیں رہتا۔ اس میں صبر کی غیر معمولی قوت ہوتی ہے۔ وہ دنیا کے کہنے کی پروا نہیں کرتا۔ دنیا کا کیا ہے وہ تو کہتی ہی رہتی ہے۔ یہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔ وہ اپنے دھن کا پکا ہوتا ہے۔ جس کے پیچھے ایک مرتبہ لگ گیا گھن کی طرح چمٹ گیا۔ لاکھ دھتکارو، پھٹکارو، غیرت دلاؤ، جھڑکو، غصہ کرو۔ اس پر اثر نہیں ہوتا۔ اگر اخلاق کی یہ فرضی پابندیاں وہ اپنے اوپر عائد کرے تو اس کا روبار کس طرح چلے۔ پیسہ کمانا اتنا مشکل نہیں جتنا دوسرے کی جیب سے پیسہ نکلا لینا۔ لیکن ایک ماہر گداگر کے لئے یہ بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔

ان کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں جو پرانی لکیر کے فقیر ہیں۔ شکستہ حال، پھٹے پرانے کپڑے بدن پر لٹکائے بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ ان کی صورت دیکھنے میں قابلِ رحم ہوتی ہے۔ لیکن ان کی تھیلی میں اتنے پیسے ہوتے ہیں کہ آپ کی بیری جیب میں مشکل ہی سے نکل سکیں گے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ گداگروں نے بھی اپنے فن میں نفع بخش اضافے کر لئے ہیں۔ ان کے جدید ہتھکنڈوں سے بھولے بھالے شہری عموماً دھوکا کھا جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر کراچی میں بندر روڈ پر میونسپلٹی کے سامنے آپ کو ایک سفید پوش بزرگ نظر آئیں گے۔ دراز قد، لانبی داڑھی۔ خراماں خراماں ٹہلتے ہوئے، آپ پاس سے گذریں گے۔ تو نہایت رعب سے آپ کو مخاطب کریں گے۔ "حضرت، ذرا سنئے گا" آپ یقیناً ایک مرد بزرگ کو دیکھ کر احتراماً ٹھہر جائیں گے۔ پھر وہ اس چالاکی سے اپنا مدعا بتائیں گے۔ کہ آپ کو کچھ دیتے ہی بنے گی۔ ایک شام میں اور میرا چھوٹا بھائی ادھر سے جا رہے تھے۔ کچھ کتابیں خریدنی تھیں۔ یہی بزرگ ملے۔ روکا۔ ہم رک گئے۔ فرمانے لگے۔ "میں مسافر ہوں۔ آج ہی کراچی آیا ہوں۔ کسی نے ہاتھ کی صفائی دکھائی اور جیب صاف کر دی۔ لاہور جانا ہے۔ ٹکٹ میں صرف آٹھ آنے کی کمی ہے۔ باقی روپیہ آپ جیسے نیک صفات لوگوں نے دیدیا ہے۔

ایسی بات سننے کا کسے شرم دامن گیر ہوتی ہے۔ لیکن جب ہی انسان کو جو نہ کہلائے تھوڑا ہے وہ یہ کہہ کر آبدیدہ ہو گئے۔ اور دوسری جانب منہ پھیر لیا۔ میں ابھی سمجھا ہی رہا تھا کہ میرے چھوٹے بھائی نے اٹھنی ان کے ہاتھ پر رکھ دی

چلتے چلتے ہی راستے میں میں نے کہا "تم نے اچھا نہیں کیا۔ مفت میں اٹھنی گنوا دی" شاید اس کو میرا کہنا ناگوار گزرا بولا "بھائی آپ تو ہر انسان پر شک کرتے ہیں۔ اگر اس کی جگہ میں یا آپ ہوتے تو کیا کرتے۔ خدا کسی پر برا وقت نہ ڈالے"

میں نے کہا "اس قسم کے گھڑت قصے پر تم ہی یقین کر سکتے ہو۔ اور میں ہوتا تو کچھ ہی کرتا لیکن سر بازار بھیک نہ مانگتا" اسی طرح گفتگو کرتے ہم آگے چلے گئے۔

مختصر یہ کہ ہم کتب فروش سے اپنی پسند کی کتابیں خریدنے کے بعد واپس ہوئے۔ آدھ گھنٹہ ہمیں اس کام میں صرف ہو گیا تھا۔ ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی جب واپسی پر انہی بزرگ نے پھر ہمیں روکا۔ شاید وہ ہمیں پہچان نہ سکے۔ پھر وہی عذر پیش کیا۔ میں نے بھائی کی طرف مسکرا کے دیکھا اس نے کہا "میرے پاس روپیہ ہے اگر آپ آٹھ آنے واپس دے دیں۔ تو میں کچھ مدد کروں" ان بزرگ نے آہ بھرتے ہوئے جیب سے آٹھ آنے نکال کر بھائی کو دے دیئے۔ مجھے سخت تاؤ آ رہا تھا کہ دوبارہ اٹھنی پھینک رہا ہے۔ لیکن اس نے آٹھ آنے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا حضرت سلام علیکم ——— اب کسی اور کو بے وقوف بنایئے۔ ہمارے پیسے حرام کے نہیں" اور آگے بڑھ گیا۔

"بدمعاش کہیں کا" اس نے غصے سے کہا "دیکھا بھائی صاحب کیا بدلہ لیا۔ بڑا ہوشیار سمجھتا ہے اپنے آپ کو"

میں نے کہا "تم نے کیا کمال کیا جو اپنی اٹھنی واپس لے آئے۔ کمال تو یہ ہے کہ دوسروں کی جیب سے اتنے روپے نکال کر دکھاؤ جتنے اس شخص نے اکٹھے کر لیے ہیں"

"یہ تو بڑی بے غیرتی ہے" اس نے جواب دیا "صورت فرشتوں جیسی اور حرکت شیطان کی"

"ہو گی بے غیرتی۔ لیکن اس کا اس پر کیا اثر ——— ایک تم بچ نکلے اور کتنے ہیں جو اس کے فریب میں نہ آئیں گے"

آج بھی وہ شخص کسی نہ کسی بہانے سے بندر روڈ پر شام کے وقت بھیک مانگتا نظر آتا ہے۔ لیکن اب لوگ اس سے واقف ہو گئے ہیں۔ یقیناً وہ کوئی اور ترکیب سوچ رہا ہو گا۔

ایک دن میں اپنے ایک دوست سے ملنے اس کے دفتر گیا۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ ہم دونوں باتیں کر رہے تھے کہ ایک صاحبزادے تشریف لے آئے۔ یہی ہو گا اندازاً سولہ سترہ برس کا۔ اس نے ایک کاغذ میرے دوست کو دیا۔ اس نے پڑھا اور ایک روپیہ نکال کر دینے لگا۔ "کیا ہے" میں نے دریافت کیا۔ اس نے وہ کاغذ میرے حوالے کر دیا۔ اس کے ہاتھ سے روپیہ لیتے ہوئے میں نے پڑھا لکھا تھا۔

"میں ایک مہاجر طالب علم ہوں۔ شبینہ اسکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔ گزشتہ دو ماہ سے اسکول کی فیس نہیں دے سکا قومی ہمدردی کے تحت آپ سے امید ہے کہ ایک غریب مہاجر کی تعلیم میں مدد فرمائیں گے"

اس کے نیچے انگریزی میں Strongey Recommended لکھا تھا اور کسی کے دستخط تھے۔ لطف یہ کہ ہیڈ ماسٹر کی مہر لگی ہوئی تھی۔

میں نے اس لڑکے سے پوچھا "جیکب لائن میں یہ اسکول کس طرف ہے" اس نے جواب دیا

"بڑی مسجد کے عقب میں"

میں نے پھر پوچھا۔ "کتنے روپیہ داخل کرنا ہیں۔ ہم سب دے دیں گے۔"

وہ خوش ہو کر بولا: "کل آٹھ روپے۔"

"نہیں اس وقت کہیں اور تو جانا نہیں ہے؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اسکول کس وقت شروع ہوتا ہے؟"

"پانچ بجے شام کو۔"

ایک گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے کہا چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ دفتر کا وقت بھی ختم ہو گیا تھا۔ ہم دونوں فوراً اس کے ساتھ ہو لیئے۔

وہ لڑکا اگرچہ ہمارے ساتھ تھا لیکن اس کے چہرے پر گھبراہٹ سی طاری تھی۔ صدر تک تو وہ بس میں بیٹھا رہا۔ لیکن صدر میں بس رکتے ہی اترنے لگا۔ میں نے پوچھا: "کیا اسی جگہ اترنا ہے۔"

اس نے کہا: "مجھے اب یاد آیا صاحب۔ میری ماں کی طبیعت سخت خراب ہے۔ مجھے ان کی دوا لانا تھی۔ میں آج اسکول نہ جا سکوں گا۔"

قبل اس کے ہم اس سے کچھ اور کہتے وہ فوراً اتر گیا۔

اسی طرح کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن گداگری کا فن روز بروز نت نئی شان سے فروغ پا رہا ہے۔

ان لوگوں کو نفسیاتی مطالعے میں حیرت انگیز کمال حاصل ہوتا ہے۔ وہ دور سے دیکھ کر بھانپ لیتے ہیں کہ کس قسم کا انسان ہے۔ اور کیا فقرہ اس پر کارگر ہو سکتا ہے۔ ایک طالب علم کو دیکھ کر وہ فوراً آگے بڑھے گا اور کہے گا خدا تمہیں امتحان میں پاس کرے ——— فقیر کو بھی ایک آنہ دیتے جاؤ۔ کسی عورت کو دیکھ کر اگر اس کی گود میں بچہ ہو تو اس طرح گویا ہو گا۔ "مائی تیرے بچے کی خیر ——— ایک آنہ خدا کی راہ میں ———" کسی شوخ لڑکی کو دیکھے گا تو کہے گا۔ "خدا تیری دلی مراد پوری کرے بیٹی۔ بیٹی جا محتاج کو کچھ راہِ خدا میں۔" عورت مرد کو ساتھ جاتا دیکھ کر فوراً یہ صدا بلند کرے گا: "خدا جوڑی سلامت رکھے۔" نئے شادی شدہ جوڑے کو بھانپ کر دل میں خوش ہوتے ہوئے کہے گا۔" اللہ چاند سا بیٹا دے۔ کچھ غریب محتاج کو بھی دیتے جاؤ۔"

غرضکہ وہ نفسیاتی طور پر اثر ڈالنے کی امکانی کوشش کرتا ہے۔ عورتیں عموماً ان کے جھانسے میں جلد آ جاتی ہیں۔ اور کچھ نہ کچھ دے گذرتی ہیں۔

کراچی میں بس میں سفر کرنا اکثر نہایت صبر آزما ہوتا ہے۔ آپ دن بھر کے تھکے ماندے شام کو گھر واپس ہو رہے ہیں۔ شام کا اخبار آپ نہایت غور سے پڑھ رہے ہیں کہ ایک آواز آپ کی سماعت کے پردوں کو پھاڑتی گذر جاتی ہے۔

"یتیموں کی فریاد سن لیجئے۔"

کچھ دیر تو آپ ضبط کرتے رہیں گے۔ لیکن اس یتیم کی آواز بس کی رفتار کے ساتھ بلند ہوتی جائے گی۔ آپ ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکیں گے اور وہ یتیم اپنی فریاد ختم کرنے کے بعد ڈبہ جھنجھناتا آپ کے سر پر پہنچ جائے گا۔ کوفت سے آپ کا برا حال ہو گا۔ جی چاہے گا کہ بس سے اتر پڑیں۔ لیکن دوسری بس میں بھی کوئی نہ کوئی یتیم ایک پیسہ یا ایک آنہ کے عوض جنت میں موتی محل آپ کے نام الاٹ کرنے کی تجویز پیش کر رہا ہو گا۔

خود اعتمادی، ضبط اور نفسیاتی دوربینی کے علاوہ فن گداگری کا ایک اہم گُر اداکاری ہے۔ جو گداگر اداکاری میں جتنا ماہر ہو گا اتنا ہی وہ اپنے فن میں کامیاب رہے گا۔ یہ چیز کچھ تو موروثی ہوتی ہے۔ اور کچھ تربیتی۔ برسوں ٹھوکریں کھانے کے بعد گداگر اس گُر پر قدرت حاصل کرتا ہے۔ ان کے بہروپ کا اتار چڑھاؤ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہونٹوں کو ایک خاص زاویہ سے دانتوں کی جانب سکیڑتے ہوئے، آنکھیں نرم سی کر کے، انگوٹھا کے

جیب زرش لگتا ہے تو کمزور دل انسانوں کو خواہ مخواہ اس کی حالت پر رحم آجاتا ہے۔ اس فقیر کی حالت سدھارنے سے زیادہ وہ اپنی عاقبت سدھارنے کے خیال سے کچھ نہ کچھ دے ہی دیتا ہے۔ جس زمانے میں کراچی میں گداگری کو ممنوع قرار دیا گیا تو گداگر شہر بدر کر دیئے گئے تھے۔ لیکن دو تین دن بعد دیکھا تو وہ نئے روپ میں نظر آئے۔ کوئی اخبارات کا پلندا اٹھائے کوئی ماچس بیچتے اور کوئی بوٹ پالش کا سامان لئے ہوئے۔ برسوں کی تربیتی عادت بھلا ایک دن میں کس طرح چھوٹ سکتی ہے۔ ان کی حالت دیکھ کر ہنسی آتی تھی کیونکہ وہ بیچ تو اخبار رہے تھے لیکن ان کی آوازیں فقیرانہ صدا معلوم ہوتی۔ ایک فقیر کو کہتے سنا "آج ہے تازہ خبر ہی ملو خدا میں؟" اس کے لہجے اور فقرے پر بے اختیار ہنسی آگئی۔ دوسرا زور زور سے کہہ رہا تھا "ماچس دو دو پیسے"۔ لیکن جب کوئی پاس سے گزرتا تو چپکے سے کہتا "دو روز سے بھوکا ہوں خدا کے نام پر ماچس لے لو"۔ مجھے اس کی حالت پر واقعی رحم آگیا میں نے دو ماچس لینے کے لئے ایک آنہ آگے بڑھا دیا لیکن اس نے بہت بے دلی سے ماچس اٹھائی جیسے اس کی آنکھیں کہتی ہوں "رہنے بھی دو بابو ——— خدا بھلا کرے گا!"

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ "گداگری" دینی اور دنیوی ترقی کے لئے بہت ضروری چیز ہے۔ اس کے بغیر نہ عاقبت سدھرتی ہے نہ دنیا ——— ان صاحب کا خیال ہے کہ جس قوم کے افراد میں فنِ گداگری جتنا مقبول ہوگا اور جتنے لوگ اس فن کے ماہر ہوں گے اتنا ہی وہ ملک ترقی کرے گا۔ انسدادِ گداگری کے موقعہ پر ان صاحب نے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں نہایت مایوس کن رائے قائم کی تھی "افسوس اس فن کا خاتمہ قومی ترقی کے زوال کا پیش خیمہ ہے۔" انہوں نے حسرتناک لہجے میں کہا تھا۔ لیکن جب امریکی گندم کراچی بندرگاہ پر آئی تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائے اور فخریہ انداز میں کہا "ہم نے کہا تھا نا کہ گداگری قومی ترقی کے لئے نہایت ضروری چیز ہے ——— اب دیکھنا تم کہ پاکستان کتنی ترقی کرتا ہے۔"

میری سمجھ میں ان کا یہ فلسفہ نہ آیا۔ سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے میں نے پوچھ ہی لیا۔ "بھئی ہم تو تمہاری منطق سمجھ نہ پائے۔"

"میاں تم کیا سمجھو گے ——— اگر سمجھتے تو آج کسی بڑے عہدے پر نہ ہوتے۔" پھر خود ہی کہنے لگے "آج کا دن پاکستان کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ آج اجتماعی گداگری کا دور شروع ہوا ہے۔ کراچی میں انفرادی گداگری کو جب ممنوع قرار دیا گیا تھا تو مجھے پاکستان کے مستقبل کی طرف سے بڑی تشویش تھی۔ لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ابھی چند باہوش اور دانا اشخاص ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ میاں وہی قوم کامیاب رہی جس نے اپنی جھولی بھر لی۔ مرحبا۔ شاباش۔"

"لیکن یہ تو جذبہ امدادِ باہمی ہے" میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"امدادِ باہمی! اس نے حقارت سے کہا۔ "کچھ نہیں ——— سب غلط ——— گداگری کی ایک ترقی یافتہ شکل ——— اور بس"

وہ اکثر مجھ سے کہا کرتے ہیں کہ گداگری کوئی برا فعل نہیں۔ دنیا میں کوئی کام برا نہیں۔ اصل میں برے یا اچھے کام کرنے والے ہوتے ہیں اس فن کو عزت دینا اپنے قومی وقار کو ترقی دینا ہے۔ دنیا کا کام ہی اس طرح چلتا ہے۔ گداگر نہ ہوں تو زکوٰۃ کس کو دو گے۔ نیاز کا کھانا کس کو کھلاؤ گے باپ دادا مریں گے قران کے تیجے، چالیسویں اور برسی کی روٹی کون کھائے گا۔ تمہیں عاقبت سدھارنے کا موقع کس طرح مل سکے گا۔ گداگری وہ معجزہ فن ہے جس سے قوم کے افراد میں چالاکی۔ ضبط۔ ایثار اور رحم پیہم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ گداگر انسان ہی ہوتا ہے۔ لیکن ہر انسان گداگر نہیں بن سکتا۔ اس کے لئے بڑی خوبیاں درکار ہیں۔ یہ معمولی دل گردے کے انسان کا کام نہیں ——— پھر اس ترقی یافتہ دور میں جب کہ گداگری کے نت نئے شعبے کھلتے جا رہے ہیں۔ مثلاً اقتصادی گداگری، سیاسی گداگری، اور قومی گداگری۔ تو اس میں مہارت حاصل کرنا اور مشکل ہو گیا ہے۔ ان کا مشورہ ہے کہ حکومت کو چاہئے وہ اس فن کی ترقی کے لئے تربیتی مراکز قائم کرے۔

نصیر انور

مصروف رہیئے

اوہو، مجھے بیٹھنا تو نہیں۔ آپ اپنے کام میں مصروف رہئیے۔ فرمایئے مزاج بخیر ـــــــ؟ ـــــــ خدانخواستہ دشمنوں کی طبیعت ناساز تو نہیں۔ یوں تو بجلی کی روشنی میں پڑھنے لکھنے سے آنکھوں پر بُرا اثر پڑتا ہے ـــــ خیر اب تو رات ہے۔ پر آپ تو دن بھر یونہی بیٹھے رہتے ہیں۔ بے مجھے بیٹھنا تو نہیں ـــــــ پہ سنیئے تو، یہی وہ لاہور ہے نا جس کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے تھے آپ نے ـــــ یہاں تو چپے چپے پر غلاظت کے ڈھیر ہیں۔ اور ہمارے وہاں لکھنؤ میں قدم قدم پر اگالدان دھرے ہیں۔ جانے اب کس حال میں ہے۔ . . . . . . کیا زمانہ تھا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ لکھنؤ سے بمبئی کیسے پہنچے۔ نفسی نفسی کا عالم تھا۔ بس قیامت ہی آگئی تھی۔ یاد تو ہوگا جب چاروں طرف سے خونی آندھیاں چلی تھیں۔ تو حضور اس وقت بمبئی کے ساحل پر آدھی رات کے وقت ہم گھر کے تمام افراد ایک ہی کشتی میں سوار ہو گئے۔ بڑی جہاز تو جا چکا تھا۔ اسی لئے بوالفروی سے کام لیا۔ کشتی کو سمندر میں ڈال دیا۔ ہوا آہستہ آہستہ کراچی کی جانب خاموش روانی کے ساتھ بہنے لگی۔ کیا پوچھتے ہیں آپ قصہ طویل ہے۔ دکھ بھری آپ بیتی ہے۔ . . . . دورانِ سفر جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ تو بیان سے باہر ہیں۔ صرف اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ بحیرۂ ہند سے نکل آئے تھے۔ بحیرۂ عرب میدانِ کربلا بن چکا تھا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ لیکن پینے کو ایک قطرہ بھی نہیں۔ یزید کی روح ابھی تک ہمارے تعاقب میں تھی۔ لیکن بندہ پرور ہمت ہم نے بھی نہ ہاری۔ آخر ساحل پر آن پہنچے۔ گذرے ہوئے واقعات اب بھی نگاہوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔

ذری پانی منگوا دیجئے۔ دیکھئے تکلف نہ کیجئے گا۔ موسمِ گرما کا آغاز ہے۔ اور پنجاب میں آگ ہی تو برستی ہے۔ اس عالم میں نمکین سکنجبین کے کیا کہنے۔ قدیم حکماء سے لے کر بڑے بڑے ڈاکٹر اس کے ہزاروں فوائد بیان کرتے ہیں۔ کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک سر پھرے نوجوان نے اسی پر بحث شروع کر دی۔ اور اس بحث میں سیاسی گتھیاں سلجھانے لگا۔ استغفراللہ، ناک میں دم آگیا۔ بات یوں ہوئی کہ میں کراچی سے لاہور آ رہا تھا۔ ریل کا ڈبہ مسافروں سے لدا پڑا تھا۔ انسان اور سامان ایک دوسرے پر سوار تھے۔ اسی ڈبے میں ایک کونہ بمشکل میسر آگیا۔ سفر سے پہلے خیال تھا کہ گاڑی چھوٹتے ہی اطمینان سے مطالعہ کروں گا۔ لیکن حضور اس گھٹی گھٹی فضا میں تو بجائے خود گھٹ کے رہ گیا تھا۔ پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر طرف تُو تُو میں میں۔ استغفراللہ ایسی مغلظ گالیاں کہ جی متلانے لگا۔ اور طبیعت میں انقباض پیدا ہو گیا۔ لکھنؤ کو کوئی گالی بھی نہیں آتی۔ رنگ رنگ کے مسافر طوطا مینا کی بولیاں بول رہے تھے۔ ایک پٹھان ہونٹوں میں نسوار دبائے بار بار تھوک رہا تھا۔ میں نے کئی بار منع کیا آخر اس کی دکاروڑا نے میرے ہونٹوں پر مہر لگا دی۔ جی چاہتا تھا کہ اسے باہر دھکا دوں۔ کوئلے اور درد شکم کا مارا مشری ہو گیا میں بھر رہا تھا۔ میرا دماغ تعفن میں گھر کر رہ گیا۔ کھڑکی سے باہر سر نکالا۔ افق تک پھیلی ہوئی غیر آباد زمین کو نگاہوں سے آباد کرتا چلا۔ تو ریل نے دوڑتے ہوئے آنکھوں میں خاک جھونک دی۔ ہمسفروں نے دھول سے بچنے کے لئے شیشے چڑھا لئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اندر کی گندی

فضا سے باہر کا گرد و غبار ہی بہتر ہے۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اچانک دو مسافروں کے مسلسل اصرار نے دم بخود بیٹھنے پر مجبور کر دیا کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا گیا۔ ڈبہ گرم حمام بننے لگا۔ سگریٹ کا دھواں، بیڑی کا دھواں اٹھتا ہی رہا۔ یکایک مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے بدبودار اچار کے بڑے مرتبان میں بند کر دیا گیا ہوں۔ بارے ایک اسٹیشن آ گیا۔ میں نے جلدی سے ڈھکنا اٹھایا اور آناً فاناً باہر کود پڑا۔ پلیٹ فارم پر دم لیا تو جان میں جان آئی۔ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ وہی نوجوان ناگہانی طور پر الجھ گیا۔

"میر صاحب معلوم ہوتا ہے جیسے بینگن تنور سے باہر آ گیا ہے ———!"

یہ سنتے ہی جی جلنے لگا۔ وطن کی یاد نے دل میں چٹکی بھری۔ اپنے وہاں کیا مجال جو کوئی آنکھ اٹھا کے بھی دیکھ سکے۔ اور یہاں یہ عالم کہ خواہ مخواہ پیچ کھلتی ہے۔ یہ انداز بارِ خاطر ہوا۔ ترچھی نگاہوں سے نوجوان کا جائزہ لیا۔ خاموش ہی کھڑا تھا کہ اس نے دوبارہ اپنی طرف متوجہ کیا۔

"معاف فرمائیے آپ تو خفا ہو گئے۔ میرا مطلب ہے کہ آخر اس تیسرے درجے میں وہ آرام کیوں نہیں جو فرسٹ اور سیکنڈ میں ہے۔ کیا آپ ان درجوں کو پسند کرتے ہیں۔ جو انسانوں میں بلندی و پستی کو برقرار رکھیں۔ اور دیکھئے تو کتنے انسانوں کو تنگ و تاریک پیٹیوں میں دم توڑنے پر مجبور کیا جا رہا ہے ——— عورتوں کے ڈبے پر بھی نظر ڈالیے یہ ابھی تک علیحدہ ڈبوں میں بند ہیں ———"

میں نے دو ٹوک ہی کہی .... میاں صاحب زادے بساطِ عالم پر کوئی فیل ہے تو کوئی پیادہ۔ ہر کوئی وزیر بادشاہ بننے لگے تو ساری بازی چوپٹ ہو کر رہ جائے۔ کوئی مہرہ پٹنا نہیں چاہتا تو نہ بنے۔ چال چلنے کی ہمت ہے تو آگے بڑھیے.....؟

اس پر انجن نے بھی دادِ تحسین دی۔ گارڈ نے جھنڈی ہلا دی۔ میں فوراً اپنے ڈبے کی طرف لپکا۔ اپنی جگہ پر قبضہ جمایا۔ اوہ!

——— لے آئے۔ ان یہاں رکھ دو .... شکریہ .... واللہ۔ کیا مزے کی سکنجبین ہے ....

او ہو لیموں کا عرق ذرا کم ہے .... اور نمک تو کچھ ویسا ہی ہے .... البتہ برف نہیں ہے ....

خیر صراحی کا پانی بھی غضب ٹھنڈا ہے .... حضور آپ کام میں مصروف رہیے .... میں دوسرا گلاس خود ہی انڈیل لیتا ہوں ———!

"دیکھئے اس نوجوان کا خیال ابھی تک قائم ہے۔ آخر نوجوان تھا۔ نئی روشنی نے اس کی بینائی سلب کر لی تھی۔ عورتوں کے بارے میں اس کے طنزیہ اشارے کا یہی مطلب تھا کہ یہ عورتیں کھلے بندوں آزادی سے یہاں وہاں اٹھلاتی پھریں۔ وہ غالباً اپنی روایات سے واقف نہیں اسے نہیں معلوم کہ حرم سرائیں کیوں آباد تھیں۔ یہ زنانہ مردانہ کیسے ایوانوں میں کیوں تعمیر ہوئے۔ یہ کوئی دیوار نہیں تھی۔ غیرت کا پردہ تھا لیکن اب تو اس پردے کو سرے ہی سے اٹھایا جا رہا ہے۔ لڑکیاں بجائے خود آزادی کی دعوے دار ہیں۔ بیباکی کی انتہا ہو گئی ہے۔ ان عام نوجوانوں کو یہ واقعہ کیونکر سناؤں کہ شرم و حیا کسے کہتے ہیں۔ آپ ہی سنیئے۔

"اپنی بیگم کا قصہ ہے۔ شادی کی رات جب میں حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو آہٹ پاتے ہی حیا کی تصویر گھونگھٹ میں سمٹ کر رہ گئی۔ میں قریب بیٹھا دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ گھونگھٹ اٹھایا تو وہ مارے شرم کے پانی پانی ہو گئی۔ اور ابھی اس کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ بیگم غائب ہے اور اس کی جگہ ندی بہہ رہی ہے۔ ....

"بھئی ذرا آپ اپنے کام میں مصروف رہیئے۔ اور ہاں، یہ جو آپ نے لاہور کی نت نئی خوبیاں گنوائی تھیں، کہاں ہیں۔ میں نے تو

ابھی شہر کا اندرونی حصہ دیکھا ہے۔ جہاں تنگ تنگ گلی کوچوں میں مکانات ایک دوسرے پر یوں سوار ہیں جیسے ریل کے تیسرے درجے میں مسافر ... یہاں کے لوگ غم کھانے پر بھی مشتاق نظر نہیں آتے ——— اور سنئے

"ایک بازار میں سے گزرا تو دیسی ہی ٹوٹی ہوئی ہیں۔ کسی نے بتایا کہ یہ موچی گیٹ ہے۔ آگے بڑھتے بڑھتے اچانک ایک ... سے مکان پر نگاہ جم گئی۔ ایک لمبے چوڑے بورڈ پر لکھا تھا۔

"تپ دق اور خنازیر کا ہسپتال"

"اسی ہسپتال کے زیر سایہ تمباکو کی ایک دوکان ہے۔ اس کے پاس سے ایک تندرست گزرے تو بے اختیار کھانسنے لگے اور کھانسی کا مارا گزر ہی جائے ——— !

حضور آپ کے یہاں پہچان تھا ——— اور آپ کا پاندان سلامت رہئے۔......شکریہ

——— "جی تو میں عرض کر رہا تھا کہ آپ کے اس لاہور میں ابھی جانے کتنے "مقامات آہ و فغاں" اور بھی ہیں۔ میں نے تو فقط شہر دیکھا ہے۔ محکمۂ صحت نے خون بڑھانے کی کوئی اسکیم تو جاری کی ہو گی۔ وحدتِ مغربی پاکستان کے قیام سے پہلے اسی خیال میں محو خرام تھا کہ میو ہسپتال پر ایک بورڈ نظر آیا۔

"مغربی پنجاب محکمۂ انتقالِ خون"

آپ جانتے ہیں کہ اپنا مزاج تو شاعرانہ ہے۔ اسی مصرع طرح پر گرہ لگا دی اور بے ساختہ زبان سے نکلا

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

——— "فرمائیے تو وہ ہر کب دکھائیے گا مجھے بیٹھنا تو نہیں۔ آپ اپنے کام میں مصروف رہئے۔ اچھا تو اجازت دیجئے ——— خدا حافظ ——— !

. . . .

"جی ہاں ——— میں پھر آ گیا۔ باہر تو بالکل اندھیرا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ آپ کو زحمت تو ہو گی ——— ہتھیلی لیمپ اگر ساتھ لیتا جاؤں تو راستہ آسانی سے کٹ جائے گا۔

اوہ! یہ بجلی کا ہے جناب

——— تو پھر شب باشی کے لئے مجبوراً آپ کے یہاں ہی قیام کرنا پڑے گا۔

فراق گورکھپوری

○

یوں جھجکتے ہوئے ابھرتی ہے — زندگی زندگی سے ڈرتی ہے
جیسے آئینے میں شعاعِ سحر — نگہِ ناز یوں اترتی ہے،
ہوتی ہے فرصتوں کی جب توفیق — زندگی تجھ کو یاد کرتی ہے
نگہِ شوخ کر کے وعدۂ لطف — معترف ہے نہ اب مکرتی ہے
یہ اشارے سکوتِ فطرت کے — جیسے وہ آنکھ بات کرتی ہے
نگہِ یار نے اڑا دی مجھ کو، — اب نہ آکاش ہے نہ دھرتی ہے
نشۂ بے خمار خود ہے مگر — عاشقی ہر نشے کو ہرتی ہے
بحرِ غم کی تہوں کو جب پا جائے — زندگی جب کہیں ابھرتی ہے
راز دار اس نظر کو کون کرے — وہ تو ہر بات کہہ گزرتی ہے
زندگی وقفِ اتقا ہو کر، — مسخ ہوتی ہے یا نکھرتی ہے
ہائے کمزوریاں محبت کی — زندگی جن پہ ناز کرتی ہے
اپنی تہذیب ہے عجب تہذیب — نہ تو جیتی ہی ہے نہ مرتی ہے
جیسے قرطاس پر مرے اشعار — کاکلِ ناز یوں بکھرتی ہے
جیسے تالیفِ قلبِ شاعر ہو — کاکلِ ناز یوں سنورتی ہے

ہر نفس ایک سانحہ ہے فراقؔ
کیا کہیں کس طرح گزرتی ہے

سید عابد علی عابد

میں نے جس دن تجھے لیے دشمنِ دیں دیکھا تھا ۔۔۔ ہمتِ تسلیم کو آمادہ کہیں دیکھا تھا
نکہت و نور کے سانچے میں ڈھلی فصلِ بہار ۔۔۔ یہ طلسمات کا نیرنگ نہیں دیکھا تھا
اس کے باوصف کہ روشن تھا چراغِ مہتاب ۔۔۔ رات بھر نجمِ سحر کو گہریں دیکھا تھا
جو برستا تھا سرِ شاخِ نشیمن بادل ۔۔۔ میں نے بجلی کو بھی آسودہ وہیں دیکھا تھا
کیا ہوا دیدہ ورو! قافلۂ فصلِ بہار؟ ۔۔۔ خیمہ زن صحنِ گلستاں میں کہیں دیکھا تھا
رات کو خواب میں شیریں کے شبستاں میں کہیں ۔۔۔ نقشِ فرہاد کو اورنگ نشیں دیکھا تھا
ہاتھ کاٹے گئے میرے کہ بصیرت نے مری ۔۔۔ ہر رگِ سنگ میں بت خانۂ چیں دیکھا تھا
آج پابندِ زمیں ہے وہی رہوارِ خیال ۔۔۔ جس کو یاروں نے سرِ عرشِ بریں دیکھا تھا
میں نے لے نقشِ گرداتم کو مٹانے کے لیے ۔۔۔ آسمانوں کو بھی ہم دستِ زمیں دیکھا تھا
غمِ دوراں کا مداوا نہیں ہوتا مجھ سے ۔۔۔ غمِ جاناں کا یہی روپ نہیں دیکھا تھا

کیا تماشا ہے کہ شیریں سخنی شرط نہ تھی
جب لبِ لعل کو دیکھا شکریں دیکھا تھا

سید واسطی

○

شرابِ ناب کو شبنم بنا کے چھوڑ دیا،
بہار نے قدمِ نیک اٹھا کے چھوڑ دیا

تمام عمر ہے اب اور شبِ سیاہِ فراق
اسیرِ حلقۂ گیسو بنا کے چھوڑ دیا

لگا گئی چمنستان میں آگ بادِ بہار
بہارِ ابر نے گل کو رُلا کے چھوڑ دیا

وہی ہے زمزمہ پیرا دلوں کی دھڑکن میں
جسے نصیب نے شاعر بنا کے چھوڑ دیا

وفورِ مے سے وہ مینا چھلک کے بن گئی پھول
جسے بہار نے غنچہ بنا کے چھوڑ دیا

حیات لائی اُدھر مرگِ آرزو کا پیام
ادھر اجل نے ہمیں مسکرا کے چھوڑ دیا

تری نظر کی بہار آفرینیوں کے نثار
کہ زخمِ دل کو گلِ تر بنا کے چھوڑ دیا

کسی کے خواب مرے غم سے کیوں پریشاں ہو
اٹھا دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کے چھوڑ دیا

ستم ہے اس کی جفائے وفا نما نیّرؔ
کہ مجھ کو جور کا خوگر بنا کے چھوڑ دیا

عدم

○

کب اُٹھے گا حجابِ معنیٔ ساز — کس جگہ گم ہے زمزمہ پرداز
سازِ تحلیل ہو گیا نے میں — مٹ گیا امتیازِ نغمہ و ساز
ہنس دیئے وہ مرے گریباں پر — موسمِ گل کا ہو گیا آغاز
اللہ! اللہ! اس کی انگڑائی — سنگِ مرمر کی کوششِ پرواز
روشنی یوں ہے ذہن میں جیسے — پڑھ رہا ہو کوئی حسین نماز
کر رہے ہیں وہ مست آنکھوں سے — اس طرح رسم و راہ کا آغاز
جس طرح میکدے کا دروازہ — موسمِ گل میں ہو رہا ہو باز
پرشکستہ طیور بھی مالی! — کر گئے دل کے زور پر پرواز
میں کہاں سے کہاں چلا آیا، — آئی تھی کس حسین کی آواز
جنبشِ لب کی اب اجازت دے — جاں بلب ہے تمام محفلِ ناز

دل ہے وہ طفلِ سادہ لوح عدمؔ
جس کا مذہب ہے صدق و شوق و نیاز

قیصر نظر

O

کل وہ دل پر غم دہر نے یوں چھیڑی غزل
میں نے پھر چوم لیا حسن کا ڈھلتا آنچل
دیکھتے دیکھتے ہر چیز کی صورت بدلی
دل کے ویرانے میں تعمیر ہوا رنگ محل
کندنی جسم کی سج دھج وہی روشن چہرہ
وہی بندی کی سجاوٹ وہی تیکھا کاجل
خم ابرو کی نزاکت میں وہ مشکل سا کھنچاؤ
زیر محراب وہ لو دیتے ہوئے نین کنول
دیدۂ شوق میں کھبتا ہوا اٹھتا جوبن
رس بھرے لب کہ بیک وقت ہیں مچھلی اور پھل
گیسوؤں کا وہ جہاں شانوں پہ بکھرا بکھرا
میری آنکھوں میں جو منظر تھا پرستاں لیل
جانے کیوں درد کا دامن ہوا یاد آتو وہ
اور اب میں ہوں نہ وہ عشق کے اسباب وصل
وقت کی بات خوش آتی ہے تفرقت کے ساتھ
حال میں ڈوب گئے ماضی کے جھروکے سے نکل

باقی صدیقی

○

چشمکِ ہمسفراں یاد نہیں
کون بچھڑا ہے کہاں یاد نہیں

دلِ شوریدہ سے اُلجھا تھا کوئی
تم تھے یا دورِ جہاں یاد نہیں

ہم بھی شاکی تھے جہاں بھی شاکی
کون کس پر تھا گراں یاد نہیں

زندگی چال نہ چل جائے کہیں
کوئی بھی اپنا نشاں یاد نہیں

ساتھ کشتی کے لگا تھا کوئی
ہم تھے یا موجِ رواں یاد نہیں

فاصلے بڑھتے گئے بڑھتے گئے
کس کا غم تھا رگِ جاں یاد نہیں

ہم کہاں ہیں کہ ہمیں اب کچھ بھی
جز حدیثِ دگراں یاد نہیں

آگ گلشن میں لگی تھی باقیؔ
فصلِ گل تھی کہ خزاں یاد نہیں

غفار صدیق

○

کس طرح دیکھیے تجھے کیوں کر دیکھیے
دیکھتی آنکھوں جو محشر دیکھیے

حاکمِ وقت ہوئی بے ہنری
اب کوئی عرضِ ہنر کر دیکھیے

جودتِ ذہن ہے جسم سنگیں
مرتکب، خاک برابر دیکھیے

یوسفِ عصر رہا بے مایہ
قارون یوسف کے برادر دیکھیے

ہر خزف ریزہ ہوا لعل بہا
ہیرے دیکھے نہیں کنکر دیکھیے

دیدہ ور کی ہے سزا محتاجی
کم نظر، کسریٰ و قیصر دیکھیے

اسپِ تازی رہا زیرِ پالاں
طوقِ زریں کے لیے خر دیکھیے

عشرت رحمانی

شوق ہم کو لے چلا ہے پھر سوئے بت خانہ آج
کعبۂ ایماں بنا ہے جلوۂ جانانہ آج

ہے جو وہ جانِ تمنا زینتِ بزمِ چمن
غرق ہے رنگینیوں میں نرگسِ مستانہ آج

دیر سے اٹھے جو مستانے چلے ہیں سوئے دار
رقص کرتا جا رہا ہے ساتھ ہی میخانہ آج

چشمِ انجم منتظر ہے دم بخود ہے کائنات
دیکھیے کس کس کو سناتے ہیں ترا افسانہ آج

ہر قدم پر جوشِ مستی رنگِ میخانہ بنا
کھو چکے ہم احترامِ لغزشِ مستانہ آج

خون کلیوں کا ہوا اور نام ہے دورِ بہار
سرفروشوں کا لہو ہے زینتِ میخانہ آج

اپنے پروانوں کی پامالی کا منظر دیکھ لو
ماند ہے یعنی فروغِ محفلِ جانانہ آج

دل جلوں کو گر اٹھاتے ہو اٹھا دو بزم سے
ان کے داغوں سے ہے لیکن رونقِ کاشانہ آج

جرأتِ صبر آزما سے کام لیں عشرت اگر
چھین لیں ساقی سے بڑھ کر ساغر و پیمانہ آج

شہرت بخاری

○

زندگی آن رکی ہے دل میں
آج وہ ٹیس اٹھی ہے دل میں

پھر چراغوں کی لویں ڈوب گئیں
پھر تری بات چلی ہے دل میں

کون جانے ترا غم بھی جل جائے
اب کے وہ آگ لگی ہے دل میں

کوئی سایہ بھی نہ کام آئے گا
یاس کی دھوپ چڑھی ہے دل میں

بعد مدت کے جو دیکھا تو کھلا
اپنی تصویر کھنچی ہے دل میں

وہ دھواں ہے کہ گھٹا جاتا ہے دم
کوئی شمع بجھی ہے دل میں

کس طرف دیکھیں گے کیا دیکھیں گے
زندگی ساری کٹی ہے دل میں

عمر بھر شعر کہے ہیں شہرت
دل کی ہر بات رہی ہے دل میں

رفعت سلطان

سایۂ زلف جہاں پائیں گے
دو گھڑی بیٹھ کے سستائیں گے

مجھ کو بھی غم ہے شکستِ دل کا
وہ بھی کچھ سوچ کے پچھتائیں گے

یوں نہ ہنس میری پریشانی پر
تیرے گیسو بھی بکھر جائیں گے

جب بھی چھیڑے گا کوئی ذکرِ وفا
آپ بے ساختہ یاد آئیں گے

ان اندھیروں سے کرن پھوٹے گی
دن مصیبت کے گزر جائیں گے

جب نہ سوجھے گا انہیں کوئی جواب
وہ مرے سر کی قسم کھائیں گے

ان دنوں آئینہ دیکھیں وہ اگر
آپ ہی اپنے سے شرمائیں گے

اُجڑے میخانوں کو آباد کرو
ورنہ ہم لوگ تو مر جائیں گے

کس کی آواز سنے گی دنیا
اب کوئی گیت نہ ہم گائیں گے

رفعت اس شہر کے رہنے والے
جانے کب تک ہمیں تڑپائیں گے

سجاد ظہیر

○

غم نے جادو وہ جگائے ہیں کہ جی جانے ہے
اور یوں خواب دکھائے ہیں کہ جی جانے ہے

رات اس جلوۂ خاموش نے پہروں ایسے
نغمے آنکھوں سے سنائے ہیں کہ جی جانے ہے

دامِ صحرائے تمنا میں غزالانِ خیال
آج اس رنگ میں آئے ہیں کہ جی جانے ہے

ہم سے یہ سنگ ہی بہتر کہ جگر پہ جس نے
تیشے اس آن سے کھائے ہیں کہ جی جانے ہے

لبِ خاموش نے اک حرفِ تمنا کے لیے
دل کے وہ ناز اٹھائے ہیں کہ جی جانے ہے

دامنِ دل نے مہکتی ہوئی یادوں کے دیئے
یوں سرِ شام بجھائے ہیں کہ جی جانے ہے

عمر بھر نقشِ کفِ پائے تمنا سجاد
اس طرح دل سے مٹائے ہیں کہ جی جانے ہے

ضمیر اظہر

○

پرسشِ حال پہ یک لخت جو رو دیتے ہیں
ایسے بیمار بھرم عشق کا کھو دیتے ہیں

تیرے ہر غم سے عبارت ہے ہماری ہستی
تیرے ہر غم کو رگِ جاں میں سمو دیتے ہیں

قصۂ شوق رقم کرنے سے پہلے عاشق
خونِ دل میں سرِ خامہ کو ڈبو دیتے ہیں،

جانے کس سوز سے جلتے ہیں اُمیدوں کے چراغ!
بعد بجھنے کے بھی مدھم سی یہ لَو دیتے ہیں!

رو لے دل کھول کے تسکین کی خاطر اظہر
اشکِ زنگارِ غم و یاس کو دھو دیتے ہیں؛

ارشد کاکوی

○

بات نہ کہنی آئے تو ہر بات بنے بیکار سی بات
بات کرو تو ایسی جس سے پیدا ہو ہر بات میں بات

ہجر کی رت بس ایک ہی رت ہے کیسا دن اور کیسی رات
آہوں کی لو چلتی ہے، اشکوں کی ہوتی ہے برسات

پھیلا پھیلا آنکھوں میں کاجل، اُلجھے اُلجھے بکھرے بال،
اور بھی ان سایوں کی بدولت روشن ہو گئی پچھلی رات

دنیا تو بس اتنا جانے تم جیتے اور ہم ہارے
پر کیا تم انکار کرو گے ہم نے کھائی جان کے مات

جس نے جیتی عشق کی بازی اس نے جیتا سارا جگ
اس نے ہر جا ٹھوکر کھائی جس نے کھائی عشق میں مات

ایسی بھی یکسانی کیا کچھ فرق تو ہو اے میرے خدا
مرنا جبکہ مقدر ہے پھر زیست ہے کیوں ہر رنگ مات

کس کا شکوہ کیجئے ارشد کیسی قسمت کیا محبوب
جب اپنا ہی دل نہ سنے تو کون سنے پھر اپنی بات،

حسنِ بخت

○

اُٹھو خرابات میں پڑے ہو کوئی مہکتا سرور لاؤ،
کہیں سے پھولوں کا رس نچوڑو کہیں سے تاروں کا نور لاؤ

تمہاری محفل ہے بے سلیقہ خموش رہنا ہی مصلحت ہے
جو ہم سے سننا ہیں دل کی باتیں تو کوئی اہلِ شعور لاؤ

ہماری مشکل پسند فطرت کا ہر تقاضا سمجھنے والو،
کوئی مصیبت جو رہ گئی ہو ہماری خاطر ضرور لاؤ،

چلے چلو زندگی کی راہوں پہ منزلوں کی تلاش لے کر
تمہاری توہین ہے جو دل میں خیالِ نزدیک و دور لاؤ

یہ آرزو ہے کہ بزمِ ہستی سے ہم بھی کچھ انتخاب کر لیں
جو ہو سکے تم سے چند جلوے نظر کی حد تک ضرور لاؤ

تمام محفل میں ہے چراغاں مگر کوئی فائدہ نہیں ہے
جبینِ بخت جواں پہ کوئی شعاعِ قندیلِ نور لاؤ،

اصغر بٹ

انصاف کیا جائے گا

(تمہیدی نوٹ :- قومی تواریخ کے اوراقِ پارینہ کی شیرازہ بندی بڑی عرق ریزی کا کام ہے لیکن تحقیق تامہ اور تجسس بسیار سے گوہرِ مراد دستیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بعد از محنتِ شاقہ ان ذیل روایات کے وہ حصے جو ابھی تک مختصر حالت میں تھے یکجا کئے گئے ہیں۔ جن تاریخی ماخذات سے استفادہ کیا گیا ہے ان میں "انارکلی"۔ "انارکلی کی واپسی"۔ "نورجہاں"۔ "تاریخِ ہند" "پکار" عرف انصاف کا گھنٹہ وغیرہ شہرۂ آفاق نادرات شامل ہیں۔ مصنف)

(منظر - محل میں دیوان خانہ جو نیم دربار اور نیم آرام گاہ کے طور پر آراستہ ہے۔ کمرے کے عین مرکز میں پچھلی دیوار کے ساتھ ایک شاہی مسند ہے اس پر زریں چادر ہے اور کمخواب کے گاؤ تکیے ہیں۔ مسند کے ساتھ ایک سنہری اگالدان ہے۔ پچھلی دیوار میں تین محرابیں ہیں۔ دائیں اور بائیں محرابوں میں تو سنگِ مرمر کی جالیاں ہیں۔ لیکن درمیانی محراب میں سفید پتھر پر رنگ برنگ کے پھول بنے ہوئے ہیں اور پھولوں کے بیچ میں ایک بڑے ترازو کی تصویر ہے جو پچی کاری سے بنی ہوئی ہے۔ دائیں جانب ایک ریشمی گدے دار دیوان پڑا ہے جس میں مختلف رنگوں کے تین گاؤ تکیے لگے ہوئے ہیں۔ دیوان اور مسند کے بیچ میں جو کونہ ہے اس میں لکڑی کی ایک کشمیری پھولدار تپائی رکھی ہے۔ دیوان کے سامنے ایک پرتکلف پیچوان اور ایک چاندی کا اگالدان رکھا ہے۔ پورے کمرے میں ایک بہت بڑا سرخ قالین ہے۔ دائیں اور بائیں جانب سنگِ سرخ کی دیواریں ہیں جن میں تین تین محراب دار ستون ہیں دائیں جانب حرم کی طرف راستہ ہے۔ اور بائیں جانب دیوانِ عام کی طرف۔

جہانگیر دیوان پر نیم دراز ہے۔ ادھیڑ عمر۔ زرد رنگ۔ آنکھوں کے نیچے حلقے۔ مونچھوں میں کہیں کہیں سفید بال۔ جسم فربہی کی طرف مائل کسی زمانے میں یہ شخص ضرور خوبصورت ہوگا لیکن اب عمر نے اسے جھنجوڑ رکھا ہے اس کے ہاتھ میں ایک سنہری پیالہ ہے جس میں سے کچھ پی رہا ہے۔ بائیں جانب ہاتھ باندھے ایک بڈھا حکیم کھڑا ہے)

جہانگیر :- (پیالے کی طرف دیکھتے ہوئے) اچھی چیز ہے حکیم صاحب

حکیم :- جہاں پناہ کی ذرہ نوازی ہے۔

جہانگیر :- میرا خیال ہے کہ ملکہ اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔

حکیم :- جہاں پناہ ملکہ بڑی زیرک ہیں۔

جہانگیر :- لیکن اس میں تو قطعی طور پر شراب کی بو نہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ملکہ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا (ہاتھ سے پیالہ رکھ دیتا ہے)

حکیم :- اس خانہ زاد کی دانست میں شراب آپ کی صحت کے لئے نہایت ضروری ہے۔

جہانگیر :۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ لیکن اب ملکہ کو کون سمجھائے؟

حکیم :۔ اگر جہاں پناہ اپنی صحت کا واسطہ دیں تو ملکہ یقیناً مان جائیں گی۔ کہاں سو پیالے روز کہاں اب محض پندرہ پئیں۔

جہانگیر :۔ (سوچتے ہوئے) اگر آپ ملکہ سے کہیں تو کیسا رہے؟!

حکیم :۔ (چونک کر) جی جہاں پناہ! جہاں پناہ کا حکم ہے۔ (زبان لڑکھڑاتی ہے) بندہ تعمیل کے لئے حاضر ہے..... لیکن ملکہ کہیں خدانخواستہ اس
خانہ زاد کی گستاخی پر محمول نہ فرمائیں۔ جہاں پناہ آپ جانتے ہیں میرے چھوٹے چھوٹے بچے.....

جہانگیر :۔ (آہ بھر کر) ہم سمجھ گئے۔ آپ ڈرتے ہیں۔ دانش مندی یہی ہے۔ حکیم صاحب ہم بھی دانشمند ہیں۔

حکیم :۔ حضور کوئی فرمانا ہی ہے۔

جہانگیر :۔ اچھا حکیم صاحب پھر کل آپ سے گفتگو ہو گی۔

حکیم :۔ (جھک کر) جو حکم عالی جاہ (الٹے پاؤں بائیں جانب سے نکل جاتا ہے)

جہانگیر :۔ (تالی بجاتا ہے) کوئی ہے؟

(دائیں جانب سے ستارہ بھاگتی ہوئی داخل ہوتی ہے۔ ستارہ کوئی اٹھارہ برس کی لڑکی ہے چلبلی اور البیلی،
شکل مناسب ہے۔ لیکن جوانی رویں رویں سے پھوٹ رہی ہے۔ طرار آواز میں باتیں کرتی ہے)

ستارہ :۔ حکم سرکار؟

جہانگیر :۔ (گھوم کر اس کی طرف دیکھتا ہے) میں نے چوبدار کو بلایا تھا

ستارہ :۔ (واپس جانے کے لئے مڑتی ہے) بہتر سرکار۔

جہانگیر :۔ ستارہ!

ستارہ :۔ جی عالی جاہ

جہانگیر :۔ سامنے آؤ

(ستارہ سامنے آتی ہے اور جھک کر آداب بجالاتی ہے)

جہانگیر :۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمارے قریب منڈلاتی رہتی ہو۔ ذرا سا اشارہ پا کر آن پہنچتی ہو۔

ستارہ :۔ حضور اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں

جہانگیر :۔ اجازت ہے۔

ستارہ :۔ حضور شمع کے گرد پروانے منڈلاتے ہی رہتے ہیں۔

جہانگیر :۔ (بناوٹی خفگی سے) اگر ملکہ نے سن لیا تو گدی سے زبان کھچوا دیں گی۔

(باہر سے گھنٹہ پھر بجتا ہے)

جہانگیر :۔ جاؤ چوبدار کو بلاؤ۔

ستارہ :۔ جو حکم ——— (بائیں جانب بڑھتی ہے اور جھانک کر واپس گھومتی ہے) حضور باہر چوبدار آپ کے حکم کا منتظر ہے (دائیں جانب جھک کر) چوبدار

چوبدار :- (داخل ہوتے ہی جھک جاتا ہے) حکم سرکارِ عالم
جہانگیر :- باہر کوئی فریادی ہے۔ اہبدولت کی طبیعت ٹھیک نہیں یہیں بھیج دو.
چوبدار :- جو حکم جہاں پناہ (ویسے ہی جھکا جھکا واپس بائیں جانب سے نکل جاتا ہے)
جہانگیر :- (پیالہ اٹھا کر پیتا ہے اور منہ بناتا ہے) کڑوی! اچھی!
ستارہ :- نصیبِ دشمناں حضور کی طبیعت کچھ .... ؟
جہانگیر :- اہبدولت کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں.
ستارہ :- اگر شکایت کا علم ہو تو یہ لونڈی شاید کچھ کر سکے ؟
جہانگیر :- (پیالہ تپائی پر رکھ کر) تمہیں حکمت سے بھی کچھ شغف ہے ؟
ستارہ :- حضور کا اقبال سلامت. بندی کا باپ ایک حکیم تھا اور کچھ نسخے ایسے ہیں جو سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں
جہانگیر :- (دلچسپی سے) اچھا ؟ ہمیں اس کا علم پہلے کیوں نہیں ہوا ؟
ستارہ :- جہاں پناہ کو اپنے ہنروں کا منہ پر لانا ناگوارِ خاطر تھا.
جہانگیر :- ہوں! ستارہ تم بڑی شریر ہو۔ ہم ملکہ سے تمہاری شکایت کریں گے.
ستارہ :- حضور بندی کا ذکر کریں اس سے بڑھ کر سعادت لونڈی کو کیا نصیب ہو سکتی ہے ــــــ ؟
جہانگیر :- لیکن یہ ذکرِ خیر نہیں ہوگا۔ اور ملکہ کے غصے کو تم جانتی ہو.
ستارہ :- مجھے جہاں پناہ کے غصے کا زیادہ غم ہوگا.
جہانگیر :- ہمیں تو خیر اب غصہ آتا ہی نہیں۔ ہمارا غصہ مر چکا ہے اب تو ملکہ ہماری طرف سے غصہ ہوتی ہیں
ستارہ :- لیکن مسکراتے تو جہاں پناہ خود ہی ہیں
جہانگیر :- (ہنس کر) ہاں ہماری طرف سے ابھی وہ مسکرا نہیں پائیں۔ ستارہ تم بڑی گستاخ ہو. تمہیں محل بند کروا دیتے لیکن جاؤ معاف کیا.
ستارہ :- (جھک کر آداب بجا لاتی ہے) جہاں پناہ کی نوازشات کے شکریہ میں زبان یاری نہیں کرتی.

(دائیں جانب سے نکل جاتی ہے. بائیں جانب سے چوبدار داخل ہو کر جھک جاتا ہے)

چوبدار :- جہاں پناہ فریادی حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے.
جہانگیر :- (دیوان سے اٹھ کر مسند کے قریب جاتا ہے اور مسند پر کہنی ٹیک کر ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے) حاضر ہونے کی اجازت ہے.

(رحما دھوبی داخل ہوتا ہے. ایک نہایت میلا پتلا منحنی سا آدمی ہے۔ ادھیڑ عمر. ڈرپوک. کالی مونچھیں
ہونٹوں کے قریب نیچے کو لٹک رہی ہیں. آتے ہی جھک جاتا ہے)

جہانگیر :- تم کیا چاہتے ہو ؟
رحما :- (ویسے ہی جھکے ہوئے) حضور میرا نام رحما دھوبی ہے.

جہانگیر: کیا؟

(چوبدار رحما کو پکڑ کر سیدھا کرتا ہے)

رحما: حضور میرا نام رحما دھوبی ہے۔

جہانگیر: ہم نام نہیں پوچھ رہے۔ کام پوچھ رہے ہیں۔

رحما: حضور میں انصاف چاہتا ہوں۔

جہانگیر: انصاف کیا جائے گا۔

رحما: حضور میری بیوی کو آپ کا مہاوت بھگا کر لے گیا ہے۔

جہانگیر: (مسند کا سہارا چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے) کون، شیر دل خان؟

رحما: حضور اس کا پورا نام تو معلوم نہیں لیکن ہم اسے شیر دل کہتے ہیں

جہانگیر: چوبدار، شیر دل کو حاضر کیا جائے۔

رحما: جو حکم سرکار۔ (جھک کر واپس نکل جاتا ہے)

جہانگیر: کیا تمہارے ساتھ اس کی کوئی دشمنی تھی؟

رحما: نہیں حضور بڑی دوستی تھی۔

جہانگیر: (چیں بہ جبیں) دوستی؟

رحما: جی ہاں حضور۔ وہ حضور کے ہاتھیوں کو نہلانے کے لئے اسی گھاٹ پہ لاتا ہے جس پہ ہم کپڑے دھوتے ہیں۔

جہانگیر: کیا تمہارے ساتھ تمہاری بیوی بھی وہیں گھاٹ پہ کپڑے دھوتی تھی؟

رحما: نہیں حضور

جہانگیر: تو۔ ! تو اس نے تمہاری بیوی کو کہاں دیکھا؟

رحما: وہیں گھاٹ پہ حضور ! حضور میری بیوی کپڑے دھوتی نہیں تھی۔ مجھ سے دھلواتی تھی۔

جہانگیر: ہاں ہاں۔ خیر ایک ہی بات ہے اور یہ واقعہ کب کا ہے؟

رحما: حضور ایک مہینہ ہوا۔

جہانگیر: ایک مہینہ؟ اور تم آج فریاد لے کر آئے ہو؟

رحما: حضور پہلے خوشی میں بھول ہی گیا۔

جہانگیر: خوشی میں؟ کیا مطلب؟

رحما: سرکار ہماری شادی کو دس برس ہو چکے ہیں۔

جہانگیر: تو۔ ؟

رحما: سرکار ایک برس بھی بہت ہوتا ہے، دس برس بعد ایسے حادثے سے بڑی خوشی ہوتی ہے

گیر :- کہو پھر تم فریاد کس بات کی لائے ہو ؟

ا :- بستی ساری برادری مجھ پر ہنستی رہتی ہے۔ میری ناک کٹ گئی ہے۔

انگیر :- (تھوڑا ہنستے سوچتے ہوئے پھر مسند پر جاکر بیٹھ جاتا ہے) دھنیا!

ا :- (جھک کر) جہاں پناہ

گیر :- ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ تم ہمت کی بیوی کو بھگا لو۔ (دھنیا بدستور جھکا رہتا ہے) جاؤ۔

ر :- (ذرا سے سیدھا کرتے ہوئے) جاؤ

ا :- (سیدھا ہو کر) حضور کا اقبال بلند۔ لیکن حضور ......

انگیر :- لیکن کیا؟ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔

ا :- لیکن حضور اس کی کوئی بیوی نہیں ہے۔

انگیر :- (جھنجھلا کر) تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ (مسند سے اتر کر ٹہلتا ہے) مفت میں سارا فیصلہ غلط کروا دیا۔

ا :- حضور میرا خیال تھا......

انگیر :- (ٹہلتے ہوئے غصے کی) چپ رہو۔ سوچنے دو۔ (سر پکڑ کر مسند پر بیٹھ جاتا ہے) کوئی اور صورت نہیں (سر اٹھا کر) دھنیا

ا :- سرکار

انگیر :- ہم تمہاری بیوی تمہیں واپس دلوانے کا حکم دیتے ہیں

ا :- لیکن......

انگیر :- لیکن کیا ؟

ا :- لیکن حضور کیا شیر دل کا قصور معاف کر دیا جائے گا ؟

انگیر :- (غصہ اور سختی سے) تو کیا چاہتے ہو ؟

ا :- حضور مجھے بیوی بہا مل جائے

انگیر :- بیوی بہا ! کیا معنی ؟

ا :- جس طرح خون بہا ہوتا ہے ویسے ہی

انگیر :- (مسند سے اتر کر) بہت اچھا ایسا ہی ہوگا۔ تمہارا مطالبہ کتنی رقم کا ہے ؟

ا :- حضور میں لالچی نہیں ہوں۔ اگر اس کے تول کے چاندی کے سکے مل جائیں تو مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔

انگیر :- (کچھ سوچ کر) اگر شیر دل اتنی رقم نہ دے سکا تو ؟ تمہاری بیوی کا وزن کیا ہوگا ؟

ا :- حضور خاصی وزنی ہے

انگیر :- پھر بھی ؟

س :- (سوچتے ہوئے) اب تول تو معلوم نہیں حضور۔ ایک ایک ہاتھ ایک ایک سیر کا ہے۔

جہانگیر :- دھوبی ایسا معلوم ہوتا ہے تم بیوی سے بہت ڈرتے تھے۔

رحما :- حضور سب بیویوں والے بیویوں سے ڈرتے ہیں۔

جہانگیر :- کیا مطلب؟ ہم تو نہیں ڈرتے۔

رحما :- حضور اگر جان بخشی ہو تو میں کچھ عرض کروں

جہانگیر :- اجازت ہے۔

رحما :- حضور بعض مان جاتے ہیں بعض نہیں مانتے۔

جہانگیر :- نہیں نہیں تم بہت ڈرپوک واقع ہوئے ہو اگر تم ڈرپوک نہ ہوتے تو شیر دل سے بدلہ لینے پہنچتے۔

رحما :- حضور نے بجا ارشاد فرمایا۔ ایک بیوی ہی میرے لئے بہت تھی۔ اور اس کے ساتھ اگر شیر دل بھی مل جاتا تو آج اس فریادی کی لاش ہی فریاد کرنے کو آتی۔

جہانگیر :- خیر۔ تم نے قانون کی پناہ چاہی ہے۔ وہ پناہ تمہیں دی جائے گی۔

رحما :- شہنشاہ کا اقبال سلامت

(بائیں جانب سے چوب دار داخل ہوتا ہے)

چوبدار :- شیر دل حاضر ہے جہاں پناہ!

جہانگیر :- (مسند پر بیٹھ کر) ملزم کو پیش کیا جائے۔

(بائیں جانب سے شیر دل سر جھکائے داخل ہوتا ہے اور کورنش بجا لاتا ہے۔ شیر دل کوئی چالیس برس کا سیاہ فام لحیم شحیم آدمی ہے)

جہانگیر :- شیر دل اس دھوبی کو جانتے ہو؟

شیر دل :- جی ہاں جہاں پناہ

جہانگیر :- جانتے ہو یہ کس لئے حاضر ہوا ہے؟

شیر دل :- حضور اس کا خیال ہے کہ میں نے اس کی بیوی کو بھگایا ہے۔

جہانگیر :- تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم نے نہیں بھگایا؟

شیر دل :- نہیں جہاں پناہ

رحما :- حضور یہ جھوٹ کہتا ہے

شیر دل :- جہاں پناہ۔ اس کی بیوی نے مجھے بھگایا ہے۔

جہانگیر :- اس سے غرض نہیں۔ وہ عورت آجکل تمہارے پاس ہے یا نہیں؟

شیر دل :- (سر جھکا لیتا ہے) جی ہاں جہاں پناہ

جہانگیر :- اور تمہیں معلوم ہے کہ قانونی طور پر تم اسے اپنے ہاں نہیں رکھ سکتے۔

شیر دل :- حضور جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔

جہانگیر :- جو لوگ ماں کا درد نہیں کرتے۔ لیکن تمہیں بولنے کی اجازت ہے۔
شیردل :- ظلِ شہنشاہ عالم میں اس عورت کو اپنے گھر پر رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ لیکن یہ زبردستی کر رہی ہے۔
رحما :- حضور یہ جھوٹ کہتا ہے۔
جہانگیر :- خاموش ــــ ! شیردل اگر تم اس عورت کو رکھنے کے لئے تیار نہیں تھے تو پہلے دن کیوں اسے اپنے گھر میں آنے دیا تھا ؟
شیردل :- جہاں پناہ ناتجربہ کاری میں غلطی ہو جاتی ہے اس غلطی کی سزا جو آپ تجویز فرمائیں اس غلام کی سر آنکھوں پر لیکن صاحب عالم میری بھی ایک عرضداشت ہے
جہانگیر :- کیا ــ ؟
شیردل :- اس عورت کو واپس اس کے میاں کے گھر پہنچا دیا جائے۔
رحما :- (چلاتی ہے) نہیں نہیں حضور ــ نہیں یہ درخواست حضور کبھی نہ ......
جہانگیر :- (ہاتھ اٹھا کر) اس کا فیصلہ ہم بدولت خود کریں گے۔ تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔ شیردل۔
دھوبی کا مطالبہ ہے کہ تم اس عورت کے وزن کے چاندی کے سکے اسے دو۔
شیردل :- جہاں پناہ یہ غلام اپنا گھر بار بھی اسباب بیچ کر یہ رقم ادا کر دے گا۔
جہانگیر :- دھوبی تمہیں اپنی بیوی واپس لینا پڑے گی۔
رحما :- شہنشاہ کے فیصلے کے سامنے میری مجال نہیں کہ چوں بھی کر سکوں لیکن جہاں شہنشاہ نے رحم فرما کر میری ایک فریاد سنی ہے وہاں میری ایک اور فریاد بھی سن لیں۔
جہانگیر :- کہو۔
رحما :- حضور میں نے شیردل کا کیا بگاڑا ہے کہ وہ میری بیسی چھوڑنا چاہتا ہے
جہانگیر :- یہ بات تمہیں پہلے سوچنی چاہئے تھی۔
رحما :- جہاں پناہ میں بھی شادی سے پہلے ناتجربہ کار تھا لیکن اب اگر شہنشاہ مناسب خیال فرمائیں تو میں چاندی کے سکے چھوڑنے کیلئے تیار ہوں۔
جہانگیر :- شیردل اگر تمہیں منظور ہو تو ہم دھوبی سے طلاق دلا کر اس عورت کی شادی تم سے کر دیں۔
شیردل :- جہاں پناہ کا حکم ہو تو سرتابی کی مجال نہیں لیکن اگر غلام کے لئے کوئی اور سزا تجویز فرمائی جائے تو بندہ تاعمر احسان نہ بھولے گا۔
جہانگیر :- (مسند سے اٹھ کر ٹہلتا ہے) عجیب مشکل ہے (ذرا تامل کے بعد) اچھا ہم بدولت اس مقدمے کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ چوبدار
چوبدار :- جہاں پناہ
جہانگیر :- ان دونوں کو لے جاؤ۔ باہر انتظار کریں۔
چوبدار :- جو حکم عالی جاہ۔

(چوبدار، رحما اور شیردل کو اشارہ کرتا ہے۔ سب جھک کر واپس باہر نکل جاتے ہیں۔ جہانگیر پریشان ٹہل رہا ہے پھر تالی بجاتا ہے۔ بائیں جانب سے چوبدار اور دائیں جانب سے ستارہ داخل ہوتی ہے)

جہانگیر :- (ستارہ سے) ہم ملکہ سے ملنا چاہتے ہیں۔

ستارہ :۔ جو حکم (دائیں جانب واپس لوٹ جاتی ہے)

جہانگیر :۔ نہیں ہم نے تمہیں نہیں بلایا تھا (چوبدار واپس جانے لگتا ہے) اچھا ٹھہرو (چوبدار رک جاتا ہے)

چوبدار :۔ عالی جاہ

جہانگیر :۔ چوبدار تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ !

چوبدار :۔ جی ہاں جہاں پناہ

جہانگیر :۔ تمہیں اپنی بیوی سے کوئی شکایت ہے ؟

چوبدار :۔ جی نہیں سرکار۔

جہانگیر :۔ بہت بہتر ہے۔

چوبدار :۔ لیکن عالی جاہ میری بیوی کو مجھ سے کئی شکایتیں ہیں۔

جہانگیر :۔ مثلاً

چوبدار :۔ حضور وہ شکایتیں ایسی ہیں کہ شہنشاہ کے گوش گزار کرنے کی جرأت نہیں سکتا۔

جہانگیر :۔ نہیں نہیں کہو اس سے ہمیں مقدمے کا فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

چوبدار :۔ مثلاً حضور میری بیوی کو یہ شکایت ہے کہ میں کسی صوبے کا حاکم اعلیٰ کیوں نہیں ہو جاتا۔ اور اگر میں کہتا ہوں کہ میں اس قابل نہیں تو وہ کہتی ہے کہ قابل کیوں نہیں ہو جاتے۔

جہانگیر :۔ خوب ! اور ؟

چوبدار :۔ اور کہتی ہے کہ مجھے خوبصورتی کی پہچان نہیں۔

جہانگیر :۔ تو کیوں پہچان نہیں ہے ؟

چوبدار :۔ حضور وہ خوبصورت بے شک ہوگی میری آنکھوں کا قصور ہے۔

جہانگیر :۔ آنکھوں کا قصور ہے تو آنکھوں کا علاج کراؤ۔ ہر روز رات کو سرمہ لگایا کرو (اس کی طرف غور سے دیکھ کر) اور تمہاری مونچھیں خشک ہیں۔ مونچھوں میں تیل لگایا کرو۔

جہانگیر :۔ (آواز دے کر) ستارہ

(دائیں جانب سے ستارہ داخل ہوتی ہے)

ستارہ :۔ جہاں پناہ

جہانگیر :۔ ہمارے چوبدار کی آنکھوں میں کچھ خرابی ہے۔ تم بھی حکمت جانتی ہو۔

ستارہ :۔ علالت کی نوعیت کیا ہے جہاں پناہ ؟

جہانگیر :۔ یہ خوبصورتی نہیں پہچان سکتا۔

ستارہ :۔ یہ تو بڑا تشویشناک مرض ہے جہاں پناہ۔ اس کا علاج تو فوراً ہونا چاہیئے۔

جہانگیر :۔ ہم نے اسی لئے تمہیں بلایا ہے۔
ستارہ :۔ ذرا آنکھیں جھپکنے دیجئے ابھی رکھتی ہے پھر آنکھیں کھول دیتی ہے) چوبدار۔ جہاں پناہ کی طرف دیکھو۔
چوبدار :۔ (جہانگیر کی طرف دیکھ کر) جی
ستارہ :۔ یہ جہاں پناہ کی تابندہ پیشانی۔ جہاں پناہ کا روشن چہرہ۔ جہاں پناہ کا سڈول جسم تمہیں نظر آ رہے ہیں۔
چوبدار :۔ جی سرکار۔
ستارہ :۔ کیا ان میں تمہیں کوئی خوبصورتی نظر آتی ہے؟
چوبدار :۔ جہاں پناہ کی خوبصورتی میں کسے کلام ہو سکتا ہے؟
ستارہ :۔ دیکھا جہاں پناہ۔ میں نے اس کا علاج کتنی جلدی کر دیا۔
جہانگیر :۔ (معنی خیز انداز میں) تو تم نے یہ حکمت پڑھ رکھی ہے ——— اچھا چوبدار تم جاؤ۔
چوبدار :۔ بہتر عالی جاہ (جھک کر بائیں جانب سے نکل جاتا ہے)
جہانگیر :۔ ستارہ تم نے ہمارا مرض تشخیص کیا؟
ستارہ :۔ جی ہاں عالی جاہ۔
باہر سے عورت کی آواز :۔ باادب! باملاحظہ ہوشیار ملکہ عالم تشریف لائی ہیں۔
جہانگیر :۔ (یکایک چونک کر) تخلیہ!
ستارہ :۔ بہتر جہاں پناہ

(دائیں جانب جھک کر نکل جاتی ہے۔ جہانگیر بڑھ کر مسند پہ بیٹھ جاتا ہے۔ دائیں جانب سے نورجہاں داخل ہوتی ہے کوئی پینتیس برس کا سن ہوگا۔ اونچی ناک۔ چہرے پر رعب و تکبر ٹپکتا ہے۔ لمبا قد۔ دبلی پتلی سی ہے۔ زیادہ خوبصورت نہیں لیکن بڑی بنی سنوری ہے)

جہانگیر :۔ مہرو ہم ایک مقدمے کی وجہ سے کچھ پریشان ہیں
نورجہاں :۔ (دائیں جانب دیوان پر بیٹھ کر) کیا مقدمہ ہے جہاں پناہ؟
جہانگیر :۔ ہمارا جہارت شیر دل کسی دھوبی کی بیوی کو بھگا لایا ہے۔ اب دھوبی ہرجانہ مانگتا ہے اور بیوی واپس لینے کو تیار نہیں۔ ادھر شیر دل ہرجانہ دینے کو تیار ہے لیکن عورت رکھنے کو وہ بھی تیار نہیں۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ اس عورت کا کیا ہوگا؟
نورجہاں :۔ جہاں پناہ میں نے آجکل کے مردوں میں ایک خطرناک رجحان دیکھا ہے اور وہ یہ کہ وہ بیویوں سے پلہ چھڑانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اس کا سد باب فوراً ہونا چاہیے۔
جہانگیر :۔ (مسند سے اٹھ کر بائیں جانب دیکھتے ہوئے) خیر یہ بعد کی بات ہے فی الحال تو اس مقدمے کو نپٹانا ہے۔
نورجہاں :۔ اصل سوال وہی ہے کہ دھوبی اپنی بیوی کو کیوں نہیں رکھتا؟
جہانگیر :۔ (مڑ کر نورجہاں کی طرف دیکھتے ہوئے) ظاہر ہے کہ جب وہ دوسرے مرد کے ساتھ بھاگی ہے تو وہ اسے کس طرح واپس لے آئے۔ رشتہ بڑا نازک ہے

دونوں ایک دوسرے سے چھین لیں گے۔ یا کم از کم دوسرا ان کو چھین لے گا۔

نورجہاں :- قصہ ختم کروا دیجئے۔ ساری جھنجھٹ دور ہو جائے گی۔

جہانگیر :- یہی تو مشکل ہے۔ وہ چپ چاپ ملک چھوڑنے کو تیار ہے لیکن لڑکی کی واپسی پر رضامند نہیں۔

نورجہاں :- ایسے مرد کو گلا کٹوا دینے چاہئیں۔ مرد تو بیسیوں دفعہ دوسری عورتوں سے پینگیں بڑھاتے ہیں (جہانگیر ایک جھٹکا سا محسوس کرتا ہے) اور بیویاں انہیں نہیں چھوڑتیں۔

جہانگیر :- کاش چھوڑ دیں

نورجہاں :- کیا ---؟

جہانگیر :- (گھبرا کر) کچھ نہیں

نورجہاں :- آپ ہی تو کہہ رہے تھے کہ جب ایک دفعہ بیوی کسی دوسرے کے بہکانے میں آ جاتی ہے تو مرد اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ جب کہ خود اس کا اپنا قصور بھی ہوتا ہے۔

جہانگیر :- اپنا قصور --!

نورجہاں :- اس کا قصور یہ ہے کہ اس نے دوسرے مرد کو اپنی بیوی سے ملنے ہی کیوں دیا ------؟

جہانگیر :- (کسمسا کر) لیکن شیر علی کا بھی تو قصور ہے وہ کیوں نہ اس عورت سے شادی کر کے نکلتے۔

نورجہاں :- بچتے --؟ جہاں پناہ آپ بھی دوسرے مردوں کی طرح ازدواجی زندگی کی تلخیوں کو بھگتنا کہہ رہے ہیں ---------

جہانگیر :- (بات کاٹ کر) اوہو۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا ----

(گھنٹے کی آواز)

جہانگیر :- یہ گھنٹہ جب سے لگوایا ہے مصیبت میں جان آ گئی ہے چوبیس گھنٹے ٹن ٹن ٹن ٹن۔

نورجہاں :- میں نے اس وقت لگوانے سے منع نہیں کیا تھا؟

جہانگیر :- تم تو بہت سی باتوں سے منع کرتی ہو۔

نورجہاں :- اور آخر میں میری بات ٹھیک نکلتی ہے۔

جہانگیر (طنزاً) جی ہاں۔ درست (آواز دیتا ہے) ستارہ۔ ستارہ۔

نورجہاں :- (ذرا تامل کے بعد) آپ کو لونڈیوں کے نام خوب یاد ہیں۔

جہانگیر :- وہ لونڈی نہیں ہے۔

نورجہاں :- (چونک کر) تو --؟

(دائیں جانب سے ستارہ داخل ہوتی ہے)

ستارہ :- جہاں پناہ۔

جہانگیر :- دیکھو باہر کون فریادی آیا ہے --؟

ستارہ :۔ جی جہاں پناہ (بائیں جانب بڑھتی ہے)

نور جہاں :۔ ذرا سنو لڑکی

ستارہ :۔ (رک کر) حکم عالم

نور جہاں :۔ تم کب سے محل سرا میں ہو؟

ستارہ :۔ دو سال سے ملکۂ عالم

نور جہاں :۔ کہاں سے آئی ہو؟

ستارہ :۔ بنگال سے —

نور جہاں :۔ بنگال سے — ؟

ستارہ :۔ میرے والد حکیم تھے شاہی مہم پر مارے گئے وہ خانخاناں کے مصاحب بھی تھے اس لئے خانخاناں نے مجھے محل سرا میں بھجوا دیا۔

نور جہاں :۔ تو تم بھی بنگال سے آئی ہو!

(گھنٹہ پھر بجتا ہے)

جہانگیر :۔ جاؤ دیکھو کون ہے؟

ستارہ :۔ جی جہاں پناہ (بائیں جانب سے نکل جاتی ہے)

جہانگیر :۔ تم بھی سے کیا مطلب؟

نور جہاں :۔ میں بھی بنگال سے آئی تھی نا

جہانگیر :۔ اوہ (سر جھکائے ادھر ادھر ٹہلتا ہے) علی قلی خان اچھا آدمی تھا۔

نور جہاں :۔ اچھا اور برے کو تو میں نہیں جانتی لیکن اس نے اپنی بیوی کے علاوہ کبھی کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

جہانگیر :۔ اوہ (یونہی ٹہلتے ہوئے اور سوچتے ہوئے) یہی سن کر بڑا رنج ہوتا ہے کہ تم کبھی کبھی اسے ہم سے بہتر سمجھتی ہو۔

نور جہاں :۔ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے۔

جہانگیر :۔ (رک کر نور جہاں کی طرف دیکھتے ہوئے) تو آخر ہم میں بھی کوئی خوبی ہوگی۔

نور جہاں :۔ آپ شہنشاہ ہند ہیں۔

جہانگیر :۔ (ناامیدی سے) بس؟

نور جہاں :۔ جہاں پناہ شہنشاہ تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

جہانگیر :۔ یہ جواب ناکافی ہے۔ آخر دنیا میں ہم نے کوئی تو اچھا کام کیا ہوگا۔ کیا وہ ہماری خوبی کے طور پر شمار نہیں کیا جا سکتا؟

نور جہاں :۔ کیوں نہیں

جہانگیر :۔ — ؟

نور جہاں :۔ شاید یہی کہ آپ نے ملک کا انتخاب بالکل صحیح کیا۔

(بائیں جانب سے ستارہ داخل ہوتی ہے)

ستارہ :۔ جہاں پناہ باہر ایک فریادی عورت کھڑی ہے۔

جہانگیر :۔ کیا کہتی ہے؟

ستارہ :۔ یہ تو اس نے بتایا نہیں عالی جاہ۔ لیکن اس کا نام نادرہ ہے۔

جہانگیر :۔ (نور جہاں کی طرف دیکھ کر) یہیں بلوائیں؟ آپ بھی اس کا مقدمہ سن لیں۔۔۔۔

نور جہاں :۔ بسر و چشم

جہانگیر :۔ (ستارہ سے) اسے اندر بھیج دو۔

ستارہ :۔ جو حکم عالی جاہ (بائیں جانب گھوم کر چلتی ہے)

جہانگیر :۔ (یکایک چونک کر) نادرہ! ستارہ کیا کہا تھا نادرہ؟

ستارہ :۔ (رک کر) جی حضور یہی نام بتایا تھا اس نے۔

جہانگیر :۔ (ہوں۔ تامل کے بعد نور جہاں سے) بہر حال ہم نے خواہ مخواہ آپ کو زحمت دی۔ آپ جا کر آرام کریں۔ جانے کیا مقدمہ ہے۔ آپ کی بیج خراشی ہو گی۔

نور جہاں :۔ (شک کے عالم میں) نہیں جہاں پناہ مجھے مقدمہ سے بے حد دلچسپی ہے۔

جہانگیر :۔ ہماری بھی طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں ہمارا خیال ہے کہ ہم اس وقت مقدمہ نہیں سن سکیں گے ستارہ!

ستارہ :۔ جی سرکار

ستارہ :۔ حکیم صاحب جو دوائی دے گئے ہیں۔ وہ فورا دو

نور جہاں :۔ نصیب دشمناں آپ کی طبیعت ناساز تھی تو آپ نے اس لونڈی کو کیوں یاد نہیں فرمایا؟

(ستارہ بڑھ کر تپائی سے سنہری پیالہ اٹھا لیتی ہے)

نور جہاں :۔ لڑکی ادھر دو مجھے یہ پیالہ (ستارہ نور جہاں کو پیالہ دیتی ہے)۔۔۔۔۔ اس سے تو بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے

جہانگیر :۔ (بے پروائی سے) دوائی ہے بہر صورت دوائی ہے خوشبو ہو یا نہ ہو۔

نور جہاں :۔ (انگلی لگا کر چکھتی ہے) اور اس کا تو ذائقہ بھی دوائی کا سا نہیں (اٹھ کر پیالہ پیش کرتی ہے)

جہانگیر :۔ (ہنس کر) ہمارے حکیم صاحب ذوق معلوم ہوتے ہیں (پیالہ لے کر ایک دو گھونٹ پیتا ہے)

نور جہاں :۔ جہاں پناہ اگر کوئی فریادی در دولت سے نامراد لوٹا تو جہانگیر کے انصاف کی روایات پہ حرف آئے گا۔

جہانگیر :۔ (ایک گھونٹ اور پی کر بے خیالی سے) ہاں ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔

نور جہاں :۔ (ستارہ سے) لڑکی فریادی کو حاضر کیا جائے۔

جہانگیر :۔ (فوراً سنبھل کر) نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔

نور جہاں :۔ تو جہاں پناہ!

جہانگیر :- (سر کھجاتے ہوئے ستارہ سے) تو اس نے کام نہیں بتایا ؟
ستارہ :- نہیں سرکار۔ بس اپنا نام بتایا ہے۔ نادرہ۔
نور جہاں :- جہاں پناہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس عورت کو جانتے ہیں۔
جہانگیر :- نہیں نہیں ـــــ (سوچ کر) معلوم نہیں رہی ہے۔ کون ہے۔
نور جہاں :- (یعنی) ابھی نادرہ کے علاوہ جسے چنبیلا بیگم نے والے انارکلی کہتے تھے۔ آپ کسی اور نادرہ کو بھی جانتے ہیں ؟
جہانگیر :- نہیں تو۔
نور جہاں :- تو پھر الجھن کیا ہے۔ انارکلی کو تو زندہ دیوار میں چن دیا گیا تھا۔ یقیناً کوئی اور ہے۔
جہانگیر :- (مسند سے اتر کر) ہو سکتا ہے لیکن ......
نور جہاں :- (ستارہ سے) لڑکی فریادی کو پیش کیا جائے۔
ستارہ :- بہتر ملکۂ عالم (بائیں جانب سے نکل جاتی ہے)

(جہانگیر سر جھکائے ادھر ادھر ٹہلتا ہے۔ پھر رک کر نور جہاں سے مخاطب ہوتا ہے)

جہانگیر :- بات یہ ہے کہ خلد آشیانی کے حکم کی تعمیل میں انارکلی کو دیوار میں چن تو دیا گیا تھا لیکن وہ نادرہ نہ تھی۔
نور جہاں :- تو عالی جاہ ؟
جہانگیر :- ہم نے انارکلی کے پودے سے ایک کلی توڑ کر معماروں کو دے دی تھی اور نادرہ کو دکن بھجوا دیا تھا۔
نور جہاں :- تو خلد آشیانی کو اس کا علم نہیں ہوا ؟
جہانگیر :- چند سپاہی اور چند معمار ہی وہ لوگ تھے جن کے ذمے یہ کام تھا۔ ان کو خریدنا مشکل نہیں تھا۔ اور انعام کے وعدے اور قتل کی دھمکیاں بھی تھیں۔
نور جہاں :- ہوں (تخت کے پایہ پر بیٹھ جاتی ہے) تو انارکلی زندہ ہے!
جہانگیر :- معلوم نہیں ـــ ہم نے اسے کہا تھا کہ وہ تمام عمر ادھر کا رخ نہ کرے۔
نور جہاں :- تو اس کی شادی آپ نے کہیں کر دی تھی ؟
جہانگیر :- (چونک کر) یہ خوب! گویا ہم لوگوں کی شادیوں کے بھی ذمہ دار ہیں گویا۔
نور جہاں :- اس بات کو کافی عرصہ ہو چکا ہے اب تو
جہانگیر :- (گن کر) پانچ ـ دس ـ پندرہ ـــــ پندرہ برس ہو گئے۔
نور جہاں :- میں نے سنا جہاں پناہ کافی فریفتہ تھے اس پر
جہانگیر :- ہوں ـــــ نہیں تو ـــــ کوئی خاص نہیں ـــــ بس یونہی دبلی پتلی نازک سی لڑکی تھی ـــــ بات یہ ہے کہ ابو الحسن کے ایام طفلی میں ویلی تیار ہو گئیں
خدا جانے کیا تھیں۔ محض ہمایاں کی طرح۔
نور جہاں :- اصحاب ؟
جہانگیر :- صاحب تمہاری کے علاوہ ہماری آنکھوں میں اور کوئی سماتا ہی نہیں۔

(ستارہ بائیں جانب سے داخل ہوتی ہے)

ستارہ :۔ فریادی حاضر ہے شہنشاہِ عالم۔

جہانگیر :۔ اجازت ہے۔

(نادرہ داخل ہوتی ہے۔ عمر تو نور جہاں جتنی ہی ہے لیکن قد نور جہاں سے چھوٹا ہے جسم بھاری بھرکم۔ ناک نقشہ نور جہاں سے بہتر لیکن غربت کے نشان عیاں ہیں۔ لباس معمولی ہے۔ نادرہ داخل ہو کر کورنش بجا لاتی ہے۔ صرف جہانگیر کو دیکھ رہی ہے)

جہانگیر :۔ (نادرہ کو غور سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے) انارکلی کو کیا ہو گیا ہے؟ (منہ پھیر لیتا ہے)

نور جہاں :۔ (غور سے جہانگیر اور نادرہ کو دیکھتی ہے اور پھر دیوان سے اٹھ کر) نادرہ ہم نے سنا ہے کہ تم نے محلوں کے آداب سیکھے ہیں۔ تم نے شہنشاہ کی تعظیم میں اپنا سر خم نہیں کیا۔

نادرہ :۔ ملکہ میں نے نہیں سنا کہ کوئی آج تک ملزم کے سامنے جھکا ہو۔

نور جہاں :۔ کیا کہہ رہی ہو تم؟

نادرہ :۔ میں جس شہنشاہ کے سامنے فریاد لے کر آئی ہوں۔ وہی میرا ملزم بھی ہے۔

نور جہاں :۔ تمہارا الزام کیا ہے؟

نادرہ :۔ میرا الزام یہ ہے کہ شہزادہ سلیم نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ شہنشاہ ہو جائے گا تو مجھے اپنی ملکہ بنائے گا۔ اب شہزادہ سلیم شہنشاہ ہند ہے۔

(جہانگیر مستقل پیٹھ کئے کھڑا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی)

نور جہاں :۔ ہماری رائے میں اس مقدمے کا فیصلہ ملکہ کو کرنا چاہئے کیونکہ اس میں شہنشاہ خود ملزم ہیں۔

نادرہ :۔ مجھے ملکہ کے انصاف پر اتنا بھروسہ نہیں جتنا شہنشاہ کے انصاف پر ہے۔

نور جہاں :۔ (یکایک غیظ و غضب میں) چھوکری ہم نے تیری گستاخی ابھی تک معاف کی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر آئی ہے۔

نادرہ :۔ ملکہ کا غصہ اپنی جگہ ٹھیک ہے کیونکہ اگر میرے ساتھ انصاف کیا گیا تو ملکہ ملکہ نہیں رہے گی۔ جہانگیر کی بیوی ہو کر رہ جائے گی

نور جہاں :۔ ہم تجھے ہاتھیوں کے پاؤں تلے . . . .

جہانگیر :۔ (گھوم کر بات کاٹ دیتا ہے) بس! ہم اس فریاد کو خود سن رہے ہیں۔

فریادی تم کیا چاہتی ہو؟

نادرہ :۔ حضور نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔

جہانگیر :۔ ہمیں یاد ہے لیکن . . . . . .

نادرہ :۔ شہنشاہ اپنے قول سے نہیں پھرتے

جہانگیر :۔ (یکایک لہجے میں نرمی آجاتی ہے) انارکلی تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟ اور تم ہمیں بتاؤ اتنا عرصہ کیا کرتی رہی ہو۔ اور یہاں کیسے آئی ہو؟

نادرہ :۔ آپ کے دیئے ہوئے پیسے تو تین برس میں ختم ہو گئے تھے اس کے بعد محنت مزدوری کرتی رہی اور آپ کی تخت نشینی کا انتظار کرتی رہی۔ جب آپ

کی تنخواہ کی تھوڑی سی تو میرے پاس کوڑی تک نہیں تھی کہ یہاں تک کا سفر کر سکتی۔ آپ سے راز داری کا وعدہ تھا کسی سے کہہ بھی نہ سکتی تھی۔ بارہ برس میں تھوڑی تھوڑی سی پونجی جمع کر کے یہاں تک پہنچ سکی ہوں۔

نورجہاں :۔ (دیوان پر بیٹھ کر) جہاں پناہ آپ فریادی سے ہیں یا فریادی سے راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہیں؟

جہانگیر :۔ آپ نے اس لڑکی کو پندرہ برس پہلے دیکھا ہوتا تو آپ بھی اس سے یہی باتیں پوچھتیں۔

نورجہاں :۔ پندرہ برس پہلے اگر ہم اس لڑکی سے ملتے تو آج یہ ہم سے ہمکلام ہونے کی جسارت نہ کرتی۔

نادرہ :۔ آج سے پندرہ برس پہلے جس لڑکی سے ولیعہد سلطنت ہمکلام تھا اسے اور کسی سے کلام کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

نورجہاں :۔ مجھے افسوس ہے کہ ولیعہد کو آوارہ لڑکیاں بہکانے کی کوشش کرتی رہیں۔

نادرہ :۔ بہکانے کی کوشش تو بہت لوگوں نے کی۔ کبوتر بھی اڑائے لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نورجہاں :۔ (گرج کر) چھوکری خاموش ـــــ!

جہانگیر :۔ (تالی بجا کر) بس!

(کچھ عرصہ خاموشی رہتی ہے)

اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔ انارکلی تم بائیں باغ میں انتظار کرو ـــــ ستارہ تم انہیں پہنچاؤ

ستارہ :۔ جو حکم۔

(ستارہ اور نادرہ دائیں جانب سے نکل جاتی ہیں)

نورجہاں :۔ مجھے دیکھ کر سخت تعجب ہوا ہے اور رنج ہوا ہے کہ آج اس رقاصہ کے سامنے شاہی دربار دب رہا تھا

جہانگیر :۔ نہیں مہرو تم سمجھتی نہیں ہو۔

نورجہاں :۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ (دیوان سے اٹھ کر) آپ نے اس چھوکری کے ہاتھوں ملکہ کی بے عزتی کروا دی یہی کافی ہے۔

جہانگیر :۔ انصاف کے سامنے ملکہ اور لونڈی دونوں برابر ہیں۔

نورجہاں :۔ ایسا انصاف آپ ہی کو مبارک ہو ـــــ بہرحال اب آپ اس کا فیصلہ کر رہے ہیں؟

جہانگیر :۔ کس کا؟

نورجہاں :۔ اس چھوکری کی فریاد کا!

جہانگیر :۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

نورجہاں :۔ یعنی آپ ابھی تک اس کے سحر میں ہیں

جہانگیر :۔ نہیں، وہ انارکلی ہی نہیں جس کے سحر میں ہم شادی کا وعدہ کر بیٹھے تھے۔

نورجہاں :۔ تو ـــ!

جہانگیر :۔ لیکن بہرصورت شادی کا وعدہ تو تھا۔ اس سے انکار نہیں۔

نورجہاں :۔ اس کا حل ایک ہی ہے۔ سونا۔ اس وقت وہ سخت بدحالی میں ہے۔ سونا دیکھ کر سارا عشق ہرن ہو جائے گا۔

جہانگیر :۔ ہمارا خیال ہے کہ جس لڑکی نے پندرہ برس انتظار کیا ہے اسے خریدنا مشکل ہوگا۔

نور جہاں :۔ تو یوں کہیئے کہ آپ کی کوشش کرنے کی نیت ہی نہیں ہے۔

جہانگیر :۔ نہیں وہ بات نہیں۔ تم ہمیں سوچنے دو۔ (ادھر ادھر ٹہلتا ہے)

نور جہاں :۔ تو میں چلی (دائیں جانب بڑھتی ہے) فرمایا کریں تو اس بندی کو بھی یاد فرمائیں۔ مجھے اس معاملے میں دلچسپی ہے۔

(دائیں جانب سے نکل جاتی ہے ——— جہانگیر تالی بجاتا ہے ——— دائیں جانب سے ستارہ بھاگتی ہوئی آتی ہے)

ستارہ :۔ جی جہاں پناہ

جہانگیر :۔ (ویسے ہی ٹہلتے ہوئے اپنے آپ سے) اب مشورہ دینے والا بھی کوئی نہیں (ستارہ سے) اچھا بیربل کو بلاؤ۔

ستارہ :۔ جہاں پناہ راجہ بیربل تو اکبر اعظم کے عہد حکومت میں ہی فوت ہو گئے تھے۔

جہانگیر :۔ (رک کر) ہاں ——؟—— ہاں —— ہم بھول گئے (دیوان پر بیٹھ جاتا ہے) تو پھر کس سے مشورہ کیا جائے؟

ستارہ :۔ اگر بندی کو اجازت ہو تو

جہانگیر :۔ ہاں ہاں کہو۔

ستارہ :۔ جہاں پناہ اگر الجھن کی نوعیت کا پتہ چلے تو شاید یہ ناچیز کوئی راستہ بتا سکے۔

جہانگیر :۔ پہلے ایک الجھن تھی اب دو الجھنیں ہو گئی ہیں۔

ستارہ :۔ جہاں پناہ کی مراد دھوبی والی الجھن سے ہے۔

جہانگیر :۔ دھوبی ؟ دھوبی گیا جہنم میں۔ ابھی تک تو یہ سوچ رہے ہیں کہ ایک ملکہ ہی ہمارے لئے کافی الجھن تھی۔ اب ادھر سے انارکلی آن پہنچی ہیں اور بری طرح چپک رہی ہیں۔ ہمارا انجام خدا بخیر کرے۔

ستارہ :۔ اور عالی جاہ انارکلی سے شادی کرنا نہیں چاہتے ——؟

جہانگیر :۔ ستارہ تمہیں سلیم کے ذوق سلیم کے ساتھ انصاف کرنا چاہیئے۔ بایں ڈیل ڈول انارکلی اب کلی سے ثابت انار بن چکی ہے۔ مجھ پر تو شادی کے تصور ہی سے نزع کی کیفیت طاری ہو رہی ہے۔

ستارہ :۔ حضور میرا اندازہ ہے کہ انارکلی اس خیال میں ہے کہ جہاں پناہ اسے ابھی تک چاہتے ہیں۔ اگر حضور ذرا سا اشارہ بھی کر دیں کہ اب وہ پہلی سی بات نہیں تو خود ہی حضور کو قول سے رہا کر دے گی۔

جہانگیر :۔ یہی تو مشکل ہے۔ اگر بدولت ذرا سا اشارہ بھی کر تو اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ ہم اپنے قول سے پھر رہے ہیں۔ اور شاہنشاہ کو یہ زیب نہیں دیتا۔

ستارہ :۔ لیکن اگر ایسی صورت نکل آئے کہ اشارہ بھی ہو جائے اور جہاں پناہ کا وقار بھی برقرار رہے تو ......

جہانگیر :۔ تو جو تم مانگو گی ملے گا۔

ستارہ :۔ (کچھ سوچ کر) اچھا میں انارکلی کو بلاتی ہوں۔ آپ اتنے میں دھوبی اور شیر دل کو بلوا لیجئے

جہانگیر :۔ (حیرت سے) دھوبی کے معاملے کا اس سے کیا واسطہ؟

ستارہ :۔ اگر اجازت ہو تو جہاں پناہ کے کان میں کہہ دوں

جہانگیر :۔ (تالی بجاتا ہے) ہاں ——— لیکن اس میں رازداری کی آخر کیا بات ہے ؟

(بائیں جانب سے چوبدار داخل ہو کر جھک جاتا ہے)

جہانگیر :۔ دھوبی اور شیر دل کو حاضر کیا جائے۔

چوبدار :۔ جو حکم جہاں پناہ

(بائیں جانب سے واپس نکل جاتا ہے ستارہ جہانگیر کے قریب آ کر کچھ آہستہ آہستہ کہتی ہے)

جہانگیر :۔ (چونک کر) نہیں، یہ کیسے۔۔۔۔ ؟ (پھر کچھ سوچ کر)۔۔۔۔ اچھا لیکن اگر نتیجہ وہ نہ نکلا جو تم کہہ رہی ہو ؟

ستارہ :۔ جو سزا حضور چاہیں میرے لئے تجویز فرمائیں۔

جہانگیر :۔ بہتر تو تم جاؤ (ستارہ دائیں جانب سے نکل جاتی ہے)

(بائیں جانب سے چوبدار کے پیچھے دھوبی اور شیر دل داخل ہوتے ہیں اور آداب بجا لاتے ہیں)

جہانگیر :۔ (ایوان سے اٹھ کر مسند کی طرف جاتا ہے) تم لوگوں کو بہت انتظار کرنا پڑا۔ لیکن مابدولت نے نجومی کو بلوایا تھا اور اس سے کچھ حساب پوچھ رہے تھے اس لئے دیر ہو گئی۔ ایک بڑی عجیب بات معلوم ہوئی (مسند پر بیٹھ کر) ہم نے نجومی سے کہا کہ زائچہ دیکھ کر بتائے کہ اس دھوبن کی قسمت میں کونسا خاوند لکھا ہے۔ کئی دفعہ حساب لگایا گیا لیکن ہر دفعہ ایک ہی جواب نکلا۔

دھوبی :۔ (نہایت کمزور آواز میں) کیا جہاں پناہ ؟

جہانگیر :۔ مابدولت کو تو جواب سن کر یقین نہیں آیا لیکن نجومی نے کہا کہ آج اس عورت کا ستارہ ایسے برج میں پہنچ گیا ہے کہ اس کے خاوند کو شہرت اور عزت ملنا لازمی ہو گیا ہے۔

دھوبی :۔ (گلا صاف کرتا ہے) جی حضور ؟

جہانگیر :۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ہم نے نجومی سے یہ پوچھا کہ اس کا خاوند کون ہو گا تو اس نے حساب لگا کر جواب دیا ایک بادشاہ

دھوبی اور شیر دل :۔ جی ؟ جہاں پناہ ؟

جہانگیر :۔ (مسند سے نیچے اترتا ہے) ایسی صورت میں کہ جب تم دونوں میں سے کوئی اسے رکھنے کے لئے تیار نہیں، مابدولت نے یہ سوچا ہے کہ ہم ہی کیوں نہ اس سے شادی کر لیں۔ ستاروں کی بات بھی پوری ہو جائے گی۔

دھوبی اور شیر دل :۔ جی جہاں پناہ ؟

جہانگیر :۔ ظاہر ہے کہ اگر ہمارے علاوہ کسی اور سے اس کی شادی ہو گئی اور وہ شخص بادشاہ ہو گیا اور اس کے ساتھ اسے شہرت اور عزت بھی ملی۔ جیسا کہ ستارے کہتے ہیں کرنے گی تو ہمارے لئے ایک اچھی خاصی مشکل ہو جائے گی ——— ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں یا نہیں ؟

دھوبی اور شیر دل :۔ جی ہاں حضور۔

جہانگیر :۔ لیکن اس میں ایک منزل ابھی باقی ہے۔ اور وہ یہ کہ قانونی طور پر اسے ابھی تک طلاق نہیں ملی۔

شیر دل :۔ جہاں پناہ کے حکم کی تعمیل میں میں اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں اگر دھوبی اسے طلاق دے دے تو۔

دھوبی :۔ (ذرا رک کر) اگر طلاق دے دے تو ——— کیوں میں کیوں طلاق دوں ؟

جہانگیر :۔ لیکن یہ تم دونوں آپس میں کیوں فیصلہ کر رہے ہو۔ عدالت کو کیوں آسیں نظر انداز کیا جا رہا ہے؟

دھوبی :۔ جہاں پناہ یہ کون ہوتا ہے مجھے کہنے والا کہ میں بیوی کو طلاق دوں ——— !

جہانگیر :۔ بات تو ٹھیک ہے۔

شیر دل :۔ لیکن جہاں پناہ یہ تو خود ہی اسے چھوڑنے کے لئے تیار تھا۔

دھوبی :۔ جہاں پناہ آپ خود ہی انصاف فرمائیے میں نے طلاق کا نام بھی لیا تھا۔

جہانگیر :۔ ہاں تم نے طلاق کا نام تو نہیں لیا۔ لیکن اس سارے معاملے کا کسی صورت تو فیصلہ ہونا ضروری ہے اور وہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم طلاق نہ دو۔

دھوبی :۔ جہاں پناہ میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں

جہانگیر :۔ ہاں ہاں۔

دھوبی :۔ جہاں پناہ میاں بیوی میں شکر رنجیاں ہوتی رہتی ہیں جہاں پیار ہے وہاں کبھی کبھی مار بھی ہے اگر شکر رنجیوں میں طلاقیں ہونے لگیں تو نا بھی ہو جائے۔

شیر دل :۔ جہاں پناہ اس عورت سے پوچھ لیا جائے کہ وہ کس کے پاس رہنا چاہتی ہے۔

دھوبی :۔ جہاں پناہ آپ اس کو منع کر دیجئے بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنائے کیونکہ اگر ہم بادشاہ ہو گئے تو اس کو میلے کپڑے کی طرح پٹخوا دیں گے۔

شیر دل :۔ جہاں پناہ شاہوں کے اقبال اور ہوتے ہیں۔ ایسوں کو تو شاہی ہاتھی کا راتب سمجھ کر کھا جائے۔

دھوبی :۔ دیکھو دیکھو

جہانگیر :۔ بس

(خاموشی چھا جاتی ہے۔ ستارہ دائیں جانب سے داخل ہوتی ہے)

ستارہ :۔ جہاں پناہ۔ نادرہ باریابی کی اجازت چاہتی ہے۔

جہانگیر :۔ اجازت ہے (مسند پر بیٹھ جاتا ہے)

ستارہ :۔ (دائیں جانب گھوم کر) جہاں پناہ کی طرف سے اجازت ہے

(دائیں جانب سے نادرہ داخل ہوتی ہے)

نادرہ :۔ جہاں پناہ یہ لونڈی آپ کے تازہ ترین انتخاب پر آپ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرنے حاضر ہوئی ہے۔

جہانگیر :۔ کیسی ؟

نادرہ :۔ جہاں پناہ نے کسی دھوبن سے شادی کرنے کا اعلان فرمایا ہے۔

جہانگیر :۔ ابھی اعلان نہیں کیا، البتہ ارادہ ہے۔

دھوبی :۔ جہاں پناہ ......

جہانگیر :۔ تم چپ رہو (نادرہ سے) دراصل وہ اس دھوبی کی بیوی ہے لیکن اس نے ابھی تک اسے طلاق نہیں دی۔ جس وقت یہ طلاق دے دے گا تو ...

اور سلطنت کی مصلحتوں کے پیشِ نظر مزید شادی کا اعلان فرمائیں گے۔

باہر سے خواص کی آواز :۔ باادب با ملاحظہ ہوشیار ملکۂ عالم تشریف لاتی ہیں۔

جہانگیر :۔ چوبدار شیرعلی اور دھوبن کو باہر لے جاؤ اور ہمارے حکم کا انتظار کرو۔

چوبدار :۔ جو حکم (دھوبن اور شیر سے) چلو

دھوبن :۔ (چلتا ہے لیکن فوراً پلٹ کر) لیکن جہاں پناہ یہ کیسے . . . . .

چوبدار :۔ (دھوبن کو دھکیلتے ہوئے) چلو (شیرعلی اور دھوبن دونوں کو بائیں جانب سے باہر لے جاتا ہے

دائیں جانب سے نورجہاں داخل ہوتی ہے)

نورجہاں :۔ شہنشاہ نے تو یاد نہیں فرمایا لیکن ہمیں اطلاع مل گئی تھی کہ موقع غنیمت جان کر (نادرہ کی طرف اشارہ) یہ چھوکری حضور کی خدمت میں پیش ہو گئی۔

نادرہ :۔ ملکہ کا محکمۂ اطلاعات یقیناً بہت تیز ہے لیکن غالباً ملکہ کو اس کی اطلاع نہیں کہ شہنشاہ عالم اس ناچیز کی دادرسی کی بجائے ایک نہایت ہی حسین و جمیل دھوبن کو شرفِ ازدواج بخش رہے ہیں۔

جہانگیر :۔ (جلدی سے) نادرہ کی تمہاری فریاد اپنی جگہ ہے۔ اس کا دھوبن سے ہماری شادی کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔

نورجہاں :۔ (حیرت سے) جہاں پناہ آج ہمارے کانوں کو کچھ ہو گیا ہے یا نصیبِ دشمناں جہاں پناہ کی دوائی میں بھنگ ڈال دی گئی ہے۔

جہانگیر :۔ ملکہ کی تشویش ہمارے لئے باعثِ اطمینان ہے لیکن شہنشاہ کی دوائیوں کے ساتھ ایسا مذاق نہیں کیا جا سکتا۔ اور ملکہ کی قوتِ سامعہ بھی بفضلِ باری تعالیٰ ابھی چاک و چوبند ہے

نورجہاں :۔ تو پھر خیر!

جہانگیر :۔ بات یہ ہے کہ اس دھوبن کے ستاروں میں کسی بڑے باوقار بادشاہ کی بیوی ہونا لکھا ہے ہم نے سوچا کہ بچاری اس شخص کی تلاش میں کہاں ماری ماری پھرے گی۔ شہنشاہ خود اپنی رعایا کی مشکلیں آسان کر سکتا ہے۔

نورجہاں :۔ بہت خوب۔

(خاموشی)

نادرہ :۔ جہاں پناہ آپ کو نئی دلہن مبارک ہو۔ میں اپنی فریاد سے دست بردار ہوتی ہوں۔

نورجہاں :۔ (یکایک اس کی طرف پلٹ کر) شاباش۔ اور اگر ہم ملکہ نہ ہوتے۔ فریادی ہوتے تو اس شہنشاہ کے در پہ فریاد لے کر آنا بھی کسرِ شان سمجھتے۔

جہانگیر :۔ (ذرا برہمی سے) ملکہ آپ اپنا مقام بھول رہی ہیں۔

نورجہاں :۔ (پلٹ کر نادرہ سے) لیکن چونکہ ہم ملکہ ہیں اور شہنشاہ کے ہر فیصلے کے اسیر اس لئے شہنشاہ کی خوشنودی میں خوش ہیں — نادرہ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے تمہیں غلط سمجھا۔ تم یقیناً غیور اور عالی حوصلہ ہو۔ تم اگر ہمیں معاف کر سکو تو ہم دوستی کے لئے حاضر ہیں۔

نادرہ :۔ ملکہ لونڈی قسمت کی بھوکی تھی مرتبے کی بھوکی نہیں تھی۔

نورجہاں :۔ تمہارا مرتبہ وہی ہوگا جو ملکہ کے مصاحب کا ہونا چاہیے۔ (نادرہ کو گلے لگا لیتی ہے)

جہانگیر :۔ (کھانس کر) ملکہ آج بڑی جذباتی نظر آ رہی ہیں۔

نورجہاں :۔ شہنشاہ سے کم (نادرہ سے) اچھا نادرہ تم یہ بتاؤ کہ تمہیں بچپن میں ولی عہد سلطنت سے کیسے عشق ہو گیا ؟
نادرہ :۔ (مسکرا کر) ولی عہد کی سب سے اچھی بات جو مجھے لگتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ بیٹھے پٹ پٹ آنکھیں جھپکتے تھے اور کھلکھلا کر ہنستے تھے۔
نورجہاں :۔ اور اب ؟
نادرہ :۔ اب تو ٹکر ٹکر دیکھتے ہیں اور ذرا نہیں جھپکتے
نورجہاں :۔ (قہقہہ لگا کر) واہ واہ ——— کیا جواب مطالعہ ہے۔ واقعی واہ واہ
(نادرہ کا ہاتھ تھامے ہنستے ہوئے دائیں جانب سے نکل جاتی ہے)
جہانگیر :۔ (برانگیختہ) ستارہ میں اس گستاخ لڑکی سے عشق کروا کے چھوڑوں گا۔
ستارہ :۔ کیا جہاں پناہ کو انارکلی اب تک اچھی لگتی ہے ۔ ؟
جہانگیر :۔ (سنبھل کر) نہیں تو لیکن شہنشاہ کملی کو کیسے نظر انداز کر دیں ۔
ستارہ :۔ لیکن اگر شہنشاہ نے انارکلی سے شادی کی طرف رغبت ظاہر کر دی تو یہ تو انارکلی کی فتح ہوگی نہ کہ شہنشاہ کی
جہانگیر :۔ لیکن ستارہ تم نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ دونوں عورتیں مل کر ہماری دولت پر ہنس رہی تھیں ۔
ستارہ :۔ ان کو اس کی سزا دی جا سکتی ہے ۔
جہانگیر :۔ یہی تو بات ہے ہم ایسی سزا دینا چاہتے ہیں جو بظاہر معلوم بھی نہ ہو کہ سزا ہے اور ہم ان دونوں پر ہنس بھی سکیں ۔
ستارہ :۔ جہاں پناہ یہ مشکل نہیں لیکن پہلے جو فریادی باہر کھڑے ہیں ان کا مقدمہ نپٹانا ضروری ہے ۔
جہانگیر :۔ (بیزاری سے) وہ تو ٹھیک ہو ہی چکا ہے۔ اچھا خیر بلاؤ۔
(ستارہ بائیں جانب سے نکل جاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد چوبدار مع شیردل اور دھوبی
کے بائیں جانب سے داخل ہوتا ہے۔ دھوبی اور شیردل دونوں جھک جاتے ہیں)
جہانگیر :۔ سنو تم دونوں میں سے کسی کا بھی اس عورت پر حق نہیں لیکن ہماری دولت کو قانون کی حفاظت کرنا ہے اور چونکہ قانونی طور پر وہ عورت ابھی تک دھوبی کی بیوی ہے اس لئے ہم اسے دھوبی کے حوالے کرتے ہیں ۔
دھوبی :۔ (بے حد خوش ہو کر) حضور کا اقبال لاکھ گنا ہو۔
جہانگیر :۔ اور شیردل تم نوکری سے برخاست !
شیردل :۔ (منہ لٹکا کر) جو حکم عالی جاہ
(باہر سے گھنٹے کی آواز)
جہانگیر :۔ (مسند سے اٹھ کر درشتی سے) یہ کیا ہے ؟
چوبدار :۔ سرکار کوئی فریادی ہے۔
جہانگیر :۔ (گرج کر) اکھاڑ دو اس گھنٹے کو جینا حرام کر دیا ہے ہمارا۔ اکھاڑ دو اسے اب ! جڑ سے اکھاڑ دو اسے۔
چوبدار :۔ بہتر سرکار۔

جہانگیر :- (پھر نرم ہو کر) نہیں اسے کچھ نہ کہو۔ اسے حاضر کرو اس کے بعد گھنٹہ ہٹا دیا جائے۔

چوبدار :- بحکم عالی جاہ

جہانگیر :- دودھ کا مقدمہ برخاست۔

(سب جھک جاتے ہیں۔ چوبدار دودھ والوں کو باہر نکال دیتے ہیں۔ جہانگیر تھکن سے مسند پہ بیٹھ جاتا ہے پھر مسند سے اترتا ہے اور آہستہ آہستہ چل کر دیوان پہ جا کر نیم دراز ہو جاتا ہے اور پیالہ اٹھا کر ایک دو گھونٹ [illegible] ہے۔ بائیں جانب سے چوبدار داخل ہوتا ہے)

چوبدار :- جہاں پناہ فریادی حاضر ہے۔

جہانگیر :- پیش کرو

(بائیں جانب سے ستارہ داخل ہوتی ہے)

جہانگیر :- کون ہے فریادی؟

چوبدار :- یہی فریادی ہیں سرکار۔

جہانگیر :- (پیالہ ہاتھ سے رکھ کر) یہ کیا مذاق ہے ستارہ؟ چوبدار جاؤ۔

(چوبدار جھک کر واپس نکل جاتا ہے)

ستارہ :- شہنشاہ عالم نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میں جو مانگوں گی ملے گا۔ میں انصاف چاہتی ہوں

جہانگیر :- (دیوان پر بیٹھ کر) انصاف کیا جائے گا۔ تم کیا چاہتی ہو؟

(ستارہ جہانگیر کی طرف دیکھ کر نظریں جھکا لیتی ہے اور خاموش رہتی ہے)

جہانگیر :- (ستارہ کی طرف دیکھتے ہوئے) نہ جانے کیوں مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ تم انارکلی کی جوانی ہو

ستارہ :- اور اگر جہاں پناہ کو اپنی جوانی کا وعدہ بھی یاد ہے تو مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔

جہانگیر :- (ہنس کر) ہاہا۔ خوب یاد ہے۔ اور ان دونوں عورتوں پہ ہنسنے کے لئے ہم یہی سزا تجویز کرتے ہیں۔

——(پردہ گرتا ہے)——

ہاجرہ مسرور

دروازے

رضیہ بانو:۔ پندرہ بیس کی درمیانی عمر کی دبلی پتلی لڑکی۔ سیدھی مانگ کے ساتھ لمبی سی چوٹی، جسے سر کی الہڑ جنبشوں سے پشت پر نمایاں طریقے سے جھٹکانے پر مجبور کرتی ہے۔ دوپٹہ سر پر رکھنے کی عادی ہے۔ مگر تھوڑے تھوڑے وقفے سے سر کے دلکش جھٹکوں سے دوپٹہ سر سے گرانے کی عادی۔ چال میں دھیماپن، مگر چلتے چلتے یوں رکتی ہے جیسے اسے اپنے پیچھے کسی وجود کا احساس ہو۔ لباس لکھنوی غرارہ اور کرتہ دوپٹہ۔

معصوم رضا:۔ معمولی شکل و صورت —— درمیانی عمر کے آدمی، آنکھوں پر ہر وقت عینک لگی رہتی ہے۔ بڑے سنجیدہ ہیں۔ لباس کرتا پاجامہ اور کبھی کبھی شیروانی۔ حامد کے رشتے میں بھائی۔

حامد:۔ تقریباً معصوم رضا کے ہم عمر۔ بالوں وغیرہ سے بڑے روایتی انٹلیکچوئل نظر آتے ہیں۔ اور لباس میں بھی اس کی رعایت۔ شگفتہ مزاج۔ رضیہ بانو کے چہیتے بھائی جان۔

لطیف:۔ حامد اور معصوم رضا کے پرانے بے تکلف دوست۔ صاف ستھرے دُھلے دھلائے —— کنپٹیوں پر نمایاں سفید بال۔ نشست و برخاست اور بات چیت میں ایک خاص دل نشیں قسم کا رکھ رکھاؤ —— اس وجہ سے بڑے معتبر سے نظر آتے ہیں۔

شہامت:۔ دس بارہ سال کا لڑکا۔ بھلی صورت ہے اس لئے اس کا منہ چڑھاپن عجیب نہیں معلوم ہوتا —— معصوم بھولا بھالا —— رشتے کی دو عورتیں۔ اور دو ایک بچے ——

پہلا منظر

(ایک کمرہ، اسٹیج کے دونوں بازوؤں میں دروازے ہیں، داہنے ہاتھ کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا ہے اور بائیں ہاتھ کا دروازہ زنان خانے میں جاتا ہے۔ سامنے کی دیوار میں بھی ایک دروازہ ہے جو زنان خانے میں کھلتا ہے۔ زنان خانے میں کھلنے والے دروازوں پر ذرا میلے خوبصورت پردے پڑے ہیں۔ کمرے میں سامنے دیوار سے لگی ایک پرانے طرز کی مسہری ہے، جس پر صاف ستھرا بچھا ہوا بستر ہے۔ بڑے بڑے پھولوں والا لحاف یوں پڑا ہے جیسے ابھی ابھی یہاں سے کوئی اٹھ کر گیا ہو —— مسہری کے قریب ایک تپائی ہے جس پر ٹیبل لیمپ ہے، بہت سی کتابیں اور چھوٹا سا ایش ٹرے، سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرا ہوا بستر پر کتابیں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی ہیں۔ کمرے کے درمیان ایک بڑی سی پرانے طرز کی گول میز پڑی ہے جو بیک وقت پڑھنے لکھنے اور کھانا کھانے کے کام آتی ہے۔ چنانچہ اس میز پر کتابوں اور اخباروں کے علاوہ ناشتے کی کشتی پڑی ہوئی ہے۔ وہ تین کرسیاں ایک معمولی سا بک شیلف بک شیلف پر میلی قمیص اور پاجامہ پڑا ہوا ہے اور تولیہ کرسی کی پشت پر۔ دیوار گیری

بے چند کپڑے لٹکے ہوئے ہیں — پردہ اٹھنے کے چند لمحوں بعد رضیہ بانو بائیں ہاتھ کے دروازے سے اندر آتی ہے اس کے
ہاتھ میں جھاڑو ہے، اس نے گہرے نیلے رنگ کا کھدر یا نیلا ململ کا چنا ہوا دوپٹہ اور ململ کا سفید کرتہ پہن رکھا ہے۔
ہاتھوں میں دو دو چوڑیاں — آتے ہی وہ جھاڑو فرش پر ڈال دیتی ہے اور کمرے میں ہر طرف یوں دیکھتی ہے جیسے کچھ سوچ رہی
ہو کہ پہلے کیا کرے ؟)

رضیہ بانو :۔ (اس دروازے کی طرف جا کر جدھر سے آئی ہے) شہامت! اے شہامت ذرا ادھر آئیو — (کچھ رک کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) اے برتن
چھوڑ دو پہلے ادھر آؤ — سنتے نہیں آتنی دیر سے کہہ رہی ہوں۔

(ذرا توقف سے مڑتی ہے اور بستر پر سے کتابیں اٹھا اٹھا کر تپائی پر بے دردی سے پھینکتی ہے۔ ایک
کتاب کھول کر سرسری نگاہ ڈالتی ہے اور اسے الگ بڑے گول میز پر رکھ دیتی ہے — شہامت ایک
چھوٹا سا سرخ چہرے والا لڑکا اندر آتا ہے اس کے ہاتھ راکھ میں بھرے ہوئے ہیں)

رضیہ بانو :۔ (بیزاری سے) بھئی اللہ کیا ناک میں دم کیا ہے اس چھوکرے نے — ارے تو ان ہاتھوں سے صفائی کرنے آیا ہے یہاں —؟

شہامت :۔ (گھبرا کر دونوں بازو چہرے کی طرف اٹھا کر یوں جیسے تھپڑ سے بچ رہا ہو) ایں باجی۔ میں سمجھا کوئی باہر آیا ہے — مجھے کیا معلوم تھا آج میں
صفائی کروں گا — ورنہ تو آپ —

رضیہ بانو :۔ ہاں بڑا آیا بقراط کہیں کا، ہر بات کا جواب کوئی تجھ سے لے لے — جا ہاتھ دھو کر آ اور جلدی سے یہاں کی صفائی کر — مجھے کیا غرض پڑی ہے
جو سات دن سب کی غلامی کرتی رہوں۔

(شہامت جلدی سے دروازے میں غائب ہو جاتا ہے۔ رضیہ بانو دائیں طرف کے دروازے کی طرف
جاتے ہوئے بولے جاتی ہے)

بھلا کیا فائدہ اپنی جان ہلکان کرنے سے کسی کے پیچھے۔ ہنہ، ہمیں تو جیسے کوئی کام ہی نہیں سوائے اس کے کہ لوگوں کی سگریٹوں کی راکھ سمیٹے
جائیں — کتابیں سنبھال سنبھال کر رکھے جائیں۔ ہاں ہم میں تو جان تھوڑی ہے، ہم تو کمہار کے گھر سے دو پیسے کی مٹی کی گڑیا بن کر آئے ہیں سب
ہمیں یہی تو سمجھتے ہیں۔ جبھی تو —

(ایک دم مڑ کر پیچھے دیکھتی ہے اور شہامت کو نہ پا کر چپ ہو جاتی ہے اور پھر آہستہ سے واپس مسہری
کی طرف آ کر کٹہرے سے لگی خاموش کچھ گھورتی رہتی ہے)

شہامت :۔ (اندر آ کر کرتے سے گیلے ہاتھ پونچھتے ہوئے) جھاڑو دوں اب —؟

(جواب کا انتظار کئے بغیر جھاڑو اٹھا کر سٹراسٹر دری پر مارنا شروع کر دیتا ہے۔ رضیہ بانو چونک کر
جھاڑو اس کے ہاتھ سے چھین لیتی ہے)

رضیہ بانو :۔ دری پر ایسے جھاڑو دیتے ہیں؟ تیری شامت آئی ہے میرے ہاتھوں

شہامت :۔ (رحم طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے) روز تو خود یہاں کی صفائی کرتی ہیں، ہمیں تو اس کمرے میں آنے بھی نہیں دیتیں — پھر ہم سے
نے کیسے — اچھا یوں دیکھئے

(کمری جھاڑنے کی فکر میں سے وہی بھاگتا ہے اور وہی بیٹھے لگتی ہے)

رضیہ بانو:۔ چل ہٹ تیرے :اے یہ کمرہ بھی کر دیتی نواب تک ہر چیز کی گت بن جاتی ـــ میں آج جھاڑو خود دے لوں گی تو یہ ایش ٹرے صاف کر لا۔

(شہامت ایش ٹرے لے کر تیزی سے بائیں دروازے میں بھاگ جاتا ہے اور رضیہ بانو جھک کر

جھاڑو سے دھیرے دھیرے کاغذ وغیرہ سمیٹتی ہے۔ شہامت آکر جھاڑو پکڑ لیتا ہے)

شہامت :۔ آپ کا جی اچھا نہیں ہے باجی۔ میں اسی طرح جھاڑو دے لوں گا ـــ آپ تو بیٹھ جائیے ـــ دیکھئے ابھی سب کام ہلکا ہوتا ہے۔

(رک کر) باجی دیکھئے نا یہ سب کام میرے ہیں۔ مجھی کو کرنا ہیں ـــ آپ تو چلی جائیں گی پھر

رضیہ بانو:۔ (جھاڑو چھوڑ کر) میں کہاں جا رہی ہوں (دوپٹہ سر پہ ڈال کر مصنوعی غصے سے اس کی طرف دیکھتی ہے)

شہامت :۔ (جھاڑو دیتے ہوئے) سسرال اور کہاں ؟

(رضیہ بے اختیار اس کی پشت پہ ایک دھپ لگا دیتی ہے۔ اور شہامت بسور کر اسے دیکھتا ہے۔

رضیہ غصے سے اسے دیکھتی ہے)

رضیہ بانو :۔ بدتمیز سر پہ چڑھے آتے ہیں ـــ ذرا منہ لگاؤ نوکروں کو تو یہی ہوتا ہے۔

شہامت :۔ (جھکا کر آنکھیں ملتے ہوئے) اچھا اور مار لیجئے۔ ہاں نہیں تو ـــ (سسک کر) کل بھائی جان نہیں کہہ رہے تھے آپ کے سامنے

کہا نہیں تھا کہ شہامت جلدی جلدی سب کام سیکھ لو بٹیا سے۔ نہیں تو بٹیا چلی جائیں گی ـــ اور ـــ اور نہیں تو تیری جگہ دوسرا نوکر رکھنا

پڑے گا ـــ کل کہا نہیں تھا۔ بس ایک دم بھول گئیں ـــ ہاں کہا نہیں تھا۔

(معصومیت سے انگلی اٹھا کر اور گردن ٹیڑھی کر کے یاد دلاتا ہے)

رضیہ بانو:۔ (جھینپ کر) ہٹ اور ماروں گی ـــ چل کب کہا تھا بھائی جان نے ؟ اپنی طرف سے باتیں جوڑتا ہے ـــ بس اب رونا بند کر

شہامت :۔ (اسی طرح) ہاں کہا نہیں تھا (سسک کر) جب کل وہ عورتیں آئی تھیں۔ اور چچی جان آئی تھیں اور آپ نے کامدانی والا دوپٹہ اوڑھا تھا اور

یوں کر کے بیٹھی تھیں

(اسی کیفیت میں فرش پہ بیٹھ کر لڑکیوں کی طرح شرما کر ٹھوڑی گھٹنے پہ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔

اور رضیہ ہنس پڑتی ہے)

رضیہ بانو:۔ نقلچی کہیں کا ـــ تو نوکر ہے یا گھر کا باوا ـــ ہر بات میں دخل کوئی تجھ سے دلوا لے۔

شہامت :۔ ہاں بس آپ تو مار لیجئے ـــ پہلے تو کبھی مارا نہیں، سب کام چمکار کر لیتی تھیں، اب کچھ دنوں سے خفا سی کرتی رہتی ہیں (آنسو پونچھتا ہے)

رضیہ بانو:۔ (چمکار کر) بس اب رونا بند ـــ تو نہیں جانتا میرا جی اچھا نہیں رہتا ـــ میں کیا کروں لا ذرا اس کی طرف دیکھتی ہے) میرا حال کسے معلوم

ہے ـــ اچھا اب تو باورچی خانے میں جا۔ میں آج بھی یہاں کی صفائی کر لوں گی۔

شہامت :۔ (جھاڑو اٹھا کر) نہیں باجی آپ تو چلی جائیں گی۔ مجھے ہی سارا کام سنبھالنا ہے (رضیہ ٹوٹی ہوئی سی سہری کا کٹہرا پکڑ کر چھت کی طرف دیکھتی ہے)

باجی وہ عورتیں جو آئی تھیں ان کی نوکرانی کہہ رہی تھی کہ تمہاری صاحبزادی سے ہمارے گھر کے صاحبزادے کا بیاہ طے ہوا ہے ـــ آپ تو

باجی پھر آپ چلی جائیں گی

(شہامت کھڑا سیدھا کر کے جھٹ سے دیکھتا ہے۔ رضیہ بانو سر جھکا کر لحاف ٹھیک کرنے لگتی ہے۔ شہامت
پھر شرم سے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

کیوں باجی پھر آپ کو گھر یاد نہیں آئے گا؟ میری آپا ہیں نا وہ۔ دیکھئے وہ تو ورکاب گنج کے پل پہ بیاہ کر رہتی ہیں۔ اگرچہ عید بقر عید نمازیں کر ان کے پاس آتی ہیں۔ جب میں ان سے ملنے جاتا ہوں اور کہتا ہوں آپا گھر نہیں چلو گی تو جھٹ کہہ دیتی ہیں کہ آسمے یہیں اپنا گھر چھوڑ کے وہ خود کہاں آئیں جائیں پھر آپ بھی کبھی کبھی آئیں گی ——— (رک کر) باجی مجھ سے چپاتی کیوں نہیں پتی کیا کرتیں؟ وہ جو معصوم بھائی ہیں نا ان کے کھانے میں ایک بار میں نے پکائی ہوئی چپاتی رکھ کے دی تھا۔ اجی جناب جب وہ کھاتے کھاتے میری چپاتی تک پہنچے تو بس دیکھتے ہی پانی پی کر کھانا ختم کر دیا

(رضیہ متوجہ ہو کر سنتی ہے اس کے چہرے سے درد کی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے)

(اسی لہجے میں جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو) وہ معصوم بھائی تو میرے ہاتھ کی روٹی کھائیں گے نہیں یہ پکی بات ہے۔ شرط ہے۔ بھائی جان ہمارے تو کھالیں گے پر وہ معصوم بھائی بھلا میری بڑی بڑی سوکھی چپاتیاں کھائیں گے ——— وہ تو مجھے نکلوا دیں گے (رک کر) اللہ میری باجی آپ نہ جائیے

(شہامت کپڑا کندھے پر رکھ کر رضیہ کو دیکھتا ہے اور رضیہ کی آنکھیں مسکراہٹ سے چمک اٹھتی ہیں وہ لپک کر بڑھتی ہے۔ اور شہامت کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیتی ہے)

رضیہ بانو:- سچ شہامت ———؟
شہامت:- کیا؟
رضیہ بانو:- کچھ نہیں ——— کچھ بھی نہیں

(رضیہ دھیرے دھیرے چل کر کپڑے کی کھونٹیوں تک جاتی ہے اور ہاتھ مار کر دھول جھاڑتی ہے
شیلف پہ پڑے ہوئے کپڑے اٹھا کر کھونٹیوں پر لٹکا دیتی ہے)

شہامت:- اب میں جاؤں باجی۔ چولہا پڑا ہے ——— (دروازے کی طرف بڑھتا ہے پھر پلٹ کر) باجی آج ساری روٹی مجھی سے پکوا لیجئے گا۔
رضیہ:- (بے تابی سے) شہامت

(شہامت ٹھہر جاتا ہے۔ رضیہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے)

رضیہ:- شہامت تو بڑا اچھا ہے بڑا وفادار ہے ——— سن جو ہیں نا معصوم بھائی ان سے آج کھانے کے وقت الگ سے کہنا۔ باجی پوچھتی ہیں کہ آپ شہامت کے ہاتھ کی روٹی کھا لیں گے ——— دیکھ جب وہ اکیلے ہوں جب پوچھنا
شہامت:- (گھبرا کر) نا باجی وہ تو مجھ سے بولتے ہی نہیں، پانی مانگتا ہو تو ہاتھ جھلا دیتے ہیں۔ ڈانٹتے تک نہیں۔ بس رات دن کتابوں پہ جھکے رہتے ہیں۔ میں تو ان سے نہیں پوچھوں گا ——— کہئے تو بھائی جان سے پوچھ لوں؟
رضیہ:- (چڑ کر) اچھا اب اندر جا ——— دماغ کھا گیا ہے۔

(شہامت تیزی سے اندر بھاگ جاتا ہے اور رضیہ بستر پہ بیٹھ کر دو پٹے کا پلو منہ پر رکھ لیتی ہے اور مسہری کے کٹہرے پہ سر ٹکا لیتی ہے) تھوڑا وقفہ۔ دائیں طرف کا دروازہ کھلتا ہے اور معصوم رضا گھبرایا ہوا اندر آتا ہے۔ اور

بغیر کسی طرف دیکھے کپڑے والی کھونٹیوں کے قریب چلا جاتا ہے ــــ رضیہ چاپ سن کر تیزی سے سر اٹھاتی ہے۔
اور معصوم کی طرف دیکھتی رہتی ہے ــــ معصوم بغیر کسی طرف دیکھے کپڑے ٹٹول کر دوبارہ دروازے کی طرف جانے
لگتا ہے اور رضیہ جیسے تھک کر اپنا سر مسہری کے کٹہرے پہ مارتی ہے اور اس کے منہ سے ایک لمبی آہ نکل
جاتی ہے ــــ معصوم مڑ کر ادھر دیکھتا ہے اور رک جاتا ہے)

معصوم :۔ (رکے رکے سے لہجے میں) میں اپنا قلم بھول گیا تھا۔ کافی دور جا کر یونیورسٹی کے راستے میں یاد آیا تو واپس آنا پڑا ــــ اچھا (دروازہ کھولتا ہے)

رضیہ :۔ (سر ٹیک کر دوبارہ کراہتی ہے)

معصوم :۔ کیا بات ہے، رضیہ ــــ؟ (قریب آکر) تمہارا منہ لال ہو رہا ہے۔

رضیہ :۔ (آہستگی سے اٹھ کر مسہری کے سہارے کھڑے ہوتے ہوئے کانپ کر) میرا دل جانے کیسا ۔

معصوم :۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) شروع سردی میں ملیریا کا خطرہ رہتا ہے ــــ تمہارا منہ بھی لال ہو رہا ہے اور تم کانپ بھی رہی ہو ــــ تم ایسا
کرو کونین کی دو گولیاں جلدی سے کھا لو۔ میں راستے میں حامد بھائی سے کہتا جاؤں گا۔

(رضیہ منہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی ہے)

معصوم :۔ (اس لہجے میں) کیا کونین گھر میں نہیں؟ لاؤں بازار سے

رضیہ بانو :۔ (معصوم کی طرف سے مڑ کر زنان خانے والے دروازے کی طرف جاتے ہوئے) کونین؟ کونین تو بہت ہے گھر میں ــــ بہت ساری (دفعتاً مڑ کر
معصوم کی طرف دیکھتی ہے اور پھر اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیتی ہے) آپ جائیے آپ کو دیر ہو جائے گی ــــ میں ٹھیک ہوں

معصوم :۔ (معصومیت سے) ہاں واقعی دیر ہو رہی ہے ــــ اچھا دیکھو آج آرام کرنا صفائی کرنے کی بھی ضرورت نہیں (جیب میں قلم ٹٹول کر) کھانا بھی
نہ پکانا۔ شہامت ٹیڑھی بیڑھی کچھ روٹی پکا ہی لیتا ہے ــــ اچھا

(معصوم اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے غائب ہو جاتا ہے۔ رضیہ دھیرے سے پلٹتی ہے اور مسہری کے
کٹہرے کو پکڑ کر اس دروازے کو گھورتی رہتی ہے جہاں سے معصوم گیا ہے اور پھر بڑی اذیت سے
اپنا سر ہلاتی ہے، جیسے کوئی چیز اپنے سر سے گرا رہی ہو)

رضیہ بانو :۔ (آپ ہی آپ) ٹھیک تو ہے ــــ (اپنی کپکپاتی ٹھوڑی پر اور ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر) اب سب یوں ہی ٹھیک ہے۔
تیزی سے بڑھتی ہے اور لحاف کی تہہ بگاڑ کر چونکا سا پھینک ڈالتی ہے۔ تپائی پر سے کتابیں اٹھا کر بستر پہ پٹک
دیتی ہے۔ کھونٹیوں پر سے کپڑے اٹھا کر کرسیوں پر پھینک دیتی ہے ــــ اور پھر ہاتھ جھاڑ کر یوں
ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہے جیسے فوٹوگرافر سے تصویر کھنچوانا ہو ــــ تھوڑے وقفے کے بعد شہامت
اندر آتا ہے اور حیرانی سے ہر طرف دیکھتا ہے)

شہامت :۔ باجی

رضیہ بانو :۔ (لہجے میں اطمینان) کیا ہے؟

شہامت :۔ گوشت گھبار نے چھٹے گیارہ بج رہے ہیں میں نے آٹا گوندھ لیا ہے۔

رضیہ بانو:۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ——— جیسا تجھ سے بنے چاہے پکالے ——— میں آج روٹی بھی نہیں پکاؤں گی۔

شہامت:۔ مگر باجی میری چپاتی معصوم بھائی

رضیہ بانو:۔ بس اللہ بک بک نہ کرو ——— معصوم بھائی تیرے ہاتھ کی روٹی تو کیا چولہے کے انگارے بھی نگل جائیں گے تو پتہ نہیں چلے گا انہیں تو ان کے لئے کیوں دم دیئے جا رہا ہے۔

شہامت:۔ (حیران ہو کر) اور یہاں کی صفائی ؟

رضیہ بانو:۔ (شدید غصے سے) میں تھوکتی ہوں یہاں

(رضیہ دیدے نکال کر شہامت کی طرف دیکھتی ہے اور شہامت سہم کر اندر چلا جاتا ہے۔ رضیہ ایک منٹ بعد اپنا سر کرسی کے ہتھے پر ٹیک کر لمبا لمبا سانس لیتی ہے۔ تھوڑے وقفے کے بعد باہر والا دروازہ کھلتا ہے۔ اور حامد اندر آتا ہے۔ شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے اور روکھے بال بے ترتیب۔ بغل میں چمڑے کا بیگ۔ آتے ہی سب سے پہلے رضیہ بانو کی طرف دیکھتا ہے اور ان کے چہرے پر وہ پرانی آجاتی ہے جو ایک بھائی کا حصہ ہے)

حامد :۔ ارے ——— بٹیا ؟

(رضیہ چونک کر سر اٹھاتی ہے اور چہرہ اس کی طرف سے پھیر کر آنسو پونچھتی ہے ——— ساتھ ہی جلدی سے دوپٹہ سر پر ڈال لیتی ہے لیکن کرسی پر بیٹھی رہتی ہے)

:۔ (حیرانی سے) کیا بات ہے بٹیا رو کاہے کو رہی ہو ؟

رضیہ بانو:۔ کچھ نہیں (آنسو ضبط کرنے کیلئے کوئی شے بار بار نگل رہی ہے) نہیں تو

حامد :۔ تو منہ کیسا لال بھبوکا ہو رہا ہے، پھر کہتی ہو نہیں تو ——— کیا چچی جان آئی تھیں ———؟ (رضیہ کا جواب نہ پا کر) میں کہتا ہوں یہ چچیاں اس دنیا میں کیا ضروری ہیں۔ ان کے بغیر کیا کام نہیں چل سکتا تھا؟ انہوں نے پھر میرے قدرتی کام کو آوارگی کا نام دیا ہوگا ——— اور بس ——— تم رونے بیٹھ گئیں ——— ان کی باتوں کو سنتی ہی کیوں ہو

رضیہ بانو :۔ (ناک پونچھ کر) نہیں ——— نہیں ——— تو

حامد :۔ چچی جان بھی نہیں آئیں تو پھر رونے کی وجہ کیا ہے؟ (پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر) شہامت نے کوئی بدتمیزی کی ——— تم سے کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ اس بچے سے کام نہیں بنتا تو اماں بوا کو گاؤں سے بلوا لیں ——— بڑھی ہیں تو کیا کام تو سارا سنبھال لیں گی۔ مگر تم خود ہی تو شہامت کو لگائے رہتے ہو۔ خود ہی پیار کر کر کے اسے سر پہ چڑھا رکھا ہے ——— اور اب بیں روتی ہو بیٹھ کر

رضیہ بانو :۔ (اسی طرح سسکیاں لیتے ہوئے) نہ نہیں تو۔

حامد :۔ (اس کا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف موڑ کر) یہ بھی نہیں ——— وہ بھی نہیں ——— تو پھر تم رو کیوں رہی ہو ——— آج تم نے معصوم کا کمرہ بھی صاف نہیں کیا، وہ کہے گا جی میں کہ لو اب ہم ان لوگوں کے لئے بوجھ ہو گئے ہیں ——— پھر ابھی لطیف آ رہے ہیں، ہمیں یہاں بیٹھ کر چائے پینا ہے اور کچھ کام کرنا ہے ——— آخر جلدی سے بولو نا کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت خراب ہے کیا ؟

(رضیہ بانو کی سسکیاں ایک دم رک جاتی ہیں، وہ گہری نظروں سے بھائی کی طرف دیکھتی ہے۔ حامد کا ہاتھ رضیہ بانو

کی پیشانی پر ہے اور رضیہ کا چہرہ اپنے بھائی کی طرف اٹھا ہوا ـــــ ایک دو لمحے کی خاموشی کے بعد حامد کا ہاتھ کانپ جاتا ہے اور وہ جلدی سے رضیہ بانو کا سر اپنے سینے سے لگا لیتا ہے ـــــ دوسرے لمحے حامد اپنے پیگ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور رضیہ بانو کرسی سے اٹھ کر دوپٹہ سر پہ ڈال لیتی ہے)

حامد :- بٹیا اندر جا کر چائے کا پانی رکھ دو ـــــ اور دیکھو خبردار جواب دوگی سمجھیں سر میں درد ہو جائے گا ـــــ بس اب بھاگ جاؤ شاباش

(اسے تھپکتا ہے اور رضیہ کے سہمے ہوئے چہرے پر ایک لجاتی ہوئی مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ وہ اپنی مخصوص چال سے اندر کی طرف چلی جاتی ہے۔ حامد رضیہ بانو کو جاتا ہوا دیکھتا ہے اور پھر یوں سر جھٹکتا ہے جیسے کسی بچے کو بہلا کر فرصت پائی ہو)

حامد :- (آپ ہی آپ مسکرا کر) واہ ری بٹو ـــــ تو تو سچ مچ بڑی سی ہو گئی ـــــ عدم تعاون کی تحریک ہماری گھر میں ـــــ دھرنا دے کر بیٹھ گئیں سارا کمرہ گندہ پڑا ہے۔ (کپڑے اٹھا اٹھا کر کھونٹیوں پر لٹکاتا ہے) اپنے بھیا سے کہنے کے لئے کیسی اچھی زبان ایجاد کی بٹیا نے (پیار سے ہنستے ہوئے خلا میں دیکھ کر) تمہارے بھائی جان سمجھ گئے بٹیا ـــــ ہم سمجھ گئے

(دروازے پہ دستک)

حامد :- (کتابیں تپائی پر جماتے ہوئے) آ جاؤ لطیف، آ جاؤ بھئی۔ دروازہ کیا کھٹکھٹا رہے ہو ؟

(لطیف اندر آتا ہے)

لطیف :- میں نے کہا رضیا بٹیا کمرے میں نہ ہو اس لئے دروازہ

حامد :- ارے یار چھوڑو۔ بٹیا کا بڑا پردہ ہے تم سے ـــــ ابھی تین چار سال پہلے جناب سے کہانیوں کی کتابیں مانگا کرتی تھی اور منہ کلیا پکا کر چکھاتی تھی ـــــ اب آپ کو اس کے پردے کا اتنا خیال ہو گیا ـــــ میں تو سمجھتا ہوں اگر اماں جان زندہ رہتیں تو رضیہ ابھی تک اتنی چھوٹی سی ہوتی ـــــ لڑکیوں پہ ذمہ داری پڑ جائے تو جلدی بڑی ہو جاتی ہیں ـــــ بھلا اس کا تم سے کیسا پردہ ؟

لطیف :- ہاں ٹھیک ہے ـــــ مگر برائی بھی کیا ہے ـــــ خواہ مخواہ تمہاری چچی جان کو ایک اور اعتراض ہاتھ آ جائے گا کہ حامد میاں بٹیا کو دوستوں کے سامنے کرتے ہیں ـــــ اچھا اب یہ صفائی وغیرہ ختم کرو اور آؤ بیٹھ کر وہ کام کر لیں ـــــ ہام مت کی کتاب تو ہے نا یہاں ؟

حامد :- ہاں ہو گی (اسی موڈ میں) دیکھو تو لطیف آج بٹیا نے صفائی بھی نہ کی (تولیے سے میز صاف کر کے ناشتے کی ٹرے اٹھا کر نان خانے والے دروازے کے پردے تلے کھسکا کر پلٹتے ہوئے) بٹیا بھی خوب ہیں ـــــ مزے سے یہاں کرسی پہ بیٹھی رو رہی تھیں۔

لطیف :- (بے توجہی سے) اچھا رضیہ رو رہی تھیں۔ شہامت نے پریشان کیا ہوگا ـــــ (بک شیلف کی طرف جاتے ہوئے) شہامت بڑا باتونی ہے۔

حامد :- (اسی سرشاری کے عالم میں) ارے واہ لطیف بھیا۔ تم نہیں جانتے۔ ایسی باتوں پہ لڑکیاں اکیلے میں نہیں روتیں ـــــ اماں جان جب سے رخصت ہوئیں بٹیا تو جیسے میرے خون میں دوڑتی ہے میں اس کو خوب سمجھنے لگا ہوں

لطیف :- (بے توجہی سے) ہاں کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ اچھا اب آؤ ادھر کرسی پر بیٹھ جاؤ ـــــ پھر پرسوں پہ لیس میں چلا جائے گا۔

حامد :- (تولیہ سہرے کے کٹہرے پر ڈال کر کرسی پہ بیٹھتے ہوئے) ہاں واقعی مضمون جلدی تیار ہو جانا چاہیئے ـــــ در اصل معاشیات میرا مضمون نہیں۔ اس لئے

لطیف :- اچھا بھئی تم اعداد و شمار تو نوٹ کرو ـــــ بہرحال یہ مضمون اس بار مزہ آنا چاہیئے ـــــ

(حامد بیگ کھول کر کاغذات نکالتا ہے۔ کرسی پر ایک کرسی سے ٹیک لگا کر خلا میں کچھ گھورنے لگتا ہے)

حامد:- لطیف سنو! بٹیا نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ بس اس نے ایک لمحے میری طرف دیکھا۔ اور میں سمجھ گیا کہ وہ کیوں رو رہی ہے؟

لطیف:- (کرسی پر ٹیک لگا کر عینک رومال سے صاف کرتے ہوئے) کیا بات؟

حامد:- یہی کہ بٹیا اور معصوم رضا ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔

لطیف:- (عینک لگا کر اطمینان سے) اچھا!

حامد:- (سوچ سوچ کر) یہ بات مجھے پہلے معلوم ہوتی تو آج بٹیا اکیلی بیٹھی کیوں روتی؟ کل عورتیں اسے دیکھنے آئی تھیں نا۔ اس لئے وہ رو رہی تھی۔ لطیف دیکھو اگر اماں جان ہوتیں تو شاید وہ میری طرح بیوقوفی نہ کرتیں اور بجائے باہر کے رشتے ڈھونڈنے کے پہلے معصوم رضا کو بٹیا کے لئے پسند کرتیں

لطیف:- (بات کاٹ کر) مگر حامد تم کو یہ اندازہ کیسے ہوا؟

حامد:- لطیف، دیکھو بٹیا ہمیشہ کی بڑی شرمیلی ہے ——— اس نے کبھی میرے سامنے نگاہ نہ اٹھائی۔ مگر آج اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میری طرف دیکھا ——— میں سمجھ گیا۔ میں غالباً صحیح سمجھا ہوں کہ وہ کیا چاہتی ہے خدا جانے مجھے خود ہی پہلے یہ خیال کیوں نہ آیا ——— (بالوں میں انگلیاں ڈال کر) میں شاید بٹیا کو اتنا چاہنے لگا ہوں کہ ساری دنیا کے مردوں کو ——— معصوم رضا تک کو بٹیا کے لئے ایک بھائی کے روپ میں ہی دیکھتا ہوں۔ عجیب سی بات ہے مگر معصوم رضا

لطیف:- (گھبرا کر عینک اتارتے ہوئے) حامد ——— حامد تم محسوس نہ کرنا ——— دیکھو میں نے بھی بٹیا کو بہن ہی سمجھا ہے۔

حامد:- پھر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

لطیف:- میں تمہارے بہت قریب رہا ہوں ——— مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا رہا کہ رضیہ کا مجھ پر کچھ حق ہے ——— میں بھی اس کے لئے اچھا سا دولہا ڈھونڈتا رہا۔

حامد:- (خوشی سے) مجھے معلوم ہے کہ تم میری بہن کو اپنی بہن سمجھتے رہے۔

لطیف:- ہاں ایک بار مجھے یہ خیال آیا تھا کہ معصوم بٹیا کے لئے اچھا دولہا ثابت ہوگا۔ میں نے تم سے ذکر نہیں کیا۔ بس اپنے طور پر معصوم سے کہا کہ اس نے رضیہ کو اتنے قریب سے دیکھا ہے کیوں نہ وہ رضیہ کے لئے پیام دے

حامد:- پھر کیا کہا معصوم نے؟

لطیف:- معصوم تو حیران رہ گیا تھا میری بات پر ——— اس نے جواب دیا کہ رضیہ اس کے ذہن میں کبھی اس حیثیت سے نہ آئی ——— کہنے لگا کہ رضیہ اتنی اچھی لڑکی ہے وہ مجھے اپنا سگا بھائی سمجھتی ہے۔ میرا اتنا ہی خیال کرتی ہے میں بھلا کیسے ایسی بات سوچ سکتا ہوں۔

حامد:- (لمبی سانس لے کر) معصوم بہت اچھا لڑکا ہے۔ میں ہمیشہ سے اسے جانتا ہوں ——— جب وہ یہاں ریسرچ کے سلسلے میں آیا تو میں نے اسے ہوٹل میں نہیں رہنے دیا ——— مجھے اس پر بھروسہ تھا ——— ورنہ لطیف میں اپنی بہن کے ہوتے کسی رشتے دار لڑکے کو اپنے گھر ٹھہراتا ——— میں جانتا تھا کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔

لطیف:- یہ بات تو ہے ہی۔ مگر تم ابھی کہہ رہے تھے کہ رضیہ بٹیا رو رہی تھیں۔

حامد :۔ (ایک دم پریشان ہوکر) ہاں ــــ آں یہ بات بھی ہے (قدرے خاموش ہو جاتا ہے) مگر ہو سکتا ہے میں غلط سمجھا ہوں ــــ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

لطیف :۔ اچھا تو دیکھو حامد تم ابھی کسی پیغام کے لئے ہاں نہ کرنا۔ میں معصوم رضا سے بات کروں گا۔

حامد :۔ (پریشان ہوکر) مگر لطیف یہ طریقہ۔

لطیف :۔ اب چھوڑو رسموں کو ــ آخر وہ میرا بھی دوست ہے میں اسی طرح بات کروں گا جیسے میں اپنی طرف سے بات کر رہا ہوں۔ ــــ میرا خیال ہے کہ معصوم ــــ دیکھنا بیٹا بہت اچھی لڑکی ہے اس سے کوئی کسی ایک لمحے میں بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ میں رات معصوم کو سینما لے جاؤں گا پھر بات کریں گے

حامد :۔ مگر لطیف ــــ شاید غلط۔

لطیف :۔ اوہ اب چھوڑو مجھ پر ــــ ہاں تو وہ پام دت کی کتاب دینا ــــــ (پردہ)

دوسرا منظر

(وہی کمرہ، وہی سامان۔ بستر سلوٹوں سے بھرا ہوا۔ لحاف پوٹلی کی شکل میں پڑا ہوا جیسے ابھی کوئی بستر سے اٹھا ہو۔ ہر طرف کاغذات اور کتابیں پھیلی ہوئی۔ مسہری کے پاس والی تپائی پر سرجھایا ہوا سفید پھولوں کا ہار جو بجلی کے لیمپ کی روشنی میں نمایاں ہو رہا ہے۔ ایش ٹرے سگریٹوں کے ٹکڑوں اور راکھ سے بھرا ہوا۔ پردہ اٹھتا ہے تو کمرے میں کوئی نظر نہیں آتا۔ پس منظر سے دو عورتوں کے بولنے اور ہنسنے کی آوازیں آ رہی ہیں ــــ سامنے کی دیوار سے حامد تیزی سے اندر آیا۔ معصوم کہتا اندر آتا ہے ــ اور پھر جلدی سے دائیں دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ اس کے جانے کے ایک لمحے بعد رضیہ زنان خانے والے دروازے سے بڑی تیزی سے ــ اندر آتی ہے۔ اس نے گہرے ہرے رنگ کا غرارہ سوٹ پہن رکھا ہے سر کے بائیں حصے پر سونے کا جڑاؤ چھپکا، ہاتھوں میں سرخ چوڑیاں اور سونے کے کنگن، پاؤں میں ہلکے ہلکے بجنے والا کوئی زیور مانگ میں افشاں ــــ سر سے پاؤں تک خوب بنی ٹھنی چوتھی کی دلہن ــ اس کے تعاقب میں دو رشتے دار عورتیں اور ایک بچہ۔ عورتوں نے برقعے پہن رکھا ہے مگر نقاب الٹی ہوئی ہے)

رضیہ بانو :۔ (ذرا اٹھلا کر) لے اللہ ایسی کیا جلدی تھی ذرا اور ٹھہر جاتیں آپ لوگ۔ سب مہمان چلے گئے اب آپ بھی جا رہی ہیں۔

ایک عورت :۔ اے بیٹا اب رات ہوگئی۔ ماشاء اللہ ــــ دن بھر نور ہے۔ دولہا سے چوتھی بھی خوب کھیلے۔ کھایا پیا۔ اب چلیں آتی دیر سے منجھلے میاں تانگہ لئے باہر کھڑے ہیں۔ اللہ تمہاری اماں جان کو جنت بخشے وہ ہوتیں تو کیا نہال ہوتیں آج کے دن

(رضیہ ایک دم کرسی کا سہارا لے کر سر جھکا لیتی ہے)

دوسری عورت :۔ ماشاء اللہ ــــ تمہارا دولہا بڑا اچھا ہے ــــ گر نرا سیدھے سے آدمی لگتے ہیں ــ اللہ رکھے ہنستے بولتے بھی زیادہ نہیں ــــ خیر اللہ خوش رکھے۔

پہلی عورت :۔ ہاں بیٹا تمہاری ساس ذرا کم چڑھی لگتی ہو ــ تمہارے دولہا بھی اپنی ماں کے سکھے میں زیادہ معلوم ہوتے ہیں (دوسری عورت سے مخاطب ہوکر)

سلے آپا دیکھا نہیں تھا، پھر تی کے وقت کیا بیٹھے سے کہے جا رہی تھیں کہ باہر چلے جاؤ اور وہ بھی تو مر مانے ہیں چل دیئے ـــ ارے ایسا بھی کیا چھوتی کا دن کہ رہتا ہی ہے سب کے ہنسنے مذاق کرنے کا ـــــ

پہلی عورت :۔ (رضیہ بانو کا بازو پکڑ کر) اور دیکھا ابھی تمہاری ساس جانے گئیں تو دولہا کو ساتھ لے گئیں کہ اب اکیلے کیسے جاؤں خدانخواستہ کیا یہی ایک بیٹا ہے ـــ اے جہاں دولہا کی رات یہاں گزرنا تھی، اتنی دیر اور رہ لینے دیا ہوتا دیکھ لینا دولہا کو آنے تھوڑی دیں گی۔

رضیہ بانو :۔ (گھبرا کر) جی ـ جی نہیں۔ وہ تو کہہ گئی تھیں کہ ابھی بھیج دیں گی۔

دوسری عورت :۔ اچھا بھئی چلو آج بھیج دیں گی۔ مگر کہے دیتی ہوں اس ساس کا بھروسہ ـــــ

(باہر سے آواز۔ "جلدی آؤ منو کی اماں" دونوں عورتیں جلدی جلدی رضیہ بانو کو گلے سے لگاتی ہیں اور دروازے کی طرف جاتی ہیں اچانک پہلی عورت دروازے سے پلٹ کر)

پہلی عورت :۔ اے میں یہ پوچھنا تو بھول گئی کہ سسرال سے منہ دکھائی کتنی ملی

رضیہ بانو :۔ میں نے بتایا تو تھا آپ کو خالہ جان ـــ بہت سے روپے اور زیور ملے۔ میں نے گنے نہیں

(باہر سے پھر آواز آتی ہے)

پہلی عورت :۔ (جاتے جاتے پلٹ کر) دولہا نے کیا دیا ؟

رضیہ بانو :۔ میں نے بتایا تھا نا کہ کنگن ـــ اچھا تسلیم خالہ جان۔

(رضیہ دروازہ بھیڑ کر پلٹتی ہے تو ہنستی ہے)

یا اللہ دن بھر منہ دکھائی کا حساب پوچھتی رہیں، پھر بھی نہ پوچھ سکنے کا غم رہا (نقل کرتی ہے) "خوش رہو خوش رہو" ہاں جیسے ان کی اجازت کے بغیر ہم خوش بھی نہیں رہ سکتے۔

(ہنستی ہے اور اٹھلا اٹھلا کر پاؤں کے گھنگھرو بجا کر ننھے ننھے قدم اٹھاتی ہے اور پھر خود ہی ایک بار ہر طرف دیکھ کر پریشان سی ہو جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ سے بڑھ کر تپائی پر پڑا ہوا پھولوں کا ہار اٹھا لیتی ہے۔ پریشان ہو کر زنان خانے کے دروازے تک جاتی ہے)

رضیہ بانو :۔ شہامت ـــ ارے او شہامت ادھر تو آئیو۔

(شہامت کہ سے لٹھے کا پاجامہ جس پر سالن کے داغ ہیں اور دھاری دار قمیص پر پرانا کوٹ پہنے آتا ہے۔ رضیہ کمر پر ہاتھ دھرے آنکھیں نکالے کھڑی ہے اس کے ہاتھ میں پھولوں کا ہار ہے)

کیوں بھئی شہامت میں دروازے کے لیے گھر سے گئی اور تو نے بدتمیزیاں شروع کر دی ہیں کہوں بھائی جان سے کہہ کر تجھے پٹواکریں۔

شہامت :۔ (اترا کر) آں باجی، آج بھی ڈانٹ رہی ہیں۔

رضیہ بانو :۔ (غصے سے) ڈانٹوں نہ تو تجھے سر پہ بٹھا لوں ـــ یہ کمرہ دیکھ ذرا ـــ جیسے کتے لوٹتے ہوں ـــ ابھی وہ واپس آئیں گے تو کہیں گے کہ کیسے لوگ ہیں ـــــ

شہامت :۔ وہ کون ؟

رضیہ بانو :- (جھینپ کر) وہ ــــــــ وہ سے وہ وہ دلہا میاں

شہامت :- وہ کیوں کہیں گے کچھ۔ میری اماں کہتی ہیں بیٹی نے دی سب کچھ دے دیا۔ بس جاؤ آپ بھی کہہ دیجئے گا دلہا میاں سے

رضیہ بانو :- (بے تحاشہ ہنستے ہوئے) افوہ بے تقراط۔ ہر معاملے میں جناب کی رائے موجود ہے ـــ تو بھلا وہ بے چارے کیا مانگنے جائیں۔ ہے میں کہتی ہوں وہ اس کمرے کی ابتری دیکھیں گے تو اپنے جی میں کیا کہیں گے (سنجیدگی سے) یہی کہیں گے کہ تیری باجی کتنی بے تمیز ہیں بھولے کر صفائی کرنا بھی نہ سکھایا۔

شہامت :- (جھنجھلا کر) لیجئے میں نے تو یہیں صفائی کر رہا ہوں ـــ میری اماں کہتی رہیں، لا بیٹے آج تیرے حصے کا کام میں کروں گی۔ مگر میں نے ان کا کہنا نہیں مانا۔ مہمان بھی نہیں آئے تھے۔ وہاں تو پھر چاندنیاں بچھاتی۔ یہیں میں نے سارا گھر شیشے کی طرح چمکا دیا ـــــ بھائی جان جب آپ کی سسرال جانے لگے تو مجھے خوب شاباش دی تھی اور یہ چمک دے ڈالا تھا ــــــ اور آپ اب کہتی ہیں

رضیہ بانو :- (ہنس کر اس کے قریب آتے ہوئے) میں تجھے کچھ کہہ تو نہیں رہی ہوں۔ بس اتنی سی بات کہی ہے کہ یہ کمرہ ـــــ ارے یہ تین دنوں کا سوکھا ہار ہی پھینک دیا ہوتا کونے سے میں۔

شہامت :- اللہ قسم باجی میں یہاں آیا تھا تو معصوم بھائی نے کہا جاؤ کمرہ ٹھیک ہے۔ وہ ہوں نہ ڈانٹا ـــ میں کیا کروں ؟

رضیہ بانو :- اچھا بابا قائل ہو گئے۔ اب تم اندر جاؤ اور میاں چاندنیاں تہہ کر کے رکھو ـــــ (ایک دم کچھ یاد کر کے دھیرے سے) اور دیکھو اپنی اماں سے کہہ دینا کہ میرے کمرے میں روشنی کر دیں ــــ اچھا

(شہامت جاتا ہے۔ سامنے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر معصوم بخاری دروازے میں بت کی طرح کھڑا ہوتا ہے۔ اس نے سیاہ شیروانی اور پاجامہ پہن رکھا ہے۔ بال بڑے اجڑے ـــ رضیہ کپڑے اٹھا کر اٹھتی ہے اور بڑبڑاتی ہے۔ اب آتے ہی ہوں گے ـــ ظاہر ہے کہ اس نے ابھی معصوم کو نہیں دیکھا ـــ رضیہ پلٹتی ہے اور معصوم بخاری کو دیکھ کر ذرا چونکتے ہوئے مسکراتی ہے ــــ)

رضیہ بانو :- (دوپٹہ کا آنچل نزاکت سے کندھے پر ڈالتے ہوئے) ارے آپ ــــ ؟ میں ذرا آپ کے کمرے کا مزاج درست کر رہی تھی (کھل کر مسکراتی ہے)

معصوم :- (دھیرے دھیرے اندر آ کر دھیمے لہجے میں) اچھا کیجئے آپ۔

رضیہ بانو :- ارے معصوم بھائی، میں آپ کی کب سے ہو گئی (اپنی مخصوص ادا سے چہرہ اس کی طرف اٹھا کر)

معصوم :- (رضیہ کی طرف سے منہ پھیر کر سامنے دیکھتے ہوئے) جی ـــ جی آپ ـــ آپ کی شادی ہو گئی نا

رضیہ بانو :- (شرما کر دوپٹہ سنبھالتے میں چوڑیاں بجا کر) واہ ـ تو ـ اس سے کیا ہوتا ہے ـــ میں تو آپ کے لئے وہی ہوں۔

معصوم :- نہیں ـ یہ بات نہیں ـــ (رضیہ کی طرف غور سے دیکھتا ہے) آپ ـ آپ بہت خوش ہیں ؟

رضیہ بانو :- ہائے اللہ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ معصوم بھائی ـــ (چھی چھی کر کے زنان خانے والے دروازے کی طرف جاتے جاتے اپنی مخصوص ادا سے پلٹ کر دیکھتی ہے اور پلٹنے کے انداز سے دوپٹہ سر پر درست کرتی ہے)

رضیہ بانو :- (ایک دم) بھائی جان کہاں ہیں ؟

معصوم :- (دھیمی آواز میں) باہر گئے ہیں کتب خانے تک ابھی آتے ہیں ـــــ

رضیہ بانو:۔ توبہ ہے جب چاپ کرسی پہ بیٹھا جائیے۔ آپ کی چیزیں تو بیچتے سے رہے اور ابھی ایک مہمان آئیں گے تو آپ کے کمرے کی حالت دیکھ کر کیا کہیں گے اپنے جی میں۔

(رضیہ کتابیں تپائی پہ جماتی ہے)

معصوم:۔ (کرسی کی پشت پکڑ کر) کون مہمان؟

رضیہ:۔ (شرما کر) بھئی اللہ آپ کو کیا ہو گیا ہے ——— یہاں آپ کے بہنوئی اور کون؟

(جلدی سے جھک کر ہاتھوں سے چادر کی سلوٹیں ہٹاتی ہے اور لحاف تہہ کرتی ہے۔ جھکنے کے باعث دوپٹہ سر سے ادر کر سے پھسل جاتا ہے لمبی سی چوٹی ریشمی قمیص پہ تڑپ کر پہلو میں لٹک جاتی ہے۔ اور کمرہ چوڑیوں کے چھناکوں سے گونج اٹھتا ہے)

معصوم:۔ (ایک دم شیروانی کے بٹن بند کرتے ہوئے) وہ یہاں کیوں آئیں گے!

رضیہ بانو:۔ (ٹھٹھک کر) معصوم بھائی! آپ بہنوئی کو غیر سمجھتے ہیں؟

(رضیہ انہماک سے تکئے کا غلاف ٹھیک کرتی ہے اور پھر گول میز کے قریب آتی ہے جہاں کرسی کے پاس معصوم کھڑا ہے ——— وہ پھرتی سے رسالے اخبار سمیٹتی ہے ——— معصوم نظر بچا کر اسے دیکھتا رہتا ہے رضیہ ادھر سے پھرتی سے سرک کر میز پہ پڑا ہوا پاس ہار اٹھاتی ہے۔ اور زنان خانے والے دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔)

معصوم:۔ (چونک کر) یہ کہاں ——— لے جا رہی ہیں آپ

رضیہ بانو:۔ (مصنوعی حیرت سے) پھر آپ کہاں؟ (ہار میز پہ ڈال دیتی ہے)

معصوم:۔ یہ رکھ دیجئے۔ میں کہہ رہا ہوں ——— مجھے اپنی چیزوں اور کمرے سے شرم نہیں آتی

رضیہ بانو:۔ (ذرا ناز سے) آپ برا مان گئے معصوم بھائی ——— ہائے اللہ میں

(اسی لمحے)

شجاعت:۔ (پردے سے منہ نکال کر اونچی آواز میں) دیکھ لیجئے باجی، اماں میرا کہنا نہیں مانتیں آپ کے کمرے میں وہ پلنگ ڈال رہی ہیں اور سارے بستر پھول نوچ نوچ کر ڈال رہے ہیں۔ پھر آپ منع کر دیجئے نہیں تو ناس مار دیں گی ———

(رضیہ شجاعت کی گفتگو کے دوران میں سٹپٹا کر منہ پہ یوں ہاتھ رکھ لیتی ہے جیسے اپنی چیخ کو دبا رہی ہو اور پھر دفعتاً وہ دروازے کی طرف بھاگتی ہے۔ اس کے منہ سے ہائے اللہ نکلتا ہے اور وہ شجاعت کے سر کو دھکیلتی ہوئی اندر غائب ہو جاتی ہے۔ معصوم اس دوران میں یوں کھڑے رہتے ہیں جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اور پھر ایک کتاب اٹھا کر دیکھنے لگتے ہیں۔ اس دوران میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیزار ہیں۔ دفعتاً وہ میز پہ پڑا ہوا ہار اٹھا کر جیب میں رکھ لیتے ہیں۔ اور کرسی پہ بیٹھ جاتے ہیں اسی کرسی پہ جہاں پہلے منظر میں رضیہ بیٹھی تھی۔ چند لمحے بعد وہ اپنا سر ہتھے پہ ٹیک دیتے ہیں۔ چند لمحے کے وقفے کے بعد حامد اور لطیف ہشاش بشاش اندر آتے ہیں۔

(دونوں ٹھٹک کر معصوم کو دیکھتے ہیں جو اب خفیف ہو کر مسکرانے کی کوشش کرتا ہے)

حامد: (معصوم کے قریب آ کر) ارے معصوم کیا بہت تھک گئے آج — ہاں مہمان بھی تو آج ——

معصوم: (مسکرا کر) نہیں تو —— زیادہ تو نہیں ——

(سب بیٹھ جاتے ہیں)

لطیف: ہمارے ہاں کی شادیوں میں عزیزوں پر اتنا کام پڑ جاتا ہے کہ تھکے بغیر بات بنتی نہیں ——

حامد: (برجستہ) اسی لئے لطیف تم ولایت جا کر شادی کرنا ——

(سب ہنستے ہیں۔ حامد کا قہقہہ سب سے اونچا ہے)

حامد: (اچانک سنجیدہ ہو کر) ارے ہاں معصوم جب چڑھتی کھیلی جا رہی تھی تو پھلوں کی لڑائی میں میں نے ایک اڑن طشتری دیکھی تھی؟ لال سرخ —— یہ آئی، وہ گئی۔

معصوم: (حیرت سے) اڑن طشتری؟

حامد: (بے تکلفی سے کندھے پر ہاتھ مار کر) ارے بابا وہ سرخ دوپٹے والی محترمہ جنہوں نے تمہارے سر پر ایک سیب رسید کیا تھا — واللہ انہوں نے بخدا اس دل جمعی سے لگائی تھی کہ قطعی سیب معلوم ہو رہی تھیں —— کہو تو معلوم کریں کہ محترمہ کس کھونٹے کی گائے ہیں (رک کر سنجیدگی سے) میں تمہیں رنجیدہ نہیں دیکھ سکتا معصوم۔

معصوم: (کھسیانی ہنسی ہنس کر) اچھا معلوم ہوا کہ سیب کی چوٹ کدھر لگی —— تو اسی لئے آپ اتنے بشاش ہیں آج —— مگر کس لو بھائی لطیف ادھر کے حاتم ہیں

لطیف: (ہنس کر بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) قبلہ حاتمی کا دور بیت گیا —— واقعی جب بچپن میں حاتم طائی پڑھتے تھے تو یہ احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ حسن بانو بھی کیا گھٹیا کردار ہے — نئے "منیر شامی" کی جگہ حاتم طائی ساتوں شرطیں پوری کرتا ہے اور محترمہ بجائے اس کے کہ حاتم کی جواں مردی پر صدقے ہوتیں منیر شامی کی منکوحہ بن گئیں —— اس زمانے میں تو بھی ——

حامد: (زور سے) سیب آپ کی جھولی میں ٹپک پڑے گا کیوں صاحب ——

(حامد اپنی بات پر زور سے ہنستا ہے اور اٹھ جاتا ہے)

لطیف: کہاں چلے، تین چار دن سے کوئی کام نہیں ہوا اس وقت پرچے کے لئے کچھ مضامین دیکھنا ہیں۔ کاتب کاپیاں بھی دے گیا ہے ——

حامد: تم لوگ میرے بغیر بھی کچھ کر لیا کرو بابا —— میں ذرا بٹیا کے پاس جا رہا ہوں جب تک کچھ کر ڈالو ابھی آیا —— کپڑے بھی بدل لوں —— شیروانی میں تو انسان جکڑا جاتا ہے —— تم لوگوں کے لئے بھیجوں دو عدد کمبل —— نہیں مذاق نہیں ——

لطیف: نہیں صاحب ہم ٹھیک ہیں، آپ جائیے اپنے بوری نما کمبل سے شوق فرمائیے —— اور دیکھو بٹیا کے پاس ہی بیٹھنا یہ نہیں کہ اپنے کمرے میں جا کر سو رہو۔

(حامد سامنے والے دروازے میں چلا جاتا ہے — لطیف اٹھ کر شیلف کے نچلے خانے سے کچھ کاغذ اور رسالوں کی موٹی کاپیاں نکالتا ہے اور کمبل پر رکھ دیتا ہے —— اس کے بعد کرسی پر بیٹھ کر جیب سے رومال نکالتا ہے اور سیدھ

اطمینان سے عینک اتار کر رومال سے صاف کرتا ہے ــــ معصوم اس دوران میں بے تعلق سا بیٹھا رہتا ہے)

لطیف :- اور ہاں معصوم تم کاپیاں پڑھ ڈالو۔ میں مضامین دیکھتا ہوں ــــ آج تھوڑا کام ہو جائے تو بہتر ہے۔

(معصوم کاپیاں کھول کر میز پر پھیلا دیتا ہے اور انہماک سے پنسل ہاتھ میں پکڑ کر جھک جاتا ہے۔ لطیف فائل میں سے کاغذات نکال کر دیکھنے لگتا ہے ــــ ایک آدھ منٹ کی مکمل خاموشی رہتی ہے)

لطیف :- (ہاتھ سے کاغذات رکھ کر غور سے معصوم کی طرف دیکھتے ہوئے) معصوم!

معصوم :- (چونک کر) آں ہاں

لطیف :- (سنجیدگی سے نرم آواز میں) اطلاعاً عرض ہے کہ تم الٹی کاپی پڑھ رہے ہو۔

معصوم :- (ہڑبڑا کر) آں۔ اچھا۔ (کاپی سیدھی کرتا ہے)

لطیف :- تم بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ جاؤ بستر میں لیٹ جاؤ ــــ تمہارا منہ سرخ ہے اور تم سردی سے کانپ رہے ہو۔ یہ موسم ہی ایسا ہے میرا خیال ہے کہ تم اس وقت کونین کی ایک گولی کھا لو ــــ گھر میں کونین ہوگی؟

معصوم :- (گھبرا کر) کونین تو بہت ہے گھر میں (رک رک کر ایک دم خلا میں دیکھتے ہوئے) ایک دن۔ ایک دن یہ ہوا کہ (پھیکی ہنسی کے ساتھ) رضیہ نے بالکل یہی بات مجھ سے کہی تھی

لطیف :- میں حامد کو بلاتا ہوں وہ اندر سے کونین لا دے گا

معصوم :- نہیں نہیں۔ رہنے دو، میں بالکل ٹھیک ہوں، میں ذرا تھک گیا ہوں۔ (کاپی پڑھنے کے لئے جھکتا ہے)

لطیف :- معصوم تم کچھ جذباتی سے ہو رہے ہو۔ میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں، تمہاری کوئی سگی بہن نہیں ہے نا ــــ اس لئے ــــ تم کل بھی اس کیفیت میں تھے ــــ بہنیں تو گھر سے چلی ہی جاتی ہیں ــــ میں جانتا ہوں کہ گھر میں اب نہیں وہ پہلا سا آرام نہیں ملا ہوگا ــــ دیکھو حامد کتنا خوش ہے ــــ تم رضیہ سے ملے؟

معصوم :- (بالوں میں انگلیاں پھنسا کر) تو ہاں۔

لطیف :- وہ تو خوش ہے نا؟

معصوم :- ہاں بہت زیادہ ــــ (ایک دم کرسی سے اٹھ کر رومال نکالتا ہے اور جیب سے باسی ہار گر جاتا ہے۔ لطیف حیرت سے دیکھتے ہیں اور جھک کر اسا اٹھا لیتے ہیں)

لطیف :- یہ ہار ــــ اسے احتیاط سے رکھ دو ــــ میری چھوٹی بہن کی شادی کا ہار بھی اب تک میرے پاس ہے ــــ یہ بہنیں کتنی پیاری ہوتی ہیں اور پھر کتنی عجیب بات ہے کہ ہم خود اپنے ہاتھوں انہیں اجنبیوں کو سونپ دیتے ہیں ــــ

معصوم :- (چڑ کر، لطیف، یہ بات نہیں ــــ میں ــــ میں تو ــــ مجھے تو باسی پھولوں کی خوشبو پسند ہے اس لئے دو دن سے جیب میں پڑے ہیں ــــ اور پھر رضیہ تو بہت بدل گئی ہے ــــ دیکھو میں صاف کہہ دوں، مجھے اس سے مل کر بڑا صدمہ پہنچا۔ پہلے اسے اس گھر کا کتنا خیال تھا ــــ کوئی چیز جگہ سے ذرا سا کھسکا بھی کسی طرف نہ پڑا رہ جائے ــــ ہر وقت جیسے ہر طرف سایہ سا بنی رہتی تھی (معصوم منہ اٹھا کر خلا میں دیکھتا ہے)

لطیف :- (اطمینان اور دلچسپی سے) ہاں واقعی وہ جب چھوٹی سی تھی جب بھی ایسی ہی تھی ــــ ایک بار میں گرمیوں میں آیا تو کرتے کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔

جلدی جلدی نہا کر یوں ہی چل پڑتا تھا یہاں آیا تو رضیہ بھاگتی ہوئی آئی — ایک منٹ میرے پاس رکی اور پھر بھاگ گئی — نسا اور لبھائی تو سیلی تاگا اور بجلی لیئے — ایک بار جب میں آیا تو امی کے انتقال کے بعد بہت اداس تھا — اس نے کچھ نہ بنا۔ مجھے دیکھا اور بھاگی تند گئی۔ واپس آکر اپنی کپڑے کی گڑیا مجھے دے دی

معصوم :۔ (اسی انداز سے خلا میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر) لطیف — بڑی ہونے کے بعد تو تم نے اسے نہیں دیکھا تھا — وہ تو بہت اچھی ہو گئی تھی — جب سے میں یہاں آیا وہ مجھے سامنے کی طرح عزیز رکھتی چپ چاپ الگ الگ مگر وقت پر اچھا اچھا کھانا — صبح صبح نہانے کو گرم پانی — بستر پہ گرم چائے شیو کے لئے گرم پانی — جوتوں پہ پالش — میں گھر میں ہوتا تو میری پڑھائی کے خیال سے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی شہامت سے چپکے چپکے بات کرتی — مگر اب شہامت بھی پوچھتا ہے — اوہ — وہ تو بہت عجیب سی ہو گئی ہے — ایک دم لا پرواہ

لطیف :۔ (سنجیدگی سے ٹہلتے ہوئے) معصوم یوں نتیجہ نہیں نکالتے — دیکھو لڑکی کے لئے شادی ایک نیا تجربہ ہوتا ہے سنسنی پیدا کرنے والا —

معصوم :۔ (تیزی سے پلٹ کر) لطیف۔ بس۔

(دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور پھر معصوم آہستہ سے ڈولتا ہوا کرسی کی طرف جاتا ہے اور جیسے نڈھال کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے لطیف قریب آکر اس کے کندھے پر تھپکی دیتا ہے)

معصوم :۔ (لمبی سانس لیتے ہوئے) تم نہیں جانتے۔ لوگ جانے کیا کہیں گے۔ مگر مجھے آج بہت دکھ ہوا لطیف

لطیف :۔ کس بات کا دکھ ؟

معصوم :۔ وہ ابھی میرے کمرے میں آئی تو اس نے کہا کہ یہ کمرہ صاف ستھرا ہونا چاہیئے ورنہ اس کے دولہا پر بڑا خراب اثر پڑے گا — سنا تم نے۔ اب اس کمرے سے اس کا اتنا ہی تعلق ہے کہ یہاں سے اس کا دولہا گزرے گا چونکہ اسے رسم کے مطابق آج کی رات اس گھر میں گزارنا ہے — لطیف تم ابھی کہہ رہے تھے کہ یہ لڑکیاں کیا کیا ہوتی ہیں — میں کہتا ہوں یہ لڑکیاں محض ایک رسم ہوتی ہیں۔

(لطیف خاموشی سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ تھوڑا وقفہ)

معصوم :۔ (پچھلی کیفیت سے اچانک نکل کر) لطیف کیا خیال ہے اس رسم کے بارے میں کہ دولہا چوتھی کی رات لڑکی کے میکے میں بسر کرے — سخت بدتمیزی کی رسم ہے۔ اب دیکھو نا گھر میں چھوٹا سا شہامت بھی ہے

لطیف :۔ (جلدی سے بات کاٹتے ہوئے) رسمیں اچھی بھی ہیں بری بھی ہیں — خیر چھوڑو اب اس وقت اصلاح رسوم کے بیٹھنے سے زیادہ اہم کام ہے — چلو مضامین ہی دیکھ لیں پرچہ پریس میں جانے کو ہے

(معصوم کاپیاں سنبھالتا ہے اور لطیف اپنے کاغذات لے کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

(تھوڑا وقفہ)

معصوم :۔ (ایک دم کرسی کی پشت سے سر لگا کر) میں حامد کے ساتھ سہ پہر رضیہ کے سسرال گیا تھا — اسے چوتھی کے لئے لانا تھا — جانے یہ رسم بھی بھگتنی

لطیف :۔ (میک اور کی کمائی دانتوں میں دبا کر) بھگتنی کیوں — بھائی نہ جاتے تو کون لینے جاتا۔ خوشی تو بہت ہوئی ہوگی تم دونوں کو دیکھ کر شادی کے بعد لڑکیاں میکے کے لئے بہت جذباتی ہو جاتی ہیں۔

معصوم (چونک کر) ہنہ خوش فہمی! ارے صاحب ہم لوگ پہلے ان کی ساس کے حضور میں بیٹھے بیٹھے تھک گئے۔ وہ بڑی بی کہے جا رہی تھیں کہ اب دلہن نہا رہی ہے۔ اب دلہن سنگار ہو رہے ذرا دل لینا ۔۔۔ ایسی باتیں جیسے ہم دلہن کے لئے غیر ہوں۔ میں تو حامد کے خیال سے بیٹھا رہا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو نہ کچھ گھر کا پوچھا نہ کچھ اور آدھے گھنٹے خواہ مخواہ شرماتی رہیں یا منہ چھپا کر روتی رہیں۔ پھر جب سر اٹھایا تو بس اپنے کلمی ہی گھماتی رہیں

لطیف :- (سنجیدگی اور ملائمت سے) معصوم یہ تو سب بہت فطری چیزیں ہیں۔ شادی دراصل لڑکیوں کے لئے ایک حیرت خیز تجربہ ۔۔۔

(معصوم فقرہ مکمل ہونے سے پہلے تیزی سے ہاتھ کے اشارے سے لطیف کو چپ رہنے کا اشارہ کرتا ہے۔ اور کھڑا ہو جاتا ہے۔ لطیف حیرت سے خاموش ہے)

معصوم :- اوہ! اس قسم کی باتوں سے مجھے دلچسپی نہیں ۔۔۔ میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ وہ بدل گئی میری توقع کے خلاف وہ ایک دم بدل گئی ۔۔۔

لطیف :- بھائیوں کو بہن کی خوشی سے خوشی ہوتی ہے۔

معصوم :- (سخت آواز میں) ایسی میری بہن نہیں ہو سکتی۔

(سامنے کے دروازے کے پردے میں ایک لرزش)

لطیف :- میں سمجھ گیا معصوم! (رنجیدہ چہرے سے عینک اتار کر رومال سے دھیرے دھیرے پونچھتا ہے۔ معصوم ٹہلتے ٹہلتے ٹھٹھک کر لطیف کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ اور گھبراہٹ میں شیروانی کے بٹن ٹٹولتا ہے)

معصوم :- کیا سمجھے؟

لطیف :- (ایک سگریٹ سلگا کر) جو تم نہیں سمجھ رہے ہو (رک کر) دیکھو معصوم میں تم سے درخواست کروں گا کہ حامد کے سامنے یا رضیہ کے سامنے اس قسم کی باتیں نہ کرنا ۔۔۔

معصوم :- (سخت آواز میں) جو میرے خیالات ہیں ۔۔۔

لطیف :- (بات کاٹتے ہوئے) جانے دو معصوم۔ لو یہ سگریٹ پی لو۔

(معصوم سگریٹ لیتا ہے اور لطیف ماچس جلا کر پیش کرتا ہے)

لطیف :- (مبالغہ سے کروٹ آہستہ آہستہ اگل کر) کاش رضیہ شادی سے پہلے اتنی گھر گھسنی نہ ہوتی، وہ بھی اور لڑکیوں کی طرح کبھی کبھی گھر چھوڑ کر کسی خالہ یا چچی کے گھر چند دن کے مہمان جایا کرتی۔

معصوم :- (حیرانی سے) تو اس سے کیا ہوتا ہے؟

لطیف :- مجھ سے پوچھتے ہو؟ اچھا تو سنو رضیہ آج سے بہت پہلے تمہیں اپنے اہم وجود کا احساس دلا رہی (ٹہلتے ہوئے) میں جب چھوٹا سا تھا تو میری اماں صبح صبح چوکی پر بٹھا کر مجھے دودھ روٹی دے دیا کرتی تھیں، لیکن روز جب منہ زور وقت پر دودھ روٹی ملنے لگی تو اکثر مجھے ۔۔ روٹی توڑ توڑ کر کتوں کو کھلانے میں بڑا مزہ آنے لگا۔ ایک دن اماں نے میرے سامنے سے دودھ روٹی چھین لی کہ تو ٹکڑا کتوں کو کھلا رہا ہے ۔۔۔ سچ کہتا ہوں معصوم اس روز جس زور کی بھوک مجھے لگی وہ مجھے اب بھی یاد ہے۔

معصوم :- لطیف! لطیف!!

لطیف :۔ (اسی طرح ٹہلتے ہوئے) رضیہ تمہارے لئے گھر کی جلترنگ ہاتھوں میں ڈھل گئی تھی —— وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جن میں آنکھ کے کھولتے ہی ماتا کا روپ اپنے لگتا ہے ۔ صاف ستھرا گھر، شیو کے لئے گرم پانی، مزیدار کھانا اور جوتوں پہ پالش، یہ ہاتھیں اتنے تسلسل سے مہیا ہوتی رہیں کہ ان ہاتھوں کا احساس ہی تمہارے دل میں نہ ابھرا —— تمہیں ان ہاتھوں کے علاوہ کسی علیحدہ وجود کا احساس تک نہ ہو سکا۔ یہ تمہارے کمرے میں لگی ہوئی بجلی ہے : تمہیں نہیں اس کا احساس کہاں ہوتا ہے۔ تمہارے جوتے اس کے لمس کو محسوس نہیں کرنے دیتے —— تو سنو آج سے پہلے تمہارے یہ ہاتھ بھی جوتے پہنتے ہے —— اور ——

معصوم :۔ لطیف مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر قابل واقع ہوئے ہو —— (سگریٹ ایش ٹرے میں زور سے بجھاتا ہے)

لطیف :۔ (اٹھ کر دوسری سگریٹ پیش کرتے ہوئے) معصوم ہر آگ سگریٹ کی آگ نہیں ہوتی جسے اتنی آسانی سے بجھایا جا سکے —— تم رضیہ میں عیب ڈھونڈ کر چھٹکارا نہیں پا سکتے ——

(معصوم سگریٹ نہیں لیتا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور معصوم جھٹکے سے مڑ کر کرسی میں دھنس جاتا ہے - لطیف ایک لمحہ اس کے پاس رک کر پھر ٹہلنے لگتا ہے)

(وقفہ)

لطیف :۔ (معصوم کے قریب آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر) میں جذباتی ہو گیا ہوں معصوم۔ معاف کر دو —— میری پرانی خواہش تھی کہ رضیہ تم سے بیاہی جائے —— میری یہی ناکام خواہش تمہیں ڈنک لگانا چاہتی تھی —— مجھے معاف کر دو! میں سب غلط سمجھا ——

معصوم :۔ (کرسی سے ایک دم اٹھ کر) لطیف! میں نے ابھی —— اس لئے یہ معلوم کیا کہ تم صحیح سمجھے —— میں رضیہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

(معصوم لطیف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے اور لطیف ایک قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے)

معصوم :۔ (غم زدہ آواز میں) لطیف' بھائی جب تم نے مجھ سے آخری بار پوچھا تھا کہ رضیہ سے شادی کرو گے ——؟ تو میں نے کیا کہا تھا لطیف بھائی؟ میں اپنا جواب بھول گیا ہوں۔

لطیف :۔ (مدھم آواز میں) تم نے کہا تھا کہ رضیہ کے بارے میں مجھے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں اور کہا تھا کہ تم رضیہ کو اس روپ میں نہیں دیکھتے —— اور یہ بھی کہا تھا کہ تمام عمر ایک فنکار کی طرح بسر کرنا چاہتے ہو جس کی زندگی ——

معصوم :۔ (جلدی سے گویا جیسے حافظے پر زور دے رہا ہو) جس کی زندگی میں پھولوں کی خوشبو تک نہیں ہوتی، جس کی زندگی میں کوئی چوڑی تک نہیں کھنکتی

(لطیف کے قریب سے گزر کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

کل شام میں چھت پر گیا تھا۔ تم کبھی شام کو چھت پہ گئے ہو اور تم نے تیزی سے اڑتی ہوئی ابابیلوں کے ننھے منھے اور خوبصورت گیت سنے ہیں؟ آج رضیہ میرا بستر ٹھیک کر رہی تھی تو اس کی چوڑیاں کھنک رہی تھیں —— اور مجھے ایسا لگا کہ کمرے میں ابابیلیں گا رہی ہیں —— اور ساتھ جیسے برف کے ذرے بن بن کر میرے کندھوں پر گر رہی ہے —— عجیب سی کیفیت تھی —— میں تھک گیا ہوں لطیف —— رضیہ کے بغیر کیا ہو گا اب ——؟

(شدید اذیت سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہے)

لطیف :۔ معصوم تم بہت پریشان ہو مگر مجھے اتنا ضرور کہنا ہے کہ جو تکلیف رضیہ کے معصوم دل نے اٹھائی اس کا کفارہ بھی تمہیں کو ادا کرنا ہے —— میں نے جب آخری بار تم سے پوچھا تھا تو ساماں کی مرضی بھی اس میں شامل تھی —— مگر تم نے انکار کر دیا تو پھر دوسرا رشتہ قبول کرنا پڑا —— چھ ماہ

رضیہ کے دل پر کیا گزری ہوگی ۔ حامد کا خیال تھا کہ وہ تمہیں پسند کرتی تھی ـــــ مگر اب سب باتیں بیکار ہیں

معصوم :۔ (روتے ہوئے) میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا

(سامنے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر حامد اندر آتا ہے اس کا چہرہ غصے سے بگڑا ہوا ہے وہ بھاری قدم رکھتا گول میز تک آتا ہے لطیف مڑ کر اسے دیکھتا ہے ـــــ معصوم کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آتی)

لطیف :۔ (خوفزدہ آواز میں) حامد!

حامد :۔ (کانپتی آواز میں) سب کام ختم ہو چکا ـــــ (ہاتھ زور سے مار کر کچھ کاغذات گرا دیتا ہے)

لطیف :۔ ـــــ تم اس شخص کو یہاں سے ساتھ لے جاؤ۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایک بھولی بھالی بہن کا بھائی کیا کر بیٹھے ؟

لطیف :۔ (گھبرا کر) معصوم! (ہاتھ پکڑ کر) میرے ساتھ چلو۔

معصوم :۔ میں نہیں جاؤں گا میں اپنا کفارہ ادا کروں گا ـــــ اب ہر کام ختم ہو چکا ـــــ میں ختم ہو جاؤں تو کیا حرج ہے۔

(حامد شدید نفرت سے معصوم کی طرف ایک قدم بڑھاتا ہے اور تیزی سے لطیف دونوں کے درمیان آ جاتا ہے)

لطیف :۔ حامد، پاگل نہ بنو ـــــ تم سب سن چکے ہو ـــــ معصوم تمہارا دوست بھی ہے ذرا سوچو حامد ـــــ (حامد کی کہنی پر جھٹکا دیتا ہے)

حامد :۔ (زور سے) معصوم سے کہو اسی وقت چلا جائے ـــــ چلا جائے یہاں سے

(دفعتاً زنان خانے کے دروازے کا پردہ ہلتا ہے اور رضیہ کی تیز سسکیاں سنائی دیتی ہیں اور سب یک لخت ساکت ہو کر ادھر دیکھتے ہیں ـــــ اسی لمحے باہر والے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ لطیف دروازہ کھولنے کو بڑھتا ہے ـــــ معصوم انتہائی کرب سے تماشائیوں کی طرف سے منہ پھیر کر مسہری کی طرف جاتا ہے۔ اور مسہری کے کٹہرے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے ـــــ اس کا چہرہ نظر نہیں آتا مگر کٹہرے پر رکھا ہوا ہاتھ کانپ رہا ہے)

حامد :۔ (چیخ کر) دروازہ نہیں کھلے گا لطیف ـــــ یہ آج کی رات اپنی ماں کے ساتھ کھیل گیا تھا ـــــ دروازہ نہیں کھلے گا ـــــ ہم کسی کے نوکر نہیں

لطیف رک کر حامد کے منہ پر ہاتھ رکھتا ہے کہ اچانک زنان خانے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر رضیہ بے تابی سے اندر ایک قدم رکھتی ہے اور پھر پردے کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا لیتی ہے۔ اس کا جسم پردے سے باہر ہے اور وہ کانپ رہی ہے

حامد :۔ (لطیف سے اپنے آپ کو چھڑا کر رضیہ سے ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر) بٹیا! تم بتاؤ میں کیا کروں ـــــ بٹیا ـــــ؟ تم بتلاؤ بٹیا ـــــ کسی سے بھی ڈرے بغیر ـــــ ساری دنیا کی بجلیوں کی فوج بھی میرے مقابلے پر آ جائے تو میں تیری خوشی کے لئے ڈھال بنا رہوں گا ـــــ تو ان دروازوں کے پیچھے محفوظ رہے بٹیا ـــــ بٹیا!

(سب رضیہ کی طرف دیکھتے ہیں ـــــ معصوم کے چہرے پر امید کی جھلک ہے دروازے پر دستک دوبارہ ہوتی ہے)

رضیہ (بالکل آہستہ۔ منہ سے پردہ ہٹا کر) مگر بھیا وہ میرے بغیر کیسے رہیں گے۔ ان کا خیال کون کرے گا ؟

(پاؤں کی پازیبیں اور چوڑیاں چھنکاتی تیزی سے اسٹیج چھوڑ کے باہر کے دروازے کی طرف بھاگتی ہے۔ اور چٹخنی گرا دیتی ہے۔

(پردہ تیزی سے گر جاتا ہے)

مسیتا ادیب

پرچھائیں

کردار

فوزیہ ــــــــــــ ناصر کی بیوی
ناہید ــــــــــــ فوزیہ کی سہیلی
ناصر ــــــــــــ فوزیہ کا شوہر
حسنی ــــــــــــ خادمہ

(عام کمروں سے نسبتاً بڑا کمرہ، اچھا خاصہ سجا سجایا۔ فرش پر بیش قیمت قالین، دیواروں پر رنگارنگ تصویریں، ایک طرف صوفہ سیٹ، کرسیاں، تپائی میز، سب کچھ قرینے سے رکھا ہوا۔ مشرقی دیوار کے ساتھ تپائی کے اوپر گراموفون، اسی دیوار میں گراموفون کے پاس کمرے میں آنے جانے کے لئے ایک دروازہ، جس میں ہلکے نیلے رنگ کا پردہ پڑا ہوا۔ شمالی دیوار میں ایک کھڑکی۔ دونوں پٹ کھلے ہوئے۔ پس منظر میں صاف طور پر کچھ نظر نہیں آتا۔ فضا ابر آلود۔ پانی کی جھلملاتی ہوئی ایک لکیر سی جو کچھ دور جا کر افق کی تاریکیوں میں گم ہو گئی ہے۔

موسم بہار کی ایک رات۔ پہلا پہر

جس وقت پردہ اٹھتا ہے۔ ہم دروازے کے پاس فوزیہ اور ناہید کو دیکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے دونوں ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی ہیں۔

فوزیہ سفید براق ساڑھی پہنے ہوئے ہے۔ قد و قامت درمیانہ، چہرے پر ملاحت۔ نقش تیکھے اور گہرے گہرے، آنکھیں بڑی اور سیاہ جن میں ایک موہوم سی مسکراہٹ ہمیشہ نمایاں رہتی ہے۔ ہونٹوں پر سرخی کا ایک خط جو اس کے قدرتی رنگ کا جزو بن گیا ہے۔ کانوں میں لمبے آویزے۔ جو تیس کے لگ بھگ۔

ناہید لمبے قد کی عورت۔ چہرہ فوزیہ جیسا دلکش تو نہیں مگر اس کی سادگی میں بھی ایک حسن ہے۔ فوزیہ کی ہم عمر۔ پیازی رنگ کی ساڑی میں ملبوس۔

فوزیہ کھڑکی کی طرف جاتی ہے اس کے دونوں پٹ بند کر دیتی ہے۔ پھر گراموفون کے پاس جا کر سوئیوں کی ڈبیا اٹھاتی ہے۔ نئی سوئی نکال کر ساؤنڈ بکس میں لگا دیتی ہے ــــ ڈسک پر ریکارڈ رکھتی ہے

ناہید اس کے قریب اس انداز سے کھڑی ہے جیسے اسے فوزیہ کی اس حرکت سے کوئی دلچسپی نہیں)

ناہید ــ تو تم نے بتایا نہیں فوزی! اس تقریب کی وجہ کیا تھی؟

فوزیہ ــ تقریب کی وجہ! ــــ کوئی خاص نہیں۔ جی چاہا کر اپنی سہیلیوں سے باتیں کی جائیں۔ گھر میں ذرا گہما گہمی ہو، بلا لیا تم لوگوں کو کھانے پہ۔

ناہید :۔ گویا گپ شپ کے لئے ہم لوگوں کو بلایا گیا تھا!

فوزیہ :۔ خاص وجہ نہ سہی ——— وجہ تو ہے بہرحال!

ریکارڈ سنو! (فوزیہ سوئی ریکارڈ پر رکھتی ہے)

(فلم معاشی کا ریکارڈ گھومتے ہوئے "نیا قدم" نغمہ بجتا ہے)

ناہید :۔ بھئی یہ ریکارڈ تو پہلے بھی سنوا چکی ہو۔

فوزیہ :۔ اللہ ——— اچھا اور لگاتی ہوں۔ یہ اوپر ہی پڑا تھا ریکارڈوں کے ——— لگا دیا

ناہید :۔ دیکھو بھئی فوزی! اس وقت میرے جذبے کی نیا تو ساحل پر جانے کے لئے بیقرار ہے

فوزیہ :۔ کیا مطلب؟

ناہید :۔ بھئی ختم کرو یہ قصہ مجھے گھر جانا ہے۔

فوزیہ :۔ رات یہاں نہیں رہو گی؟ (فوزیہ سوئی ریکارڈ سے ہٹا دیتی ہے)

ناہید :۔ کیسے رہ سکتی ہوں!

فوزیہ :۔ ایک رات اپنے گھر سے الگ رہ کر گزار لوگی تو کیا قیامت آجائے گی؟

ناہید :۔ قیامت تو نہیں آئے گی۔ پر آجکل گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں ——— ایک تو وہ ملتان والی خالہ ہیں مدت کے بعد آئی ہیں چند روز کے لئے۔

فوزیہ :۔ صبح باتیں کر لینا ان سے۔

ناہید :۔ دوسرا مہمان ان کا بیٹا صاحبزادہ ہے۔ دیکھا ہوگا تم نے ——— دیکھا کیا ہوگا تمہارے ساتھ ہی تو کالج میں پڑھتا تھا ——— سلیم ہے ——— پہلے ہی شاعر مزاج تھے یہ حضرت پر آجکل تو کچھ زیادہ ہی شاعر مزاج ہو گئے ہیں ——— ان کی مہمان نوازی کا فرض میرے ذمے ہے۔

فوزیہ :۔ کیوں؟

ناہید :۔ گھر میں صرف میں ہی ان سے ذرا بے تکلف ہوں اور کسی کی تو سنتے ہی نہیں۔ اپنی وحشت میں گم سم باہر گھومتے رہتے ہیں یا گھر میں چپ چاپ پڑے رہتے ہیں!

فوزیہ :۔ تو پاگل تھا نہیں؟

ناہید :۔ عجیب بات کرتی ہو ——— انہیں ساتھ لائی ہیں۔ سمجھتی ہیں یہاں ان کا علاج معالجہ ہو جائے گا ——— مگر ان کی بیماری میری سمجھ میں تو آتی نہیں۔ اور آج تو خالہ کچھ پریشان بھی بیٹھی تھیں۔

فوزیہ :۔ کیوں؟

ناہید :۔ سلیم کہہ گیا تھا میں واپس نہیں آؤں گا شاید ——— جب میں آنے لگی تو خالہ کہہ رہی تھیں نہ جانے میرا دل کیوں بری طرح ڈوب رہا ہے ——— جانے کیا ہوگا؟

فوزیہ :۔ تم رہ جاتیں آج رات ——— شاید ——— پتہ نہیں تم کیوں نہیں رہتیں۔

ناہید :۔ فوزی میں نے کہا ایسی بات کیا ہے۔ بھائی جان کہیں باہر جا رہے ہیں کیا؟

فوزیہ :۔ نہیں!

ناہید :۔ پھر؟

فوزیہ :- پھر ؟ پھر کیا ؟ کبھی کبھی گھبرا جاتی ہوں۔ ہمارا گھر ایسی جگہ واقع ہے کہ شام سے پہلے ہی یہاں سناٹا چھا جاتا ہے۔

ناہید :- (کھڑکی کی طرف دیکھ کر) ہاں ، مگر تو مجھے یہ حد پسند ہے۔ ادھر ادھر سبزہ، درخت اور پھر قریب ہی دریا ــــ

فوزیہ :- گویا تم رہو گی نہیں !

ناہید :- (حیرت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے) کیا اب بھی تمہیں اصرار ہے ؟

فوزیہ :- اوہ نہیں ــــ تمہاری مرضی۔ پھر کب آنے کا ارادہ ہے ؟

ناہید :- جلدی آنے کی کوشش کروں گی درست ہے لیکن تمہارے میاں ابھی تک نہیں آئے۔ مہمان تو جا چکے ہیں۔

فوزیہ :- بلا کر لاتی ہوں جاؤ۔ خود تو وہ شاید جلدی نہیں آئیں گے :

(فوزیہ دروازے کی طرف جانے لگتی ہے ابھی دروازے کے قریب ہی پہنچتی ہے کہ دروازے کا پردہ ہٹا کر ناصر آتا ہے۔ ناصر پینتیس چھتیس برس کا تنومند آدمی ہے۔ چہرے پر شگفتہ مزاجی نمایاں جا کیٹ رنگ کے سوٹ میں ملبوس۔ آتے ہی ناہید کو ذرا حیرت سے دیکھتا ہے۔ فوزیہ واپس آ جاتی ہے)

ناہید :- (مسکرا کر) ناصر بھائی ! مجھے دیکھ کر آپ کچھ حیران سے ہو گئے ہیں !

ناصر :- آپ واپس کیونکر آ گئیں ؟

ناہید :- میں گئی ہی کب تھی۔ آپ نے مجھے زبیدہ کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا شاید۔

ناصر :- میں تو سمجھتا تھا آپ جا چکی ہیں۔

فوزیہ :- میں نے روک لیا تھا انہیں۔

ناصر :- یہ تو ٹھیک ہے مگر دیکھو فوزی ! آج سارا دن تم نے شاپنگ کی ہے دعوت کے اہتمام میں بھی بری طرح مصروف رہی ہو۔ اپنی سہیلی سے باتیں پھر کبھی کر لینا۔ آج جلدی سو جانا چاہئے تمہیں

ناہید :- آپ اس کی فکر بالکل نہ کریں میں جا رہی ہوں

ناصر :- کیسے ؟

ناہید :- آپ کی گاڑی میں بیٹھ کر۔

ناصر :- لیکن جانے کی اب ضرورت کیا ہے سوجاتیں یہیں۔

فوزیہ :- انہیں جلدی گھر جانا چاہیے۔ آپ چھوڑ آئیں۔

ناصر :- مجھے اعتراض تو کوئی نہیں،

فوزیہ :- چھوڑ آئیں نا !

ناہید :- بھائی جان ! آپ کو تکلیف تو ہو گی۔ جب فوزی نے روکا تھا مجھے تو میں نے یہی سمجھا تھا کہ آپ لوگ شہر جا رہے ہیں مجھے بھی ساتھ لے چلیں گے بعد میں معلوم ہوا فوزی کی نیت کچھ اور ہے۔

ناصر :- کوئی بات نہیں۔ گاڑی نکالتا ہوں

(ناصر کمرے سے نکل جاتا ہے)

ناہید۔ فوزی! ایک بات کہوں؟

فوزیہ:۔ کہو۔ اجازت ——— کیوں مانگ رہی ہو؟

ناہید:۔ تمہارے ابا جان مرحوم کا فیصلہ بالکل درست تھا۔

(فوزیہ کوئی جواب نہیں دیتی)

درست کہہ رہی ہوں ——— مجھے خوب یاد ہے میں نے ہی کھٹکا کر نہیں بتایا تھا کہ تمہارے ابا میاں ناصر کو تمہارا رفیقِ حیات بنانا چاہتے ہیں۔ اس وقت تم نے قطعاً دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ میرا خیال ہے کہ سوگوار سی ہو گئی تھیں تم ——— میں اس کی وجہ سمجھ نہیں سکی تھی! یقیناً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ تم نے پہلے کبھی ناصر کو دیکھا نہیں تھا!

فوزیہ:۔ تمہیں معلوم ہے ناہید! میں ابا جان کا کس قدر احترام کرتی تھی ——— انہوں نے اپنی ساری زندگی میں صرف یہی ایک بات مجھ سے کہی تھی۔ ہاں یا نہ کا لفظ میری زبان سے نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ خاموشی احترام کی وجہ سے تھی!

ناہید:۔ اور تم نے بزبانِ خاموشی اسے مان لیا تھا ——— کاش وہ زندہ رہتے اور دیکھتے کہ ان کا فیصلہ کس قدر صحیح نکلا ہے۔

فوزیہ:۔ تم نے اس کے متعلق کیا بتایا تھا؟

ناہید:۔ کس کے؟ اسلم کے متعلق ———؟ یہ شاعر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں

(باہر سے ہارن کی آواز آتی ہے)

اچھی خدا حافظ: پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(ناہید اور فوزیہ دونوں دروازے کی طرف جانے لگتی ہیں)

فوزیہ:۔ ناہی! پچھلے راستے سے جانا نزدیک تر ہے ——— ان سے کہہ دینا

ناہید:۔ بہتر!

(ناہید دروازے پر جا کر "چیریو" کہتی ہے اور نکل جاتی ہے ——— فوزیہ واپس آتی ہے ایک لمحے کے لئے کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے ——— پھر گراموفون کی طرف جاتی ہے ——— ریکارڈ پہ سوئی رکھ دیتی ہے۔ وہی ریکارڈ بجتا ہے۔ "ٹوٹے ہوئے دل کی نیا ڈولے" ——— خود کو اسی کرسی میں گرا دیتی ہے جو گراموفون کے پاس پڑی ہے ——— گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالتی ہے۔ اس کی تہیں کھولتی ہے ——— اور کاغذ پر نگاہ جما دیتی ہے ——— ایک دو لمحوں کے بعد کرسی سے اٹھ بیٹھتی ہے اور کھڑکی کی طرف قدم اٹھانے لگتی ہے ——— کھڑکی کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھاتی ہے۔ مگر پھر رک جاتی ہے ——— دوبارہ کاغذ کو دیکھتی ہے

کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیتی ہے ——— باہر دیکھنے لگتی ہے

سٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے ——— اور اس کے ساتھ ہی دریا کی لہروں کا شور آہستہ آہستہ بلند ہونے لگتا ہے ——— بلند ہوتا جاتا ہے۔ تیز و تند ہوا کے تھپیڑوں سے کھڑکی کے دونوں پٹ زور زور سے ٹکراتے ہیں۔ اس شور میں سسکیوں کی آواز ابھر ابھر کر ڈوب جاتی ہے ——— کئی لمحے یہ منظر رہتا ہے ——— اس کے بعد لہروں کا شور مدھم ہوتا جاتا ہے سٹیج پر روشنی پھیل جاتی ہے۔

(روشنی میں فوزیہ کھڑکی میں سر جھکائے کھڑی ہے ــــ بال بکھرے ہوئے ہیں ــــ حسنی دروازے میں کھڑی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی ہے ــــ ریکارڈ ختم ہو چکا ہے اور اب گھر گھر کی آواز آ رہی ہے ۔
حسنی اس کی جانب جاتی ہے ــــ فوزیہ اس کی طرف دیکھتی ہے)

حسنی :۔ آپا!

فوزیہ :۔ کیا ہے؟ ــــ کیا کہنے آئی ہو؟

حسنی :۔ بستر بچھا دیا ہے میں نے. صاحب کہہ گئے تھے جلدی بستر بچھا دو

فوزیہ :۔ اچھا.

حسنی :۔ تم اتنی سرد ہوا میں کھڑکی کے پاس کھڑی ہو آپا! ــــ بڑی سردی ہو گئی ہے. باہر تو طوفان سا ہے آپا.

(فوزیہ اس کی طرف گھوم کر دیکھتی ہے ــــ حسنی نگاہوں کی تاب نہ لا کر گرامو فون کی طرف جاتی ہے سوئی ہٹا دیتی ہے گھر گھر کی آواز بند ہو جاتی ہے)

فوزیہ :۔ ابھی آئے نہیں وہ؟

حسنی :۔ صاحب؟ جی نہیں۔ ابھی ابھی تو گئے ہیں نا بیدل بی کو چھوڑنے. کہہ گئے تھے تمہاری آپا تھک گئی ہیں جلدی بستر بچھا دو ــــ پر تم ــــ سردی میں یہیں کھڑی ہو یہاں. آپا!

فوزیہ :۔ ادھر آؤ.

حسنی :۔ جی کیا کروں؟

(فوزیہ اس کے پاس آ جاتی ہے ــــ حسنی کھڑکی کے پردے بند کر دیتی ہے. لہروں کا شور اب بہت دور سے آتا ہوا محسوس ہوتا ہے حسنی واپس آتی ہے)

فوزیہ :۔ تمہارے ابا کیسے تھے؟

حسنی :۔ (سوال پر حیران ہو کر) جی میرا باپ ــــ اچھا آدمی تھا، نماز روزے کا پابند

فوزیہ :۔ تم ان کی بڑی عزت کرتی تھیں.

حسنی :۔ ہاں. پر وہ بڑے سخت آدمی تھے ــــ میں جوان ہو گئی پھر بھی مجھے مارا کرتے تھے اللہ جنت نصیب کرے بڑے اچھے لوگ تھے.

فوزیہ :۔ حسنی!

حسنی :۔ جی آپا!

فوزیہ :۔ میں نے سنا ہے تم اپنے چچا بننے والے کے ساتھ بھاگ گئی تھیں.

حسنی :۔ (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) ہا ہا! ــــ میں نے ایسی بے شرمی کی بات نہیں کی.

فوزیہ :۔ اوہ ــــ یاد آیا ــــ وہ ہماری پہلی نوکرانی تھی

حسنی :۔ تمہارے اپنے گھر میں ــــ؟ وہاں ہو گی ایسی مردار میں تو یہاں بیس سال سے ہوں.

فوزیہ :۔ (کرسی میں بیٹھتے ہوئے) چائے بناؤ گی ؟

حسنی :۔ بناؤں گی ـــ پھر تم اپنے بستر پہ سونا۔ یہاں کیا کریں گی۔ صاحب کہہ گئے تھے ـــ،

فوزیہ :۔ جاؤ حسنی !

حسنی :۔ تو ـ پھر آپا !

فوزیہ :۔ جاؤ نا !

(حسنی دروازے سے نکل جاتی ہے فوزیہ گراموفون کی طرف آتی ہے ـــ مگر کسی خیال سے آتے ہی ترنت ہی کھڑکی کی طرف جاتی ہے ـــ ادھر ادھر نگاہ دوڑاتی ہے جیسے کوئی چیز تلاش کر رہی ہو ـــ کھڑکی کے نیچے قالین پر لفافہ پڑا ہے ـــ اُسے اٹھالیتی ہے پھاڑنے کو ہاتھ اٹھاتی ہے ـــ شاید پھاڑنے کا ارادہ کر رہی ہے۔ مگر اسے کھول کر پڑھنے لگتی ہے)

لہروں کا شور قریب تر ہو گیا ہے۔

یکبارگی تاریکی پھیل جاتی ہے ـــ کھڑکی کے پٹ آپس میں ٹکرانے لگتے ہیں۔ ہوا کا ایسا شور جیسے چیخ رہی ہو۔

چند لمحے یہ منظر رہتا ہے ـــ اس کے بعد ایک نیا منظر سامنے آتا ہے۔ ایک سنسان سڑک۔ سامنے بجلی کا کھمبا جس کی مدھم روشنی اردگرد محدود جگہ پہ پڑ رہی ہے

فوزیہ آتی ہے ـــ بال بکھرے ہوئے چہرے پہ گہرے اضطراب کا نشان

معلوم ہوتا ہے قریب ہی دریا ہے ـــ لہروں کا مسلسل خراش شور ہو رہا ہے

فوزیہ آگے قدم اٹھاتی ہے ـــ ایک لمحے کیلئے ٹھٹک جاتی ہے ـــ پھر قدم اٹھاتی ہے ـــ تیزی سے بڑھتی ہے ـ کھمبے کے نیچے پہنچ کر ٹھٹک جاتی ہے ـــ سامنے دیکھتی ہے ـــ اس کے دیدے پھیل گئے ہیں۔

طوفان پہلے سے بڑھ چکا ہے

فوزیہ بڑھتی ہے ـــ دونوں ہاتھ سر کی طرف لے جاتی ہے ـــ چیخ مار کر پیچھے ہٹنے لگتی ہے ـــ کھمبے سے ٹکراتی ہے ـــ کسی چیز کے گرنے کی آواز آتی ہے ـــ لہروں کا شور تھم جاتا ہے

یکلخت پھر اندھیرا پھیل جاتا ہے ـــ اور جب روشنی ہوتی ہے تو کمرے کے وسط میں فوزیہ کھڑی ہے۔ اور اس کے سامنے حسنی نظر آ رہی ہے حیران اور خوف زدہ۔ نیچے قالین پہ چائے کا سارا سامان بکھرا پڑا ہے۔

کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہیں)

حسنی :۔ (آواز میں لرزش) آپا ـــ یہ کیا ہو گیا تھا تمہیں ؟

(فوزیہ اس کی طرف گھور کر دیکھتی ہے)

میں نے کہا آپا !

فوزیہ :۔ کیا ہے ؟

حسنی :۔ یہ کیا ہو گیا تھا ؟ ڈر گئی تھیں آپا ؟

فوزیہ :۔ نہیں؟
حسنی :۔ تو ۔۔۔ پھر کیا ہوا تھا؟ میں چائے لے کر آ رہی تھی۔ تم جیسے ڈر کر بھاگیں کھڑکی میں سے اور مجھ سے ٹکرائیں ۔۔۔ سب کچھ گر پڑا۔
فوزیہ :۔ جھوٹ کہتی ہو!
حسنی :۔ نہیں آپا۔ اللہ قسم کھاتی ہوں ۔۔۔ تمہیں کیا ہو گیا تھا؟
فوزیہ :۔ حسنی! اب کچھ اٹھا کر لے جاؤ۔
حسنی :۔ صاب مجھ پہ خفا ہوں گے۔
فوزیہ :۔ نہیں ہوں گے ۔۔۔ احتیاط نہیں کی تم نے قالین تباہ کر دیا ہے ۔ پر ۔ خیر۔
حسنی :۔ سچ کہتی ہوں آپا! ۔۔۔ میں ادھر آ ہی رہی تھی کہ تم نے ۔۔۔ اللہ جانے تم ڈر سی گئی تھیں۔
فوزیہ :۔ جاؤ اب ۔۔۔ اٹھا لو سب کچھ۔
حسنی :۔ صاب سے کہہ دیں کہ ۔۔۔
فوزیہ :۔ اس کی فکر نہ کرو۔ خاموشی سے چلی جاؤ۔
حسنی :۔ تم چلو نا ادھر آپا! (رازدارانہ لہجے میں) دریا کے کنارے بڑی بُری بلائیں رہتی ہیں جو ۔۔۔ اللہ بچائے ان سے
(حسنی سامان ٹرے میں رکھنے لگتی ہے)۔
میں تو کہتی ہوں صاب آ جائیں گے ابھی ۔۔۔ تم انتظار کر لو ان کا۔ وہ کہہ جو گئے ہیں ۔۔۔ ناہید بی بی یہیں سو رہتیں تو اچھا تھا۔ صاب اتنی سویرے میں گئے ہیں۔

(فوزیہ صوفے میں گر پڑتی ہے ۔۔۔ حسنی ٹرے اٹھا کر دروازے میں سے نکل جاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد فوزیہ دروازے کے پیچھے جاتی ہے اور جلدی ہی باہر نکل آتی ہے ۔۔۔ معلوم ہوتا ہے اس نے دروازہ بند کر دیا ہے۔ واپس آ کر وہ صوفے پہ بیٹھ کر دائیں ہاتھ کی مٹھی کھولتی ہے ۔۔۔ اب کاغذ اس کے ہاتھ میں ہے ۔۔۔ کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگتی ہے ۔۔۔ قالین پر ننھے ننھے ٹکڑے اڑنے لگتے ہیں ۔۔۔ فوزیہ بے اختیار کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے ابھی چند ٹکڑے اس کے ہاتھ میں ہیں ۔۔۔ قالین پر سے ایک ایک پرزہ اٹھانے لگتی ہے

لہروں کا شور بلند ہونے لگتا ہے ۔۔۔ وہ کھڑکی کی طرف قدم اٹھانے لگتی ہے! ۔۔۔ کاغذ کے تمام پرزے باہر اڑا دیتی ہے۔ سٹیج پہ تاریکی پھیل جاتی ہے۔

لہروں کا شور بلند تر ہو گیا ہے۔ اس میں سسکیوں کی آواز ابھر ابھر کر ڈوب رہی ہے ۔ کھڑکی کے پٹ آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔
لہروں کا شور اور سسکیوں کی آواز مدھم ہونے لگتی ہے
سٹیج پہ روشنی پھیل جاتی ہے۔ فوزیہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہے۔ بال بکھرے ہوئے رخساروں پہ داغ ہے۔ دروازے پہ مسلسل دستک اور اس کے بعد ناصر کی تیز تیز "فوزی" کہتی ہوئی آواز۔
فوزیہ کھڑکی سے سر ہٹاتی ہے ۔۔۔ چہرے پہ ہاتھ پھیرتی ہے اور دروازے کی طرف اس طرح دیکھتی ہے جیسے ابھی ابھی اس نے دستک سنی ہو۔

دروازے کی طرف قدم اُٹھانے لگتی ہے مگر کرسی کے سامنے پہنچ کر ٹھٹک جاتی ہے ۔ کھڑکی کی طرف لوٹتی ہے۔ پٹ بند کرتی ہے
— پھر دروازے کی طرف جاتی ہے۔

دروازے کے پردے کے پیچھے جاتی ہے — دروازہ کھلتا ہے۔ ناصر اندر آتا ہے — فوزیہ کے ہونٹوں پر سوگوار سی
مسکراہٹ پھیل جاتی ہے —)

ناصر :- فوزی! تم اِدھر ، کیا بات ہے ؟

فوزیہ :- انتظار کر رہی تھی آپ کا۔

ناصر :- کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر آتی سرد ہوا میں (اس کے چہرے پر نگاہ جما کر) باہر سر نکال کر دیکھتی رہی ہو چہرے پہ یہ نشان کیسے ہیں ؟

فوزیہ :- (جلدی سے دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے) کچھ بھی تو نہیں یہاں۔ آپ کو وہم ہو گیا ہے خامخواہ — کچھ بھی تو نہیں ہوا۔

ناصر :- فوزی! تم پریشان تو نہیں ہو ؟

فوزیہ :- پریشان آپ ہیں — اور مجھے بھی پریشان کر دینے کا ارادہ ہے (چہرے پہ دبی سوگوار مسکراہٹ)

ناصر :- نہیں فوزی۔

(فوزیہ دروازے سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ جاتی ہے۔ ناصر بھی اس کے پاس آ بیٹھتا ہے)

فوزیہ :- چھوڑ آئے ناہید کو اس کے گھر ؟

ناصر :- اسے چھوڑنے ہی تو گیا تھا — تو فوزی :

فوزیہ :- میں بالکل ٹھیک ہوں — صرف ؟

ناصر :- صرف کیا !

فوزیہ :- جب آپ گئے تو نہ جانے میرے دل میں ذرا سا خوف کیوں پیدا ہو گیا۔

ناصر :- خوف ؟

فوزیہ :- ذرا سا خوف — یا وہم۔ سوچنے لگی۔ ہوا بہت تند و تیز ہے کہیں خدانخواستہ آپ کو کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔

ناصر :- حادثہ تو کوئی خاص پیش نہیں آیا۔ البتہ ایک ناگوار سا واقعہ ضرور ہوا دریا کے پل پر ؟

فوزیہ :- کہاں ؟

(فوزیہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شوہر کو دیکھنے لگتی ہے)

ناصر :- اسقدر خوف زدہ کیوں ہو گئی ہو ؟ بات بالکل معمولی تھی — جب گاڑی پل پر پہنچی تو ناہید نے ڈر کر کہا بھائی جان جلدی چلو"

فوزیہ :- پھر ؟

ناصر :- فضا ڈراؤنی تھی — جب گاڑی پل پر سے گزر گئی تو کہنے لگی میں نے اندھیرے میں ایک پرچھائیں سی دیکھی تھی۔ جیسے کوئی آدمی کھڑا ہے

(فوزیہ ٹکٹکی باندھ کر شوہر کو دیکھ رہی ہے)

فوزیہ :- ہٹو۔

ناصر :۔ سہو یہاں وہم ہو گیا تھا اسے۔ اتنی سردی میں دریا کے پل پر کون کھڑا ہو سکتا ہے —— ناہید کہتی تھی ممکن ہے کوئی شخص خودکشی کے ارادے سے کھڑا ہوا —— خیر اب تم چلو کمرے میں۔

(فوزیہ چپ چاپ کھڑی ہو جاتی ہے ناصر دروازے کی طرف جانے لگتا ہے۔ فوزیہ سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے جا رہی ہے۔ دروازے پر پہنچ کر ناصر بجلی کا سوئچ دبا دیتا ہے کمرے میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔
— قریب سے ناصر کی آواز آتی ہے۔ فوزی! — کہاں ہو فوزی! — فوزی! یہ آواز تھوڑی دور ہوتی جاتی ہے)

جب سٹیج پر روشنی آتی ہے تو وہ اس قدر مدھم ہوتی ہے کہ اس میں صرف لیٹی ہوئی فوزیہ کا چہرہ نظر آتا ہے۔ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی ہے۔ ناصر کے چہرے کا سایہ اس پر جھکا ہوا ہے۔

دور لہروں کا شور آتا ہوا سنائی دے رہا ہے۔

ناصر :۔ فوزی! تمہیں کیا ہو گیا تھا —— یہ کیا ماجرا ہے فوزی؟

(فوزیہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی ہے)

بتاتیں کیوں نہیں —— فوزی! فوزی!

(فوزیہ کے دیدے اور پھیل جاتے ہیں)

میں یہ سماں سمجھ نہیں سکتا —— تم پاگلوں کی طرح دریا کی طرف کیوں جا رہی تھیں؟

(لہروں کا شور بڑھنے لگتا ہے)

مجھے حسنی نے سوتے میں اٹھا کر کہا تم باہر چلی گئی ہو —— میں فوراً بھاگا —— تم آخری کھیت میں درخت سے ٹکرا کر گر پڑی تھیں اور بے ہوش ہو گئی تھیں۔

فوزیہ :۔ وہ کہاں ہے؟

ناصر :۔ وہ کون؟

(فوزیہ بے تابی سے اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے)

فوزیہ :۔ وقت گزر گیا ہے ——

(لہروں کا شور بڑھ گیا ہے)

اس نے چھلانگ لگا دی ہے —— وہ ڈوب رہا ہے —— وہ ڈوب رہا ہے

ناصر :۔ کون؟

فوزیہ :۔ (جیسے ایک دم چونک کر) وہ —— پرچھائیں

ناصر :۔ (انتہائی حیرت کے عالم میں) پرچھائیں ——؟

(لہروں کے طوفانی شور میں پردہ جلدی سے گرتا ہے)

عندلیبِ شادانی

○

آبِ حیات سے بڑھی روح کی تشنگی کچھ اور
بن گئیں شعلہ و شرر پنکھڑیاں گلاب کی،

○

زمانہ کس لیے پہرے بٹھاتا ہے محبت پر
شمیمِ گل کوئی رُکتی ہے دیوارِ گلستاں سے

○

اللہ رے قسمت کی خوبی صیاد کو ہم کب یاد آئے
جب رنجِ اسیری سہتے سہتے زمزمہ سنجی بھول گئے

○

مری آرزو کی بہشت ہے وہ نمودِ لطفِ حجاب سے
کہیں جیسے چاند کی اک کرن نکل آئے چھن کے سحاب سے

○

دل کے قرب و دوری کا پیمانہ ہے اندازِ نظر
ایک نظر ہے قربِ لبوں کا ایک افق کی دوری ہے

○

ہائے تصور کی دنیا بھی کیا دنیا ہے ہم نے رات
چاند سے کھیلی آنکھ مچولی، شہد اُڑایا پھولوں سے

○

رات تھوڑی سی رہی ہے آؤ ہنس لیں، بول لیں
پھر خدا جانے شبِ غم کی سحر ہو یا نہ ہو،

○

نظیر صدیقی

○

زندگی نام ہے جس کا وہ کہاں ہے ہم ہیں
سانس لینے کی جو پوچھو تو گنہگار ہیں ہم

○

نظیر آئے ہو محفل میں تو کچھ تم بھی ہنسو بولو
سنا ہوگا خیالِ خاطرِ احباب لازم ہے

○

دیکھئے دیکھنے میں کیا آئے
یوں تو ہم نے سنا بہت کچھ ہے

○

دل چاہتا ہے تیری ندامت کو دیکھ کر
تو مجھ سے بات بات پہ برہم ہوا کرے

○

ترے لبوں کے تصور کی کیفیت توبہ!
وفورِ شوق میں خود اپنے ہاتھ چوم لیے

○

ترکِ تعلقات کا مجھ کو گلہ نہیں
ہاں رنج یہ ہے آپ سے کیوں آشنا ہوا

○

زندگی جس طرح بھی گزری ہو
عہدِ رفتہ عزیز ہوتا ہے۔

○

اک وہ ہیں جو محال کو ممکن بنا گئے
اک ہم کہ ممکنات کو حاصل نہ کر سکے

○

سکونِ یاس کو یا پھر سکوتِ نامرادی کو
جسے چاہو ہماری زندگی کا ماحصل کہہ لو

○

"سب[1] کچھ نثار راہِ وفا کر چکے ہیں ہم"
اپنا جو فرض تھا وہ ادا کر چکے ہیں ہم

○

یہ اپنی اپنی قسمت ہے ورنہ اسی سمندر میں
پلنے والے پلتے ہیں اور کھونے والے کھوتے ہیں

○

یہ حال ہے تمہارے آنے کی آرزو میں
وعدے پہ جیسے کوئی ہو منتظر کسی کا۔

[1] ۔ یہ شعر کہنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ مصرعہ فیض کا ہے۔ اب قارئین کی مرضی ہے اسے توارد سمجھیں یا تضمین۔ (نظیر صدیقی)

فیض احمد فیض

○

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخ رو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے، کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

بادِ خزاں کا شکر کرو، فیضؔ، جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں

شاد عارفی

○

چمن بھی آپ کا چمن کی جان ہیں تو آپ ہیں،
مگر ہمارے حق میں آسمان ہیں تو آپ ہیں
نگاہِ آرزو سے بدگمان ہیں تو آپ ہیں
شباب ہے تو آپ پر جوبن ہیں تو آپ ہیں
خبر نہ تھی کہ "آپ سے" مراد ہے کل انجمن،
سُنا یہ تھا کہ ہم سے بدگمان ہیں تو آپ ہیں
ابھی بہار آئے دن بھی کے ہوئے ہیں۔ دیکھنا
اُداسیاں کہیں گی۔ باغبان ہیں تو آپ ہیں
نہ رہروؤں کو ٹوکنا ۔۔۔ نہ رہزنوں کو روکنا
جو پی کے سو رہے وہ پاسبان ہیں تو آپ ہیں
ہمیں تو سرد و گرم دہر جھیلنے کی مشق ہے
حضور سوچ لیں کہ دھان پان ہیں تو آپ ہیں
ہماری التجا کو توڑ موڑ دیں تو کیا عجب،
ہماری التجا کے ترجمان ہیں تو آپ ہیں
قریب آکے حالِ دل وہ سن رہے ہیں اس طرح
جو دیکھے کہے کہ مہربان ہیں تو آپ ہیں
اُٹھا رہے ہیں بزم سے گلے میں ہاتھ ڈال کر
ہماری جب کسی کے قدردان ہیں تو آپ ہیں
جنابِ شادؔ ہمنوا نہ شیخ ہے نہ برہمن،
صفاتِ میکدہ میں ترزبان ہیں تو آپ ہیں

ظہورِ نظر

ہے طرب گاہ بھی، غم خانہ بھی
دل ہوا شہر بھی، ویرانہ بھی
کس طرح اس پہ بھروسہ کریں
دل کہ ہے اپنا بھی بیگانہ بھی،
کون سا رُخ ترا بتیا کر دکھاؤں
تو حقیقت بھی ہے، افسانہ بھی
آشیاں میرا جلانے والے
جل رہا ہے ترا کاشانہ بھی
آؤ اب ہم سرِ مہتاب جلیں
جل چکی ہے شمع بھی، پروانہ بھی
تلخیٔ غم سے چھلک جاتا ہے
خوب ہے زیست کا پیمانہ بھی
ابر بھی، رنگِ شفق بھی ہے نظر
کیا کھلے گا درِ مے خانہ بھی؟

سلیمان ادیب

○

کبھی بہ پاسِ صداقت بھی منہ نہیں کھلتا
بہت عجیب ہے یہ داستانِ جرم و سزا

نہ جانے کفر کا انجام اپنے کیا ہوتا
ہمارے دور میں لیکن کوئی خدا نہ ہوا

نہ ہو سکا جو مداوائے زخمِ لالہ و گل،
بچا کے آنکھ چمن سے گزر گئی ہے صبا

بہار اور خزاں مل کے ڈھونڈتے ہیں اُسے
جو پھول تیری قبا، تیری سیج تک پہنچا

ہمارے دم سے ہے قائم روایتِ مستی
جو ہم نہ جائیں سوئے میکدہ، اُٹھے نہ گھٹا

اے انقلاب تری رہگزر پہ ہم بھی ہیں
ترے نثار ادھر بھی ذرا نگاہ اُٹھا

گزر رہا ہوں مسلسل کچھ ایسے عالم سے
حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا

ہر ایک دوست نے دامن جب اپنا کھینچ لیا
ادیب رو نہ سکا پھر ادیب رو نہ سکا

زہرا نگاہ

○

شکوۂ دار و رسن باعثِ رُسوائی ہے،
ہم نے ہر حال میں جینے کی قسم کھائی ہے

شور و غلِ فکر و حوادث کا وہیں ڈوب گیا
جب کسی دل کے دھڑکنے کی صدا آئی ہے

عجب انداز سے نکھرا ہے تری یاد کا رنگ
کچھ ہنسی لب پہ، تو کچھ آنکھ میں بھر آئی ہے

پُرسشِ غم کی کسے تاب ہے اے چارہ گرو،
اب طبیعت نئے انداز سے گھبرائی ہے

○

رضا ہمدانی

○

اُن سے ہم بار بار ملتے رہے
دل تھا بے اختیار ملتے رہے

ترکِ اُلفت کے باوجود کبھی
بر سرِ رہگزار ملتے رہے

جن پہ کی جان نثار کرتے آئے
نہ کیا جن سے پیار ملتے رہے

چھوڑ کر چل دیئے بوقتِ خزاں
جو بہ فیضِ بہار ملتے رہے

زندگی بھر جو پھول بستے رہے
اُن غریبوں کو خار ملتے رہے

نہ ملا کچھ سراغِ اہلِ جنوں
پیرہن تار تار ملتے رہے

ان میں جانِ رضاؔ کی بات کہاں
دوست تو بے شمار ملتے رہے

اصغر سلیم

○

یارو بہ عَلَمِ جنوں کا نشاں کر چکے ہیں ہم
بہم بساطِ شیشہ گراں کر چکے ہیں ہم

کیوں سُرخ ہو نہ طرۂ طرفِ کلاہِ گُل
اِک جوئے خوں چمن سے رواں کر چکے ہیں ہم

اب آ چکی ہے ہاتھ میں رخشِ غزل کی باگ
اب امتحانِ طبعِ رواں کر چکے ہیں ہم

ہاں مُشتعل ہے آج بھی اپنے سخن کی آگ
ہاں مدعی پہ سحرِ بیاں کر چکے ہیں ہم

ناصح متاعِ جیب و گریباں پہ خاک ڈال
کہ جو دیا کہ سب کا زیاں کر چکے ہیں، ہم،

اب کیا ملالِ کاوشِ اہلِ حرم کریں!
برسوں طوافِ کوئے بُتاں کر چکے ہیں ہم

سو بار آ چکا ہے فلک زیرِ پا سلیم
سو بار سیرِ کاہکشاں کر چکے ہیں ہم

حمایت علی شاعر

○

اُن کے غم کو غمِ ہستی تو مرے دل نہ بنا
زیست مشکل ہے اِسے اور بھی مشکل نہ بنا

تو بھی محدود نہ ہو مجھ کو بھی محدود نہ کر
اپنے نقشِ کفِ پا کو مری منزل نہ بنا

اور بڑھ جائے گی ویرانیِ دل جانِ جہاں
میری خلوت گہِ خاموش کو محفل نہ بنا

دل کے ہر کھیل میں ہوتا ہے بہت جاں کا زیاں
عشق کو عشق سمجھ، مشغلۂ دل نہ بنا

پھر مری آس بندھا کر مجھے مایوس نہ کر
حاصلِ غم کو خدارا غمِ حاصل نہ بنا

حسن عابدی

○

ابھی تو دیر میں تصویرِ سنگ مہرِ لب ہے

پیمبروں کا خدا ہے وہی جو شیخ کا رب ہے

ترے فراق سے گزرے ترا وصال بھی دیکھا

مگر قرار دل کو نہ اُن دنوں تھا نہ اب ہے

ٹھہر گئے ہو جہاں تم، ٹھہر گیا ہے اندھیرا

ہم اس دیار میں پہنچے جہاں سے رخصتِ شب ہے

نوائے صبحِ طرب سے کسی نے آگ لگا دی

کسی کے ساز میں پنہاں سکوتِ گریۂ شب ہے

ابھی چمن کو طلب ہے نواگروں کے لہو کی

کشودِ لالہ و گل اک ادائے حسنِ طلب ہے

○

مسعود درویش

○

چھوڑ کر بھری محفل وہ گیا تھا تن تنہا،
ایک اس کے جانے سے ہے سب انجمن تنہا

وہ سمن بدن رخصت، بوسہ پیاس رخصت
یادگارِ عہدِ گُل چاکِ پیرہن تنہا

تم کبھی کبھی میری زندگی میں آ جانا
یہ بھرا جہاں مجھ کو ہے اجاڑ بن تنہا

تم کبھی نہ سمجھو گے کیا ہے دردِ تنہائی
تم جہاں ہو محفل ہو، میں جہاں ہوں تن تنہا

آپ کی عنایت سے ایک شام روشن ہے
رات دن کی ظلمت میں ہے یہی کرن تنہا

چاند بن کے آئے تھے جان بن کے جاتے ہو
زندگی کٹھن ہوگی مجھ کو جانِ من تنہا،

اشک کا نمک لاؤ، درد کی کسک لاؤ
بے اثر نمائش ہے فن کا بانکپن تنہا

ضمیر جعفری

○

بے خرد سمجھے گئے، نادان گردانے گئے،
لوگ جو سمجھا کیے، ہم لوگ کب جانے گئے

زندگی کی ہر کشش آواز دیتی رہ گئی
ہم غمِ جاناں کو کتنی دور اپنانے گئے

آگہی پر ہنس کے چپ رہنے کی عظمت کو سلام
آہ وہ کم ظرف دیوانے کہ پہچانے گئے

ہائے جینے کی ہوس، ہائے ارادوں کی شکست
تشنہ لب قطروں کو ہم دریا کا دل ہانے گئے

زندگی اک دور سے آتی ہوئی آواز تھی
چلنے والے کوئی کوئی لفظ پہچانے گئے

جب سے دل اجڑا ہے دنیا ہی اجڑ کر رہ گئی
ہم جہاں پہنچے ہمارے ساتھ ویرانے گئے

آج کس عالم میں لوگوں نے مجھے دیکھا ضمیرؔ
آج تو کچھ لوگ اس کافر کو سمجھانے گئے

نازش کاشمیری

○

ہم نے اُس بُت سے محبت کی نظر چاہی ہے
لاکھ انہونی سہی بات، مگر چاہی ہے

ہم اُجالوں کے پرستار ہیں ہم نے ہر آن
دہر کے شب کدۂ غم کی سحر چاہی ہے

ہم کو منظور نہیں قافلۂ شوق کی موت
ہم نے منزل سے اِدھر گردِ سفر چاہی ہے

زندگی دوست ہیں ہم اور ہمیں نے اکثر
زندگی چاک قبا، خاک بسر چاہی ہے

ہم نے خود ان کو جفاؤں پہ کیا ہے مائل
ہم نے تسکین بہ اندازِ دگر چاہی ہے

دل کے ویرانے کی توقیر بڑھانے کے لیے
ہم نے شوریدگیٔ دیدۂ تر چاہی ہے

ڈوبتے چاند کی مغموم نظر سے نازشؔ
ہم نے اکثر غمِ ہجراں کی خبر چاہی ہے

مجیب خیرآبادی

○

بدل ہی دیں گے نظامِ دوراں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی
ازل سے ہیں انقلاب ساماں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی

انہیں کی ناکارہ دھجیوں سے فضا میں پرچم اچھال دیں گے
سئیں گے کب تک یہ جیب و داماں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی

بہار آئے تو دیکھنا پھر ہماری شوریدگی کا عالم
خزاں میں بھی ہیں جنوں بداماں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی

ہمیں تو اس ظلمتِ شبِ غم میں صبح کی پھوٹتی کرن ہیں
سحر میں ڈھالیں گے شامِ زنداں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی

بہت مسیحا و خضر آئے مگر وہی بے بسی ہے اِس کی،
اب آؤ سلجھائیں زلفِ دوراں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی

سفینہ کب کی ڈوب چکی ہوتی ناخداؤں کی ناخدائی —!
اگر نہ ہوتے حریفِ طوفاں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی

صبا کا حسنِ خرام بن کر نئی سحر کا پیام بن کر
جگا رہے ہیں نصیبِ دوراں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی

تلاش کرتی پھرے گی دنیا ہر انجمن میں جواب اپنا
کہاں ملیں گے ہم ایسے انساں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی

اگر کبھی وحشت سما گئی تو الٹ ہی دیں گے بساطِ عالم
سہیں گے کب تک یہ جبرِ یزداں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی

ابھی تو رنگِ بہار آنکھوں سے جیسے خوں بن کے بہہ رہا ہے
منائیں کیا جشنِ نو بہاراں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی

اٹھی نقابِ سحر اچانک تو ظلمتیں نعرہ زن تھیں باہم
بایں مجالِ نظر ہیں حیراں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی

مجیب کوئے بتاں سے نکلے تو بھا گئی دار کی بلندی
ہزار رنگوں میں ہیں نمایاں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی،

سلیم سیّد

○

شہرِ طرب کے ہنستے ہوئے بام و در کہاں
لے آئی ہم کو وحشتِ قلب و نظر کہاں

ویران ہو گیا ہے صنم خانۂ خیال
دل تھا حریمِ شوق کبھی، اب مگر کہاں

اب کون ہے جو منزلِ جاں سے گزر سکے
وہ دل گرفتہ لوگ، وہ آشفتہ سر کہاں

ویرانیِ نظر بھی وہی، داغِ دل وہی
اب جائیں تیرے شہر کو ہم چھوڑ کر کہاں

اب تک سُلگ رہی ہے نگاہوں میں تیرگی
اہلِ نظر کو تابِ جمالِ سحر کہاں،

صحرائے یاس میں بھی کھِلے آرزو کے پھول
آیا ترا خیال بہ رنگِ دگر کہاں

پیرایۂ اختتام

قطع نظر اس امر کے کہ سالنامہ شائع کرتے وقت پڑھنے والوں سے تاخیرِ اشاعت کے لئے اظہارِ معذرت ہمارا ایک ناخوشگوار فرض ہے اس موقعہ پر دو ایک باتوں کی طرف اشارہ کرنا بھی کچھ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاخیرِ اشاعت کے سلسلے میں ہم صرف یہی عرض کریں گے کہ اپنی نیک نیتی کے باوجود اور انتہائی کوشش کے باوصف ایک ضخیم نمبر پیش کرتے وقت بعض ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن پر مقررہ وقت سے پہلے قابو پانا مرتب کے لئے ناممکن ہے۔ کئی کام جو بظاہر بڑے معمولی ہوتے ہیں انجام پذیر ہوتے ہوتے — کا بیشتر حصہ سمیٹ لیتے ہیں۔ اور جن چیزوں کے لئے صرف ایک دن مقرر کیا جاتا ہے وہ بسا اوقات تین دن میں بھی مکمل نہیں ہوتیں۔

بہرحال اس وقت تجزیہ یا توضیح کی فرصت نہیں۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ اپنے پڑھنے والوں سے معذرت طلب کر لی جائے۔ اور اس ذمہ داری سے مرتب سب سے پہلی سطر ہی میں عہدہ برآ ہو چکا ہے! —— اب کچھ دو ایک باتوں کے متعلق سنیئے! سالنامے کی فہرست پر پہلی نظر ڈالتے ہی غالباً پہلا احساس یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کے مضامین کی ترتیب دینے والے نے حفظِ مراتب کو بہت حد تک نظر انداز کر دیا ہے اور نتیجۃً ترتیب میں کئی اہم نام نسبتاً کم اہم ناموں کے پیچھے چلے گئے ہیں اور یہ توقیتی حیثیت مسلمہ اصول کے خلاف ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ کوئی عام نمبر ہو یا خاص نمبر ہمارے ہاں روایت یہی ہے کہ بڑے ناموں کی تخلیقات کو پہلے جگہ دی جاتی ہے اور حفظِ مراتب کا تقاضہ بھی یہی ہے۔ لیکن اگر آپ اس روایت پر اس نقطۂ نظر سے غور کریں کہ کسی رسالے کو (عام نمبر ہو یا خاص نمبر) مختلف نثری مضامین کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ جس میں صرف ناموں کو دیکھ کر مضامین کو ترتیب دے دیا جاتا ہے بلکہ اس کے تمام مضامین نظم و نثر میں ایک نوع کا نفسیاتی آہنگ ہونا چاہیئے تو یہ ترتیب زیادہ موزوں اور مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ ایک کتاب کی طرح رسالے کے مضامین میں بھی ایک ترتیبی آہنگ و جامعیت ہونی چاہیئے۔ اور اس سے ضروری یہ ہے کہ لکھنے والوں کی بجائے جو چیزیں لکھی گئی ہیں ان کی نوعیت پر غور کر لیا جائے اور پھر ان کے موضوعات کو سامنے رکھ کر رسالے میں ان کے لئے جگہ نکالی جائے۔ سالنامے میں ہم نے اکثر و بیشتر اس اصول کی پابندی کی ہے۔ ہم نے تخلیقات کے موضوعات کو پیشِ نظر رکھا ہے ناموں کو نہیں اور یہی وجہِ جواز ہمارے اس اقدام کی ہے! اس کے ساتھ ساتھ ہم نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ سالنامے کے مندرجات میں زیادہ سے زیادہ سے زیادہ تنوع پیدا ہو۔ ہمارے ہاں سالنامے یا خاص نمبر کی اشاعت کے وقت سب سے زیادہ کوشش افسانوں کی فراہمی پر کی جاتی ہے افسانہ ہر ادب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اور پڑھنے والوں کی زیادہ تعداد افسانوں ہی کو پسند کر کے رسالہ خریدتی ہے ہمیں اس چیز کا علم ہے لیکن کسی ملک کا ادب محض افسانوں کی ترقی سے ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتا۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ ادب کی باقی اصناف بھی بلند سطح نظر آئیں۔ اسی امر کے زیرِ اثر ہماری توجہ اہم اصنافِ ادب پر یکساں رہی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو شاید غلط نہیں ہو گا کہ ہم نے افسانوں سے زیادہ مقالوں اور ڈراموں کی طرف توجہ کی ہے اور سالنامے میں بھی یہ کوشش نمایاں ہے

سالنامے میں جن محترم اہلِ قلم کی تخلیقات شائع کی گئی ہیں۔ ان کا بصمیمِ قلب شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے مگر اس موقعے پر ہم ان دوستوں سے بھی شرمندہ ہیں جن کی چیزیں سالنامے کی تنگ دامانی کی وجہ سے اس کے صفحات پر اشاعت پذیر نہیں ہو سکیں۔ ہم اپنے ان قابلِ احترام احباب کی خدمت میں معذرت پیش کرتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری معذرت منظور قبول فرمائیں گے۔ بعض اہلِ قلم کے مضامین اس وقت ملے جب پرچہ تیار ہو کر پریس میں جا چکا تھا یا جا رہا تھا۔ اگر پرچہ روک کر ان کی چیزوں کے لئے گنجائش نکالنے کی سعی کی جاتی تو پرچے کی اشاعت میں تاخیر مزید ہوتی اور یہ کسی طرح بھی مناسب بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر محمد حسن، شوکت صدیقی، پروفیسر اختر اورینوی، باقر مہدی، اکبر رضوی اور بلراج کومل سے ہم خاص طور پر معذرت خواہ ہیں کہ ان کے مضامین اور نظمیں ہمیں وقت پر نہ مل سکیں اس لئے ہم انہیں سالنامے میں شامل نہ کر سکے!

ایک بہت بڑا واقعہ

۲۳ مارچ کو ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ رونما ہوا ہے —— اس دن ہمارا آئین مکمل ہوا ہے اور اس آئین کے مطابق ہمارا ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان بن گیا ہے۔ خدا کرے یہ آئینی تغیر عوامی خوشحالی کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ اصل چیز تو ہمارے عوام کی خوشحالی ہے اور اسی توقع کے ساتھ ہم اس تبدیلی کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔

نقش و نگار

پینٹنگ ہاؤس کے مہتمم جناب ملک شمس نے ہماری درخواست پر سالنامے کی تصویروں کی تشریح سلیس و سادہ الفاظ میں وضاحت فرمائی ہے تاکہ ہمارے پڑھنے والوں کو تصویروں کی فنی خوبیوں کا اندازہ لگانے میں کچھ سہولت حاصل ہو جائے اور وہ تصویروں کے مطالعے سے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں۔ ملک شمس فنون لطیفہ کے بہت اچھے نقاد ہیں خاص طور پر آپ جدید فن تصویر کشی کے ماہر ہیں۔ موصوف نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ ادب لطیف کے لئے فنون لطیفہ کے متعلق مضامین بھی لکھیں گے۔ ہمیں احساس ہے کہ ادب لطیف میں فنی نوعیت کے مضامین بہت کم شائع ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ملک صاحب کے مخلصانہ تعاون سے ہم اس کمی کو ایک حد تک دور کر سکیں۔ (مرتب)

کنول نین

اٹھارویں صدی کی یہ راجستھانی تصویر ایک حسینہ کی نقش کشی ہے جس کے خدوخال خیالی اور مثالی ہیں۔ حقیقی نقش کی بجائے ایک راجپوتی استاد مصور نے شاعرانہ تشبیہوں اور استعاروں سے ایک پرشباب اور نکیلی نازنین کو نہایت آراستگی اور عمدگی سے رنگوں اور خطوں میں پیش کر دیا ہے۔ چہرے مہرے میں سب سے نمایاں نقش آنکھیں ہیں۔ سنسکرت اور ہندی کے شعرا نے حسین آنکھوں کو اکثر کنول سے تشبیہ دی ہے۔ بھنویں تنی ہوئی کمان ہیں جنہیں کمان ابرو سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ لابنی، ناک پتلی اور سیدھی اور نوک دار ہے جو مرصع نتھ سے مزین ہے۔ ٹھوڑی نہایت ترشیدہ ہے۔ رخسار پر آراستہ گال بہت ملائم معلوم ہوتے ہیں اور شانوں پر سیاہ پریشان زلفیں گر کر کولھوں تک گر رہی ہیں۔ ایک ہاتھ میں کنول کی خوشبودار ڈنٹھل ہے اور دوسرے ہاتھ سے چہرے اپنے اور شانوں کے گرد بل کھاتے ہوئے دوپٹے کے گھونگھٹ کو لطافت و نزاکت سے تھامے ہوئے ہے اور کمر مثالی طور پر پتلی ہے۔ یہ ایک ایسی پرشباب عورت کا منظر ہے جسے سنسکرت میں کامنی یا پدمنی کہتے ہیں۔ جسمانی رعنائی اور اس کے زیورات کی رنگ دمک اور ہار سنگار اس کی خودنمائی اور سینے میں دبے ہوئے جذبات بھی آئینہ دار ہیں۔ اس خیالی تصویر میں ایک غزل کی سی غنائیت یا کسی گیت میں کھنچا ہوا ایک حسینہ کا نقشہ ہے۔

باز بہادر اور روپ متی

انیسویں صدی کی اس تصویر میں جست و خیز کرتے ہوئے ایک گھوڑے پر سوار باز بہادر اور روپ متی کو ایک ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ باز بہادر سلطنت مالوہ کا حکمران تھا وہ ایک رنگین طبع انسان تھا جو عشق و محبت کا پرستار اور شعر و نغمہ کا دلدادہ تھا۔ روپ متی اس کی محبوب ملکہ تھی اور اپنے حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھی۔ ۱۵۶۱ء میں اکبر نے مالوہ پر حملہ کیا اور اسے تسخیر کر لیا۔ باز بہادر فرار ہو گیا۔ روپ متی نے خیال کیا کہ وہ میدان جنگ میں مارا گیا ہے اس کے لئے محبوب کی دائمی جدائی کا صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ زہر کھا کر اس نے اپنی جان دے دی اور اس طرح تاریخ شہیدان محبت میں ایک نئے اور تابناک باب کا اضافہ کر دیا۔

آہستہ آہستہ باز بہادر کی تاریخی شخصیت ایک رنگین رومانی داستان بن گئی اور باز بہادر اور روپ متی کا عاشقانہ رومانی قصہ رنگین کر دیا گیا۔ ان دونوں کی محبت شعر و نغمہ اور تصویر کشی کا مرغوب موضوع رہا۔ ذکر یوں آیا ہے کہ عشق و محبت کے پرستار شاہ اور ملکہ پہلو بہ پہلو سوار ہو کر ایک دوسرے کی طرف ٹکٹکی لگائے ہاتھوں پر باز شکار پر جاتے۔ اس تصویر میں باز بہادر اور روپ متی کو ایک ایسے ہی منظر میں دکھایا گیا ہے۔ دونوں شکار کی مہم پر نکلے ہوئے ہیں۔

ہندوپاکستان کی درخشندہ ستارہ

مینا

نگار پکچرز کی معیاری تخلیق

سرفروش

میں

ہدایت کار و فلمساز:- انور کمال ایم۔اے

ستارے:- سنتوش، صبیحہ، رخشی، شاہدہ، غلام محمد، آصف جاہ، علاؤالدین
اقبال شیخ، نسیم ہاشمی و مینا،

پیشکش ــــ سید مختار احمد

کہانی ــــ حکیم احمد شجاع ــــ میک اپ ــــ چارلی و لطیف

موسیقی ــــ رشید عطرے ــــ ملبوسات ــــ ہالی وڈ ٹیلرز

نغمات ــــ طفیل ہوشیارپوری ــــ رقص ــــ سرات عاشق حسین

عکاسی ــــ رشید لودھی ــــ معاون ہدایتکار:- آغا حسینی

صدابندی ــــ بیگ ــــ منتظم فلمساز:- معین شاہ

تدوین ــــ اکرم

ساکت عکاسی ــــ منظور و معراج

حقوق تقسیم

(۱) کل عالم، سوائے پنجاب و سرحد
نگار پکچرز کراچی

(۲) پنجاب و سرحد
کمال ڈسٹری بیوٹرز لاہور۔

جاری کردہ:- کمال پکچرز۔ لاہور

فضلی ایس ایم لطیف قدرتی مناظر کی

نیا موضوع

ہدایت کار اشفاق ملک کی انوکھی تخلیق

باغی

موسیقی ——— عکاسی

رحمان ورما ——— ریاض احمد

——— ستارے ———

مسرت نذیر ، سدھیر ، یاسمین ، زینت ، نذر

علاؤالدین . غلام محمد اجمل اور طالش

تنویر پکچرز کی سچی کہانی

جبرو

(پنجابی)

سلمیٰ

(رفیق سید صلاح الدین)

ہدایت کار

مظفر طاہر

موسیقی

عاشق حسین

عکاسی

شیدا

مکالمے

علی

ستارے

یاسمین

طالش

نور محمد

ہمایوں

سکے دار

روبینہ

اور نئے چہرے سعید اختر اور انمل

نیا تصور

کافر

ہدایت کار ——— موسیقی

ایس فضلی ——— عنایت حسین

مکالمے ——— نغمات

زیدی ——— سیف

کافر کے بیرونی مناظر کی عکاسی اس ——— سرزمین میں ہوئی جس کے متعلق
کافرستان کے باشندوں کا دعوے ——— ہے کہ وہ دیوتائے اعظم کی اپنی
سرزمین ہے

تفصیلات کے ——— لیے لکھیے

کیپیٹل فلم ایکسچینج

مداراسٹریٹ روڈ ——— لاہور

دلاویز پکچرز کا حسین شاہکار پیش کرتے ہیں

فلمساز ایس ایم لطیف کی اسلامی پیشکش

ہدایت کار: ایس ایم لطیف

دیارِ حبیب

——— موسیقی ———

حسن لطیف ——— رحمان ورما

——— ستارے ———

یاسمین طالش مجید نزار نصرت

اور کئی نامور اداکاروں کے علاوہ بیگم پروین

هنگامہ پرور زیر تکمیل شاہکار

سفید خون

ہدایات ——— مصنف

لقمان ——— امتیاز علی تاج

——— ستارے ———

مسرت نذیر اور حبیب کے علاوہ دوسرے

(سیٹھ یعقوب آف رائل فلمز کراچی کے اشتراک سے)

کتاب منزل لاہور

دو کلاسیک اور ایک انتخاب پیش کرتا ہے

دوستوفسکی کا، سارے روس کا، دنیا کی کلاسیک کا عظیم ناول

جرم و سزا

(زیر طبع)

- روشنی اور سائے
- غیر و شر
- جرم و سزا

لیکن ۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ سٹیج پر محض روشنی ہو یا صرف گھپ اندھیرا روشنی اور تاریکی کی لکیریں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی دوستوفسکی کے کرداروں کی روح کے آر پار گذر جاتی ہیں

جرم و سزا

ایک ایسے بلند آہنگ نغمے کی مانند ہے جس کے سُر ہر لحظہ بلند ہوتے جائیں، یہ ایک ایسا تند رو دریا ہے جو سر ٹپکتا، ٹکراتا، بپھرتا ہوا اور بھی تیز رفتار ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر کار اپنے منتہا پر پہنچ کر ابدیت کے سکون میں ڈوب جاتا ہے۔

ترجمہ: کمال احمد رضوی

ایوان تورگنیف کا کلاسیکی ناول

سوادِ شہر

جو روسانی پس منظر میں اپنے انقلابی سفر کا آغاز کرتا ہے۔

جس میں انقلاب کی آنچ ایک نرم انداز میں سلگ رہی ہے، یہ آنچ بتدریج بلند ہوتی جاتی ہے اور روس کے انقلابی افق پر اس آنچ کی کلیاں لہلہانے لگتی ہیں۔

جس میں نسلیں تازہ بہ تازہ آتی ہیں اور آن کی آن میں گذر جاتی ہیں، انسان کے پیچھے تاریک سائے لہراتے رہ جاتے ہیں۔

ترجمہ: کمال احمد رضوی۔ قیمت [illegible]

اُردو ادب ۸ سال

تقسیم ملک کے بعد ہمارے آٹھ برسوں کے ذہنی رجحانات میں کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں؟ ہمارے ادب پر آزاد جمہوری زندگی کا کیا اثر پڑا؟ ہمارے ادب کے شعبوں میں کیا کیا انقلاب واقع ہوئے؟ اس پوری ہشت سالہ زندگی میں، فکر اور اسلوب کے کون کون سے نئے زاویے قائم ہوئے؟

اُردو ادب ۸ سال ۔ ہشت سالہ ادبی کارناموں کا ایک تنقیدی انتخاب ہے جو [illegible] صفحوں پر پھیلا ہوا ہے اور ان تمام نمائندہ اصناف تخلیق کا مرقع ہے جو آٹھ سال کے عرصے میں ظہور پذیر ہوئے۔ افسانے، ڈرامے، ناول، منظومات، تنقید، سیاسیات، [illegible] شعبہ اس انتخاب میں آنے سے نہیں بچا۔ قیمت [illegible]

مرتب:
- عشرت رحمانی
- وقار عظیم
- ابواللیث صدیقی
- شوکت تھانوی
- حامد اللہ افسر
- پرکاش پنڈت

بہترین دوائیوں کی خصوصیات کیا ہیں؟

① بہترین کوالٹی

② مناسب مقدار

③ عمدگی اور نفاست

اور یہ تمام خوبیاں ہماری بنائی ہوئی دوائیوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہماری فرم کی دوائیاں نہ صرف سارے پاکستان بلکہ لنکا، برما، افغانستان، تاشقند اور بغداد وغیرہ میں بھی جاتی ہیں۔

اپنے ملک کی بہترین ٹنکچرز اسپرٹس (TINCTURES ANDSPSPIRITS) استعمال کریں؛

پاپولر کیمیکل ورکس لمیٹڈ پرانی انار کلی لاہور

تار پتہ :- تھینک فل (THRNK FUL) فون ۲۸۰۱


اپنا سامان بک کرائیے
اور بھاری اشیاء بریک وان میں رکھوائیے
نارتھ ویسٹرن ریلوے
پبلسٹی

معیار اور حسن ترتیب کا لحاظ رکھنے والا ادارہ

مکتبہ جدید

اچھی کتابیں پڑھنے والوں کیلئے تین نئی کتابیں پیش کرتا ہے

کنکری (افسانے) انتظار حسین

انتظار حسین کے افسانے وسیع و عریض جھیل میں گرنے والی کنکری کی طرح اندر اور باہر دونوں سطحوں پر اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ جس طرح کنکری پانی کے چہرے پر چھوٹے بڑے دائروں کا جال بُن دیتی ہے۔ اسی طرح انتظار حسین کے افسانے پڑھنے والے کو اپنی زبان اور اپنے کرداروں کے دائروں میں اسیر کر لیتے ہیں اور جس طرح کنکری جھیل کے پانی میں آہستہ آہستہ گھستی ہے، اسی طرح انتظار کے افسانے پڑھنے والے کے دل میں تحلیل ہوتے جاتے ہیں اور اس کی یادوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ قیمت -/۵

چنگیز خاں (ناول) ہیرلڈ لیمب ـــــ ترجمہ عزیز احمد

ساڑھے سات سو سال کی بات ہے۔ ایک منگول جنگجو آندھی کی طرح اُٹھا اور آدھی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک وقت تھا کہ وہ دشت بہ دشت مارا مارا پھرتا تھا، اُسے جان کے لالے پڑے رہتے تھے اور ایک وقت تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دُمدار ستارے کی طرح روئے زمین پر محیط ہو گیا۔ یہ شخص چنگیز خاں تھا۔ تاریخ عالم میں کوئی سکندر، کوئی نپولین، کوئی ہٹلر اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچا۔ چین جیسا بے حد و کنار ملک اس کے گھوڑوں کی چراگاہ تھا۔ ایک لاکھ ترک اس نے ایک جنگ میں قتل کیے تھے۔ عیسائی سلطنتیں نسل در نسل اس کے خوف سے لرزہ بر اندام رہی ہیں ـــــ ہیبت کا یہ عالم تھا کہ اس مملکت میں سونے سے لدی پھندی دوشیزہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک اکیلے سفر کرتی تو کوئی دم نہ مارتا تھا۔ شہرۂ آفاق سوانح نگار ہیرلڈ لیمب نے اس مرد بے پایاں کی اس کہانی میں ماضی کے ان آتشیں اوراق کو پھر سے زندہ کیا ہے جن کے رنگ و گل پر صدیوں کی گرد جم رہی تھی۔ قیمت -/۵

مکاتیب جمیل (خواتین کے خطوط) مرتبہ ربیعہ سلطانہ

خطوط شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں، اسی لیے لوگ چوری چھپے دوسروں کے خطوط پڑھنے کی کوشش میں رہتے ہیں، ہمارے معاشرے میں خواتین کے لیے اظہار شخصیت کے بہت کم مواقع موجود ہیں، ان کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کی تصویریں ان کے خطوط ہی میں مل سکتی ہیں۔ اسی کے پیش نظر خطوط کے اس مجموعے میں مشاہیر خواتین کے ساتھ ساتھ غیر معروف خواتین کے ذاتی خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں۔ چنانچہ جہاں یہ خطوط خواتین کی ذہنی مصروفیتوں کے آئینہ دار ہیں وہاں [illegible] عجیب و غریب تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ قیمت -/۴

مکتبہ جدید لاہور

تین اور کتابیں

میٹھا بول میں جادو ہے

ڈیل کارنیگی کی شہرۂ آفاق کتاب H O WT OWIN FRIENDS کا ترجمہ

اس کتاب کی پچاس لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، کروڑوں انسانوں نے اس کتاب سے روشنی پائی ہے، گمنامی کے اندھیروں سے نکلے ہیں۔ کامیابی اور شہرت سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ یہ کتاب کس طرح سے آپکی مدد کریگی۔

زنگ آلودہ ذہن کو جلا دے گی، آپ میں نئے خیالات، نئے نظریات اور نئے ارادے موجزن ہوں گے۔ آپ کی مقبولیت میں اضافہ ہو جائے گا۔ لوگوں سے کام لینے کی اہلیت، آپ کے اثر و رسوخ اور آپ کی ساکھ میں اضافہ ہو جائے گا۔ آپ اپنے پرانے اور نئے خریداروں کے لیے باعث کشش بن جائیں گے آپ کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ شکایات سے نبٹنے، بحث بازی سے بچنے اور لوگوں کے ساتھ خوشگوار اور ہموار تعلقات قائم رکھنے میں آپ کو کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔ آپ کو بہتر مقرر بننے میں مدد ملے گی اور آپ کی گفتگو میں زیادہ سے زیادہ لوگ دلچسپی لے سکیں گے۔ قیمت ۵/-

آگ

گریز، شبنم، ایسی بلندی ایسی پستی کے مصنف عزیز احمد نئے اردو ادب میں ناول کے اولین استاد ہیں۔ آگ کی حیثیت ان کے ناولوں میں سنگ میل کی ہے، اس میں ان کے دلچسپ ناولوں کی سی دلچسپی ہے اور پختہ ناولوں کی سی پختہ کاری۔ یہ ناول کشمیر کے بارے میں ہے، زعفران کے اس چمن کی روح اس ناول کے صفحات پر نقش ہے، بے نقاب ہے۔ قیمت ۶/-

تذکرۂ شوق

یہ کتاب مثنوی زہر عشق کے مصنف مرزا شوق لکھنوی کے حالات اور شاعری پر عطاء اللہ پالوی نے لکھی ہے۔ اس میں عریانی اور فحاشی کے ان الزامات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جو نام نہاد اخلاق پرستوں نے مرزا شوق پر لگائے۔

مصنف نے دوسرے شاعروں کے کلام کو مثالاً پیش کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ شوق اردو کے عظیم شاعروں کی صف میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

یہ کتاب تنقید بھی ہے، تحقیق بھی اور ساتھ ہی ساتھ دلچسپ اور رنگین بھی ہے۔

قیمت ۶/-

مکتبہ جدید لاہور


فرنگن
ایم اسلم
فرنگن
ایم اسلم
البلاغ
لاہور

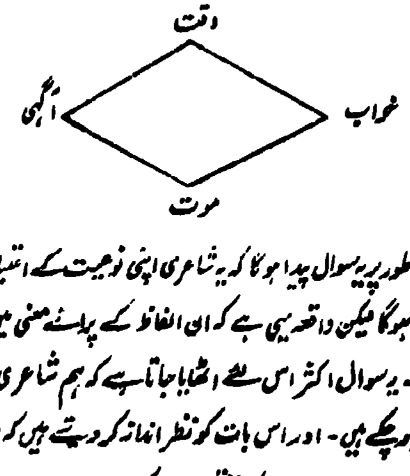


موت ایک ایسا مسیحا ہے جو اس دور کے عذاب و کرب کے لئے شفا کا پیغام لاتا ہے ۔ یہ انفرادی ذمہ داری کے کھائے جانے والے احساس اور باشعور زندگی بسر کرنے کے مرض کے لئے تیر بہدف کا کام کرتی ہے چنانچہ شاعر زہر کو اس دور کا " نیا امرت " قرار دیتا ہے :

دواؤں کی الماریوں سے سجی اک دوکاں میں
مریضوں کے انبوہ میں مضمحل سا

اک انسان کھڑا ہے
جو اک نیلی کبڑی سی شیشی کے سینے پہ لکھے ہوئے
ایک اک حرف کو غور سے پڑھ رہا ہے
مگر اس پہ تو " زہر " لکھا ہوا ہے
اس انسان کو کیا مرض ہے
یہ کیسی دوا ہے ؟

" موت " کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس شاعری کا سلسلۂ تصورات مکمل ہو جاتا ہے ۔ اب اس کو مربوط طور پر یوں پیش کیا جا سکتا ہے :



یہاں قاری کے ذہن میں لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ شاعری اپنی نوعیت کے اعتبار سے مثبت ہے یا منفی ؟ قنوطی ہے یا رجائی ؟ اس سوال کا یہ جواب کچھ عجیب سا معلوم ہوگا لیکن واقعہ یہی ہے کہ ان الفاظ کے پرانے معنی میں یہ شاعری نہ قنوطی ہے نہ رجائی ۔ اس سے نہ مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں نہ منفی ۔ یہ سوال اکثر اس لئے اٹھایا جاتا ہے کہ ہم شاعری کے بارے میں روایتی طور پر مقصدی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے سوچنے کے عادی ہو چکے ہیں ۔ اور اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ شاعری حالی و سرسید کے دور سے لے کر اقبال و جوش و جگر تک کی شاعری سے اس لحاظ سے بالکل مختلف ہے کہ یہ سماجی ذمے داری کے احساس کی شاعری نہیں ۔ یہ دور آگہی کے آشوب کا دور ہے ۔ آج کا انسان اپنے شعور کے ہاتھوں پریشان ہے ۔ اس کے دکھ درد اور غم کی نوعیت بالکل دوسری ہے ۔ اس کی الجھنیں اور مسائل بھی پچھلے دور کے انسان کی الجھنوں اور مسائل سے مختلف ہیں ۔ اور ان کا کوئی حل ابھی اس دور کے انسان کو نہیں سوجھا ۔ اس لئے یہ شاعری تبلیغ کی یا پیغام کی شاعری نہیں ہو سکتی اس کے بعض جواب مایوس کن ہیں اور اس لحاظ سے اگر کوشش کی جائے تو اس میں مثبت اور منفی عناصر الگ الگ تلاش کر کے دکھائے جا سکتے ہیں ۔ لیکن ان سے کوئی واضح فیصلہ اخذ کرنا مناسب نہ ہوگا کیونکہ یہ اس شاعری کی معنوی وحدت کو مجروح کرنے اور اس کے ایک حصے کو نظر انداز کر کے دوسرے کو پیش کرنے والی بات ہوگی ۔ افسوس ہے کہ اس طرح کی چند کوششیں کی بھی گئی ہیں جو ہر لحاظ سے معصومانہ ہیں اور ہماری ہمدردی کی مستحق ہیں ۔ بات صرف اتنی ہے کہ نئی شاعری

بنیادی طور پر اس دور کے زخم خوردہ انسان کی اندرونی پیاس، روحانی کرب اور شعوری الجھنوں کی شاعری ہے۔ یہ ایک طرف خواب، آگہی اور دوسری طرف وقت و موت کی قوتوں کے درمیان معلق ہے اور زندگی کی معنویت کی تلاش میں سرگرم عمل ہے۔ یہ زندگی اصل چہرے کو جیسا کہ وہ غم اور مسرت کے لمحوں میں نظر آتا ہے، پہچاننے کی کوشش کرتی ہے اور حال کے ہر حالیہ میں جینا چاہتی ہے مستقبل کی یہ شاعری قائل ہی نہیں۔ اسے خود نہیں معلوم کہ انسان کی اگلی منزل کیا ہوگی۔ شہریار اس کے نزدیک "سنسار" بھی سپنا اور "دنیا کا سپنا" بھی (آدرش) چنانچہ یہ شاعری مسرت اور غم کے لمحوں میں جو کچھ محسوس کرتی اور دیکھتی ہے، اُسے من و عن بیان کر دیتا ہے اور اس سے زیادہ کی اس سے توقع کرنی بھی نہیں چاہیے۔

ارادہ تھا کہ شہریار کی نظموں کے فارم سے بھی بحث کی جائے، لیکن خدشہ ہے کہ اس سے یہ تبصرہ جو پہلے ہی خاصا غیر دلچسپ ہے، غیر ضروری طور پر طویل بھی ہو جائے گا۔ پھر بھی اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ شہریار نے بے معنی جدت طرازی سے کام نہیں لیا جو اکثر نئے شاعروں کا طرۂ امتیاز ہے لیکن جس سے ابہام اور اشکال پیدا ہوتا ہے اور کلام سے لطف و اثر جاتا رہتا۔ شہریار نے اس سلسلے میں روایت اور جدیدیت کے امتزاج کو ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی مختصر نظمیں تکنیک کے اعتبار سے نہایت کامیاب ہیں۔ ان میں سے "خواب"، "قریب در قریب" اور "ایک منظر" کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ مجموعے سے "پرچھائیاں" اور "قرب قیامت" بھی ملاحظہ فرمائی جائیں۔ یہ تمام نظمیں معنوی وحدت کے اعتبار سے مکمل اکائیاں ہیں اور موضوع کے تاثر کو ابھارنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

آخر میں شہریار کی غزلوں سے چند اشعار دیکھیے، ان میں نئی شاعری کے ان تمام عناصر کی کارفرمائی ایک بلیغ اشاریت کے ساتھ ملے گی، جن کا ذکر نظموں کے سلسلے میں اوپر کیا جا چکا ہے:

دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے | پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے
ہم نے تو کوئی بات نکالی نہیں غم کی | وہ زود پشیمان، پشیمان سا کیوں ہے

———

زباں ملی بھی تو کس وقت بے زبانوں کو | سنانے کے لیے جب کوئی داستاں نہ رہی

———

لوگ سر پھوڑ کر بھی دیکھ چکے | غم کی دیوار ٹوٹتی ہی نہیں

———

ہوا کا جھونکا بھی جس راہ پر نہیں آتا | نہ جانے کس لیے اس راہ پہ کھڑے ہیں لوگ

———

عجیب چیز ہے یہ وقت جس کو کہتے ہیں | کہ آنے پاتا نہیں اور بیت جاتا ہے

———

یہ کیا جگہ ہے دوستو یہ کون سا دیار ہے　　حدِ نگاہ تک جہاں غبار ہی غبار ہے
ہمیں تو اپنے دل کی دھڑکنوں [illegible]　　خوشا وہ لوگ جن کو دوسروں پہ اعتبار ہے

ہزار پرسشِ غم کی مگر نہ اشک بہے　　حیا نے ضبط یہ دیکھا تو لاجواب ہوئی

ہمیں تو یاد تھی بے مہری جہاں یوں بھی　　بہانہ مل گیا اس کو ترے تغافل کا

بے تاب ہیں اور عشق کا دعویٰ نہیں ہم کو　　آوارہ ہیں اور دشت کا سودا نہیں ہم کو
یا تیرے علاوہ بھی کسی شے کی طلب ہے　　یا اپنی محبت پہ بھروسا نہیں ہم کو

جو چند لمحے وقت نے دیئے ہیں اُن کا کیا کریں　　درِ حبیب وا نہیں، درِ حیات بند ہے

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو　　میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو
وہ کون تھا، وہ کہاں کا تھا، کیا ہوا تھا اسے　　سنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

نذرانہ تیرے حسن کو کیا دیں کہ اپنے پاس　　لے دے کے ایک دل ہے سو ٹوٹا ہوا سا ہے

زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے　　جب بھی ملتی ہے مجھے اجنبی لگتی کیوں ہے

ان اشعار میں جو انفرادیت اور تازگی ہے وہ عام قسم کی انفرادیت اور تازگی سے مختلف ہے۔ ان میں نئے تغزل کی جو لَے ہے وہ نئی نسل کے شاعروں کے ہاں عام ہوتی جاتی ہے۔ اس سے جہاں صنفِ غزل سے ہماری محبت کا پتہ چلتا ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزل بھی اس کے بدلے میں بڑی فیاضی سے کام لیتی ہے اور ہمیشہ ہماری محبت کو کئی گنا بڑھا کر ہمیں واپس کر دیتی ہے۔


فیصلہ کون کرے؟


جاذبِ نظر لباس
کیلئے
آدم جی
پارچہ جات
سینفورائزڈ
SANFORIZED
ACME
آدم جی کاٹن ملز
آدم جی انڈسٹریز لمیٹڈ کا ایک شعبہ
adamjee
THE NAME YOU HAVE LEARNT TO TRUST

گلیکسوز ڈی آپ کی توانائی کی تعمیر کرتا ہے



گلیکسوز۔ڈی

ٹریڈ مارک

میں تین خاص اجزا شامل ہیں۔

۱۔ گلوکوز
غذائیت اور توانائی
فوری بہم پہنچاتا ہے۔

۲۔ کیلشیم اور فاسفورس
غذائیت بہم پہنچاتے ہیں اور اعصاب کو
قابو میں رکھنے میں مدد دیتے ہیں

۳۔ وٹامن ڈی۔
کیلشیم کو ہضم
کرتا ہے

گلیکسوز۔ ڈی نہ صرف بیماری میں اور بیماری کے بعد توانائی بخشتا ہے بلکہ عام حالات میں بھی اس کا استعمال اتنا ہی فائدہ مند ہے۔ بیماری کی طرح دن بھر کے کام کاج میں بھی کافی قوت ضائع ہو جاتی ہے۔ کھوئی ہوئی قوت دوبارہ حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ اور یہ گلیکسوز۔ ڈی سے بہت آسان ہے۔ کیونکہ گلیکسوز۔ ڈی کو ڈاکٹری اصولوں پر توانائی کی تعمیر کے لئے بنایا گیا ہے۔ سمجھدار لوگ اسے پابندی سے استعمال کرتے ہیں۔ ایک ایک بڑا چمچہ گلیکسوز۔ڈی چائے، دودھ، پانی یا پھلوں کے عرق میں گھول کر دن میں دو تین مرتبہ پی لیں آجکل کی ہنگامہ خیز زندگی سے مقابلہ کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ گلیکسوز۔ ڈی کو شکر کی جگہ استعمال کیجئے اور توانائی حاصل کیجئے

گلیکسوز۔ڈی نام لے کر خریدیئے۔

گلیکسوز۔ ڈی کو سائنٹیفک طریقہ پر گلیکسو لیبارٹریز (پاکستان) لمیٹڈ تیار کرتے ہیں

۴ آونس اور ۱۶ آونس کے ڈبوں میں ملتا ہے۔

مجلس ترقی ادب لاہور (۲ کلب روڈ لاہور) کی کلاسیکی اور تحقیقی و تنقیدی مطبوعات

۱۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (دو جلدیں)	۲۴/-
۲۔ مقالاتِ مولانا محمد حسین آزاد	۸/۰۰
۳۔ مکاتیب مولانا محمد حسین آزاد	۵/-
۴۔ تذکرہ مخزن نکات از قائم چاند پوری	۵/۰۰
۵۔ تذکرہ گلستانِ سخن از قادر بخش صابر دہلوی	۲۲/۰۰
۶۔ کلیاتِ قربان علی بیگ سالک	۱۱/۰۰
۷۔ کلیات اصغر علی خان نسیم دہلوی	۹/۰۰
۸۔ اصولِ انتقادِ ادبیات از سید عابد علی عابد	۱۵/۰۰
۹۔ شاعری اور تخیل از محمد ہادی حسین	۶/۰۰
۱۰۔ ذوق ۔ سوانح اور انتقاد از ڈاکٹر علوی	۸/۰۰
۱۱۔ مومن (حالاتِ زندگی) از فائق رام پوری	۵/۵۰
۱۲۔ ڈراما نگاری کا فن از ڈاکٹر محمد اسلم قریشی	۸/۰۰
۱۳۔ باقیاتِ شبلی از شبلی نعمانی	۴/۰۰
۱۴۔ مکتوباتِ سرسید مرتبہ شیخ محمد اسماعیل	۱۰/۰۰
۱۵۔ موعظۂ حسنہ از ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	۴/۰۰
۱۶۔ مسافرانِ لندن از سرسید احمد خاں	۳/۰۰
۱۷۔ سوانح مولانا روم از شبلی نعمانی	۲/۵۰
۱۸۔ حیاتِ سعدی از خواجہ الطاف حسین حالی	۲/۵۰
۱۹۔ یادگارِ غالب از خواجہ الطاف حسین حالی	۹/۰۰
۲۰۔ تذکرہ بہارستانِ ناز از حکیم فصیح الدین رنج	۴/۵۰
۲۱۔ قصصِ ہند از مولانا محمد حسین آزاد	۲/۰۰
۲۲۔ آرائشِ محفل از میر شیر علی افسوس	۸/۰۰
۲۳۔ رسومِ ہند از رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب	۳/۵۰
۲۴۔ بزمِ آخر از منشی فیض الدین دہلوی	۲/۵۰

ناول

۲۵۔ امراؤ جان ادا از مرزا رسوا لکھنوی	۵/۰۰
۲۶۔ ابن الوقت از ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	۳/۵۰
۲۷۔ فسانۂ مبتلا از ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	۴/۵۰
۲۸۔ طرح دار لونڈی از سجاد حسین لکھنوی	۶/۰۰
۲۹۔ نشتر از سجاد حسین انجم کسمنڈوی	۴/۰۰
۳۰۔ توبۃ النصوح از ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	۷/۲۵
۳۱۔ ملک العزیز ورجنا از عبد الحلیم شرر	۵/۵۰

داستانیں، حکایات اور قصص

۳۲۔ باغ اردو از میر شیر علی افسوس	۵/۰۰
۳۳۔ عجائب القصص از شاہ عالم ثانی	۲/۵۰
۳۴۔ توتا کہانی از حیدر بخش حیدری	۳/۵۰
۳۵۔ مذہب عشق از نہال چند لاہوری	۲/۰۰
۳۶۔ اخوان الصفا	۴/۵۰
۳۷۔ نو رتن : از محمد بخش مہجور	۶/۰۰
۳۸۔ سروشِ سخن از محمد فخر الدین حسین سخن	۵/۰۰
۳۹۔ خرد افروز از شیخ حفیظ الدین احمد	۹/۵۰
۴۰۔ اخلاقِ ہندی از میر بہادر علی حسینی	۳/۰۰
۴۱۔ آرائشِ محفل (قصہ حاتم طائی) از حیدر بخش حیدری	۶/۵۰
۴۲۔ شگفتہ (کہانی) از کاظم علی جوان	۲/۲۵
۴۳۔ بیتال پچیسی از مظہر علی خاں ولا	۲/۰۰

نظم (دواوین)

۴۴۔ کلیات قائم چاند پوری	۱۸/۰۰
۴۵۔ دیوان جہاں دار مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی	۴/۰۰
۴۶۔ مثنویات حسن (جلد اول) مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی	۶/۰۰
۴۷۔ کلیاتِ نظام مرتبہ کلب علی خاں فائق رام پوری	۹/۰۰
۴۸۔ کلیاتِ شیفتہ مرتبہ کلب علی خاں فائق رام پوری	۴/۵۰
۴۹۔ مہتاب داغ از نواب مرزا خاں داغ دہلوی	۷/۵۰
۵۰۔ دیوان درد از میر درد	۳/۵۰
۵۱۔ کلیات مومن مرتبہ کلب علی خاں فائق	۱۴/۰۰
۵۲۔ واسوخت از امانت لکھنوی	۲/۷۵

قواعدِ اردو

۵۳۔ رسالہ گل کرسٹ (قواعد زبان اردو) سفید کاغذ	۲/۰۰

داستان (نظم)

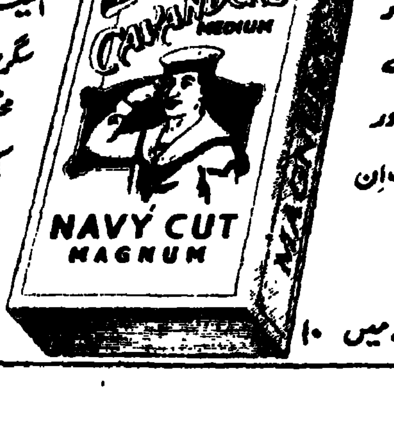
۵۴۔ بہار دانش از مرزا جان طپش	۳/۰۰

تنقید

۵۵۔ موازنۂ انیس و دبیر از شبلی نعمانی	۹/۰۰



مستقل مزاج
کیونڈرز کو
پسند کرتے ہیں



کیونڈرز سگریٹ، تمباکو کی بہترین آمیزش، اعلیٰ قوام اور اپنے روایتی عمدہ معیار کے حامل ہونے کی وجہ سے سگریٹ نوشی کا صحیح لطف بخشتے ہیں۔ یہ عام سگریٹوں سے مقابلتاً بڑے اور مختلف ہیں۔ انہیں پینے سے دیرپا تسکین حاصل ہوتی ہے۔ انہی خوبیوں کے سبب ان کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے

۱۰ پیسے میں ۳۸

تیار کردہ: پریمیر ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ
بااشتراک: گوڈفرے فلپس لمیٹڈ۔ لندن

UNITED

غزل

غزل
ناصر

آمدِ بہار

جوش ملیح آبادی

ہزار شکر کہ آیا وہ یارِ اطلس پوش — سحابِ قبلہ بگیسو و برشگال بدوش
فضا نے بھاؤ بتایا بہ نغمۂ دف و چنگ — ہوا نے ساز اُٹھایا بہ بانگِ نوشا نوش
رُخِ حیات سے نکلا جلوسِ مستی و کیف — خُمِ شراب میں ڈوبا تمام عالمِ ہوش
اُٹھے جو بات نرت میں تو چوڑیاں کھنکیں — چلا جو دَور تو گونجا لہو میں طرفہ خروش
بڑھی فضائے خنک پر معانقے کے لیے — صدائے مطربۂ گُل رُخ و نوائے سروش
اِدھر قبائے زر افشاں کے بند ٹوٹ گئے — اُدھر ہجومِ تمنا سے کھُل گئے آغوش
در آئی توڑ کے قوسین کو شبِ معراج — بیُمنِ دخترِ تاک و بفیضِ بادہ فروش
تعیّنات سے رندی چلی سوئے اطلاق — پیمبری بکفِ ناز و داوری بر دوش
زہے عروجِ گدایانِ کوئے استغنا — زمیں زیرِ نگیں، آسمان حلقہ بگوش
چھلک رہا ہے شبِ نیم رس کا سناٹا — رواں کواکبِ رقصندہ خاکداں خاموش

گہر چکاں ہیں ستارے قمر فشاں ہے فضا
زہے نواگریِ خادمانِ حضرتِ جوشؔ

محض لفافے

حفیظ جالندھری

جہاں مضمون قرباں ہو لفافوں کی نمائش پر
بنا ہو جس تمدّن کی لباسوں کی ستائش پر

جلو میں جن کے چلتی ہو غلامانہ سرشت اُن کی
ہوئی ہو ساتھ ہی جن کے تولّد خوئے زشت اُن کی

جہاں حق اور باطل میں نہ ہو ضدّین کی صُورت
جہاں ذاتی غرض ہی میں ہو نصبُ العین کی صورت

عبارت زیست ہو دواؤں اور غذاؤں سے
پھلا پھُولا ہو جن کا نفس معدے کی ہواؤں سے

وہاں پر اعترافِ صدق کا اظہار بے معنی
وہاں گفتار بے ہُودہ ، وہاں رفتار بے معنی

فراق گورکھپوری

وقت آئے گا تو ہوگی بہارِ چمن کی بات
اہلِ وطن ابھی نہ اُٹھائیں وطن کی بات

ہر بار اک ادائے تغافل نما کے ساتھ
اُس آنکھ نے کہی کسی عہدِ کہن کی بات

راتوں کی خامشی میں، بہ ہر عشوۂ نجوم
سنتا ہوں میں تری نگہِ کم سخن کی بات

افسانہ گو کو یاد نہیں ختمِ داستاں
چھیڑی ہے اُس نے زلفِ شکن در شکن کی بات

ہے کہ خرامِ ناز کی تصویرِ کائنات
یاد آگئی ہے ایک غزالِ ختن کی بات

محسوس ہو رہی ہیں دلوں میں گھلاوٹیں
مجنوں کی ہے یہ بات کہ ہے کوہکن کی بات

میری غزل نوائے معانی، زندگی
عیش و طرب کی بات نہ رنج و محن کی بات

ہے انکھڑیوں کی شام میں دُنیا کی داستاں
ہونٹوں کی صبحِ نو میں ہے باغِ عدن کی بات

آجائے کاش میری نوائے حیات میں
تیرے خرامِ ناز کے آہستہ پن کی بات

اب زندگیٔ عشق میں وہ تازگی کہاں
بُوسے پریدہ ہے کسی گُل پیرہن کی بات

جاں بازیوں کے اور طریقے ہزار ہیں
کیوں بار بار چھیڑیئے دار و رسن کی بات

ہم تو ہر امتیاز مٹانے کو آئے ہیں
مُدّت ہوئی کہ بھول چکے ما و من کی بات

دیکھا ہر ایک شاخ پہ غنچوں کو سرنگوں
جب آگئی چمن میں ترے بانکپن کی بات

ہر اک کے پاس حسنِ زبان و بیاں سہی
لیکن کہاں سے لائے کوئی میرے فن کی بات

تارے ہیں آبدیدہ، دلِ آسماں گداز
پہنچی ہے دور تک مرے شعر و سخن کی بات

ممکن ہے دردِ شامِ غریباں بہل سکے
چھیڑی ہے دل نے دُوریٔ اہلِ وطن کی بات

میں نے سُنی ہے سیرِ گلستاں کے درمیاں
ہر گُل کی خامشی میں ہزاروں چمن کی بات

اے اہلِ ہند تم نے سُنی یا نہیں سُنی
ہر مشتِ خاکِ ہند میں دردِ وطن کی بات

وہ دیکھو اُس کے پاس کھنچے آرہے ہیں لوگ
ہر بات ہے فراقؔ کی اک انجمن کی بات

تعزیت

(ایک طنزیہ نظم)

جمیل مظہری

مت پوچھو ہر تبدیلی پہ کہرام یہ کیسا ہوتا ہے
برہم ہے سیاست کی دنیا ہے موت کے بستر پہ لیٹی
شیطان کی وہ بیٹی جس کو اللہ کی رحمت کہتے ہیں
قسمت کے سنہرے محلوں سے ماتم کی صدائیں آتی ہیں
تلبیس، حسد، کینہ، غیبت، چوری، عیاشی، غداری
اترے ہیں گناہوں کے چہرے ماں کی مہلک بیماری سے
کس طرح نہ روئیں مرتی ہے ناز اُن کے اٹھانے والی ماں
تہذیب گریباں پھاڑے ہے، شیطان پچھاڑیں کھاتا ہے
موسیقی نوحہ کرتی ہے۔ تھیٹر کے حسیں ایوانوں میں
شاہنشاہی کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے
کہتی ہے اماں واری ہو، بچوں سے بھی منہ موڑ چلیں
نافہم طبیبوں نے اس کے سمجھا ہی نہیں بیماری کو
اک عرصہ تک بیچاری نے خوں پینے سے پرہیز کیا
حکمت کے شفاخانوں میں گئی معجونِ سیاست بنوایا
مغرب کے مسیحِ دوراں نے تہذیب کا آکسیجن بھی دیا
درگاہوں میں چلّے بھی کھینچے دیوتاؤں کو ڈنڈے بھی ڈنے

ابلیس کے مستقبل کے لیے ابلیس کا کنبہ روتا ہے
شاہنشاہی کی جگر گوشہ شیطان کی اکلوتی بیٹی
بابو جی ممی کہتے ہیں، خانصاحب دولت کہتے ہیں
شیطاں کی کنیزیں روتی ہیں سر پیٹتی ہیں چلاتی ہیں
کل بیٹیاں مرنے والی کی، کرتی ہیں کھڑی آہ و زاری
اک ایک کا منہ تکتا ہے کھڑا کس حسرت کس لاچاری سے
سایہ میں رہے آنچل کے پروان چڑھانے والی ماں
"مذہب" بالیں پہ مریضہ کی بیٹھا تسبیح ہلاتا ہے
بازاروں میں سناٹا ہے خاک اڑتی ہے میخانوں میں
دکھیاری سینہ کوٹتی ہے، روتی ہے، دہائی دیتی ہے
اس کو کہہ بھی بوڑھی ماں کہاں اے بیٹیا کس پر چھوڑ چلیں
مردم خواری سے باز رکھا، اک عرصہ تک بیچاری کو
کمزور ہوئی، کمزوری نے رفتار مرض کو تیز کیا
اعصاب کی تقویت کے لیے قانون کا ٹانک بھی کھایا
محنت کے خونِ صالح کا رگ رگ میں انجکشن بھی دیا
مُلّا نے دعائیں بھی دم کیں، پنڈت جی نے منتر بھی پڑھے

کل تدبیریں اُلٹی نکلیں تقدیر نے اپنا کام کیا
کہنے والوں نے رو رو کر بالیں پہ اک کہرام مچایا

اے مزدورو لٹے دہقانو اب ارتھی کی تیاری ہے
سب مل کے اٹھاؤ تو اُٹھے، دولت کا جنازہ بھاری ہے

اے بھائی ابلیس آؤ ادھر، رونا دھونا نامردی ہے
اس حادثۂ جانکاہ میں تم سے شاعر کو ہمدردی ہے

کیا کہتے ہو صدیوں کا مشن مفلوج ہوا، برباد ہوا
یزداں کی مشیت جیت گئی، انساں کا عمل آزاد ہوا

یہ بے صبری کی باتیں ہیں، اب جی کو سنبھالو صبر کرو
اُٹھو اور اپنا کام کرو، بیٹی کو سپردِ قبر کرو

بیٹی نہ سہی زندہ لیکن مذہب سا پالک بیٹا ہے
اظہارِ سعادت مندی میں کیا یہ اس سے کچھ ہیٹا ہے

گو دشمن کی اولاد سہی پھر بھی گودی کا کھلایا ہے
بن باپ کے بیکس بچے پر دامن کا تمھارے سایہ ہے

فطرت کو بدلنے میں اس کی تم نے برسوں محنت کی ہے
افکار کی تربیت کی ہے، اعمال کی تربیت کی ہے

تم اس کو دل سے پیارے ہو وہ تم کو دل سے پیارا ہے
عیسیٰ کا ہے نہ محمدؐ کا اب تو وہ خاص تمھارا ہے

دولت کا سنہرا جال نہ ہو، تسبیح تو ہے، زُنّار تو ہے
اللہ کی وہ رحمت نہ سہی، لیکن یہ خدا کی مار تو ہے

گھبراتے کیوں ہو اے بھائی، ہوگی حق پوشی بھی ہوگی
انسان پرستی بھی ہوگی، ایمان فروشی بھی ہوگی

بھٹکے گی اگر نسلِ آدم یہ سیدھی راہ دکھا دے گا
منزل پہ جہنم کی اک دن، کُل دنیا کو پہنچا دے گا

پھونکا جو صورِ جہاد اُس نے تم مارے خوشی کے پھُول گئے
بچپن ہی سے ہوشیار تھا یہ کیا جنگِ صلیبی بھول گئے

یہ ایک اکیلا کافی ہے، کُل دُنیا کو بہکا دے گا
تم کو گھر میں بٹھلائے گا، خود سارا کام اُٹھائے گا

ہم بھی کچھ خدمت کر دیں گے جذبات افزا رُومانوں سے
اپنی کیف آور نظموں سے، اپنے رنگیں افسانوں سے

افسردگیِ سوختہ جاناں

اختر اورینوی

(افسردگیِ سوختہ جاناں ہے قہر میرؔ   دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ)

ہر سمت جوشِ گُل سے چمن میں لگی ہے آگ   غنچہ بھی آگ، سبزہ دھواں ہے، کلی ہے آگ
دل جل رہا ہے، روحِ تپاں، بے کلی ہے آگ   بے گانگی کی سرد فضا، بے دلی ہے آگ
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

افسردگیِ سوختہ جاناں ہے قہر میرؔ!   دل بجھ گیا دھواں سا اٹھا نا بہ چرخِ پیر
اپنوں کی بے رخی بھی اچٹتا ہوا ہے تیر!   اغیار کے ستم نے تو سینوں کو ڈالا چیر
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

شعلہ بھڑک کے جس طرح خاموش ہو گیا   اپنی ہی راکھ اوڑھ کے روپوش ہو گیا
کانپا، ڈگا، گرا، وہیں بے ہوش ہو گیا   ظلمت کدہ میں غم سے ہم آغوش ہو گیا
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

گلشن تمام حلقۂ دامِ بہار ہے   اس سیلِ رنگ و بو پہ کسے اختیار ہے
ارماں فریب خوردۂ حسنِ نگار ہے   جلوے ہیں بے ثبات، نظر بے قرار ہے
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

یہ زندگی ہے مرگِ تماشائے آرزو!   موجِ سرابِ منزلِ صحرائے آرزو!
خوش پردگیِ محملِ لیلائے آرزو!   محروم و منفعل ہے تقاضائے آرزو!
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

یہ آسمان جور ہے اپنی زمیں نہیں   تیری نگاہِ لطف و وفا آفریں نہیں
ہم راہروانِ شوق ہیں سوزِ یقیں نہیں   وہم و گماں کا شائبہ بھی اب کہیں نہیں
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

خاکسترِ فسردہ کو پھر شعلگی ملے!   پژمردگیِ شوق کو تابندگی ملے!
روندے ہوئے نصیب کو بالیدگی ملے!   اے زندگی فروز ہمیں زندگی ملے!
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

احسان دانش

یوں نہ مل ہم سے خفا ہو جیسے
ساتھ چل! موجِ صبا ہو جیسے

چپ نہ رہ، محوِ عزا ہو جیسے
بات کر، نغمہ سرا ہو جیسے

چڑھتے سورج نے جگا دی شبنم
آئینہ ٹوٹ گیا ہو جیسے

یوں ہے گرجا پہ شفق کا پرتو
ابنِ مریم کی قبا ہو جیسے

بعض اوقات گزرتا ہے یہ وہم
وہ مجھے ڈھونڈ رہا ہو جیسے

کھلتی کلیوں سے مہک پھوٹ پڑی
اُس کے آنگن کی ہوا ہو جیسے

دستِ گلچیں کا تشدد دیکھو
پھول نے جرم کیا ہو جیسے

شرم کو شرک کی حد تک نہ بڑھا
یوں نہ چھپ ہم سے خدا ہو جیسے

یاس میں گم ہیں اُمیدوں کے دیار
ریت پر تیز ہوا ہو جیسے

ہائے اُس سانولی صورت کی کشش
صبحِ ساحل کی فضا ہو جیسے

آج یوں اس نے اُڑائی ہے ہنسی
مجھ سے اللہ خفا ہو جیسے

سرخ رو ہے مرے گلشن کی بہار
خون چہرے پہ مَلا ہو جیسے

چاند یوں دشت و چمن سے گزرا
دھوپ میں آبلہ پا ہو جیسے

اُس سے ملتے ہی گماں سا گزرا
وہ مجھے بھول گیا ہو جیسے

موت بھی آئی تو اس ناز کے ساتھ
مجھ پہ احسان کیا ہو جیسے

زرد مہتاب، غنودہ در و بام
پختہ قبروں میں دیا ہو جیسے

روتے روتے یہ ہوا ہے محسوس
کوئی سینے میں ہنسا ہو جیسے

اُڑ رہا ہے وہ گلابی آنچل
پھول سے رنگ جدا ہو جیسے

خشک پتوں پہ پھواروں کی صدا
نامرادوں کی دعا ہو جیسے

آج پھر اُن سے ملاقات ہوئی
دل پہ پھر زخم لگا ہو جیسے

نیم شب کنجِ گلستاں کا سکوت
خلوتِ غارِ حرا ہو جیسے

ان کی محفل میں خموشی ہے مگر
ایک کہرام مچا ہو جیسے

بعض اوقات تو دل یوں دھڑکا
دُور ماتم کی صدا ہو جیسے

آ رہے ہیں وہ کئی روز سے یاد
خود بخود زخم ہرا ہو جیسے

زندگی بیت رہی ہے دانشؔ
کوئی بے جرم سزا ہو جیسے

مئے حلال

حکیم احمد شجاع ساحر

حذر ز ایمانِ کج نگاہے کہ مردِ حق را غلام سازد
بُتے تراشد ز خاک و بیچارہ را خدائے انام سازد

بہ حیرتم در جہانِ فردا چہ بہرئے می رسد بہ قومے
کہ ہرزباں درِ قلندرے را بہ مسجد اندر امام سازد

بہ پیرِ مے خانہ رندِ بدمست گریہ می کرد و نعرہ می زد
کہ واعظِ حیلہ جُو بتے دیگرے بہ بیت الحرام سازد

جہانِ مزدور تلخ کام از تطاولِ چرخِ سفلہ پرور
مگر بہ بیں خواجۂ خرد بردہ با صراحی و جام سازد

علاجِ اندوہِ زندگانی کجاست بجز جامِ ارغوانی
حلال کردم مئے کہ غم را حرام گیرد حرام سازد

بہ خلوت اندر جبینِ زاہد سیہ زنگید کفر و باطل
مگر رکوع و سجود بنگر کہ او بہ بالائے بام سازد

بہ گوشۂ درنشستہ ساحر بہ فکرِ تعمیرِ آں جہانے
کہ عظمتِ این و آں نہ داند بہ لطف با خاص و عام سازد

○

معین احسن جذبی

اک مضمحل سی شام ہے پر شامِ غم نہیں
عہدِ کرم ہے یاد، امیدِ کرم نہیں

آنکھوں میں وہ نمی ہے جسے کہہ سکیں نہ اشک
دل پر ہے وہ ستم کہ بظاہر ستم نہیں

یہ تشنہ لب نہ غرق ہوں خود ہی تو اور بات
یوں تو شراب ان کے پیالوں میں کم نہیں

اک یادِ خوشگوار ہے اور آہِ سرد سرد
اک بزمِ جم کا ذکر ہے اور بزمِ جم نہیں

O

عدم

حسن اک موزوں ادا کا نام ہے
دلربائی۔ دلربا کا نام ہے

حادثے کتنے بھی ہوں ہمت شکن
حوصلہ مشکل کشا کا نام ہے

آؤ پی کر رقصِ مستانہ کریں!
فصلِ گل ساز و صبا کا نام ہے

آبیاری ہو اگر اس نخل کی
بے کلی نشو و نما کا نام ہے

غنچہ و گُل کی حقیقت کھل گئی
آپ کے رنگِ قبا کا نام ہے

رفتہ رفتہ تجربہ ہونے لگا
زندگی کس بد دعا کا نام ہے

دیکھ لینا بھی ہے اک طرزِ سخن
آنکھ آہنگ و نوا کا نام ہے

جس کے باعث ہونا پڑتا ہے خراب
وہ خرابی مدعا کا نام ہے

خلد و دوزخ کے پسِ پردہ عدمؔ
ایک افسانہ سرا کا نام ہے

فرار

مصطفیٰ زیدی

اِس سے پہلے کہ خرابات کا دروازہ گرے

رقص تھم جائے، اداؤں کے خزانے لُٹ جائیں
وقت کا درد، نگاہوں کی تھکن، ذہن کا بوجھ
نغمہ و ساغر و ابہام کا رُتبہ پا لے
کونپلیں دھوپ سے دَریوزۂ شبنم مانگیں
سنگساری کا سزاوار ہو بِلّور کا جسم
دل کے اُجڑے ہوئے مندر میں وفا کی مشعل
مصلحت کیشیٔ طوفان کی زد میں آ جائے
آہوئے دشتِ جنوں شہر کی حد میں آ جائے
سب کے قدموں میں تمنّا پئے خمیازہ گرے
عاقلو! دیدہ ورو! دوسری راہیں ڈھونڈو

اِس سے پہلے کہ خرابات کا دروازہ گرے

○

ظہیر کاشمیری

پروانہ جل کے صاحبِ کردار بن گیا
لیکن جمالِ شمع گنہ گار بن گیا

ہم دل زدے جو سیرِ چمن کو نکل پڑے
ہر پھول دستِ شاخ میں تلوار بن گیا

امشب طلوعِ یار کا منظر عجیب تھا
بامِ بلند، مطلعِ انوار بن گیا

اے مہ وشانِ شہر میری بندگی کرو
میں خود سنور کے عکسِ رخِ یار بن گیا

وہ پاس تھے، نظر پہ حجابِ غرور تھا
وہ چل دیئے، میں دیدۂ بیدار بن گیا

جب خامشی ہی بزم کا دستور ہو گئی
میں آدمی سے نقش بہ دیوار بن گیا

محسوس کر رہا ہوں کہ تنہا ہوں ان دنوں
ہر شہر گرچہ مصر کا بازار بن گیا

جس ہم نفس کو مجھ سے متاعِ وفا ملی
وہ ہم نفس مرا ہی خریدار بن گیا

اے دل ستم ظریفیٔ حالات دیکھنا
جو حرفِ مدعا تھا، وہی دار بن گیا

شہر آشوب

قیوم نظر

لب شرر بار، چشم اشک فشاں — دل کا اُجڑا نگر بتاؤں کہاں
چار سُو شور ہے قیامت کا — اُتر آئی زمیں پہ کاہکشاں
شوکتِ نو سے ہمکنار ہے شہر — عظمتِ رفتہ بستۂ نسیاں
تنگ گلیوں کے سوتے سنّاٹے — شہ رہِ حسن عارضی پہ رواں
رونقیں ہیں جمالِ تازہ کی — ہر کہن نقش معبدِ ویراں
جامہ زیبوں کی چُست پیرہنی — رہ روِ وضع دار پہ ہے گراں
بہکی نظروں میں نارِ ابراہیم — گرم ہونٹوں پہ چشمۂ حیواں
شعلۂ عشق جانفزا خاموش — ہوسِ مشتعل ہے نعرہ زناں
ہر نظر مشتری کی صورت ہے — جسم گویا دکانِ شیشہ گراں
طرفہ تزئین ہے دریچوں کی — طاقچوں پر صنم کدوں کا گماں
طرحیں کیا کیا ہنر نے ڈالی ہیں — کارِ خوش طالعاں ہے کارِ زیاں
آبرو کا طلسم توڑ چلا — جوشِ مستی کا سیلِ بے پایاں
نہر پہ لہر لہر سینہ سپر — باغ میں شاخ شاخ شوق تپاں
سایۂ گُل میں بلبلیں بے حال — قمریاں زیرِ سرو زمزمہ خواں

کو بہ کو قافلے بہاروں کے
زیرِ گُل گردِ کاروانِ خزاں

(۲)

زندگی پر دراز دستی کو — تارِ زر سے رفو ہوئی رگِ جاں
ٹوٹنے ہی کو تھی یہ شہر پناہ — ورنہ کھلتا نہ حلقۂ زنداں
اوک، ساغر، سبو، پیالہ، جام — تشنگی کو تھے سینکڑوں ارماں
خواہشوں نے حسیں اضافے کیے — ننگ، ناموس، نام سب نقصاں
گردشِ چشمِ مست ساقی سے — تیز تر اور گردشِ دوراں
فکرِ فردا کو عشرتِ امروز — موت کے گھاٹ اُتار کر ہے دواں
در و دیوار پر ہے خوں کاری — گلی کوچے مثالِ لالہ رُخاں
قتل کرتا ہے دیکھتی آنکھوں — شعبدہ باز ہے غضب انساں
کوئی طوفاں کہیں نہ حشر بپا — کہیں فریاد ہے نہ آہ و فغاں
عاملوں کاملوں کی دنیا میں — کہاں ملتے ہیں قاتلوں کے نشاں

راست گوئی سے مدعا معدوم
زشت خوئی سے مشکلیں آساں

(۳)

وسعتیں کاسۂ گدائی کی — جانے کیا؟ خود کفیل ہے دہقاں
چاک کرنا زمیں کا سینہ کجب — اور کجا عرضِ تشنگیٔ داماں
دے رہی ہے گداگری وہ فراغ — جس سے چہرہ ہے مطلعِ تاباں
چارہ سازوں کی مصلحت سے ہوئی — دانے دانے پہ ثبت مہرِ بتاں
دولتِ دیں ضرور ہوگی کہیں — ہُن برستا ہے ایں آں کے یہاں
دن کو ڈھلتے ہیں نیک منصوبے — رات لاشوں پہ جن کی نوحہ کناں

تنگ گوشوں میں ہونکتے ہیں فقیہ ‏ رشکِ جنت قلندروں کے مکاں
صرف میں اجنبی کے گنگ محل ‏ کوچہ گردی نصیبِ ہم وطناں
ناسزا دار کی بلندی سے ‏ ستمِ کج رواں کیا ارزاں
سرِ بازار دار پہ کھینچا ‏ عاقبت کے خیال کا ایماں
خوش نصیبوں کو اور اک تمغہ ‏ کم سوادوں پہ دادِ زنداں
صدفِ احتیاج تک نہ گیا
کسی عنواں بھی قطرۂ نیساں

(۴)

لفظ و معنی کے دام میں پھنس کر ‏ بیش و کم پر مدارِ سود و زباں
آدمی آدمی سے کوسوں دور ‏ ہر طرف یوں ہجومِ پیر و جواں
کاٹتی ہے ضمیرِ انساں کو ‏ سرو سامانِ آرزو کی زباں
روح کا اضطراب لوٹنے کو ‏ ان گنت پیچ و خم ہوئے عریاں
اہلِ فن کا جنوں خریدنے کو ‏ فن پرستوں نے رکھ لیے درباں
سرد مہری کی دھوپ کھلتی ہے ‏ پیار کی چھاؤں کھیلتی تھی جہاں
لذتِ سنگ پر جو مرتے تھے ‏ بار ہے اُن پہ جنبشِ مژگاں
مصلحت جذبۂ شوق پر بھاری ‏ وقت کے ہاتھ میں خرد کی عناں
دیکھ کر جن کو میں ہوں حیرت میں ‏ میری باتوں پہ وہ بھی ہیں حیراں
نظرِ خوش نگر سے پھر اُلجھا
نفسِ گرم کا کثیف دھواں

ہم سفر

ادا جعفری

رات اندھیری ہے نہ گھبراؤ رفیقِ منزل
میں نے کرنوں کو نگاہوں میں چھپا رکھا ہے
موج در موج بگولوں کی تمھیں کیا پروا
میں نے نغموں کو کلیجے سے لگا رکھا ہے
آنکھ بھی مجھ سے ملانے کی نہیں تاب جنھیں
آج پھر تاک میں بیٹھے ہیں کمیں گاہوں میں

دیکھ لیں میرے شہیدوں کا لہو ہے اس میں
ہے تو پیالہ ہی مگر جامِ مئے ناب نہیں
میرے سورج کو چرالیں یہ مجال ان کی کہاں
یہ مرا دل ہے کوئی کوہرِ شب تاب نہیں
رُت بدلنے کو فقط دل کی لگن کافی ہے
پھول ہر رنگ کے مہکیں تو بہار آتی ہے

ہم محبت کے پیامی ہیں ہمیں ڈر کس کا
قتل گاہوں میں محبت کا علَم لے کے چلو
غیر کیا شے ہے مقدر سے بھی ٹکر لے لیں
راہ میں آئے جو پتھر اسے ٹھکراتے چلو
گھر پہنچ کر نہ مسافر کہیں لٹنے پائے
ہاتھ میں ہاتھ رہے ہاتھ نہ چھٹنے پائے

منحمنّا

عبدالعزیز خالد

(بابِ اوّل)

ع : ہے یہ منجملۂ اسمائے رسولِ مقبولؐ
ب ۔ ثنائے

مطالعِ آدم و انجم، متاعِ لوح و قلم
محمدؐ امّی محبوبِ کبریا صلعم

محمدؐ انجمنِ کن فکاں کا صدر نشیں
محمدؐ افسرِ خلق و سرورِ عالم

وہ عبدہٗ و رسولہٗ وہ اسمہٗ احمدؐ
کتاب و حلم و نبوّت کا خاتمِ خاتم

محمود و حامد و احمد، محمّد و محمود
کریم و میرِ کرام و کرائم و اکرام

وہ لانبوت سراجِ سُبل، امامِ رُسُل
امیرِ قافلۂ سخت کوشِ اہلِ ہمم

ہے جس کا وصف و بیاں کان خلقہ القرآن
جو ہر جہت سے ہے فخم و مفخّم و افخم

جمیل و اجمل و کامل، مکمّل و اکمل
ستم زدہ بشریّت کا محسنِ اعظم

خدائے لم یزل و لایزال کا کلمہ
نشیدِ سلّم و سلام و صلوٰۃ و حمد و حکم

ترانۂ ملکوتی، غنائے لاہوتی
نوائے پاکِ قنوتی کہ جس میں زیر و بم

نثارِ نغمۂ داؤدؑ و لحنِ باربدی
ہیں حرف سادہ پہ قربان سماع و صوت و نغم

زباں سے نکلے نہ غیرِ فصیح لفظ کوئی
مُقِر ہیں اہلِ مقال و معارف و معجم

بہشتِ سامعہ ترجیعِ قرأت و تقریر
سخن میں زمزمۂ موجِ کوثر و زمزم

احدؐ نے بخشی ہے ما ینطق کی جس کو سند
جو نکتہ سنج ہے رمز آشنائے کیف و کم

وہ خوش بیاں کلامی، خطیبِ قرآنی
بہ ہر فضیلت و تکرّم ہے مفضّل و مکرّم

بساطِ حیّزِ امکاں ہے فرشِ پا انداز
شفق شمائل و گل طلعت و بہار شیم

ہے وہ افق بہ افق والسّماء والطّارق
اسی کے جلوے کی تنقیحِ حسنِ مفتنِ عالم

طلیعۂ سحر و ماہِ بے محاق و کلف
ہے آب و تابِ تباشیرِ رخ، بیاضِ کرم

جبیں ہے سینے کے انوار سے فروغانی
ہے فطرتاً متبسم وہ باسم المبتسم

شمیمِ خُلدِ بریں، کاکُلِ مجعّد میں
سحابِ رحمتِ رحمان، زُلفِ غالیہ شم

مئے طہور سے سرشار پُرخمار آنکھیں
ہے ماورائے بیاں جن کے کیف کا عالم

طبیعتِ متوازن سے باغِ دل کی ہوا
بہار ہو کہ خزاں، معتدل بہر موسم

خوش اختلاط، ملنسار، مستقیم مزاج
ہے جس کی غاشیہ بردار نکہتِ یاسم

سفر میں جس کو شجر جھک کے سایہ کرتے ہیں
وہ والضحیٰ رُخ و ریحاں نفس، نسیمِ منسّم

ہیں جس کے شیفتہ دلدادگانِ حسن و جمال
عفاف و عدل و شہامت ہیں جس کے خیل و خدم

وہ جس کا بیضوی چہرہ ہے چاند کا ٹکڑا
وجیہہ و خوش دل و بیدار مغز و تازہ دم

جو دیکھے زلفِ چلیپا و عارضِ زیبا
پکار اٹھے: نُورٌ علیٰ نُور ہے خَم اندر خَم

بہارِ گلشنِ احیا و حسنِ ہفت رِواق
گلِ سرسبدِ دودۂ بنی آدم

وہی ہے جانِ جہاں، تاجدارِ محبوباں
دلوں کا قائد و قمقام و پاسبان و مہیم

امام سبحۂ خاصان و دیزگانِ خدا
نہیں ہے جس کا کوئی قول و فعل غیر اہم

زباں پہ لفظِ دُرود آتا ہے جس کے نام کے بعد
ہے جس کا نقشِ قدم مخزنِ دُر و درہم

اسی کو صاحبِ خُلقِ عظیم کہتے ہیں
وہی ہے نوعِ بشر کا معلمِ اعظم

یتیمِ وادیِ بطحا ہوا عزیزِ جہاں
عرب کی شمع بنی مہرِ نیمروزِ عجم

نسیمِ نجد میں ہے راح و روحِ خلدِ جناں
نشاطِ ہر دو جہاں سیلِ موج میں مدغم

یہاں کی ریت ہے سونا، یہاں کی خاک عبیر
حریمِ گنبدِ خضرا ہے ہمقرانِ حرم

پڑی کرن تو چھٹی ظلمتِ ہیولانی
پگھل کے بہ گئے قصرِ نشیدِ ظلم و ظُلَم

درود بر نبیِ آخر الزماں کہ جو ہے
سلیم و صاحبِ اسلام و سالم و اسلم

ہے جو یگانۂ آفاق و قبلۂ اشواق
ہے جس کے ہاتھ میں کونین کی زمام و نعم

کبیر کو کبرٔ انبیا کہیں جس کو
وہ تاجدارِ دو عالم خدیوِ حلم و کرم

فضیل و فاضل و افضل مفضّل و مفضال
جمال و خیر کا منبع و معدنِ منجم

وہ شہریارِ سپہرِ اقتدار و فرخ فر
وہ بادشاہِ فلک احتشام و دہر ہمم

زمانہ صبحِ ازل سے تھا منتظر جس کا
تھے جس کے واسطے سرگشتہ اشہب و ادہم

وہ شاہکارِ بدیع صانع علی الاطلاق
ستارہ رایت و مہ پرچم، آفتاب علم

منارِ معدلت و اعتدال و استقلال
نہ اس سا صاحبِ وعدہ، نہ اس سا اہلِ فہم

وفا نے عہد میں اس سے دبے سموئل بھی
کوئی نظیر کہیں ہوگی تو بہ کتمِ عدم

وہ کوہِ صبر و رضا، آسمانِ توکّل کا
ہے جس کے آگے دوتا سطوتِ شکوہِ دوم

کہے جو مضطرب اعرابیہ سے: لاتخشین
پسر ہوں اس کا تھی جس کی غذا قدید و شحم

بنا جو بعد میں چوپانِ نسلِ انسانی
صغر سنی میں رہا وہ شبانِ غولِ غنم

دلیل و بدرقۂ راہ پیچدارِ حیات
عدو و داعی و مدعی کا مرشد و معلّم

جسے ہر اک نے کہا: الامین و الصادق
بہ بزم و رزم — عظیم و معظّم و اعظم

بجانِ عزم و مصمّم، بدل اخو ثقۃ
حلیم و حازم و حاذم، مقاوم و مغتنم

وہ خوش نقب نبیِ صالح و رسولِ کریم
عرب کا سیّد و دیّانِ مرز بوم عجم

خطاب جس سے ہے اقرأ باسمِ ربّک کا
ہے جس کے فیض سے معجز نوا صریرِ قلم

نظر جھکا کے کہے: ما انا بقاری
علیم و عالم و اعلم کے لب پہ لا اعلم!

ہے بزمِ راز میں رندوں کے لب پہ ہوہو ہو
ہے چشمۂ قُم آگاہ میں وہ پُر شور قم

پرانی سرک، مہامد سے جس کو یاد کرے
ہے خلق و خُلق و شمائل میں وہ برگزیدۂ قوم

وہی قرارِ دلِ ہفت دُخترِ خضرا
گواہ اس کی ہے پُرنم کہ ہے وہی پُرنم

مُرورِ وقت سے اپنا نام ہی بنے جس نام
الگ نہ ہو سکے اسمِ صفت سے اسمِ علم

شمار کرنے چلیں اس کی خوبیوں کا اگر
تو ساتھ چھوڑ دیں تھک تھک کے نیل سنکھ پدم

وہی ہے شمعِ شبستانِ بے در و دیوار
اسی کی آس ہے آشا کے پھوٹوں بن لی ام

ہے جوت جس کی فسوں خیز چاندنی کی طرح
شرر ہے جس کا پَوِتر اور آتما ہے پرم

اسی کو کہتے ہیں ماتے: جگت جگاون ہار
ہوا اس کے نور سے تت چھن ہیں دور اتکا تم

شعاعِ حسنِ دل آرا سے روئے گل فق دق
عرق عرق نگہِ چشمِ سرمہ سا سے پدم

وہ لُبِّ وحُبّ کے چمن کا گلِ ہمیشہ بہار
جو عکسِ رُخ سے منوّر کرے شبِ اَبہم

ہے جس کی ذاتِ مطہّر خمیر مایۂ کون
ہیں جس پہ آئنہ اسرارِ مخفی و مبہم

پکارتا ہے پپیہے: انا رسول اللہ
خیالِ سود و زیاں ہے نہ فکرِ مدحت و ذم

وہ گوہرِ صدفِ قلزمِ زمان و مکاں
ہے جس سے خاطرِ قلّا بگاں نژند و دژم

وہ کانِ حکمت و ادراک و فہم و استبصار
مزاجِ کفر ہے جس سے منغّص و برہم

مخاطب: فکشفنا غطاءک عنک
حریمِ لم یزلی کا مقرّب و محرم

جو شہرِ علم ہے علّامۂ الٰہی ہے
نظر بخیر کا ظہورِ تمام و تام و اتم

سحرِ لغت، نبیِ رحمت، امامِ ہُدیٰ
پیام جس کا ہے: تخلّقوا بخلقِ اللہ
بیک کرشمہ جو عشّاق کو مستقیم کرے
غزل، نو رستے جو بہ سمت قمرانوں کا
ضیا، زمزمہ بخشے اصم و اعمیٰ کو
ملک نگاہ کیے سلبِ تمکنت سم سے
اثر ہے جس کے مسِ عام ہو زرِ خالص
وہی جو رائق و فائق ہے خافض و رافع
بہ اتصالِ عبودیت و ربوبیت
وہی جو لطفِ ورا ہے، بکادِ کافِ انام
رموزِ کُن فیکون جس پہ ہو بہ ہو روشن
وہ عقلِ اوّل و اعلیٰ، حقیقتِ اسماء
ہے جس کی رائے امورِ دین و دنیا میں
نوشتہ جو حکم کسی کو بغیر استمزاج
صفت ہے عاصم و معصوم و معتصم جس کی
سعید و سعد و مساعد، مطیّب و طیّب
عطائے حق کا جو قاسم ہے وہ ابوالقاسم
وہی مقسّم و قسّامِ گنجِ ربّانی
جسے خدا نے خزانے خدائی کے سونپے
ہے ریگِ گرمِ بیاباں حریرِ گُل جس کو
بشوش و صابر و شاکر، بشیر و مستبشر
فراخ حوصلہ، خندہ جبین و عالی ظرف
شفیعِ روزِ جزا شافع و مشفّع ہے
زرُوئے وحی جو یا ایّھا المزمّل ہے
مجسّم امن و امان و امانت و ایمان
زعیم و قرم و سدیم سمیذع و صندید

جو راہِ حق میں رہا مبتلائے رنج و سقم
کیا و مانع و دلِ متفضّل کو جس نے نِعَم
مُہیمن ہو کہ ملک الموت تھا ملم بد اعلیم
نہ ہو مفاد و مصالح کے سامنے کبھی خم
بحکمِ قُل ہو سخن آشنا لبِ آیکم
ملے گر آپ و دہن اس کا شہد ہو علقم
نظر سے سوختہ بیخ و بُنِ نفاق و نقم
ہے جس کا عزم و تصرف مسلّم و مبرم
ہے جو مربیٔ خاص و اخص و عام و اعم
صدوق و صادق الاقرار و استوار ذمم
وہی جو ختمِ رُسُل ہے وہی جو فخرِ اُمم
وہ نفس کاہنہ و روحِ خالد و اعظم
سدید و صائب و مرجوح و متقن و محکم
وہی جو قیّمِ اقدار ہے قوامِ قیم
جو محتشم کہ سنے تمثالِ اعتصام و عصم
بہ عجز و عفت و عصمت، مقدّم و اقدم
ملیکِ مقسط و معطی و مقتدر کی قسم
نبیلِ شادروان و حرمِ پاک شِیَم
وہی مقوّم و قوّام و قائم و اقوم
ہے جس کے ہونٹ ہیں تریاق، آنکھ میں مرہم
بہ صبح گاہِ غنائم، بہ شام گاہِ ازم
ثنا نہ طالب و سائل نے جس سے لا و نعم
بفکرِ امّتِ مرحوم، وقفِ کلفت و غم
قیامِ شب سے ہے جس کے ساق و پا میں ورم
ہمہ سکینت و آزرم و خیر و مہر و کرم
رسولِ رحمت و رأفت، پیمبرِ ملحم

وہ امامِ آدمیاں، افتخارِ عالمیاں — ہے جس کے آگے اُولی الاجنحہ کی گردن خم
جواد و راد، جلیل و اجل، مبین و مبیں — حمید و غالب و نامآور و ہمام و نعم
طواف جس کا کرے الصفیح الاعلیٰ بھی — ہیں سجدہ گاہِ جبینِ نیاز جس کے قدم
زباں سے خود کو کہے نہ سابق العرب لیکن — کہے زمانہ جسے: سیّدِ انام و اُمم
نگار خانۂ کُن کی حسیں ترین تصویر — ہے جس پہ نازِ کُناں خود مصوّرِ نعم
نہ لائے تابِ نظارہ، نگاہِ مشتاقاں — نہ پائے خامۂ ندرت ختامہ اذنِ رقم
بیان کیا کروں اس جبہۂ منوّر کا — شعاعِ مہر سے جلتے ہیں پردہ ہائے ظُلَم
کریں تلاوتِ واللیل اذا سجیٰ زلفیں — سیاہ رات کے سائے ہیں حلقہ ہائے خم
جو رنگ چہرے پہ والصبح اذا تنفّس کا — تو کیوں نہ صبح بھرے عارضِ صبیح کا دم
وشاقِ موجِ شکر خند، اہتزازِ چمن — وصیفِ نائرۂ غیظ، آتشِ مضطرم
وہ سیّدُ البشر و احسنُ الصُّوَر کہ جو ہے — پناہ گاہِ جہاں، پیکرِ لطافت و حلم
وہ جس کے خسروِ گیتی پناہ حلقہ بگوش — ہیں کجکلاہ اُولوالعزم جس کے مستخدم
ہے نعل جس کے تگاور کا تاجِ ہفت اقلیم — سلام کرتے ہیں جھک کر جسے اکام و قِمَم
ہے سیمِ ماہ و زرِ مہر خاکِ پا جس کی — وہ بختیار و قویم و قلاوز و قوّم
پلک نواز، سخی، دیدہ ور، پلک دریا — ابیت، امر، جری، حلّالِ مشکلات و حشم
جہاں پناہ، جہاں مرزباں، جہاں داور — رواقِ عالمِ اجسام کا عمود و دِعَم
وہی ہے کاشفِ رازِ نہانِ یزدانی — امینِ سرِّ سراپردۂ وجود و عدم
پرے ہے عرش سے بھی جس کی منزلِ متعال — ہے نقش خانۂ فقط جس کا نیلگوں طارم
ستارے کاہکشاں کے ہیں راہ کے ذرّے — طرازِ صفحۂ گردوں ہیں جس کے نقشِ قدم
بوصفِ مرتبۂ ارجمندِ او ادنیٰ — حضورِ حضرتِ پروردگار ہے پُرنم
جو اپنے رب سے کرے بالمشافہہ باتیں — اَغرّ و گنجورِ بشر و بذل و بذم و عظم
خلاصۂ دو جہاں جس کی ذاتِ والا شاں — گیا جو عرش پہ بے نردبان و بے سُلّم
ہے جس کی شان: فاوحیٰ الیہ ما اوحیٰ — وہ آسماں خیم، انجم خدم، سپہر حشم
ملا دنیٰ فتدلیٰ کا جس کو مجد و شرف — فلک مخائل و طوبیٰ محاسن و مبتسم
یہاں سے ہو کے گیا جب ہے وہ فلک پیما — ہے سرمہ آنکھ کا گردِ رہِ بریدِ شُبَلَم
نہیں ہے وصل و ملاقات کا مقام کوئی — نہیں ہے حرف و حکایات کا کوئی موسم

وہ نورِ ساطع سُبحانَ الَّذِی اَسْرٰی
سوار ہو کے چلا سوئے اَخضری نشیم

ہے غلغلہ: فَلَمَّا تَمَّ اِلمُحِی ءُ جَاءَ کا
ہیں فرشِ راہ دل و دیدہ، تن بدن جاجم

پراجماں ہوئے آکاش پر مکٹ دھاری
سُلجِ سُبھاس سے چھلکاتے پریم رس پرنیم

یہ سرب بھومی کا راجہ، مہابلی سمراٹ
اپار، اتھاہ، اننت اور وشواتم

یہی کلکی، یہی یوگیشور، یہی کاہن
سدا اتما، اپراجت، انوپم اور دُرّدم

مہا پُرش سجے آکار، آلکھ پُرش کا کہیں
پسینہ جس کا ہے سونا، سگندھ وہ سُستم

یہ راہبر ہے سرل مارگ کا سرشٹی میں
نہیں ہے گیانی کو آگم کا پر پرم آتم

وشالتا میں یہ نرمی یہ رس یہ کوملتا!
یہی ہے شانتی شکتی کا سنگمِ سُستیم

پُنم کو مات کرے چھب ہے شیام سانول گات
یہ آنکھیں ڈرس کو کب سے ترس رہی تھیں نگم!

ہے اپسراؤں کے شیریں لبوں پہ پریم کُشل
بنا دیا ہے مسرت نے سانس کو سرگم

رسال ادھروں کا ہر بول راگنی میں ڈھلا
اپنی الھڑیں کیا جانیں تال سُر کے مرم!

حنائی انگلیوں کی ضربِ دلنشیں دف پہ
پڑے پھوار سی بوندوں کی جس طرح چھم چھم

کنوار جھیل کی دمک ہو رجھل جھلاتی ہے
ٹھسک سے چلتے ہوئے چھمچھمانے بین کی جھم

ملوک رُتھے سوشیل، سہج سیل سبھاؤ
رہیں بہار پہ جگ جگ جوانیاں جم جم

ہلیں تمتبِ فورِ طرب سے دھڑکیں اُروج
کرے نہاں کو نمایاں لباسِ ابریشم

دہانِ خُم پہ ہو خشتِ کلیسیا جیسے
ہیں یوں ہی نور کے قبوں پہ دیدبانِ حرم

سمائیں آنگ میں کیسے جب انگ باڑھ پہ ہوں؟
چلیں لچک کے کریں پائلیں چھم چھم

عرارِ نجد کی خوشبو سے پیرہن مہکیں
ہو دستہائے حنا بستہ پر گمانِ عنم

ضیائے حسن لباسِ حریر سے جھلکے
کہ جیسے پھولوں نے پہنا ہو جامۂ شبنم

بدن چھریرے، کسیلے، چھبیلے، مہکیلے
اٹھائے سینے میں طوفانِ نفس کا زیر و بم

ہیں گال خطۂ کشمیر، نین نینی تال
کسم کے کھیت کنارے کھلے ہیں نیل پدم

کسے حقیقتِ راز و نیاز کی ہے خبر؟
ہے ریت پریت کی گمتھم اَمِت، انوپ، اگم

کیا مشاہدۂ شاہدِ جلیل و جمیل
پڑی نہ پڑ سکے جس پر نگاہِ نامحرم

ممیّتِ آزری و محیِ دینِ ابراہیمؑ
مرادِ موسیٰؑ عمران و عیسیٰؑ مریم

مبشر اس کے تھے زردشت و کرشن و کنفیوشس
نقیبِ پیش رس اس کے ارسطو و گوتم

خدائے برحق و مطلق کا مخبرِ صادق
بکارِ خاص بیک وقت مہتمم، مہتمم

سلام بھیجتے ہیں جس کو قدسی و قدیس
ہے جس کی ذاتِ مقدس ہمہ صلاح و سلم

وہی جو مقصد و مقصودِ آفرینش ہے
بنا ہے جس کے لیے کارخانۂ عالم

ضمیرِ آیۂ لولاک و فخرِ موجودات
یمِ مکارمِ اخلاق و زندہ رودِ کرم

وہ عینِ غایتِ تکوینِ بزمِ کون و مکاں
کتابِ بعثت و الہام کا وہ نقطۂ تم

وہ ماحیٔ ملل و فاتحِ درِ ادیان
صفوح و ہادی و مہدی، جہاں کشا، ضیغم

ہے جو رزین و رصین، شہم و سمح و رحب الصدر
بہ رحم و مرحمت و موہبت، رحام و دیم

وہ شاہِ کاظمہ و عاصمہ و امّ قریٰ
وہ مرجعِ شرف و فضل و افتخار و عظیم

جو بے کسوں کا ہے ملجا و مامن و ماویٰ
جو بے دلوں کا ہے ہمدرد و ہمدل و ہمدم

ہے جس کے چاہنے والوں کا نام حمّادون
عمرؓ ہے جس کے فدائی وہ مرسل و ملہم

وہی جو بت شکن و صاحبِ مطراد ہے
مطیع جس کے ہیں ابطالِ نامدار و بہم

سرِ سجل ہے حبیبِ خدائے عزّ و جلّ
عزیزِ اہلِ جہاں قاسم و قسیم و قثم

اسی کو مطلبی و ہاشمی بھی کہتے ہیں
وہی ہے صاحبِ فیضِ عمیم و عام و اعم

جو مکی و مدنی ہے قریشی و کوثری
حکیم و حاملِ احکام و حاکم و حکم

وہ خانوادۂ عبدِ مناف کا سردار
وہ شاہزادۂ صحرا، بلند بام و اشم

اٹھائے ہاتھ دعا کے لیے اسی کی خاطر جب
رکھی خلیل براہیمؑ نے بنائے حرم

وہی ہے عروۂ وثقیٰ، وہی ہے حبلِ متین
وہی ہے فخرِ ورا، خیرِ خلق، صدرِ امم

جمیع و جملہ صفاتِ کمال کا جامع
جو ہر نزاع میں ہے متفق علیہ حکم

نہیں حدودِ زمان و مکاں میں جو محدود
جو ایک حق ہے پئے کلِ خلائقِ عالم

شعاعِ شمس و ضیائے نجوم و نورِ قمر
اسی کے حسنِ نظر سے منتظم و منضم

ہے بے ستونِ سماوات کا ستون وہی
نشانِ راہ اسی کے، منارِ ارضِ حرم

حصارِ مجد و مناقب، دیارِ دانش و داد
رحیم و راحم و ارحم، کبیرِ کلک و کلم

جلائے پردۂ ظلماتِ روح و صیقلِ دل
نہیں ہے جس کے لیے کوئی مانع و برکم

امین و مؤتمن، آمنِ بظاہر و باطن
تمام طیب و تحیت ز فرق تا بقدم

حیا و صدق و فتوت کا حرفِ بازپسیں
وہ قولِ فیصل و برہانِ قاطع و مستدم

بہ اصطفاء محمدؐ، بہ اجتباء احمدؐ
ہے جس کا اسوہ رہِ حق کا سنگِ میل و علم

دمِ ظفر و لا فخر جس کے ہونٹوں پر
وہ صبر و شکر و سماحت کا علم و تبسم

انیس و مونسِ بیچارگاں، ندیمِ عدیم
مقاومت میں پہاڑ، التفات میں ریشم

چمن میں غنچۂ شاداب و لالۂ سیراب
صفِ مصاف میں ضرغامِ غاب و شیرِ اَجَم

کلی حیا میں، نزاکت میں پنکھڑی گل کی
مبارزت میں حصارِ منیع و تیغِ دو دَم

اگر ہو خرمنِ باطل تو شعلۂ سوزاں
اگر ہو گلشنِ حق تو طراوتِ شبنم

اِذَا غَضِبَ اَشَاحَ وَاَعرَضَ، لیکن
ستیزگہ میں ہَزَبر و غضنفر و ہیصم

بحکم و بحزم حدید و بحلم و رفقِ حریر
ہے بیتِ حکمتِ دل، نور و نار کا سنگم

فروغِ نور سے چہرہ مشعشع تاباں
ہے رشکِ عہدِ جوانی، زمانِ شیب و ہرم

خرامِ ناز میں آہستگیِ تمکیں ہے
کہ جیسے دور سے آئے صدائے نَے و دو رنم

شفق میں برق چمکتی ہے وقتِ خندیدن
حریفِ شامۂ سحر ہیں حروفِ لا و نعم

نذیر و منذر و ناذر و مبشر و بشریٰ
نعیم و ناعم و منعم، نفورِ ناز و نعم

غنا و فقر سے جاہ و جلال شرمندہ
خجل کِساءِ ملبّد سے دیبۂ معلّم

نثارِ خرقۂ پشمینِ شاہِ بطحا پر
سمور و بیرم و خز و دبیقی و ملحم

وہ جس نے مال کو یعسوبِ اہلِ کفر کہا
سماءِ رشد و ہدایت کا نیّرِ اعظم

پیام جو صلوا ارحامکم کا دیتا ہے
کرے جو وحدتِ انسانیت کے نسخے رقم

خدائے قادر و قدوس کے تصور سے
کرے دلِ متزلزل کو ثابت و محکم

اَنَا بَشَر کا جو اعلان و اعتراف کرے
نہیں جو وحیِ خدا میں مجازِ بیشی و کم

وہی ہے نقطۂ بسم اللّٰہی اے اہلِ نظر!
جہاں رسالت و عبدیت آ کے ہوں مدغم

محمدؐ عربی آبروئے ہر دوسرا
حبیبِ پاکِ خدا، جانِ عالم و آدم

صفاتِ بوقلموں، لا تعد و لا تحصیٰ
ثنائے خواجہؐ سے معذور ہیں زبان و قلم!

احساسِ ندامت

جگن ناتھ آزاد

میں اس خیال میں تھا بجھ چکی ہے آتشِ درد
بھڑک رہی تھی مرے دل میں جو زمانے سے
میں اس خیال میں تھا ہو گئی ہے آگ وہ سرد

وہ ایک شعلۂ درد آفریں متاعِ حیات
میں اس خیال میں تھا میں اُسے بچا نہ سکا
گماں یہ تھا کہ وہ اک شعلۂ حیات افروز
ہوائے پیرس و لندن کی تاب لا نہ سکا

میں سوچتا تھا کہ شاید بھلا چکا ہوں تجھے
جو اپنے دل کی کہانی تجھے سنانا تھی
وہ اپنے سازِ غزل پر سنا چکا ہوں تجھے

کچھ ایسا مجھ کو گماں تھا طفیلِ مرہمِ وقت
کوئی بھی گھاؤ ہو اک روز بھر ہی جاتا ہے
زمانہ وقت کے پردے پہ ہر گھڑی شاید
نیا طلسم نئی دلکشی سجاتا ہے

جو ہیں رفیقِ دل و جاں اُن آنسوؤں کی قسم
ترے حضور ابھی تک جو بار پا نہ سکے
جنھیں ہے تجھ سے سوا تیری آبرو کا خیال
جو دل میں رک نہ سکے اور مژہ تک آ نہ سکے
ملا ہوں آج جو تجھ سے تو وسوسے یہ تمام

سمٹے خیال کی دنیا سے مثلِ نقش بہ آب
پتہ چلا کہ وہ شعلہ بجھا نہیں ہے ابھی
بس اتنی بات ہے اب جل رہا ہے زیرِ نقاب
نقاب ــــ وقت و مسافت کے دو دبیز حجاب

گزر گئی تری فرقت میں زندگی جتنی
عدن کی صبح نہ پیرس کی رات میں گزری
دل و نظر کے کسی واردات میں گزری
کہ اک حسینۂ عالم سے بات میں گزری
فقط وہ ایک ندامت ہے اور کچھ بھی نہیں

اور آج میری ندامت کا یہ شدید احساس
ہر ایک سانس میں مجھ سے سوال کرتا ہے
ہوس ہے عشق سے کتنے قدم؟ دو چار قدم
کہ یا ہے فاصلہ ان میں کئی ہزار قدم
پکیڈلی میں بھی ہم یاد کرتے تجھے کہ نہ تھے
پگال میں بھی خلش کوئی دل میں تھی کہ نہ تھی
وہ شامِ ٹیمز کی اب بھی نظر میں ہے کہ نہیں
کہ جب ہوس کی نظر پہ کوئی حجاب نہ تھا
وہ سطحِ بحر پہ رقصاں جہاز کا عرشہ
اور اُس پہ چار طرف ایک نُور کا عالم
کہ جیسے برقِ تجلّیِ طُور کا عالم
وِلینشیا میں وہ رقصِ برہنگی کے طلسم
تری نگاہِ تماشا کو کچھ جھجک تو نہ تھی
یہ اک سوال کہ جس کے ہزار پہلو ہیں
ہیں ایک لمحے کو جب ان پہ غور کرتا ہوں
تو سوچتا ہوں کہ میں تجھ سے اب ملوں نہ ملوں

شاعر لکھنوی

○

غم جو لہو میں تر گئے ہم
کانٹوں میں بھی رنگ بھر گئے ہم

جب راہ میں گردشوں نے روکا
پیمانہ بکف گزر گئے ہم

رنوں کو سمیٹنے کی خاطر
شبنم کی طرح بکھر گئے ہم

تھا تری ادا پہ لیکن
جینے کی ادا پہ مر گئے ہم

طوفاں نے کیے ہیں طنز کیا کیا
ساحل پہ اگر اُتر گئے ہم

حائل تھی بہت چمن کی دیوار
خوشبو کی طرح گزر گئے ہم

تنکا ہی سہی ہوا کی زد پہ
کچھ دیر تو رقص کر گئے ہم

غنچوں کا مآل تھا نظر میں
آئی جو ہنسی تو ڈر گئے ہم

دیوار ہے دشت میں نہ سایہ
یہ کس کے لیے ٹھہر گئے ہم

پل پل میں سجا کے یاد تیری
لمحوں کو چراغ کر گئے ہم

سمجھا نہ کسی نے ہم کو شاعر
اپنی ہی وفا کے سر گئے ہم

○

دھواں دھواں ہیں چراغ کتنے، تو کتنے چہرے چمک گئے ہیں
ہیں سب حجابات ہم پہ روشن کہ ہم تری بزم تک گئے ہیں

جو قربِ منزل تک آگئے ہیں وہی مبارک نہیں ہیں تنہا
عزیز وہ بھی ہیں منزلوں کو جو راستے میں بھٹک گئے ہیں

اگر ہو ناخوشگوار موسم تو کیا ضرورت ہے گفتگو کی
ہے باغباں کا مزاج برہم جو چند غنچے چٹک گئے ہیں

ہزار دامن بچا کے گزریں ہزار وہ چھپ چھپا کے گزریں
مگر انھیں اس کی کیا خبر ہے کہ راستے بھی مہک گئے ہیں

جو لڑکھڑاتے ہیں پی کے تلچھٹ انھیں مبارک ہو لڑکھڑانا
مجھے ہے اُن میکشوں پہ حیرت جو بے پیئے ہی بہک گئے ہیں

سکوتِ لب کے محافظوں کو ہو دو گھڑی تو سکوں میسّر
سُنی ہے رودادِ اہلِ زنداں مگر کچھ اتنی کہ تھک گئے ہیں

ہمیں تو صرف اک اسی ادا سے سُراغِ قاتل ملا ہے شاعر
جہاں جہاں ذکر تھا لہو کا وہیں وہیں وہ جھجک گئے ہیں

یکتائی

عبد المجید بھٹی

مطلق الحکم جلال و جبروت
"میں" کے اعلان میں سرمست ہے
سرشار بھی ہے
دوسرا کوئی نہیں، کوئی نہیں

اپنی یکتائی کہ تنہائی میں
جب اُسے 'میں' کا خیال آتا ہے
حسن تقویم سے ہوتا ہے وہ تسکین طلب
اس پہ بھی
کہ خطا کاری سے نسبت ہے مجھے
ظلم اور جہل ہے مجھ سے منسوب
میری فطرت میں بغاوت بھی ہے
باعث فخر بنا جاتا ہوں میں
دوسرا کوئی نہیں، کوئی نہیں!

میں کی سرمستی و سرشاری کہ ہے پیاس،
میں بھی تو کہہ دیتا ہوں
دوسرا کوئی نہ ہو، کوئی نہ ہو!
بس ہی میں ہوں یہ انا کا ہے مقام
دوسرا کوئی نہیں، کوئی نہیں!

میں انا الحق بھی جو کہہ دوں تو وہی کچھ ہو
جس کو میرے سہارے کی تلاش
پھر مری 'میں' ہے کہاں؟
اور اس سے بھی جو بڑھ جاؤں تو وہ یکہ
آپ ہی اپنی کہوں اور سنوں
دوسرا کوئی نہ ہو — کوئی نہ ہو!

○

خلیل الرحمٰن اعظمی

ہم سے شاکی شہر کے سب عالم و فاضل ہوئے
ہے بس اتنی بات ہم پر شعر کچھ نازل ہوئے

تیرے کہنے پر کیا ترکِ وفا کا حوصلہ
ورنہ اے جانِ وفا ہم اور کس قابل ہوئے

لوگ لکھتے ہیں ہمارے نامۂ اعمال میں
ایسے ہنگامے نہ جس میں ہم کبھی شامل ہوئے

اُس نظر کے پھول ہم چُنتے تو کوئی بات تھی
یوں تو دل کے زخم بھی وجہِ سکونِ دل ہوئے

کس سے پُوچھیں جا کے اپنی نارسائی کا سبب
بارہا ہم خود بھی اپنی راہ میں حائل ہوئے

ہم نے کب جی بھر کے دیکھا تجھ کو اے عصرِ رواں
عمر کے لمحات نذرِ خوابِ مستقبل ہوئے

خانم ممتاز مرزا

○

یادوں کے قافلے اِدھر آئے اُدھر گئے
یہ موتیوں کے ہار گندھے اور بکھر گئے

شمعِ دلِ فسردہ کبھی جب بھڑک اٹھی
ایوانِ تصوّرات کے جیسے سنور گئے

کس دل سے ان کو دیکھتے حیران و مضطرب
اچھا ہُوا کہ نالے میرے بے اثر گئے

ساحل ہی پر جنھوں نے ڈبوئی ہیں کشتیاں
وہ ناخدا ہمارے نہ جانے کدھر گئے

پہلے ہی کون سی تھیں بہاریں مرے لیے
تم اور زندگی میری ویران کر گئے

وہ کیف وہ سرور ملا ان کے درد میں
ممتاز عارضِ رخِ ہستی نکھر گئے

○

مرے نالوں میں اتنا تو اثر ہے
شبِ غم ہے مگر کچھ مختصر ہے

امیدیں لائے تھے غم لے کے اُٹھے
یہ رودادِ حیات مختصر ہے

اسیروں کو رہائی مل رہی ہے
مگر شرطِ شکستِ بال و پر ہے

وہ راہیں جن کو سونا کر گئے تھے
ان ہی پہ آج تک میری نظر ہے

جہاں تم ہو وہاں ہیں لالہ و گُل
جہاں ہم ہیں وہاں برق و شرر ہے

بدل ڈالا ہے جس نے میرا عالم
کسی کی اک نگاہِ مختصر ہے

الٰہی خیر میرے آشیاں کی
صبا کے ساتھ پھر موجِ شرر ہے

شاذ تمکنت

وہ نیاز و ناز کے مرحلے نگہ و سخن سے چلے گئے
ترے رنگ و بُو کے وہ قافلے ترے پیرہن سے چلے گئے

کوئی آس ہے نہ ہراس ہے شبِ ماہ کتنی اُداس ہے
وہ جو رنگ رنگ کے عکس تھے وہ کرن کرن سے چلے گئے

کوئی اُن کی آنکھیں سراہتا کوئی وحشتوں سے نباہتا
کہ وہ آہوانِ رمیدہ خُو یہ شناختن سے چلے گئے

کئی مہر و مہ اُتر آئے تھے وہ یہیں تھے میرے گھر آئے تھے
وہ کلی کلی سے در آئے وہ چمن چمن سے چلے گئے

مرے دل کی آب و ہوا لگی کہ وفا بھی اُن کو خطا لگی
وہی سادگی سے جو آئے تھے وہی بانکپن سے چلے گئے

نہ تو کفر کے نہ خدا کے ہم نہ دُعا کے ہم نہ دوا کے ہم
کہ بتانِ کعبۂ آرزو دلِ برہمن سے چلے گئے

یہ مرا فریبِ نظر نہیں مرے ہم قدم تھے یہیں کہیں
مجھے آہٹیں بھی نہ مل سکیں وہ بڑے جتن سے چلے گئے

یہ بجا کہ تحفۂ جاں لیے ترے پاس آئے تھے بے پئے
وہ گدا گرانِ تہی سبُو ترے حسنِ ظن سے چلے گئے

یہی تجھ سے اپنا تھا واسطہ یہی تھی حیاتِ معاشقہ
تری خلوتوں کے شریک تھے تری انجمن سے چلے گئے

پسِ عمر بازوئے شوق پر سرِ ناز تھا تو ہوئی خبر
کئی رُت جگے ترے گیسوؤں کی شکن شکن سے چلے گئے

وہ بجھے وہ لُٹے لُٹے سرِ راہ شاذ ملے تو تھے
انھیں اب وطن میں نہ ڈھونڈیے وہ اب وطن سے چلے گئے

علی احمد جلیلی

○

فریبِ جادہ کا دینے والے کچھ اور اندھیرا بڑھا رہے ہیں
دیے جلانا تو دور ٹھہرا، دیے سلگتے بجھا رہے ہیں

نشاطِ امروز اپنا ایماں ہے کفر اندیشہ ہائے فردا
یہ کہہ دو غم سے دھوکہ نہ آئے کہ ہم ابھی مسکرا رہے ہیں

وفا کی راہوں میں چلنے والے یہ کھیل کھیلیں گے کیا خبر تھی
جو تھامتے تھے ہمارا دامن، ہمیں سے دامن بچا رہے ہیں

ہم اہلِ ہمت کے واسطے ہیں بہت مقاماتِ آزمائش
جہاں گری تھی چمن میں بجلی، وہیں نشیمن بنا رہے ہیں

جہاں حوادث ہوئے مقابل وہیں یہ ہمت جواں ہوئی ہے
جہاں کہیں مل گئے سہارے، وہیں قدم ڈگمگا رہے ہیں

سحر کی تعمیر کرنے والے سحر کی تعمیر کر چکے بھی
مگر کچھ ایسے بھی ہیں جو اب تک چراغ کی لو بڑھا رہے ہیں

جہاں نہ عارض کی چاندنی ہے جہاں نہ سائے ہیں گیسوؤں کے
علی کچھ ایسے ہی موڑ اب تو غزل کی راہوں میں آ رہے ہیں

○

آ کے ہونٹوں پہ اُن کے ہنسی رہ گئی
شاخِ گل پر لچک کر کلی رہ گئی

ہم تو کر آئے طے راہِ دار و رسن
کون جانے کہاں زندگی رہ گئی

اشک پلکوں پہ آ کر زباں بن گئے
لے کے اپنا سا منہ خامشی رہ گئی

ہم نے بڑھ کر تبسم کے گل چن لیے
فصلِ گل دور سے دیکھتی رہ گئی

آنکھ چھلکی نہ رسوائی کے خوف سے
یہ صراحی بھری کی بھری رہ گئی

ہم تو چپ ہی رہے کہہ گئی خامشی
کام بھی بن گیا، بات بھی رہ گئی

کوئی ساغر نہ پہنچا مرے ظرف تک
تشنگی حاصلِ تشنگی رہ گئی

لاکھ پونچھے بہاروں نے آنسو مگر
کچھ خزاں کی نمی اے علی رہ گئی

○

فضا ابن فیضی

زخموں کی یہ بہار یہ اشکوں کی چاندنی — میرے سوا نہیں ہے کوئی حسن دیدنی

اخلاص بھی گریز، مروّت بھی دشمنی — غربت میں کوئی چھاؤں بھی ہوتی نہیں گھنی

پی کر نہ رہ سکے حدِ آدابِ غم میں لوگ — میری ہی پیاس آبروئے میکدہ بنی

ہم لُٹ کے عشق میں ہوئے سرمایہ دارِ درد — اللہ رے اُس نگاہ کی معصوم رہزنی

چھوڑ آئے آج حوصلۂ گفتگو کہاں — کل تیری انجمن میں جو باتوں کے تھے دھنی

ہونے لگا جو کم غمِ دوراں کا التفات — ہم نے خود اپنے آپ پہ کی ناوک افگنی

آنسو بنا کے ضبطِ غم اس کو بھی پی گیا — لے دے کے ایک حرفِ تمنّا تھا گفتنی

کن تلخیوں میں گھل گئی اے شاہدِ حیات — رُخ کی تہ سے مٹھاس ترے لب کی چاشنی

یوں تیری آرزو ہے دلوں میں بسی ہوئی — سوتی ہے جیسے کنج میں پھولوں کے چاندنی

مانا کہ غم کی دھوپ ہے تیز اور سفر طویل — مل جائے گی کہیں نہ کہیں چھاؤں بھی گھنی

اے اہلِ دل! سلیقۂ بادِ صبا ہے شرط — وہ غنچۂ طلسمِ قبا ہے شگفتنی

چاہے جہاں سے چھیڑ دو، بجنے لگیں گے ساز — سر تا قدم وہ حسنِ مجسّم ہے راگنی

اُف رے فروغِ طبع کی رسوائیاں فضاؔ
پی جائے کوئی میرے چراغوں کی روشنی

چراغِ طور

عیش ٹونکی

مے کدے کے بام و در پر کس بلا کا نور ہے
یہ مرا ساغر ہے روشن یا چراغِ طور ہے

ذوقِ ایمن ہے نہ دل میں آرزوئے طور ہے
ان کا دیوانہ تو ہر منزل سے کوسوں دور ہے

آپ کی مرضی سے ہو سکتا ہے کس کو اختلاف
آپ جو دستور فرمادیں وہی دستور ہے

جانبِ اربابِ غم چشمِ حقارت سے نہ دیکھ!
ان میں جو بھی ہے حریفِ قیصر و فغفور ہے

بے ضرورت آپ کیوں فکرِ مے و ساغر کریں
مے کدے کا مے کدہ اب بے پئے مسرور ہے

ہر نفس ہے اک نویدِ مستی و کیف و نشاط
یہ بہشتِ دل میں اُن کی یاد ہے یا حُور ہے

جستجوئے شوق ہے محرومِ ادراک اس قدر
ہر زباں پر آج تک ذکرِ قریب و دور ہے

اے غمِ دوراں پریشاں کر نہ اتنا عیش کو
شہر میں اک شخص ان کے نام سے مشہور ہے

بشیر بدر

○

نی اُداس بینا کے سب تار کس گئے
ارش ہوئی کہ درد کے نغمے برس گئے

وجھل اُداس رات تھی دونوں دلوں کے بیچ
م مسکرا دیے تو اُجالے برس گئے

دھرتی کی خشک آنکھوں میں رتیلی دھول ہے
اب کے تو بوند بوند کو دریا ترس گئے

یوں حال پوچھتے ہو کسی گلعذار کا
وہ لُو چلی ہے اب کے کہ پتھر جھلس گئے

ب ہر طرف دھواں ہے سلگتی حیات کا
باتوں میں رس نہیں رہا، ہاتھوں کے جس گئے

آنگن میں چُپ اداس چنبیلی کے سائے ہیں
وہ گنگناتے چاند کہیں اور بس گئے

سادہ ورق اُداس ہے نغموں کے نرم خواب
تتلی کی طرح اُڑ گئے پھولوں میں بس گئے

○

نہ جی بھر کے دیکھا، نہ کچھ بات کی
بڑی آرزو تھی، ملاقات کی

شبِ ہجر تک کو یہ تشویش ہے
مسافر نے جانے کہاں رات کی

مقدر مری چشمِ پُرآب کا
برستی ہوئی رات برسات کی

اُجالوں کی پریاں نہانے لگیں
ندی گنگنائی، خیالات کی

میں چُپ تھا تو چلتی ہوا رُک گئی
زباں سب سمجھتے ہیں جذبات کی

کئی سال سے کچھ خبر ہی نہیں
کہاں دن گزارا، کہاں رات کی

شفقت کاظمی

○

یوں ختم کر چکے وہ رہ و رسمِ دوستی
جیسے ہم اُن کو یاد نہ آئیں گے پھر کبھی

دو دن کی زندگی میں اُٹھائے ہزار غم
دو دن کی زندگی بھی ہمیں خوش نہ آ سکی

تم نے تو خیر ایک نظر کا زیاں کیا
قسمت کسی غریب کی لیکن سنور گئی

رہتے ہوئے اگرچہ زمانہ گزر گیا
ہم لوگ تیرے شہر میں اب تک ہیں اجنبی

بیٹھے ہیں تھک کے راہ میں درماندگانِ شوق
باوصفِ جستجو تری منزل نہ مل سکی

گزرا ہوں جب کبھی کسی پُرہول دشت سے
تصویر اپنے گھر کی نگاہوں میں پھر گئی

جب سے نظر پڑی ہے خطِ سرنوشت پر
شفقتؔ کسی سے ہم کو شکایت نہیں رہی

○

دلچسپ سہی مرا فسانہ
دہرائے گا تا بہ کے زمانہ

ساتھی مرے جس طرف سدھائے
میں بھی ہوں اُسی طرف روانہ

ہم اپنی روش بدل نہ پائے
ہر چند حریف تھا زمانہ

ملتے ہی بچھڑ گئے وہ ہم سے
ترتیب نہ پا سکا فسانہ

نیند آئی ہے تیرے دل جلوں کو
یہ بھی نہ ہو موت کا بہانہ

ہم اُن کے سوا نہ تھے کسی کے
اتنا بھی نہ دوستوں نے جانا

لگتا نہیں جی وطن میں شفقتؔ
ڈھونڈھیں کہیں اور اب ٹھکانا

آخری رات

مظہر امام

یہ رات کتنی حسیں ہے، کہ تیرے دامن میں — چمن کے پھول بھی ہیں، آسماں کے تارے بھی
شراب خانۂ ہستی میں رقص فرما ہیں — نگاہِ ناز کے بہکے ہوئے اشارے بھی

سحر کے گیت جو گائے تھے بارہا ہم نے — وہ گیت آج ہمارے نہیں، پرائے ہیں
جہاں تصورِ شاداب مسکراتا تھا — وہیں پہ رُوح کی ویرانیوں کے سائے ہیں!

مگر سحر سے غرض کیا، یہ شب مبارک ہے — چلیں، عروسِ قمر کا پیام لے آئیں
شعاعِ حسن سے فانوسِ دل کریں روشن — گلوں کے ہاتھ سے نکہت کے جام لے آئیں

سحر کا نام نہ لے، رات کتنی شیریں ہے! — یہ رات تیری جوانی کو سازگار آئے
دیارِ خواب سے مہتاب زادیاں اُتریں — جہانِ فکر و نظر کو جنوں سنوار آئے

یہ رات وہ ہے جو پہلے کبھی نہ آئی تھی
خدا کرے یہ حسیں رات جاوداں ہو جائے
تری بہار رہے زندگی کی راہوں میں
یہ رات تیری محبت کی داستاں ہو جائے

نعیم صدیقی

دل پوچھتا پھرا سرِ بازارِ زندگی
کس سے ملے گا دارُوئے آزارِ زندگی

آؤ انھیں کے سائے میں ٹھہرائیں غم ہٹیں
نعشیں لٹک رہی ہیں سرِ دارِ زندگی

دیکھا ہے گاہے موت کے پیکر میں جلوہ گر
جنگاہ میں نگارِ طرحدارِ زندگی

سب کچھ لٹا کے کچھ بھی تو پلّے نہیں پڑا
دل بیچ کر بنے تھے خریدارِ زندگی

اے صاحبِ عدالتِ عقبیٰ! ہے اعتراف
کچھ دن رہے تھے ہم بھی خطاوارِ زندگی

شکرِ عطا ترا، مگر اے خالقِ حیات
کس روز ہم ہوئے تھے طلبگارِ زندگی

ہوتا نہ نور و نار کا اس میں اگر شمول
اک مشتِ خاک کب تھی سزاوارِ زندگی

خود مسترد کیے تھے گل و لالہ و سمن
خود ہی پسند کی خلشِ خارِ زندگی

رنگیں کھلونے بکتے ہیں یاں پر بہ عوضِ دل
لو، آؤ، دیکھو! گرمیٔ بازارِ زندگی

خوں ریز و فتنہ خیز و سراپا ستیز ہے
یارب! یہی تو ہے ترا شہکارِ زندگی

کارِ شہنشہی بھی ہے گرد اس کے سامنے
یارو! ہمارے بس کا نہیں کارِ زندگی

نسلیں کی نسلیں پھوڑ چکیں اس سے اپنا سر
اب تک محیطِ قلب ہے دیوارِ زندگی

ہم عمر کاٹ کر اٹھے تھے بزمِ حیات سے
اب اٹھ رہا ہے پردۂ اسرارِ زندگی

آپ اٹھ گئے تو وقت ہوا کتنا سست گام
آپ آ گئے تو بڑھ گئی رفتارِ زندگی

قائم ہوئی اصولِ شہادت پہ کائنات
ہے زندگی کے واسطے ایثارِ زندگی

ہنستے ہوئے امیر کہ روتے ہوئے غریب
دیکھے ہیں قسم قسم کے بیمارِ زندگی

یہ علم کے چراغ! یہ دانش کی مشعلیں
روشن ہوئی نہ پھر بھی شبِ تارِ زندگی

اسبابِ زندگی میں جو دارا مقام تھے
نکلے وہی جہان میں نادارِ زندگی

نے حاجتِ قفس، نہ ہے درکار کوئی دام
ہم تو ازل سے ہیں ہی گرفتارِ زندگی

جو کچھ بھی زندگی کہے تسلیم کیجیے
لٹکی ہوئی سروں پہ ہے تلوارِ زندگی

ہر کوئی ہانپتا ہوا بڑھتا ہے گام گام
ہر کوئی ہے اٹھائے ہوئے بارِ زندگی

آبادیاں اجاڑ سکیں جو تباہ کار
ایسے ہی لوگ بنتے ہیں معمارِ زندگی

فطرت کی شاعری میں بڑا حسن ہے مگر
کھٹکی ہمیشہ ذوق کو تکرارِ زندگی

آتی ہے پیچھے پیچھے دبے پاؤں موت بھی
ہے سامنے درندۂ خونخوارِ زندگی

اک دردِ تہ نشین، دلِ بے امیدِ شوق
باقی نہیں اور کچھ آثارِ زندگی

انساں کو تضاد کا چسکا ہوا ہے، لوگ
شیدائے زندگی بھی ہیں بیزارِ زندگی

ایسے ہی لوگ بچ سکے نیشِ حیات سے
جو زہر پی کے رہتے ہیں سرشارِ زندگی

جس کی ہر اک نظر ہوئی میزانِ قول و فعل
یثرب میں مل گیا ہے مجھے معیارِ زندگی

کرم حیدری

جو لوگ خاکِ دشتِ وفا چھانتے نہیں — لیلائے زندگی کو وہ پہچانتے نہیں

ہم ہیں کہ ہے ہماری یہی کچھ متاعِ شوق — وہ ہیں کہ قدر و قیمتِ دل جانتے نہیں

غم کس طرح ہو کم جو ملیں ایسے غمگسار — غم کی نزاکتوں کو جو پہچانتے نہیں

واعظ! خطا معاف کہ رندانِ میکدہ — دل کے سوا کسی کا کہا مانتے نہیں

وہ بُت جنھیں دیا تھا ہمیں نے شعورِ حُسن — ملتے ہیں اب تو ایسے کہ پہچانتے نہیں

طوفانِ برق و باد میں اُن سرپھروں کی خیر — جو ناخُدا کو اپنا خُدا جانتے نہیں

ہم پر یہی ہے وجہِ عتابِ بُتاں، کہ ہم — اُن کی جفا کو اپنی خطا مانتے نہیں

ہے رند و محتسب میں تو روزِ ازل سے بَیر — اے اہلِ شہر اتنا بھی تم جانتے نہیں

اتنا تو جانتے ہیں کہ ہم ہیں شہیدِ ناز — قاتل کی پوچھتے ہو تو ہم جانتے نہیں

اب تو یہی بہت ہے ہمارے لیے کرمؔ
وہ لائقِ سزا ہمیں گردانتے نہیں

بے چہرگی

پروین شاہدی

ہزار پوست استخواں،
ہزار لب فسردگی،
ہزار پردہ تشنگی،
ہزار شاخِ بے دلی،
ہزار عشوہ خودسری،
ہزار غمزہ عاجزی،
ہزار پیچ آگہی،
ہزار عقدہ ابلہی،
ہزار لہجہ خامشی،
ہزار مرگ زندگی،
غرورِ برتری کے ساتھ اختلاجِ کمتری!
یہ ریزہ ریزہ آدمی!
یہ پارہ پارہ آدمی!
ہزار چہرہ آدمی!
معاشیاتِ حرص کا اُبھرتا خلفشار ہے —
— مجسم انتشار ہے —
نظامِ بے مہار کا عظیم شاہکار ہے!
ہزار چہرہ آدمی،
خود اپنا چہرہ ڈھونڈتا
رواں دواں،
ابھی یہاں،
ابھی وہاں!

نہ کوئی سمت ذہن میں
نہ کوئی راہ سامنے!
فقط فریب کاریٔ انا کی گرد اوڑھ کر
کبھی ہے دوڑتا اِدھر،
کبھی ہے بھاگتا اُدھر!
ہو کون اس کا ہم سفر؟
خود اس کے چہروں کے ہجوم میں جو چہرہ کھو گیا،
دوبارہ وہ ملے گا کیا؟
تعاونِ آئینہ کا بھی فریب ہی فریب ہے!
نظر لگا کے غوطہ کیا کہ آئینہ اتھاہ ہے
خود اپنے چہروں کا ہجوم درطۂ نگاہ ہے!
نہ کوئی نقشِ منفرد،
نہ کوئی عکس معتبر!
ہزار چہرہ آدمی،
ہزار چہرگی لیے
بھٹک رہا ہے بے ارادہ صرف اسی تلاش میں
کہ اس کو....
چہرہ چاہیے —
خود اپنا چہرہ چاہیے —
وہ اصلی چہرہ چاہیے
بچھڑ کے جو سسک رہا ہے چہروں ہی کی بھیڑ میں

زندگی، موت، زندگی

جمیل ملک

زماں سے اُس پار زندگی بحرِ بیکراں تھی، رواں دواں تھی
مکاں سے اُس پار وقت کی کوئی ابتدا تھی نہ انتہا تھی
اچھلتی موجوں کے ساتھ رقصاں تھی روح میری
زماں کی لہروں کا سلسلہ تھا وجود میرا
تو وہ ہے کہ میرے پیکر میں تو نے لذت کا بیج بویا — !
گروہ در گروہ میرے سینے میں تو نے نفرت کی آگ بھر دی — !!
تلاطم موجوں نے مجھ کو ساحل پہ آن ٹپکا
مکاں کے زنداں کا مجھ کو قیدی بنا کے چھوڑا

میں زندگی سے بچھڑ گیا ہوں
جسے یہاں لوگ زندگی کہہ رہے ہیں وہ موت کا ستم ہے
یہ کیسے انسان ہیں جو دولت پہ مر مٹے ہیں
فریب زندگی کا حاصل سمجھ رہے ہیں — !
یہ کیسے انسان ہیں جو شہرت کی دُھن میں
گمنام، تیرہ و تار، تنگ راہوں پہ چل رہے ہیں — !
یہ کیسے انسان ہیں جو "انسان" سے بے خبر
اپنے اپنے خوابوں کے تاج محلوں میں دفن ہیں
زندگی پہ احسان کر رہے ہیں — !
یہ زندگی، زندگی نہیں ہے
یہ موت ہے اور یہ موت آغازِ زندگی ہے

میں موت سے ہمکنار ہوں
آج پھر اسی زندگی کی صورت اُبھر رہا ہوں
جو کل ازل سے اُدھر مرے ساتھ رقص فرما تھی
اور اب
دور، ابد کے اُس پار ہاتھ اٹھائے کھڑی ہے
جیسے مجھی کو آواز دے رہی ہو
میں آ رہا ہوں ——— میں آ رہا ہوں

○

یوسف جمال انصاری

یک گونہ بے خودی بھی کہاں ہے شراب میں
صدیوں کے غم ہیں تلخیٔ صہبائے ناب میں

پیتا ہوں میں تو آپ میں آنے کے واسطے
کم ظرف نشہ ڈھونڈ رہے ہیں شراب میں

جو چاہیے تھا اُس کی تو کچھ اور بات ہے
اچھی گزر رہی ہے جہانِ خراب میں

شہرِ جنوں کی خاک اُڑانے سے کام ہے
تسکین کی طلب ہی کسے اضطراب میں

دل کے لیے ہو دل سے سوا بے وفا کوئی
تم کیوں سما گئے نگہِ انتخاب میں

کچھ تو جمود ٹوٹے، ذرا تو ہوا چلے
بیٹھا ہوں کب سے رہ گزرِ انقلاب میں

ہچکی لگی ہوئی ہے نسیمِ بہار کو
حیران آنکھ جاگ رہی ہے گلاب میں

اِس جبرِ زیست میں ہوسِ چشم و لب کسے
اب میں اُنھیں لکھوں تو لکھوں کیا جواب میں

الفاظ گرد کو بھی نہ پہنچیں خیال کی
لیکن کہاں خیال میں جو کچھ ہے خواب میں

○

انوار انجم

میری بستی میں جو سورج کبھی اترا ہوتا
میں بدن ہوتا ترا، تُو مرا سایا ہوتا

کس کی بے مہرادائی سے ہمیں شکوا ہوتا
ہم کسی کے نہ ہوئے کون ہمارا ہوتا

جان پرکھیل کے میں راہِ وفا طے کرتا
اُس کی جانب سے مگر کچھ تو اِشارا ہوتا

دل کا احسان ہے جو بجھ گیا خود ہی، ورنہ
جانے میں کس کو کہاں ڈھونڈنے نکلا ہوتا

اُس کو پانے کی تو حسرت ہے اُسے پاکر بھی
کس کو معلوم ہے دل یونہی اکیلا ہوتا

دور سے کھینچتا رہتا ہے جو تصویر مری
کاش اُس نے کبھی نزدیک سے دیکھا ہوتا

سن کے یاروں کے الم سوچتا رہتا ہوں کہ میں
کیسے جیتا جو ترا پیار بھی جھوٹا ہوتا

میرے عیبوں میں ہے شامل مری مجبوری بھی
میں بھی انسان نہ ہوتا تو فرشتہ ہوتا

تم نہ آئے کبھی نزدیک تو اچھا ہی کیا
لوگ ناداں ہیں یونہی شہر میں چرچا ہوتا

دنیا داری میں پڑے ہوتے جو تم بھی انجم
دل بھی خوش رہتا سدا، نام بھی اُونچا ہوتا

رفعت سلطان

جس بے درد نے ساری عمر نہ بھول کے ہم کو یاد کیا
دُور سے اُس کو دیکھ کے ہم نے اپنے دل کو شاد کیا

خاک میں اپنی آن ملا کر ہم نہ کسی کے در پہ گئے
عظمتِ عشق کی خاطر لیکن دل کا نگر برباد کیا

تجھ سے بچھڑ کر اب تک زندہ ہیں، لیکن یہ بات نہ پوچھو
دُنیا والوں نے ہم کو ناشاد کیا یا شاد کیا

سب سے پہلے تیری بزمِ طرب میں جھُوم کے آئیں گے
قسمت نے غم کے زنداں سے جب ہم کو آزاد کیا

زندہ رہ کر شیریں کو حاصل کرتے تو بات بھی تھی
عشق میں جان گنوائی یہ کیا تم نے اے فرہاد کیا

کیا جانے وہ کون تھا یہ معلوم نہیں مجھ کو رفعت
جس کی ایک نظر نے دل کی دُنیا کو آباد کیا

لہ

○

اختر ہوشیارپوری

قدم قدم پر ساتھ دیا ہے قدم قدم اب ساتھ رہو
ہاتھ چھڑا کر جانے والو یہ جو نہیں تو لوٹ چلو

ایسی بھی خاموشی کیا دیواروں تک کو سکتہ ہے
دیواریں بھی بول اٹھیں گی مجھ کو تم آواز تو دو

جاتے جاتے اس نے بیشک سارے گھر کی باتیں کیں
مجھ کو بھی اس نے یاد کیا تھا؟ میرے عزیزو! کچھ تو کہو

عالمِ رخصت کیا کہیے وہ جانِ جدائی سامنے ہے
دل والو اے دل والو کیا میری صورت تکتے ہو

دادِ وفا ارمانِ وفا پیمانِ وفا سب خاک ہوئے
آئینہ آسا بیٹھا ہوں اب کوئی مجھ کو اٹھائے تو

روٹھ کر روٹھ ستاتا ہے کس کو پکاروں کس سے ملوں
منہ کو چھپائے جانے والو ساتھ مجھے بھی لیتے چلو

کل جو حقیقت حسنِ نظر تھی آج وہ خواب کی باتیں ہیں
خواب کی بزم سجانے والو مجھ سے بھی پوچھو کیسے ہو؟

آنکھیں ویراں دامن خالی دستِ طلب ہیں گردِ طلب
عمرِ گریزاں! عمرِ گریزاں! مجھ سے لپٹ اور مجھ پر رو

شب جو کٹی تو نورِ کفن اور دن کا اجالا ایک سے
صبح کا جلوہ دیکھنے والو کس نے کہا تھا صبح بھی ہو

راہِ حیات میں مرگِ رفاقت جشنِ جدائی ہوتا ہے
لو وہ اٹھی ہے دل کی میت تم بھی اختر کاندھا دو

○

مہرِ طلب کو شب کی لحد میں اتار کے
حیراں کھڑا ہوں دولتِ امید ہار کے

منزل کہاں کی رستہ کہاں کا چراغ کیا
اب میں ہوں اور فاصلے گرد و غبار کے

اے ہم نشینو تم ہی صدا دے سکو تو دو
مایوس ہو گیا ہوں میں اس کو پکار کے

دامن میں تھا جو پھول فضا میں بکھر گیا
اب مجھ سے اٹھ سکیں گے نہ احساں بہار کے

راتوں کی ظلمتیں دل و جاں میں اتر گئیں
آنکھوں میں جل اٹھے ہیں چراغ انتظار کے

میں خواب میں تھا اور مری دنیا اجڑ گئی
بیتا کہ دن گئے مرے صبر و قرار کے

مجھ سے ملو کہ پھر نہ مجھے دیکھ پاؤ گے
زندہ ہیں مجھ سے معجزے شب ہائے تار کے

مجھ سے نہ پوچھیے مرے اشکوں سے پوچھیے
اختر جو رنگ چھلکے ہیں لیل و نہار کے

○

اختر انصاری (اکبرآبادی)

ہم اہلِ شوق تماشائے رنگ و بو کرتے
گزر رہے ہیں شگوفوں سے گفتگو کرتے

جہانِ جہد و عمل میں نہ آ گئے ہوتے
تو قصدِ شہرِ نگارانِ خوبرو کرتے

ادا شناسِ جنوں مل گئے ہمیں ورنہ
زباں سے اپنی ہم اظہارِ آرزو کرتے

اگر زمیں کے ذرّے پکارتے نہ ہمیں
تو آسماں کے ستاروں سے گفتگو کرتے

کبھی جو عقل کے بندوں کو ہوش آ جاتا
خیالِ بندگیٔ ساغر و سبو کرتے!

بقدرِ ظرف خرابات میں جو مل جاتی
گلوں کی طرح نہ شبنم سے ہم وضو کرتے

جھلک خلوص کی ملتی جو تیری نظروں میں
تو ہم بھی شوق میں کچھ شرحِ آرزو کرتے

گلوں کے ناز اُٹھانے پڑیں گے اے اختر
ہم آ گئے ہیں تمنائے رنگ و بو کرتے

دل محمد فضا

○

نہ جانے کیوں مجھے یادِ چمن ستاتی ہے — کہ عمر یوں بھی تو آخر گزر ہی جاتی ہے

...نے جب سے اٹھائے ہیں پردۂ اسرار — حیات اپنے مقدر پہ مسکراتی ہے

...پڑتی ہے محرومیِ مسلسل پہ — ہنسی فریبِ تمنا پہ آ ہی جاتی ہے

...ب جو میرے خیالوں سے دشمنی کیوں ہو — کچھ اس میں آپ کی مرضی بھی پائی جاتی ہے

...ں تک آ کے تو پہنچا گئی ہوائے بہار — اب آگے دیکھیے تقدیر کیا دکھاتی ہے

...چھلی رات یہ موجِ سکوں یہ نرم ہوا — تمھاری یاد مجھے بار بار آتی ہے

...سی کی برقِ نظر سوزِ دل کا عنواں ہے — یہ آگ خود نہیں لگتی لگائی جاتی ہے

...دیثِ عشرتِ ماضی ندیم مجھ سے نہ سن — فسانہ ہے جسے سنیے تو نیند آتی ہے

...راب عشق میں کم ملے ہے کیف آزاد — یہ مجھ سے پوچھو مرا تجربہ یہ ذاتی ہے

...گرچہ کرتا ہوں کوشش میں بھول جانے کی — تمھاری یادِ حسیں پھر بھی آ ہی جاتی ہے

مآلِ عشرتِ دوراں سے بے خبر ہوں فضاؔ
مجھے گلوں کی جوانی لہو رلاتی ہے

○

لے کے آئی ہے صبا باغ سے پیغام ابھی
خشک کلیوں کے لبوں پر ہے مرا نام ابھی

اپنی گستاخ نگاہی کا تو اندازہ کر
حسن معصوم نہیں موردِ الزام ابھی

گوشۂ دل میں تمنائیں جو تھیں جونک اٹھیں
چپکے چپکے سے لیا کس نے مرا نام ابھی

بارہا دیکھ چکے جلوۂ حسنِ دلکش
آنکھ ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

او مری تیرگیِ بخت پہ ہنسنے والے
تو نے دیکھی ہی نہیں گردشِ ایام ابھی

یاد آتے ہی بدل جاتا ہے ماحول تمام
دل دھڑکتا ہے جو لیتا ہوں ترا نام ابھی

تیرے جلوؤں سے ہے رنگیں مری صبحِ امید
ترے گیسو سے مہکتی ہے مری شام ابھی

منکشف جن سے ہوں اسرارِ شبستانِ حیات
ان عناصر کو بشر کر نہ سکا رام ابھی

گو ہوں آغازِ محبت سے گرفتارِ الم
دل میں پنہاں ہے فضاؔ کاوشِ انجام ابھی

مضطر اکبر آبادی

کیا جانے یہ چاند رات کیا ہے
سویا ہوا درد جاگ اُٹھا ہے

یادوں کے لپک رہے ہیں شعلے
زخموں کا چمن کھلا ہوا ہے

ہر زخم سے پھوٹتی ہیں کرنیں
ہر داغ چراغ بن گیا ہے

تم دھوپ کی بات کر رہے ہو
سایہ بھی یہاں سُلگ رہا ہے

حائل ہے کچھ اِس طرح زمانہ
جو بات ہے دور کی صدا ہے

اب دل ہے کسی چراغ کی لَو
ہر سانس کے ساتھ کانپتا ہے

سینے میں ہر ایک سانس مضطر
تلوار کی دھار بن گیا ہے

ضمیر اظہر

○

دیوانگی میں کیا ہیں صحرا ہی جانتا ہے
خوشبو ہیں یا ہوا ہیں صحرا ہی جانتا ہے

بکھرے تو ابر بن کر پھیلے ہیں وسعتوں میں
سمٹے تو نقشِ پا ہیں صحرا ہی جانتا ہے

بہہ جاتے ہیں ہمہ تن کیا جانے کس لگن میں
اُمڈی ہوئی گھٹا ہیں صحرا ہی جانتا ہے

چلتے ہیں سر کے بل پر ریگِ رواں کی صورت
کس شوق میں فنا ہیں صحرا ہی جانتا ہے

رہتا نہیں ٹھکانہ اپنا کسی بھی جانب
ہر حد سے ماورا ہیں صحرا ہی جانتا ہے

تاروں کو ہم نے روندا پائے جنوں سے شب بھر
مہتاب کی قبا ہیں صحرا ہی جانتا ہے

کرتے ہیں رقص پیہم رقصِ صبا کی مانند
خود اپنی ہم ادا ہیں صحرا ہی جانتا ہے

لینا ہے کیا کسی سے ہم دل جلوں نے اظہر
دنیا میں کیوں ہیں، کیا ہیں صحرا ہی جانتا ہے

○

کیا لگ گیا ہے روگ کہ ہم بولتے نہیں
حیراں ہیں سارے لوگ کہ ہم بولتے نہیں

مدت سے انتظار ہے اک غمگسار کا
یہ بھی ہے کیسا سوگ کہ ہم بولتے نہیں

بس ایک دُھن ہے ایک ہی لو ہے لگی ہوئی
کیا لے لیا ہے جوگ کہ ہم بولتے نہیں

سادہ مزاج، سادہ زباں، سادہ دل ہے
ہے سادگی کا روگ کہ ہم بولتے نہیں

کوئی تو کاش صورتِ درماں نکالتا
چپ ہیں تمام لوگ کہ ہم بولتے نہیں

اظہر ہمیں بھی اب تو خبر کچھ نہیں رہی
کس بات کا ہے سوگ کہ ہم بولتے نہیں

اِمتحان

احمد وصی

نہ کوئی دوست، نہ یاور، نہ برادر، نہ عزیز
کون نصرت کو بڑھے، جان نچھاور کرنے
کون مظلوم کی آواز پہ لبیک کہے
کون نیزوں کی ہر اک نوک پہ سینے رکھ دے
کون تلواروں کے سائے میں گلے کٹوائے
موت کی سنت میں پڑھے کون محبت کی نماز
کون ہر ظلم کی ہر پیاس بجھانے کے لیے
خود تو پیاسا رہے خنجر کی زباں تر کر دے
زیست کے دشت میں اس کرب و بلا کے بن میں
زیرِ خنجر تنِ تنہا ہے، اکیلا ہے حسینؑ

ہر طرف صرف جفا کار ہیں شمشیر بکف
ہر طرف صرف ستمگار ہیں تیر سے تانے
وقت کی دھوپ سے تپتی ہوئی مقتل کی زمیں
سامنے نظروں کے بہتی ہوئی خواہش کی فرات
جس کی موجوں سے اسے ایک بھی قطرہ نہ ملا
روح گھائل ہے کہ پیوست ہیں احساس کے تیر
سانس کی آمد و شد جیسے رواں ہے خنجر
اور ہر سمت سے بڑھ بڑھ کے تقاضوں کے یزید
اس سے کہتے ہیں مرے ہاتھ پہ بیعت کر لو"

محبوب اللہ مجیب

○

یارو بتاؤ چشمِ غزل خواں کا کیا ہوا؟
اب کے برس متاعِ دل و جاں کا کیا ہوا؟

تم بھی وہی ہو، ہم بھی وہی اور دل وہی
لیکن ترے خلوصِ فراواں کا کیا ہوا؟

ٹھنڈی ہوائیں، چاند ستاروں کے شہر میں
دیوانو! یہ بتاؤ گریباں کا کیا ہوا؟

ہم اہلِ دل کے واسطے کیا ہجر کیا وصال
لیکن حضور! آپ کے ارماں کا کیا ہوا؟

دیوانگی میں لمحۂ امید و بیم میں
اُٹھتے جو ہم تو تیرے شبستاں کا کیا ہوا؟

ہم سے ملے تو ایک زمانہ گزر گیا
راہِ طلب بتا! دلِ ناداں کا کیا ہوا؟

ہنستے ہوئے گزار دیے گرچہ روز و شب
لیکن مجیبؔ شورشِ پنہاں کا کیا ہوا؟

○

اسی کو آج یہ اتنی بڑی سزا دی ہے
کہ جس نے تیرے لیے خود کو بد دعا دی ہے

ہر ایک گام پہ چلتے ہوئے ہوا محسوس
کہ جیسے تم نے کسی سمت سے صدا دی ہے

جو اس طرف کو چلے جاں ہتھیلیوں پہ رکھے
کہ اُس نے آج سے شرطِ وفا بڑھا دی ہے

وہ رات جو کہ ترے جسم سے لپٹ کے کٹی
اُس ایک رات کو ہر رات نے دعا دی ہے

تصورات میں اُبھری ہے جب بھی وصل کی رات
تمھاری یاد نے پھر تشنگی بڑھا دی ہے

دھڑک اُٹھا ہے دلِ خانماں خراب مجیبؔ
کسی نے پھر ترے گیسو کی بات اٹھا دی ہے

رائگاں

مصحف اقبال توصیفی

کوئی یہ دیوار گرائے
ایک ہی خواہش
کب تک دل کو بہلائے گی
ایک ہی سپنا
کب تک راتوں کے صحرا میں بھٹکے گا
وہ اک اُڑتی خوشبو
جس کے پیچھے بھاگوں، ہات نہ آئے گی
گُم سُم سا اک کونے میں جا بیٹھوں گا
جب یاد کسی کی آئے گی

اس کا ہی دُکھ سہنے کو ہے
کیا یہ اتنا لمبا جیون —
اک آنسو میں بہنے کو ہے

○

زبیر رضوی

دل کے تار تار ہیں یادوں سے اب آہو بھی نہیں
آئینہ مانگیں جو ہم سے وہ پری رُو بھی نہیں
دشتِ تنہائی میں آواز کے گھنگھرو بھی نہیں
اور ایسا بھی کہ سنّاٹے کا جادو بھی نہیں
زندگی جن کی رفاقت پہ بہت نازاں تھی
ان سے بچھڑی تو کوئی آنکھ میں آنسو بھی نہیں
چاہتے ہیں رہِ مے خانہ نہ قدموں کو ملے
لیکن اس شوخیٔ رفتار پہ قابو بھی نہیں
تلخیاں نیم کے پتّوں کی ملی ہیں ھر سُو
یہ مرا شہر کسی پھُول کی خوشبو بھی نہیں
جانے کیا سوچ کے ہم رُک گئے ویرانوں میں
پرتوِ رُخ بھی نہیں سایۂ گیسو بھی نہیں
حسنِ امروز کو تشبیہوں میں تولیں کیسے
اب وہ پہلے سے خمِ کاکل وابرو بھی نہیں
بے حجاب ایسے کہ پہلو سے نہ ہٹ کر بیٹھیں
احتیاط ایسی کبھی ہم کو کہا تو بھی نہیں
ہم نے پائی ہے اُن اشعار پہ بھی داد زبیرؔ
جن میں اُس شوخ کی تعریف کے پہلو بھی نہیں

خواہش

انتخاب سید

زندگی

حادثاتِ جہاں سے لڑتی ہوئی
اپنے ماضی کے چہرے پہ جمتی ہوئی گرد کو دیکھتی
اپنی معصومیت کا جنازہ اٹھاتے ہوئے کانپتی
کتنی گستاخ نظروں کا مرکز بنی
کتنے بے باک جملوں کی زد سے
چراتی ہوئی اپنی آہستگی
رات دن کے مسلسل سفر سے پریشان ہے
چاہتی ہے کہ اب
مدتوں کی تھکن کا یہ بارِ گراں
وقت کو سونپ کر
خواہشوں، آرزوؤں، تمناؤں
کی آہٹوں سے پرے
آسمانوں پہ ابدی سکون کی ردا اوڑھ لے
دیوتاؤں کے پاکیزہ نقشِ قدم چوم لے
تاکہ پھر
جنگلوں میں بھٹکنے کا احساس جاتا رہے
موت کو پھر کلیجے لگانے کی خواہش نہ ہو!!

○

اختر لکھنوی

اب ہمیں نہیں ساقی لائقِ کرم تنہا
اور بھی ہیں تشنہ لب بس نہیں ہیں ہم تنہا

آنکھ پونچھ کر دیکھو ہر قدم پہ پاؤ گے
شہر میں نہیں تم ہی ایک چشمِ نم تنہا

ساتھ چلنے والے سب مسندوں پہ جا بیٹھے
کوچۂ عدو میں اب پھر رہے ہیں ہم تنہا

اپنے عہد سے پھرنا زندگی سے پھرنا ہے
ہم بلند رکھیں گے عہد کا علم تنہا

کچھ ہوئی تھی دشواری ابتدا میں لیکن اب
ہم گزار دیتے ہیں ہنس کے شامِ غم تنہا

وہ بھی اپنی قسمت تھی ساتھ ایک خلقت تھی
یہ بھی اپنی قسمت ہے ہیں قدم قدم تنہا

اپنا گلشنِ ہستی خود سنوار لیتے ہم
چھوڑتی اگر ان کی یاد کوئی دم تنہا

تم نے اس کو چاہا ہے ہم اسی کو چاہیں گے
سب غموں پہ بھاری ہے جس کا ایک غم تنہا

پارسا اگر مذہبی بن گئے تو غم کیسا
ہم رکھیں گے رندی کا دوستو بھرم تنہا

صف بنا کے آئے ہو سیف لے کے آئے ہو
یہ نہ بھولو کافی ہے صاحبِ قلم — تنہا

سوئے مقتل کوئی دم ساتھ چلے
جس کو رکھنا ہو بھرم ساتھ چلے

اسی حسرت میں کٹی راہِ حیات
کوئی دو چار قدم ساتھ چلے

اپنی چاہت کا یہ معیار رہا
ہم چلے ہیں تو صنم ساتھ چلے

روز ان کوچوں میں گل کھلتے ہیں
جن میں آپ اور کبھی ہم ساتھ چلے

خارزاروں میں جہاں کوئی نہ تھا
بن کے ہمدم ترے غم ساتھ چلے

ہم سے رندوں کا ٹھکانا کیا ہے
تم کہاں شیخِ حرم ساتھ چلے

داستانوں کی جلی ہیں شمعیں
ہمنوا جب بھی بہم ساتھ چلے

وادیٔ شب کی کٹھن راہوں میں
لوگ کترا گئے کم ساتھ چلے

کوئی پہنچا نہیں اس تک اختر
اس کے الطاف و ستم ساتھ چلے

بشیر منذر

○

نکلے تھے کیا سوچ کے دل میں دیوانے ویرانے سے
شہر کی گلیوں میں پھرتے ہیں بیگانے بیگانے سے

مجنوں کا قصہ جو چلا تو ہم پر آکر ختم ہوا
یونہی نکلتے ہیں دنیا میں، افسانے، افسانے سے

اپنی دھن میں ہم گزرے تھے دروازے کے آگے سے
قلقل کی آواز لگائی صہبا نے میخانے سے

شمع پر کیا بیت رہی ہے، یہ بھی تو معلوم کرو
پوچھ رہے ہو دل والو! کیا پروانے پروانے سے

پچھلی رات کو چاند کے سائے پیڑوں پر جب سوتے ہیں
خواب کئی بنتے ہیں ہم یادوں کے تانے بانے سے

یہ بھی کرم ہے ان کا منذر! یہ بھی ان کا احساں ہے
جتنے دکھ ملتے ہیں مجھ کو سب جانے پہچانے ہیں

○

حال جو کوئی دیکھے تڑپنے لگے
غیر بھی مجھ کو دنیا میں اپنے لگے

گرمئ عشق بھی، لیکن ایسی نہ تھی
دل سلگنے لگے، جسم تپنے لگے

اب تو پیغام ان تک پہنچ جائے گا
میرے نامے رسالوں میں چھپنے لگے

اس قدر اپنی مایوسیاں بڑھ گئیں
زندگی کے حقائق بھی سپنے لگے

عمر بھر جو ہمیں زخم دیتا رہا
ہم اسی شوخ کا نام جپنے لگے

دھیرے دھیرے وہ چلمن سرکنے لگے
میرے ارمان منذر! پنپنے لگے

کیف احمد صدیقی

○

زندگی زہر بھی، امرت سے بھری پیالی بھی
مادۂ عیش سے لبریز بھی ہے خالی بھی

میں نے اشکوں سے کبھی خون کی ہولی کھیلی
اور اشکوں سے منائی کبھی دیوالی بھی

دیوتا روٹھ کے گم ہو گئے کیا جانے کہاں
اور ٹھکرانے لگے پھولوں سے بھری تھالی بھی

لاکھ ہشیار سہی تیری جوانی لیکن
اثرِ کیفِ محبت سے ہے متوالی بھی

موسمِ گُل پہ مراحق بھی ہے گلشن والو!
سُرخیٔ گُل میں مرے خون کی ہے لالی بھی

کل مہکتی تھیں ہر اک شاخ پہ کلیاں لیکن
آج گلشن میں شگفتہ نہیں اک ڈالی بھی

یا مجھے کیف میسر تھے ہزاروں ساغر
یا میسر نہیں اک زہر بھری پیالی بھی

○

سیف زلفی

میں، کہ اک کچّا گھروندا ہوں بھری برسات میں
کون میرا ساتھ دے گا اس اندھیری رات میں
دل سے موجِ درد اُٹھے بھی، تو رو سکتا نہیں
ضبط کی دیوار حائل ہے مرے جذبات میں
میں یہ سمجھا تھا، مجھے کونین کا سُکھ مل گیا
جب دیا تھا تو نے اپنا ہاتھ میرے ہات میں
میں تجھے دل میں ہی رکھتا، اے مرے دل کی بہار
کیا خبر تھی، ہیں خزاں کے رنگ تیری گھات میں
یہ مری کڑیل جوانی، یہ ترے غم کا شباب
اک تلاطم کروٹیں لیتا ہے میری ذات میں
کاٹتا جاتا ہوں کڑیاں، بنتے جاتے ہیں حصار
میں بایں بُعدِ مسلسل قید ہوں حالات میں
تم سرشتِ غم کہو اس کو کہ سوزِ آگہی ـــ
ہم دکھوں کا ذکر کرتے ہیں خوشی کی بات میں
میں جو اُبھروں گا، تو جاگ اُٹھے گی ساری کائنات
چلتے چلتے آ گرا ہوں چشمۂ ظلمات میں
زہرِ غم ہوتا نہ کیوں تریاق، زلفی کے لیے
پھول بن جاتے ہیں انگارے نفِ ساوات میں

○

سید تابش

یوں دل کو روشنی ترا عکسِ جمال دے
شاعر ادب کو جیسے اچھوتا خیال دے

وہ پیاس ہے جو حلق میں کانٹے بھی ڈال دے
اب کوئی بڑھ کے جامِ فضا میں اچھال دے

شہرِ فغاں تھا اب کہیں آواز ہی نہیں
جیسے کوئی سکوت کے سانچے میں ڈھال دے

منزل تو اک تلاشِ مسلسل کا نام ہے
دل سے خیالِ ختمِ سفر ہی نکال دے

گلشن میں اب سنبھال کے رکھنا ذرا قدم
ممکن ہے کوئی پاؤں میں زنجیر ڈال دے

تابش کسی کی عیب نمائی سے فائدہ؟
تجھ میں کمال ہے تو ثبوتِ کمال دے

گیت

قتیل شفائی

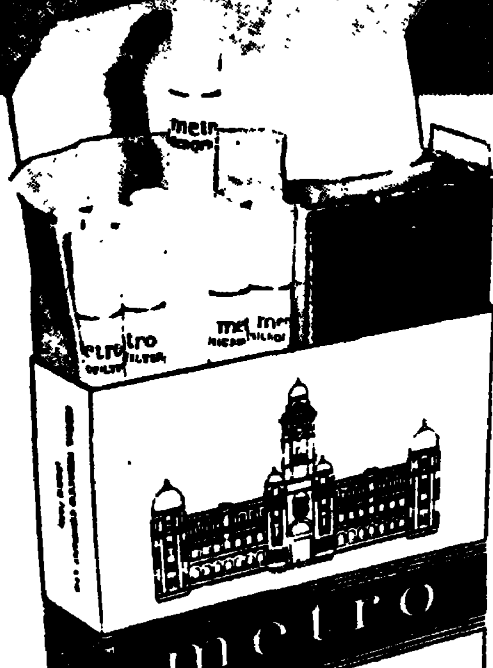
یہ حسیں بہار یہ وادیاں   یہ گلوں کا رنگ چمن چمن
جنھیں دیکھ دیکھ کے پیار سے   تری یاد میں جو رہی مگن
میرے گلبدن، میں وہی تو ہوں

ترے انتظار میں اب تلک
نہ لگی پلک سے کبھی پلک
یہی آرزو تھی کہ دیکھ لوں
ترے عارضوں کی بس اک جھلک
نہ شفق بھی جس کو لبھا سکی   رہی جس کو صرف تری لگن
مرے گلبدن، میں وہی تو ہوں

وہ چمن میں گونجتے قہقہے
وہ گلوں سے کھیلنا بچپنا
جو چلا شباب کی راہ پر
تو مچل کے تاج محل بنا
کسی چاند رات میں جھوم کر   جسے چومتی رہی کرن کرن
مرے گلبدن، میں وہی تو ہوں

وہ زمانہ یاد نہیں تجھے
کسی آبشار کے سامنے
میں کبھی پھسل کے جو گر پڑی
تو پہنچ گیا مجھے تھامنے
کہا تو نے کھیل ہی کھیل میں   کبھی مسکرا کے مجھے دلہن
مرے گلبدن، میں وہی تو ہوں





میٹرو

اَب زندگی کی مصروفیات کو
خوشگوار بناتے جا رہے ہیں

ایسا خوشگوار کش میٹرو مائیکروفلٹر ہی کا حصّہ ہے

میٹرو فلیور اعلیٰ ورجینیا تمباکو
اور مغل کی ماہرانہ بلنڈنگ کا مجموعہ ہے

مغل ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ

خوردہ قیمتیں:-

۲۰ سگریٹ کے پیکٹ کیلئے ۱:۲۴ روپے
۱۰ " " " ۶۲ پیسے



یہ صاحب دنیاداری کے معاملات میں تو بڑے سیانے ہیں لیکن
انعامی بونڈ کے معاملہ میں بالکل کورے نکلے۔ انہوں نے اپنا
انعامی بونڈ بیچ ڈالا اور اب اسی بونڈ پر پہلا انعام نکل آیا۔
یہ انعام اب اس شخص کو ہی ملے گا جس نے یہ انعامی بونڈ خریدا ہے۔
لیکن اب پچھتاوے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت.....
بہرحال ہوسکتا ہے آئندہ خوش قسمتی آپ ہی کا ساتھ دے۔ بشرطیکہ آپ
اپنے انعامی بونڈ سنبھال کر رکھیں۔ اس سے بھی بہتر تو یہ ہے کہ آپ ہر سلسلے
کے بونڈ خریدتے رہیئے۔ اور اس طرح انعامات حاصل کرنے کے مواقع بڑھاتے
جائیے۔ اور یہ کوئی مشکل بات نہیں کیونکہ مختلف سلسلوں کے بھنائے
ہوئے بونڈ بھی دوبارہ فروخت کئے جاتے ہیں۔

انعامی بونڈ

وطن کی ترقی اور حفاظت کے لئے

منظور شدہ بینکوں اور ڈاکخانوں سے دستیاب ہیں

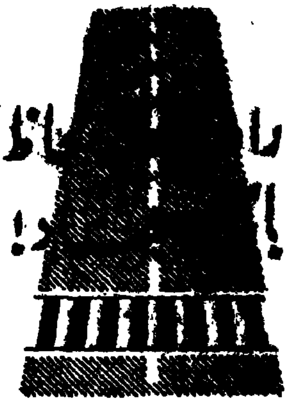
اپنے مستقبل کے لئے
بچت کیجئے
اپنے وطن کے لئے

D.F.P.   NADEEM



بس
بال بال
بچے...

خوش قسمتی سے بریک بروقت لگے
ورنہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہوتے!
تیز رفتار بس اور اسے اوورٹیک کرتی ہوئی ٹرک
کی زد سے ذرا کم ہی بچا کرتے ہیں۔ چند لمحوں کی
دیر اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ دس بیس سال
پہلے دوسری دنیا میں پہنچ جائیں۔ سڑک پر چوکنا نہ
رہنا جان بوجھ کر موت کو دعوت دینا ہے!



سڑکوں کے قانون

- جہاں کہیں ممکن ہو فٹ پاتھ اور زیبرا کراسنگ استعمال کیجئے۔
- جہاں فٹ پاتھ نہ ہوں وہاں دائیں کنارے پر یوں چلئے کہ آپ آتے ہوئے ٹریفک کو سامنے سے دیکھ سکیں۔
- سڑک پار کرتے وقت پہلے دائیں پھر بائیں پھر ایک بار دائیں اور دیکھ لیجئے تاکہ اطمینان ہو جائے کہ سڑک صاف ہے۔
- سڑک پار کرتے وقت ہمیشہ سیدھے اور نسبتاً تیز چلئے۔
- چلتی ہوئی بس یا ٹرام سے ہرگز نہ اتریئے اسی طرح کسی مقررہ اسٹاپ کے علاوہ اترنے کی کوشش نہ کیجئے۔
- ایسے موڑوں پر جہاں دائیں بائیں سے آنے والی گاڑیاں نظر نہ آئیں انتہائی محتاط رہئے۔

برما شیل





ڈگمگاتے قدم

علی عباس حسینی

۱۸ نومبر ۱۹۶۶ء

لیجیے جناب طفیل افسانہ حاضر ہے۔ نفسیاتی تحلیل میں قدرے شوخی ہے۔ مگر یہ بجھتی شمع کی آخری بھڑک ہے۔ بس اسی سے سمجھیے کہ یہ چھوٹی سی کہانی تین مہینے میں صاف کی جا سکی ہے۔ اب یہ حالت ہے کہ دس سطریں لکھتا ہوں بس جی گھبرا اٹھتا ہے۔ پھر ہفتوں قلم اٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔ آلام ہیں، آزار ہیں، علالتیں ہیں، عیال کی تیمارداری ہے، خود اپنی بیماری ہے۔ ایسے میں آپ جیسے دوستوں کی فرمائشیں کیسے پوری ہوں؟ — بس اب چھوٹی ہوئی آتشبازی کی قطع ہے: جلے ہوئے بارود کی بو باقی رہ گئی ہے اور کچھ نہیں — (علی عباس حسینی)

شاکرہ بیگم ابھی نہا رہی تھیں کہ ظہورن نے حمام کے دروازے کے پاس آ کر کچھ ہانپتی آواز اور کچھ سرگوشی کے انداز میں کہا کہ "چھوٹن نواب آ گئے ہیں"۔ وہ کچھ بوکھلائی سی لگتی تھی۔ اس بوکھلاہٹ کی خاص وجہ تھی۔ مالکن اور ملازمہ کے درمیان ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کا ذکرِ خیر تھا اور وہ شیطان کی طرح آ دھمکے۔

ظہورن ابھی ابھی شاکرہ بیگم کا سر دھلا کر اور ان کے گورے گورے پنڈے میں خوشبودار اُبٹن مل کر اور اسے بیسن لگا لگا کر خوب رگڑ رگڑ کر دھو کے نکلی تھی۔ ایک حمام میں سب ہی ننگے ہوتے ہیں، یعنی مالکہ اور ملازمہ میں بہت سی چھپی ڈھکی باتوں پر بھی گفتگو ہونے لگتی ہے۔ اکثر ماما دائیاں اس خدمت کی انجام دہی کے سلسلے میں سہیلیوں کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہیں۔

بیگم کا کندنی رنگ جب ظہورن کے کھردرے ہاتھوں کی رگڑ سے شہابی ہو گیا تھا تو ظہورن کو بےساختہ ان پر پیار آنے لگا تھا۔ اس کا جی چاہنے لگا تھا کہ وہ ان کو کلیجے میں سمیٹ کر ان کی پور پور چوم ڈالے۔ ظہورن کا سن وہ تھا کہ جب اعصاب کے ہیجان کو طوفانی شکل اختیار کرنے کے لئے ایک معمولی بہانہ کافی ہوتا ہے اور یہاں اس کی آنکھوں کے سامنے سب سے بڑے صنم تراش کے کمالِ صناعی کا ایک شاہکار موجود تھا۔ رنگ روپ، ناک نقشہ، اعضا کا تناسب تو یہ شکل حسن کی ہر چیز شاکرہ بیگم میں مکمل طور پر پائی جاتی تھی۔ بیگم تھیں تو تیس کے پیٹے میں اور دو لڑکیوں کی ماں بھی، مگر سوائے پیٹ پر دو ہلکی سپید سلوٹوں کے جسم بھر میں نہ کوئی ڈھیلا پن تھا، نہ کوئی شکن تھی اور نہ کوئی داغ تھا۔

دوشیزہ کالی ہو کہ گوری، بھینگی ہو کہ ہونٹ کٹی کبھی بھی دو بچوں کی ماں کو اپنے سے زیادہ حسین اور خوبصورت نہیں سمجھتی۔

مگر شاکرہ بیگم کا حسن ہی ایسا تھا کہ ظہورن خود بخود ہڑبڑا اٹھی تھی۔ "اللہ جانے ہمارے نواب کی آنکھوں کو کیا ہوگیا ہے!" شاکرہ بیگم کو نواب پہ الزام لگانے میں جو ان کی تعریف پوشیدہ تھی وہ شہد سے زیادہ شیریں لگی۔ انہوں نے ظہورن کو گردن گھما کر مسکراتی آنکھوں سے دیکھا اور کہا "کیوں کیا بات ہوئی۔ ہیرن جیسی بڑی بڑی تو ماشاءاللہ سے ہیں!"

ظہورن بولی "ہونہہ، ہوں گی۔ مگر انہیں یہ کیوں نہیں دکھاتی دیتا کہ آپ کی خاک کے برابر بھی تو وہ موئی مشتری نہیں!"

بیگم کی دلی مسرت اور بڑھی۔ اپنے مقابلے میں سوکن کی مذمت نے ظہورن کے فقرے کی چاشنی دوگنی کر دی۔

انہوں نے مصنوعی بھولے پن سے کام لے کر ظہورن کو اور اکسایا۔ وہ بولیں "اے تم جو کہتی ہو، اگر سچ ہوتا تو نواب دس برس سے اسے گلے میں لٹکائے کیوں پھرتے؟"

وہ بولی "سچ کہتی ہوں سرکار، دس برس پہلے وہ جیسی بھی رہی ہو، مگر اب تو خاصی بھینس ہے۔ بھوری بھینس! اور چلتر ایسے کہ بیسوا بھی اس کے آگے پانی بھرے!"

بس پھر سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ بات چل نکلی۔ نواب ماشاءاللہ سے ہمیشہ کے دل پھینک تھے ماما دائیاں، رنڈیاں منڈیاں، ہر کالے سر والی کو وہ نوازتے پھرتے تھے۔ مگر سب ہوتی تھیں وقتی دل بہلاوا۔ بہت ہوا تو چھ مہینہ سال بھر چلیں۔ پھر پرانی جنتری نئی جنتری سے بدل لی گئی۔ مگر یہ مشتری تو گویا دوسرا محل بن کر بیٹھ گئی تھی! شاکرہ بیگم خود بھی خاندانی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ شاہی کے زمانے میں ان کے بزرگوں کے بھی دس بیس محل ہوتے تھے۔ مگر اس بیسویں صدی میں، اور وہ بھی جب ریاست بال بال مقروض ہو چکی ہو، اس مشتری کو تعویذ کی طرح باندھے پھرنا، اس کے لئے ایک محل نما کوٹھی خرید دینا، اس کے پان دان کا خرچ شاکرہ بیگم سے بھی زیادہ مقرر کرنا، اور اس کے ہر آن کے نکتوڑے اس طرح توڑنا کہ جیسے وہی ان کے دو چاند جیسے بیٹوں کی ماں ہے، یا وہ واقعی حسن و جمال میں بیگم سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اور اس پہ نظر پڑتے ہی نواب کی آنکھیں سچ مچ چکا چوند کرنے لگتی ہیں۔ سینہ پہ انگارے کی طرح جلاتا تھا۔ "اے ماں دادی والا شان کے پاس جب آئی تھی جب ہی اس کا ایک خاصا سیانا سانڈ جیسا لونڈا پہلے خصم سے تھا۔ لوگ کہتے ہیں اس زمانے میں چہرے مہرے سے خدا غنیمت تھی۔ پر اب دس بارہ برس بعد کیا رہ گیا ہوگا اس میں؟ البتہ سنا ہے کھلائی پلائی سے خوب چربیالی ہو گئی ہے۔ یہ بھی سنتی ہوں کہ ایسی ہرجائی ہے کہ نوکروں تک پہ بند نہیں!......" "اے حضور اس کے کرتوت شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ وہ بنا مرد کے اکیلی کوئی رات نہیں کاٹ سکتی۔ نواب صاحب چاہے گیارہ بجے آئیں، بارہ بجے آئیں، پہ سرکار کھانا یہیں کھاتے ہیں آرام بھی یہیں کرتے ہیں"...... "ہاں بی بی، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اتنی بات ابھی تک باقی ہے۔ وہ چاہے کہیں ہوں کیسی حال میں ہوں، کتنی ہی رات کو آئیں مگر رات کو سوئیں گے حویلی ہی میں!...... مگر ایسے سونے کا فائدہ!؟...." "اے سرکار، اللہ رکھے، کیا ہم لوگ دیکھتے نہیں!......"

نواب والا شان جھومتے لڑکھڑاتے گیارہ بجے رات کو حویلی میں آتے۔ ماما دائیوں میں سے جو جاگتی ہوتی وہ دسترخوان لگا دیتی۔ شاکرہ بیگم بھی آنکھ ملتی آکر پاس بیٹھ جاتیں۔ وہ خود آٹھ ساڑھے آٹھ بجے دونوں بچوں کے ساتھ خاصا نوش کر لیتی تھیں، اس لئے محض دسترخوان کا پھول بنی رہتیں۔ والا شان کی قسمت میں ٹھنڈا باسا کھانا ہوتا۔ آخر کب تک یا د رچن چولھا گرمائے بیٹھی رہتی؟ نواب

دو تین پیپاں کباب اور بالائی سے، دو چار لقمے پلاؤ کے یا مزعفر کے ہاتھ چاول کے توڑے سے کھا لیتے، اور میٹھے میں برفی کی ڈلیاں، چلوز چوسی ہوئی۔ قلفیاں کھیں، بیسن سے ہاتھ دھویا، تخت پر بچھے پلنگ پر دراز ہو گئے۔ ظہورن نے مسہری کے پاس رکھی مہاگنی کی تپائی پر خاصدان رکھ دیا، ظہیرالدین نے حقہ بھر کے منہ جھکا کر منہ نال لبوں سے آہستہ سے لگا دی۔ نواب نے ایک گلوری پان کی کھائی، حقے کے دو ہی چار کش لیے اور ناک بجنے لگی۔ ان کو جو کچھ کچھ سہارا شانے ہوتے وہ کوٹھی ہی میں آڑا آڑا کے رکھے ماندے آتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا رن ماسکے تھے ہیں۔ بس بیوی کی حویلی امن و امان کی جگہ ہے، چین کی نیند سونے کی جگہ، پہلے تھوڑی تھوڑی افیون کھاتے تھے اب ادھر شراب بھی منہ سے لگ گئی تھی۔ شاکرہ بیگم کو اس کی بو سے متلی آتی تھی۔ چنانچہ کئی سال سے جب سے یہ [illegible] کے منہ کو لگی تھی نواب کے جاگنے پر بھی شاکرہ بیگم ان کے بستر کے قریب بھی نہ گئی تھیں۔

اور اُدھر مشتری نواب کے حویلی جانے کا بھی انتظار نہ کرتی۔ اور جب سے کہ چھٹن نواب کا آنا جانا ہو گیا تھا نہ دن کا پردہ تھا، نہ رات کا۔ چھٹن والاشان کا حقیقی بھانجا تھا۔ بچپن ہی سے ماموں کے قدم بہ قدم چلا تھا۔ والاشان بودے تھے، وہ بلا کا نڈر جس پر نظر پڑی دن دھاڑے اٹھا لایا، شہر کے مشہور غنڈے ملازم رکھ چھوڑے تھے۔ "چھوٹی قوم" کی بیاہی ہو کہ کنواری کوئی بھی اس سے محفوظ نہ تھی۔ ان کے مردوں میں کسی کی ہمت نہ تھی کہ چوں بھی کر سکے۔ پیدل نکلتا تو موٹا سا تیل پلایا ہوا ڈنڈا ہاتھ میں اور غنڈوں کا طول ساتھ۔ گھوڑے پر سوار نکلتا تو بڑا سا ہنٹر ہاتھ میں۔ جیب میں ہر وقت ریوالور ڈالے رکھتا۔ وہ شورہ پشتی تھی کہ الامان و الحفیظ! ۔ اب یہی چھٹن نواب مشتری سے ماموں کے پیسے وصول کر رہا تھا۔ والاشان کو سب معلوم تھا۔ مشتری کے ہاں اندر جانے سے پہلے ہمیشہ چپکے سے دریافت کر لیتے کہ وہاں چھٹن نواب تو نہیں بیٹھا ہے؟ ان کا بھی چھٹن کے نام سے دم نکلتا تھا۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے وہ اس غم و غصہ کو بھی جام پر جام میں ڈبو دیتے۔

شاکرہ بیگم اور ظہورن میں اسی چھٹن نواب کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ اور یہی چھٹن نواب تھوڑی دیر بعد آ دھمکا۔ ظہورن کی بوکھلاہٹ کی وجہ یہی تھی۔ شاکرہ بیگم نے حمام کے اندر سے قدرے متانت سے یہ تو ضرور کہا کہ "انھیں لے جا کر صدر دالان میں بٹھاؤ۔ میں نہا چکی، آ رہی ہوں۔"

مگر ان کے افعال و حرکات بھی اضطراری ہونے لگے۔ انہوں نے صندل کی چوکی پہ بیٹھے بیٹھے ذرا کانپتے ہاتھوں سے پائپ کا فوارہ بند کیا، اور کچھ گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ پھر بڑے تولیے سے سر کے بال اور بدن کا پانی پونچھتی ہوئی حمام کی دیوار میں لگے قدآدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا منہ دیکھنے لگیں۔ پانی کی خنکی نے غزالی آنکھوں میں لال لال ڈورے ڈال دیئے تھے۔ انہوں نے جسم بھر میں ایک خاص طرح کا کیف محسوس کیا۔ وہ کسمسائیں۔ ان کی آنکھیں کچھ اور نشیلی ہو گئیں۔ انہوں نے تولیے سے جسم کو زور زور سے اس طرح رگڑا کہ اکثر اعضا کی جلد سرخ ہو گئی۔ وہ جلدی جلدی کپڑے پہننے لگیں۔

ظہورن نے باہر سے آواز دی "سرکار! میں نواب صاحب کو بٹھا آئی۔ وہ کہتے ہیں اگر سرکار کے برآمد ہونے میں دیر ہے تو وہ اس وقت چلے جائیں، پھر کبھی حاضر ہوں گے۔"

وہ بولیں "نہیں، نہیں، ان سے کہو میں آ رہی ہوں۔" اور بجائے اس کے کہ وہ حسب معمول ظہورن کو حمام میں بلا کر اس سے

تو سے پچھوا آئیں، وہ خود ہی اپنے ہاتھ سے یہ فریضہ انجام دے کر جوتی میں آدھا پاؤں ڈال کر اسے کچھ گھسیٹتی حمام سے باہر نکل آئیں۔

چھٹن نے سمندر کے کنارے سے طلوع ہوتے ہوئے آفتاب جیسے چہرے کو دیکھا۔ پہلے تو ایک لالچی کی طرح زبان پھرائی، پھر بڑا نیک خوردہ بن کر جھک کر سلام کیا۔ وہ شریہ ممانی کے رشتے سے فائدہ اٹھا کر یوں بھی شاکرہ بیگم کو چھیڑا کرتا تھا۔ اس رشتے میں متانت، سنجیدگی، بزرگی و احترام سے زیادہ ایک لطیف طرح کی بے تکلفی ہوتی ہے، جو مزاح سے آگے مذاق تک کو روا جانتی ہے۔ دیہاتی مثل ہے۔ "آدھی ماں آدھی جورو۔ پد لگا دے لنگری ہوئے"۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے چھٹن ایک جھرلی ممانی کو ناپ تول کر اب سچی ممانی کی پیمائش کرنے کو تیار ہے۔ اس کے چہرے پر اس کی آنکھوں میں وہ خاص جنسی کشش پیدا ہوگئی جو سدا سے لیلاؤں کو مجنوں بناتی آئی ہے۔

شاکرہ بیگم نے ایک جھرجھری سی لی۔ وہ تخت کے چوکوں پہ بچھی ہوئی مسند پہ آکر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے دوپٹہ ہی سے گردن و سینہ نہ چھپایا بلکہ بڑا تولیہ بھی اس پر سے لپیٹ کر ظہورن سے مڑ کر کہا: "تم چھوٹے تولیے سے خوب رگڑ رگڑ کر بال سکھا دو"۔ وہ چھوٹا تولیہ لئے حکم کی منتظر تو کھڑی تھی۔ اس نے تولیے سے بھیگے بال سکھانا شروع کیا۔ دفعتاً ایک لٹ شاکرہ کے سامنے آگئی۔ سیاہ بالوں میں ایک سفید بال چمک گیا۔ تاریک بادلوں میں جیسے کوندا لپک گیا۔ بیگم کے بدن میں جیسے کسی نے برف کی ایک لکیر کھینچ دی۔ چھٹن کی نظر سے جو جسم میں گرم گرم لہریں اٹھ رہی تھیں وہ ایک ٹھنڈی سانس بن کر منہ سے نکلی۔

وہ گھبرا کر اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ چھٹن سے بولیں: "نواب، تم جاتے نہیں۔ میں ابھی آئی"۔

وہ تولیہ اور دوپٹہ سنبھالتی اوٹ کے پیچھے جانے لگیں۔ جسم میں چپکی ہوئی گلابی جالیدار قمیص میں سے پیٹھ کے گورے گورے رنگ نے ایک جھانک لگائی۔ پھر پتلی کمر پر بل کھاتے ہوئے کولھے کی لچک نے ہوا میں برق نما ارتعاش پیدا کیا۔ کرنٹ چھٹن نواب تک پہنچا۔ اس نے انگڑائی لی اور داہنے ہاتھ کی انگلیاں تخت پر رکھ کر چٹخائیں۔ ظہورن نے اپنی بیگم کے پیچھے جاتے جاتے اسے پلٹ کر دیکھا۔ چھٹن نے مسکرا کر آنکھ مار دی۔ اس نے بیگم کی آنکھ بچا کر چھٹن کو ٹھینگا دکھا دیا اور کولھا مٹکا کر بیگم کے ساتھ اوٹ کے پیچھے چلی گئی۔

شاکرہ بیگم اپنے انوکھے جذبات سے الجھتی ہوئی ظہورن کو جھڑک کر بولیں: "نہیں، اب تمہاری ضرورت نہیں۔ تم بھیگے تولیے سوکھنے کو پھیلا دو"۔ یہ کہہ کر انہوں نے بڑا تولیہ بھی ظہورن کی طرف بڑھا دیا۔ جسم سے تولیہ ہٹتے ہی اس کی ساری رعنائیاں چمک اٹھیں۔ ظہورن نے ایک رشک بھری نظر ان پر ڈالی اور تولیے لئے ہوئے وہ عمداً چھٹن نواب کے پاس سے ہو کر گزری۔

اس نے ہونٹوں کا غنچہ اس طرح بنایا جیسے وہ ظہورن کے گالوں پر پیار کر رہا ہے۔ اس نے چھٹن کو بیہودگی کے انداز سے دیکھا اور بڑا تولیہ اس طرح ہلایا کہ اس کے ایک کونے نے چھٹن کے گالوں کو چھو دیا اور جلدی جلدی قدم رکھتی ہوئی وہ بھاگ گئی۔ چھٹن نواب کے منہ سے بے ساختہ ایک سیٹی سی نکل گئی۔

شاکرہ بیگم جو اپنے بالوں میں کنگھی کرنے میں بار بار لٹوں میں سے چاندی کے تار اکھاڑ اکھاڑ کر پھینک رہی تھیں، سیٹی کی آواز سے چونک پڑیں۔ انہوں نے اوٹ کے پیچھے سے اچک کر جھانکنے کی کوشش کی۔ وہ ان کے قد سے کہیں اونچا نکلا۔ جب ناکام رہیں تو انہوں نے

سے اوڑھ کے کپڑے کا ایک کونہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ چھٹن نواب ٹکٹکی باندھے اوڑھے ہی کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر انھیں ایک اکتاہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ جلدی سے بولیں۔

"نواب گھبرانا نہیں۔ میں ابھی آئی!"

وہ بولا: "ارے تو کسی طرح ختم بھی کیجیے اپنا سولہ سنگار۔ ہم چھوٹوں پر بجلی گرانے کے لئے اتنے اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ آنکھوں میں سرمے کی سلائی پھیراتی ہوئی وہیں سے بولیں: "چپکے بیٹھے رہو۔ زیادہ تیزیاں نہ دکھاؤ۔"

وہ مسکرا کر بولا: "بہت اچھا ممانی جان! بہت اچھا!"

اس کے ممانی کی جگہ 'ممانی' کہنے اور صاحبہ کی جگہ 'جان' کا لفظ استعمال کرنے نے انھیں پھر گدگدایا۔ انہوں نے جلدی جلدی ڈھیلا ہی جوڑا باندھا۔ کس کر باندھنے میں کالی رات میں تاروں کے چھپنے کا ڈر تھا!

جب وہ بن سنور کر نکلیں تو چھٹن نے جلدی جلدی آنکھیں جھپکائیں۔

بیگم نے ہنس کر پوچھا: "یہ کیا مسخرا پن ہے؟"

وہ لمبا سا منہ بنا کر بولا: "اپنے بس کی بات تھوڑے ہے۔ آنکھیں خود بخود چکا چوند کرنے لگیں!"

وہ ہنستی ہوئی مسند پر بیٹھ گئیں۔ پھر وہ بولیں: "سنتی ہوں کہ تم اب بڑے ڈھیٹ ہو گئے ہو۔ بزرگوں کے مال پر بھی ہاتھ ڈالنے میں نہیں جھجکتے!"

وہ اپنے ہاتھ پھیلا کر بولا: "بھلا ان ہاتھوں میں اتنا دم کہاں؟" اور اس نے بڑی جسارت سے ان کا ہاتھ پکڑ کر ہتھیلی کے نشانوں پر اپنا کلمے کی انگلی کے ناخن سے لکیریں کھینچتے ہوئے کہا۔

"البتہ یہ بات ہے۔ باوجود اپنی نزاکت کے جیسا مال چاہے کاٹ لائے! جس کا دل چاہے اُچک لے!......"

شاکرہ بیگم کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ انہوں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ کر کہا۔

"پھر وہی بدتمیزی! کیا مجھے بھی مشتری سمجھ رکھا ہے!"

چھٹن ذرا اور قریب کھسک کر بولا: "سچ کہتا ہوں مجھے بعض وقت اموں جان کی بینائی پر شبہ ہوتا ہے! جس کے گھر میں اللہ کا دیا سارا مال موجود ہے، وہ سڑی دال کی جھوٹی ہانڈی کیوں چاٹتا رہتا ہے!......"

وہ تو مال کے فقرے پر ہنس دیں اور جھوٹی ہانڈی کی مثال سے لذت لے کر بولیں: "چل لڑکے! تجھے باتیں بنانا خوب آتی ہیں!"

وہ ذرا اور قریب کھسکا۔ اس کے لباس کی خوشبو، اس کے جسم کی مردانہ بو میں مل کر ان میں سرخوشی کی کیفیت پیدا کرنے لگی۔ ان کی سانس گرم ہونے لگی۔

وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا: "ناقدروں کے ہاتھ میں خدا کسی کی قسمت نہ دے!"

وہ لمبی سانس لے کر بولیں: "اب تو دے ہی دی اس نے ایک ناقدرے کے ہاتھ میں!"

وہ شیطانی انداز سے آنکھیں جھپکا کر بولا "مگر قسمت بدلی بھی تو جا سکتی ہے ...... اور نہیں تو بدلہ تو یقینی لیا ہی جا سکتا ہے! ......"

ان کے نتھنوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے۔ وہ خشمگیں آواز بنا کر بولیں "تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو چھٹن نواب!"

وہ سرگوشی کے انداز میں بولا "سالگرہ کو آج نہیں منانی جان! کوئی بُری بات ہوتی تو اماں جان آپ ہی کی طرح دل کڑا کئے نہ بیٹھے رہتے! وہ تو یہی کہ ایک مشترکہ ہی نہیں معذور بھی تھی ......"

بیگم کے روئیں روئیں میں اُبال سا آنے لگا۔ وہ شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر آنے والے پتّے کی طرح تھرتھرانے لگیں۔
چھٹن نے ان کے تمتماتے گالوں پر آنکھیں گڑا کر انھیں آغوش میں سمیٹنے والے انداز سے ہاتھ بڑھایا۔ ان کے بھی ہاتھ مجبور بے بسی سے اس کی طرف بڑھنے لگے ......

دفعتاً پانچ برس کا منجھو نواب دوڑتا ہوا آیا۔ "امّی! امّی! مجھے کنکیا ڈور منگا دیجیے۔ میں بھی پتنگ اڑاؤں گا!"
شائستہ بیگم نے دونوں ہاتھ پھیلا کر بیٹے کو گود میں زور سے سمیٹ لیا۔ لڑکا جو پھڑپھڑایا تو ان کا جوڑا کھل گیا۔ کالے بادلوں میں پھر کوندا لپکا۔ وہ منجھو کا منہ چوم کر چھٹن سے بولیں:۔

"نواب اب تم سدھار سکتے ہو!" اور جب وہ جوتا پہن رہا تھا تو انھوں نے ہونٹ چبا کر کہا:۔
"اور یاد رکھنا اس گھر میں اس طرح کی شوخیاں تمھیں نہیں پسند کی جاتیں!" اور ان کی آنکھوں کا رنگ ان دہکتے کوئلوں جیسا ہو گیا جو راکھ سے ڈھک گئے ہوں ——

ہیرے کی چوری

حکیم احمد شجاع (ستارۂ امتیاز)

(منظر)

(سیٹھ یوسف جی اسماعیل بھائی کے سونے کا کمرہ)

ہدایات: کمرہ نہایت شستگی سے آراستہ ہے۔ کمرے کے بائیں طرف کے کونے میں ایک نہایت مضبوط فولاد کی تجوری رکھی ہے۔ اس کے قریب ہی سیٹھ یوسف جی کا ڈبل بیڈ ہے جس کے سرہانے کی طرف ایک قد آدم آئینہ ہے۔ بستر کا ساز و سامان امیرانہ ہے پلنگ کے دائیں طرف ایک بہت خوبصورت تپائی پر ٹیلی فون رکھا ہے۔ اس کے نیچے کے خانے میں ٹیلی فون کی ڈائریکٹری رکھی ہے۔ پلنگ کے درمیانی حصے کی سامنے ایک دوسری تپائی پر ایک پیالی اور طشتری رکھی ہے۔ اس کے قریب ہی ایک شیشے کا گلاس ایک پلیٹ میں رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوا کی دو شیشیاں رکھی ہیں۔ کمرے کے دائیں طرف ایک شیشے کی کھڑکی ہے اور اس کے قریب ہی ایک دروازہ ہے جو غسل خانے میں کھلتا ہے۔ پلنگ کی پائینتی کی طرف دیوار کے درمیانی حصے میں ایک دروازہ ہے جو ڈرائنگ روم میں کھلتا ہے۔ تجوری کے ساتھ ہی ایک دروازہ ہے جس سے مکان میں آمد و رفت ہوتی ہے۔ پلنگ کے سامنے تپائی سے ذرا ہٹ کر ایک پُرتکلف آرام کرسی ہے جس پر سیٹھانی (سیٹھ یوسف جی کی بیوی) بیٹھی ہے۔ وہ اس وقت بہت افسردہ خاطر ہے۔ سیٹھ یوسف جی تپائی کے سامنے پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں آج کا تازہ اخبار ہے جس کی سُرخی نظر آ رہی ہے۔ سیٹھ جی بہت پریشان حال نظر آتے ہیں۔ وہ سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے ہیں اور ابھی تک انھوں نے اپنے بالوں میں کنگھی بھی نہیں کی۔ سامنے مینٹل پیس پر سیٹھ جی اور سیٹھانی جی کی جوانی کے زمانے کی تصویر آویزاں ہے)۔

سیٹھ یوسف جی: (اخبار کی سُرخی کو پڑھتے ہوئے)

"کراچی کے مشہور جوہری سیٹھ یوسف جی اسماعیل بھائی کے بیش قیمت ہیرے کی چوری"

(پھر اخبار کو زانوؤں پر رکھ دیتے ہیں اور دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر اخبار کی سرخی کو دُہراتے ہیں)۔

"کراچی کے مشہور جوہری سیٹھ یوسف جی اسماعیل بھائی کے بیش قیمت ہیرے کی چوری"

(طنز سے ہنس کر) ——— (" بیش قیمت ہیرے کی چوری !"

(پھر زیادہ المناک آواز میں) " بیش قیمت ہیرے کی چوری" یہ ظالم "بیش قیمت" لکھ کر ہمارے ہیرے کی قیمت گھٹانا چاہتے ہیں۔

(سیٹھانی کی طرف دیکھ کر) سیٹھانی! کون جانتا ہے اس ہیرے کی قیمت کیا تھی۔ ہم نے اس ہیرے کو اسی ہزار (۸۰ ہزار) روپے میں خریدا تھا۔

سیٹھانی : (حیران ہو کر) اسی ہزار روپے میں۔

سیٹھ : جی! اسی ہزار روپے میں، اور اپنی سمجھ میں بڑے سستے داموں خریدا۔ جانتی بھی ہو یہ ہیرا کس خاندان سے ہے؟

سیٹھانی : میں کیا جانوں۔

سیٹھ جی : (سیٹھانی جی کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے) کوہِ نور دیکھا ہے؟

سیٹھانی : کوہِ نور کیا بلا ہے؟

سیٹھ جی : دُنیا کا سب سے بڑا ہیرا۔ سب سے زیادہ قیمتی ہیرا! سب سے زیادہ مشہور ہیرا۔

سیٹھانی : میں تو آج ہی سن رہی ہوں کہ کوہِ نور کوئی ہیرا بھی ہے۔ کوہِ نور ٹیکسٹائل ملز دیکھی ہے۔ کوہِ نور کیمیکلز کا نام سنا ہے۔ کوہِ نور سوپ سے منہ ہاتھ دھویا ہے۔ کوہِ نور پوڈر لگایا ہے. . . . . .

سیٹھ : (بات کاٹ کر) اسی لیے تو کہتے ہیں کہ عورت ذات میں عقل کی کچھ کمی ہوتی ہے۔

(ذرا غصے میں) یہ سب چیزیں جو تم نے گنوائی ہیں ان کا نام کوہِ نور ہیرے ہی پر تو رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ کوہِ نور دُنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہے۔

سیٹھانی : (تنگ آ کر) تو یہ کوہِ نور تمہارے ہاتھ کیسے آ گیا؟

سیٹھ : (حسرت سے) ہونہہ۔ سیٹھانی جی۔ کوہِ نور ہماری قسمت میں کہاں ہے۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ ہیرا بھی کوہِ نور ہی کے خاندان سے ہے۔

سیٹھانی : تو کیا ہیروں کے بھی کوئی خاندان ہوتے ہیں؟

سیٹھ : (احساسِ علم سے) کیوں نہیں!

کوہِ نور تو ہیروں کے جدِ امجد کا نام ہے۔ دریائے نور، ضیائے نور اور شعاعِ نور اسی کوہِ نور کی اولاد

میں سے ہیں اور کیا عجب ہے کہ ہمارے اس بیش قیمت ہیرے کا نشنہ بھی دور و نزدیک سے اسی نوکر سے ملتا ہو۔ مگر سیٹھانی: میں تم سے پوچھتا ہوں کہ یہ پولیس کیا کر رہی ہے؟ تھانے میں اطلاع کر دی۔ اخبار میں خبر چھپ گئی۔ شہر بھر میں چرچا ہو رہا ہے اور پولیس ہے کہ اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور ہاں: نو کروں پر کیا اوس پڑ گئی۔ نو بجنے کو ہیں اور اب تک چائے نہیں آئی؟

سیٹھانی : نوکروں پر اوس نہ پڑتی تو اور کیا ہوتا۔ سب تمہارے ہیرے کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔

سیٹھ : (طنز سے مسکرا کر) تو کیا ہیرے کے کوئی پاؤں تھے کہ تجوری سے بھاگ نکلا؟

سیٹھانی : مطلب یہ ہے کہ سب نوکر ہیرے کے چور کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔

سیٹھ : چور کے تو پاؤں نہیں ہوتے یہ کس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں سیٹھانی جی؟

سیٹھانی : وہ بے چارے تو یہ سمجھتے ہیں کہ سیٹھ جی کا اتنا بھاری نقصان ہو گیا ہے ان کو چائے پینے کی ہوش کہاں ہوگی۔

سیٹھ : سیٹھانی! تیس برس ہو گئے اس گھر میں رہتی ہو۔ ہر روز یہاں لاکھوں کے وارے نیارے ہوتے رہتے ہیں۔ ہماری ہوش اگر اسی طرح ٹھکانے نہ رہا کرتی تو کبھی کے پاگل خانے پہنچ چکے ہوتے۔

سیٹھانی : بڑے لوگوں کے حوصلے بھی تو بڑے ہوتے ہیں اور ابھی تو ان بے چاروں کو یہ خبر نہیں کہ اسّی ہزار روپے کا نقصان ہوا ہے۔ وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی سو دو سو روپے کی چیز گم ہو گئی ہے۔

سیٹھ : غریبوں کے لیے سو دو سو روپے ہی لاکھ دو لاکھ ہوتے ہیں۔ سیٹھانی جی (ذرا مسکرا کر) مگر نقصان تو ہمارا ہوا ہے۔ یہ لوگ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔

سیٹھانی : پریشان نہ ہوں تو اور کیا ہو۔ اس گھر میں جو رہتے ہیں۔ انھیں ڈر ہے کہ کہیں چوری کے الزام میں وہی نہ دھر لیے جائیں۔

سیٹھ : بات تو یہ بھی عقل کی کہی تم نے۔ اس کمرے میں ہمارے تمہارے اور ہمارے پیارے سلیم کے سوا اور کوئی آتا بھی تو نہیں!

سیٹھانی : (ذرا غصے میں) تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں چور ہوں؟

سیٹھ : (کسی قدر زور سے) بیشک۔ یا ہم چور ہیں یا تم . . . .

(اتنے میں دروازہ کھلتا ہے اور سلیم بیرا چائے کی ٹرالی کو دھکیلتا ہوا داخل ہوتا ہے)۔ (سیٹھ جی سلیم کو دیکھتے ہوئے) اور پھر یا سلیم چور ہے (سلیم ٹرالی سیٹھانی جی کی طرف بڑھا دیتا ہے اور رونی صورت بنا کر کہتا ہے) تو کیا سرکار کو مجھ پر شک ہے۔ سرکار کے نمک ہی کی قسم جو میں نے آنکھ اٹھا کر بھی آپ کا ہیرا دیکھا ہو۔ بیچ میں کوٹھی سے کہیں باہر تو نہیں گیا۔ میری تلاشی لے لیجیے۔ (پہلے اپنی ٹوپی پھر واسکٹ سیٹھ جی کے پلنگ پر پھینک

دیتا ہے۔ پھر اپنا جوتا اتار کر اسے سیٹھ جی کے ہاتھوں کی طرف بڑھاتا ہے۔

سیٹھ جی : (گھبرا کر اور اسے روک کر) بس بس بس بھائی بس۔ تلاشی ہو چکی۔ (سلیم پھر دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیتا ہے)

سیٹھ جی : (تنگ آ کر تسلی دیتے ہوئے) اے بھائی میں نے کب کہا ہے کہ تم چور ہو (سیٹھانی چائے بنا کر چائے کی پیالی سیٹھ جی کی تپائی پر رکھ دیتی ہے)

سلیم : (روتے ہوئے) ابھی ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ سلیم چور ہے۔

سیٹھانی : سچ تو کہتا ہے غریب! آپ نے ابھی ابھی کیا کہا تھا۔

سیٹھ جی : (حیران ہو کر) کیا کہا تھا ہم نے؟

سیٹھانی : یہی کہ چور یا ہم ہیں یا تم اور یا سلیم۔

سیٹھ جی : (تنگ آ کر سلیم سے) اچھا بھئی معاف کر دو چور نہ تم ہو اور نہ سیٹھانی جی۔ چور ہم ہیں۔

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

(سیٹھ یوسف جی گھبرا کر ٹیلیفون کا رسیور اٹھا لیتے ہیں)۔

سیٹھ جی : (ٹیلیفون پر بات کرتے ہوئے)۔

"ہاں ہاں! میں ہی سیٹھ یوسف جی ہوں .... سیٹھ یوسف جی اسمٰعیل بھائی .... اور آپ کون ہیں ...... شاہد حسین (کچھ سوچ کر ٹیلیفون کے ریسیور سے منہ ہٹا کر) ..... شاہد حسین۔ میں نے اس سے پہلے یہ نام کبھی نہیں سنا۔ (پھر ریسیور سے منہ لگا کر) معاف کیجیے! میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔ کس جگہ سے بول رہے ہیں آپ؟ .... خفیہ پولیس کے دفتر سے؟ ...... اچھا! اچھا! کیا نام بتایا تھا آپ نے؟ .... انسپکٹر شاہد حسین۔ آئیے آئیے صاحب ضرور آئیے۔ اور جلدی آئیے۔ میں تو کل شام سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں .... کیا فرمایا آپ نے .... تو آپ کو اب اطلاع ملی ہے۔ تعجب ہے میں نے تو کل شام ہی کو تھانے میں رپٹ درج کرا دی تھی .... ٹھیک ہے۔ آخر رپٹ کو تھانے سے آپ کے دفتر تک پہنچنے کے لیے کچھ نہ کچھ وقت تو ضرور چاہیے۔ مگر ذرا اس بات کا خیال رہے کہ ہم لوگ رات بھر نہیں سوئے۔ آپ ہی کے انتظار میں بیٹھے ہیں .... دس بجے سے پہلے نہیں آ سکتے۔ بجا فرمایا آپ نے .... آپ کسی ضروری کام میں مصروف ہیں۔ مگر حضور یہ کام بھی تو کچھ ایسا غیر ضروری نہیں۔ اسّی ہزار روپے کی چوری کا معاملہ ہے .... بہت بہتر جو حکم۔ میں دس بجے آپ کا منتظر رہوں گا۔"

(ریسیور رکھ دیتا ہے اور ذرا اطمینان کا سانس لے کر سیٹھانی سے مخاطب ہوتا ہے)۔

سیٹھ جی : "اب جلدی سے کچھ چائے وائے کا انتظام کرو! سیٹھانی ۔ پولیس والے آتے ہی ہوں گے اور اُن کی کچھ نہ کچھ خاطر تواضع تو کرنی ہی چاہیے ۔ (گھڑی کو دیکھ کر) اب نو بجے ہیں اور ٹھیک دس بجے انسپکٹر صاحب پہنچ جائیں گے۔ اتنے میں میں بھی ذرا کپڑے پہن کر تیار ہو جاؤں ۔ اور دیکھو سلیم تم یہیں ٹھہرو۔ جب تک ہم نہ آئیں کوئی اس کمرے میں نہ آنے پائے۔

سلیم : (مکاری سے) بہت بہتر سرکار۔

(سیٹھ جی غسل خانے کا دروازہ کھول کر جاتے ہیں اور دروازہ بند کر لیتے ہیں) سیٹھانی اس دروازے سے جو تجوری کے قریب ہے۔ کوٹھی کے اندرونی حصے میں چلی جاتی ہے۔ اور دروازہ بند کر لیتی ہے۔ سیٹھ اور سیٹھانی کے چلے جانے کے بعد سلیم بڑی احتیاط سے چاروں طرف دیکھتا ہے۔ پھر بڑی خاموشی سے چل کر دروازوں کو دیکھتا ہے کہ وہ اچھی طرح سے بند ہیں پھر جلدی سے آکر ٹیلیفون کا ریسیور اٹھاتا ہے اور کوئی نمبر ملاتا ہے)۔

سلیم : (بڑے رازدارانہ انداز سے دبی ہوئی آواز میں)۔

"میں ہوں ٹالی۔ جلدی کرو مجھ پر شبہ کیا جا رہا ہے۔ ٹھیک دس بجے ...... انسپکٹر صاحب آ جائیں گے ...... ان کا نام ...... ؟ ...... شاہد حسین نام بتایا تھا۔ تو میں دس بجے تک یہیں رہوں یا کہیں رفوچکر ہو جاؤں ؟ ...... بہت بہتر۔"

(ریسیور رکھ دیتا ہے اور بڑے اطمینان سے دیوار پر لگی ہوئی تصویر کو دیکھنے لگتا ہے۔ سیٹھ یوسف جی غسل خانے کا دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔)

سیٹھ جی : (سلیم سے) "تم اس تصویر کو کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ اس زمانے کی تصویر ہے جب ہم جوان تھے اور سیٹھانی جی بھی جوان تھیں۔"

(پھر ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کر جو پلنگ کے سرہانے رکھا ہے اپنی ٹائی کو درست کرتے ہیں اور کہتے ہیں) "اب اپنی جوانی کے کھنڈر کو کیا دیکھیں (پھر سلیم سے)۔ تم ذرا تپائی کو صاف کر لو اور ہم بھی ذرا یاد کر لیں کہ کل سے تمہارے اور ہمارے سوا تو اس کمرے میں کوئی اور نہیں آیا تھا۔"

سلیم : (پھر رونی صورت بنا کر) "حضور میں تو ہر روز اس کمرے میں آتا ہوں۔ آخر ایسی نئی بات کیا ہوئی کہ آپ مجھ پر شک کرنے لگے۔"

سیٹھ جی : "بھئی سلیم بات یہ ہے کہ جس کا مال جاتا ہے اس کا ایمان بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم بے گناہ ہو اور ہم بھی بے گناہ ہیں اور سیٹھانی جی بھی بے گناہ ہیں تو پھر ہیرا کس نے چرایا ؟"

(بیرونی دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

سیٹھ جی : (گھبرا کر) یہ اس وقت کون کم بخت آ گیا۔ کوئی دوست قرض لینے کے لیے آیا ہو گا۔ معلوم نہیں جاڑوں کے موسم میں صبح ہی صبح کون آتا ہے۔

(سلیم سے) جاؤ دیکھو کون صاحب ہیں۔ اگر شکل صورت سے کوئی عزت دار آدمی ہوں تو ڈرائنگ روم میں بٹھا دو اور اگر کوئی ایسا ویسا آدمی ہو تو یہ کہہ کر ٹال دو کہ سیٹھ صاحب ابھی سو رہے ہیں۔

(سلیم۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر جاتا ہے اور دروازہ بند کر دیتا ہے۔ سیٹھ جی کنجیوں کا گچھا ہاتھ میں لیے تجوری کے پاس جاتے ہیں۔ ایک کنجی کو ہاتھ میں لیتے ہیں اور تجوری کا دستہ کھینچتے ہیں۔)

"تجوری بھی بند ہے اور کنجی بھی میرے پاس۔ پھر ہیرا کیسے غائب ہو گیا؟"

(سلیم دروازہ کھول کر داخل ہوتا ہے)

سلیم : "حضور! انسپکٹر شاہد حسین آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔"

سیٹھ جی : (اپنی ریسٹ واچ دیکھ کر) انسپکٹر شاہد حسین! . . . . ابھی تو سوا نو ہی بجے ہیں . . . خیر . . . . . یہیں بلوا لو انھیں۔"

(سلیم باہر جاتا ہے۔ سیٹھ جی کرسی کو تپائی کے سامنے رکھتے ہیں اور پلنگ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے اور انسپکٹر شاہد حسین داخل ہوتا ہے)

شاہد حسین : "آداب عرض ہے۔ سیٹھ صاحب۔ میں ذرا وقت سے پہلے ہی آ گیا ہوں مجھے آپ کی پریشانی کا خیال تھا۔"

سیٹھ جی : (اٹھ کر) تسلیم! تسلیم۔ آپ نے بہت مہربانی کی۔ ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ (سلیم سے) . . . . "جاؤ سلیم . . . سیٹھانی جی سے کہو کچھ چائے واسے کا بندوبست کریں . . . .

(شاہد حسین سے) آپ تشریف رکھیے انسپکٹر صاحب۔"

شاہد حسین : "اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو اس چوری کا مفصل حال بتا دیجیے۔ تاکہ میں اپنا کام شروع کر سکوں . . . . اور ہاں! جب تک میری تفتیش مکمل نہ ہو جائے آپ کا ملازم اسی کمرے میں رہے۔"

سیٹھ جی : (گھبرا کر) یہی تو ایک ملازم ہے جو میرے کمرے میں آتا ہے۔ اگر یہ یہاں رہا تو پھر آپ کے لیے چائے کون لائے گا۔"

شاہد حسین : "میں نے پہلے ہی عرض کر دیا ہے کہ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ اس چوری کی کیفیت بتائیے!"

سیٹھ جی : "چوری کی کیفیت کیا عرض کروں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں جواہرات کی تجارت کرتا ہوں۔ کوئی آٹھ

روز ہوئے میں نے ایک ہیرا اسّی ہزار روپے میں خریدا، اور اپنی دانست میں بہت سستا خریدا۔ میں اسے ہر رات خود تجوری میں بند کر کے سوتا تھا۔ پرسوں رات تک وہ تجوری میں موجود تھا۔ کل شام کو تجوری کھولی تو ہیرا غائب تھا۔ میں . . . . . . اس کے سوا میں اور کچھ نہیں جانتا۔"

شاہد حسین: "آپ نے یہ ہیرا کس سے خریدا تھا۔"

سیٹھ جی: افریقہ کے ہیروں کی ایک کان کے مالک سے۔

شاہد حسین: "آپ اس کا پتہ بتا سکتے ہیں؟"

سیٹھ جی: کیوں نہیں! یہ رہا ان کا کارڈ (ڈائری میں سے کارڈ نکال کر شاہد حسین کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ شاہد حسین پڑھتا ہے)۔ "محمد علی حیدر علی اینڈ سنز ڈائمنڈ مائنز اونرز۔ نیروبی۔"

شاہد حسین: "خوب۔ (پھر کارڈ کو واسکٹ کی جیب میں رکھ لیتا ہے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے)۔ ہوں۔ اس کمرے میں کل صبح سے۔ کل شام تک کون کون آیا؟"

سیٹھ جی: "میرے اور میری بیوی اور اس ملازم کے سوا۔ اس کمرے میں اور کوئی نہیں آتا۔ سلیم میرا پرانا ملازم ہے کوئی دس بارہ برس سے میرے ہاں کام کرتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ لڑکپن ہی سے میرے پاس رہا ہے اور جواہرات کی تجارت تو یہاں ہر روز ہوتی رہتی ہے۔ آج تک اس نے کسی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اس پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔"

شاہد حسین: "وجہ معلوم کرنا تو ہمارا کام ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ کا یہ ملازم کل سے کہیں باہر تو نہیں گیا۔"

سیٹھ جی: "بالکل نہیں۔"

شاہد حسین: (سوچتے ہوئے) "کیا میں اس تجوری کو دیکھ سکتا ہوں؟"

سیٹھ جی: "بڑی خوشی سے۔ تشریف لائیے۔ (تجوری کے پاس جا کر) یہی وہ تجوری ہے جس میں میں جواہرات رکھتا ہوں اور اسی میں وہ ہیرا بھی تھا۔ یہ رہی اس کی کنجی۔"

(شاہد حسین ——— کنجی کو ہاتھ میں لے کر دیکھتا ہے اور تجوری کو کھولنا چاہتا ہے)

سیٹھ جی: (مسکرا کر) "اسے ہمارے سوا اور کوئی نہیں کھول سکتا ——— انسپکٹر صاحب . . . . اس کے کل پرزوں سے صرف ہم ہی واقف ہیں۔"

شاہد حسین: "تو آپ کا مطلب ہے کہ اس تجوری کو آپ کے سوا کوئی نہیں کھول سکتا۔"

سیٹھ جی: "جی ہاں۔ جی! میں نے تو صاف صاف عرض کر دیا ہے اور سچ عرض کر دیا ہے۔ اس تجوری کے کل پرزوں سے میرے سوا اور کوئی واقف نہیں۔ (کچھ سوچ کر) ہاں یہ اور بات ہے کہ اس تجوری کو بنانے والے اسے کھولنے کا راز کسی اور کو بھی بتا دیں۔"

شاہر حسین : (مصنوعی حیرت سے) "تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی بیگم صاحبہ بھی اس تجوری کو کھولنا نہیں جانتیں۔"

سیٹھ جی : "بالکل نہیں۔ انسپکٹر صاحب۔ آپ نے ہمیں ایسا بے وقوف سمجھ رکھا ہے کہ ہم زیوروں کی تجوری کھولنے کا راز بھی سیٹھانی جی کو بتا دیں۔ عورتیں زیوروں کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔ سیٹھانی جی کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ تجوری میں کیسے کیسے زیور ہیں اور کس کس رقم کے جواہرات ہیں تو پھر یوں سمجھ لیجیے کہ ہماری لٹیا ہی ڈوب گئی اور اس کے علاوہ انسپکٹر صاحب عورتیں بہت باتونی ہوتی ہیں ان کو تو کوئی راز بتا دینا ایسا ہے کہ اخبار میں چھپوا دیا۔"

شاہر حسین : (کچھ سوچ کر) "میں بیگم صاحبہ سے کچھ سوال کرنا چاہتا تھا۔ وہ مردوں سے پردہ تو نہیں کرتیں۔"

سیٹھ جی : (مسکرا کر) "مردوں سے عورت کب پردہ کرتی ہے انسپکٹر صاحب۔ عورتیں تو برقع کی جالی دار آنکھوں سے اور چلمن کی باریک تیلیوں کے اندر سے بھی مردوں کو دیکھ سکتی ہیں اور اس زمانے میں تو پردے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کس زمانے کی باتیں کر رہے ہیں انسپکٹر صاحب۔"

شاہر حسین : "بات یہ ہے سیٹھ صاحب کہ بعض گھرانے اب بھی ایسے ہیں جہاں عورتیں پردے میں رہتی ہیں۔"

سیٹھ جی : (مسکرا کر) "آپ کا مطلب یہ ہے کہ جہاں مرد پردے میں نہیں رہتے اور عورتوں کو کھلے منہ دیکھ سکتے ہیں۔ ہم نے تو آج تک یہی دیکھا ہے کہ پردے میں رہنے کے باوجود عورت جسے چاہے دیکھے، البتہ مرد ان عورتوں کو نہیں دیکھ سکتے جو پردے میں رہتی ہیں (مسکرا کر) خیر! بات تو سیٹھانی جی کی تھی۔ ہم کس بحث میں جا پڑے۔ میں انھیں بلوائے لیتا ہوں۔ آپ جو کچھ بھی اُن سے پوچھنا چاہیں پوچھ سکتے ہیں۔

(سلیم کی طرف دیکھ کر)

سلیم جاؤ سیٹھانی جی سے کہو کہ اگر چائے تیار ہو گئی ہو تو لے آئیں۔"

شاہر حسین : (بات کاٹ کر) "اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر انھیں تکلیف نہ ہو تو ذرا سی دیر کے لیے خود ہی تشریف لے آئیں۔"

(سلیم جاتا ہے)

سیٹھ جی : "ہاں انسپکٹر صاحب جب تک سیٹھانی جی آئیں ہم ذرا اس پردے کے معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کر لیں۔"

شاہر حسین : "سیٹھ صاحب! یا تو آپ کے اس بیش قیمت ہیرے کی چوری ہی نہیں ہوئی اور یا آپ کا حوصلہ اتنا بڑا ہے کہ آپ اس چوری کی تحقیقات کرنے کی جگہ مجھے عورتوں کے پردے کی بحث میں اُلجھانا چاہتے ہیں۔"

سیٹھ جی : "بات یہ ہے انسپکٹر صاحب! کہ ہر شخص کو اپنے اپنے کام کی لگن ہوتی ہے۔ آپ کو ہمارے ہیرے کے چور کی تلاش ہے اور ہمیں ان گاہکوں کی تلاش جن کی جیب سے ہم اس نقصان کو پورا کر سکیں؟ اور یہ اِدھر اُدھر کی باتیں تو محض دل بہلانے کے لیے ہیں۔

ہنستا ہے (ہا ——— ہا ——— ہا)

(سمجھاتے ہوئے) ہر شخص اپنے پیشے کا چور ہوتا ہے انسپکٹر صاحب! اور دیکھیے پولیس کا وہی افسر چوروں کو پکڑ سکتا ہے جو ان کے طور طریقوں سے واقف ہو۔

(ہنستا ہے ہا ۔۔۔ ہا ۔۔۔ ہا)

(دروازہ کھلتا ہے آگے آگے سیٹھانی جی اور پیچھے پیچھے سلیم چائے کا ٹرے اٹھائے داخل ہوتا ہے)۔

شاہد حسین: (کھڑے ہو کر) آپ نے ناحق یہ تکلف کیا بیگم صاحب۔

سیٹھانی جی: (بڑے اطمینان سے) نہیں کوئی بات نہیں۔ آخر گھر میں کوئی مہمان آئے تو اس کی کچھ نہ کچھ خاطر تواضع تو کرنی ہی چاہیے۔

(سلیم ٹرے چائے کی ٹرالی پر رکھ دیتا ہے۔ سیٹھانی کرسی پر بیٹھ کر چائے بنانے لگتی ہے اور کہتی جاتی ہے) اور یہ چائے بھی کوئی تکلف کی چیز ہے۔ ہم تو دن میں دس دس مرتبہ چائے پی لیتے ہیں۔ (چائے کی پیالی شاہد حسین کی طرف بڑھاتی ہے)۔

شاہد حسین: شکریہ۔ بیگم صاحب۔ میں نے آپ کو یہاں تشریف لانے کی اس لیے تکلیف دی ہے کہ میں آپ سے اس ہیرے کی چوری کے بارے میں دو چار سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔

سیٹھانی جی: (بگڑ کر) ہیرے کی چوری کے بارے میں مجھ سے کیا سوال پوچھنا چاہتے ہیں آپ؟

شاہد حسین: اوّل تو یہی کہ آپ نے اس ہیرے کو کب دیکھا؟

سیٹھانی جی: (بگڑ کر) کبھی نہیں۔ مجھے سیٹھ جی اپنے جواہرات کہاں دکھاتے ہیں۔

شاہد حسین: خوب! تو آپ نے یہ ہیرا نہیں دیکھا؟

سیٹھانی جی: بالکل نہیں۔

شاہد حسین: اچھا تو یہ فرمائیے کہ سیٹھ جی اپنے جواہرات کہاں رکھتے ہیں؟

سیٹھانی جی: میں کیا جانوں کہاں رکھتے ہیں۔ ہاں گھر میں یہ تجوری ضرور رکھی ہوتی ہے۔

شاہد حسین: اور اس کی کنجی؟

سیٹھانی جی: سیٹھ جی ہی کے پاس ہوگی۔

شاہد حسین: کبھی آپ نے اس تجوری کو کھولا بھی ہے؟

سیٹھانی جی: کھولنے کا تو کیا ذکر میں نے تو کبھی سیٹھ صاحب کو اسے کھولتے بھی نہیں دیکھا۔

شاہد حسین: تو اس کے یہی معنی ہوئے کہ آپ نہیں جانتیں کہ اس تجوری میں کیا کچھ رکھا ہے۔

سیٹھانی جی: میں کیا جانوں؟

شاہد حسین: اور آپ اس تجوری کو کھولنا بھی نہیں جانتیں؟

سیٹھانی جی: جی نہیں۔

شاہد حسین: کبھی آپ نے سیٹھ صاحب سے بھی نہیں پوچھا کر تجوری کیسے کھولی جاتی ہے۔

سیٹھانی جی: (مسکراہٹ سے) اگر آپ کو تیس برس تک کسی جوہری کی بیوی کی حیثیت سے اس کے گھر میں رہنے کا اتفاق ہوتا تو آپ جان لیتے کہ ان روپے پیسے والے لوگوں کی بیویاں اپنے شوہروں سے ایسی باتیں نہیں پوچھا کرتیں۔

شاہد حسین: (حیرت سے) کیوں؟

سیٹھانی جی: (سادگی سے) اس لیے کہ وہ ان سے ہمیشہ یہی کہتے رہتے ہیں کہ آج کل روپے پیسے کی بہت کمی ہے اور بازار مندا ہے۔

شاہد حسین: اچھا تو یہ بتلائیے کہ کل صبح سے اس وقت تک اس مکان میں کون کون آیا؟

سیٹھانی جی: میں کیا جانوں۔

شاہد حسین: میرا مطلب یہ ہے کہ اس کمرے میں کون کون آیا؟

سیٹھانی جی: یہ ہمارے سونے کا کمرہ ہے اس میں میرے اور سیٹھ صاحب کے سوا اور کوئی نہیں آتا۔

شاہد حسین: (ہوشیاری سے) اور یہ آپ کا ملازم؟

سیٹھانی جی: (ہنسی سے) ملازم بھی کوئی ایسی چیز ہے کہ اس کا آنا جانا کسی کو یاد ہو۔ یہ تو حکم کا بندہ ہے جب بلایا آگیا جب کہا چلا گیا۔

شاہد حسین: اچھا تو بیگم صاحب کل اور آج آپ سے کوئی ملنے والا بھی یہاں آیا ہے؟

سیٹھانی جی: (غصہ اور حیرت سے) مجھ سے ملنے والا۔ مجھ سے ملنے والا کون آتا۔ شریفوں کے گھروں میں لوگ مردوں سے ملنے آتے ہیں عورتوں سے ملنے کوئی نہیں آتا۔

شاہد حسین: میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی آپ کی سہیلی کوئی دور و نزدیک کی رشتہ دار؟

سیٹھانی جی: (بات کاٹ کر) تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہماری سہیلیاں اور بھانجیاں اور بھتیجیاں چور ہیں۔

شاہد حسین: بیگم صاحب۔ آج کل کسی کا اعتبار نہیں۔ اور ہم پولیس والے تو جس گھر میں چوری ہو جاتی ہے اس میں ہر آنے جانے والے کو اس کے ہر رہنے والے کو اس وقت تک چور ہی سمجھتے ہیں جب تک اس کی بے گناہی ثابت نہ ہو جائے۔

سیٹھانی جی: تو اس حساب سے تو ہم بھی چور ٹھہرے۔

شاہد حسین: (مکاری سے) اب میں کیا کہہ سکتا ہوں؟

سیٹھانی جی: ایک تو ہماری چوری ہوئی اور پھر ہمیں پر الزام اور ہمیں سے پوچھ گچھ۔ صاحب اگر ہم چور ہوتے یا چور کو

جانتے تو آپ کو یہاں آنے کی تکلیف کیوں دیتے۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ اگر آپ کو چور کا کھوج لگانا ہے تو آپ کس مرض کی دوا ہیں۔

شاہد حسین : (اطمینان سے) میں چوری کا کھوج لگانے کی تو کوشش کر رہا ہوں۔ اچھا بیگم صاحب معاف کیجیے۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی مگر پولیس کو اپنا فرض ادا کرنا ہی ہوتا ہے۔ آپ آرام فرمائیے۔

(سلیم سے کہتا ہے)

میاں! بیگم صاحب تھک گئی ہوں گی۔ جائیے ان کے کمرے میں لے جاؤ۔

(سیٹھانی کچھ بڑبڑا کر جاتی ہے۔ سلیم ان کے پیچھے پیچھے ٹرالی لے جاتا ہے۔)

سیٹھ جی (شاہد حسین سے) ایسے ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے انسپکٹر صاحب۔ مگر سیٹھانی جی نے جو کچھ بھی کہا سچ کہا۔

شاہد حسین : (مکاری سے) جھوٹ تو وہی ہوتا ہے سیٹھ صاحب جو بالکل سچ نظر آئے۔ جو جھوٹ ظاہر ہو جائے وہ جھوٹ کہاں ہوتا ہے وہ تو سچ ہوتا ہے۔

سیٹھ جی : مگر یہ بات تو سچ ہے انسپکٹر صاحب کہ ہم لوگ اپنے روپے پیسے کا حال اپنی بیویوں کو نہیں بتاتے۔

(سلیم واپس آتا ہے)

(باہر کے دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

سیٹھ جی : (پریشان ہو کر) یہ اس وقت کون آ نکلا۔ یہ ظالم اتنا بھی نہیں جانتے کہ ملاقات سے پہلے وقت مقرر کر لینا چاہیے۔ سلیم جاؤ دیکھو کون صاحب ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اگر کوئی ضروری کام ہے تو ڈرائنگ روم میں انتظار کریں ورنہ پھر کسی وقت تشریف لائیں۔

(سلیم جاتا ہے)

شاہد حسین : (کچھ سوچتے ہوئے) سیٹھ صاحب جو کچھ میں نے سنا ہے اور جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس سے تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ہیرا اس گھر میں آیا ہی نہیں۔

سیٹھ جی : (حیران ہو کر) کیا فرماتے ہیں آپ! میں تو آٹھ روز تک اسے تجوری میں خود بند کر کے سوتا رہا ہوں۔

شاہد حسین : (جیب سے محمد علی حیدر علی کا کارڈ نکال کر پڑھتے ہوئے)

آپ اس محمد علی حیدر علی کو کب سے جانتے ہیں سیٹھ صاحب۔

سیٹھ جی : اسے جاننے کی کیا ضرورت ہے انسپکٹر صاحب۔ ہم لوگوں کو تو مال سے غرض ہوتی ہے اور مال بیچنے والے کو پیسے سے۔

شاہد حسین : اور اگر کوئی چوری کا مال بیچے؟

سیٹھ جی : (مسکراتے ہوئے) تو جو مال چور کا وہ اس کا۔

شاہ حسین : (تیوری بدل کر) چوری کا مال خریدنے والا بھی چوری کے الزام میں ماخوذ ہو سکتا ہے سیٹھ صاحب۔ آپ نے سُنا نہیں "مشتری ہوشیار باش۔"

سیٹھ جی : (بے پروائی سے) چوری کا مال کوئی ۸۰ ہزار روپے میں خریدا نہیں کرتا انسپکٹر صاحب۔

شاہ حسین : (کارڈ کو پھر جیب میں رکھتے ہوئے) بہر حال ہمیں آپ کے اس محمد علی حیدر علی کا سراغ لگانا ہی پڑے گا۔

(سلیم واپس آتا ہے)

سلیم : حضور کوئی صاحب آپ سے کسی بڑے ضروری کام کے لیے ملنا چاہتے ہیں اور اپنا نام انسپکٹر شاہ حسین بتاتے ہیں۔

سیٹھ جی : (حیران ہو کر) انسپکٹر شاہ حسین !

شاہ حسین : (کچھ بے چین سا ہو کر سوچتے ہوئے) ہُوں۔ ہُوں۔ انسپکٹر شاہ حسین۔ ہاں۔ سیٹھ صاحب انھیں یہیں بُلا لیجیے۔ اچھا ہُوا کہ میں وقت سے کچھ پہلے ہی آگیا۔

سیٹھ جی : (سلیم سے) "جاؤ۔ ان کو بلا لاؤ۔"

(سلیم جاتا ہے)

شاہ حسین ۱ : (سیٹھ جی سے) مگر سُنیے اس شخص کو میرا اتا پتا نہ بتائیے گا۔ اگر وہ پوچھیں تو یہی کہہ دیجیے گا کہ میں آپ کا ایک دوست ہُوں۔ اور ہیرے کی چوری کی خبر سُن کر آیا ہُوں۔

سیٹھ جی : (دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) "بہت بہتر۔ بہت اچھا۔"

(دروازہ کھلتا ہے۔ سلیم اور انسپکٹر شاہ حسین ۲ داخل ہوتے ہیں۔)

شاہ حسین ۲ : "آداب عرض کرتا ہوں۔ سیٹھ صاحب۔"

سیٹھ جی : (کھڑے ہو کر) "تسلیم۔ تسلیم۔ (سلیم سے) وہ کرسی ذرا آگے کو بڑھا دو۔"

سلیم کونے میں رکھی ہوئی کُرسی کو آگے بڑھا دیتا ہے۔

سیٹھ جی : "تشریف رکھیے۔ انسپکٹر صاحب۔"

شاہ حسین ۲ : (سلیم کو غور سے دیکھتا ہے۔ پھر سیٹھ جی سے مخاطب ہوتا ہے) اسمٰعیل بھائی آپ ہی کا نام ہے۔"

سیٹھ جی : (مسکرا کر)۔ اسماعیل بھائی تو میرے باپ کا نام تھا۔ میرا نام یوسف جی ہے اور پُورا نام یوسف جی اسماعیل بھائی۔"

شاہ حسین ۲ : "میں خفیہ پولیس۔ ۔ ۔ ۔ (رُک جاتا ہے) اور شاہ حسین ۱ کو مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہے اور کھنکارتا ہے (اہم۔ اہم)"

سیٹھ جی : کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ میرے ایک پُرانے دوست ہیں ہمارے ہیرے کی چوری کی خبر سُن کر آئے ہیں۔

شاہد حسین : (پھر کھکارتا ہے ۔ اہم ۔ اہم)
"خیر ، کیا میں آپ کے ملازم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں۔"
سیٹھ جی : "بڑی خوشی سے : (سلیم سے)
سلیم آگے بڑھو اور جو کچھ انسپکٹر صاحب پوچھیں اس کا صحیح صحیح جواب دو ۔"
سلیم : (رونی صورت بنا کر) "مجھے کچھ معلوم ہو سرکار تو جواب دوں ۔"
شاہد حسین : (سلیم کو غصے کی نظر دیکھ کر اور کڑک کر) "تم کو سب کچھ معلوم ہے ۔"
سلیم : (ڈرتے ہوئے) "مجھے . . . . . . مجھے تو سرکار کچھ بھی معلوم نہیں۔"
شاہد حسین : "اچھا یہ بتاؤ تم یہاں کب سے ملازم ہو ؟"
سلیم : (سوچتے ہوئے) "بڑی مدت ہو گئی سرکار ۔"
شاہد حسین : "آخر کتنے روز ــــ کتنے مہینے ــ کتنے برس ــــ ؟"
سلیم : " یہ تو میں نہیں کہہ سکتا ــــــ سرکار "
مگر ہو گئے ہوں گے ایسے کوئی دس بارہ سال ۔"
شاہد حسین : (سلیم کو غور سے دیکھتے ہوئے) "مگر پچھلے برس تو تم لاہور میں تھے ۔"
سلیم : (حیران ہو کر) " میں لاہور میں ــــــ ؟ ۔ صاحب میں نے تو لاہور کی صورت بھی نہیں دیکھی ۔"
(سلیم رونے لگتا ہے) ۔
شاہد حسین : " اب رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا ۔ (سلیم کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر) ۔ دکھیں تمھارا جوتا ۔ یہ تم نے کہاں سے خریدا ہے ؟"
سلیم : " کراچی میں حضور جوتوں کی کیا کمی ہے ۔ یہیں سے خریدا ہے (دائیں پاؤں کا جوتا اتار کر شاہد حسین ۲ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے اور سب کی آنکھ بچا کر بائیں پاؤں کا جوتا دائیں پاؤں میں پہن لیتا ہے ۔
شاہد حسین : (لکڑی کے بید سے جوتے کو ٹھونک کر اس کی آواز سنتا ہے) ٹھیک ۔ (جوتا واپس دیتے ہوئے) اب لاؤ تو ذرا دوسرے پاؤں کا جوتا ۔"
(سلیم جوتے کو لے کر بائیں پاؤں میں پہن لیتا ہے اور پھر اسی کو واپس دے دیتا ہے)
شاہد حسین : (جوتے کو ہاتھ میں لے کر)
"خوب دونوں جوتے دائیں پاؤں ہی کے " (سلیم سے) ذرا دکھیں تو تمھارے دوسرے پاؤں کا جوتا ۔ وہ جو اب تم نے اپنے دائیں پاؤں میں پہن رکھا ہے ۔"
سلیم : (کچھ مجبور سا ہو کر بائیں پاؤں کا جوتا جو اس نے اپنے دائیں پاؤں میں پہن رکھا ہے ۔ شاہد حسین ۲ کے

ہاتھوں میں دے دیتا ہے)

شاہد حسین ۲ : (جوتے کی ایڑی کو اپنے بیٹ سے ٹھونک کر اسے اپنے کان کے قریب لا کر اس کی آواز سنتا ہے۔ پھر جوتے ہی کی ایڑی کو باہر کی طرف کھینچتا ہے۔ ایڑھی میں ایک چھوٹا سا خانہ ہے اور اس میں ہیرا موجود ہے)۔

(خوشی اور کامیابی کے احساس سے ہیرا نکال کر سیٹھ صاحب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے) "لیجیے سیٹھ صاحب یہ رہا آپ کا ہیرا۔ اب میں آپ کے اس پرانے اور معتبر ملازم کو ذرا بڑے گھر کی ہوا کھلانے کے لیے تکلیف دینے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

(سیٹھ جی حیرت سے کبھی ہیرے کو کبھی سلیم کو اور کبھی شاہد حسین نمبر ۲ کو دیکھتے ہیں۔ اتنے میں شاہد حسین ۱ جیب سے اپنا پستول نکال کر شاہد حسین نمبر ۲ کی چھاتی کو اس کی زد میں لے لیتا ہے اور بڑے اطمینان سے کہتا ہے)۔

"ایسی جلدی کیا ہے۔ انسپکٹر صاحب۔"

شاہد حسین ۲ : (کسی قدر غصے میں)۔ "آپ کا اس حرکت سے مطلب۔"

شاہد حسین ۱ : "صرف یہی کہ میں آپ کی چال سمجھ گیا ہوں۔"

"سیٹھ صاحب۔ یہ شخص بھی آپ کے ملازم کا ساتھی ہے اور چور ہے۔ جو ہیرا اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ محض موم کا بنا ہوا (سیٹھ ہیرے کو دیکھنے لگتا ہے) نقلی ہیرا ہے۔ اصلی ہیرا اس وقت اس کی جیب میں پہنچ چکا ہے۔ (شاہد حسین نمبر ۲ سے مخاطب ہو کر) ہاں۔ ذرا اپنے ہاتھ تو اٹھا دو اور دیکھو۔ اگر تم نے ذرا سی بھی حرکت کی تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔"

شاہد حسین ۲ : (اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے)۔

شاہد حسین ۱ : "اب آپ اس کی جیبیں ٹٹول کر اپنا اصلی ہیرا نکال لیجیے سیٹھ صاحب۔" (سیٹھ جی شاہد حسین نمبر ۲ کی جیبیں ٹٹولنے لگتے ہیں کہ اتنے میں باہر کے دروازے کی گھنٹی کی آواز آتی ہے)۔

سیٹھ جی : (حیران ہو کر) "یہ اس وقت کون آگیا" دروازے کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔

شاہد حسین ۱ : "ذرا رک جائیے۔ سیٹھ صاحب۔ یہ بھی شاید انہی کی ٹولی کا کوئی آدمی ہے۔ مجھے ان دونوں کو کسی دوسرے کمرے میں بند کر لینے دیجیے۔ اور ذرا اپنا رومال تو مجھے دیجیے۔"

(سیٹھ صاحب اپنی جیب سے رومال نکال کر شاہد حسین نمبر ۱ کو دیتے ہیں۔ شاہد حسین نمبر ۱ ریوالور کی نالی دکھا دکھا کر سلیم کے منہ میں اپنا رومال اور اور شاہد حسین نمبر ۲ کے منہ میں سیٹھ صاحب کا رومال ٹھونس دیتا ہے اور پھر ان سے مخاطب ہوتا ہے۔)

شاہد حسین ۱ : "چلیے۔ ذرا سی دیر کے لیے۔ آپ دوسرے کمرے میں آرام فرمائیے۔" (سیٹھ جی بڑھ کر وہ دروازہ کھولتے

ہیں جو کوٹھی کے اندر گھستا ہے۔ شاہد حسین یہ کہتے ہوئے دُوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔)

شاہد حسین ۱ : (سیٹھ جی سے) "جب تک میں نہ آؤں۔ آپ یہیں ٹھہریئے۔"

سیٹھ جی : (اپنے آپ سے سوچتے ہوئے) "وہ بھی انسپکٹر شاہد حسین۔ یہ بھی انسپکٹر شاہد حسین۔ ہیرا گیا بھاڑ میں۔ میں نے پولیس کو کیا اطلاع دی اپنی جان کو عذاب میں ڈال لیا۔" شاہد حسین نمبر ۱ واپس آ جاتا ہے۔

شاہد حسین ۱ : (سیٹھ جی سے) "اب ذرا سی دیر کے لیے مجھے سیٹھ یوسف جی اسماعیل بھائی بننے کی اجازت دی جائے۔ آپ میرے وکیل ہیں اور ہیرے کی چوری کے بارے میں کوئی قانونی مشورہ دینے کے لیے اس وقت میرے ہاں تشریف لائے ہیں۔" (سیٹھ جی بیرونی دروازے کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں)۔

شاہد حسین ۱ : "آپ یہیں بیٹھیے۔ میں خود جا کر دیکھتا ہوں۔ کون آیا ہے۔"

(شاہد حسین نمبر ۱ جاتا ہے۔ سیٹھ جی پریشانی کی حالت میں سگریٹ جلا کر ایک زور کا کش لگاتے ہیں اور کمرے میں اِدھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر ٹہلنے لگتے ہیں۔ اتنے میں دروازہ کھلتا ہے۔ شاہد حسین نمبر ۱ ایک پولیس افسر کو ساتھ لیے داخل ہوتے ہیں اور سیٹھ جی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

شاہد حسین ۱ : (سیٹھ جی سے) "وکیل صاحب۔ خفیہ پولیس کے انسپکٹر شاہد حسین ہمارے ہیرے کی چوری کی تحقیقات کرنے آئے ہیں۔"

سیٹھ جی / نقلی وکیل : (چونک کر) "خفیہ پولیس کے انسپکٹر شاہد حسین۔ آیئے۔ آیئے! آپ خوب وقت پر پہنچے۔ چور تو پکڑا گیا ہے۔ اب ذرا چالان کا مسودہ تیار کیجیے۔"

شاہد حسین ۳ : "چور پکڑا گیا ہے؟ تو پھر آپ نے ہمیں اطلاع کیوں نہیں کی۔ کہاں ہیں وہ چور؟"

شاہد حسین ۱ : "ہم نے اسے اس کمرے میں بند کر رکھا ہے اور اسی انتظار میں تھے کہ آپ آ جائیں تو اسے آپ کے حوالے کر دیا جائے۔ چلیے چور بھی موجود ہے اور ہیرا بھی ابھی اس کی جیب ہی میں ہے۔"

(شاہد حسین ۱ بڑھ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ آگے آگے شاہد حسین نمبر ۳ اور اس کے پیچھے پیچھے شاہد حسین ۱ دُوسرے کمرے میں داخل ہوتے ہیں)

(شاہد حسین نمبر ۱ دروازہ بند کر لیتا ہے۔ سیٹھ جی بڑے اضطراب کی حالت میں کمرے میں ٹہلتے ہیں اور سگریٹ کا کش پر کش لگائے جاتے ہیں کبھی کبھی رُک کر کہتے ہیں)۔

سیٹھ جی : "یہ کتنے شاہد حسین پولیس میں بھرتی ہو گئے اور پھر سب کے سب انسپکٹر بھی بن گئے۔ اب ان تینوں میں کون اصلی شاہد حسین ہے (کچھ فیصلہ کر کے اور سگریٹ پھینک کر) ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا۔"

(اتنے میں کمرے سے کسی کے چیخنے اور چلّانے کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ انسپکٹر شاہد حسین نمبر ۱ واپس آتا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔)

شاہد حسین: (بڑی خوشی سے) "سب کے سب گرفتار ہو گئے۔ آج کا دن بھی کتنا مبارک دن ہے۔ چوروں کا ایسا خطرناک گروہ اور اس طرح قابو چڑھ گیا۔ یہ اپنی خوش قسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔ سیٹھ صاحب۔ لیجئے اب ذرا اپنے ہیروں کو حفاظت سے رکھا کیجیے۔ ایسے پنچھی روز روز جال میں نہیں پھنسا کرتے۔"

سیٹھ جی: (پریشان ہو کر) مگر وہ میرا ہیرا کہاں ہے انسپکٹر صاحب!

شاہد حسین: "وہ فی الحال سرکاری مال خانے میں رہے گا۔ آپ ہیرے کی ملکیت کا ثبوت دے دیں گے تو آپ کو مل جائے گا۔"

سیٹھ جی: "تعجب ہے۔ چور بھی پکڑے گئے اور ہیرا بھی ہاتھ نہ آیا۔"

(پچھلے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے۔ شاہد حسین نمبر ۲ اور سلیم بڑی خاموشی سے داخل ہوتے ہیں۔ دونوں کے ہاتھ میں ریوالور ہیں جو سیٹھ صاحب کو اپنی زد میں لیے ہوئے ہیں۔)

شاہد حسین: (اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے اور کسی قدر طنز یہ لہجے میں)۔ اب کے اگر کوئی قیمتی ہیرا ہاتھ آ جائے تو اسے ذرا حفاظت سے رکھیے گا۔ نوکروں کا آج کل کوئی اعتبار نہیں۔ بالکل ممکن ہے کہ اس وقت بھی آپ شہر کے تین نامی چوروں کے نرغے میں پھنسے ہوئے ہوں اور وہ آپ کی تجوری کی تاک میں ہوں۔ (سیٹھ یوسف جی گھبرا کر اپنے اردگرد نظر ڈالتے ہیں) شاہد حسین نمبرا بھی اپنا ریوالور نکال کر سیٹھ صاحب کو اس کی زد میں لے لیتا ہے۔ سلیم۔ آگے بڑھ کر سیٹھ جی کی پتلون کی جیب ٹٹول کر کنجیوں کا گچھا نکالتا ہے اور تجوری کی طرف بڑھتا ہے

(سیٹھ یوسف جی کی زبان پریشانی سے لڑکھڑا رہی ہے۔)

سیٹھ جی: آ آ آ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟

شاہد حسین: "یہی کہ ——— ذرا ہمیں اجازت دیجیے کہ آپ کو اس کرسی کے ساتھ باندھ دیں تاکہ آپ کم از کم تھوڑی سی دیر کے لیے آرام تو کر سکیں۔ دیکھیے نا۔ آپ رات بھر نہیں سوئے۔ سیٹھ صاحب!"
(جیب سے ایک مضبوط رسی نکال کر سیٹھ یوسف جی کو کرسی کے باندھ کر بے دست و پا کر دیتا ہے (اور تمسخر سے کہتا ہے) اور وہ آپ کے انسپکٹر شاہد حسین بھی اسی طرح دوسرے کمرے میں کرسی پر آرام فرما رہے ہیں۔)

(سلیم تجوری کھول کر وہ سب جواہرات جو تجوری میں رکھے ہیں نکال کر ایک رومال میں باندھ لیتا ہے اور انھیں شاہد حسین نمبر ۲ کے حوالے کر دیتا ہے۔)

شاہد حسین: "لیجیے سیٹھ صاحب ——— خدا حافظ ——— آج کا تماشا تو ختم ہوا۔ جب آپ پھر کسی بیش قیمت ہیرے کو بہت سستے داموں خرید یں گے تو ہم آپ کی ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لیے حاضر ہو

جائیں گے ——— آداب عرض ——— معاف کیجیے آپ کو بہت زحمت دی ہم نے

سیٹھ جی : (گھبرا کر چلاتا ہے) ارے کوئی ہے —— بندو —— کریم —— سیٹھانی —— کیا سب کو سانپ سونگھ گیا ہے۔"

شاہد حسین ۱ : "سانپ نہیں سونگھا سیٹھ صاحب۔ سب اپنے اپنے بستر پر میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ مگر ایک ذرا سی زحمت اور گوارا کر لیجیے۔ سیٹھ صاحب!" (جیب سے رومال نکال کر سیٹھ جی کے منہ میں ٹھونس دیتا ہے۔ سیٹھ جی بے بسی میں ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور شور مچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کلاک میں دس بجتے ہیں۔ شاہد حسین نمبر۱ شاہد حسین نمبر۲ اور سلیم اپنے ریوالور جیب میں ڈال کر دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔ اتنے میں دروازہ کھلتا ہے اور ایک شخص ڈبل بیرل پستول کی نالی سامنے کیے داخل ہوتا ہے۔

شاہد حسین ۱ : (گھبرا کر) "کون؟"

شاہد حسین ۲ : "کون ہو تم؟"

(آنے والا شخص بڑے اطمینان سے)

"خفیہ پولیس کا انسپکٹر شاہد حسین۔"

شاہد حسین ۱ : (گھبرا کر) "اجازت کے بغیر کسی کے گھر میں اس طرح گھس آنے کا مطلب۔"

شاہد حسین ۴ : (طنز سے مسکرا کر) یہی سوال میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ اب بھاگنے کی کوشش نہ کیجیے۔ کوٹھی کے چاروں طرف پولیس کا پہرہ لگا ہے۔ اور جس شخص کو تم شاہد حسین سمجھ کر کمرے میں بند کر آئے ہو۔ میرا سب انسپکٹر ہے۔ اب میں ذرا آپ لوگوں سے بے تکلف ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔

"اپنے ہاتھ بڑھا دیجیے۔"

تینوں مجرم ہچکچاتے ہیں۔

شاہد حسین ۴ : (کڑک کر) "بڑھاؤ ہاتھ۔"

(تینوں ہاتھ بڑھا دیتے ہیں۔)

"شاباش! ایسے۔"

(تینوں کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دیتا ہے اور شاہد حسین ۲ کی جیب سے اصلی ہیرا نکال لیتا ہے) سیٹی بجاتا ہے۔ پولیس کے چار سپاہی داخل ہوتے ہیں اور سیلوٹ کرتے ہیں۔)

شاہد حسین ۴ : (ہتھکڑیوں کی زنجیریں تین سپاہیوں کے ہاتھوں میں دے دیتا ہے اور چوتھے سے کہتا ہے) تم اس کمرے

میں جا کر سب انسپکٹر صاحب کو ہمارا سلام دو (سپاہی سیلوٹ کر کے جاتا ہے۔ شاہ حسین نمبر ۴ بڑھ کر سیٹھ صاحب کے مُنہ سے رومال نکال دیتا ہے اور جس رسّی سے وہ بندھے ہیں اسے کھولنا شروع کر دیتا ہے۔

سیٹھ یوسف جی: (بڑی حیرت اور مسرت سے)

"تو اصلی شاہ حسین آپ ہیں ؟"

شاہ حسین ۴: جی! اور یہ رہا آپ کا ہیرا۔

سیٹھ جی خوشی سے دیوانہ وار ہنستا ہے اور شاہ حسین سے لپٹ جاتا ہے۔

بشکریہ ریجنل ڈائرکٹر ٹیلی ویژن لاہور

نقصان

انور

میں لالوکھیت میں رہتا ہوں۔ وہ لالوکھیت جس نے اپنا گھنیا، بدصورت نام بدل کر لیاقت آباد بننے کی کوشش کی، لیکن لالوکھیت کا لالوکھیت ہی رہا۔ وہ لالوکھیت جس نے ۱۹۶۵ء کی تاریخ میں ۴ جنوری کے سیاہ صفحے پر اپنی سیاہ مہر ثبت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اس میں ابھی لیاقت آباد بننے کی لیاقت نہیں۔

جہاں اب لالوکھیت کے سیمنٹ کے گھروندے اور ٹاٹ کی جھونپڑیاں ہیں، وہاں آج سے پندرہ سال پہلے زرد رنگ کی مٹی کے اونچے نیچے بھوسے پتھروں کے بڑے خوب صورت ٹیلے تھے اور گجر نالے کی گہرائی میں خاموشی آرام کی نیند سو رہی تھی اور سنسان بیابان کی فضاؤں میں سکون کا طلسم آباد تھا۔

پھر گجر نالے کی گہرائی اور ٹیلوں کی اونچائی کے احتجاج کے باوجود اس علاقے کو مکھیوں، مچھروں اور مہاجروں کی آبادکاری کے لیے انتخاب کر لیا گیا۔ اب یہ تینوں قومیں لاکھوں کی تعداد میں بڑی صلح و آشتی سے یہاں زندگی کے دن کاٹ رہی ہیں۔

میں بھی یہیں رہتا ہوں، لیکن میں نے یہاں کی زندگی سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہاں رہنے والے مہاجروں سے تو میری بڑی دوستی ہے، لیکن مکھیوں اور مچھروں سے سمجھوتہ ناممکن ہے، کیونکہ یہاں کی مکھیاں اور مچھر مجھے اپنی راشن شاپ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اور میں راشن شاپ نہیں ہوں، افسانہ نگار ہوں۔

میں ایک کوٹھری میں اکیلا رہتا ہوں اور میرے مقابلے میں مکھیوں اور مچھروں کی تعداد ان گنت ہے۔ ظاہر ہے میں اکیلا دشمن کی اتنی بڑی تعداد کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہوں۔ چنانچہ میں جھنجلا کر چیخ اٹھتا ہوں:

"میں لالوکھیت میں نہیں رہوں گا۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

یہ سن کر میرے دروازے پر بدبودار پانی اور کیچڑ کی نالی جس کو میں پیار سے دریائے نیل کہتا ہوں، میری دہلیز پر چڑھ کر اندر آجاتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے:-

"کہاں؟"

میں چپ ہو جاتا ہوں اور اپنی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر افسانہ لکھنے لگتا ہوں۔

لیکن افسانہ کہاں لکھا جاتا ہے۔ مکھیاں مارتا ہوں، یا مچھروں کے پیچھے بھاگتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ افسانہ لکھ سکتا ہوں، نہ مکھیاں مار سکتا ہوں اور نہ مچھروں کا شکار کر سکتا ہوں۔ بلکہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگتا ہوں:

"میں جا رہا ہوں۔ میں لالوکھیت میں نہیں رہوں گا۔ اگر میں لالوکھیت میں رہا تو افسانہ نگار نہیں رہوں گا۔ راشن شاپ بن جاؤں گا۔

میں جارہا ہوں"۔

میری چیخ و پکار کو گندے پانی اور کیچڑ کی نالی میں یکایک طغیانی آجاتی ہے اور وہ اندر آ کر سوال کرتی ہے :

"کہاں ؟"

میں جواب دیتا ہوں :

"کیماڑی"

وہ پوچھتی ہے :

"کیوں ؟"

میں کہتا ہوں :

"خودکشی کرنے کے لیے"

عین اس وقت شیر خاں آجاتا ہے اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :

"چلو !"

میں بغیر کسی حیل و حجت کے اس کی ٹیکسی میں بیٹھ جاتا ہوں اور وہ مجھے جوتوں کی دکان پر چھوڑ آتا ہے، جہاں میں ملازم ہوں۔

ہمارا ادب ایک خود غرض سرمایہ دار ہے جو اپنے مزدوروں کو نہ کوئی اُجرت دیتا ہے اور نہ کوئی بونس۔ وہ ان سے بے لوث، بلا معاوضہ خدمت مانگتا ہے۔ اس لیے ہمارے ادیب اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے کہیں نہ کہیں ملازمت کرتے ہیں، چنانچہ ادب کی بے لوث خدمت کرنے کے لیے میں ایک جوتوں کی دکان پر ملازم ہوں۔

یہ بات میں نے شیر خاں سے کہی تھی جب اس نے ٹیکسی خریدنے کے بعد پہلے دن مجھے جوتوں کی دکان پر چھوڑا تھا اور حیران ہو کر کہا تھا :

"خوچے یہ کیا ؟ کہاں ادیب اور کہاں جوتوں کی دکان !"

شیر خاں کو جب میں نے پہلی دفعہ دیکھا، میں ڈر گیا۔

اس دن جوتوں کی دکان بند تھی۔ میں چھٹی پر تھا اور بسوں کے اڈے پر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس دن میں اپنے ایک ادیب دوست کے ہاں جا رہا تھا۔ میرا وہ ادیب دوست کراچی کے ایک مقابلتاً بہتر علاقے میں رہتا تھا۔ پچھلی دفعہ جب وہ مجھے ملا تھا تو اُس نے مجھے لالوکھیت سے اپنے ہاں منتقل ہونے کی پیش کش کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں اُس دن شام کو لالوکھیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دوں گا۔

ایک راشہ میری طرف بڑھا۔

راشہ ایک روایتی قسم کے پٹھان کو کہتے ہیں جو خوشحال خاں خٹک کے فوجیوں کا تاریخی لباس پہنتا ہے۔ دلکش گھٹنے کی شلوار جس کا بل کھاتا ہوا گھیر ٹانگوں کو دو منقش گرز بنا دیتا ہے۔ کفوں اور کالروں کے بغیر لٹھے کی لمبی قمیض کے اوپر کالی صدری جس پر جیب کے بٹنوں کی قطار

مشکل سے ساٹھ کے لپیٹے میں آئی ہوگی۔ سر پر سیاہ چمکدار بالوں کے پٹے جو مشہدی پگڑی کے نیچے سے جھانک رہے ہیں، سرخ و سفید چہرے پر بڑی بڑی سیاہ مونچھیں اور پیروں میں ذرا ہی فرسودہ جوتے کہ چپلی چپل تاکہ یہ چوڑی مضبوط ہڈیاں اور یہ سیکڑوں پیروں کی گوشت زمین میں دھنس جانے سے بچ گیا۔

ماشہ لوٹی پھوٹی اردو میں باتیں کرنے لگا، جس کو میں سلیس اردو میں پیش کرتا ہوں۔

"اگر آپ کے پاس وقت ہو، تو میں ایک بات بتانا چاہتا ہوں"

میں نے کہا:

"بتاؤ۔ خان، کیا بات ہے؟"

وہ بولا:

"میں کل عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد لالوکھیت کی مسجد میں سو گیا تھا۔ کیونکہ کراچی میں میرا کوئی مکان نہیں ہے۔ میرے پاس خشک میووں کی ایک گٹھڑی تھی جس کا وزن بیس سیر تھا۔ اور کچھ نقدی تھی جیب میں۔ صبح کو اٹھا تو میں نے دیکھا کہ میری گٹھڑی اور نقدی غائب تھی۔ اگر ممکن ہو تو مجھے لانڈھی تک کا بس کا کرایہ دے دیجئے۔ لانڈھی میں میرے کچھ دوست رہتے ہیں۔ میں ان کے پاس جانا چاہتا ہوں"

مجھ پر جو ایک خفیف سا خوف طاری تھا، وہ رفع ہو گیا۔ میں نے خاموش، ہمدرد نگاہوں سے پٹھان کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ یہ دیوہیکل انسان دیو نہیں ہے۔ صرف انسان ہے جس کی چوڑی چکلی ہڈیوں اور منوں وزنی گوشت کو چند سکوں کی ضرورت کمزور کر دیتی ہے۔

میں نے کہا:

"خان، تم نے ناشتہ کیا ہے؟"

خان نے جواب دیا:

"نہیں۔ رات کو مسجد کے ملا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے ناشتے کا انتظام کر دے گا۔ لیکن آج صبح وہ اپنے حجرے میں نہیں تھا۔ فجر کی نماز بھی میں نے پڑھائی تھی"

میں نے کہا:

"آؤ، میرے ساتھ"

میں خان کو ایک ہوٹل کی طرف لے گیا۔ راستے میں میں نے اُس سے کہا:

"خان، یہ تو صاف چوری کا کیس ہے جو ملا نے کی ہے۔ کیوں نہ پولیس کو رپورٹ کی جائے؟"

خان نے جواب دیا:

"نہیں۔ اگر میرے میوے بیچ کر اور میری نقدی سے ملا کی کوئی ضرورت پوری ہو گئی ہے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ چوری دوسروں کی دولت میں سے اپنا حصہ مانگنے کا ایک طریقہ ہے۔ اور اپنی دولت میں سے ضرورت مندوں کو ایک حصہ دینا زکوٰۃ کہلاتا ہے۔ اس لیے چوری اور زکوٰۃ ایک ہی چیز کی دو شکلیں ہیں۔ لوگ اپنی آمدنی میں سے زکوٰۃ نکالنا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے ضرورت مند ان سے زبردستی زکوٰۃ چھین لیتے ہیں۔ اس کا

مطلب یہ ہے کہ اگر زکوٰۃ نہ دینا جائز ہے تو چوری بھی جائز ہے۔

مجھے خان کی یہ بات بہت پسند آئی۔ میں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے ہنس کر کہا:

"خان، تم بڑے دولتمند معلوم ہوتے ہو جو اتنی خندہ پیشانی سے یہ زکوٰۃ دینے پر رضامند ہو گئے ہو۔"

اس نے جواب دیا:

"جی نہیں۔ اس وقت میں بالکل مفلس ہوں۔ شاید میں نے اپنی آنے والی دولت میں سے پیشگی زکوٰۃ دی ہے۔"

خان کی شخصیت اور خان کی یہ باتیں میرے دل میں اتر گئیں۔

ہوٹل میں پہنچ کر ہم ایک میز پر بیٹھ گئے۔

میں نے کہا:

"خان۔ میرے آج کے بجٹ میں صرف ایک روپیہ ہے۔ اس لیے اس کے جمع اور خرچ کا گوشوارہ اس طرح ہوگا۔ ناشتہ چار آنے، تمہارا لانڈھی کا کرایہ آٹھ آنے۔ میرا بس کا کرایہ چار آنے۔ میزان ایک روپیہ۔ آمدنی ایک روپیہ"

خان احتجاج کے طور پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا:

"نہیں نہیں مجھے ناشتہ نہیں چاہیے۔ مجھے ناشتہ نہیں چاہیے۔"

لیکن ناشتہ آچکا تھا۔ دو سنگل چائے اور دو کھارے بسکٹ۔

میرے اصرار پر اس نے ناشتہ لے لیا۔ ایک سنگل چائے۔ دو کھارے بسکٹ۔ اس کے اصرار کے باوجود میں نے بسکٹ نہیں لیا، کیونکہ میں ایک سنگل چائے اور ایک بسکٹ کا ناشتہ کر چکا تھا۔

ناشتہ کرتے وقت میں نے کہا:

"خان، جب تم پھر لالوکھیت میں آؤ، تو مسجد میں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس ٹھہرو۔ وہ دیکھو، سامنے میری کوٹھڑی ہے۔ وہ جہاں نیلے گندے پانی کی نالی چوڑی ہو کر جھیل بن گئی ہے۔ گندگی اور کیچڑ جب میرے دروازے کے سامنے گذرتے ہیں تو خوشی سے اپنے آپ میں نہیں سماتے، اور میری دہلیز سے ٹکرا کر بڑے احترام سے آداب کرتے ہوئے گذرتے ہیں۔ مجھے یہ جگہ بڑی ناپسند ہے۔ یہ بڑی گندی جگہ ہے۔ میں اس کو چھوڑنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن یہاں کی گندگی کو اور بدبو کو اور مچھروں کو اور مکھیوں کو مجھ سے اتنی محبت ہے کہ وہ مجھے یہاں سے ہلنے نہیں دیتے۔"

خان نے میری کوٹھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"کونسی کوٹھڑی؟ وہ جس کے نیلے دروازے اور کھڑکیاں ہیں؟"

میں نے جواب دیا:

"ہاں"

وہ بولا:

"یہ تو بڑی اچھی جگہ ہے۔ نالی کے نیلے پانی پر نیلے دروازے اور کھڑکیاں کتنے اچھے لگتے ہیں۔ کوئی جگہ جہاں انسان رہتا ہو، خراب نہیں

ہو سکتی۔ انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات پیدا کیا ہے۔ انسان جہاں جاتا ہے، جہاں رہتا ہے، اس جگہ کو اس کی موجودگی سے شرف حاصل ہو جاتا ہے، عظمت نصیب ہو جاتی ہے۔ جگہ کی بڑائی وہاں کے صوفوں اور فانوسوں سے نہیں ہوتی، انسان سے ہوتی ہے۔ انسان جس چٹائی پر بیٹھ جائے وہی صوفہ ہو جاتی ہے۔ جس مٹی کے دیے سے روشنی حاصل کرے وہی فانوس بن جاتا ہے اور انسان میں اتنی قابلیت ہے کہ وہ جب وہ چاہے چٹائی کی جگہ صوفہ بچھا لیتا ہے۔ مٹی کے دیے کی جگہ فانوس لگا دیتا ہے۔ بدبو کو خوشبو میں تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ گندگی کو نفاست سے بدل ڈالتا ہے۔ مکھیوں اور مچھروں کے ماحول کو تعفن اور جبوں کا ماحول دے دیتا ہے۔ وہ شخص جو مچھروں، مکھیوں، گندگی اور بدبو سے بھاگ کر کسی ایسے مقام پر جانے کی کوشش کرتا ہے، جہاں یہ چیزیں موجود نہ ہوں، ایسے سپاہی کی مثال ہے جو جنگ کے میدان سے بھاگ کر کسی محفوظ مقام پر چھپنا چاہتا ہو۔ کیا انسان کو مچھروں اور مکھیوں جیسے حقیر کیڑوں سے شکست کھا جانی چاہیے؟ کیا انسان گندگی اور بدبو جیسی ذلیل چیزوں کے سامنے ہتھیار ڈال سکتا ہے؟"

میں حیرت زدہ توجہ کے ساتھ خان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ پختون لہجے میں لنگڑی لولی اردو بول رہا تھا۔ اس کا استدلال یہی تھا اگرچہ اس کے بیان میں وہ ربط اور تسلسل نہ تھا جو میں نے پیدا کر دیا ہے۔

خان نے اپنی بات جاری رکھی:

"کیا یہ انسان جو گجر نالے کی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں، ان انسانوں سے کم ہیں جو کلفٹن کے بنگلوں میں رہتے ہیں۔ بالکل نہیں۔ ان میں کمیاں ہیں۔ لیکن وہ کم نہیں ہیں۔ ان میں دولت اور تعلیم کی کمیاں ہیں۔ ان کو تعلیم اور دولت سے آراستہ کر دو۔ گجر نالے کی گہرائی کلفٹن کی بلندی بن جائے گی۔ یہ کمیاں خارجی کمیاں ہیں، بنیادی کمیاں نہیں۔ بنیادی طور پر تمام انسانوں میں مکمل مساوات ہے۔ دراصل حقیقی کمی دولت کی کمی ہے۔ تعلیمی کمی اضافی ہے۔ میں پشتو جانتا ہوں انگریزی نہیں جانتا۔ ان پڑھ ہوں۔ آپ اردو جانتے ہیں انگریزی نہیں جانتے۔ ان پڑھ ہیں۔ اس طرح اگر آپ سماج کی مصنوعی درجہ بندی پر غور کرتے چلے جائیں تو یہ کہیں ختم نہیں ہوتی۔ بنیادی حقیقت انسان کی بنیادی مساوات ہے۔ اس لیے جس طرح لالوکھیت کے باشندوں اور کلفٹن کے باشندوں میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں اسی طرح لالوکھیت کی جھونپڑیوں اور کلفٹن کے محلوں میں بھی کوئی فرق نہیں۔ اگر آپ اپنے نیلے دروازوں والے گھر کو جہاں دوسرے علاقوں کے مقابلے میں گندگی، بیماری اور غریبی زیادہ مقدار میں پائی جاتی ہے چھوڑ کر دوسرے علاقوں کی طرف بھاگیں گے، تو آپ پاکستان کو جس میں دوسرے ملکوں کے مقابلے میں گندگی، بیماری اور غریبی زیادہ مقدار میں پائی جاتی ہے، چھوڑ کر کہاں جائیں گے؟"

اب گفتگو خطیبانہ، طولانی اور بور ہو گئی تھی۔ ناشتہ ختم ہو چکا تھا۔ ہم اٹھ کر بسوں کے اڈے کی طرف چل پڑے۔

راستے میں میں نے خواہ مخواہ بات کرنے کے لیے کہہ دیا:

"امد خان، تم بھی تو اپنا گھر چھوڑ کر کراچی آ گئے ہو۔ پھر مجھے لالوکھیت چھوڑنے سے کیوں منع کرتے ہو؟"

وہ جوش میں آ گیا اور بولا:

"خدا کی قسم، میرا گھر اور میرا گاؤں کراچی سے بہت خوب صورت ہے۔ میں کراچی میں صرف روزگار کی تلاش میں آیا ہوں۔ میرا جسم یہاں ہے بلکہ میرا ذہن وہاں ہے، ہمارے گاؤں کی زمین پنجاب کی زمین کی طرح زرخیز نہیں۔ پنجاب کی زمین میں ہل چلا کر روزی پیدا کی جاتی ہے۔ لیکن ہماری زمین پتھریلی ہے۔ ہم ہل کی بجائے رائفل سے روزی پیدا کرتے ہیں۔ انگریزوں کے وقتوں میں یہ کام آسان تھا۔ درۂ خیبر میں داخل ہونے والے فوجی ٹرکوں پر چھاپے مارے جاتے تھے یا پشاور میں سرکاری خزانوں کو لوٹا جاتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ہماری روزی کا یہ ذریعہ بند ہو گیا۔ اب ہم اپنی

مزدوری کمانے کے لیے جاتے ہیں۔ میں کراچی میں کئی دفعہ آیا ہوں۔ ہر دفعہ میں یہاں سے روپیہ جمع کر کے اپنے گاؤں لے گیا ہوں اور اس کو اپنے گاؤں کی حالت بہتر بنانے میں صرف کیا ہے۔ میرا گاؤں لنڈی کوتل سے اٹھارہ میل دور ہے۔ میں نے لنڈی کوتل سے کھاد اور مٹی خرید کر گدھوں کی پیٹھ پر اپنے گاؤں میں لا کر اپنے کھیت اور باغ بنائے ہیں۔"

لنڈی کوتل کا تذکرہ سن کر میں چونک گیا اور میرے لیے دلچسپی کا ایک اور پہلو نکل آیا۔ میں نے کہا:

"لنڈی کوتل میں میرے دو بہت عزیز دوست رہتے ہیں۔ شاید آپ اُن کو جانتے ہوں؟"

اس نے پوچھا:

"کون؟"

میں نے کہا:

"امیر حمزہ شنواری اور مراد شنواری۔"

وہ بولا:

"ہاں میں اُن کو جانتا ہوں۔ امیر حمزہ شنواری ہمارے وقت کا سب سے بڑا شاعر ادیب اور فلسفی ہے اور مراد شنواری نوجوان شاعروں کی نئی پود کا سربراہ ہے۔ میں نے خوگا خیل میں امیر حمزہ شنواری کے حجرے میں پشتو کے بہت سے مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ خصوصاً وہ مشاعرہ جو امیر حمزہ شنواری ہر سال بامر شنواری مرحوم کی یاد میں منعقد کراتے ہیں۔ بامر شنواری ایک جواں سال ہونہار شاعر تھا جو تپدق سے فوت ہو گیا تھا۔ وہ امیر حمزہ شنواری کا شاگرد تھا اور ان کو اس سے بہت محبت تھی۔ امیر حمزہ شنواری بامر شنواری کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے اس سے ناراض ہو گئے تھے۔ بامر شنواری ایک نوجوان لڑکے سے بہت ملنے جلنے لگ گیا تھا اور امیر حمزہ شنواری یہ بات پسند نہیں کرتے تھے۔ جب اُن کے منع کرنے پر بھی بامر شنواری نے اس لڑکے سے ملنا جلنا بند نہ کیا تو وہ اس سے ناراض ہو گئے۔ لیکن امیر حمزہ شنواری کو بامر شنواری کی موت کا بہت رنج ہوا۔ اب وہ ہر سال اس کی یاد میں ایک مشاعرہ کراتے ہیں اور اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد کہتے ہیں: تم نے ایک لڑکے کے لیے مجھے چھوڑ دیا، لیکن میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ امیر حمزہ شنواری اس مشاعرے میں مجھے خاص طور پر مدعو کرتے ہیں کیونکہ میں ہی وہ لڑکا تھا جس کی وجہ سے امیر حمزہ شنواری اور بامر شنواری میں اَن بن ہوئی تھی۔"

اب خان میں میری دلچسپی دوچند ہو گئی اور میرے لیے اس کا نام جاننا ضروری ہو گیا۔ میں نے تعارف کی درخواست کی، اپنا نام بتایا اور خان کا اسمِ گرامی پوچھا۔

خان نے کہا:

"میرا نام شیر خان ہے۔"

شیر خان نے بس پر سوار ہوتے وقت مجھ سے کہا کہ وہ پرسوں کو ۹ بجے شام کو میرے ہاں آئے گا۔ میں نے اُسے خدا حافظ کہا اور ایک بس پر اپنے ادیب دوست کے ہاں جانے کے لیے سوار ہو گیا۔

اپنے دوست کے علاقے میں پہنچ کر میں اس کا گھر بھول گیا۔ مجھے یاد آیا کہ میرے دوست کا گھر مسجد کے سامنے ہے۔ میں نے ایک

شخص سے مسجد کا راستہ بتانے کی درخواست کی۔ وہ بڑا مومن آدمی تھا۔ اُس نے کہا: میں مسجد کو جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ آئیے۔ ہم دونوں مسجد کی طرف چل پڑے۔ مسجد کے سامنے پہنچ کر اس مومن شخص نے کہا: یہ ہے مسجد۔ آئیے نماز کا وقت تنگ ہے۔ میں نے کہا: السلام علیکم میرے دوست کا گھر مسجد کے سامنے ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔

میرے دوست کے گھر میں میرا دوست نہیں تھا۔ مالک مکان بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے اپنے دوست کے بارے میں پوچھا، وہ مجھ پر برس پڑا: تم کون ہو جی۔ میں نے کہا: میں اس کا دوست ہوں۔ وہ بولا: تو پھر تمہیں معلوم ہو گا کہ تمہارا دوست کہاں ہے۔ مجھے بتاؤ تمہارا دوست کہاں ہے۔ وہ میرا تین مہینے کا کرایہ دے کر بھاگ گیا ہے۔ میں نے کہا: مجھے بالکل معلوم نہیں میرا دوست کہاں ہے۔ اس نے پوچھا: کیا وہ تم ہی ہو جس نے اس کے ساتھ آج شام کو اس کے گھر میں آ کر ٹھہرنے کا وعدہ کیا تھا: میں نے کہا: ہاں۔ اُس نے اُٹھ کر مجھے بازو سے پکڑ لیا اور بولا: تو میرا کرایہ نکالو۔ تمہارے دوست نے کہا تھا آج شام کو اس کا ایک دوست اس کے ساتھ ٹھہرنے کے لیے آ رہا ہے۔ وہ اس سے تین مہینے کا کرایہ لے کر مجھے دے گا۔ اگر تم ہی وہ شخص ہو تو نکالو میرا کرایہ۔ میں نے پوچھا: آخر میرا دوست کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا: اس نے تمہارا بہت انتظار کیا۔ جب تم نہ آئے تو وہ تمہیں ڈھونڈنے اور تم سے روپے لینے کے لیے گیا ہے۔ اب اگر تم روپے لے آئے ہو تو نکالو۔ میں نے کہا: ٹھہریے۔ نماز کا وقت بہت تنگ ہے۔ نماز پڑھ لوں۔ پھر دیتا ہوں۔ اُس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ میں مسجد کے ایک دروازے میں داخل ہو کر دوسرے سے نکل گیا۔

اور پھر وہی مچھر، وہی مکھیاں، وہی گندگی، وہی بدبو۔

تیسرے دن شیر خاں خشک میووں کی بڑی بڑی گٹھڑیاں اور پھلوں کی ایک ٹوکری لے کر آ گیا۔ اُس نے میرے سامنے باداموں، کشمشوں، پستوں، چلغوزوں اور پھلوں کے ڈھیر لگا دیے اور بولا:

"کھاؤ، دوست!"

پھر اس نے دس روپے کا ایک نوٹ میرے سامنے رکھ کر کہا:

"اور یہ لو اپنے آٹھ آنے"

میں نے سخت احتجاج کیا:

"نہیں نہیں۔ میں روپے نہیں لوں گا۔ میں روپے ہرگز نہیں لوں گا۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور نہ روپے میرے سامنے سے اٹھائے۔

ہم مغرب کی نماز تک میوے اور پھل کھاتے رہے اور جب تک ہم میوے اور پھل کھاتے رہے۔ میری کوٹھڑی میں نہ کوئی مچھر تھا اور نہ مکھی۔ صرف بادام، کشمش، چلغوزے اور پستے تھے۔

پھر شیر خاں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا:

"میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ نماز کے بعد ہم چپل کباب اور نان کھائیں گے۔"

میں نے جلدی سے کہا:

"شیر خان، یہ دو پیسے لو"

شیر خان نے دس روپے میرے سامنے سے اٹھاتے ہوئے کہا:

"اگر آپ قرضِ حسنہ واپس لینے سے انکار کرتے ہیں، تو میں یہ دس روپے اُس مسجد کے ملّا کو دے دوں گا، جس نے میری چوری کی تھی، تاکہ وہ پھر چوری نہ کرے"

شیر خاں نماز پڑھنے چلا گیا۔

شیر خاں تین دن تک میرے پاس رہا۔ دن کو وہ لالو کھیت کی مین روڈ کے فٹ پاتھ پر خشک میووں کی ڈھیریاں لگا کر بیٹھ جاتا۔ صبح اور رات کا کھانا ہم اکٹھے کھاتے اور رات کو وہ میری کوٹھڑی کے فرش پر سو جاتا۔

پھر جب میووں کی گٹھڑیاں ختم ہو گئیں۔ تو شیر خاں لالو کھیت سے چلا گیا۔

اس کا معمول تھا کہ وہ کراچی کے مختلف علاقوں میں تین تین چار چار دن کے لیے جاتا۔ دن کو فٹ پاتھوں پر بیٹھ کر خشک میوے بیچتا، اور رات کو اس علاقے کی مسجد میں سو جاتا۔ اور جب وہ لالو کھیت میں آتا تو میرے پاس ٹھہرتا۔

پھر وہ ایک لمبے عرصے کے لیے غائب ہو گیا۔

اور پھر یکایک ایک موٹر رکشا پر سوار میرے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا:

"یہ موٹر رکشا میں نے تمہارے لیے خریدی ہے۔ اس وفعہ میووں کے سیزن میں مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔ اس موٹر رکشا سے ہمیں اس سے بھی زیادہ فائدہ ہوگا۔ یہ تمہیں صبح کو جوتوں کی دکان پر چھوڑ کر آئے گی۔ شام کو وہاں سے واپس لائے گی۔ دوپہر کو تمہارا کھانا وہاں پہنچائے گی۔ یہ موٹر رکشا اس کوٹھڑی کا کرایہ ادا کرے گی۔ ہمارے لیے تین وقت کے کھانے کا انتظام کرے گی اور اتنے اخراجات برداشت کرنے کے بعد بھی ہمارے لیے اتنا روپیہ بچاتی رہے گی کہ ہم اگلے سال ایک ٹیکسی خرید لیں گے۔ پھر میں تمہیں جوتوں کی دکان پر کام کرنے کے لیے نہیں جانے دوں گا۔ تمام شہر میں افسانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمہارے سامنے رکھ دیا کروں گا اور تم لکھنا، لکھنا لکھتے رہنا، لکھتے رہنا۔ حتّٰی کہ تم اس ملک کے سب سے بڑے ادیب بن جاؤ۔ اور جب تم اس ملک کے سب سے بڑے ادیب بن جاؤ گے تو میری ایک دیرینہ حسرت جو باصر شنواری کی بے وقت موت نے میرے دل میں پیدا کر دی تھی، پوری ہو جائے گی۔

جب شیر خاں نے ٹیکسی خرید لی، تو وہ مجھے جوتوں کی دوکان پر لے جاتے وقت روزانہ مجھ سے اصرار کرتا تھا کہ میں جوتوں کی دوکان کی ملازمت چھوڑ دوں اور اکثر اس سے کہتا تھا کہ ہمارا ادب ایک خود غرض سرمایہ دار ہے جو اپنے مزدوروں کو نہ کوئی معقول اُجرت دیتا ہے اور نہ کوئی بونس۔ وہ ان سے بے لوث بلا معاوضہ خدمت چاہتا ہے۔ اس لیے ہمارے ادیبوں کو اپنا پیٹ پالنے کے لیے کہیں ملازمت کرنی پڑتی ہے۔

اس پر وہ جھنجلا کر کہتا تھا۔

"خوب ہے، تم ایک کونے میں بیٹھ کر لکھو۔ میں تمہارے لیے شہر کے کونے کونے سے افسانے ڈھونڈ کر لاؤں گا"

وہ رات کو دیر تک مجھے اپنے افسانے سنایا کرتا تھا۔ اس کے اکثر افسانے ایسے ہوتے تھے۔ جن کو سُن کر مجھے نیند آ جاتی تھی اور وہ اس کی پرواہ کیے بغیر کہ میں سو چکا ہوں، اپنے افسانے بیان کرتا رہتا تھا۔ لیکن اس نے ایک دن ایک ایسا افسانہ سنایا کہ مجھے ساری رات نیند

نہ آئی۔

اس نے کہا: آج ایک بڑی خوب صورت نوجوان لڑکی چپ چاپ ٹیکسی کا دروازہ کھول کر میری ٹیکسی میں بیٹھ گئی اور بولی: ڈرائیور کلفٹن چلو۔ میں نے ٹیکسی کو سٹارٹ کیا اور کلفٹن کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اس نے ایک دفعہ مجھے پریشان سے لہجے میں کہا: ڈرائیور، ذرا تیز چلو۔ میں نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ کلفٹن کے ٹیکسی سٹینڈ پر پہنچ کر وہ ٹیکسی سے اتری اور کہنے لگی: میں ابھی ایک آدمی کے ہاتھ ٹیکسی کا کرایہ بھیجتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ جنیڈ سٹینڈ کی طرف چل پڑی اور جنیڈ سٹینڈ کی سیڑھیاں چڑھ کر جنیڈ سٹینڈ پر چلی گئی۔ اوپر پہنچ کر وہ جنیڈ سٹینڈ کے گنبد کے سامنے ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور اس نے جلدی سے اپنی گھڑی دیکھی۔ پھر اس نے پریشان نگاہوں سے باغیچے میں گھاس کے قطعوں میں بیٹھے ہوئے ہجوم کو دیکھا۔ پھر اس کی نظریں بابہ ودی اور پتھر کے جنگلے والے راستے سے ہو کر کلفٹن کے ساحل تک گئیں اور مایوس ہو کر واپس اپنی گھڑی کی طرف آ گئیں۔ پھر اس نے کراچی کی طرف سے آنے والی سڑک کی طرف دور دور تک دیکھا اور پھر وہ دیر تک اپنی چپلیوں میں اپنے خوب صورت پیروں کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیوں سے اتری، میری ٹیکسی میں آ کر بیٹھ گئی اور بولی: ڈرائیور پرانی کلفٹن چلو۔ پرانی کلفٹن پر پہنچ کر وہ ٹیکسی سے اُتر کر ٹیکسی کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ پرانی کلفٹن پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ وہ کچھ عرصہ اِدھر اُدھر دیکھتی رہی اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر بولی: ڈرائیور۔ بولٹن مارکیٹ چلو۔ بولٹن مارکیٹ میں اس نے ایک ڈاکٹر کی کلینک کے سامنے مجھے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ وہ ٹیکسی سے اُتر کر جلدی جلدی کلینک میں گئی اور ایک منٹ کے بعد واپس آ گئی۔ ٹیکسی کا دروازہ کھول کر وہ پھر ٹیکسی میں بیٹھ گئی اور بولی: ڈرائیور ناظم آباد چلو۔ ناظم آباد میں اس نے ایک بنگلے کے سامنے گاڑی رکوائی۔ ٹیکسی سے اتر کر وہ بنگلے کے گیٹ پر گئی۔ چند لمحے وہ گیٹ پر سہمی ہوئی کھڑی رہی پھر اس نے ڈرتے ڈرتے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ ایک ملازم اندر سے باہر آیا۔ لڑکی نے اس سے کوئی سوال کیا۔ معلوم نہیں ملازم نے کیا جواب دیا۔ لڑکی جلدی جلدی واپس آ کر ٹیکسی میں بیٹھ گئی اور بولی ڈرائیور نیو ٹاؤن چلو۔ نیو ٹاؤن پر ٹیکسی کا میٹر نو روپے آٹھ آنے دکھا رہا تھا۔ اور لڑکی کے چہرے پر پریشانی اور مایوسی کی کوئی حد نہ تھی۔ وہ دیر تک نیچی نظریں کیے بیٹھی رہی اور پھر انتہائی لجاجت سے بولی: خان میں بہت شرمندہ ہوں۔ میرے پاس پیسے نہیں۔ حیرت سے میری زبان بند ہو گئی اور آخر جب میں بولنے کے قابل ہوا تو میں نے کہا: اچھا بی بی، کوئی بات نہیں۔ تم جا سکتی ہو۔ وہ میری ٹیکسی سے اُتر کر گل لالہ کلب کی طرف چلی گئی۔

یہ کہانی سنانے کے بعد تین دن تک اس نے کوئی کہانی نہ سنائی۔ اس کی بجائے تینوں وقت کے کھانے کے بعد سبز چائے کی پیالی کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ مجھ سے کہتا رہا کہ میں یہ کہانی لکھوں اور جوتوں کا کام چھوڑ دوں۔

میں نے وہ کہانی نہ لکھی اور جوتوں کا کام کرتا رہا۔

دراصل محبت میرے افسانوں کا موضوع نہیں۔ میرے افسانوں کا موضوع زندگی ہے۔ زندگی کل ہے۔ محبت جزو ہے۔ زندگی سمندر ہے محبت قطرہ ہے۔ کم گہرے لوگ قطرے کو سمندر سمجھ کر اس میں ڈوب مرتے ہیں اور قبر میں لیٹ کر اپنے محبوب کو اپنی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے آوازیں دیتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ زندگی کی شاہراہ کو چھوڑ کر محبت کی راہ پر پڑ کر گمراہ ہو جاتے ہیں اور اپنا گریبان پھاڑ کر کبھی ہومر کے جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور کبھی غالب کی محفلوں میں جا گھستے ہیں۔ ان گمراہ لوگوں کو گمراہ کرنے والے دوسرے گمراہ لوگ ہوتے ہیں جو ان کو بتاتے ہیں کہ محبت انسان کا سب سے اہم اور بنیادی جذبہ ہے اور صرف یہی جذبہ ادب کا موضوع بن سکتا ہے۔ یہ جذبہ اچھے خاصے انسان کو غزل گو بنا دیتا ہے۔ ایسا غزل گو جو اپنے اشعار مشاعرے میں ترنم سے پڑھ کر سناتا ہے۔ لیکن وہی اشعار اپنے محلے میں ترنم سے پڑھنے میں خطرہ محسوس کرتا ہے۔

میں ان گمراہ لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ میرے نزدیک ابدی اہمیت رکھنے والے محبت کے جذبے سے بھی زیادہ اہم وہ جذبات ہیں جن کی وقتی اہمیت ہوتی ہے۔ وہ جذبات جو پھولوں کی طرح صبح کو کھل کر شام کو مرجھا جاتے ہیں۔ وہ واقعات جن کی وقتی اہمیت سے وقت پیدا ہوتا ہے۔ وہ وقت جس سے زمانے کی پگڈنڈی نکلتی ہے۔ وہ پگڈنڈی جو وسیع ہو کر زندگی کی شاہراہ بن جاتی ہے۔

میرے لیے کرم خوردہ کلاسیکی کتابیں نہیں، تازہ ادبی رسالے ہیں۔ میرے لیے شیکسپیئر کے ڈرامے نہیں، صبح کا اخبار ہے۔ میرے لیے موٹی موٹی کتابوں سے بھی ہوئی لائبریری نہیں، صدر کے چوک میں انسانوں کا بے پناہ ہجوم ہے۔ میرے لیے وہ محبت نہیں جو دودھ کے ڈبوں اور پیشاب کے پوتڑوں میں جذب ہو جاتی ہے۔ میرے لیے وہ محبت ہے جو زندگی کی آخری ارتقائی شکل ہے۔ وہ محبت جو غیر فانی ہے۔ غیر مرئی ہے وہ محبت جو صرف نام ہوتی ہے۔ جسم نہیں ہوتی۔ جس کو چھوا نہیں جا سکتا۔ جس کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ جو خوشبو بن کر روح میں حلول ہو جاتی ہے جو روشنی بن کر راستے میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ جو نغمہ بن کر ساری کائنات پر چھا جاتی ہے۔ نغمہ یعنی انسان یعنی انسانیت یعنی منزل۔

اور وہ لڑکی تو گل لالہ کلب میں جا کر چھپ گئی ہے۔ میں اس کو گل لالہ کلب کے پس منظر میں ڈھونڈنے کیوں جاؤں؟ میں اس کو یہ پوچھنے کے لیے کیوں ڈھونڈتا پھروں کہ تم کسے ڈھونڈتی پھر رہی ہو؟

لیکن شیر خاں کا اصرار تھا کہ میں اس لڑکی کی کہانی ضرور لکھوں۔ تین دن تک اس نے اس کے سوا اور کوئی بات نہ کی۔ تین دن تک اس نے اور کوئی کہانی نہ سنائی۔ تین دن تک وہ مجھ سے اس لڑکی کی کہانی لکھنے کے لیے اصرار کرتا رہا۔

اور چوتھے دن چار جنوری کا منحوس دن تھا۔

نہیں وہ منحوس دن تو نہیں تھا۔ وہ تو رمضان المبارک کا پہلا مبارک دن تھا۔ جس کی تابندہ پیشانی پر انسان کی سیاہ کاریوں نے سیاہ دھبے ڈال دیے تھے۔

شیر خاں سحری کے لیے اٹھا۔ اس نے مجھے بھی سحری کے لیے جگایا۔ میں نے کہا: "میں روزہ نہیں رکھوں گا۔" اس نے کہا: "روزہ نہ رکھو۔ سحری کا ثواب تو حاصل کرو۔" میں نے کہا: "نہیں میں رمضان کے مہینے میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔" اس نے کہا: "تم نے تو رمضان کے پہلے دن سے ہی مجھے تکلیف پہنچانی شروع کر دی ہے۔" میں نے کہا: "نہیں۔ بالکل نہیں۔ وہ کیسے؟" اس نے کہا: "میرے ساتھ سحری جو نہیں کھاتے۔" میں نے کہا: "اچھا میں پھر صبح کو ناشتہ نہیں کروں گا۔" ہم نے اکٹھے سحری کا ثواب حاصل کیا۔

دوپہر کو میرا پروگرام یہ تھا کہ میری جوتوں کی دکان کے پاس ایک بڑا سستا اور پراگندہ ہوٹل ہے جہاں ہماری جوتوں کی دکان کے موچی، فٹ پاتھ پر بوٹ پالش کرنے والے۔ لنڈن ٹیلرنگ شاپ کے درزی اور ہولی وڈ ہیئر کٹنگ پیلس کے حجام کھانا کھاتے ہیں۔ میں بھی لنچ کرنے کے لیے وہاں جاؤں گا۔ اور رمضان کے مہینے میں وہیں لنچ کروں گا اور چونکہ ہوٹل کے مالک نے اپنا تہمد کھول کر ہوٹل کے دروازے پر لٹکا دیا ہے اس لیے رمضان کا پوری طرح احترام ہو گیا ہے اور پردہ خدا کے خوف سے تھرتھراتا ہوا اعلان کرتا ہے: روزہ داروں کو اندر آنے کی اجازت نہیں اور جب میں جلدی سے پردہ اٹھا کر اندر چلا جاؤں گا تو کسی کو گمان تک بھی نہ ہوگا کہ میں اندر بیٹھا کھانا کھا رہا ہوں۔

اور جب میں جوتوں کی دکان سے ہوٹل کی طرف جانے کے لیے نکلا تو میں نے دیکھا کہ شیر خاں میرے لیے کھانا لیے

آدھا سچ

وہ مجھے بازو میں بازو ڈال کر جوتوں کی دکان کے ٹفن روم میں لے گیا۔ مکان میں داخل ہونے سے پہلے اس نے معمول کے مطابق طنز کے ساتھ ہماری دکان کا نام پڑھا۔

"بین الاقوامی جوتا لمیٹڈ"

وہ مجھے کھینچتا ہوا ٹفن روم میں لے گیا۔ میں نے پرزور احتجاج کیا۔

"نہیں شیر خاں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بڑے شرم کی بات ہے۔ تم روزے سے ہو۔ میں تمہارے سامنے بیٹھ کر کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

اس نے ایسے لہجے میں جواب دیا جیسے حدیث پڑھ رہا ہو۔

"اگر کوئی روزہ دار کسی ایسے شخص کو جو روزہ نہ رکھتا ہو۔ اپنے ہاتھ سے کھانا کھلائے گا تو اس کو ایک اونٹ کی قربانی کا ثواب حاصل ہوگا۔"

میں نے پھر احتجاج کیا۔

"نہیں شیر خاں، یہ تمہاری حدیث غلط ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر ہوٹل والا وہ لڑکا جو روزانہ ہمارا کھانا لاتا ہے، میرے لیے کھانا لاتا رہتا تو ایسی کوئی بات نہیں تھی، لیکن اس نے رمضان کی وجہ سے کھانا لانے سے انکار کر دیا، تو پھر روزے سے تم میرا کھانا کیوں لاؤ۔"

شیر خاں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کھانا میز پر لگا دیا۔ اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا:

"اور دیکھو آج شام کو جب تک میں تمہیں لینے کے لیے نہ آؤں، یہیں رہنا۔ اکیلے کہیں نہیں جانا۔ کافی ہاؤس میں بھی نہیں۔ میں پانچ بجے تمہیں لینے آؤں گا۔"

میں نے پوچھا:

"کیوں؟ کوئی خاص بات ہے؟"

اس نے جواب دیا:

"لالوکھیت میں فساد ہو گیا ہے۔ آج کراچی کے پختونوں نے جشنِ انتخاب منایا تھا۔ شہر کے پٹھان تمام شہر کے سڑکوں پر جلوس کی شکل میں اپنے امیدوار کی کامیابی کے لیے نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔ جب وہ لالوکھیت میں پہنچے تو بلایک پٹھانوں میں اور لالوکھیت کے مہاجروں میں فساد پھوٹ پڑا۔"

"وہ کیوں؟" میں سراسیمہ ہو کر بولا۔ "جلوس تو سارے شہر میں گھوم رہا تھا۔ لالوکھیت میں فساد کیوں ہو گیا؟ اور اگر فساد کا خطرہ تھا تو جلوس لالوکھیت میں کیوں گیا؟"

اس نے جگ اٹھا کر میرے لیے گلاس میں پانی ڈالنا چاہا۔ میں نے جلدی سے جگ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اپنے لیے خود گلاس میں پانی ڈالا۔

"جلوس کا لالوکھیت میں سے گزرنا ضروری تھا۔" شیر خاں نے کہا: "لالوکھیت میں پختونوں کا امیدوار ہار گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ انتخاب میں ہماری اکثریت سے جیت گیا۔ اس لیے لالوکھیت میں پہنچ کر پٹھانوں کے نعرے زیادہ اونچے ہو گئے۔ لالوکھیت کے مہاجروں نے نعروں کا جواب پتھروں سے دیا۔ اس کے جواب میں سارا جلوس ٹرکوں سے اتر آیا۔ قتل عام شروع ہو گیا۔ دکانیں لوٹ لی گئیں۔ جھونپڑیاں جلا دی گئیں۔ گجر نالے میں خون کی ندی بہہ نکلی۔ پولیس حالات پر قابو نہ پا سکی تو فوج نے آ کر مشین گنیں چلا دیں۔ لالوکھیت میں پٹھانوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ پٹھانوں کی لاشیں اب تک سڑکوں پر بکھری پڑی ہیں۔"

میری بھوک رفو چکر ہو گئی۔ میرا کھانا میرے منہ سے باہر آنے لگا۔ مجھے قے ہونے لگی۔ میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا:

"شیر خاں، چلو"

شیر خاں نے پوچھا:

"کہاں"

میں نے کہا:

"لالوکھیت"

شیر خاں بھی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ میرے پاس آ کر میرا کندھا تھپکنے لگا۔ اور سمجھانے کے انداز میں بولا:

"نہیں، لالوکھیت ابھی خطرے میں گھرا ہوا ہے۔ فساد میں ہلاک ہونے والوں کی لاشیں جابجا پڑی ہیں۔ سنا ہے پٹھان اپنے دوستوں اور رشتے داروں کی لاشیں لے جانے کے لیے لالوکھیت پر ایک اور حملہ کرنے والے ہیں۔ اس وقت لالوکھیت میں جانا خطرے سے خالی نہیں۔"

میں جھنجھلا گیا اور بولا:

"شیر خاں، ہم لالوکھیت کے رہنے والے ہیں۔ ہمیں جا کر دیکھنا چاہیئے، لالوکھیت میں کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں ان جاہلوں بیوقوفوں کو بتانا چاہیئے کہ بھائی کو اپنے بھائی کا گلا نہیں کاٹنا چاہیے۔ ہمیں اس ترقی یافتہ زمانے کو ہابیل اور قابیل کی داستان نہیں بنا دینا چاہیئے۔ اور شیر خاں یہ تم نے نہیں بتایا کہ لالوکھیت میں ہماری کوٹھڑی کا کیا حال ہے!"

شیر خاں نے کہا:

"ہماری کوٹھڑی کے دروازے کو بھاری پتھر مار مار کر توڑ دیا گیا۔ ہماری میووں کی بوریاں اٹھا لی گئیں۔ ٹرنک غائب ہو گیا۔ تمہاری کتابیں گلی میں بکھری پڑی ہیں۔"

میں بے قرار ہو گیا اور بے ساختہ بولا:

"شیر خاں مجھے فوراً لالوکھیت لے چلو"

شیر خاں نے سختی سے کہا:

"نہیں، تم شام تک اس جگہ سے ہو گے بھی نہیں، اور جب تک میں تمہیں لینے کے لیے نہیں آؤں گا، تم یہیں ٹھہرے رہو گے۔"

یہ کہہ کر وہ بین الاقوامی جوتا لمیٹڈ سے باہر نکل گیا۔

اس دن میں فلش روم میں اکیلا تھا۔ اس چمڑے کی بدبو سے بھرے ہوئے کمرے کو ہم طنزاً فلش روم کہتے تھے۔ اس کے درمیان میں چمڑے کا ایک بہت بڑا خالی کھوکھا تھا۔ وہ ہمارا ڈائننگ ٹیبل تھا۔ اس کے اردگرد پڑے ہوئے جوتوں کے خالی کھوکھے ہماری کھانے کی کرسیاں تھیں۔ کھانا آدھے سے زیادہ بچا ہوا ڈائننگ ٹیبل پر پڑا تھا اور میں کھویا کھویا ڈائننگ ٹیبل کے اردگرد ٹہل رہا تھا۔

دوکان کے ایک ملازم نے آکر کہا: آپ کو سیٹھ بلاتا ہے۔

میں نے سیٹھ کے پاس جا کر کہا: آپ نے یاد فرمایا؟

سیٹھ نے گرج کر کہا:

"یہ پٹھان کون ہے جو اکثر آپ کے پاس آتا ہے؟"

اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی اس نے اپنے سوال کا جواب دے دیا۔

"ہم کو معلوم ہے یہ کون ہے۔ یہ پٹھان ہے۔ اور تمہیں معلوم ہے پٹھانوں نے لالوکھیت میں کیا کیا ہے۔ پٹھانوں نے لالوکھیت میں مہاجروں کے خاندان کے خاندان ختم کر دیے۔ دکانیں لوٹ لیں۔ مکانات کھنڈر بنا دیے۔ جھونپڑیاں جلا دیں۔ عورتوں کی چھاتیاں کاٹ لیں۔ لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ گلی کوچوں، نالوں میں خون کے دریا بہا دیے، ایسا ظلم تو ہم پر سکھوں نے بھی نہیں کیا تھا۔"

میں نے بات کاٹ کر کہا:

"سیٹھ صاحب، ایسے موقع پر ہم کو بہت سوچ سمجھ سے کام لینا چاہیے۔ افواہوں پر بلا چون و چرا یقین کر لینے سے حالات اور بھی خراب ہوتے ہیں۔"

سیٹھ صاحب بولے:

"ہم نے بہت سوچ سمجھ سے کام لیا ہے۔ ہم نے اپنے پٹھان چوکیدار کو ملازمت سے الگ کر دیا ہے۔ صدر میں بوٹ پالش کرنے والے پٹھانوں سے بوٹ پالش کرانے بند کر دیے ہیں۔ مہاجروں کے گھروں میں کام کرنے والے تمام پٹھان نوکروں کو برخاست کر دیا ہے۔ اور نہ اب کوئی کسی پٹھان رکشا ڈرائیور یا ٹیکسی ڈرائیور کی گاڑی میں سفر کرتا ہے۔ اور آج کے بعد یہ پٹھان ٹیکسی ڈرائیور بھی یہاں نہیں آئے گا۔"

میں نے کہا:

"یہ ٹیکسی ڈرائیور یہاں ہمیشہ آتا رہے گا۔ یا کم از کم آج شام کو وہ یہاں ضرور آئے گا۔ پھر میں اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ پھر ہم دونوں یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔ ہم دونوں نہایت عزیز دوست ہیں۔ وہ پٹھان ہے۔ میں مہاجر ہوں۔ ہم دونوں لالوکھیت میں رہتے ہیں۔ ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ اکٹھے کھاتے ہیں۔ اپنا زیادہ وقت اکٹھے گزارتے ہیں۔ ہمارا کبھی جھگڑا نہیں ہوتا۔ ہماری کبھی لڑائی نہیں ہوتی۔ آج ہم دونوں

آپ لالو کھیت میں چلے جائیں گے۔ جہاں دو نادان بھائیوں میں کسی غلط فہمی کی بنا پر تنازعہ ہو گیا ہے۔ ہم ان نادانوں کو اپنی پُرخلوص دوستی کی مثال پیش کریں کہ ان میں صلح صفائی کرائیں گے۔ یہ مسئلے کا حل ہے۔ اس پیچیدہ مسئلے کا حل افواہوں میں اور افواہوں پر بلا سوچے سمجھے ایمان لانے میں نہیں ہے۔ کیا آپ نے ان غریب پٹھان مزدوروں کا جو ہزاروں میل کے فاصلے سے کراچی میں اپنے پسینے سے پیسہ حاصل کرنے آئے ہوئے ہیں اور جن کا فساد سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ روزگار چھین کر لالو کھیت کے فسادات کا علاج ڈھونڈ لیا ہے یا نہیں؟ آپ جلتی ہوئی آگ پر تیل ڈال رہے ہیں۔"

سیٹھ نے میری بات کاٹ کر کہا،

"مسٹر ہم نے تم کو لیکچر دینے کے لیے نہیں بلایا۔ بلکہ یہ بتانے کے لیے بلایا تھا کہ وہ پٹھان ٹیکسی ڈرائیور آئندہ یہاں نہ آئے۔"

میں نے کہا۔

"میرا دوست آج شام کو آخری دفعہ یہاں آئے گا۔ اور میں آپ سے امید رکھتا ہوں کہ آپ میرے سامنے اُس کی بے عزتی نہیں کریں گے۔ میرا دوست انتہا کا قابلِ احترام انسان ہے۔"

سیٹھ نے اپنی دانست میں بڑے کارگر طنز سے کام لیا۔

"ہاں تمہارا دوست بہت قابلِ احترام ہے۔ وہ رمضان کا بھی بہت احترام کرتا ہے۔ جبھی تو وہ تمہارے لیے کھانا لایا اور تم دونوں نے ٹفن روم میں بیٹھ کر کھایا۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ رمضان میں میں کبھی کو ٹفن روم میں کھانا کھانے کی اجازت نہیں دیتا۔"

میں نے کہا:

"اگر آپ ذرا ٹفن روم میں آنے کی زحمت گوارا کر لیتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ میرا دوست روزے سے تھا۔ وہ میرے سختی سے منع کرنے کے باوجود میرے لیے کھانا لے کر آیا تاکہ میں کسی گندے ہوٹل میں کھانا کھانے نہ چلا جایا کروں۔ اس کو اس لیے بھی کھانا لانا پڑا کہ وہ نوکر جو روزانہ میرا کھانا لاتا تھا رمضان کے مہینے میں میرے لیے کھانا نہیں لائے گا۔"

اب سیٹھ کو یہ کہنا چاہیے تھا۔ "پھر تم کو شرم آنی چاہیے۔ تم خود کیوں نہیں رکھتے روزے۔" لیکن سیٹھ نے یہ بات نہ کہی۔ کیونکہ روزے رکھنے کے بارے میں وہ پہلے کئی دفعہ مجھے کہہ چکا تھا۔ اس کے بجائے سیٹھ نے کہا: "اچھا جاؤ، مغز نہ کھاؤ، بل بناؤ۔"

میں شام تک بل بناتا رہا۔

شام تک گاہک رونگٹے کھڑے کرنے والی افواہیں لاتے رہے۔

مسلح پٹھانوں کے دستے لوٹ مار کرتے ہوئے کلفٹن اور کیماڑی تک پہنچ گئے ہیں۔ وہاں سے وہ منوڑے جانے کے لیے زبردستی ماہی گیروں کی کشتیوں پر سوار ہو رہے تھے کہ نیوی کے جہازوں نے اپنی توپوں کے دہانے ان کی طرف کر دیے۔ اس لیے وہ وہاں سے ملکوڈ روڈ کی طرف چل پڑے اور پولیس ہیڈ کوارٹر کے سامنے جمع ہو گئے۔ پولیس نے خوفزدہ ہو کر ہیڈ کوارٹر کے دروازے بند کر لیے۔

آج شام کو لالو کھیت پر بڑا بھاری حملہ ہونے والا ہے۔ وہاں بہت سے پٹھان جن کو فوجی مشین گنوں نے ہلاک کر دیا ہے، پڑے ہوئے ہیں۔ ان لاشوں کو اٹھانے کے لیے حملہ ہو گا۔

ابھی نہیں۔ لاشوں کو اٹھانے کے لیے کیوں ہوگا۔ ان لاشوں کے ساتھ جو کارتوس اور رائفلیں رہ گئی ہیں۔ ان کو لینے کے لیے آئیں گے۔ پٹھانوں کے نزدیک اسلحہ انسان سے زیادہ قیمتی ہے۔

اس سے بھی بڑا حملہ آج رات کو ہو گا۔ جو ہر آباد، عزیز آباد، دستگیر کالونی، گولی مار اور ناظم آباد کا صفایا ہو جائے گا۔ دراصل اس فساد میں پٹھانوں نے جتنا نقصان کیا ہے۔ اس سے زیادہ تو مشین گنوں نے ان کا کر دیا ہے۔ اب اس کا بدلہ لینے کے لیے باہر سے پٹھان لشکر بلا رہے ہیں۔

مہاجر بھی کوئی ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی حفاظت کا پورا انتظام کر رکھا ہے۔ اپنے علاقے میں ٹھیکری پہرہ لگا دیا ہے۔ علاقے سے باہر جوانوں کی ٹولیاں لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور لوہے کے سریے لیے کھڑی ہیں۔ دشمن کو دیکھ کر اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے جائیں گے اور تمام علاقے میں بجلی کے کھمبے بجنے لگ جائیں گے اور دور دور کے علاقوں میں دشمن کی آمد کی خبر پہنچ جائے گی

بین الاقوامی جوبلی لمیٹڈ میں ان افواہوں سے خوف و ہراس پھیل گیا۔ سیٹھ اور ملازم سہم گئے۔ ہر گاہک باہر جانے سے پہلے تنبیہ کرکے جاتا: آج خیال سے۔ احتیاط سے۔ ہوشیاری سے اپنے اپنے گھروں کو واپس جانا۔ اس وارننگ سے سیٹھ اور ملازم اور بھی سہم جاتے کیونکہ وہ سب پاپوش نگر کے رہنے والے تھے، جہاں پہنچنے کے لیے ان کو فساد زدہ علاقے سے گزرنا تھا۔

شام کو شیر خاں آ گیا۔

شیر خاں کی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ موسمیوں، مالٹوں، کیلوں، امردوں اور کھجوروں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ روزہ کھولنے کا انتظام تھا۔

شیر خاں نے مجھے کہا: سیٹھ کو افطاری کے لیے کچھ فروٹ دے دو اور بولا اگر میرے ساتھ کوئی آنا چاہتا ہے تو آ جائے میں حفاظت سے گھر پہنچا دوں گا۔

میں سیٹھ کے پاس فروٹ لے کر گیا اور اسے شیر خاں کا پیغام دیا۔ سیٹھ نے فروٹ رکھ لیا، لیکن اس کی لفٹ کی پیش کش کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا: تم بیوقوف ہو جو اس کے ساتھ جا رہے ہو۔ شاید تمہیں اپنی جان پیاری نہیں۔ ہمیں تو اپنی جان پیاری ہے۔ اور دیکھو اسے بول دو وہ پھر یہاں کبھی نہ آئے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ اور میں یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔

میں شیر خاں کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی چل پڑی۔

وکٹوریہ روڈ

گارڈن روڈ

بندر روڈ

جہانگیر روڈ

"شیر خاں"

"ہاں"

میں نے سُنا تھا کہ اِس فساد میں لالوکھیت سے لے کر کیماڑی اور کلفٹن تک کراچی شہر تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں۔

"نہیں، بس لالوکھیت اور اس کے گرد و نواح میں کچھ خون خرابہ ہوا ہے۔ گولی مار۔ لس بیلہ۔ فردوس کالونی۔ کچھ حصہ ناظم آباد کا جہانگیر آباد۔ دستگیر کالونی۔ عزیز آباد۔ سنا ہے ان علاقوں میں گڑبڑ ہے"

"چلو دیکھیں"

"نہیں ان علاقوں میں جانا خطرناک ہے"

"میں ان علاقوں میں ضرور جانا چاہتا ہوں، میں اس فساد کی کہانی لکھنا چاہتا ہوں"

"اگر تم کہانی لکھنے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے ساتھ جہنم میں بھی جانے کو تیار ہوں"

"میں وعدہ کرتا ہوں"

تین ہٹی۔

لس بیلہ۔

گولی مار۔

چورنگی

"شیر خاں"

"ہاں"

"کتنا سنسان پڑا ہے۔ ڈر آتا ہے"

"معلوم ہوتا ہے کوئی ملٹری ٹرک یہاں سے گزر کے گیا ہے"

"اور یہ پولیس والے بھی تو راہگیروں کے ساتھ پھر رہے ہیں"

"پولیس والوں سے کوئی نہیں ڈرتا۔ ملٹری کی مشین گنوں سے سب ڈرتے ہیں"

"چاروں طرف خاموشی ہے۔ حالات قابو میں معلوم ہوتے ہیں"

"نہیں خاموشی کا ایک ہی مطلب نہیں ہوتا۔ خاموشی کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ طوفان آنے والا ہے۔

یکایک فردوس کالونی کے ایک موڑ پر ڈنڈوں اور لاٹھیوں سے لیس ایک گروہ ٹیکسی کے سامنے آ گیا۔ ٹیکسی ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ گروہ کے سردار نے لاٹھی گھما کر شیر خاں کے سامنے والے ونڈ شیلڈ کے شیشے پر ماری۔ شیشے پر تریڑوں کا جال بچھ گیا۔ لیکن شیشہ نہ ٹوٹا۔ کسی نے چلا کر کہا: اسے باہر نکال لے اس کو۔ یہ راستہ دیکھنے آیا ہے۔ رات کو اپنی ماں کے یاروں کو لے کر آئے گا۔ میں بجلی کی تیزی سے باہر نکلا اور گروہ کے سامنے آ گیا اور چیخنے لگا۔ نہیں، نہیں۔ دیکھو، میری بات سنو۔ یہ وہ پٹھان نہیں۔ یہ ان پٹھانوں میں سے نہیں۔ یہ تو مجھے ان پٹھانوں سے بچانے کے لیے اپنی ٹیکسی پر مجھے میرے گھر چھوڑنے جا رہا ہے۔ گروہ کا سردار جو مجھ سے پانچ فٹ اونچا اور چھ فٹ چوڑا تھا۔ اپنی سرخ

آنکھوں سے انگاروں کے ساتھ میری طرف بڑھا۔ اس کے لوہے جیسے مضبوط ہاتھ نے مجھے کندھے سے پکڑ کر زمین پر پٹخ دیا۔ ایک لمحے کے لیے میرے حواس باختہ ہو گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک شخص جس کے ہاتھ میں کوئی ڈنڈا یا کوئی دوسری حملہ کرنے والی چیز نہیں تھی۔ مجھے زمین سے اٹھا رہا ہے وہ شخص اس گروہ میں سے نہیں تھا۔ وہ اس گروہ سے باہر کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے اٹھاتے ہوئے میرے کان میں کہا: آپ کہاں پھر رہے ہیں ؟ آپ نے اس پٹھان کے سامنے آکے اپنی جان خطرے میں ڈال دی ہے۔ آپ یہ ٹیکسی چھوڑ دیجئے۔ میرے ساتھ آیئے۔ آج رات کو میرے پاس ٹھہریے۔ کل صبح میں آپ کو آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔ لیکن مجھے اس شخص کی اس پُرخلوص پیش کش کا شکریہ ادا کرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ گروہ کا سردار شیر خاں کو گریبان سے پکڑ کر ٹیکسی سے باہر نکال رہا تھا۔ میں اس کی طرف جھپٹا اور اپنی آواز میں ساری دنیا کی منتیں اور خوشامدیں جمع کر کے بولا: خدا کے لیے اس کو چھوڑ دو۔ یہ میرا عزیز ترین دوست ہے میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ نہایت اعلیٰ کردار کا انسان ہے۔ اس کا فساد سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ خدا کے لیے اس کو چھوڑ دو۔ شیر خاں نے کہا: مجھے گھسیٹنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود باہر آجاؤں گا۔ اور وہ ٹیکسی کا دروازہ کھول کے باہر آگیا۔ گروہ کے سردار نے میرے کندھے کو اپنی آہنی گرفت میں لے کر کہا: ہم اس کو کیسے چھوڑ دیں۔ اس کے بھائی بندوں نے ہمارے ساتھ کونسا اچھا سلوک کیا ہے۔ ہماری جھونپڑیاں جلا دیں۔ ہماری دکانیں لوٹ لیں۔ ہماری عورتوں کی چھاتیاں کاٹ دیں۔ پھر ہم اس کو کیسے چھوڑ دیں۔

یکایک مجھے ایک گوشے سے آواز آئی:

"ٹیپو سلطان"

سب اس آواز دینے والے کی طرف دیکھنے لگے۔ یہ وہی شخص تھا جس نے مجھے زمین پر گرے ہوئے کو اٹھایا۔ اس نے کہا

"ٹیپو سلطان ان کو جانے دو۔"

ٹیپو سلطان حیران ہو گیا اور اس شخص سے مخاطب ہو کر بولا:

"ہیڈ ماسٹر صاحب، آپ ساری فردوس کالونی کے لیے عزت کی جگہ ہیں۔ آپ ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ ہم سب آپ کا احترام کرتے ہیں۔ اور میں خاص طور پر آپ کی عزت کرتا ہوں۔ کیونکہ آپ نے میرے بھتیجے کو جسے کسی سکول میں داخلہ نہیں مل سکا تھا۔ اپنے سکول میں لے لیا ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ کیونکہ ہم آپ کی بات نہیں مانیں گے۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا:

"ٹیپو سلطان، آپ میری بات نہ مانیں۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے میری طرف اشارہ کرکے کہا: "آپ کو ان کی بات ماننی چاہیئے۔"

ٹیپو سلطان نے میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

"کیوں ؟ مجھے اس کی بات کیوں ماننی چاہیئے ؟"

"میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گا۔" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا: "پہلے ان کو جانے دیجئے۔" ٹیپو سلطان نے اپنی جلتی ہوئی سرخ آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا اور بولا:

"جاؤ۔"

یکلخت گردو کے آدمیوں نے ڈنڈے اور لکیاں ہلا ہلا کر چیخنا شروع کر دیا:

"ٹیپو سلطان! یار یہ کیا کر دیا ہے! تیری مت تو نہیں ماری گئی۔"

ٹیپو سلطان نے اپنا دایاں بازو ہوا میں بلند کیا اور بولا:

"چپ رہو"

شیر خان نے ٹیکسی سٹارٹ کر دی۔

فردوس کالونی

رضویہ کالونی

خاموشی کالونی

شیر خان۔

"ہاں"

"تم نے کپڑے بھی تو ایسے پہن رکھے ہیں کہ فوراً پہچانے جاؤ۔ پورا پختونی لباس۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ وہی لباس ہے جس میں میں تمہیں پہلی دفعہ ملا تھا۔ کالی پگڑی۔ کالی صدری۔ بے شمار بلوں والی شلوار اور پشاوری چپل۔ اس لباس میں تم نے میری مدد کی تھی۔ اسی لباس میں میں تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔ افواہ تھی کہ پٹھان مہاجر علاقوں پر ایک اور حملہ کرنے والے ہیں۔ میں افواہوں پر یقین تو نہیں کرتا لیکن احتیاطاً پختونی کپڑے پہن لیے تھے کہ پٹھان دیکھتے ہی مجھے پہچان لیں ——— اور تم پر کوئی ہاتھ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔"

"اور یہاں ہو گئی بات اُلٹی۔"

"ہاں بالکل اُلٹی۔ اب دیکھو تم نے کوئی مہاجروں والا لباس نہیں پہنا ہوا۔ لیکن تم شکل ہی سے مہاجر معلوم ہوتے ہو۔ اور یہ اچھا ہی ہوا۔ تمہاری وجہ سے میری جان بچ گئی۔ اب پٹھانوں سے میں تمہیں بچاؤں گا، اور تم مجھے مہاجروں سے۔"

"میں نے تو تمہیں نہیں بچایا۔ ہیڈ ماسٹر نے بچایا ہے۔"

"یہ ہیڈ ماسٹر کون تھا؟"

"معلوم نہیں۔ میں اسے نہیں جانتا۔"

"اس نے ٹیپو سلطان کو تمہارے بارے میں کیا بتایا ہو گا؟"

"معلوم نہیں۔"

"اچھا! اب ہم یہاں سے سیدھے لالوکھیت جائیں گے۔"

"نہیں۔ ابھی جوہر آباد۔ عزیز آباد اور دستگیر کالونی دیکھنی ہے۔"

"بہتر ہے اب ہم وہاں نہ جائیں۔"

"کیوں؟ ڈر گئے؟"

"نہیں۔ اب ہمارے پاس وقت نہیں۔ افطار کا وقت نزدیک ہے۔ افطار اور مغرب کے بعد تراویح سے پہلے ایک چکر ماریں گے۔"

"جی نہیں، ابھی افطار میں بہت وقت ہے۔ پہلے ان علاقوں کا حال دیکھ آئیں۔ پھر ایک چھوٹا سا جائزہ لالوکھیت کے نقصانات کا لیں گے۔ پھر اطمینان سے افطاری کریں گے۔ پھر تم تراویح پڑھنے کے لیے چلے جانا اور میں کہانی لکھنے بیٹھ جاؤں گا۔"

"میرا خیال ہے ہم اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔"

"تم نے کہا تھا کہ اگر میں کہانی لکھنے کا وعدہ کروں تو تم جہنم میں بھی چلے جاؤ گے۔"

"اس وقت میرا جہنم میں جانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔"

"تو میں کہانی نہیں لکھوں گا۔"

"اچھا! ہم پہلے دستگیر کالونی جائیں گے۔ اس کے بعد عزیز آباد پھر جوہر آباد، اور وہاں سے سیدھے لالوکھیت۔ شرط یہ ہے کہ ہم ان علاقوں کے اندرونی حصوں میں نہیں جائیں گے تاکہ ایسا نہ ہو ہم فردوس کالونی کی طرح مصیبت میں پھنس جائیں۔ باہر باہر بڑی شاہراہوں پر رہیں گے۔ جہاں پولیس اور فوج کی موجودگی کی وجہ سے خطرہ کم ہوگا۔"

"او کے"

فیڈرل ایریا

کریم آباد

دستگیر کالونی

"شیرخان"

"ہاں"

"شاید تم نے یہ خیال نہیں کیا کہ فردوس کالونی سے ہم اپنی جانیں ہی بچا کر نہیں لائے۔ بلکہ اپنی جانوں سے زیادہ قیمتی ایک چیز بچا کر لائے ہیں۔"

"کیا۔"

"افطاری۔"

"ہاں فروٹ ان کی نظر نہیں پڑا، ورنہ صاف کر دیتے۔ اور مجھے بھی خیال نہیں رہا۔ ورنہ میں خود کچھ فروٹ ان کو افطاری کے لیے دے دیتا۔ غلطی ہوگئی، دینا چاہیئے تھا۔"

"وہ دیکھو، سامنے ایک کھمبے کے پاس کچھ آدمی جمع ہیں۔ یہ دستگیر کالونی ہے؟"

"ہاں"

"یہ راستہ چھوڑ دو۔ دستگیر کالونی کی بڑی سڑک سے چلو"

"اوہ ہاں، مجھے یاد آیا، دستگیر کالونی، عزیز آباد اور جوہر آباد میں کوئی بڑی سڑک نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی سڑکوں سے پولیس اور فوج کے ٹرک نہیں گزر سکتے۔ ہمیں اپنی حفاظت خود کرنی پڑے گی، میں تمہاری ایک ڈیوٹی لگاتا ہوں"

"کیا"

"گھبرانا نہیں"

"نہیں، نہیں گھبرانا نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے ہم اس گروہ کے پاس سے نہ گزریں"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یا ہمیں ان کے پاس سے گزرنا پڑے گا یا واپس لوٹنا ہوگا، کوئی دوسرا راستہ نہیں"

"نہیں ہم واپس نہیں لوٹیں گے۔ اگر کوئی اور راستہ نہیں ہے تو ہم ان کے پاس سے چپ چاپ گزر جائیں گے اور اگر انہوں نے ہمیں ٹھہرانے کی کوشش کی تو تم ٹھہرنا نہیں"

"اچھا"

جب ٹیکسی ہجوم سے کوئی دس گز کے فاصلے پر پہنچ گئی تو کسی نے کہا:

"پٹھان ہے"

کسی اور نے کہا:

"اس کے پیچھے اور پٹھان آ رہے ہوں گے"

"روکو اس کو"

"جانے نہ دو"

"روک کے، خان"

"خان، روکو ٹیکسی"

"خان!"

"خان!"

"ٹھہرو!"

"روکو!"

"ٹیکسی!"

"ٹیکسی!"

لیکن شیر خان نے کسی کی بات نہ سنی۔ اس نے ٹیکسی کی رفتار تیز کر دی۔ وہ تیزی سے ہجوم کے پاس سے گزر گیا۔ ہجوم میں سے

سے کچھ آدمی ٹیکسی کے پیچھے بھاگے۔ ٹیکسی کے پچھلے حصے پر لاٹھی کی ایک ضرب سنائی دی۔ پتھروں کے کچھ ٹکڑے ٹیکسی کی باڈی سے ٹکرا کر سڑک پر بکھر گئے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے ہمارے دل دہل گئے، اور ہم اپنے آپ کو خطرے میں گھرا ہوا محسوس کرنے لگے۔

یکایک ہجوم نے سڑک سے پتھر اٹھا کر بجلی کے کھمبوں کو بجانا شروع کر دیا۔ چیخنا شروع کر دیا، چلانا شروع کر دیا:

"خبردار!"

"خبردار!"

"پٹھان آگئے!"

"پٹھان آگئے!"

ایک کھمبے کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا، تیسرے کے بعد چوتھا۔ دستگیر کالونی کے سب کھمبے بجنے لگے۔ عزیز آباد کے کھمبے بجنے لگے۔ جوہر آباد کے کھمبے بجنے لگے۔ پیر کالونی کے کھمبے۔ جبل پور ہاؤسنگ سوسائٹی کے کھمبے۔ لالو کھیت کے کھمبے۔ ہمارے چاروں طرف کھمبے بج رہے تھے اور قیامت کا شور ہو رہا تھا۔

"پٹھان آگئے"

"پٹھان آگئے"

"اللہ اکبر!"

"پاکستان زندہ باد"

لوگ گھروں سے نکل کر کھمبوں کے پاس جمع ہو گئے تھے اور زور زور سے کھمبے بجا رہے تھے اور نعرے مار رہے تھے اور شیر خان بڑی خطرناک رفتار سے ان کے پاس سے گزرتا جا رہا تھا، اور میں سہما بیٹھا تھا۔

میں نے کہا:

"شیر خاں حالات کچھ خطرناک ہو گئے ہیں"

"شیر خاں نے کہا:

"نہیں بالکل نہیں۔ یہ بینڈ ہمارے استقبال میں نہیں بج رہا۔ یہ تو اُن پٹھانوں کے لیے ہے جو ہمارے پیچھے ان علاقوں پر حملہ کرنے کے لیے آرہے ہیں:

دستگیر کالونی

عزیز آباد

جوہر آباد

شیر خاں"

"ہاں"۔

"اب لالوکھیت کتنی دور ہے"

"کیوں؟ ڈر گئے ہو؟"

"میرا خیال ہے اب ڈرامہ زیادہ سنسنی خیز ہو گیا ہے۔ اب اس کا ڈراپ سین ہونا چاہیئے۔"

"میں بھی جلدی واپس جانا چاہتا ہوں۔ افطار کا وقت نزدیک ہے اور میری دو نمازیں قضا ہو گئی ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ وہ سامنے ریلوے لائن ہے۔ اس کو پار کر کے ہم بڑی سڑک پر پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد کوئی خطرہ نہیں"۔

جب ہم ریلوے لائن پار کر کے بڑی سڑک پر پہنچے تو خطرہ انتہائی خوفناک ٹھوس شکل میں ہمارے سامنے کھڑا تھا۔

لالوکھیت سے باہر جو راستہ ہے کے دائرے سے اس طرف سڑک کے ایک کنارے سے لے کر دوسرے کنارے تک لالوکھیت کے رہنے والوں کا ایک بپھرا ہوا ہجوم سڑک روکے کھڑا تھا کھمبے بج رہے تھے۔ نعرے بلند ہو رہے تھے۔

میں نے کہا:

"شیر خاں"

شیر خاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے کہا:

"شیر خاں"

شیر خاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شیر خاں حالات کا خاموشی سے مطالعہ کر رہا تھا۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ لیکن خاموشی نے بڑا بُرا اثر کیا۔ میرے دل کی حرکت تیز ہو گئی، میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

میں نے کہا:

"شیر خاں، کیا ہم خطرے میں ہیں"

شیر خان نے جواب دیا:

"ہاں، یہ فردوس کالونی کے لوگ نہیں۔ لالوکھیت کے لوگ ہیں۔ زخم کھائے ہوئے۔ فساد کے مارے ہوئے۔ ان کی دکانیں لٹ گئی ہیں۔ جھونپڑیاں جل گئی ہیں۔ ان کے ماں باپ، بہن بھائی، بیٹے بیٹیاں قتل کر دیے گئے ہیں۔ اور کھمبوں اور نعروں نے ان کو یہ پیغام دیا ہے کہ ہمارے پیچھے پٹھان ایک اور حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ ہم واقعی خطرے میں ہیں"۔

میں نے جلدی سے کہا:

"تو واپس چلو"

شیر خاں ہنسنے لگا اور بولا:

"نہیں۔ ہم اتنے بُزدل نہیں کہ اپنے سامنے خطرہ دیکھ کر پیچھے ہٹ جائیں۔ مرد خطرے کے سامنے اپنا سینہ رکھتا ہے۔ پیٹھ نہیں اور کیا تمہیں یاد نہیں کہ آج دوپہر کو جب میں لائلپور کے فساد کے بارے میں تمہیں بتا رہا تھا کہ تم اُٹھ کر لائلپور کی طرف بھاگ پڑے تھے کہ چلو لائلپور میں فساد برپا کرنے والوں کو سمجھائیں کہ بھائی بھائی کا خون نہیں بہاتا۔ بھائی اپنی بہن کی عزت کی حفاظت کرتا ہے تو جناب یہ لائلپور والے آپ کا وعظ سننے آئے ہیں۔ میں اِن کے نزدیک جاکر ٹیکسی کھڑی کروں گا۔ ٹیکسی کے سامنے کھڑے ہو کر قرآن پاک کی تلاوت کرکے کہنا: یا ایہاالذین آمنو!"

جب ٹیکسی ہجوم کے نزدیک پہنچ گئی تو چند ایک آدمی جو ہجوم سے نکل کر آگے آگئے تھے چلانے لگے:

"وہی ہیں۔ وہی ہیں"

ٹیکسی ہجوم کے سامنے جاکر ٹھہر گئی۔

میں نے جلدی سے باہر نکل کر ٹیکسی کے سامنے ہجوم سے مخاطب ہونے کے لیے دروازہ کھولا۔ چھ مضبوط ہاتھوں نے دروازہ مجھ سے چھین کر قبضوں سے الگ کر کے پرے پھینک دیا اور مجھے گلے سے گھسیٹ کر باہر نکال لیا اور جب ہجوم میں سے کسی نے پکار کر کہا: اسے چھوڑ دو۔ اسے چھوڑ دو۔ یہ پٹھان نہیں، تو انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ ایک موٹے مشٹنڈے نے لوہے کا ایک انچ موٹا سریہ اپنی پوری طاقت سے بونٹ پر دے مارا۔ بونٹ درمیان میں سے پچک گیا اور آگے سے کھل گیا۔ شیر خاں ٹیکسی سے باہر آکر ٹیکسی کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے بازو اٹھا کر زور زور سے چیخنے لگا۔ مسلمان بھائیو۔ مسلمان بھائیو! ایک مسلمان بھائی نے جلی ہوئی جھونپڑی کی ایک بلّی اٹھا کر شیر خاں کے سر پہ ماری۔ شیر خاں کی کالی پگڑی اُس کے سر سے گر کر ہجوم کے پیروں میں جا گری۔ ایک اور مسلمان بھائی نے ٹال سے اٹھائی ہوئی ایک کلہاڑی ہوا میں لہرا کر زور سے شیر خاں کے سر پر جڑ دی۔ لہو شیر خاں کے ماتھے سے ہوتا ہوا کنپٹی پر سے گزر کر ٹھوڑی کے راستے اُس کے لٹھے کی قمیض پر گرنے لگا۔ ہجوم سامنے سے ہٹ کر ٹیکسی کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ اس لیے سامنے چوراہے کے دائرے میں سرسبز گھاس کی مخمل اور سبز مخمل کے فرش کے درمیان میں موسم سرما کے خوشنما رنگ برنگے پھولوں کا قطعہ نظر آ رہا تھا۔ ان کے پرے کچھ فاصلے پر مسجد نظر آ رہی تھی۔ جس میں شیر خاں مجھ سے ملنے کے لیے ایک دن پہلے رات کو سویا تھا۔ شیر خاں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر ماتھے پر، پھر گال پر۔ پھر اُس نے اپنے لہو سے رنگے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر اس نے مسجد کی طرف دیکھا۔ اور پھر وہ مسجد کی طرف بھاگ پڑا۔ اس کے ساتھ ہی وہ شخص جس کے پاس بلّی تھی اور وہ جس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ شیر خاں کے سر پہ اور اس کے جسم کے دوسرے حصوں پر بلّی اور کلہاڑی کی پے درپے ضربوں سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے اور وہ نڈھال ہو کر دائرے میں گھاس کے قطعے پر پھولوں کے پاس گر پڑا، اور ہجوم نے لوہے کے موٹے موٹے سریوں کی مدد سے ٹیکسی کو الٹا کر دیا، اور پٹرول کی ٹنکی کا ڈھکنا کھول دیا۔ اُلٹی ہوئی ٹیکسی میں سے افطاری کا فروٹ کیلے، مالٹے، موسمیاں اور کھجوریں باہر آکر سڑک پر پھیل گئیں۔ فروٹ کو آناً فاناً چھینا جھپٹی کر کے اٹھا لیا گیا۔ چند آدمیوں نے لوہے کی سلاخوں کی مدد سے ٹائر اور ٹیوب نکالنے کی کوشش کی، لیکن ٹائر نہ نکل سکے۔ کچھ اور آدمیوں نے گدّے نکالنے کی کوشش کی، لیکن پٹرول کی ٹنکی کا ڈھکنا کھلا تھا۔ پٹرول ٹنکی سے نکل کر تمام ٹیکسی میں پھیل گیا تھا اور گدّوں کے غلاف پٹرول سے بھیگ گئے تھے۔ اس لیے گدّوں کو اُلٹی ہوئی گاڑی میں سے باہر نکالتے ہوئے دیر ہو گئی۔ اس اثناء میں اس گروہ میں سے جس نے ٹیکسی کو الٹا یا تھا، ایک آدمی نے ماچس کی ایک تیلی جلا کر ٹیکسی کے اندر پھینک دی۔ ٹیکسی آگ کے شعلوں میں غائب ہو گئی۔

یکایک فیڈرل ایریا کی طرف سے مسلح پولیس کا ایک ٹرک آتا دکھائی دیا۔
مسلح پولیس کے ٹرک کو دیکھ کر ہجوم تتر بتر ہو گیا۔ اور ہجوم کو دیکھ کر ٹرک واپس فیڈرل ایریا کی طرف مڑ گیا۔
اب میں نے دیکھا کہ اس خوفناک ماحول میں اکیلا کھڑا ہوں۔ اب تک میرا احساس شل تھا۔ میرے حواس باختہ تھے۔ پچھلے چند لمحوں میں میری آنکھوں کے سامنے سے گزرنے والے واقعات میں نے اس طرح دیکھے، جیسے کسی سینما ہال میں بیٹھا ہوں۔ اب میں نے محسوس کیا کہ میں تو خود اس ڈرامے کا ایک کردار ہوں۔ میرا عزیز ترین دوست میرے سامنے زخموں سے نڈھال پڑا ہے۔ میرے عزیز ترین دوست کی ٹیکسی میری آنکھوں کے سامنے جل رہی ہے اور میں زندہ سلامت کھڑا ہوں۔ میں زندہ سلامت ہوں۔ لیکن اکیلا ہوں۔ میں اس دنیا میں اکیلا کیا کروں گا۔ میں یہاں کھڑا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں کیا کروں۔
میں شیر خاں کی طرف بھاگا۔
شیر خاں کو دیکھ کر مجھ پر غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ لیکن میں نے اپنی تمام قوتِ ارادی کو جمع کر کے اپنے آپ کو سنبھالا۔
شیر خاں خون میں لت پت تھا۔ اس کے کپڑے خون سے شرابور تھے، سبز گھاس کے مخمل پر خون کے دھبے تھے۔ موسم سرما کے خوشنما پھولوں پر خون کے چھینٹے تھے۔ افق پر ڈوبتے ہوئے سورج کے اردگرد شفق کا خون بکھرا ہوا تھا۔ فضا میں خون کے لوتھڑے تیرتے پھر رہے تھے۔۔
شیر خان کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کا سانس اُکھڑا ہوا تھا۔ وہ موت کے ساتھ اپنی ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔
میں نے کہا:
"شیر خاں"
شیر خاں کی آنکھیں تھوڑی سی کھلیں۔ پھر پوری کھل گئیں۔ لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ معلوم نہیں کسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جن میں ہمیشہ خوب صورت سرخ ڈورے رہتے تھے۔ بالکل سفید اور بے رنگ تھیں۔ وہ نہایت مدھم اور نحیف آواز میں بولا:
"تم — آ گئے —— مرے — پاس — آ جاؤ — مجھے — نظر — نہیں آتا"
میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے خون آلود سر پر ہاتھ رکھ دیا۔
شیر خاں بولا:
تم — ٹھیک ہو "
میں نے کہا:
" ہاں، شیر خاں "
شیر خاں نے کہا:
" حمزہ شنواری — کو — اور — مراد شنواری — کو — میرا — سلام — لکھ دینا — اور — لکھنا — میں — باصر شنواری — کے پاس — جا — رہا — ہوں "

میرا گلا بند ہوگیا۔ میری آواز رُک گئی۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان آگیا۔ میں نے بہت کوشش کے ساتھ جذبات سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا:

"نہیں، شیر خاں، میں تمہیں ہسپتال لے کر جا رہا ہوں۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

شیر خاں نے انتہائی نقاہت میں آہستہ سے سر ہلایا:

"نہیں — کچھ — فائدہ — نہیں"

میں نے شیر خاں کی بات نہیں سُنی۔ کیونکہ میری توجہ گھاس کے قطعے کے ایک کونے میں چلی گئی تھی۔ جہاں گھاس اور پھولوں کو پانی دینے کے لیے پانی کا پائپ نظر آ رہا تھا۔ پائپ کا سرا گھاس سے تھوڑا اُونچا تھا۔ لیکن اس میں کوئی ٹونٹی نہیں تھی۔ اس کا منہ لکڑی کے ایک گول ٹکڑے سے بند کیا ہوا تھا جس میں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

میں نے شیر خاں کے ہونٹوں کی طرف دیکھا۔ شیر خاں کے ہونٹ جن میں ہمیشہ سُرخ اور شیریں رس چھلکتا رہتا تھا، نیلے ہوگئے تھے اور ان پر سفید سفید چھلکے اُبھر آئے تھے۔

میں نے کہا:

"شیر خاں، میں تمہارے لیے پانی لاتا ہوں"

اور میں اُٹھ کر پانی کے پائپ کی طرف بھاگا۔ پائپ کے منہ میں لکڑی کو ڈھیلا کر کے پانی کا بہاؤ زیادہ کیا۔ پانی میں اپنے رومال کو اچھی طرح دھویا اور پھر رومال میں جتنا پانی آ سکتا تھا، لے کر شیر خاں کی طرف بھاگا اور اس کے پاس بیٹھ کر بولا:

"شیر خاں، میں تر رومال سے تمہارے منہ میں پانی ٹپکاتا ہوں"

شیر خاں نے اپنے سر کو ایک اضطراری حرکت دے کر بہت کمزور آواز میں کہا:

"نہیں — میرا — روزہ — ہے"

میں چپ ہوگیا اور سوچنے لگا اب میں کیا کروں۔ پھر میں نے تر رومال سے اس کے منہ پر خون کے دھبوں کو صاف کر دیا۔ خون کے دھبوں سے صاف ہو کر اُس کا چہرہ چاندی کی طرح نکل آیا، بالکل سفید، بالکل زرد۔

پھر میں نے کہا:

"شیر خاں، اب میں تھوڑی دیر کے لیے تمہارے پاس سے جاتا ہوں۔ کوئی گاڑی لاتا ہوں، اور پھر میں تمہیں ہسپتال لے جاؤں گا"

شیر خاں کی آواز پہلے سے بھی زیادہ نحیف ہوگئی۔ بولنے کی کوشش میں وہ اور بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا مجھے اس سے باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اس لیے جب میں نے محسوس کیا کہ وہ میری بات کا جواب دینا چاہتا ہے تو میں اس کو ہاتھ کے اشارے سے چُپ رہنے اور آرام کرنے کے لیے کہا، لیکن میرے منع کرنے پر بھی اس نے کہا:

"نہیں — میرے پاس — ٹھہرو — صبر کرو — مجھ میں — خون — کا — ایک — قطرہ — نہیں"

میں نے بے قرار ہو کر جواب دیا:

"شیر خاں، میں تمہیں اپنا سارا خون دے دوں گا"

وہ بولا:

"کچھ — نہیں — ہو — سکتا — تم — نہیں — جانتے — یہ — دیکھو!"

اُس نے اپنے بے جان ہاتھ سے اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں اس کی قمیض پر خون کا سب سے بڑا دھبہ تھا۔ میں نے اس کے پیٹ کی طرف دیکھا۔ اس کے پیٹ پر اس کی قمیض کے دامن کے دو ٹکڑے خون کی گہرائی میں ایک معلوم ہوتے تھے۔ میں نے بے اختیار ہو کر قمیض کا دامن اٹھا دیا۔ شیر خاں کا پیٹ اوپر سے لے کر نیچے تک چاک تھا، اور اس میں انتڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

میں پاگلوں کی طرح چلایا:

"شیر خاں، یہ کیا تھا؟ چاقو؟"

شیر خاں نے ہاں کے اظہار کے لیے سر ہلایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

میں پاگلوں کی طرح اٹھا اور چلایا۔

"میں تمہارے لیے گاڑی لینے جا رہا ہوں، میں ابھی آتا ہوں"

میں پاگلوں کی طرح فیڈرل ایریا کی طرف بھاگا۔ شاید مجھے پولیس کا وہ ٹرک مل جائے جو ہجوم کو دیکھ کر فیڈرل ایریا کی طرف چلا گیا تھا شاید مجھے کوئی ایمبولنس مل جائے جو لاشوں کو اٹھاتی پھر رہی ہو۔ شاید مجھے کوئی ٹیکسی مل جائے۔ شاید مجھے ادھر سے گزرنے والی کوئی کار مل جائے۔ لیکن مجھے کچھ نہ ملا۔ میں سڑکوں پر پاگلوں کی طرح دوڑتا پھرا۔ سڑکوں پر سناٹا تھا۔ نہ کوئی انسان۔ نہ کوئی حیوان۔ نہ کوئی پرندہ۔ یا خدا، میں کیا کروں! کہاں جاؤں؟ اور میں بلا سوچے سمجھے لالوکھیت کی طرف بھاگ پڑا، شاید لالوکھیت میں میرا کوئی دوست میری مدد پر آمادہ ہو جائے۔ میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا، بھاگتا رہا اور میرے پاس یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ اتنا بھاگنے کے باوجود میں تھکا کیوں نہیں اور میرا سانس اس قدر پھولنے کے باوجود میرا ہارٹ فیل کیوں نہیں ہوا اور مجھ میں یہ قوت اور طاقت کہاں سے آ گئی ہے۔ میں بھاگتا رہا۔ بھاگتا رہا، بھاگتا رہا، اور پھر میں یکایک نیشنل کلینک کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

نیشنل کلینک۔ ڈاکٹر عبدالرزاق گاندھی۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔

ہاں۔ یہ ڈاکٹر گاندھی ہے جس کو میں کبھی کبھی مذاق سے مہاتما گاندھی کہتا ہوں۔ ڈاکٹر گاندھی کے پاس گاڑی بھی ہے جس کے وزٹ پر استعمال کرنے کے پانچ روپے چارج کرتا ہے۔ ڈاکٹر گاندھی بڑا اچھا ڈاکٹر ہے۔ میں ڈاکٹر گاندھی کو جانتا ہوں۔ اس نے میرا ٹائیفائڈ کا علاج کیا تھا۔ میں نیشنل کلینک کے اندر چلا گیا۔

کلینک میں کوئی مریض نہیں تھا۔ کمپاؤنڈر بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر گاندھی اپنے دفتر میں جہاں وہ مریضوں کا معائنہ بھی کرتا تھا، اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز پر افطاری کا سامان پڑا تھا۔ کٹا ہوا پپیتہ۔ پکوڑے۔ بھنی ہوئی دال۔ پان کی طشتری، سگریٹوں کی ڈبیہ، ماچس ———

میں نے نہایت رحم انگیز لہجے میں کہا:

"ڈاکٹر، میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ ایک مریض کی جان خطرے میں ہے۔"

ڈاکٹر کے چہرے پر تامل اور تذبذب کے آثار پیدا ہو گئے۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔ پھر بولا:

"معاف کیجئے کلینک بند ہو چکا ہے۔ رمضان شریف کے مہینے میں کلینک افطار سے ایک گھنٹہ پہلے بند ہو جاتا ہے۔ اب روزہ ...نے کا وقت نزدیک ہے۔ مغرب کی نماز کا وقت قریب ہے۔ اس کے بعد تھوڑا سا وقت کھانا کھانے کے لیے ہوگا۔ پھر نمازِ تراویح۔ ...اف کیجئے میں اب کہیں نہیں جا سکوں گا۔ اگر آپ کا کیس بہت سیریس ہے، تو اس کو یہیں لے آیئے۔"

میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا:

"ڈاکٹر خدا کے لیے میرے دوست کی جان بچایئے۔ میرے دوست کا کیس بہت سیریس ہے۔ وہ یہاں آنے کے بالکل قابل نہیں۔ ...پ کے پاس گاڑی ہے۔ افطار میں ابھی کچھ وقت ہے۔ اس وقت اس علاقے میں کوئی ٹرانسپورٹ نہیں۔ آپ اس کو یہاں ...آیئے۔"

ڈاکٹر گاندھی نے میری بات کاٹ کر کہا:

"جہاں تک گاڑی کا تعلق ہے اس کو باہر نکالنا ناممکن ہے۔ آج کے فساد میں بہت سی گاڑیاں اور ٹیکسیاں جلا دی گئی ہیں۔ ...ن حالات میں میں اپنے آپ کو اور اپنی گاڑی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔"

مجھے غصہ آ گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس کی خود غرضی پر برس پڑوں۔ لیکن مجھے اس نے بولنے کا موقع نہ دیا۔ اس نے کہا:

"مریض کو کیا تکلیف ہے؟ اگر آپ اس کو یہاں نہیں لا سکتے تو میرا مشورہ ہے آپ اس کے لیے دوا لے جایئے۔"

میں نے کہا:

"میرا دوست فساد میں بری طرح زخمی ہو گیا ہے۔ اگر اس کو فوراً ہسپتال نہ پہنچایا گیا تو وہ ختم ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر گاندھی یکایک گھبرا گیا اور بولا:

"فساد میں؟ تو فساد کے زخمیوں کا علاج تو سرکاری ہسپتال کے حادثاتی وارڈ میں ہوتا ہے۔ اور ان کو اٹھانے کے لیے تو سرکاری ...بولنس آتی ہے۔ حضرت مہربانی کیجئے، میرے کلینک سے ذرا جلدی چلے جایئے۔ ایسا نہ ہو میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں۔"

یہ میری ہتک تھی۔ مجھے انتہا غصہ آیا۔ اتنا غصہ کہ میرے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ اس کی بجائے میں نے ایک دس روپے ...نوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اور بولا:

"ڈاکٹر، میں ایمبولنس کے لیے ٹیلیفون کرنا چاہتا ہوں۔ اور پھر مجھے ایک روئی کا ایک رول دے دیجئے اور ایک رول پٹی ...دے دیجئے اور ایک ڈوز مورفیا کا اور ایک سرنج۔ میں خود انجکشن کر دوں گا۔ ایمبولنس کے آنے تک وہ آرام سے سویا رہے گا۔"

ڈاکٹر گاندھی نے کہا:

"ٹیلیفون ساتھ کے کمرے میں ہے۔ آپ ٹیلیفون کریں۔ میں دوائیں تیار کرتا ہوں۔"

جب میں ٹیلیفون کر کے واپس آیا تو ڈاکٹر گاندھی نے کہا:

"مورفیا کا انجکشن اس کو نقصان دے گا۔ اس کو سونا نہیں چاہیئے۔ اگر وہ سو گیا تو پھر نہیں جاگے گا۔ میں نے اس کے لیے ایک خاص دوا تیار کی ہے۔ کوکین ٹنچر۔ روئی کے ایک پھائے سے زخموں کے آس پاس لگا دو۔ کوکین زیادہ درد نہیں ہونے دے گی۔ ٹنچر جراثیم سے بچائے گی اور تھوڑی تھوڑی جلن پیدا کر کے اُس کو جاگتا رکھے گی۔ دوائیں میز پر سے اٹھا لیجئے:"

یہ کہہ کر وہ کلینک کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور غور سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شاید وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ میرے نکلنے سے پہلے کہیں اس کے کلینک پر پٹھان حملہ تو نہیں کر دیں گے۔

میں دوائیں اٹھا کر جلدی جلدی دروازے کی طرف چلا۔ دروازے پر مجھے ڈاکٹر گاندھی نے روک لیا اور میری طرف دس روپے کا نوٹ کر کے بولا:

"یہ بھی لے جائیے!"

میں نے کہا:

"نہیں، ڈاکٹر۔ یہ دواؤں کی قیمت ہے:"

ڈاکٹر گاندھی نے دس روپے کا نوٹ میرے کوٹ کی سامنے کی چھوٹی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا:

"میں نے آپ کے لیے کچھ نہیں کیا:"

میں نے کہا:

"شکریہ، ڈاکٹر۔"

اور میں بے لگام ہو کر بھاگ پڑا۔ بھاگ۔ بھاگ۔ بھاگ۔ بھاگ۔ تو یہ کتنا لمبا راستہ ہے اور اس بیوقوف کے بچے ڈاکٹر نے باتوں باتوں میں کتنی دیر لگا دی اور میں ڈاکٹر سے بھی بڑا بے وقوف تھا کہ اس سے باتیں کرتا رہا۔ باتیں کرنے کی بجائے مجھے چاہیئے تھا کہ میں بھاگ کر واپس شیر خاں کے پاس چلا جاتا اور اسے اپنے کندھے پر اٹھا کر کلینک میں لے آتا۔ بس اب میں پہنچنے والا ہوں۔ تھوڑا سا فاصلہ اور رہ گیا وہ سامنے آگیا، وہ ہے شیر خاں۔

"شیر خاں!"

"شیر خاں!"

"شیر خاں!"

"شیر خاں!"

اور میں شیر خاں کو دیکھ کر پتھر میں تبدیل ہو گیا۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر تک پتھر کا بت بنا کھڑا رہا۔ پھر یکایک میرے دماغ کے کسی کونے میں ایک مدھم سا لامپ روشن ہوا، اور میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ میں پتھر کی طرح بے حس و حرکت کیوں کھڑا ہوں؟ میں شیر خاں کے ساتھ بات کیوں نہیں کرتا؟

میں آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر شیر خاں کے اوپر جھک گیا۔ شاید شیر خاں زخموں سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گیا ہے۔ میں
ں نے زخموں کے سارے گرد کیمو ٹنکچر کے پھاہے لگانے لگا۔ اب اس کا درد کم ہو جائے گا اور ٹنکچر کی جلن سے وہ جاگ اٹھے گا۔ میں اس کو جگانے
ے لیے اسے زور زور سے آوازیں دینے لگا۔

"شیر خاں، اٹھو، شیر خاں، تمہارے لیے سونا اچھا نہیں۔ شیر خاں، جاگو۔"

شیر خاں نے کوئی جواب نہ دیا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ میں شیر خاں کی نبضیں دیکھوں، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ میں شیر خاں کی نبضیں نہیں دیکھوں گا۔
ہیں شیر خاں مر نہ گیا ہو۔

میں پھر شیر خاں کو آوازیں دینے لگا۔

"شیر خاں، سنو، میری بات سنو۔ میرے ساتھ باتیں کرو۔ شیر خاں۔ اگر تم میرے ساتھ بات کرو گے تو میں تمہارے لیے ایک
بہت اچھی کہانی لکھوں گا۔ تمہاری کہانی۔" شیر خاں نے کوئی جواب نہ دیا۔

مجھے شک ہو گیا۔ میں نے شیر خاں کے دونوں بازو اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور اپنے دونوں گالوں سے لگا لیے۔ اس کے بازو برف
طرح ٹھنڈے اور بانس کی طرح سخت تھے۔ میری چیخ نکل گئی:

"شیر خاں، تم مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے؟ شیر خاں، تم مر گئے؟ نہیں شیر خاں۔ تم نہیں مر سکتے، میں تمہیں کبھی نہیں مرنے دوں گا،
تمہیں کبھی نہیں مرنے دوں گا، میں تمہیں کبھی نہیں مرنے دوں گا۔"

سائرن بجنے لگے۔

روزہ کھلنے کا اعلان ہو گیا۔

مسجدوں میں اذانیں ہونے لگیں۔

اللہ اکبر!

اللہ اکبر!

میرے زخم

مہندر ناتھ

دراصل میں خود حیران تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اُرملا کو دیکھنے کے بعد میری آواز کیوں حلق میں اٹک جاتی ہے جو کچھ وہ کہتی ہے، اسے کہنے پر میں کیوں مجبور ہو جاتا ہوں۔ اُرملا کو میرے گھر آئے ہوئے صرف چند دن ہوئے تھے وہ اپنی پھوپھی کے ساتھ آئی تھی۔ اگر میں اپنے خدوخال کا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دوں تو مجھے سمجھنے میں آپ کو بہت آسانی ہوگی۔ میری صورت دیکھ کر آپ کبھی خوش نہ ہوں گے۔ یعنی اچھا خاصا بدصورت آدمی ہوں۔ یوں میرے بتیس دانت اپنی جگہ پر ہیں۔ ناک ذرا لمبی اور نوکدار ہے۔ لیکن اتنی لمبی اور نوکیلی نہیں کہ آپ میرا مذاق اڑاتے پھریں۔ آنکھیں نہ چھوٹی نہ بڑی۔ چہرہ لمبوترہ۔ رنگ ذرا سیاہ سا۔ ماتھا چھوٹا اور بال کالے کم۔ سفید زیادہ۔ یوں میری عمر زیادہ نہیں ہے بلکہ اسے خاندانی بیماری سمجھئے کہ میرے بال کم عمر میں ہی سفید ہو گئے۔ یوں چہرے کو دیکھ کر آپ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ لیکن مجموعی طور پر میرا چہرہ خوشگوار اثر نہیں ڈالتا۔ یوں میرا قد لمبا اور میرا اچھا خاصا ڈیل ڈول ہے۔ بھاری آواز۔ پھر بھی کیا عرض کروں کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بات نہیں بنتی۔

اس بات کا مجھے علم ہے کہ میرے پیدا ہوتے ہی میری ماں مر گئی تھی اور میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ میرا باپ ایک حوالدار تھا۔ اسے سوائے حکم چلانے کے اور کچھ نہ آتا تھا۔ بچپن میں اس نے مجھے خوب مارا۔ اس لیے پانچویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکا۔ جب میں جوان ہوا تو سارے علاقے میں اچھا خاصا آوارہ گرد مشہور ہو چکا تھا۔

چند لوگ اچھے کام کر کے مقبول اور مشہور ہو جاتے ہیں۔ میں نے بُرے کام کر کے شہرت حاصل کر لی تھی۔ یہ بات تو نہیں کہ میں شرابی کبابی یا جواری تھا۔ بس کام نہ کرنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ بہت کوشش کرنے پر بھی یہ عادت مجھ سے نہ چھوٹ سکی تھی۔ ذاتی مشغلہ یہ رہ گیا کہ یار دوستوں سے یا تو گپیں ہانکنا۔ چار مینار کے مسلسل سگرٹ پینا۔ گھٹیا افسانے اور ناول پڑھنا۔ نت نئی فلمیں دیکھنا اور اگر ان سے مہلت ملتی تو ایک ہلکی پھلکی کہانی گھسیٹ لیتا۔ ایک اور بری عادت پڑ گئی تھی، جسے کہتے ہوئے شرم سی آتی ہے۔ یعنی جب میں کسی خوب صورت لڑکی کی طرف دیکھتا تو بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ حتیٰ کہ لڑکی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی اور میں خوابوں کی دنیا میں کھو جاتا۔

میری بدصورتی مجھ پر اس قدر غالب تھی کہ آج تک کسی لڑکی نے مجھ سے مسکرا کر بات نہ کی۔ اکثر جوان لڑکیاں مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتیں۔ یوں میں مرنجان مرنج قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ اپنا کام نکالنا جانتا ہوں۔ کافی بیباک اور اکھڑ ہوں۔ جب تک لوگ میری مدد کرتے ہیں۔ میں ان کی طرفداری کرتا ہوں۔ جونہی وہ مدد کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ میں بھی ان سے منہ پھیر لیتا ہوں کبھی ملاقات ہو جائے تو ان کی اچھی خاصی خبر لیتا ہوں۔ چھوٹے بھائیوں سے روپے ادھار لے کر انہیں کبھی واپس نہیں کرتا۔ اپنے گھٹیا پن کا مجھے احساس ہے۔ کیا کروں زندگی کی گاڑی اس گھٹیا پن کے بغیر نہیں چلتی اور اس وجہ سے لوگ مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔

ایسی حالت میں اُرملا نے میری طرف دیکھا۔ دیکھتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یوں اُرملا تھی لڑکی۔ ایسی لڑکی نہیں کہ انسان دیکھتے ہی اُس پہ فدا ہو جائے۔ میری طرح وہ بھی اچھی خاصی بدصورت تھی۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ میرے چہرے پر وہ اعضاء تھے جو ایک خوبصورت انسان کے چہرے پر ہوتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ایسا تاثر پیدا کرتے کہ دیکھتے ہی گھن آنے لگتی۔ اُرملا کے چہرے کی بھی یہی حالت تھی۔ اُرملا کی آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں۔ نہ ٹیڑھی نہ بھینگی۔ سر کے بال سیاہ تھے۔ ناک مجھ سے بہتر۔ ہونٹ ذرا موٹے موٹے اور رنگ مجھ سے زیادہ سیاہ، چہرہ بھرا ہوا۔ جہاں تک اُرملا کے جسم کا تعلق تھا۔ اس میں نسوانی دل کشی کی جھلک نمایاں تھی۔ لیکن اگر مجموعی طور پر اُرملا پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو اسے اچھی خاصی بدصورت لڑکیوں کی صف میں جگہ ملے گی۔

پہلی ملاقات میں اُرملا نے بُلا کر کہا۔ "یہ لو پانچ کا نوٹ اور فلم "جنگل" کے دو ٹکٹ لاؤ! جلدی!" اُرملا کے اندازِ بیان میں کوئی نسائیت نہ تھی۔ بلکہ بات کہنے کا ڈھنگ ہٹلرانہ تھا۔ جو مجھے ناگوار لگا۔ میں اس وقت خاموش رہا۔ اگر اس طریقے سے میرا کوئی ساتھی مجھ سے ہمکلام ہوتا تو پانچ روپے کا نوٹ اس کے منہ پر دے مارتا۔ میں نے سوچا کسی لڑکی کی اس طرح بے عزتی کرنا شرافت نہیں حماقت ہوگی۔ میں نے ٹکٹ خرید کر اُرملا کو دے دیئے اس نے شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ بس ٹکٹ مجھ سے چھین لیے۔ کیا میں اُرملا کا زرخرید غلام تھا۔ کیا سمجھتی ہے وہ اپنے آپ کو۔ شاید وہ یہ نہیں جانتی کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ ابھی جس نے اپنوں سے بگاڑ لی۔ وہ دوسروں کی کیا پروا کرے گا۔

اگلے دن وہ کہنے لگی۔ "ذرا ماچس لا دیجئے بازار سے" اور میں ماچس لے آیا۔ پھر کہنے لگی "چائے کا پیکٹ؟" وہ بھی لے آیا۔ پھر سوئی اور دھاگے کی فرمائش کر دی۔ ایک دن تو غضب کر دیا اُرملا نے۔ کہنے لگی "وہ سلیپر اٹھا کر لا دیجئے" کوئی اور ہوتا تو سلیپر اٹھا کر منہ پر ملتا۔ میں نے خاموشی سے سلیپر اٹھا کر اس کے پاؤں کے پاس رکھ دیئے۔ میری خودداری اور عزت کہاں گئی تھی۔ شرم سے میرا سر جھک گیا۔ میں نے بے شرمی کا لبادہ کیوں اوڑھ لیا۔ میں اُرملا سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتا کہ تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ اتنے گھٹیا کام مجھ سے کیوں کرواتی ہو۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ میں ایسے گھٹیا کام کرتا ہی کیوں ہوں۔

اُرملا دس دن تک میرے گھر میں رہی اور دس دنوں تک مجھ پر ایک ڈکٹیٹر کی طرح حکومت کرتی رہی اور میں ایک غلام کی طرح اُس کے حکم کی تعمیل کرتا رہا۔ گیارھویں دن جب وہ جانے لگی تو اس نے میری طرف دیکھا۔ اُن آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی رعونت اور اکھڑپن تھا۔ ان آنکھوں میں کسی قسم کی نرمی نہ تھی۔ نہ شفقت نہ پیار اور نہ ہی محبت کی کوئی ایسی خوشبو جس سے میرا دماغ معطر ہو جاتا۔ وہ آنکھیں اصرار کے انداز سے کہہ رہی تھیں "جہاں میں جا رہی ہوں تمہیں آنا پڑے گا" عجیب معشوقہ سے پالا پڑا ہے۔ خالص ڈکٹیٹر ہے۔ کم بخت۔ میں دو سال تک اپنے گاؤں میں بھٹکتا رہا تاکہ اُرملا کو بھلا سکوں۔

ارملا نے مجھے کیا دیا تھا کہ میں اسے یاد کرتا۔ بس نوکروں کی طرح کام لیتی رہی۔ وہ کونسی کالنسداد احسینہ تھی کہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتی۔ مجھے غصہ تو اس بات کا تھا کہ میں غلاموں کی طرح اس کے حکم بجا لاتا رہا۔ آخر کیوں ——— دو سال تک میں اور کوئی کام نہ کر سکا۔ بس ارملا کے خلاف ایک محاذ بناتا رہا۔ مل جائے تو اس بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔ یہی سوچتے سوچتے میرا دماغ شل ہو گیا۔ یہ کس قسم کی نفرت تھی مجھے ارملا سے ۔۔ اور کیوں ۔۔ میں اُرملا کو بھول کیوں نہیں جاتا۔ اس ذہنی انتشار سے مجھے کیا ملے گا۔ اسے بے عزت کر کے مجھے کونسا تمغہ ملنے والا ہے۔ اُرملا کا بدصورت چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آتا۔

پھیلے ہوئے نتھنے۔ سیاہ چہرے پر موٹے موٹے ہونٹ۔ بیکاری رعونت۔ طرزِ تکلم ہتلرانہ کیا یہ نفرت کا لاوا محبت کو جنم دے سکتا تھا۔ کیا نفرت کی کوکھ سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ میں پہلے ہی بیکار تھا۔ اُرملا کی محبت نے اور بیکار کر دیا۔ میں چڑ چڑا سا ہو گیا۔ بات بات پہ یار دوستوں سے لڑ پڑتا۔۔ جو لوگ میرے ہمدرد تھے ان سے بھی جھگڑا کرتا۔ اور جب میں اس گاؤں میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ تو میں نے اُرملا کے شہر کی طرف رُخ کیا تاکہ میری روح کی تشنگی مٹ سکے۔

میں بمبئی آ گیا جہاں ارملا اپنے بھائی اور بھاوج کے ساتھ رہ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ پیشانی پر فتح مندی کے آثار نمودار ہو گئے۔ کہنے لگی، "مجھے یقین تھا تم آؤ گے"

یہ میری زندگی کا بدترین دور تھا۔ آٹھ سال کا عرصہ ایک بھکاری کی طرح اس شہر میں گزار دیا۔ پانچویں جماعت پاس انسان بھلا اس شہر میں کیا کر سکتا تھا۔ بس تھوڑی سی ہندی آتی تھی اور ٹوٹی پھوٹی انگلش۔ کام کاج کے لیے کافی ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر نتیجہ صفر نکلا۔ ایک وقت کھانا کھا کے سو جاتا۔ بس انہیں دنوں اُرملا میرے کام آئی وہ اکثر مجھ پر ترس کھا کے مجھے ایک دو روپے دے دیتی۔ کبھی کبھی میرے کپڑے دھوتی۔ قمیض یا پاجامہ پھٹ جاتا تو فوراً اسے سی دیتی اور مہینے میں ایک دو فلمیں بھی دکھا دیتی اور ہمیشہ مجھ سے کہتی "کوئی کام کرو" جب کوئی اور کام نہ ملا تو میں نے وادر پوسٹ آفس کے باہر منی آرڈر لکھنے کا کام شروع کیا۔ چلچلاتی دھوپ میں کھڑا ہو کر لوگوں کے منی آرڈر لکھتا۔ برسات میں جب بارش ہوتی تو پوسٹ آفس کی دیوار سے لگ کر تار اور منی آرڈر لکھتا۔ یہ کیسے دن تھے۔ یہ کیسی راتیں تھیں۔ یہاں تو کوئی کسی کا نہ تھا۔ بس ایک اُرملا تھی۔ جو وقت بے وقت دو میٹھے بول بولتی۔ اب تو حکم نہ ماننے کی بھی ہمت مجھ میں نہ رہی تھی۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اُرملا کے ظاہری خول میں ایک تکبر غرور اور رعونت ضرور تھی۔ لیکن اس کے دل کے اندر میرے لیے کافی جگہ تھی۔ اگر اسے مجھ سے ہمدردی نہ کرتی تو وہ میرے کپڑے ہرگز نہ دھوتی۔ ان پر استری بھی نہ کرتی۔ میرے پھٹے ہوئے کپڑوں کو اسے سینے کی کیا ضرورت تھی۔ اور اسے کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ "کہیں نوکری کر لو!" جب کبھی وہ نوکری کی بات کرتی۔ تو میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ نہ جانے میرا جی ایک جگہ جم کے کام کرنے کو کیوں نہیں چاہتا۔ اگر مجھے نوکری مل جائے تو میں ایک کمرہ کرائے پر لے سکتا ہوں۔ ارملا میرے پاس رہ سکتی ہے۔ جو کچھ میں کماتا تھا۔ اس سے دو وقت کا ہی کھا سکتا تھا۔

اُرملا کے بھائی کو ہم دونوں کی ملاقاتوں کا پتہ چل گیا۔ بس پھر کیا تھا وہ اپنی بہن پر ایسا برسا کہ ناکوں چنے چبوا دیے۔ ایک رات ارملا کو اتنا پیٹا کہ وہ سات دنوں تک گھر سے باہر نہ نکل سکی۔ بھائی نے بہن سے صاف صاف کہہ دیا ـــ "اگر تم نے اس ناخلف، بے شرم۔ آوارہ۔ اور بیکار انسان سے بات کی تو میں تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ اور اگر وہ کبھی یہاں آیا تو اس کی لاش ہی یہاں سے جائے گی"

جب مجھے اس مار پیٹ کی خبر ملی تو بے حد رنج ہوا۔ میں کتنا بیکار قسم کا آدمی ہوں کہ ارملا کو اپنانے کے لیے کچھ کرتا نہیں۔ چند دنوں کے بعد پتہ چلا کہ اُرملا کی سگائی ہونے والی ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی میرے ہوش اُڑ گئے۔ اب میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ کس سے کہوں۔ اپنے دل کی واردات میری کون دیکھ بھال کرے گا۔ اس دنیا میں اُرملا کے سوا میرا اور کون تھا۔ مجھے ایک دو روپے روز کون دے گا۔ میرے میلے کپڑے کون دھوئے گا۔ میرے پھٹے کپڑوں کو کون سیئے گا۔ مجھے ڈھارس کون دے گا۔ مجھ سے کون کہے گا کہ "تم کہیں نوکر کیوں نہیں ہو جاتے؟" مجھ سے کون بات کرے گا اب میں کہیں کا نہ رہا۔ اُرملا کے بغیر میری زندگی بیکار تھی۔ میں اُرملا سے ضرور ملوں گا۔ اور کہوں گا ـــ اگر تم نے کسی اور سے شادی کر لی تو میں بالکل بے سہارا ہو جاؤں گا۔ میں ارملا کے گھر کی طرف چل دیا۔ آج اگر اُرملا کے گھر سے میری لاش نکلتی ہے۔ تو نکلے۔ اس کا بھائی مجھے قتل

کرنا چاہتا ہے تو قتل کرے۔ اب تو مرنا ہی بہتر ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ شام مجھے ابھی تک یاد ہے۔ وہ شام میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس قسم کی شام زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔ جونہی ارملا کے گھر کے قریب پہنچا کر سامنے سے ارملا آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ میرے قریب سے گزری۔ اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ بازار سے نکل کر ہم دونوں ایک جنگلے کے قریب آ گئے۔ جنگلے کے ساتھ ریل کی پٹڑی تھی۔

"جانتے ہو میری سگائی ہو رہی ہے!"

"ہاں!"

"اب تو میری زندگی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب ملنے سے کیا فائدہ؟"

"یہ فیصلہ تمہارے بھائی نے کیا ہے۔ میں اپنی قسمت کا فیصلہ تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

میں نے چار مینار کا پیکٹ جیب سے نکالا اور ایک سگریٹ سلگایا۔

"آٹھ سال سے دیکھ رہی ہوں کہ تم ایک راستے پر چلے جا رہے ہو!"

"اور وہ راستہ تمہارے گھر کی طرف جاتا ہے۔" میں نے زور سے سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"وہ راستہ اب بند ہو چکا ہے۔ مجھے اب شادی کرنی ہوگی۔ میرے لیے اور کوئی راستہ نہیں!"

میں نے غصے میں آ کر جلتے ہوئے سگریٹ کو ہتھیلی کی بائیں طرف بجھایا۔ ارملا نے جلتے ہوئے سگرٹ کو بجھتے ہوئے دیکھا۔ میرے بائیں ہاتھ کی چمڑی جل رہی تھی۔

"میں نے سوچا تھا، ان آٹھ برسوں میں تم کچھ کر لو گے۔"

"اور میں کچھ نہ کر سکا۔"

میں نے ایک اور سگریٹ سلگایا۔

"میں نے چاہا تھا کہ تم کہیں نوکر ہو جاؤ۔ ایک کمرہ لے لو۔ پھر میں اپنے بھائی سے ... ..."

"میں ایک کمرہ بھی نہ لے سکا۔"

میں نے دوسرا سگرٹ ہتھیلی کی بائیں طرف بجھاتے ہوئے کہا۔ دو زخم ہو گئے تھے۔ میرے ہاتھ کی جلد جل رہی تھی۔

"میں نے یوں بھی سوچا تھا کہ تم مجھے ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ گے اور گھر واپس چلے جاؤ گے۔"

"اور میں تمہیں آج تک نہ بھلا سکا۔" میں نے تیسری سگرٹ کو ہتھیلی کی بیک پر بجھاتے ہوئے کہا:

"میں نے سوچا تم خودکشی کر لو گے!"

"اور میں خودکشی بھی نہ کر سکا.."

میں نے اپنا چوتھا اور پانچواں سگرٹ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی بیک پر بجھاتے ہوئے کہا،

میرے ہاتھ کی چمڑی جل رہی تھی۔ پانچ جلتے ہوئے نشان! میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے ایک لمحہ اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا

ایک اور سگرٹ سلگایا ـــــ!

"یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ چلّا کر بولی "کیوں جلا رہے ہو اپنے آپ کو؟!"

"تم ابتدا کی بات کر رہی ہو۔ آج میں اپنے آپ کو جلا دوں گا تمہارے سامنے۔ اب میری راکھ کو سیندور سمجھ کر اپنی مانگ میں بھرنا!"

اب اُرملا سے نہ رہا گیا۔ میرا ہاتھ اُس نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ میرے زخموں کی طرف دیکھا جو جل رہے تھے۔ اور ان جلتے ہوئے زخموں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور آہستہ آہستہ ان بیرحم آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور میری تشنہ روح کو سیراب کرتے گئے۔ اُس وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے مجھے سب کچھ مل گیا ہو۔ میں نے اُرملا کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اُرملا بھی میرے سینے سے لگی سسکیاں لیتی رہی۔ منہ سے تو کچھ نہ بولی۔ مگر اس کی سپردگی نے مجھے احساس دلا دیا کہ وہ میری ہے۔ میرے زخموں کی طرح میری :

جاہل ناطق

محمد احسن فاروقی

پہلے زمانے میں جاہل لوگ زیادہ تر خاموش ہی رہا کرتے تھے اس لئے جاہل مطلق کی ترکیب تو عام ہو گئی مگر جاہل ناطق کی کسی کو نہ سوجھی۔ یہ تو مسلم ہے کہ آج کل کے ڈگری یافتہ لوگ رہ جاتے ہیں جاہل کے جاہل۔ جاہل کے ٹھٹھ کہیئے یا تعلیم کے ٹھٹھ کہیئے۔ مگر ان میں سے کچھ بڑے زور شور سے بولتے ہوئے بھی نکلتے ہیں۔ ان کو اگر جاہل ناطق کہا جائے تو کیا حرج ہے۔ مردم شماری میں ان کی تعداد کتنی ہی مقرر ہو مگر ہمارے نواب جلیل القدر بہادر سب سے بازی ضرور لے جائیں گے۔

وہ ایم اے بھی ہیں اور ایل۔ ایل بی بھی اور کامیاب وکیل بھی کہے جا سکتے ہیں۔ اس کے بابت دیہاتی لوگوں کو کہتے سنا: "ہارجیت تو تیری قسمت بڑا وکیل تو اس لڑا جنی اصیل مرگا"۔ شاید مرغے کی پھبتی ان دیہاتیوں کو یوں سوجھی کہ ہمارے جاہل ناطق اپنی گردن کو لڑنے والے مرغے کی طرح آگے نکال کر ہی بے تحاشہ بحث میں مصروف ہو جاتے تھے اور زیادہ غور سے انھیں بحث کرتا ہوا دیکھیئے تو محسوس ہوتا تھا کہ اب جلے اور منصف کو پنجے مارے۔ مگر مرغا تو حیوان مطلق ہے۔ ان کے نطق کا عالم ہر حیوان ناطق کا ناطقہ بند کر دے۔ وہ آواز پوری کچہری گونجتی تھی اور پھر گفتار کی وہ رفتار کہ معلوم ہوتا تھا پنجاب کلکتہ میل چھوٹے اسٹیشن چھوڑتا ہوا چلا جا رہا ہے۔

ان کے نطق کا یہ عالم ہر جگہ قائم رہتا تھا اگر ایک آدمی سے بھی بات کریں گے تو اسی رفتار کے ساتھ جس سے وہ بولتے وہ یہی محسوس کرتا جیسے کہ وہ کوئی جلسہ عام ہے۔ ان کی باتوں کا مواد بھی عجیب ہوا کرتا تھا جس سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ انھیں کچھ معلوم نہیں ہے مگر وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ ہر علم اعلیٰ پیمانے پر رکھتے ہیں۔ ان کی خاص ترکیب یہ تھی کہ کوئی کسی موضوع پر کوئی بات کہے وہ بات کو بغیر سمجھے بوجھے اس سے اختلاف کر دیں گے۔

ایک وقعہ کا ذکر ہے کہ جب عالمی جنگ ہو رہی تھی تو کچھ لوگ بیٹھے ہوئے کہہ رہے تھے: "ہٹلر نے پیرس فتح کر لیا"

آپ بھی ادھر سے آنکلے چھوٹتے سے بولے: "بالکل غلط"

"کیوں صاحب غلط کیوں؟" سوال کیا گیا۔

آپ نے تقریر شروع پورے زور شور سے شروع کر دی: "عام لوگوں کا قاعدہ یہ ہے کہ افواہوں پر چلتے ہیں کسی بات کی تصدیق نہیں کرتے۔ جاہلوں کا یہی رویہ ہے جاہل کی یہی پہچان ہے کہ سنی سنائی بات کو مان لیتا ہے۔ یہ بہت غلط بات۔ یہ اخبار بھی افواہیں ہی پھیلاتے ہیں۔ اس کے لکھنے والے بھی جاہل ہوتے ہیں انگریزی پروپاگنڈے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ یہ سب جنگ کے بابت باتیں ایک ایک غلط۔ آپ کو کیا معلوم کہ جنگ ہو بھی رہی ہے کہ نہیں۔ یہ سب چندہ جمع کرنے کے لئے ڈھونگ ہی رچایا گیا ہو کیا معلوم آپ کو۔ آپ لوگوں میں تصدیق کا مادہ ہی نہیں۔ ہر ایک کی بات پر آمنا صدقنا کر لینے کے عادی ہو چکے ہیں۔۔۔۔

ایک صاحب نے ان کی تقریر کو کاٹتے ہوئے کہا "آپ کا مطلب ہے کہ جنگ ہی نہیں ہو رہی ہے اور یہ تمام خبریں محض پروپگنڈہ ہیں۔"

"میرا یہ مطلب ہے۔ آپ لوگ بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ یہی تو میں کہتا ہوں کہ ہندوستانی لوگ بالکل جاہل ہیں جاہل مطلق ہیں۔ کیا معلوم کہ جنگ ہو ہی رہی ہے ممکن ہے ہو رہی ہو۔ ممکن ہے نہ ہو رہی ہو اور انگریز نے ریڈیو اور اخبارات اور تمام خبر دینے والے اداروں پر زور ڈالا ہو کہ جنگ کی خبریں نکالو۔ وہ سب اس کے زیر اثر ہیں۔ دھڑا دھڑ خبریں نکال رہے ہیں اور آپ لوگ مان رہے ہیں۔ میں اسی لئے بالکل اخبار نہیں پڑھتا۔ اکبر نے کہا تھا۔ وظیفہ کی جگہ اب پانیر اور پاؤنیر آئے۔ میں بھی اپنا وظیفہ جاری رکھتا ہوں۔ نماز کے وقت اٹھ بیٹھتا ہوں۔ نماز کے بعد گھنٹہ بھر وظیفہ پڑھتا ہوں۔ اللہ کو یاد کرتا ہوں۔ آج کل کے لوگ اللہ کو بھولتے جا رہے ہیں۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن ۔۔۔۔۔

"آپ کہاں سے کہاں نکلے جا رہے ہیں۔ یہ بتائیے کہ جنگ کی بابت آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔"

"کہنا کیا چاہ رہا ہوں۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ صاف صاف کہہ رہا ہوں۔ مجھے جنگ کی کیا پڑی۔ ممکن ہے جنگ ہو ہی نہ رہی ہو۔ کون جانے یہ سب چندہ جمع کرنے کی باتیں ہوں۔ اور یہ بھی امکان ہے کہ جنگ ہو رہی ہو۔ ہٹلر نے پیرس لے لیا ہو۔ مگر ۔۔۔۔۔"

"اچھا آپ اپنی بکواس بند کیجیے۔" ایک صاحب نے جھلا کر کہا۔

وہ بھی طیش میں آ گئے "یہ بکواس ہے آپ لوگ جاہل۔ بات سمجھنے کا اہل ہونا بھی مشکل بات ہے۔ خدا نے سب کو اہل نہیں بنایا۔ ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء۔ آپ لوگ سب جاہل ہیں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ آپ سے بات کروں۔ کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ لوگ بھی اونچی ذہنی سطح پر آ جائیں۔ مگر آپ لوگ تو صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ کے دائرے میں ہیں۔ آپ کو کون سمجھا۔۔"

ان کی تقریر ختم نہ ہوتی اگر آپس میں باتیں کرنے والے دوست انھیں دھکیل کر الگ نہ کر دیتے اور اپنے گھر کا دروازہ نہ بند کر لیتے۔

مگر انہوں نے جاہل مطلق دنیا کو اپنی طرح جاہل ناطق بنا لینے کا بری طرح عزم باندھ لیا تھا۔ لوگوں کی باتوں میں مزدر کودتے اور اسی طرح بے پر کی اڑاتے۔ دوسروں کو جاہل مطلق بناتے اور آخر کو غصہ کرتے ہوئے الگ ہو جاتے۔ لوگ ان سے عاجز تھے۔ وکالت ان کی کچھ دیہاتیوں کو پھانس لینے تک ہی محدود رہ گئی تھی۔ منصف لوگ جھلا کر کہہ دیتے کہ آپ IRRELEVENT جاتے ہیں۔ سمجھ دار موکلوں نے بھی انھیں وکیل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب انھیں اور بھی فرصت تھی اور وہ ہر جگہ کود پڑتے تھے اور اپنی تقریر پورے زور اور پوری رفتار سے جاری کر دیتے تھے۔

ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنی قطع بھی بدل لی تھی۔ داڑھی چھوڑ دی تھی مونچھیں خود اور صبح کو مونڈا کرتے تھے۔ اٹنگا پجامہ پہنتے اور اس پر لمبی شیروانی جس کے سب بٹن لگے ہوتے۔ سر کو اٹھا کے رہنے کے عادی تھے یہی داڑھی کے ساتھ اٹھے ہوئے سر کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ داڑھی اور سر کے بال مل کر ایک پلیٹ بنا رہے ہیں جس پر ان کا چہرہ کٹا ہوا رکھا ہے۔ سماں دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ داڑھی نے عاشق مزاجی بھی پیدا کر دی تھی اور مردوں کے علاوہ تعلیم یافتہ نئے فیشن کی لڑکیوں کے گروہوں میں بھی داخل ہونے لگے تھے۔ وہ ان کی تقریروں پر ہنستیں اور یہ سمجھتے کہ لطف اندوز ہو رہی ہیں۔ وہ تمام لڑکیوں کو برابر چاہتے تھے اور تمام لڑکیاں ان کو برابر سے مضحکہ سمجھتی تھیں۔ وہ سمجھتے

کہ ہرٹی ان پر ایک جان چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہے۔ وہ لڑکیوں کو وعظ کرنا بھی عشق بازی کا ایک جزو اعظم سمجھتے تھے۔ ان کی تقریر کا بھی کوئی موضوع تو ہوتا نہیں اور اگر ہوا تو ہمیشہ وہ اسی سے دور ہی ہو جانے کے عادی تھے۔ لہٰذا اس نے وعظوں کو لڑکیاں محض مضحک بکواس سمجھتیں۔ اگر ان سے کوئی مطلب نکل سکتا تو یہ کہ وہ شاید نکاح کرنا چاہتے تھے۔ مگر آدمی بال بچے دار تھے اور بیوی ان سے منت نالاں رہتیں اس لئے ان سے نکاح کے سوال پر ہرٹی کی خطرہ ہی محسوس کرتی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں۔ انہوں نے ان لڑکیوں سے نکاح کرنے کو بھی کہا مگر ان کی فطرت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس بات کا امکان نہیں معلوم ہوتا ممکن ہے کہ کچھ لڑکیوں سے تقریر میں انہوں نے نکاح کا لفظ اپنے مخصوص انداز میں گھمایا ہو مگر اس سے کبھی یہ مطلب نہ نکلا ہوگا کہ وہ نکاح کرنا چاہتے ہیں یا نہیں چاہتے۔ کسی صاف مطلب پر آنا ان کی شان کے خلاف تھا۔ بہرحال لڑکیاں بھی کچھ دن ان پر ہنس کر ان سے بور ہونے لگیں۔ مگر وہ یہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی مرد یا عورت ان سے بور بھی ہو سکتا ہے اور وہ بلا جھجک ہر دائرے میں داخل ہوتے رہے اور اپنی تقریریں کرتے رہے چاہے کسی نے سنیں یا نہ سنیں۔

شہر کے تمام تعلیم یافتہ مرد اور عورت ان سے عاجز تھے اور یہ سوچنے لگے کہ ان سے کیسے پیچھا چھڑایا جائے۔ اس وقت سیاست کا دور دورہ تھا اور شہر میں ہر سیاسی پارٹی اپنی تنظیم کر رہی تھی۔ لوگوں نے سوچا کہ انھیں سیاسی پارٹی کا سیکرٹری منتخب کر دیا جائے کچھ دنوں ہی کام میں لگے رہیں گے اور مختلف مقامات پر تقریریں کرتے پھریں گے۔ اور اس طرح افراد کی جان چھوٹ جائے گی۔ چنانچہ سب نے ایک رائے ہو کر اپنی مقبول سیاسی جماعت کا (جس کا نام لینے کی ضرورت نہیں) سیکرٹری بنا دیا۔ اب کیا تھا وہ ہر جگہ ایک کثیر مجمع کے سامنے اپنے خاص انداز میں دھواں دھار تقریریں کرتے نظر آتے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تقریروں کا نہ کوئی مطلب ہوتا تھا اور نہ ان کو سننے والا مجمع کسی مطلب سے ان کو سنا ہی کرتا تھا۔ مگر ان کے دوستوں کی جان بچی اور وہ مقرر کی حیثیت سے بہت کامیاب گنے گئے۔ معلوم ہوتا ہے وہ جس کام کے لئے بنائے گئے تھے وہ ان کو حاصل ہو گیا۔

سیاسی جماعت کو پوری کامیابی ہوئی اور اسے حکومت مل گئی۔ نواب جلیل القدر بہادر کو انتظامی عہدے ملے ان میں مقرری کے مواقع نہ ملنے کی وجہ سے وہ پریشان ہوئے اور خود اعلیٰ معلمی کے کام سے تنگ آ گئے حالانکہ اپنے سابقہ معلموں پر دھونس گانٹھنے کے لئے وہ ہمیشہ کہتے: "میں فلاں جماعت کا سیکرٹری رہ چکا ہوں۔ فلاں فلاں انتظامی کام کر چکا ہوں۔"

کچھ معلم جو حقیقت میں معلمی ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے یہ بھی سوال کرتے: "ان سب کاموں سے اور معلمی سے کیا سروکار؟" تو پھر جلیل القدر بہادر اپنا بے سر پیر کا لمبا لکچر چھوڑ دیتے اور سوال کرنے والے ہکا بکا رہ جاتے۔

بہرحال ان کے لکچروں سے لڑکے بہت مرعوب تھے اور ان کو بڑے قابل لوگوں میں گنتے تھے۔ ملک کی تمام اہم کمیٹیوں کے وہ ممبر ہو گئے تھے اور ہر جگہ اپنے حساب سب کو مرعوب ہی کر کے آتے تھے۔ اب انہوں نے ہر جگہ گھسنا چھوڑ دیا تھا اور اپنے کو لیے دیئے رہتے تھے بجائے بحث نکالنے اور کسی کی بات کی مخالفت کرنے کے سیدھے سیدھے لکچر دینے لگے تھے۔

ایک ادبی انجمن میں شرکت کا حال بڑا پر لطف ہے۔ ایک مقام پر مذاکرہ ہوا۔ موضوع تھا "جدید ادب زوال پذیر ہے"۔ ایک ہال میں ایک حلقے میں کرسیاں اور میزیں لگائی گئیں۔ جناب صدر کی کرسی اور میز حلقے سے الگ رکھی گئیں۔ ان کے بائیں جانب سے حلقہ شروع

ہو رہا تھا شعبہ کی کرسی پہ ہمارے نواب جلوہ افروز نظر آئے ۔ کارروائی شروع ہوئی ۔

آپ نے بحث کا افتتاح یوں کیا " حق تعالےٰ نے یہ کائنات اس طرح بنائی ۔ آسمان ہے زمین ہے ۔ ہوا ہے ۔ بادل ہے ۔ روشنی ہے ۔ تاریکی ہے ۔ یہ سب زوال پذیر ہیں ۔ آفتاب کی روشنی گھٹتی جا رہی ہے ۔ ابھی سائنس دانوں نے دریافت کیا کہ سورج کی گرمی بہت کم ہو گئی ۔ ایک دن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا نہ معلوم کتنے مہاشکھ اور کتنے کروڑ برس لگیں گے ۔ بہرحال ایک دن ٹھنڈا ہو ہی جائے گا ۔ ہر چیز فانی ہے ۔ قرآن حکیم فرماتا ہے ۔ کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام ۔ تو بھی اللہ ہی زندہ ہے اور سب مردے ہیں ۔ انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہتا ہے ۔ کیا معلوم ہے بھی ۔ یہ اس کا زعم ہے محض ۔ کچھ ہو عرض زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ۔ آج مرے کل دوسرا دن ۔ مجھے مرنے سے کوئی ڈر نہیں لگتا ۔ اگر کوئی اسی وقت گردن اڑا دے تو میں تیار ہو . . . . "

ایک صاحب بولے : " آپ موضوع زیر بحث کی گردن اڑا رہے ہیں ۔ آپ کی گردن اڑے یا نہ اڑے ۔ "

نواب بولے : " آپ کا کیا مطلب ۔ میں موضوع پر آ رہا ہوں ۔ میرا انداز بالکل نیا اور اچھوتا ہے ۔ "

" ایسے اچھوتا کہ موضوع کو چھوتا نہیں ۔ "

" جناب صدر نے بھی کہا : " موضوع ہے جدید ادب زوال پذیر ہے ۔ "

نواب بولے : " میں یہی ثابت کرنے جا رہا ہوں ۔ "

" مگر بڑے طویل راستے سے جا رہے ہیں " ۔ ان کے ایک ہم پیشہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا ۔

وہ بگڑ گئے اور غصے کے عالم میں بولے " مجھے معلوم نہ تھا کہ ایسے لوگوں سے سابقہ ہے ۔ بالکل جاہل مطلق ، حیوان مطلق ۔ "

" آپ تو حیوان ناطق ہیں " ایک اور آواز آئی ۔

" ناطق ہی ناطق ہیں " کسی اور نے آوازہ کسا ۔

" جاہل ناطق نہ کہو " پھر آواز آئی ۔

" خوب خوب خوب خوب کہی جاہل ناطق " ۔

اور اس پر سب لوگ ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ گئے ۔

نواب جلیل القدر بہادر بھناتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے ۔

جاہل ناطق ان کے لئے مخصوص ہو گیا ۔ لوگ کہتے ہیں " ان کی تقریریں سننے سے جان بچی " ۔ مگر وہ اپنے شاگردوں پر رعب قائم کئے ہوئے ہیں ۔ پورا تعلیمی ادارہ ان کی آواز سے گونجا کرتا ہے ۔

ان کا عوالے ہے کہ وہ ہر موضوع کو نہایت اچھوتے طریقہ پہ لیتے ہیں ۔

" ہاں ایسا اچھوتا طریقہ کہ کیا مجال کہ موضوع کو چھو بھی جائے " ۔ ان پر ہنسنے والے کہتے ہیں ۔

دل کے دروازے مضبوط نہیں

کشمیری لال ذاکر

آڑو کا یہ پیڑ چار برس میں کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ اس کا تنا بھی پہلے سے موٹا ہو گیا ہے۔ کئی نئی شاخیں بھی پھوٹ آئی ہیں۔ پھل تو اس میں بہت ہی کم لگتا ہے۔ جو لگتا ہے وہ بھی پکنے سے پہلے گر جاتا ہے۔ یا پرندے کچے پھل کو ہی ٹھونگیں مار مار کر خراب کر ڈالتے ہیں۔ لیکن ہر سال مارچ کے آغاز میں اس کی شاخیں پھولوں سے لد جاتی ہیں۔ سفید سفید پھول جن میں ہلکے گلابی ڈورے بڑے ہی خوبصورت لگتے ہیں۔ ہمارے لان کے ایک کونے میں اُگا یہ پیڑ میرے لئے ایک خاص جاذبیت رکھتا ہے۔ بہار کے دنوں میں تو یہ ایک دُلہن کی طرح سجا ہوتا ہے اور ذرا سا گدگدانے پر اس کے پھول لرزنے لگتے ہیں اور سفید سفید پنکھڑیاں ٹوٹ کر برف کے گالوں کی طرح دھرتی پر گرنے لگتی ہیں ---- لیکن یہ بہار کی بات ہے۔ اب تو دسمبر کے آخری دن ہیں اور اُس کے پتے پیلے ہو گئے ہیں اور ہر لمحہ شاخوں سے ٹوٹ کر نیچے گھاس پہ گرتے رہتے ہیں۔ آج کرسمس [illegible] ہے اور سورج ڈھل رہا ہے اور اس کی آخری کرنیں آڑو کے پیلے پتوں سے کھیل رہی ہیں۔ پتے اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ کرنوں کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ایک ایک کر کے نیچے گر رہے ہیں۔ میں آرام کرسی پر بیٹھی، پاؤں پیڑ کے تنے پر جمائے کچھ سوچ رہی ہوں۔ میری جھولی میں ادھ کھلی کتاب پڑی ہے اور میں شاخوں سے ٹوٹتے ہوئے ان پتوں کو دیکھ رہی ہوں۔ کچھ ایک میرے شانوں، بالوں اور ٹانگوں پہ بھی گر رہے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے دل کے دروازوں پہ کوئی دھیرے دھیرے دستک دے رہا ہے۔ اس امید پر کہ یہ دروازے کھل جائیں گے۔ شاید وہ نہیں جانتا کہ میں نے پچھلے چار برس میں ہر شام اپنے دل کے دروازوں میں ایک آہنی کیل گاڑی ہے اور رات کے سناٹے میں اس پر ہتھوڑے لگائے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی کیل ٹیڑھی بھی ہو گئی ہو - اور اب میرے ان دروازوں میں ہزاروں سے اوپر کیلیں گڑی ہیں۔ اب یہ دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے ہیں۔ کوئی لاکھ دستک دیتا رہے یہ کبھی نہیں کھل سکتے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی ٹیڑھی ہوئی کیل سے دستک دینے والے کے ہاتھ زخمی ہو جائیں اور خون بہہ نکلے۔ یہ خزاں رسیدہ پتے بند دروازوں سے ٹکرا کر میرا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ اور کوئی نہ بھی جانتا ہو لیکن یہ زرد پتے جو شاخوں سے ٹوٹ کر میرے ارد گرد گر رہے ہیں جانتے ہیں کہ میرے دل کے دروازے اب ٹوٹ تو سکتے ہیں لیکن کھل نہیں سکتے۔

آج کرسمس ایو ہے!

کمروں اور برآمدوں میں رنگ برنگے بیلون لٹک رہے ہیں۔ رنگ دار مہین کاغذ کے پھول در و دیوار فضا میں جھول رہے ہیں۔ ڈائننگ روم کے پردے بدلے گئے ہیں۔ صوفوں پر سفید دھلے ہوئے غلاف چڑھا دیئے گئے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں مینٹل اسٹینڈ پر بڑی بڑی شفاف موم بتیاں لگا دی گئی ہیں۔ کھانا کینڈل لائٹ میں ہوگا۔ خالی گلاس ترتیب میں رکھے چمک رہے ہیں اور وسکی کی بوتلوں

میں بند انگڑائیاں لے رہی ہے۔ دن ڈھلتے ہی ڈیڈی اور ممی کے دوست آ جائیں گے اور آدھی رات تک ہنگامہ رہے گا۔

لیکن میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں لان میں اسی پیڑ کے نیچے بیٹھی رہوں اور زرد پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر مجھ پر گرتے رہیں۔ میں رات کی اوس میں بھیگتی رہوں اور ماضی کے ہتھوڑے سے حسرتوں کے کیل اپنے دل کے دروازوں میں گاڑتی رہوں اور کراہتی رہوں اور پھر رات کے پچھلے پہر ایک صلیب تیار کروں اور اُسے اپنے کندھے پر اُٹھائے، گرتی پڑتی، کانٹوں بھرے راستے پر چل پڑوں اور اپنے جسم پر شکستوں کے کوڑے کھاتی اپنی صلیب کو سنبھالے ڈگ بھرتی رہوں اور پھر ایک اونچی جگہ پر خود ہی اس صلیب کو زمین میں گاڑ دوں اور اُس کے ساتھ ٹک جاؤں اور کوئی بہت بڑے بڑے کیل میری ہتھیلیوں، سر اور پاؤں میں ٹھونک کر مجھے اس صلیب پر لٹکا دے اور میرے جسم سے بہتا ہوا خون روشنی کا الاؤ بن کر دہک اُٹھے اور مشرق کی پہاڑیوں کے اوپر سے نمودار ہو جائے اور میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے روشنی کے احساس سے محروم ہو جائیں۔

لیکن میں جانتی ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔

میں نے ہر برس ایسا سوچا ہے۔

ہر برس اپنے لئے ایک صلیب تیار کی ہے اور اُسے اپنے کندھوں پر اُٹھایا ہے اور اُس سے لٹکی ہوں۔ لیکن روشنی کا احساس مٹ جانے کے بجائے اور بھی تیکھا ہو گیا ہے۔

اس برس بھی یہی ہوگا۔

آڑو کے اس پیڑ نے مجھے بھی دُلھن کے روپ میں دیکھا ہے۔ ٹھیک انہی دنوں جب اس پر ٹوٹ کر بہار آئی تھی اور وہ خود ایک دلھن بن کر سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ لان کے چاروں طرف بجلی کے بلب روشن تھے اور بجلی کی اس تیز روشنی میں یہ پیڑ کتنا خوب صورت لگ رہا تھا۔ بارات آنے میں ابھی دیر تھی۔ میں سجی سجائی کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ وہ شام ہی سے کہیں غائب تھا۔ بارات کے انتظام میں لگ رہا تھا۔ کئی دفعہ پوچھا لیکن اس کا کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ ایک بار آیا بھی تھا، میرا پیغام بھی اُسے مل گیا تھا اور دو منٹ میں آنے کا کہہ کر پھر جانے کہاں کھو گیا تھا اور اب تک نہیں آیا تھا۔ میں ایک کونے میں بیٹھی سہیلیوں اور رشتہ دار لڑکیوں سے گھری سوچ رہی تھی کہ وہ ایک دم اس قدر بے نیاز کیوں ہو گیا تھا۔ آخر اتنا بھی مصروف کیا۔ درجنوں کام کرنے والے تھے، اُس سے کہیں زیادہ ذمہ دار قسم کے لوگ۔ اُسے ہی ایسا کیا کام تھا کہ لمحہ بھر کو کمرے کے اندر جھانک بھی نہ سکتا تھا۔

اور اُسی لمحہ وہ داخل ہوا۔

"معاف کرنا نشی، مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔ کیا بات تھی؟" وہ گھٹنوں کے بل میرے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے بال کیسے روکھے تھے اور آنکھیں کتنی گہری تھیں۔

"میرا ایک کام کرو گے؟"

"کہو!"

"ذرا نزدیک ہو جاؤ۔"

اور اُس نے اپنا چہرہ میرے بالکل قریب کر دیا اور میرا سُرخ ریشمی دوپٹہ اُس کے گال سے مس ہونے لگا اور میرے ہونٹ اُس کے کان کی لوؤں کو چھونے لگے۔

"مجھے آڑو کے پیڑ تک لے چلو، پچھلے دروازے سے۔"

"پاگل ہو تم تو۔ چلو اٹھو۔"

وہ ہنسا اور پھر اُس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے اٹھایا اور میری کلائیوں میں پڑی سُرخ سُرخ چوڑیاں اور سفید سفید کوڑیوں کا سرخ دھاگے سے بندھا گجرا اور چاندی کی چھوٹی چھوٹی کٹوریاں چھنک اٹھیں اور میرے مہندی رچے پاؤں سے لپٹی پائلوں کا سنگیت گونج اٹھا۔ میں ان کھنکتی ہوئی پائلوں کی آواز ساتھ لئے، اُس کا بازو تھامے کوٹھی کے پچھلے دروازے سے نکل کر آڑو کے پیڑ کے پاس پہنچ گئی۔ اُس کے سفید سفید پھولوں نے جیسے ایک بار قہقہہ لگا کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ میرا ہاتھ ابھی تک اُس کے بازو پر ٹکا تھا۔ پیڑ کے نیچے پہنچ کر اُس نے تنے کو زور سے ہلایا اور سینکڑوں پھول مجھ پر برس گئے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل اُٹھی۔

"بس زندگی بھر ایسے ہی مسکراتے رہنا۔" اُس نے کہا

پھر میں نے اپنی مہندی رنگی انگلیوں سے پیڑ کے تنے کو سہلایا اور اُسے نمسکار کر کے واپس ہولی۔

"دیکھو میرے ساتھ رہنا، ایسا نہ ہو پھر کہیں غائب ہو جاؤ اور میں ڈھونڈتی پھروں۔"

"تم سچ مچ پاگل ہو۔" اُس نے جواب دیا۔

اور پھر باجے کا شور اٹھا اور بارات گیٹ پر آگئی۔ اُس نے مجھے چھوڑا نہیں تھا وہ میرے ساتھ تھا۔ جب جے مالا ڈالنے کو میرے ہاتھ اُٹھے وہ جب بھی میرے ساتھ تھا، جب شادی کی بے مطلب سی رسمیں ادا ہو رہی تھیں، وہ جب بھی ساتھ تھا اور جب کنیا دان کا سمے آیا وہ جب بھی میرے پیچھے بیٹھا تھا اور میں نے سُنا تھا براتیوں میں سے کسی نے کہا تھا۔

"لڑکیاں بھی شرم بالا رکھتی ہیں، یہ تو یہیں دیکھا ہے۔"

ایک زوردار قہقہہ گونجا تھا اور میں غصے سے جل ہی تو اٹھی تھی۔ ایک سنسنی سی میرے سارے جسم میں پھیل گئی تھی۔

"شادی کے لئے اتاولا ہوں، کوئی لڑکی نظر میں ہو تو میرا نام نوٹ کر لیجیے۔" یہ جواب اُس نے دیا تھا۔ دار زوردار تھا۔ اِدھر والی لڑکیاں زور سے ہنسی تھیں اور اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا تھا۔ مجھے کچھ سکون ہوا۔

اور پھر پھیروں کی رسم بھی پوری ہو گئی۔ پھول اور بتاشے ہون کنڈ میں ڈالے گئے اور آخری پھیرے کے بعد میری زندگی کا ایک نیا سفر شروع ہو گیا۔

جہیز کا سامان پیک ہو رہا تھا۔ میری سہیلیوں کے تحفے، ممی اور ڈیڈی کے دوستوں کے پریذنٹس ڈھیروں کی تعداد میں تھے۔

"تم مجھے یہ آئرن پریس ہی دے سکتے تھے، اور کچھ نہیں ملا میرے لئے۔" میں اُس سے جھگڑ رہی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔

"یہ انگلش پریس ہے، دیسی نہیں جو ہفتوں میں ہی ناکارہ ہو جائے۔ اس میں ٹمپریچر کنٹرول ہو سکتا ہے، آٹومیٹک ہے۔"

"جانتی ہوں میں نے پہلے بھی دیکھ رکھی ہے۔"

"نشی، پریس تمہیں اس لئے دے رہا ہوں کہ تمہیں کریز کا ہمیشہ خیال رہے۔ ٹوٹنے لگے تو اسے فوراً ہی ٹھیک کر لو۔ ایک بار کریز ٹوٹ جائے تو پھر پہلی سی نہیں رہتی۔ یہی حال زندگی کا ہے۔ اس کے وقار کو قائم رکھو، اس کی دیکھ بھال کرو۔ اسے سنبھالو۔ اسے کبھی نہ ٹوٹنے دو۔ وقار ٹوٹ جائے تو زندگی میں کچھ نہیں رہتا۔" اُس کی آواز میں خلوص کی گرمی تھی۔

پریس تو اور لوگوں نے بھی دیئے تھے لیکن اس جذبے سے نہیں۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کریز کبھی نہیں ٹوٹے گی۔ وعدہ کرتی ہوں۔"

اس نے میرا مہندی سے سرخ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُسے دوسرے ہاتھ سے سہلایا اور ایک بار اپنے سینے سے لگا کر کہا۔

"پھر کبھی ملاقات ہوئی تو پوچھوں گا۔"

"میرے آنے تک جانا مت، میں پرسوں واپس آ جاؤں گی۔"

"تم پرسوں نہیں آؤ گی، میں جانتا ہوں۔"

"دنیا کی کوئی بھی طاقت مجھے آنے سے نہیں روک سکے گی۔"

"تم خود ہی رُک جاؤ گی نشی۔" اور وہ مسکرا دیا تھا۔

اتنے میں میرے سسرال کے لوگ آ گئے اور میں اندر چلی گئی۔

اور اُس کے بعد میری ڈولی اُٹھی اور میں نے ہاتھ بھر لمبے گھونگھٹ سے دیکھا، وہ ایک طرف کھڑا رومال سے آنکھیں پونچھ رہا تھا۔

اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی ٹھیک کہتا تھا۔ میں ہی اپنے آپ کو ٹھیک سے نہیں سمجھ سکتی تھی۔ میرے اندازے سدا ہی غلط ہوتے تھے۔ میں اُس روز نہیں آ سکی جس روز آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں وعدہ کرتے وقت بھول گئی تھی کہ واپس آنا میری مرضی سے نہیں اُن لوگوں کی مرضی سے ہو گا جو مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے اور انہوں نے مجھے ایک ہفتہ تک واپس نہ آنے دیا۔

اسی بات پر میرا اور میرے خاوند کا جھگڑا ہو گیا۔

سات دن کے بعد تار سے اطلاع دے کر جب میں اور میرا خاوند واپس پہنچے تو ہم دونوں میں اختلاف کی شروعات ہو چکی تھیں۔ میرے واپس آنے تک وہ چلا گیا تھا اور کسی سے کچھ نہ کہہ گیا تھا۔ اُس نے کوئی شکایت نہ کی تھی، کوئی گلہ نہ کیا تھا۔

میں نے رتا سے پوچھا "کنول کب گیا تھا؟"

"جس روز اُسے جانا تھا، اُس سے دو روز بعد۔"

تجھے کوستا رہا ہو گا؟

"نہیں وہ تو بہت خوش تھا۔ جانے سے پہلے مجھے اور رُوپی کو کچھ دے گیا تھا۔ آئس کریم کھلائی تھی۔ رات دیر تک چٹکلے سُناتا

کر ہنسا تا رہا تھا۔ ڈیڈی ممی بھی بہت دیر تک ہنستے رہے تھے۔ دوسرے دن صبح ہم سب کی تصویریں اتاری گئیں اور پھر جاتی دفعہ گیٹ کو بڑی احتیاط سے بند کر کے گیا تھا۔ میں کھولنے لگی تو بولا: "اب گیٹ نہ کھولو، میں پھر اٹک جاؤں گا۔ اس گیٹ کو اب نشی ہی کھولے گی۔"

رما کی بات مجھ سے آگے نہیں سنی گئی۔ میں پچھلے دروازے سے نکل کر آڑو کے پیڑ کے نیچے آ گئی۔ شاخوں سے ٹوٹ کر گرے ہوئے پھولوں کی سیج بچھ رہی تھی۔ میں وہاں کھڑی دیر تک روتی رہی، بغیر جانے کہ میں کیوں رو رہی تھی۔ مجھے اس کے اس طرح چلے جانے پر ملال تھا یا اپنے ٹھیک سمے پر واپس نہ آ سکنے کا افسوس تھا۔ بات صاف نہیں تھی لیکن دل میں کہیں درد کی رمق ضرور تھی۔

چار ہفتے پہلے اسی پیڑ کے نیچے میں نے ممی سے کہا تھا۔

"دراصل میں شادی کرنا چاہتی ہی نہیں، مجھے شادی سے نفرت ہے۔"

"لیکن اب تم چھوٹی نہیں ہو، پچیس برس کی ہو چکی ہو۔ اچھی خاصی سروس ہے، اب تمہیں اور دیر نہیں کرنی چاہئیے۔"

"میں تم لوگوں پر بوجھ نہیں ہوں، خود کماتی ہوں۔"

"پچھلے تین برسوں سے ہم تمہاری ضد مانتے آ رہے ہیں۔ کئی لڑکے دیکھے، تم نے نامنظور کر دیئے۔ ہم نے آگے بات نہیں چلائی۔ تمہارا بیاہ ہو جائے تو پھر رما کی بات سوچیں۔ وہ بھی بڑی ہو گئی ہے۔"

"تو پہلے رما کا بیاہ کر ڈالو۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہارے ڈیڈی نے بہت پوچھ تاچھ کے بعد ایک لڑکا پسند کیا ہے۔ تم چاہو تو اسے خود بھی دیکھ لو۔"

"پہلے کیا کم دیکھ چکی ہوں۔ مجھے نہیں دیکھنا لڑکا وڑکا۔ میری چھٹی کل ختم ہو رہی ہے، میں واپس جا رہی ہوں۔"

"نہیں، واپس نہیں جانا ہے تمہیں۔ تمہارے ڈیڈی نے کنول کو بھی تار دے رکھا ہے، وہ بھی آ رہا ہے آج۔"

"وہ کیا کرے گا آ کر، اسے اپنے معاملوں میں کیوں گھسیٹتے رہتے ہو۔ شادی مجھے کرنی ہے یا کنول کو؟" میں غصہ میں آ گئی تھی۔

"اس شام کنول آ گیا تھا۔

ہم سے سرسری سی دعا سلام کے بعد وہ اور ڈیڈی اور ممی آپس میں باتیں کرتے رہے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ قہقہے لگاتا ہوا ہمارے ٹولے میں شامل ہو گیا تھا اور میں اور رما اور روپی سب کچھ بھول گئے۔ میں نے تار سے تین روز کی چھٹی بڑھوالی۔ رما نے اپنے کالج ایپلیکیشن بھیج دی اور روپی کی ہیڈ مسٹرس کو ٹیلی فون سے اس کی بیماری کی اطلاع کر دی۔ آدھی رات تک رمی چلتی رہی۔ کنول نے دس روپے ہارے، روپی نے دو روپے جیتے اور باقی میرے حصے میں آئے۔ اگلے روز پکچر کا پروگرام طے ہوا۔

اگلی صبح لان میں گھومتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

میرا دل دھڑک اٹھا۔ جانے کیا کہنا چاہتا تھا وہ۔ کوئی غلط بات نہ کہہ دے کہیں۔

"سوچ کر کہنا۔"

میری بات سن کر وہ مسکرا دیا۔

"زیادہ سوچنے والے آدمی کبھی اپنی بات صاف طور سے نہیں کہہ سکتے۔"

میرا دل اور تیزی سے دھڑک اٹھا۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ قدم مضبوطی سے زمین پر جما دیئے، جیسے مجھ پر کوئی وار ہونے والا ہو۔

"تم کسی میں انٹرسٹیڈ ہو؟"

میں نے اس مختصر سوال پر اُس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا۔

"نہیں۔"

"اگر تمہاری نگاہ میں کوئی خاص شخص ہے تو مجھے بتاؤ، میں تمہارے ڈیڈی سے بات کروں گا۔ جو کچھ تم چاہو گی وہی ہوگا یقین رکھو۔"

"میں کچھ نہیں چاہتی۔"

"جانتی ہو تمہارے گھر والے تمہارے لئے ایک لڑکا دیکھ چکے ہیں، اور وہ فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"مجھے شادی نہیں کرنی۔"

"کیوں؟" جس غیر جذباتی انداز میں اُس نے یہ سوال کیا اُسے محسوس کر کے مجھے صدمہ ہوا۔

"بس نہیں۔"

اُس نے ڈریسنگ گاؤن کی جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا، ایک سگرٹ سلگایا اور اُس کا دھواں اُڑاتے ہوئے کہا۔

"ان بے کار کے کمپلیکسز سے کیوں سفر کرتی ہو۔ یا تو بتاؤ کہ تم کہاں شادی کرنا چاہتی ہو یا پھر جہاں ہم کہیں وہاں کرو۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لان میں ٹہلتے ٹہلتے اُس سے آگے نکل گئی۔ ہم دونوں میں فاصلہ بڑھ گیا اور چند لمحوں کے بعد میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کنول دوپہر کو چلا گیا۔

کچھ سامان اُس کا یہیں پڑا تھا، اندازہ تھا کہ وہ واپس آئے گا۔

اس شام میں نے اپنے دل کے دروازے بار بار کھولے۔ اندر جھانکا لیکن لگتا تھا جیسے میرا دل اب ایک ایسا کمرہ بن گیا تھا جس میں رکھی چیزیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ کہیں کوئی ترتیب نہیں تھی۔ میز پر کتابیں کھلی پڑی تھیں۔ ریک پر خط بکھرے پڑے تھے۔ پلنگ پر ساڑھیاں روندی جا رہی تھیں۔ ایسے میں اگر کھڑکی کھل گئی اور ہوا کا تیز جھونکا آ گیا تو ایک بھی چیز نہیں بچے گی۔ سب کچھ اُڑ جائے گا۔ سب کچھ، ابھی کچھ مہینے پہلے یہی حالت کنول کے کمرے کی دیکھ کر آئی تھی۔

میں، ممی اور رما اُسے ملنے گئی تھیں۔ میرا ایم۔ اے کے امتحان کا سنٹر پنجاب میں بنا تھا۔ میں امتحان دینے گئی تھی اور ممی اور رما میرا ساتھ دینے۔ اُس کے پاس تین کمروں کا ایک فلیٹ تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں سمیٹ کر باقی دونوں کمرے ہمارے حوالے کر دیئے۔

"اچھا خاصا کباڑ خانہ ہے تمہارا گھر۔" میں نے اُسے چھیڑا تھا۔

"اس طرح چیزوں کو سیکنڈ ہینڈ بیچنے میں آسانی رہتی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا۔

میں پڑھتی خاک تھی۔ وہ ممی اور رما کو گھمانے لے جاتا کہ میں پڑھ سکوں اور میں اس بات پہ کڑھتی رہتی کہ وہ مجھے کیوں نہیں ساتھ لے جاتا تھا۔ میں اپنے دونوں کمرے چھوڑ کر اُس کے کمرے میں آجاتی اور اُس کے بستر پہ لیٹی کتابوں کے صفحے اُلٹتی رہتی۔ جانے وہ کیا استعمال کرتا تھا کہ اُس کے کمرے میں ہمیشہ ہلکی ہلکی خوشبو بسی رہتی تھی۔ اس کے بال خشک ہوتے تھے لیکن اُن میں سے پیاری سی سوگندھ نکلتی رہتی تھی۔ وہ چہرے پر کریم بھی نہیں لگاتا تھا لیکن دیکھنے میں بڑا ملائم لگتا تھا۔

وہ صبح نہا کر نکلتا تو میں ایک دم باتھ روم میں گھس جاتی۔ دیواروں پر صابن کے جھاگ اُڑتے ہوتے، گیلا ٹوتھ برش اور پنا کا کی ٹیوب کھلی ہوتی جس میں سے گلابی رنگ کی ڈیٹلی کریم دھیرے دھیرے نکل رہی ہوتی۔ سوپ کیس پانی سے بھرا ہوتا اور صابن کی ٹکیا اُس میں ڈوب رہی ہوتی اور وہ تولیہ لپیٹے، ربڑ کی چپل پہنے باتھ رُوم سے نکل کر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے گیلے پاؤں کے نشان فرش پر چھوڑتا جاتا تھا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ پاؤں کے نشان میرے دل کے آنگن میں ابھر رہے ہیں اور اُس نے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا ہے۔ میں سوپ کیس صاف کرتی، ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب پر ڈھکن گھماتی اور باتھ روم میں پھیلی خوشبو کی لپٹوں کو اپنی سانسوں میں سموتی رہتی۔ پھر باتھ رُوم کا دروازہ دھیرے سے بند کر دیتی کہ لوبان کی یہ خوشبوئیں کہیں باہر نہ نکل جائیں اور اس کے کمرے پر دستک دیتی۔

"مے آئی کم ان؟"

"پلیز نسٹی۔"

اور وہ اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا ہوتا یا قمیص پہن رہا ہوتا یا ٹائی کی ناٹ دُرست کر رہا ہوتا۔

"تمھارا تولیہ لے جاؤں؟"

"ٹھہرو، میں صاف تولیہ نکال دیتا ہوں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔" اور میں اُس کا گیلا تولیہ اُٹھا کر باتھ روم میں بھاگ آتی اور اس کے صابن کے جھاگ میں اور جھاگ گھلا دیتی۔ جلتے ہوئے لوبان میں کچھ اور لوبان ڈال دیتی اور پھر اپنے جسم کے ایک ایک انگ کو اُس کے گیلے تولیئے سے رگڑتی رہتی جب تک کہ رما باہر سے چیختی نہیں۔

"باتھ روم میں کیا کرتی رہتی ہو اتنی دیر؟"

میں چونک پڑتی، کپڑے پہن کر جلدی سے باہر نکلتی اور لگتا کہ خوشبوؤں کا ایک قافلہ میرے پیچھے چلا آ رہا ہے اور میرے پاؤں کے گیلے نشان باتھ روم سے میرے کمرے تک پھیلے ہوئے میرا تعاقب کرتے رہتے اور رما کنول سے کہتی۔

"تمہارا باتھ روم تو عطر گھر ہے۔ اتنی خوشبو، اتنی خوشبو کہ آدمی بے ہوش ہو جائے۔"

اور وہ ہنس دیتا اور کہتا۔

"میرے علاوہ یہاں کوئی بے ہوش نہیں ہو سکتا۔"

وہ تو بے ہوش نہیں ہوا لیکن میری چیتنا پہ جانے کون کون سی خوشبوئیں منڈلاتی رہیں اور جب میں اِمتحان دے کر واپس آنے لگی تو اُس نے ہم سب کو ایک بہت بڑھیا پارٹی دی اور ٹرین میں ہماری سیٹیں ریزرو کرائیں اور پھر ہمیں اسٹیشن تک چھوڑنے آیا۔

"تم کب اِدھر سے ہو کر ہمیں ملنے ؟" رتنا نے پوچھا تھا۔

"اتنے دِن ملتے ہی تو رہے ہیں۔" اُس نے کہا تھا۔

"اپنے ساتھ وہ لمحے ضرور لے آنا جن کی خوشبو سے تمہارا گھر مہکتا رہتا ہے۔" میں نے کہا تھا۔

"وہ تو اب جا رہے ہیں۔" وہ مسکرایا تھا "گھر تو اُس میں رہنے والوں کی سانسوں، اُن کی باتوں، اُن کے قہقہوں سے مہکتا ہے۔ کبھی عطر کی خوشبوؤں سے بھی مہکا ہے۔"

وہ مسکرایا ضرور تھا لیکن اُس مسکراہٹ میں ایک ہلکے سے درد کی پرچھائیں بھی تھی جسے میں نے محسوس کیا تھا اور چاہا تھا کہ وہ ہمیں ایک آدھ روز کے لئے اور روک لے۔ لیکن اُس نے رُکنے کی کوئی بات نہیں کی بلکہ جب گارڈ نے سبز جھنڈی ہلائی تو میری پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کر مجھے کمپارٹمنٹ کے اندر دھکیل دیا۔ ٹرین چلی تو میں اور رتنا دونوں سر کھڑکی سے باہر نکالے رُومال ہلاتی رہیں لیکن اُس نے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا پلیٹ فارم کا مختصر فاصلہ تیزی سے طے کرتا جاتا تھا۔ میرے ذہن میں خوشبوؤں میں لپٹی درد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔

اُس سے اگلے روز وہ واپس آ گیا۔

آتے ہی میری طلبی ہوئی۔

"میں نے لڑکا دیکھ لیا ہے۔ بنارس یونیورسٹی سے اُس نے انجینئرنگ کی ہے۔ اس سے پہلے وہ گوروکل میں پڑھتا رہا ہے صحت بہت اچھی ہے۔ بھلا لڑکا ہے۔" اُس نے کہا تھا۔ میں نظریں جھکائے سنتی رہی تھی۔ لیکن ایک دم بے نیاز سی۔

"سُن رہی ہو؟" اُس نے میری بے توجہی پہ کھیجتے ہوئے پوچھا۔

میں نے ایک بار آنکھ اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور پھر نظر نیچی کر لی۔

"میں تمہاری طرف سے ممی ڈیڈی کو ہاں کہہ دوں؟" اُس نے پوچھا۔

میں پھر خاموش رہی۔ جیسے میری خاموشی سے ہی مشکل حل ہو جائے گی۔ ہونٹوں پر جیسے کسی نے گرم لاکھ کی مہریں لگا دی تھیں۔ ایک بار یہ بھی تو نہ کہہ سکی کہ مجھے شادی نہیں کرنی ہے۔ وہ سب لوگ بے کار میں پریشان ہو رہے تھے۔

کاش میں بھی کچھ کہہ سکوں! کاش میری سوچ کے تانے بانے ایک بے جان تصویر بن کر ہی نہ رہ جائیں۔ اُس کے ہونٹوں سے کوئی آواز بھی نکلے۔ میری آواز گُنگ تھی۔

میری چھٹی یہیں سے بڑھوائی گئی۔ اُس نے بھی چھٹی لے لی۔ ڈیڈی ممی نے بیاہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ شادی کے کارڈ چھپ گئے، بھیج بھی دیئے گئے۔ سبھی مہمان پہنچ گئے۔ ڈھولک پہ گیت بھی گائے گئے۔ رتنا کی سہیلی منورما کی آواز تو کوندے کی طرح لپکتی تھی

دیوا بال کے بنیرے اُتّے رکھنی آں
گلی بھل نہ جائے ماہی میرا

لیکن میں ایکدم خاموش تھی۔ میں نے جیسے اپنے آپ کو تحت الشعور کی گہرائیوں میں ڈبو دیا تھا اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی
.. کانوں میں روئی کے گالے ٹھونس دیئے تھے۔ اب چاہے آندھی اٹھے، اولے گریں، بجلی کڑکے، مجھے کسی سے سروکار نہ تھا۔ منڈیروں
.نوئی لاکھ چراغ جلائے میری گلی میں تو سدا اندھیرا ہی رہے گا۔

کھلی چھت پہ کھڑے، چاندنی رات کی وسعتوں کو گھورتے ہوئے اس نے ایک بار پوچھا۔

"یوں سہمی کیوں لگتی ہو تم؟"

"پیلنے کو وسعتیں جو بہت چھوڑی ہیں تم نے۔"

"سبھی لڑکیاں شادی کرتی ہیں تم کوئی غیر معمولی کام تو نہیں کر رہیں۔"

"یہی افسوس ہے کہ میں کوئی بھی ایسا کام نہیں کر سکتی جو غیر معمولی ہو۔ شادی سے کچھ گھنٹے پہلے میں کہیں بھاگ جاؤں، ایسا کرنا چاہتی
ہوں۔ یہ ایک غیر معمولی قدم ہو گا۔ لیکن یہ قدم نہیں اٹھا سکوں گی۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میرے میں کچھ کر سکنے کی صلاحیت ہی نہیں۔" میں رو پڑی
تھی اور اس نے میری سسکیوں کو دباتے ہوئے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا اور سمجھا رہا تھا۔

"وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ تم شادی کے بعد ضرور خوش رہو گی۔"

کاش وہ اس کے علاوہ کچھ اور کہتا۔ کچھ اور جس سے میرے دکھے ہوئے من کو شانتی ملتی۔ لیکن اس نے کچھ نہیں کہا اور میں سلگتی رہی
اور اس کے بالوں سے اٹھتی ہوئی پیاری سی خوشبو میرے ذہن میں منڈلاتی رہی۔

اور پھر بیاہ کی تاریخ آگئی!

سائبان اور قناتیں لگ رہی تھیں۔ پنڈال سج رہا تھا۔ گیٹ بن رہے تھے۔ کاغذی جھنڈیاں باندھی جا رہی تھیں۔ بجلی کے بلبوں سے
..ستوں کی شاخیں گوندھی جا رہی تھیں۔ گھر بھر میں ایک ہل چل مچ رہی تھی۔

اور پھر بارات آ بھی گئی۔

وہ بارات کے آنے سے لے کر مجھے ڈولی میں بٹھانے تک میرے ساتھ رہا۔ مجھے سہارا دیتا رہا، سمجھاتا رہا، دعائیں دیتا رہا اور
..ب میں ڈولی میں بیٹھ گئی تو ایک طرف کھڑا رومال سے اپنی گیلی آنکھیں پونچھتا رہا۔

میں سسرال پہنچ گئی لیکن میرا دھیان اسی کی طرف رہا۔ ایک ہی دن کی تو بات تھی۔ پھر اس سے جا ملوں گی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔
میرے سسر بہت اچھے تھے۔ کٹر آریہ سماجی، ایک سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ میری ساس بڑی نیک عورت تھی۔ بے چاری نے سرخ
..وڑھنے میری ہزار بلائیں لیں۔ میری نند ششما، روپی کی ہم عمر، تو مجھے دیکھ کر پاگل ہی ہو گئی۔

"کتنی پیاری ہے میری بھابھی دیکھو۔" وہ اپنی سہیلیوں کو میرا گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر دکھا رہی تھی اور مجھے اس پہ پیار آ رہا تھا۔
..نے شاید زندگی میں بہت ہی کم خوشی کے موقعے دیکھے تھے۔ اسی لئے خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی۔ کمروں میں مہارشی دیانند کی تصویریں

تھیں۔ الماریوں میں دھرم گنتھیں سجی تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر شدھ کھدر کے پردے تھے۔ میرے سسر تخت پوش پر سوتے تھے۔ میرا خاوند بھی کئی برسوں کے بعد اب پلنگ پر سونا شروع کرے گا۔ یہ سب باتیں مجھے سشما نے بتائی تھیں۔

"تمہارے بھیا سگریٹ پیتے ہیں؟"

"رام رام، انھیں تو سگریٹ کے نام سے بھی بیر ہے۔"

"چائے کتنی بار پیتے ہیں؟"

"ایک بار بھی نہیں۔"

"بیڑی بھی نہیں؟"

"ہمارے ہاں اس کا رواج نہیں۔ میں بھی چھپ کر چائے پیتی ہوں۔"

"مجھے پلایا کرو گی؟"

"ہاں چوری سے۔" سشما نے کہا تھا۔ وہ میرے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھی۔

"تمہارے بھیا ناول تو پڑھتے ہوں گے؟"

"نہیں۔ وہ تو بس ستیارتھ پرکاش ہی پڑھتے ہیں۔"

"کون سا تیل لگاتے ہیں بالوں میں؟"

"کچی گھانی کا خالص سرسوں کا تیل۔"

"صابن کون سا استعمال کرتے ہیں؟"

"وہ صابن استعمال کرتے ہی نہیں۔ شسر بھی بغیر صابن کے ہی نہاتے ہیں۔"

"سوتے کتنے بجے ہو تم لوگ؟"

"ہم سب نو بجے سے پہلے سو جاتے ہیں۔"

"اور جاگتے کس وقت ہو؟"

"صبح چار بجے کے بعد کوئی نہیں سوتا۔"

میں یہ سوچ رہی تھی کہ ابھی کچھ اور پوچھنا باقی تھا یا سب کچھ پوچھ لیا تھا کہ میری ساس نے اسے پکارا اور وہ بھابھی ابھی آئی کہہ کر چلی گئی اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا اور طشتری میں رکھی مٹھائی تھی۔

"میں تو دودھ نہیں پیتی سشما، نہ مٹھائی ہی کھاتی ہوں۔"

"بھیا نے بھیجا ہے دودھ۔ واپس لے جاؤں گی تو ناراض ہوں گے۔"

"تو تم پی لو۔"

"اچھا میں انتظام کرتی ہوں۔"

وہ کچھ لگا چکا تھا - شاید اُس نے باہر اُٹھ کر پی لیا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دیوار کے ساتھ پیٹھ ٹیک دی ۔ مگر جلد ہی کھینچ کر اور ملا کر لیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے اور اپنے کھدر کے سفید دھلے ہوئے رومال میں آنسو جذب کرتا جا رہا ہے ۔ مجھے اس پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر مجھے ایسے ماحول میں پھینکا تھا جس میں میں کبھی مطمئن نہ ہو سکتی تھی۔ بدتار ہے عمر بھر۔ میرے ساتھ اُس نے کونسی بھلائی کی تھی، اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں پھپھک کر رو پڑی ۔

رات میں نے اپنے خاوند بہونش پانڈے کو دیکھا ۔ وہ بھرے جسم کا سانولے رنگ کا نوجوان، گٹھا ہوا جسم، سر کے چھوٹے چھوٹے بال ہمیشہ صاف کرنے والے برش کے بالوں کی طرح کھڑے رہتے۔ خالص کھدر کی پوشاک پہنے گزرے دنوں کا ودیارتھی لگ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا وہ ابھی گائتری منتر کا اُچارن کرنے لگے گا اور ہری اوم تت ست سے کمرے کی دیواریں گونجنے لگیں گی۔

اور پھر صبح تک میری ناک میں خالص سرسوں کے تیل کی بُو اور بغیر صابن کے استعمال کے جسم سے نکلے ہوئے پسینے کی باس گھستی رہی اور ایک بار جب اُس نے میرے کمزور بدن کو اپنے چوڑے چکلے سینے سے لگا کر بھینچا اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھے تو تیز سی بُو کا ایک بھبکا میرے نتھنوں میں گھسا اور مجھے اُبکائی آنے لگی ۔ وہ گھبرا گیا۔

”طبیعت خراب ہے کچھ؟“ اُس نے پوچھا ۔

میں خاموش رہی اور اپنے کپڑے درست کرتی ہوئی کروٹ بدل کر پلنگ کی پٹی کے ساتھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں خراٹوں کی اُونچی اونچی آوازوں سے کمرہ گونجنے لگا اور اُس گونج میں میری ہلکی ہلکی سسکیاں ڈوبتی گئیں ۔

شاستر مریادا کے انوسار میں سات دن اس قلعے میں قید رہی اور جب واپس اپنے گھر پہنچی تو کنول جا چکا تھا۔

میں ستا کی بات سُن کر باہر لان میں آ گئی، آڑو کے درخت کے نیچے اور روتی رہی جی کھول کر ۔ لگتا تھا مجھے زندگی میں جو کچھ کرنا تھا کر چکی تھی۔ اب تو صرف پرائسچت کرنا باقی تھا، اس کے لئے تو ساری عمر پڑی تھی۔ پرائسچت کے لئے بھی شاستر مریادا کی ضرورت ہوتی کیا؟ پچھتاوا تو ایک نجی معاملہ ہے ۔ کوئی کیسی طرح بھی پچھتا لے ، اپنے آپ کو کیسی طرح بھی کچلے ، اس سے کسی کو کیا۔ اپنے لئے ہر ایک کو صلیب خود ہی بنانی پڑتی ہے اور خود ہی کرُدسی فائی ہونا پڑتا ہے ۔ اس کے لئے کوئی قانون نہیں۔ کوئی نپا تُلا طریقہ نہیں بس صلیب اپنے کندھے پر اُٹھاؤ اور جب چلتے چلتے تھک جاؤ تو اُس کے ساتھ لٹک جاؤ۔

ستا آئی تھی ۔

”پتا جی چائے پر انتظار کر رہے ہیں“

”مجھے وہاں چائے نہیں پینی ، تم یہیں لے آؤ“

پھر ممی آئی تھی ۔

”بیٹی وہاں تمہارا انتظار ہو رہا ہے“

”میں وہاں نہیں جاؤں گی ، مجھے دِق مت کرو“۔

ممی چلی گئی، وہ میری عادات کو جانتی تھی۔

پھر ستا پاتھ سے کر باہر آنگن کے پیڑ کے نیچے آ گئی۔ ہم دونوں گھاس پر بیٹھ کر چائے پیتی رہیں۔ آج سات روز کے بعد چائے پینے کو ملی تھی۔ سسرال میں تو ایک مہا پرویش تھی۔ سشما ہر روز چوری چھپے ایک پیالی لے آتی تھی ورنہ مہاشہ ہر ونش پانڈے تو چائے پینے والوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔

رات کو میں ستا کے کمرے میں سوئی اور ہر ونش پانڈے الگ کمرے میں پڑے جاگتے رہے اور پھر خراٹوں سے چھت کے پنکھے میں گھونسلے میں دبکی ننھی سی چڑیا کو ڈراتے رہے۔

پھر صبح ہوئی۔

شام بھی ہو گئی۔ پکچر کا پروگرام بنا۔ میں جانے کو تیار نہ ہوئی، پروگرام کینسل ہو گیا۔

ایک صبح اور ہوئی۔

ہر ونش پانڈے نے واپس جانے کی تیاری کرنا چاہی۔ مجھے بلایا گیا۔ ان تین دنوں میں میرا اُس سے سامنا ہی نہیں ہوا تھا۔

"چلنے کا کیا پروگرام ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"میں ابھی نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔"

"بیاہ کے بعد ذاتی مسئلے ختم ہو جاتے ہیں۔ اب تم نشا مارکنڈے نہیں، نشا پانڈے ہو۔"

"میں نہ مارکنڈے ہوں نہ پانڈے۔ صرف نشا ہوں، اور اب دونوں قسم کے بندھنوں سے آزاد ہوں۔"

"تو میں تمہارے پیرینٹس سے بات کرتا ہوں۔"

"کر لیجئے۔"

اُس نے ڈیڈی ممی سے بات کی۔ انہوں نے مجھے سمجھایا۔ لیکن جب بھی جانے کی بات اُٹھتی۔ خالص سرسوں کے تیل کی بُو اور گندے پسینے کی باس سے میرا دماغ پھٹنے لگتا۔ میں نے سسرال جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ہاں صرف سشما کا خیال آتا رہا۔ جو بہت ہی پیاری اور اچھی لڑکی تھی لیکن غلط ماحول میں گھٹ گھٹ کر جان دے رہی تھی۔ کاش میں اُس کے لئے کچھ کر سکتی! چاہتی تھی اُسے ایک خط لکھوں اور اُس سے نہ آنے کی معافی مانگ لوں۔ اُس سے کہوں کہ وہ کچھ روز کے لئے میرے پاس آ جائے۔ لیکن وہ خط بھی کہاں لکھ سکتی تھی۔

آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میں ایک بار واپس آ کر پھر کبھی اپنی سسرال نہیں گئی۔ میرے ڈیڈی اور میرے سسر پانڈے جی میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ ایک بار وہ خود بھی آئے۔ مجھے بڑے پیار سے سمجھایا۔ یہ بھی بتایا کہ سشما میرے بغیر رو رو کر بلکان ہو رہی تھی۔ مجھے

روپیہ افسوس ہوا لیکن میں اپنا فیصلہ نہ بدل سکی۔ میرا خاوند پروفیشن پانڈے بھی ایک بار مجھے لینے آیا لیکن میں وہاں نہیں تھی۔ ملازمت کے لیے کسی اور جگہ تھی۔ وہ میرے ڈیڈی کے منع کرنے پر بھی وہیں آ پہنچا۔ میں تب بھول ہی گئی تھی کہ میں شادی شدہ لڑکی تھی۔ میں نے میں سیندور بھرنا اور بندیا لگانا چھوڑ دیا تھا۔ پہلے جیسے سادہ کپڑے پہننے شروع کر دیئے تھے۔ ایک بھی زیور میرے جسم پر نہیں تھا۔ وہ اس حالت میں دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ میں نے اپنے آفس ہی میں اسے چائے کی پیالی پلائی، اسے اپنے گھر بھی نہیں لے گئی اور وہیں رخصت کر دیا۔ جانے سے پہلے اس نے کہا۔

"تمہاری یہ ضد ٹھیک نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"دونوں گھروں کی عزت کا سوال ہے۔ لوگ ہم سے بھی طرح طرح کے سوال کرتے ہیں، کیا جواب دیں؟"

"آپ جو جی میں آئے کہیں۔ میرے کیریکٹر پر تہمت لگا دیں اگر اس سے اطمینان ہو سکتا ہو۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ بولا۔

"تو جو ہو سکتا ہے کیجیے۔ میں وہاں نہیں جا سکتی۔"

"اب تو جہاں میری پوسٹنگ ہوتی ہے، وہاں جانا ہے۔"

"میں آپ کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔"

"اس کا انجام کیا ہوگا، جانتی ہو؟"

"آہستہ آہستہ جان جاؤں گی۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ آخری بس ہے، مس ہو گئی تو آپ کو تکلیف ہوگی۔"

اور اس نے جن نظروں سے مجھے دیکھا ان میں گورو کل کے سارے ضبط اور تپسیا کی آگ تھی۔ مجھے لگا میں بھسم ہو جاؤں گی۔ اس کے بعد کوئی بات نہیں ہوئی۔

وہ واپس چلا گیا۔

اور پھر اس نے سیپریشن کے لئے درخواست دے دی۔ میں نے کوئی عذر نہ کیا اور آخر دو برس کی یہ بنا ڈشا مارک ڈالے بندھن ختم ہو گئی۔

پچھلے برس رما نے ایم۔ اے کر لیا اور اپنی مرضی سے شادی کر لی۔ گھر میں کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ رما اور اس کا خاوند ایک ہی میں پڑھاتے ہیں اور خوش ہیں۔

شوبھا نے اب بی۔ اے میں داخلہ لیا ہے۔

میں اب ملازمت چھوڑ کر گھر آ گئی ہوں۔ یوں تو سب ٹھیک ہے لیکن ڈیڈی کو چنتا ہے کہ میرا کیا ہوگا۔ میرا کوئی بھائی نہیں جو دیکھ بھال کر سکے گا۔ ڈیڈی ہارٹ کے مریض ہیں۔ ممی ویسے ہی بیمار رہتی ہے۔ اس چنتا کو مٹانے کے لئے وہ گھر میں دوستوں کو جمع رکھتے ہیں۔ پارٹیاں ہوتی ہیں، ہنگامے رہتے ہیں اور مجھے اس تمام شور و غل سے کوفت ہوتی ہے۔ لیکن کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میری کون سنتا!

مجھے اپنی بات منوانے کا کوئی حق بھی نہیں۔ میں نے ہی کب اُن کی کوئی بات مانی ہے۔

پچھلے کچھ دنوں سے مسٹر بھاردواج کا آنا جانا بڑھ گیا ہے۔ مسٹر بھاردواج یہاں کا ایک کماتا پیتا رئیس ہے۔ کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اُس کی ایک چھوٹی سی بچی ہے، بہت ہی پیاری۔ ممی ایک بار اسے ساتھ لے آئی تھی۔ اب بھی آٹھویں دسویں روز وہ آ جاتی ہے، بلکہ دیر ہو جائے تو ہمارے ہاں ہی رُک جاتی ہے اور رات کو میرے ہی ساتھ سو بھی جاتی ہے۔ مجھے اُس کی قسمت پر بڑا ترس آتا ہے۔ بے چاری اتنی چھوٹی عمر میں ماں کے پیار سے محروم ہو گئی ہے۔ مسٹر بھاردواج کسی نہ کسی بہانے کچھ دے آتا ہے۔ ممی انکار کرتے ہوئے بھی لوٹا نہیں سکتی۔

ممی ایک روز کہہ رہی تھی۔

"یہ بھاردواج بے چارہ کتنا اچھا آدمی ہے، لیکن کتنا دُکھی ہے۔"

"ہاں، دُکھ اچھے آدمیوں کا زیور ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہاری بڑی تعریف کرتا ہے۔"

"اس کی مہربانی ہے، ورنہ آج کل کے زمانے میں کون کسی کی تعریف کرتا ہے۔"

"وہ پہلا آدمی ہے جس نے کھُل کر حمایت کی ہے تمہارے فیصلے کی۔ اُس کا کہنا ہے کہ اِن حالات میں سیپریشن ہو ہی جانی چاہیئے تھی۔"

"کن حالات میں؟"

"تمہارے والے ہی۔"

"کیا حالات ہیں میرے، وہ کیسے جانتا ہے؟"

"ایک بار ویسے ہی ذکر آ گیا تھا۔" ممی بولیں۔

"ہر کسی سے یہ قصہ چھیڑ کر تم میرے لئے ہمدردیاں اکٹھی کرتی پھرتی ہو۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے بیٹی۔"

"تم لوگ اگر مجھ سے تنگ آ گئے ہو تو میں دوبارہ سروس کر سکتی ہوں۔" میں نے غصہ سے کہا۔

"بھاردواج نے باتوں ہی باتوں میں جتایا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔"

"لیکن میں اُسے پسند نہیں کرتی۔ اُسے کہہ دو وہ ہمارے گھر نہ آیا کرے اور نہ ہی اپنی لڑکی کو بھیجا کرے، یہ کوئی یتیم خانہ نہیں ہے۔" میں کڑک اٹھی۔

اور پھر ایک دن رِتا کا خط آیا۔ اُس نے لکھا تھا کہ مسٹر بھاردواج کے ساتھ میری شادی کی بات پکی ہونے والی تھی۔ اور اسی دن بھاردواج بھی آیا۔ ممی ڈیڈی گھر پہ نہیں تھے۔ میں لان میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔

"آیئے انکل۔" اُس نے کہا۔

"تمہارے ڈیڈی کہاں ہیں؟"

"دیدی کھانا بنا رہی ہیں کیونکہ ممی ڈیڈی باہر گئے ہیں۔"

"تم جاؤ اور اپنی پڑھائی کرو۔"

"یہ تو تم سے ملنے آئے ہیں۔" روپی نے لان ہی سے چلانا شروع کیا۔

میں کتاب رکھ کر باہر آئی تو منوج بھاردواج کھڑا تھا۔

"نمستے۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"نمستے۔" میں نے جواب دیا۔ "گھر پر تو کوئی بھی نہیں۔"

"مجھے پتہ ہے وہ گھر ہی پر ہیں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میرے ماتھے پر شکنیں تن گئی تھیں۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"کہیے۔"

"ہم کہیں بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے۔؟"

"آپ یہیں بات کر لیجئے۔" میں نے کہا۔

منوج بھاردواج نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دیا اور منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں لفافہ لے کر اندر چلی گئی اور وہ لوٹ گیا۔ مختصر ط میں اس نے پرپوز کیا تھا۔ مجھے بے چارے پر ترس آ گیا۔ کہاں مرنے جا رہا تھا۔

میں نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔

چند روز ہوئے مجھے روپی نے بتایا کہ ڈیڈی نے بھاردواج انکل سے میری شادی طے کر لینے کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اور رما کو فوراً کے لئے لکھا تھا۔

میں پچھلے کئی روز سے پریشان ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

رات بہت دیر تک اپنے پرانے خط نکال کر پڑھتی رہی۔ کنول کا خط نکل آیا۔ اس نے یہ خط مجھے جب لکھا تھا جب اسے میری ین کے معاملے کا علم ہوا تھا۔

نشی!

تم جس ڈھنگ سے مسرت اور سکون تلاش کر رہی ہو، تمہیں نہیں مل سکتا۔ تم نے ہر ونش سے علیحدگی اختیار کر لی کیونکہ تمہارے نظریے غلط ہیں، تمہاری پرکھ کا انداز ٹھیک نہیں۔ اب کیا کرو گی تم نہیں جانتی۔ تم نے اپنے اس عمل سے ممی ڈیڈی کو کتنا بڑا صدمہ پہنچایا ہے۔

میں اپنے آپ کو بھی قصوروار سمجھتا ہوں کہ میں نے تم پر دوسروں کے فیصلے ٹھونسنے میں، ان کی مدد کی۔ میرے قصور کی سزا تو مجھے کیا دو گی تم۔ اپنے آپ پر ضرور ظلم کر رہی ہو۔

مجھے خوشی ہوگی اگر میں کبھی تمہارے کسی کام آ سکوں!

تمہارا
کنول

میں نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اُس نے بھی اس کے بعد کوئی خط نہیں لکھا۔ وہ غالباً اب بھی اُسی تین کمرے کے فلیٹ میں رہ رہا ہوگا۔ اُس کے کمروں میں اب بھی لوبان سلگتا ہوگا۔ اس کے باتھ رُوم میں اب بھی عطر مہکتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اُس نے شادی کر لی ہو۔ لیکن وہ شادی کرتا تو ہمیں بلاتا ضرور۔ ممی ڈیڈی سے مشورہ ضرور کرتا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کوئی لڑکی پسند آ گئی ہو اور شادی کر لی ہو۔ اس میں کسی سے مشورہ کرنے کی کیا بات تھی۔ میں آدھی رات کے بعد تک اُس کے بارے میں سوچتی رہی۔ جانے مجھے کیوں لگا کہ کوئی میرے دل کے بند دروازوں کے ساتھ لگا کھڑا تھا، دروازے جن میں بڑی بڑی کیلیں لگی تھیں، دروازے جو بے حد مضبوط تھے!

اور آج کرسمس ایو ہے۔

صبح میں نے سوچا تھا کہ اُسے کرسمس کارڈ بھیج دوں۔ پھر خیال آیا کہ ڈیڈی کو بازار بھیجوں، اچھے سے کارڈز خرید لائیں گے۔ میں یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ پوسٹ مین دو لفافے دے گیا۔ ایک میں منوج بھاردواج کا بھیجا ہوا بڑا قیمتی اور خوب صورت کارڈ تھا اور دوسرے میں ہاتھ سے لکھا ہوا ایک معمولی سا کاغذ جس پر صرف ایک سطر تھی۔

"تم سلامت رہو"

اور نیچے کنول کا نام تھا۔

وہ ایک بار پھر جیت گیا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی جیت جاتا تھا۔ میں ابھو فیصلے پر سوچ وچار ہی کر رہی تھی اور اُس نے فیصلہ کر بھی ڈالا تھا۔ میں ابھی سوچ کے تانے بانے ہی بنتی تھی کہ وہ تصویر بھی مکمل کر لیتا تھا۔

میں نے اسی لمحہ اُسے ایک ایکسپریس تار دے دیا۔

اگر وہ وقت سے نہیں آیا تو یہ سب لوگ مل کر مجھے کروس فائی کر ڈالیں گے۔ صلیب تو میری پہلے ہی سے تیار ہے، لیکن میں دوسروں کے ہاتھوں سے فنا ہونا نہیں چاہتی۔ میں اپنی بنائی ہوئی صلیب پر اپنے آپ لٹکنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنے سینے پر کراس نشان بناتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں اور دُعا مانگی۔

"خداوندا اپنی بھیڑوں کی حفاظت کر۔"

اندھیرا ہونے لگا ہے۔

کارکا ہارن ہوا ہے۔ منوج بھاردواج آ گیا ہے۔ میں لان سے اُٹھ کر اندر آ گئی ہوں۔ بند کھڑکی کے شیشوں سے دیکھا ہے۔ اُس کی لڑکی بالکل گڑیا بنی بھاگ کر برآمدے کی طرف آ رہی ہے۔

"ممی ڈیڈی ہیپی کرسمس ٹو یُو"

ممی نے اُسے گود میں اٹھا کر چوم لیا ہے۔ کتنی پیاری بچی ہے۔ اور کیسی مہذب۔ کرونیٹ میں پڑھنے جاتی ہے۔ اور اب کار کا دروازہ بند کر کے منوج بھیا۔ دوبارہ ادھر آ گیا ہے۔ بڑھیا کپڑے کا اچھا سلا ہوا سُوٹ، میچ کرتی ہوئی ٹائی، چمکتے ہوئے جوتے۔ بہت ہی اچھا لگ رہا ہے وہ۔ بھلا آدمی ہے بے چارہ۔ زخم خوردہ ہے۔ شاید اسی لئے مجھے اچھا لگتا ہے۔ کاش وہ اپنی اچھائی غلط آدمیوں پر قربان نہ کرے! وہ مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا اور میں یہاں کمرے میں سر درد کا بہانہ کئے پڑی ہوں اور ساریڈان کی ڈبیا ڈھونڈوا رہی ہوں۔

رما اور اُس کا پروفیسر خاوند بھی آ گئے ہیں۔ یہ اُن کی پہلی کرسمس ہے جو وہ یہاں منانے آئے ہیں۔ رما کا انتخاب ٹھیک ہے مجھے پسند آیا ہے۔ وہ سب میرے کمرے میں جمع ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھے لمحہ بھر بھی اکیلا نہ چھوڑیں۔ مجھے اکیلے پن سے ڈر لگتا ہے۔ اکیلی دیکھ کر کوئی بھی تو آ سکتا ہے۔ نوکر نے معمول کی طرح میرے کمرے کے آتشدان میں لکڑیاں سُلگا دی ہیں۔

ممی کے بُلانے پر ہم سب کچھ لمحوں کے لئے ڈرائنگ روم میں گئے۔ بہت سے مہمان جمع ہو رہے ہیں۔ سبھی اپنے اپنے گلاس سنبھالے کرسمس ایو منا رہے ہیں۔ میں نے بھی اپنے لئے گلاس میں پورٹ ڈال لی ہے۔ رما نے بھی اپنا گلاس اُٹھا لیا ہے۔ اُٹھا تو پروفیسر نے بھی لیا ہے لیکن بے چارہ شرما رہا ہے۔

"ہیپی کرسمس ٹو دی فیملی"

سب نے اپنے اپنے گلاس ہونٹوں سے لگا لئے ہیں۔ میں نے بھی اور رما نے بھی۔ لیکن پروفیسر ابھی تک جھجک رہا ہے۔ میں اُسے ساتھ لئے واپس اپنے کمرے میں آ گئی ہوں۔

رما پروفیسر، روپی سب نے میرے گلاس سے ایک ایک سِپ لیا ہے اور ہم آتش دان کے قریب بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ آتش دان میں لکڑیاں سُلگ رہی ہیں۔ باہر تیز ہوا چل رہی ہے۔ آڑو کے پیڑ کے خزاں رسیدہ کمزور پتّے شاخوں سے جدا ہو کر نیچے گر رہے ہوں گے۔ پروفیسر نے سگرٹ سلگا کر دیا سلائی آتشدان میں پھینک دی ہے۔

ہم اپنے اپنے گلاس سنبھالے خاموش ہیں اور جانے کیا سوچ رہے ہیں۔

اچانک ایک ہنگامہ سا ہوا ہے۔ روپی بھاگ کر باہر گئی ہے۔

شاید وہ آ گیا ہے۔ وہی جس کو میں نے تار دیا تھا۔ وہی جس کی شخصیت سے خوشبو کی لپٹیں نکلتی رہتی ہیں۔ اسے وہی اپنا کنول!

"میٹ مائی سن کنول!" ڈیڈی مہمانوں سے کنول کا تعارف کرا رہے ہیں۔ وہ جب دو تین پیگ لے لیں تو جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اُن میں خلوص اور محبت کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں۔

"ہیپی کرسمس ٹو ہِم" یہ منوج بھیا کی آواز ہے۔

گلاس ٹکرائے ہیں اور ایک گھونٹ پینے کے بعد وہ ممی کے پاؤں چھو رہا ہے۔

"بہت اچھے سمے آئے ہو کنول" ممی کہہ رہی ہیں۔

روپی یہ سب دیکھ کر میرے کمرے میں آ کر مجھے بتا رہی ہے اور اس کی سانس چڑھ رہی ہے۔

اور اب کنول ہاتھ میں وہسکی کا گلاس لیے میرے کمرے میں آ گیا ہے اور میں نے آگے بڑھ کر اسے چوم لیا ہے۔ رُوپی، رما، پروفیسر، سب کے سامنے۔ ماروا نے اس کے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ بھرا ہے۔

"مائی سیٹا لوز ہیر کم":

اور ایک زوردار قہقہہ گونجا ہے اور ہم سب نے اپنے اپنے گلاس ختم کر ڈالے ہیں۔ رُوپی نے نوکر سے دوبارہ گلاس بھر دینے کو کہا۔

کھانے کے بعد سب لوگ جا رہے ہیں۔

میں کنول کے ساتھ کھڑی سب کو بائی بائی کہہ رہی ہوں۔ میں نے منوج بھاردواج کی بچی کے گالوں کو بڑے پیار سے چوما ہے اور بھاردواج کی نشیلی آنکھوں کو مسکرا کر دیکھا ہے اور آنے کے لئے شکریہ ادا کیا ہے۔

دھیرے دھیرے سارے مہمان چلے گئے ہیں۔ ڈیڈی اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں۔ اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں، ممی انہیں سنبھال رہی ہیں۔ رما اور پروفیسر بھی سونے چلے گئے ہیں۔ رُوپی نے کنول کا بستر بھی لگوا دیا ہے۔ میں اب اپنے کمرے میں آ گئی ہوں۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا ہے۔ بجلی بجھا دی ہے اور بستر پہ لیٹ گئی ہوں۔ سر میں سُرور کی ہلکی ہلکی لہریں رقص کر رہی ہیں۔ باہر تیز ہوا کے جھونکے کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا رہے ہیں۔ لگتا ہے آج رات آڑو کے پیڑ کے تمام پتے گر جائیں گے۔ کسی شاخ پہ ایک بھی زرد پتہ نہ رہ سکے گا۔ اور وہ تمام گرتے ہوئے پتے میرے دل کے بند دروازوں پر دستک دے رہے ہیں جیسے انہیں توڑ ڈالنا چاہتے ہوں۔

میں اپنے دل کے دروازوں میں گاڑی ہوئی کیلوں کو ایک ایک کر کے نکال رہی ہوں۔ صبح تک ساری کیلیں نکل جائیں گی اور دل کے دروازے ایک بار پھر کھل جائیں گے اور مشرق کے جھروکے سے ابھرتا ہوا سورج میرے احساس کی پہاڑیوں کو اپنی سنہری کرنوں سے شرابور کر دے گا۔

دل کے دروازے اتنے مضبوط نہیں کہ کبھی کھل نہ سکیں!

موتیے کے پھول

مسعود مفتی

سیالکوٹ میں یہ دس ستمبر کی رات تھی۔

دھڑام — توپ کی دہشت ناک آواز گونجی۔

چھنا چھن - چھنا چھن . . . زمین لرزی اور میز کے کنارے پڑا ہوا شیشے کا گلاس پھسل کر فرش پر گرا۔

میں بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آدھی رات کے وقت کمرہ تاریک تھا۔ لیکن کبھی کبھی دور چلنے والے راکٹ کی ہلکی سی روشنی دروازے اور کھڑکیوں کو ظاہر کر دیتی جن کے کواڑ مسلسل لرز رہے تھے۔ رات کا ماحول توپوں اور گولیوں کی ناہموار آوازوں سے کسی زخمی کی طرح کراہ رہا تھا۔ ذرا اونگھ آنے لگتی تو کوئی گرج یا دھماکہ اچانک چیخ اٹھتا، اور پھر سامنے والی کھڑکی سے نظر آنے والا آسمان چند لمحوں کے لئے دمک جاتا جیسے اندھیرے کمرے میں کوئی سگریٹ کا کش لگاتے اور چہرے کے نقوش تاریکی سے جھانکنے لگیں۔

پھر اس پُرشور ماحول کا تناؤ، پھر کمرے کی گرمی، دونوں نے سونا مشکل کر دیا تھا۔ حالانکہ میں تھکا ہوا تھا۔ کیونکہ سارا دن ریلوے اسٹیشن پر رضاکاروں کے ساتھ رسد کے بنڈل اتار اتار کر فوجی ٹرکوں پر لادتا رہا تھا اور خیال تھا کہ شام کو سو سکوں گا۔ مگر آج رات لڑائی پھر زیادہ ہی زور پر تھی، اور سونا محال تھا۔ یہ بے چینی اور بے آرامی کی تیسری رات تھی۔

بستر میں بیٹھ کر میں نے بیزاری سے ادھر ادھر دیکھا۔ ساتھ والے کمرے میں اباجان تہجد پڑھ رہے تھے۔ دوسرے کمرے میں امی آیت کریمہ کا ورد کر رہی تھیں۔ گھر کے باقی افراد بھی ادھر ادھر سکڑے بیٹھے تھے۔ یا بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ گھڑی رات کا ڈیڑھ بجا رہی تھی — ماحول کے گونجیل سے تنگ آ کر میں اٹھا اور چھت پر چلا آیا۔

سیالکوٹ میں ہمارا مکان بازار کلاں میں پرانے قلعے کے پاس ہی واقع ہے۔ قلعے پر بڑی توپ نصب تھی جس کو عقیدت سے لبریز لوگ رانی کہتے تھے۔ اس کی خوفناک آواز بھی لوگوں کا خون دگنا کر دیتی تھی۔ اور توپ دغنے کے بعد وہ بازار میں نعرے لگاتے۔ "ٹیپو رانی"۔

آج دوپہر کے بعد تو کئی لوگ جا کر اس کے پہیوں اور دہانے پر ہار بھی ڈال آئے تھے — میں بھی ابھی ابھی اس کی دہشتناک آواز سے ہڑبڑا کر اٹھا تھا اور اس کے دھماکے سے زمین کانپی تو گلاس گر کر ٹوٹ گیا تھا۔

کوٹھے پر آ کر میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، محاذ کی طرف آسمان پر قریباً مسلسل روشنی تھی۔ چھت پر آنے کی وجہ سے گولوں گولیوں اور دھماکوں کی آواز اور بھی بلند ہو گئی تھی۔ میں افق پر آتش بازی کی طرح اٹھنے والے شراروں کو دیکھنے لگا۔ جو زمین سے ابھرتے قوس کی شکل میں اڑتے اور پھر زمین کے سیاہ رنگ میں جا ملتے۔ اگر کسی بارود کے نشانے پر لگتے تو وہاں سے دیوہیکل انار چھوٹنے لگتے۔

فضا میں ایسے پٹاخے چل رہے تھے جیسے سوکھی کٹی پھٹی جا رہی ہو۔ ان کے بیچ میں بڑے بڑے دھماکے بھی اپنی گونجدار آواز چار اطراف پھیلا دیتے۔

تاروں بھرے آسمان کے نیچے تاریک اندھیرا اور تاریک افق تھی جس کے ایک کونے میں انگارے اُڑ رہے تھے اور شعلے جھوم رہے تھے۔ اور ڈھکی چھپی روشنیاں آسمان پر لمبی لمبی جھاڑو دے رہی تھیں۔ اس کے ساتھ سینے میں اترنے والی تیز آوازیں تھیں اور دماغ کے گنبد میں گونجنے والے بھاری گڑ گڑم دھماکے بھی۔ ماحول سخت ہیبت ناک مگر بہت ہی مسحور کن تھا۔ اگر آدمی اپنی موت کے خوف کو بھول جاتے تو اس سے بہتر نظارہ ممکن نہ تھا۔ چنانچہ چھت کی منڈیر پر دونوں کہنیاں ٹکائے ہوئے میں بالکل سحر زدہ سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"گوں اوں اوں ... گوں اوں اوں ... گوں اوں اوں ..." ہوائی حملے کے سائرن بجنے لگے اور میں سر چھپانے کی بجائے چاروں طرف سر گھما کر ہوائی جہاز ڈھونڈنے لگا۔

دراصل میں ڈر کے مقام سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ سیالکوٹ پر آٹھ ستمبر کو حملہ ہوا تھا۔ شروع میں بہت ڈر لگا تھا۔ مگر اب محض ذہنی تعطل سا تھا۔ کسی چیز سے خوف نہ آتا تھا صرف مستقبل کی انتہائی بے یقینی رگوں کو جھنجھناتی رہتی تھی۔ ہوائی حملے کا سائرن بھی کوئی نئی چیز نہ تھی اس لئے میں سائرن کی پروا کئے بغیر ہوائی جہاز دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور زمین سے طیارہ شکن توپوں کی پھینکی ہوئی شعلوں کی لمبی لمبی زبانیں دیکھنے لگا۔

پھر ایک دم افراتفری سی مچ گئی ——— امی کی پکار ——— اندھیرا ادھا اڑا ——— دیوہیکل سائے چھت کی طرف بڑھتے ہوئے ——— ہوائی جہازوں کی چنگھاڑ ——— میں غیر ارادی طور پر ہوائی جہاز کی گولیوں سے بچنے کے لئے سیڑھیوں کی طرف لپکا ——— مگر ...

ایک دم زبردست دھماکہ ہوا ——— میں لڑکھڑایا ——— سنبھلا ——— ہوا کا تیز جھونکا میرے چہرے پر لگا۔ اور جب میں دیوار کا سہارا لیا تو وہ جیسے زلزلے سے کانپ رہی تھی۔

میں نے اپنا آپ محسوس کیا ——— صحیح سلامت تھا۔

فوراً چھت سے صحن میں جھانکا۔ گھر کے سب لوگ صحن میں جمع تھے۔ اور مجھے پکار رہے تھے۔

"میں ٹھیک ہوں" میں چلایا

اور وہ سب دوڑتے ہوئے اوپر بھاگے آتے۔

ہوائی جہاز ایسے غائب ہو چکے تھے، جیسے تھے ہی نہیں۔ فضا میں ہر طرف گرد ہی گرد تھی اور سانس کے ساتھ بہت سی گرد میرے منہ میں جا رہی تھی۔

"کہیں قریب ہی بم پڑا ہے" ابا نے کہا "خدا رانی کی خیر کرے۔ دشمن اسی کی گھات میں ہے۔"

اس کے ساتھ ہی ایک اور زوردار دھماکہ ہوا۔ بہت ہی جانا پہچانا، اپنا اپنا ئیت کا سا انداز لئے۔

"ارے یہ تو رانی ہے" ابا بولے۔

"شکر ہے خدایا" امی نے دوپٹے کی جھولی آسمان کی طرف اٹھا دی۔
ہیبت فکری دیکھی رات کے اندھائی بجے تھے۔
اتنے میں ارد گرد کی چھتوں سے آوازیں آنے لگیں اور پتہ چلا کہ بازار میں بم گرا ہے۔

اگلی صبح میں رضاکاروں کے ساتھ ملبہ ہٹانے میں مصروف تھا۔ بم بازار کلاں اور ٹرنک بازار کے درمیانی بلاک پر گرا تھا۔ کوئی ڈیڑھ سو مکانات پر اثر ہوا تھا۔ جن میں سے بیشتر اب ملبے کا عظیم ڈھیر بن گئے تھے۔ یہ ملبہ ہمارے گھر سے پرے تیسرے مکان سے شروع ہوتا تھا جہاں حاجی صاحب رہتے تھے۔ میں جان بوجھ کر اس ٹولی میں جا شامل ہوا جو حاجی صاحب کے مکان کا ملبہ اٹھا رہی تھی۔

میرے سامنے منوں مٹی پڑی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی دیواریں، شکستہ کڑیاں مٹی میں کھبی ہوئی، ٹیڑھی بینگی خمیدہ سلاخوں پر چھت کے معلق حصے، ٹوٹے ہوئے شیشوں کی چمکتی کرچیاں۔ کواڑوں کے پھٹ جانے سے ان کے میلے رنگ میں سے جھانکتی ہوئی اجلی کڑی، میلی کچیلی، بارش زدہ اینٹوں کے ٹوٹنے سے اندرونی اینٹ کی سرخ جھلکیاں —— آندھی میں بڑھیا کے الجھے ہوئے بالوں کی طرح ملبہ تہہ تیغ کا مجموعہ تھا۔ پلستر کے چھلکے، کرسیوں کے ادھڑے ہوئے بینت، کبڑی چارپائیوں کے ٹوٹے ہوئے پائے۔ چھت پر سوکھنے والے کپڑوں کے میلے چیتھڑے۔ اوپر والی منزل سے لڑھکے ہوئے صندوق، برتن، جوتے وغیرہ تباہی کے ڈھیر میں کس مپرسی سے پڑے ہوئے تھے۔ ملبے کے ڈھیر پر ایک کونے میں مٹی کا گملا آدھا ٹوٹا پڑا تھا مگر اس کے اندر کی مٹی اور موتیے کا پودا صحیح سلامت تھا۔ فقط پتے گرد سے اٹے تھے۔

میرا دل اچھلا —— سب کی نظر بچا کر میں نے گملا اٹھایا اور چپکے سے جا کر اپنے گھر چھوڑ آیا۔ اور پھر واپس ملبہ اٹھانے کو لپکا۔

میرا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں ہر چیز کو ایسے ہاتھ لگاتا جیسے اسے درد ہوگا۔ میری کوشش تھی کہ ایک چیز اٹھانے سے دوسری نہ پھسلے۔ دراصل میں بڑی بے صبری سے ایک نسوانی جسم کو تلاش کر رہا تھا اور دعا بھی مانگ رہا تھا کہ خدا کرے وہ اس میں نہ ہو۔

"ادھر آؤ جی سب" ایک رضاکار چلایا۔

میں ساری احتیاط چھوڑ کر ملبے میں چھلانگیں مارتا ادھر لپکا، جہاں دوسرے لوگ بھی اکٹھے ہو رہے تھے۔

ملبے میں سے ایک عورت کی ٹانگ اور جوتی والا پاؤں جھانک رہے تھے۔

میرا دل بیٹھنے لگا۔

"دھیرے دھیرے بھائی"

"یا علی مدد"

"یا اللہ فضل"۔

اسے چاروں پچاس ہاتھ انتہائی تیزی سے ملبہ ہٹانے لگے۔ ٹانگیں نظر آنے لگیں تو پتہ چلا کہ باقی جسم ایک بڑی میز کے نیچے ہونے
کی وجہ سے صحیح سلامت ہے اور دب جانے سے بچ گیا ہے۔ اس پر بالکل مٹی نہ تھی کیونکہ میز کے ایک پہلو میں شہتیر ٹکا تھا۔ جس پہ اٹکی
ہوئی چارپائی نے سارا ملبہ روک لیا تھا۔
جب شہتیر اور بلیاں اٹھا کر میز کو اٹھایا۔ تو میں نے فوراً پہچان لیا——
یہ وہی تھی——
ایک بوڑھے نے لمبی آہ بھری اور اپنی بھیگی ہوئی پلکیں صاف کرنے لگا۔
لڑکی کا چہرہ آسمان کی طرف اٹھا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ جسم پر خون کہیں بھی نظر نہ آتا تھا۔ غالباً کوئی اندرونی چوٹ آئی تھی
ایک آدمی نے آگے بڑھ کر فوراً نبض دیکھی —— دل ٹٹولا —— ناک کے آگے ہاتھ کی پشت رکھ کر سانس محسوس کرنے کی کوشش کی——
بند آنکھوں کے پپوٹوں کو پھاڑ کر آنکھ کی پتلی پہ انگلی لگا کر دیکھی —— اور نا امیدی سے سر ہلانے لگا۔ پھر انتہائی مایوسی سے ہاتھ ہلا کر اس
نے انہیں لے جانے کا اشارہ کیا۔ دل گرفتہ رضاکاروں نے بڑی بے چارگی اور بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کی زبانیں
گنگ تھیں اور ہلنے کی قوت جیسے کسی نے سلب کر لی ہو۔
"کلمہ شہادت"
چپ ٹوٹنے سے جیسے سب ہوش میں آ گئے۔ ایک دو آوازوں نے کلمہ پڑھا اور کئی ہاتھ اس جسم کو اٹھانے کے لئے جھکے
پس منظر میں اب بھی توپیں گرج رہی تھیں۔

اس چہرے کو میں نے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا۔ چھپ چھپ کر چوری چوری —— اور کئی کئی دنوں کے انتظار کے بعد
وہ حاجی صاحب کی لڑکی تھی۔ کوئی اٹھارہ بیس برس کی۔ ان کے مکان اور ہمارے گھر کے درمیان صرف چھوٹے چھوٹے دو
مکان اور تھے جو ایک منزلہ تھے۔ ہمارا اور حاجی صاحب کا گھر دونوں دو منزلہ تھے۔ ہماری چھت بھی ذرا اونچی تھی چنانچہ میں
وہاں سے سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔
ابا جان کی بازار کلاں میں جنرل مرچنٹ کی دکان تھی اور حاجی صاحب کی ٹرنک بازار میں ریشمی کپڑے کی۔ میں دسویں پاس
کر کے ابا جان کے ساتھ دکان پر ہاتھ بٹاتا تھا مگر چونکہ وہ ہر وقت دکان پر رہتے تھے اس لئے میں دکان سے ایک دو گھنٹے غائب
رہ سکتا تھا۔
اس لڑکی کو میں نے اتفاقاً ایک روز دیکھ لیا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی صبح چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا۔ میں اسے اکثر منع کیا کرتا
تھا اور اس روز جھنجھلا کر چھت پر اسے مارنے گیا تو سیڑھیوں کے دروازے ہی سے میری نظر لڑکی پر پڑی۔ وہ اپنی چھت پہ
برساتی میں کھڑی ایک گملے میں پانی ڈال رہی تھی۔
میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا —— اور پھر . . . بھائی کو مارنے کی بجائے اس کے ساتھ پتنگ اڑانے میں شریک ہو گیا۔

جو کبھی کبھی لڑکی کی طرف دیکھنے کا بہانہ تھا۔

ہم پتنگ اور پیچ لڑانے کی طرح سے طریقے سے اڑا رہا تھا۔ میرا جی اچھا لگنے لگا۔ آواز سن کر لڑکی نے ادھر سر گھمایا۔ اور مجھے دیکھ کر وہ پھینک کر تی سیڑھیوں میں غائب ہو گئی۔

اس دن کے بعد سے میں اپنے چھوٹے بھائی کا دوست بن گیا۔ اسے خود پتنگ اور ڈور لا کر دیتا۔ اس کے ساتھ مل کر کوٹھے پر اڑاتا۔ بلکہ اگر وہ نہ ہوتا تو زیادہ آزادی سے اڑاتا۔

وہ مجھے کئی دفعہ نظر آئی اور ہمیشہ موتیے کے پھولوں میں پانی ڈالتے ہوئے۔ برساتی میں صرف ایک ہی بڑا سا گملا تھا جس میں یہ پودا تھا۔ جن دنوں کا ذکر میں کر رہا ہوں، اس وقت اس میں سفید سفید پھول لگے تھے۔ میں نے دو چار دفعہ لڑکی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے مجھے دیکھا بھی۔ مگر کوئی توجہ نہ دی بلکہ ہمیشہ نظر انداز کیا۔ میں کئی کئی گھنٹے پتنگ بازی میں مصروف رہ کر اس کا انتظار کیا کرتا۔ وہ دنوں کی انتظار کے بعد کبھی کبھی صرف چند لمحوں کے لئے نظر آتی۔ مگر مجھے دیکھ کر ہمیشہ واپس ہو جاتی۔

میرا اندازہ تھا کہ والد صاحب اب میری شادی کے متعلق سوچ رہے ہیں اور میں چاہتا تھا کہ کسی وقت اشارتاً امی کو کہہ دوں کہ میری شادی اسی لڑکی سے کی جائے۔

مگر انہی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا کہ میں نہ کہہ سکا۔

ایک دن میں اوپر گیا تو چھت پر برآمد ہونے سے پہلے ہی سیڑھیوں کے دروازے میں سے میری نگاہ اس پر پڑی۔ وہ حسب معمول میری طرف پیٹھ موڑے موتیے کے گملے میں پانی ڈال رہی تھی۔

میں وہیں دبک کر کھڑا ہو گیا۔

پانی ڈال چکی تو وہ روز کی طرح واپس نہ گئی بلکہ ایک دفعہ منڈیر سے نیچے صحن میں جھانک کر پھر پودے کے پاس چلی گئی۔ اور اس کے پتوں کو ٹھیک کرنے لگی۔

اتنے میں سیڑھیوں سے ایک نکھرا ہوا نوجوان ظاہر ہوا جو فوجی لیفٹیننٹ کی وردی میں ملبوس تھا۔ وہ بھی برساتی میں آ گیا۔

دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

پھر لڑکی نے موتیے کا ایک پھول توڑ کر اسے دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

نوجوان نے پھول لیا۔ پھر لمحہ بھر کے لئے لڑکی کے ہاتھ کو بھی تھام لیا۔ اور دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

میرا خون غصہ سے کھول اٹھا۔ میں فوراً باہر چھت پر نکل آیا۔ بغیر ضرورت کے اپنے چھوٹے بھائی کو بلند آواز میں پکارا۔

میرا شور سن کر وہ چونکے اور نیچے چلے گئے۔

میں جھنجھلایا ہوا اپنے چوبارے میں آیا۔ کمرہ خالی تھا اور مجھے اس وقت اور بھی خالی لگا، جیسے بالکل خلا ہو جس میں میں ایک تنکے کی مانند اڑ رہا ہوں۔ اسی طرح بے مقصد اڑتا اڑتا کھڑکی تک چلا گیا۔ گلی میں جھانکا تو وہی فوجی لیفٹیننٹ کھڑکی کے نیچے سے گزر رہا تھا۔

میرے کمرے سے ابھی ابھی جنگن صفائی کر کے گئی تھی۔ اور ردّی کاغذوں والی ٹوکری میں کوڑا اکٹھا کر کے دوسرا کمرہ کرنے گئی تھی۔ میں کھڑکی میں پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور ہاتھ لمبا کر کے کوڑے کی بالٹی باہر الٹ دی۔

چند لمحے بعد باہر جھانکا۔ تو وہ کچھ فاصلے پر جا رہا تھا اور کوڑا اس پر نہیں گرا تھا — مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے کوڑے کا پورا گڑا میرے اوپر پھینک دیا ہے۔

چند دنوں بعد میں نے پھر انہیں چھت پر دیکھا۔ وہ نوجوان موتیے کے پودے کی ٹہنیوں کو آہستہ آہستہ سہلا رہا تھا۔ اور لڑکی کچھ شرمائی شرمائی سی پاس کھڑی تھی۔

میں نیچے جا کر اپنے چھوٹے بھائی کی غلیل اٹھا لایا۔ نشانہ تان کر غلیل کھینچی۔ اور تاک کر غلہ چھوڑا . . . پھر خود ہی چیخ مار کر بیٹھ گیا کیونکہ اناڑی ہونے کی وجہ سے غلہ غلیل کے بیچ میں سے نہ نکلا بلکہ جس ہاتھ سے میں نے غلیل پکڑی تھی۔ اس کے انگوٹھے پہ آ کر لگا۔

غصے اور درد سے پاگل ہو کر میں نے ایک پتھر ان کی چھت پر پھینکا اور خود منڈیر کے پیچھے دبک گیا۔

چند لمحوں بعد سر اٹھا کر دیکھا تو وہ جا چکے تھے۔

اسی دن کے بعد میں نے انہیں اکٹھے نہیں دیکھا۔

چند ماہ بعد جنگ چھڑ گئی۔ اور حاجی صاحب کے مکان پر بم گرنے کے بعد موتیے کا وہ پودا میں گھر اٹھا لایا۔ عمر میں پہلی دفعہ جب میں نے اس لڑکی کے جسم کو ہاتھ لگایا تو وہ مردہ لاش تھی۔ مگر میرا دل پھر بھی دھڑک اٹھا تھا اور ٹانگیں لرز گئی تھیں۔

یہ بم گرنے کے بعد چوتھے روز کا واقعہ ہے۔

بازار میں شور سن کر میں ادھر گیا۔ تو ہماری فوجیں جیپوں اور ٹرکوں میں محاذ کی طرف جا رہی تھیں۔ پبلک عقیدت سے ان پر ٹوٹی پڑتی تھی۔ گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے ہوتے وہ اپنے بہادروں پر جان نثار کرنے کو تیار نظر آتے تھے۔

کئی لوگ بھاگ کر گاڑی کے قریب جاتے اور فوجیوں کے ہاتھ چومتے۔ باقی دور کھڑے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ یا رومال ہلا رہے تھے۔ اور پھول پھینک رہے تھے

سامنے والے چوک میں لوگوں نے پلاؤ کی دیگیں تیار کی تھیں جو وہ لفافوں میں بھر بھر کر گاڑیوں کے اندر پھینکتے جاتے۔ مکانوں کی کھڑکیوں میں اور چھجوں پر عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ کئی ایک بلند آواز سے رو رہی تھیں باقی لال پیلے کاسنی دوپٹے ہلا رہی تھیں۔

ایک چوبارے سے بچوں نے نعرہ لگایا "ہیرو، ہیرو"۔

دکانوں میں بیٹھے ہوتے لوگ کھڑے ہو گئے۔ اور اچھل کر نعرے لگانے لگے۔

"پاکستان زندہ باد"

"مجاہدینِ اسلام، زندہ باد"

گلی وہین عطار کی دکان کے سامنے سے گاڑیاں گزرتیں تو وہ عرقِ گلاب اور روحِ کیوڑہ کے چھینٹے مارتا۔

میرے ساتھ کھڑا ہوا بوڑھا اپنی پگڑی اتار اتار کر ہوا میں ہلا رہا تھا اور آنسو کے قطرے اس کی داڑھی میں غائب ہو رہے تھے۔

قریب کے محاذ سے توپوں کی گھن گرج اور بندوقوں کی تڑ تڑ اس سارے منظر کے ساتھ بڑی ہم آہنگ لگتی تھی۔

ہجوم کے بار بار حائل ہونے کی وجہ سے گاڑیاں بہت سست رفتاری سے بڑھ رہی تھیں۔ لوگ ان کے مڈگارڈوں پر چڑھ جاتے تھے، پیچھے لٹک جاتے تھے اور اچھل اچھل کر گاڑیوں کو ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ اندر سے فوجی لوگوں کی طرف ہاتھ پھیلا رہے تھے کہ وہ انہیں چوم سکیں۔ بعض مسکرا مسکرا کر بازو لہراتے۔ کئی جوشیلے فوجی خود بھی نعرے لگانے لگے اور گاڑیاں رک رک کر، تھم تھم کر، رینگ کر، قدم بہ قدم آگے بڑھی آ رہی تھیں۔

اچانک میں نے دیکھا کہ جو گاڑی ابھی موڑ کاٹنے والی تھی۔ اور مجھ سے ہزار گز دور تھی۔ اس میں وہی فوجی افسر سامنے کی طرف منہ کئے کھڑا تھا۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس کی باریک مونچھوں میں پُرغرور مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں اعتماد چمک رہا تھا۔ جیسے جیسے گاڑی قریب آتی گئی اس کا چہرہ لال ہوتا گیا۔

اتنے سارے مجمع میں میں ہی واحد شخص تھا جو سمجھتا تھا کہ اس کا منہ کس لئے لال ہو رہا ہے۔

پھر گاڑی نے ہلکا سا موڑ کاٹا۔ اس نوجوان کی بے تاب آنکھوں نے دردِ جاناں کو دیکھنا چاہا۔ اس کے کسی دریچے کو دیکھنا چاہا مگر وہاں کھنڈرات اور ملبے کے ڈھیر پر نظر پڑی تو وہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔

ہوا میں ہلنے والا پُراعتماد ہاتھ بے جان سا ہو کر جیپ کے شیشے پر گر گیا۔ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے کھنڈرات کو دیکھتے ہوئے وہ بالکل مبہوت ہو گیا۔

پھر وہ ایک دم ٹھٹکا ——— جھک کر ڈرائیور کے کان میں کچھ کہا۔ مگر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اب گاڑی حاجی صاحب کے مکان کے ملبے کے عین سامنے سے گزر رہی تھی۔ اور میں ایک دکان کے چبوترے پر کھڑا اس نوجوان کو دیکھ رہا تھا ——— گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی گئی ——— اس کا فق، کربناک پیلا چہرہ ہولے ہولے مڑنے والی گردن پر ٹکا ہوا ٹکٹکی باندھ کر بے ترتیب ملبے اور اجڑے ہوئے کھنڈر کو دیکھتا رہا ——— پھٹی پھٹی ویران آنکھوں سے ——— گاڑی بڑھتی گئی اور وہ لحظہ بلحظہ لوگوں کے اژدحام میں گم ہونے لگا ——— میں اپنی ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اس ڈوبنے والے چہرے کی سوگواری، بے چارگی اور کس مپرسی دیکھتا رہ گیا۔ جو گزر جانے کے بعد پُرشور فضا میں غم اور سکوت کی لمبی لہر چھوڑ گیا۔

سیالکوٹ کی جنگ جاری رہی۔ دھماکوں کا کھیل ——— انگاروں اور شراروں کے ناچ ——— بے خواب راتیں اور بے ہم دن ——— دعاؤں میں اٹھے ہوئے ہاتھ ——— قومی جذبے سے چھلکتے دل ——— حمیت اور غیرت میں کھولتے ہوئے خون ——— ان تھک فنکار ——— زخمیوں سے لبریز ہسپتال ——— بے لوث نرسیں ——— یہ تھا ان دنوں کا سیالکوٹ۔

پھر ایک دن میں نے اخبار لیا تو چونک پڑا۔
پہلے صفحہ پر اسی نوجوان کی تصویر تھی۔ انتہائی بے جگری سے پیش قدمی کرنے والا شہید ہو کر ستارہ جرأت پانے والا۔

میں جب بھی اس لڑکی اور نوجوان کو اکٹھا دیکھتا تھا تو غصے سے پاگل ہو جاتا تھا۔ مگر اب ....
اب میرے کمرے میں کھڑکی کے پاس منی پلانٹ کا پودا ہے۔ اس کے اوپر دیوار پر اخبار والی تصویر فریم میں لٹکی ہے۔ کمرے کے اندر ہونے کی وجہ سے پودا ذرا مرجھا گیا ہے۔ مگر جب کبھی ہوا کے چلنے سے اس کی ٹہنیاں تصویر کو چھوتی ہیں تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔

امر بیل

بانو قدسیہ

محبت کی امر بیل میں ہمیشہ سنتھ کے پھول کھلتے ہیں۔

تم نے کبھی بے ستھ کا پھول دیکھا زری؟

بے ستھ کا پھول جس کی پنکھڑیوں پر تاسف کے آنسو منجمد ہوں اور جس کی مخملیں جلد سے جدائی کی خوشبو آئے ——— لیکن تم نے تو بے ستھ کا پھول دیکھے بغیر ہی اپنے دل کے نہالچے پر کیوپڈ دیوتا کو سلایا۔ اور پھر آپ ہی آپ ایک رات پچھلے پہر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ محبت کا کھیل گنجفہ کا کھیل نہیں ہوتا زری ——— پھر تم نے اسے سرتیوں کی بازی کیوں سمجھا۔ یہ تو ایک تجارت ہے، ایک مکمل بند غنچہ ہے جس کی سمجھ برسوں نہیں آتی۔ تم تو ابھی فلیٹ بوٹ پہنتی تھیں۔ کندھے پر دو چوٹیوں میں سرخ ربن ڈالتی تھیں۔ تمہاری عمر آئس کریم کھانے اور رشٹ بال کھیلنے کی تھی۔ پھر تم نے سانپ کی بانبی میں ہاتھ کیوں ڈالا؟ تم سے کس نے کہا تھا کہ پارے کا کشتہ اتنی آسانی سے بن جاتا ہے؟

تم نے محبت کے لیے جو ہدف چُنا۔ وہ بڑا اُرپیچ تھا۔ کیسی عجیب سی بات ہے کہ میری محبت تم سے مہ رُخ کے توسط سے تھی۔ اگر وہ خجستہ صورت لیکن منحوس لڑکی میری زندگی میں نہ آتی تو تمھاری محبت کا سربند چشمہ میرے دل میں کبھی نہ پھوٹتا۔ تمہاری محبت میرے دل میں اس طرح بچھی ہے جیسے کسی پرانے مزار پر تازہ پھولوں کی چادر ——— نئی عقیدت کا اظہار۔ اس مرقد میں تمہاری محبت دفن ہے اور تعویذ پر بے ستھ کی پھولوں کی تازہ چادر تنی ہے ——— جن کے مومی وجود پر تاسف کے آنسو منجمد ہیں۔ ان کی مخملیں جلد سے جدائی کی خوشبو آتی ہے ——— موت کی ٹھنڈی باس اٹھتی ہے۔

آنڈا سے میری ملاقات نیل کے کنارے ہوئی تھی۔ میں اپنے دیس واپس آ رہا تھا اور وہ اپنے ہسپانیہ لوٹ رہی تھی۔ مسجد قرطبہ کے عقب میں رہنے والی آنڈا جس کے چپٹے سینے پر پلاٹینم کی صلیب آویزاں تھی۔ ہماری ملاقات چند روزہ تھی۔ بادام کے شگوفوں کی طرح معطر، بے حد نازک اور اپنی موت کے احساس سے لرزاں۔ اسی شام ہم دونوں ہوٹل سے اٹھ کر نیل کے کنارے رنگین چھتریوں تلے آ بیٹھے تھے۔ اندھیرا سست مدعی کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھ رہا تھا۔ اور قاہرہ شہر کی بتیاں نیل کے ناسپاس پانیوں میں فانوس رنگ بیل بکھر رہی تھیں۔ ان منعکس بتیوں کو دیکھ کر ہسپانیہ کی دختر نے کہا تھا۔ "آصف! ان بتیوں کا اپنا تو کوئی وجود نہیں ——— نہیں ہے ناں؟ ———"

"کن بتیوں کا آنڈا ——— ؟"

"یہ بتیاں جو آپ ہی آپ نیل کے سینے سے آ لگی ہیں۔ میلوں کا فاصلہ طے کر کے۔"

"نہیں ———"

آنڈا رو ناچاہ رہی تھی۔ جادوگرنی تھی۔ اُس کا یمین و یسار سیسہ پلائی دیوار کی طرح شکست سے ناآشنا تھا۔ اس میں اپنے ماں اور باپ کا لہو تھا۔ اُس میں کارمن کی روح تھی۔ وہ مسجدِ قرطبہ کی طرح خوبصورت اور اٹل تھی۔ لیکن نہ جانے اس روز ہمارے قیام کی آخری شام وہ شمع کی صورت قطرہ قطرہ پگھلی جا رہی تھی۔ اس کی ستواں ناک ضبط کیے ہوئے آنسوؤں کے باعث بڑی سی نظر آتی تھی اور سینے کی چینی میں رُکی ہوئی آہوں نے زیر و بم کا متواتر ساز چھیڑ رکھا تھا۔

"اس میں ان بتیوں کا بھی تو کوئی قصور نہیں جو قاہرہ میں جل رہی ہیں ——— ہے نا؟ ———"

مرد ہر لمحہ جرأت میں بزدل بن جاتا ہے۔ وہ کچھار میں پناہ لینے والے شیر ببر کی مانند سویا رہنا چاہتا ہے۔ مجھ پر بھی اس وقت بزدلی طاری تھی۔ کوئی چیز فضا میں ایسی تھی جو مانوس تھی۔ جو بموں کی خوشبو سے مشابہہ لیکن عطر حنا میں لپٹی کیسی غبارے کی طرح اُوپر ہی اُوپر اُٹھ رہی تھی۔ شام پر انہوں نے پن کی روشنیاں پڑ رہی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نہیں ہوں ——— اور پھر بھی کرسی پر بیٹھا ہوں۔ میرا کوئی مستقبل نہیں میرا کوئی ماضی نہیں ——— میرا حال بھی سائے کی مانند ہے جس کا اپنا کوئی وجود نہیں ——— میں اس کیفیت سے ڈرتا تھا۔ جیسے اپریشن ٹیبل سے بھاگ کر میں سڑکوں پر بلا مقصد گھوم رہا ہوں اور میرے سر سے جسم میری شریانوں میں کلوروفارم کا نشہ شاں شاں کر رہا ہے ———

"میری بات کا جواب دو آصف؟ ———"

اُس کی بات کا ایک ہی جواب تھا کہ میں چپکے سے اُٹھتا اور نیل کے پانیوں کو اپنا غیر مرئی حساس اور کلوروفارم سے مدہوش جسم سپرد کر دیتا۔ لیکن میں نے اپنی بزدلی کو ہنسی ٹھٹھول میں چھپاتے ہوئے کہا۔ "سیدھی بات کیا کرو۔ سمجھ میں آنے والی ہر وقت کارمن بننے کی کوشش نہ کیا کرو۔"

اُس نے مُنہ پھیر لیا۔ نیلی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے وہ بولی۔ "جو خواہ مخواہ کسی کا عکس اپنے دل میں ڈال لیں۔ اور اُسے چھپائے رکھیں ——— وہ بے وقوف ہوتے ہیں ناں۔"

"خدا کے لیے اتنی خوبصورت شام کو تباہ نہ کرو ———"

لیکن آنڈا کے اپنے وجود کے اندر خفتی پر نالہ گر رہا تھا۔ اُس کے اندر شکست و ریخت کا ایک طوفان موجزن تھا۔ وہ شیام رنگ لموں کی کیا پروا کرتی بھڑک کر بولی۔ "اگر نیل اُن بتیوں کو اپنے پانیوں میں یوں بسانا چاہتا ہے تو اس میں شہر کی بتیوں کا کیا قصور؟"

"تمہیں ہو کیا گیا ہے آنڈا ——— !" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

دُور کسی ریڈیو پر اُم کلثوم گا رہی تھی۔ ہر تان میں فی سبیل اللہ فی سبیل اللہ کی التجا تھی۔ میرے اردگرد رنگین چھتریاں اُن کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگ، ان میں گھومنے پھرنے والے بیرے چرخے کی مال کی طرح گھومتے نظر آ رہے تھے آنڈا۔ نیم وا آنکھوں میں جھنجھلاتے آنسو لیے بولی۔ "تم نے سنتھ پھول کی کہانی سُنی ہے تم نے؟ ———"

"نہیں ——— اور میں سننا بھی نہیں چاہتا۔ میری ایک کزن مجھے فلمی کہانیاں سنایا کرتی ہے میں کبھی ان کے گھر نہیں جاتا ——"

"ہے سنتھ کی کہانی فلمی نہیں ہے آصف۔ یہ تو ڈکمر کے پھول کی داستان ہے ——— ایسا پھول جس میں محبت کا مدفن تھا ——"

میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ میری قوتِ مدافعت جواب دے چکی تھی۔ سارے میں زمستانی ہواؤں کی سیٹیاں بج رہی تھیں۔ چرخے کی مال گھوم رہی تھی اور ام کلثوم انتہا کر رہی تھی ——— رو رہی تھی فی سبیل اللہ ——— فی سبیل اللہ۔

آنڈا اپنے آپ سے بولی ——— "کہتے ہیں کہ دیوتا اپالو کی دوستی ایک یونانی نوجوان سے تھی۔ ہے سنتھ نامی یہ یونانی نوجوان حسن میں بے مثل تھا۔ انگور کے پتوں کا تاج پہنے اخروٹ کی لکڑی کی کمان سنبھالے چیتے کی کھال میں ملبوس جب وہ پہاڑیوں سے اُترتا تو یونان کی دوشیزائیں پانی بھرنا بھول جاتیں۔ خود اپالو ——— سورج کی طرح پلک جھپکے بغیر اُس کی طرف تکتا چلا جاتا ——— لیکن اپالو اور ہے سنتھ کی دوستی چند روزہ تھی۔ بادام کے شگوفوں کی طرح معطر ——— نازک اور اپنی موت کے احساس سے لرزاں۔ بتاؤ آصف ہر خوبصورت چیز ہر مکمل ملاپ چند روزہ کیوں ہوتا ہے ——— کیوں ہوتا ہے بتاؤ نا؟"

میں چپ رہا۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ میرے منہ سے کچھ نہ نکلے۔

"سنو آصف۔ ابھی ہے سنتھ اور اپالو پر محبت کی اوّلین سرشاری طاری تھی کہ ہے سنتھ مر گیا۔ یہ بتاؤ جب محبت کا نشہ چڑھا ہو تب موت کا حادثہ ہو تو المیہ زیادہ ہے کہ محبت کا نشہ اُتر جانے پر؟ ——— یعنی دونوں میں سے کون سا بڑا المیہ ہے ——"

نیل کے پانی گنبد کی گونج بن کر میرے طرف بڑھے آ رہے تھے۔ میں جلدی سے اُٹھا اور اس کی کرسی پر جھک کر بولا۔

"میری آخری شام ہے پردیس میں ——— اسے یوں مضمحل نہ کرو ——— آؤ بازار چلیں ——"

وہ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولی ——— "تمہی کہا کرتے ہو کہ مشرق کے لوگ دل کے معاملے بہتر سمجھتے ہیں۔"

میں اس کے طعنے کا متوقع تھا، بیزار کھا کر بیٹھ گیا۔ اور وہ بولتی چلی گئی۔ "ہے سنتھ کی قبر پر اپالو کے اتنے آنسو گرے کہ ——— دن قبر سے ایک پودے نے سر نکالا۔ ہرے ہرے اس میں شاخیں نکل آئیں اور پھر ایک پھول کھلا۔ ارغوانی رنگ کا ——— ہے سنتھ کا پھول ——— جب اپنے دیس لوٹ جاؤ تو یاد رکھنا کہ آنڈا کو ہے سنتھ کے پھولوں سے عشق تھا ——"

میں نیل کے پانیوں میں جھلملاتی بتیوں کا رقص دیکھنے لگا ——— ارغوانی بتیاں ——— آسمانی بتیاں ——— گڈمڈ پھولوں ——— نظاریں۔ آنڈا نے ایک چھوٹی سی سسکی لی۔ سینے کے پہلو کی ہڈیوں میں ایک چھوٹا سا زلزلہ آیا اور وہ میرے کندھوں پر ——— ہاتھ رکھ کر بولی۔ "جانتے ہو ہے سنتھ کی پنکھڑیوں پر کیا لکھا ہوتا ہے؟ ——— جانتے ہو آصف؟"

"نہیں ——"

اُس کے ہاتھوں کا دباؤ شکنجے کی طرح بوجھل بھی تھا اور آسمان میں تیرنے والے پَر کی مانند ہلکا بھی ———

یہ سنتھ پچپاشے کا پھول ہے محبت کا مدفن ہے۔ اس سے جُدائی کی خوشبو آتی ہے اس میں تمناؤں کا لہو جھلملاتا ہے۔ اس کی ہر پنکھڑی پر لکھا ہوتا ہے افسوس ——— صد افسوس ———"

اُس کی آنکھوں سے دو چھوٹے سے آنسو پھسلاتے ہوئے مجھ پر آن گرے۔

"جب میں پاکستان آؤں گی تو مجھے تاج محل دکھاؤ گے ناں!"

میں نے اس کے گریبان میں لٹکی ہوئی صلیب کو چھو کر کہا۔ "تاج محل ہندوستان میں ہے آنڈرا ——— تمہیں اپنا ہمسفر بدلنا پڑے گا بارڈر پر ———"

آنڈرا نے اب تک ضرور اپنا ہمسفر تلاش کر لیا ہو گا زری ——— یہ تم ہی تھیں کہ جس میں سفرِ حیات کا حوصلہ نہ تھا۔ ورنہ راستہ چاہے جاں گسل ہی سہی لیکن اس راہ میں اور آبلہ پا بھی چلتے ہیں۔ آنڈرا کا میری زندگی سے ایسا ہی تعلق تھا۔ جیسے بچوں کی نصابی کتابوں میں رنگین تصویروں کا وجود۔ ان تصویروں کا تعلق اصل متن سے ضمنی ہوتا ہے اسی طرح آنڈرا میری زندگی میں آئی اور چلی گئی۔ ایک طرح سے تو ماہ رُخ بھی میری زندگی میں اصلی متن نہیں ہے۔

جب بھی بارش آتی ہے زری اور بوندیں گرم مٹی سے لپٹ کر سوندھی خوشبو میں بھیگ جاتی ہیں۔ میں ہمیشہ تم کو یاد کرتا ہوں۔ تم اس خوشبو کی طرح تھیں۔ انوکھی انجان ——— گرم اور سرد کے باہم اتصال کی خوبصورت دلیل۔ آج شام سے بادل چھائے ہیں بجلی ان سیاہ بادلوں میں گھبرائی پھرتی ہے۔ پہلے آسمان پر ایک سفید چادر لہرائی۔ پھر مشرق کی جانب سے اودی نیلی سیاہ سارنگیوں کے تھان اُڑ اُڑ کر آنے لگے۔ اور بہت جلد ان کپڑے کے تھانوں نے غفت اُودی تنبو کی شکل اختیار کر لی۔ اس تنبو کی طنابیں ابھی ٹھیک طور پر کسی بھی نہ گئی تھیں کہ جابجا غفت کپڑے میں شگاف آ گئے۔ مینہ اس طرح برسا جیسے رکھیل عورت بیکہ یاد کر کے رو دے۔ بارش کو دیکھ کر تمہاری یاد کا گھٹا ٹوپ اندھیرا میرے چاروں طرف چھانے لگا۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ مٹی کے گرم وجود سے لپٹی ہوئی ٹھنڈی بوندوں کی خوشبو اٹھی ——— کچھ لوگ کم ظرف اور چھیلے ہوتے ہیں۔ ان میں محبت کا مشکیزہ جب غٹ غٹ انجیں گرتا ہے تو عموماً ان کا وجود گڈی کا غذ کی طرح پھٹ جاتا ہے۔ کچھ کے لیے محبت بپھرنے اور اُترنے کا موقع ہوتا ہے! اُپچی بنے ہوا میں تلواریں مارتے ہیں۔ کچھ طفل زادے محبت کے نذرانے ٹھوکریں مار مار کر کچے گھڑے کی طرح بے قعت کر دیتے ہیں۔

ایسے ہی فرعونوں میں میرا شمار بھی تھا ——— لیکن ماہ رُخ سے ملنے کے بعد نہیں۔ اس وقت مجھے محبت اور محبت میں محرومی دونوں کا احساس پوری طرح ہو چکا تھا۔

جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو تمہارے سینے پہ دو لمبی لمبی چوٹیاں تھیں جن میں بل دیے سُرخ ربن گل لالہ کے پھولوں کی طرح دمک رہے تھے۔ تمہارے پیروں میں فلیٹ بوٹ کانوں میں گول سنہری رنگ اور کندھے پر سکول یونیفارم کا سُرخ دوپٹہ تھا تمہارے گال پکے ہوئے سیبوں کی طرح شنگرفی ہو رہے تھے۔ اس سُرخی میں کسی آئرن ٹانک یا غازے کی آمیزش نہ تھی۔ اوپر والے لب پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے تھے۔ یہی پسینہ کسی معمر عورت کی بدصورتی کی وجہ ہو سکتا تھا۔ لیکن تم پر یہ صحت اور تازگی کا انتہا

ھا۔ آنکھوں کے دونوں جانب ننھا سا ریشمی گالوں والا سر ہر کھنچا تھا۔ بھاگتے تیر کی طرح پُر افشاں اور تیز رو۔

یہ عمر عشق و عاشقی کی عمر نہ تھی۔ یہ عمر سوڈا واٹر، آئس کریم اور ریمن ڈراپس کی عمر تھی۔ تم اگر چونگم منہ میں چھوڑتی کر لیے کر بت قیمیں میں لپکاتی ہا ہا کرکے میرے پاس سے گزر جاتیں تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔ لیکن تم آ کر چپ چاپ کھڑی ہو گئیں۔ تم نے نہ بی عمر پر ترس کھایا نہ اس مشکل راہ پر نظر کی جو تم نے اپنے لیے لمحوں میں انتخاب کر لی تھی۔ بس تم پر تو خبط اچھلا ——— اور تم میری محبت میں رفتہ ہو گئیں۔ تمھاری طرف سے یہ پہلی نظر کی محبت تھی۔ اس میں استانی جی سے والہانہ عشق کا دیوانہ پن بھی تھا۔ باپ سے دلی بستگی بھی تھی۔ اور ایک اور چیز بھی تھی جسے صرف تم ہی سمجھتی تھیں۔ جو صرف تمھاری ہی رگ جان تھی۔

"میجر صاحب گھر پر ہیں بی بی ——— ؟"

بی بی کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ڈیڈی نہیں ہیں جی ممی ہیں اندر ———"

"تو انھیں جا کر بتائیے کہ آصف تنویر آیا ہے ——— آصف تنویر ——— یاد رہے گا ———"

"جی آصف تنویر صاحب ——— یاد رہے گا جی ———"

پھر تم جالی کا دروازہ کھول کر اندر بھاگ گئیں۔ گیلری میں تمھارے بھاگنے کی آواز آتی رہی۔ اس عمر میں بھاگنا کتنا فطری اور خوبصورت ہے۔ ہرن کی قلانچوں سے مشابہہ عربی گھوڑے کی جست کی طرح بے خوف۔ چیتے کی طرح سڈول جسم کو فضا میں تولتے ہوئے اٹھنا۔ یہ فلمی بھاگنا نہ تھا۔ ٹپے کھائی گیند کا سا دوڑنا تھا۔ چند ہی لمحوں میں تم واپس بھی آ گئیں۔

"جی اندر آ جائیے ممی بلا رہی ہیں"۔

تم مجھے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ یہ بیٹھک یا دیوان خانہ کم تھا اور میجر اقبال کے شکار کیے ہوئے شیر، چیتے، دنگھوں کا عجائب گھر زیادہ۔ صوفوں پر ہرنوں کی ملائم گندم گوں کھالیں پڑی تھیں۔ آتشدان کے پاس دو چیتے مع اپنے بڑے خونخوار دانتوں اور نارنجی آنکھوں کے سر اٹھائے بیٹھے تھے۔ کارنس پر بارہ سنگھے ٹنگے تھے اُن کے سینگ اخروٹ لکڑی کے بنے نظر آتے تھے۔ جا بجا ہاتھی دانت اور پیتل کا آرائشی سامان سجا تھا۔ سارے کمرے میں کافور ملے چمڑے کی بو تھی۔ تم مجھے کمرے میں بٹھاتے ہی پھر بھاگ گئیں غالباً میں تمھارے رستی پھاندنے کے شغل میں مخل ہوا تھا۔

تمھاری ممی چند لمحے بعد تشریف لائیں۔

وہ پہلے سے بہت زیادہ موٹی اور سانولی ہو چکی تھیں۔ ساتھ ہی انھوں نے نہایت وحشت انگیز قسم کی گلابی لپ اسٹک بمقدار وافر استعمال کر رکھی تھی۔ بغیر آستینوں کی بلاوز اور بڑے بڑے پھولوں والی واش اینڈ ویئر قسم کی ساڑھی میں وہ مجھے ماضی کا بھوت نظر آئیں۔

"ہیلو آصف ——— بھئی بیٹھو بیٹھو ——— ہم تو سوچ رہے تھے کہ تمھیں ڈھونڈ ہی نکالیں گے ایک دن لیکن ان کو تو سوائے شکار کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں ——— زری ——— زری ڈارلنگ ———"

مجھے ابھی مال پر رانا حمید مل گیا تھا۔ اُس سے پتہ چلا کہ اقبال کی تبدیلی لاہور ہو گئی ہے۔ بڑی مشکل سے گھر تلاش کیا اس نے ز گلوب سینما کی طرف کوٹھی بتائی تھی۔ آپ لوگ تو صدر بازار کی طرف رہتے ہیں۔"

"رانا حمید وہیں آئے تھے لیکن وہ کوٹھی مجھے پسند نہیں تھی۔ پانی کا پرو بلم تھا۔ غسلخانوں میں سے نل چھٹے نکلتے تھے رات کے وقت بڑی [illegible] تھی۔ سارے قالین خراب ہو گئے وہاں ——— آپ ابھی تک سیف گارڈ انشورنس میں ہی ہیں ناں ——— ذری ——— ذری ڈارلنگ یہاں آؤ انکل آئے ہیں۔"

"جی ہاں ابھی تک تو ان ہی لوگوں کے ساتھ دانہ پانی بندھا ہے۔"

"شادی؟ ——— ہو گئی کہ ابھی تک؟"

"ابھی تک نہیں ———"

تمہاری ممی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں اور تمہیں آوازیں دینے لگیں۔ تمہاری ممی ایک زمانے میں بڑی خوبصورت عورتوں میں شمار ہوتی تھیں۔ ناک کی کان تھیں۔ نقشہ اور جسم ایسا تھا کہ سارے میس میں ان کا چرچا تھا ہوتا تھا۔ اب وہ ایک بے جان تودے کی طرح سامنے کھڑی کسی اینگلو انڈین بڑھیا کی طرح تمہیں بلا رہی تھیں۔

تم آکر پردوں کے پاس رک گئیں۔

"آجاؤ ذری ڈارلنگ ——— انکل آصف ہیں۔ تم ان سے اپنی Booties پہنا کرتی تھیں۔ پنڈی کے دن بھی خوب تھے۔ ہے نا آصف؟" ممی بولیں۔

"جی ہاں۔ ویسی بے تکلفی کا دور پھر میں کبھی نہیں دیکھا ——— یورپ میں بھی نہیں۔"

"کیسا enjoy کرتے تھے ہم سب ——— یاد ہے آصف؟ ——— وہ ممی کی پکنک یاد ہے تمہیں جس روز ذری قریباً مر ہی چلی تھی۔"

"میری بیوقوفی تھی۔ میں نے اسے تجربے کے طور پر پانی میں اتار دیا تھا ———"

ممی کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں۔

"ذری ڈارلنگ انکل کو کافی تو پلاؤ۔ یہ کیا بچوں کی طرح پردہ پکڑ کر کھڑی ہو جاؤ بیٹھے ———"

تم پھر بھاگ گئیں اور تمہاری ممی مجھے پرانے دنوں کے واقعات یاد دلانے لگیں۔ ایسے واقعات جو بظاہر ہم دونوں کے لیے بالکل غیر اہم تھے۔

یہ میری تمہاری پہلی ملاقات تھی۔ اسی ملاقات میں کیوپڈ دیوتا نے تمہیں منتخب کر کے تمہاری دستار بندی کر دی تھی۔ تمہارے لیے یہ ملاقات حرزِ جان تھی۔ اس ملاقات کو تم نے ہیرے جڑی انگوٹھی کی طرح بار بار پرکھا۔ ہر سمت سے دیکھا۔ قریب سے دُور سے۔ اس کی چمک میں تمہیں دھنک کے سارے رنگ نظر آنے لگے۔ تمہارے لڑکپن کی فصیل میں یہ پہلی دراڑ تھی۔ اس ملاقات کے بعد جب بھی میں تمہاری طرف گیا۔ تمہاری خوشی دیکھ کر مجھے ایک دن بھی شبہات نے نہ گھیرا کیونکہ میں تو تمہیں اپنے ہاتھوں

جُوتے پہنا چکا تھا۔ تمہیں سائیکل کی سیر کرانا اور تمہاری چوٹیوں میں ربن ٹانکنا بقول تمہاری ممی ایک زمانے میں میرا محبوب مشغلہ رہا تھا۔ میں تمہاری خوشی کی اصل وجہ کبھی بھی جان نہ پاتا۔ اگر اچانک ایک دن تمہاری میری ڈرامائی ملاقات نہ ہو جاتی۔

زاہد گھر پر نہیں تھا۔ تمہاری ممی اپنی کسی دوست کے ساتھ شاپنگ کو گئی ہوئی تھیں۔ تم اپنے گیتوں کی کاپی لیے اکیلی آتشدان کے پاس بیٹھی تھیں۔

"ڈیڈی کہاں ہیں بیبی ؟"

"مرغابیوں کے شکار پر گئے ہیں جی ـــــ" تم نے یک دم کاپی کو پشت کی جانب چھپا لیا۔

"اور ممی کہاں ہیں بیبی ؟"

"آپ جی مجھے بے بی نہ کہا کریں۔"

"کیوں ! ـــــ"

تم نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا ـــــ "کیونکہ جی ـــــ کیونکہ ـــــ بس جی آپ مجھے بے بی نہ کہا کریں۔"

حکمت عملی کے خلاف جو حرکت مجھ سے اس وقت ہوئی وہ ناقابلِ معافی ہے میں نے تمہیں قد آور بچہ سمجھ کر تمہارا بازو پکڑا اور تمہیں صوفے پر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"پتہ ہے تم بہت تنگ کیا کرتی تھیں مجھے پنڈی میں۔ کیا بات ہے زری ! تم کانپ کیوں رہی ہو ؟"

میرا بازو تمہارے کندھوں کے گرد حائل تھا اور تم ڈری ہوئی کبوتری کی طرح لرز رہی تھیں۔

"کیا بات ہے زری، بخار تو نہیں کہیں ؟ ـــــ" میں نے انگریزی میں سوال کیا۔ تم خاموش رہیں۔

"تم ٹھیک تو ہو زری ـــــ"

تم نے اٹھنے کی کوشش کی تو تمہارے ہاتھ سے گیتوں کی کاپی پھسل کر قالین پر جا گری۔ دانت نکالے چیتے سے ایک فٹ اِدھر۔ میں نے اسے ہرگز کھولنے اور پڑھنے کی نیت سے نہ اٹھایا تھا۔ لیکن کاپی کچھ اس انداز سے منہ کے بل گری تھی کہ پہلے صفحے پر بنا ہوا پان کے پتے جیسا دل جگر جگر چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس دل کو اٹھا لیا۔ دل کے وسط میں ایک لمبا سا تیر کھنچا تھا۔ جس سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹ کر صفحے پر بکھری پڑی تھی۔ اوپر انگریزی میں رقم تھا ـــــ "الف کے لیے جو نہیں جانتا ـــــ" اس تصویر کے گرد ارغوانی آسمانی پھولوں کی جھالر بنی تھی۔ ـــــ بے شکوہ کے پھولوں کا حاشیہ۔

تم خوفزدہ کھڑی تھیں اور میں احمق پن سے بار بار پوچھ رہا تھا۔ "یہ الف سے کس کا نام شروع ہوتا ہے زری ڈارلنگ ؟"

تم نے منہ پھیر لیا اور آہستہ سے بولیں "اسے نہ دیکھیے پلیز ـــــ پلیز ـــــ"

میں نے صفحوں کو بڑی بے دردی سے الٹنا شروع کر دیا۔ "بیوقوف انکل سے شرمایا نہیں کرتے۔ انکل تو راز دار ہوتے ہیں اتنا ـــــ ہم کوئی ممی کو بتا دیں گے تھوڑا ہی۔"

تمہاری کجلائی آنکھوں میں آنسوؤں کا تریڑا پھیلنے لگا۔ میں نے اسے اپنی بے وقوفی سے نہ سمجھا اور کاپی کو بے توجہی سے دیکھنے لگا۔ یہ تو ایک کیلا بم تھا جس میں شرم و حیا والے عاشق بستے تھے۔ دُنیا سے چھُپ کر محبت کرتے تھے اور اس محبت کو سب سے چھپائے رکھتے تھے۔ سارے گیت انگریزی میں تھے۔ ہر گیت کے اوپر ایک ہی جُملہ لکھا تھا ——— "الف سے مخاطب ہو کر ———"

"پلیز میری سونگ بک واپس کر دیجیے پلیز ———"

اگر مجھے لمحے بھر کے لیے بھی احساس ہوتا کہ میرا نام الف سے شروع ہوتا ہے تو شاید میں بہت جلد تمہاری کتاب لوٹا کر گھر چل دیتا۔ لیکن میں تو پورے دو سیٹ ٹینس کے کھیل کر آ رہا تھا۔ میرا سارا وجود ٹپہ کھائی گیند کی طرح کھلنڈرا ہو رہا تھا۔

"پلیز ———"

یکدم میری نگاہ ایک صفحے پر رُک گئی۔ اُوپر بار بار لکھا تھا۔ شاید کبھی ——— شاید کبھی۔ نیچے کوئنٹ مارکہ مخصوص لکھائی میں نظم مرقوم تھی۔

الف ——— شاید کبھی تمہیں میرا خیال آئے ؟

تنہائی میں

شاید جس کا آج تمہیں انتظار ہے وہ بے وفا نکلے

شاید؟

تم آہیں بھرو اور دست بدعا ہو

میرے لیے ——— شاید

کون جانے میں لوٹ کر آ بھی نہ سکوں ؟"

نظم نے مجھ سے بولی مار کر ساری ہوا نکال دی۔

"یہ الف کون ہے زری ؟ ——— کون ہے یہ ؟ ———"

لیکن تمہارے چہرے پر موٹے موٹے آنسو برس رہے تھے۔ فلمی آنسو نہیں بلکہ وہ آنسو جو بڑی شدت سے حلق میں بھی اترا کرتے ہیں۔

"آئی ایم سوری بے بی ڈارلنگ خدا قسم ———۔ لو اپنی سونگ بک ——— یہ لو۔ میں تمہارا راز نہیں جاننا چاہتا ——— پلیز بے بی ———"

میں نے تمہیں چپ کرانے کی نیت سے تمہارا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اگر چانکیہ زندہ ہوتا تو وہ دست بستہ عرض کرتا کہ مہاراج ایسی کنیا کو سینے سے لگانا حکمت عملی کے خلاف ہے۔ یہ سراندیپ کی سروپ نکھا ہے۔ کام دیو کی بانی پر ننگے پیر آنے

دل۔ ایسی کتھا کی ٹانگ اوّل تو ہوتی ہی نہیں اور جو باقی رہ بھی جائے تو اسے کاٹ لینا ہی بہتر ہے۔ حکمت عملی کی دوسری غلطی کر چکنے کے بعد ——— بہت بعد مجھے احساس ہوا کہ اگر مجھے الف کا نام معلوم نہ ہوتا تو اس میں ہم دونوں کی بہتری ہوتی۔

اس واقعے کے بعد کئی روز تک میں تمہارے گھر نہ گیا۔ دل میں ایک انجانا سا خوف تھا۔ گو بظاہر اس خوف کی کوئی وجہ نہ تھی۔ تم نے اپنے منہ سے کچھ نہ کہا تھا۔ لیکن میرے دل کے ٹیلی پرنٹر پر مسلسل یہی خبر پہنچ رہی تھی کہ حذر کرو — — بچ جاؤ۔ آگے خطرہ ہے۔ زیرو آور ہے۔ یہ جگہ بیمہ کمپنی کے منیجر کے لیے بارود خانے سے کم نہیں۔ تمہارا کارڈ مکمل نہیں حذر کرو ——— بچ جاؤ۔

جب سے یہ پرچہ دل کو لگا تھا میں نے چھاؤنی کا رُخ کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اچانک ایک دن مجھے دفتر میں نواز کا فون آگیا۔

"ابھی اسی وقت گھر پہنچو۔ میں چولستان سے تین چیتل اور دو ہرن ٹلے مار کر لایا ہوں ———"

میں نے کام کا عذر پیش کرنا چاہا تو انہوں نے دھمکی دی ——— "سنو اگر آدھ گھنٹے میں نہ پہنچے تو ہم خود تمہیں لینے آ جائیں گے ——— خدا حافظ۔"

پیشتر اس کے کہ میں کوئی معقول بہانہ تراش سکتا فون ادھر سے بند ہو چکا تھا۔ میں عجب گھمبیرے میں پڑ گیا تھا۔ نہ تو جانے پر طبیعت آمادہ ہوتی تھی نہ ٹھہرنے کی جا تھی۔ ہموار زندگی میں یہ نیا شاخسانہ پیدا ہو گیا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد جب میں بالآخر وہاں پہنچا۔ تو تمہارے ممی اور ڈیڈی برآمدے میں بیٹھے تھے۔ حسب عادت نواز پائپ پی رہا تھا۔ چہرے پر بڑی بشاش مسکراہٹ تھی۔ ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ دھرے اوپر والی ٹانگ بڑے تواتر سے ہلائے جا رہا تھا۔ ممی کی کرسی سے چند قدم پرے ہرن اور چیتل پڑے تھے۔ اور ان کے پیٹ گولیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ممی ایک چھوٹا سا رومال لیے ناک کریدنے میں مشغول تھیں۔

"ہیلو بینک مین ——— کمال ہے ادھر کا چکر ہی نہیں لگاتے تم۔" اقبال نے اپنی کرسی سے اچھل کر کہا۔

تمہاری ممی نے پہلے تمہیں آواز دی اور پھر رومال سے ناک صاف کرتے ہوئے بولیں۔ "ہم تو تمہارے ہوٹل آ رہے تھے ہرن لے کر۔ پھر نواز کہنے لگے یہ ہرن اس کے کس کام؟ وہ تو ہوٹل میں رہتا ہے۔"

تم باہر آئیں تو میں نے محسوس کیا کہ تمہارا چہرہ ہسپانوی لیموں کی طرح زرد ہو چکا ہے۔ سُرخ ربن فلیٹ بوٹ اور یونیفارم کے باوجود تمہاری آنکھیں باب المندب بن چکی ہیں۔ تم میں ایک ایسی بیاہی ہوئی عورت کا سروپ تھا جس کا شوہر اُسے پہلی رات چھوڑ گیا ہو۔

"نوری نہایت اعلیٰ کباب بناتی ہے آصف ——— انکل کو سلام کرو نوری ڈارلنگ۔"

تم مقدس کبوتر جیسا سفید ہاتھ اٹھا کر پیشانی کی طرف لے گئیں۔

"یہ تو آپ کو بہت یاد کرتی ہے آصف۔ ابھی کل ہی کہہ رہی تھی اب تو انکل کبھی آتے ہی نہیں۔ میں نے جواب

دیا تمھارے ڈیڈی چولستان گئے ہیں۔ وہ بھلا کس سے ملنے آئیں؟"

میں نے تمھاری جانب دیکھا۔ تمھارے ہونٹوں میں ضبط کیے ہوئے آنسوؤں کی کپکپاہٹ تھی۔ آنکھوں میں میری بے وقوفی اور اپنی کم نصیبی کا گلا تھا۔ ان آنکھوں میں ایک پوری داستان تھی۔ شہر پر پسپائی کی تباہی کی داستان —— میں نے اس کی جذباتی زبان بظاہر نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ " زری تو ہم سے بولتی ہی نہیں۔ ہم کس سے ملنے آئیں بھلا ——"

اپنے غلط جواب پر پشیمان ہو کر میں نے فوراً ہی باتوں کا رُخ پلٹ دیا —— " اچھا یہ بتاؤ کہاں کہاں شکار کرنے گئے؟"

" پہلے تو گئے بہاولپور —— وہاں نواب صاحب کے مقربین میں سے ایک حضرت ساتھ تھے۔ بڑا اسانشنی شکار کھیلا۔ بالکل پرفیکٹ دیلیزین کر۔ شکار کم اور ضیافتیں زیادہ ہوئیں۔ پھر چار دن چولستان میں رہے۔ ونڈرفل —— سنہری —— سمندر —— پہاڑ اور ریگستان —— یہ تینوں اللہ نے اس لیے بنائے ہیں کہ جب انسان زیادہ اترانے لگے تو انھیں دیکھ کر اپنی اصلیت کو پہچانے۔"

" کافی پئیں گے آپ ——" ممی نے سوال کیا۔

اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر زری کو آرڈر لگا دیا " جاؤ زری انکل کے لیے کافی لاؤ۔ چیز اور ویفرز بھی لانا ——"

فواز اپنی ترنگ میں بولتا گیا۔ " یار چولستان خوبصورت ہے بہت ہی خوبصورت۔ خاص کر چاندنی میں۔ لیکن وہ سندربن والی بات کہاں؟"

تمھاری ممی نے گہرے فیروزی رنگ کا آنچل کندھے پر گھسیٹ کر کہا۔ " توبہ توبہ سیمن سنگھ میں یہ اس قدر خوش تھے آصف کہ کیا بتاؤں۔ صبح صبح آدھی درجن کیلے کھاتے۔ رات کو دو چار اناس اور شام کے وقت کچے ڈاب۔ ان کا بس چلتا تو کبھی لوٹ کر مغربی پاکستان نہ آتے۔"

" میری زندگی کے چار بہترین سال میمن سنگھ میں گزرے ہیں۔ وہ شکار ہے وہاں یار وہ شکار ہے وہاں کہ انسان شکار کرتا ہی نہیں کرسکتا۔ کارتوس ختم ہو جاتے ہیں لیکن شکار ختم نہیں ہوتا۔ میلوں پھیلا سبزہ —— جھیلیں بھرے کروں بیوٹی ہے کوئی جنگل لائف ہے مائی گوڈ! ونڈرفل —— ونڈرفل —— لیکن یہ تمھاری بھابی بہت بور ہوئیں وہاں۔"

تمھاری سانولی ممی نے فوراً کہا —— " توبہ میرا تو رنگ سنولا گیا تھا وہاں۔ سال دو اور رہتی تو بالکل کالی ہو جاتی۔"

" میں تو ریٹائر ہو کر وہیں چلا جاؤں گا یا گھنا میں کاٹج بنالوں گا۔ یا چندر گونا میں جھونپڑی ڈال لوں گا —— میمن سنگھ اب ذرا sophisticated ہو چلا ہے۔"

" چاٹگام بہتر ہے ——" ممی بولیں —— " ہم لوگ بھی چھٹیوں میں آجایا کریں گے۔"

" کہیں بھی ہو رہوں گا مشرقی پاکستان میں۔ یار آصف اس قدر سادہ زندگی ہے ان لوگوں کی۔ ایسی سادہ زندگی کہ انسان عبرت پکڑتا ہے ہر گھر کے آگے ایک کول بھی ہوتا ہے چھوٹا سا۔ سارا خاندان اس میں تین چار بار نہاتا ہے۔ باتھ روم کا خرچ صفر بارہ روپے کی فرسٹ کلاس صوتی آتی ہے —— ایک بہن لی ایک دھولی۔ پیروں میں کھڑاویں۔ سونے کو سیتل پاٹی۔ کھانے کو

پھل بہاتت۔ نہ انہیں کوئی کراکری چاہیے نہ قالین درکار ہیں۔ نہ الیکٹرک گرڈ نہ۔ سبحان اللہ کیا زندگی ہے۔ شیر کی طرح آزاد ——
پھرتے ہیں جنوں میں۔"

"توبہ میں بھی کیسی۔ بہشت کا نمونہ ہی بنا دیا مشرقی پاکستان کو۔"

"میں کیسے کروں؟ میں نے ایک بار ڈابھ پی لی۔ اُس نے سوم رس پی لیا۔ یار آصف کیا لذت ہے کچے ناریل میں سبحان اللہ ولذرفل ——— کبھی گئے ہو مشرقی پاکستان ———"

"جاتا ہی رہتا ہوں ——"

"پھر کیسی جگہ ہے؟ ———"

"تفریح کے لیے نہایت اعلیٰ ہے ———"

"بالکل ٹھیک بالکل ٹھیک ———" ممی چہکی۔

"——————— تم لوگ جنت میں بھی صرف تفریح کے لیے جاؤ گے ———"

اتنے میں تم کافی لے کر آگئیں۔ اخروٹ کی لکڑی کے بڑے بڑے ٹرے میں۔ تم میرے پاس بیٹھ کر کافی بنانے لگیں۔ جب بھی تم میری طرف نگاہ کرتیں تو مجھ سے جملے کے سب بل نکل جاتے۔ مجھے سلسلۂ کلام میں لڑی جوڑنا مشکل ہو جاتا۔ کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر سمجھا رہی تھی کہ مجھے جلد گھر لوٹ جانا چاہیے۔ لیکن نواز ہر قسم کے کارتوس' بندوقوں کی قسمیں' مچان باندھنے کے طریقے' جانوروں کی شکاری سے بچنے کی گھاتیں' آدھی رات' پچھلے پہر اور دوپہر کے شکار کے فوائد اور نقصانات پر سیر حاصل بحث کرتا رہا۔ یک طرفہ بحث جس میں میری شمولیت برائے نام اور تمہاری ممی براہِ صحبت بازی شامل رہیں۔ تم کونے میں کتابیں لیے بیٹھی رہی۔ گو کئی بار تمہاری ممی نے تمہیں سو جانے کو کہا لیکن تم نے سنی ان سنی کر دی۔

عجب بات ہے کہ گو مجھے تمہارے دلی جذبات کا اندازہ ہو چکا تھا پھر بھی میں اپنے آپ کو سمجھاتا تھا کہ یہ میری خود ستائی ہے کبھی اس قدر پیاری بچی کو عشق ہو سکتا ہے؟ یہ سب کینوں کی جھوٹی کھیل ہے کہ بازی ہار جانے پر سب کھلاڑی اپنے اپنے پیچھے واپس سے کر ہنسی خوشی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے ——— مجھ ازکل نما انسان سے ایسی محبت؟ ——— اور پھر وہ بھی اتنی کم عمر معصوم لڑکی کرے؟ توبہ توبہ۔

اس روز کے بعد میں نے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو گا میں تمہارے گھر نہیں جاؤں گا۔ لیکن ایک انشورنس کے سلسلے میں مجھے ایک ایسے گھر جانا پڑا جہاں میرے عزم کو توڑنے والی تمہاری ممی موجود تھیں۔ انھوں نے میرے ہر عذر کو پسِ پشت ڈال دیا اور پھر مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ آخری بات جو انھوں نے کی اُس کے بعد انکار کی گنجائش نہ تھی وہ بولیں "میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔ صرف مجھے گھر پہنچا آؤ' اترنا نہ اترنا تمہاری مرضی ———"

اور جس وقت میں نے کار پورچ میں کھڑی کی وہ فرسے اُتریں اور نواز کو فون کرنے چلی گئیں۔ میرا ارادہ اندر جانے کا نہ تھا۔ بس صرف تمہاری ممی کو تکلفاً خدا حافظ کہنے کے لیے رُک گیا تھا۔ لان کے ایک گوشے میں رنگین لوہے سے بنی ہوئی کرسیاں

پڑھی تھیں۔ میز پر تمہاری کتابیں پڑی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا جیسے تم ابھی پڑھتی اٹھ کر گئی ہو۔ میں وقت کشی کے طور پر ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ تمہاری انگریزی کی لکھائی اچھی تھی لیکن اُردو کے حروف ناپختہ اور بچگانہ تھے۔ رف کاپی میں ایک مضمون بہار پر ایک رخصتی کی عرضی اور چھوٹے چھوٹے پیروں کو اختصار سے لکھنے کی مشق کی گئی تھی۔ جا بجا میرا نام لکھ کر اس طرح پنسل سے کاٹا گیا تھا کہ بمشکل پڑھا جاتا تھا۔ میرا دل خوف سے لرزنے لگا۔ آسمان پر جب طیارے زناٹے سے گزرتے ہوں تو گھر کی کمزور کھڑکیاں دروازے اسی طرح لرزا کرتے ہیں۔ اسی کاپی کے آخری صفحے کو پنسل سے کاٹ کاٹ کر سیاہ کیا ہوا تھا۔ میرے دل نے گوشمالی کی لیکن تجسس نے حروف کو شناخت کیے بغیر نہ چھوڑا۔ صفحے کے ایک کونے میں حروف ابھی اچھی طرح مٹائے نہ گئے تھے۔ اوپر میرا نام لکھا ہوا تھا۔ نیچے تمہارے نام کے انگریزی میں ہجے کیے گئے تھے۔ جو حروف دونوں ناموں میں موجود تھے انھیں بعد ازاں کاٹ کر محبت اور نفرت کا پڑتا لگایا گیا تھا اس عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ تمہیں مجھ سے محبت اور مجھے تم سے نفرت ہے۔ تم نے یہ نتیجہ بدلنے کے لیے سارا صفحہ سیاہ کر رکھا تھا ——— میں تمہیں کیا سمجھاتا نذری کہ جب نصیب کا پارا ڈوب جاتا ہے تو کوئی تسخیر عمل کام نہیں آتا۔ میں تمہیں کیا بتاتا کہ محبت تو امر بیل ہے ——— جس درخت پر یہ بیل چڑھ جاتی ہے وہ پیڑ سوکھ جاتا ہے۔ اور ایک دن آپ ہی آپ گر جاتا ہے میں تمہیں کیا سمجھاتا کہ محبت کی امر بیل میں کبھی کسی قسم کے پھول نہیں لگتے اس بیل میں تو ہمیشہ بے سمتی کے شگوفے کھلتے ہیں ——— پشیمانی کے۔ زعفرانی پچھتاووں تاسف کے آسمانی پھول۔

میں تم سے ملے بغیر تمہاری ممی کو فون کرنا چھوڑ کر فوراً ہی چلا گیا۔ کئی گھنٹے ہوٹل کے ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں کروٹیں لینے کے باوجود مجھے ٹھنڈے پسینے آتے رہے۔ کٹے پھٹے حروف ——— ایل او وی ای سے بھری ہوئی کاپی۔ ذرا سی برآمدے میں آہٹ ہوتی تو میں چوکنے جانور کی طرح اٹھ بیٹھتا اور آہٹ پر کان دھر کر سوچتا کہیں یہ نذری نہ ہو ——— کہیں اس کے دماغ کی ڈھبریاں اس قدر ڈھیلی نہ پڑ گئی ہوں کہ وہ یہاں تک آ گئی ہو۔ پھر جی کو تسلی دیتا کہ اول تو وہ میرے ہوٹل کا رستہ نہیں جانتی ہوگی اور پھر اتنی چھوٹی عمر میں اتنی جرأت کہاں سے آ جائے گی۔ مجھے بھی ہالی ووڈ کا کوئی ایکٹر سمجھ کر محبت کرنے بیٹھ گئی ہے۔ چند روز ملیریا بخار جیسی تھرتھری چھوٹے گی پھر آپ ہی آپ ٹھنڈا نارمل پڑ جائے گا۔

اب میں نے پھر پکا عہد کر لیا تھا کہ تمہارے گھر کسی قیمت پر بھی نہ جاؤں گا۔ اور تو اور میں یہاں تک سوچنے لگا تھا کہ اپنی تبدیلی کہہ سن کر کراچی کروا لوں تاکہ اس دھندے سے جان چھوٹ جائے۔ اس شام میں نہا کر غسل خانے سے نکلا تو مجھے برآمدے میں چوڑیوں کے چھنکنے کی آواز آئی۔ پھر یوں لگا جیسے کسی نے میرے کمرے کا کنڈا کھولنے کی کوشش کی ہو۔ میں نے کنوتیاں اٹھا کر پوچھا ——— "کون ہے؟" ابھی میں قمیص پہن ہی رہا تھا کہ تم دروازہ کھول کر اندر آ گئیں۔ میں کلر زدہ زمین کی طرح سفید پڑ گیا۔

وہی سینے پر دو چوٹیاں اور چوٹیوں کے سروں پر سرخ گڑہل کے پھول۔ ملتے کی سفید شلوار قمیص اور کندھے پر سفید دوپٹہ ——— ہاں ایک بات خلاف معمول تھی۔ تمہارے دونوں ہاتھوں میں آج کانچ کی چوڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

"نذری ——— ہیلو بے بی تم یہاں کیسے؟ ———"

لمحہ بھر کو مجھے وہم ہوا کہ شاید تمہارے والدین نیچے کھڑے ہوں اور انھوں نے محض مجھے چونکانے کی خاطر پہلے تمہیں بھیج دیا ہو۔ میں اس وہم پر بھروسہ کر کے جلدی سے برآمدے تک گیا اور نیچے جھانکنے لگا۔ ایک بجری سی زرد اور سیاہ ٹیکسی چھاٹک سے نکل رہی تھی۔ لان —— پورچ اور پکی سڑک تک تمہارے والدین جیسا کوئی بھی شخص موجود نہ تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے واپس آیا اور پہلی بار میں نے تمہارے چہرے کی طرف دیکھنے کی جرأت کی۔ تمہاری آنکھیں زیادہ رو لینے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ ہونٹ اور ناک کی پھننگ یاقوت رنگ کی تھی۔ اور تم چھوٹے سے رومال کی گدی بنا رہی تھی۔

"کیا بات ہے زری؟ ممی ڈیڈی کہاں ہیں؟"

تم چپ چاپ کھڑی رومال کا گولا بنانے میں مصروف رہیں۔

"بات کیا ہے کچھ بولو ناں ——" میں نے انگریزی میں سوال کیا۔

"میں اکیلی آئی ہوں جی"

جیسے سارا ہوٹل میرے پیروں تلے سے نکل گیا۔

"کیوں —— ؟ کیوں بیٹے ؟ ——"

میں بیٹے لفظ کا قفل ڈال کر تمہارے جذباتی وجود کو مقید کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا اثر اُلٹا ہوا۔ آنسوؤں کی چمک پھر سے آنکھوں میں پیدا ہو گئی اور تم نے تھوک نگلتے ہوئے کہا —— "آپ مجھ سے ناراض ہیں جی؟ ——"

"نہیں نہیں نہیں —— ہرگز نہیں —— توبہ ہرگز نہیں۔ یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟ ——"

بھر پل میں ایک سے وزن کے آنسو تمہارے گالوں پر بہنے لگے

"پھر بھی آپ ہمارے گھر کیوں نہیں آتے؟"

"آؤں گا —— کبھی ضرور آؤں گا۔ انشاءاللہ What a silly girl"

تم نے رومال کا گیند کھولا اور اُسے ہونٹوں پر رکھ کر بولیں۔ "میں تو سمجھی آپ کبھی نہیں آئیں گے۔"

"چلو بے بی —— چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔ کم آن ڈارلنگ۔"

تم دو قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ "آپ مجھے ڈارلنگ نہ کہا کریں۔ ڈیڈی کی طرح ——"

میں نے کار کی چابی میز پر سے اٹھائی اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "چلو گھر چلیں ——"

"میں اکیلی چلی جاؤں گی —— میری ایک سہیلی گیٹ پر کھڑی ہے میں اُس کے ساتھ جاؤں گی۔"

یکدم مجھے احساس ہوا کہ پہلی بار جھجک مٹ جانے پر شاید تم دوبارہ سہ بارہ اور پھر تواتر سے یہاں آنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کرو۔ یوں تن تنہا ہوٹل کے ایک بیچلر روم میں آنا میرے اُن سفارتی مراسم کو تباہ کر سکتا تھا جو میرے تمہارے خاندان سے تھے۔ میں تمہیں بدنامی سے اپنے آپ سے اور سب سے زیادہ تمہارے اپنے نوشگفتہ ضمیر کی زد و کوب سے بچانا چاہتا تھا۔

"بے بی اگر تم مجھ سے ایک وعدہ کرو تو پھر میں تمہارے گھر آؤں گا ———"

مجھے علم تھا کہ اس عمر میں وعدے کا بڑا پاس ہوا کرتا ہے۔

"جی؟ ——— ضرور ———"

"تم یہاں کبھی نہیں آؤ گی ——— کبھی نہیں۔ سمجھیں؟"

تم نے آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا ——— "کیوں جی؟"

"اس لیے کہ ——— کہ میں تمہارا یہاں آنا پسند نہیں کرتا۔ اس لیے کہ تمہارے ڈیڈی کو اگر علم ہو گیا تو وہ بھی ناخوش ہوں گے۔"

تم نے لب کاٹا اور نظریں جھکائیں۔

"دیکھو زری ابھی تم بہت چھوٹی ہو ان باتوں کو نہیں سمجھتی۔ تمہیں میری بات ماننا ہو گی ———"

"جی مانوں گی ———"

"وعدہ ہے نا پھر؟"

تم نے اثبات میں سر ہلایا اور اس غیر مشروط وعدے پر تمہارے لبوں نے ایک ہلکی سی سسکی سے مہر لگا دی۔

اس واقعے کے بعد میں مہینے میں ایک آدھ بار تمہارے گھر جانے لگا۔ لیکن کچھ اس التزام سے رہتا کہ تمہیں مجھ سے بات کرنے کا ایک لمحہ بھی نہ ملتا۔ میں تمہارے گھر پہنچنے سے پہلے نواز کو فون کرتا اور اگر وہ گھر پر موجود نہ ہوتا تو پھر میں ادھر کا قصد بھی نہ کرتا۔ جتنی دیر تک نواز گھر پر ٹھہرتا میں بھی قیام کرتا۔ اگر اُسے کہیں جانا ہوتا تو میں بھی فوراً اٹھ جاتا۔ اس احتیاط کی کچھ وجہ تو تمہارا تحفظ تھا اور کچھ اس داخل خارج منظرے میں مہ رُخ کا نزول ہو چکا تھا۔ اس لیے میں تمہارے قرب کا متمنی نہ ہو سکا۔

میرے لیے مہ رُخ بڑی منحوس صورت اور سبز قدم ثابت ہوئی۔ اُس سے ملاقات کے وقت مجھے یہ علم نہ ہو سکا کہ وہ اس طرح میری عنانِ حکومت سنبھال کر میری خوشیوں کے رہوار پر سوار ہو جائے گی۔ مہ رُخ کا اصلی نام امتل المعینظ اور قلمی نام مہ رُخ تھا۔ وہ ایک مشہور اخبار میں عورتوں کا کالم لکھتی تھی۔ اس کالم کے اُوپر روز مہ رُخ کی تصویر چھپتی تھی۔ اور اسی تصویر کے باعث میں نے اُسے پہچان بھی لیا تھا۔ گو تصویر میں جو خیرگی تھی وہ اس کی اصلی صورت میں موجود نہ تھی۔ پھر بھی مجھ پر اس صورت کا اثر ہوتا تھا ہو کر رہا۔

مہ رُخ سے میری ملاقات شالیمار میں ہوئی تھی۔ اکابرینِ شہر چین کے صدر لیو شاؤ چی کو ایک نظر قریب سے دیکھنے کے لیے اس جی داری سے ٹوٹ کر آئے تھے کہ کار پارک کرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ عورتیں پھولوں کی پتیاں پلاسٹک کے لفافوں میں لیے روش کے کنارے بجڑی کھڑی تھیں۔ اس نسوانی دیوارِ چین میں جگہ بنا کر آگے بڑھنا قریب قریب ناممکن تھا۔ میں بھی اِنچ اِنچ آگے کھسکتا بڑھ رہا تھا کہ میری نظر مہ رُخ پر پڑی۔ پہلی نظر میں ہی میں نے اس کالم نگار خاتون کو پہچان لیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لمبی ڈائری اور پنسل تھی۔ وہ اُچک اُچک کر بے قراری سے اِدھر اُدھر چکر لگا رہی تھی۔ اسی بے قراری کے عالم میں وہ گھستی گھساتی لوگوں میں جگہ بناتی مجھ تک آ پہنچی۔ اب اُس سے نانک چندی اینٹوں کی روش تین فٹ کے فاصلے پر تھی۔ اور وہ آسانی سے

صدر یونیورسٹی کے ڈیرشن کر سکتی تھی۔ میں نے قرونِ وسطیٰ کے جانبازوں کی طرح اُس کے لیے جگہ چھوڑتے ہوئے پوچھا ـــــ
"محترمہ! آپ ماہ رُخ ہیں ناں؟"
"جی ـــــ"
"آپ خواتین کا صفحہ لکھتی ہیں؟ ـــــ میرا قیاس درست ہے کیا؟ ـــــ"
دل میں وہ اپنی شہرت پر بہت خوش ہوئی ہوگی لیکن بظاہر چڑ کر بولی ـــــ "آپ کیوں پوچھتے ہیں؟ ـــــ"
"اس لیے کہ اگر واقعی آپ ماہ رُخ ہی ہیں تو میں آپ کی مدد کروں گا۔ آپ کا کالم بہت دلچسپ ہوتا ہے اور اسے مرد زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں۔"

ماہ رُخ کا نام سُن کر چند لڑکیوں نے پلٹ کر دیکھا۔ آپس میں نوٹس ملانے اور کھسر پھسر کرنے لگیں۔ میری تعریف کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ماہ رُخ سے ناز کی کیفیت باقی رہی۔ وہ ہنس کر بولی ـــــ "واقعی؟ ـــــ"
یہ ہنسی میرے حق میں بڑی ناانصاف ثابت ہوئی۔ میں نے ایک ہی وار میں سارے ہتھیار ڈال دیے اور دل کے قلعے کی تمام چابیاں اُسے نذر کر دیں۔
"ادھر آ جائیے میرے سامنے یہاں سے آپ بہتر دیکھ سکیں گی۔"
وہ مجھ سے چھ انچ آگے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اب اُس کے بالوں کی گندھک آمیز خوشبو اور بغیر آستینوں کی قمیص سے اٹھنے والے جسم کی گرمی مجھ تک بلا روک ٹوک پہنچنے لگی۔ اُس نے کوئی نامعلوم فرانسیسی سینٹ استعمال کر رکھا تھا۔ لیکن اس سینٹ پر لائف بوائے سے دُھلے ہوئے جسم کی خوشبو غالب تھی۔

"دراصل آج میں دفتر والوں کے ساتھ نہیں آئی ورنہ مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ وہ سامنے جو آدمی بیٹھا ہے نا ـــــ وہ رنگین چھتریوں تلے ـــــ پریس گیلری میں وہ ہمارا سب ایڈیٹر ہے لیکن میں اُسے بلانا نہیں چاہتی ـــــ" یہ بات اُس نے بےرُخی ہو کر کی اور پھر جیسے اپنے آپ سے بولی۔ "اللہ جانے اگر ظفر نہ ملا تو پھر میں واپس گھر کیسے پہنچوں گی؟ ـــــ"
اُس کے آخری جملے پر ذہن میں پلان بناتے ہوئے میں نے کہا ـــــ "میں سیف گارڈ انشورنس کا زونل مینیجر ہوں۔ آصف تنویر ـــــ"
"میرا اصلی نام اُستیٰ الحفیظ ہے ـــــ سلام علیکم ـــــ"
"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آپ کو گھر پہنچا آؤں گا ـــــ"
میری شوخ چشمی کا جواب اُس نے بڑی بےرُخی سے دیا۔ "جی نہیں شکریہ۔ یہاں ضرور کوئی نہ کوئی واقف مل جائے گا۔"

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ ماہ رُخ کو اس بھرے مجمع میں ایک بھی واقف شخص نہ ملا جو اُسے گھر لے جاتا۔ اور بالآخر جب وہ شام گئے میری کار میں بیٹھی تو اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ میرے ساتھ دفتر تک جائے گی اور وہاں سے تھوڑی دیر بعد اکیلی بس پر

گھر چلی جائے گی۔ میں نے کسی قسم کی حجت بازی نہ کی کیونکہ میرے لیے یہ بھی بارانِ رحمت سے کم نہ تھا۔

مہ رُخ بڑی چمک دار گفتگو کرتی تھی۔ ٹکسال سے نکلے ہوئے چمکدار سکوں کی طرح۔ اس گفتگو میں دلآویز مسکراہٹوں اور کھنک دار قہقہوں کی چھپیاں لگا کر وہ نفسِ مضمون کو بڑا معنی اور دلچسپ بنا لیتی تھی۔ حالانکہ نہ تو اس کی تحریر میں ذہانت تھی اور نہ ہی اس کی کھوپڑی میں فطرت نے معمول سے زیادہ مغز بھرا تھا۔ ایک عام سی سادہ لڑکی جو حسنِ اتفاق سے کالم لکھنے پر مامور ہو گئی تھی۔ اس کالم لکھنے نے اس کی شخصیت میں ایک قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا۔ جیسے کوئی چھوٹے قد کی عورت ایڑھی والی جوتی پہن کر خود اعتمادی محسوس کرتی ہے اسی طرح خواتین کا کالم لکھ کر مہ رُخ مردوں سے بے تکلف بات کرنے میں، گفتگو کا دھارا موڑنے، برجستہ جواب کرا حمق پن کی دلیل بنانے اور خواتین کی سائیکلوجی پر سیر حاصل بحث کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ عورتوں کے مسائل کی وکالت کرتے ہوئے اس کی نظروں میں مردوں کی ذات بالکل بے وقعت ہو کر رہ گئی تھی۔ جب وہ باتیں کرتی تو اس کی باتوں میں قندھاری انار کا کھٹا میٹھا مزہ اور رنگ ہوتا۔ عجیب سی بات ہے کہ سارے دفتر میں اس گفتگو کا کوئی شیدائی نہ تھا۔

مہ رُخ سے ملاقات ہونے کے بعد میں بڑے تواتر سے تمہارے گھر جانے لگا۔ تم کو دیکھ کر اب مجھ پر مراقی کیفیت طاری نہ ہوتی تھی۔ میں تم سے تمہارے جذبے سے خوفزدہ نہ رہا تھا۔ میں نے اپنے جملہ حقوق مہ رُخ کے نام محفوظ کر کے اپنے آپ کو نظرِ بد سے بچانے کا اہتمام کر لیا تھا۔ تمہارے لیے شاید یہی بہت تھا کہ میں نے تمہارے گھر کو یاد تو رکھا کیونکہ تم نے مجھے کبھی بلانے کی کوشش کی اور نہ کبھی مجھے اکیلا پا کر میرے پاس ہی آئیں۔ بس مجھے دیکھ کر تم میں اتنی تبدیلی آتی کہ تمہارا چہرہ دمکنے لگتا۔ جیسے سرِ شام برف آلود چوٹیوں پر شفق کی روشنی پڑ رہی ہو۔ کانسی کے گلدان میں سرخ گلابوں کا عکس پڑ رہا ہو۔ جیسے کوئی بچہ ہتھیلی میں ٹارچ جلا کر اپنی انگلیوں کی نارنجی روشنی دیکھنے لگے ——— تمہاری ہسپانوی لیموں جیسی جلد پر اتنی سرخی کا عود کر آنا بذاتِ خود ایک بہت بڑی علامت تھی ——— لیکن میرے لیے یہ علامت اپنا مطلب کھو چکی تھی۔

مہ رُخ سے شالیمار میں ملنے کے بعد مجھے محسوس ہوا جیسے اتنے برس اتنے قرن میں ایک تیر کی مانند گھومتا رہا ہوں۔ ایک ایسا تیر جس کا ہدف کھو گیا ہو ——— میری ساری زندگی آبشاری تھی۔ شور و غوغا سے پُر ——— بہت ساری عورتیں میری زندگی میں سمندر سے جھاگ کی طرح آئیں اور چلی گئیں۔ مجھ سے ان کا رشتہ سطحی تھا۔ ان عورتوں کی محبت میں جانبین کی کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ نہ ذہنی نہ جسمانی۔ وہ مجھے اور میں انہیں کھیل کود کے شریک سمجھ کر علیحدہ ہوئے تھے۔ کسی سے بھی بچھڑ کر مجھے پامالی، مکمل خستہ حالی کا دورہ نہ پڑا تھا۔ نہ میں نے کبھی شیو بڑھائی تھی۔ نہ خواب آور گولیاں کھائی تھیں اور نہ کبھی دل بہلانے کے لیے شہر چھوڑا تھا۔ لیکن جونہی مہ رُخ کار سے اتری مجھے یوں احساس ہوا جیسے اب میں زندہ نہ بچوں گا۔ اس کی شکل دل پر کندہ ہو گئی تھی۔ اس کی آواز، اس کے قہقہے، اس کی ہنک دل کو تھامے بیٹھی تھی۔ ورنہ میں تو شاید اسی روز کچھ کر بیٹھتا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ دمے کے مریض کی طرح میرا سانس اکھڑ رہا ہے میری ٹانگیں کمزور پڑ چکی ہیں اور میں ——— وہ نہیں رہا جو اب تک تھا۔ مجھ میں حضرتِ عیسیٰ جیسی انکساری ——— کچھوے جیسے سخت جانی ——— فاختہ جیسی ناعاقبت اندیشی اور نہ جانے کیا کیا خاصیتیں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ تبھی ان چند گھنٹوں میں بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ یا بہت زیادہ گھٹ گیا تھا۔ کوئی ایسی قوت تھی جو میرے ماضی کو رگڑ سے مٹا رہی تھی۔

جو میرے مستقبل کو تشکیل دیے بغیر جتنی حروف میں میرے رسالے کا نفسِ مضمون تیار کر رہی تھی۔ میں ساری رات جاگتا رہا۔ میں نے کئی درجن سگریٹیں پھونک ڈالیں۔ کئی بار مسہری لگائی۔ اندر بیٹھا پھر بڑبڑا کر باہر نکلا مسہری اوپر چڑھائی اور پھرنے لگا۔ کوئی صاحب حصا ایسا تھا جب مجھے اونگھ سے جگاتا اور مسز رخ کے خیالوں میں غلطاں کر دیتا۔

میں بے خواب آنکھیں، بوجھل سر اور اجڑا اجڑا سا چہرہ لیے دوسرے دن مسز رخ کے دفتر پہنچا۔ وہ ہاتھ میں پنسل اور ڈائری لیے ایک عینک پوش آدمی سے چیز چیز باتیں کر رہی تھی۔ اس نے میرا رتی بھر نوٹس نہ لیا۔

"مجھے آپ سے کچھ کام تھا ——"

مسز رخ نے مجھے پہچاننے سے قطعی طور پر انکار کرتے ہوئے پوچھا —— "فرمائیے۔"

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں ——"

"جی نہیں میں نے پہچان لیا ہے۔ آپ سیف گارڈ انشورنس کمپنی کے زونل منیجر ہیں۔ تنویر آصف صاحب —— فرمائیے؟"

عینک والے شخص کی باچھیں خواہ مخواہ کھل گئیں اور وہ بڑے اخلاق سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا —— "ظفر —— ں یہاں فوٹو گرافر ہوں۔"

تو یہ ظفر تھا۔ منحنی سا فوٹو گرافر۔ چھوٹی سی فرانسیسی ڈاڑھی اور انتہائی چست بیڈی پتلون میں ملبوس ظفر؟ —— س کے چہرے پر کسی قسم کی ظفر مندی کے آثار نہ تھے۔ بلکہ یوں لگتا تھا جیسے وہ عادتاً یا مصلحتاً بھوکا رہنے کا عادی ہو۔

میں نے اس سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ——" میں نے ازراہِ تکلف کہا۔

"بہت جلد آپ نے یہ بات کہہ دی ہے ——" فوٹو گرافر انگریزی میں بولا۔ یہ بات مسز رخ کے قہقہے کا باعث ئی۔ میرے منہ پر تالا پڑ گیا۔

مسز رخ دیر تک ہنستی رہی اور وہ نیم مسخرہ، نیم فلاسفر، دبلا پتلا ہاتھ ہلاتا چینی چوپ سٹکوں کی طرح ٹانگیں ہلاتا اندر گیا۔

"فرمائیے؟ ——" کچھ دیر کے بعد مسز رخ نے میری خبر لی۔

میں ذاتی طور پر کسی کو انشورنس کے لیے نہ کہتا تھا۔ یہ کام میرے فرائض میں شامل نہیں۔ لیکن اس وقت مسز رخ سے ، سے بہتر تقریبِ ملاقات کا بہانہ میرے پاس نہ تھا۔ میں نے کاروباری لہجے میں کہا "میں حاضر ہوا تھا کہ آپ سے انشورنس لیے کہوں۔ سیف گارڈ انشورنس کمپنی کم سے کم پریمیم پر زیادہ سے زیادہ روپیہ ادا کرتی ہے ——"

مسز رخ کچھ طیش میں آگئی۔ پہلا ہی وار اوچھا پڑا —— "اسی لیے تو میں انشورنس والوں سے گھبراتی ہوں۔ ذرا سی ت بھی ہو تو فوراً انشور ہونے کو کہیں گے۔"

عجیب سی بات اس لمحے ہوئی۔ جونہی اُسے غصّہ آیا میری ہمت عود کر آئی۔ ممکن ہے یہ اُن سالوں کی ریاضت اور صبر کا نتیجہ تھا جب میں لوگوں کو انشورنس کرنے نکلا کرتا تھا ——— وہ بھی ٹیلیفون کی ڈائرکٹری میں سے ایڈریس دیکھ کر۔ اب مجھے حالات کے خاطر خواہ ہونے کا احساس ہونے لگا۔

"ہماری کمپنی عورتوں کی انشورنس نہیں کرتی۔ لیکن میں آپ کو بہت اچھی ٹرمز پر انشورنس دلوا دوں گا۔ [illegible] بھی کم دینا ہوگا اور ———"

"دیکھیے میں انشورنس کروا چکی ہوں ——— تھینک یو۔"

اب مجھے حجّت بازی میں لطف آنے لگا۔

"دیکھیے فی زمانہ انسان جتنی بھی انشورنس کروائے کم ہے زندگی کی مصلحتیں بہت بڑھ چکی ہیں مس رُخ۔"

"آصف صاحب میں ایک ڈیلی اخبار میں کام کرتی ہوں میرا وقت بہت قیمتی ہے پلیز ———"

"محترمہ مس رُخ صاحبہ! اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ایسے قیمتی وقت اور ایسی گرانمایہ شخصیت کے تحفظ کی اشد ضرورت ہے۔"

جوں جوں اُسے غصّہ چڑھ رہا تھا۔ میری کمزوری میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اچانک اس لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہوں۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا نام اسّل الحفیظ ہے! دُوسری بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے اسلامیہ کالج جانا ہے ایک مشاعرے پر ——— معاف کیجیے۔"

یہ جملہ بول کر اُس نے بڑے طمطراق سے اپنا بڑا سا بیگ اٹھایا اس میں ڈائری اور پنسل ڈالی اور بیگ جھلاتی دفتر کی عمارت سے باہر نکل گئی۔ اُس کے ساتھ ساتھ سدھائے ہوئے کُتّے کی طرح میں سڑک تک چلا آیا۔ نہ اس وقت مجھے یہ خیال تھا کہ شاید وہ دل ہی دل میں مجھے بے حیا سمجھ رہی ہے نہ ہی اس بات کا خدشہ تھا کہ شاید میرا غلط رویہ ہمیشہ کے لیے اُسے مجھ سے بدظن بھی کر سکتا ہے بس ایک لگن تھی ایک للک تھی۔ اُسے زیادہ سے زیادہ وقت تک دیکھنے کی۔ اُس کے قریب رہنے کی۔

دفتر کی سیڑھیاں اُترتے وقت اُس نے چپراسی سے پوچھا ——— "ظفر صاحب کہاں چلے گئے ہیں؟"

چپراسی نے پہلے اندر نظر دوڑائی پھر سائیکلوں والے چھپر کے قریب گیا اور دُور سے آتے ہوئے بولا "جناب وُہ ابھی ابھی یونیورسٹی کیمپس گئے ہیں۔"

مس رُخ جھنجھلاتی ہوئی سڑک پر آگئی۔ حُسنِ اتفاق سے سڑک سنسان پڑی تھی۔ دور کشے گزرے دونوں میں سواریاں لدی تھیں۔ مس رُخ بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہی تھی۔

"میری کار حاضر ہے۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ساری راہ ایک بار بھی آپ کو انشورنس کے لیے نہ کہوں گا ———

وعدہ ——— ؟"

اُس نے لمحہ بھر کو میری طرف دیکھا اور پھر کار میں بیٹھ گئی۔

مہ رُخ خوبصورت لڑکی نہ تھی فقط ذرا بے اعتنا تھی۔ باتیں کرنے کے ترپ کے پتّے چھوڑنے، شام گھات دکھانے اور بازی لُوٹ لے جانے کا اُسے چسکا تھا۔ اُس کا جسم اور دل بالکل پاک تھے۔ صرف نیت نیک نہ تھی۔ عام عورتوں کی طرح جو سج بن کر بازار جاتی ہیں، اور چاہتی ہیں کہ نظروں ہی نظروں میں سارے جہاں کے مرد اُن کے عاشق ہو جائیں لیکن اوچھا آوازہ کوئی نہ کسے اُن کے دوپٹے کو کسی کی انگلی بھی چھو نہ جائے۔ مہ رُخ بھی یہی چاہتی تھی کہ چاہنے والوں کے پشتارے لگ جائیں جو ایک بار اُس سے بات کرے ہمیشہ کے لیے اُس کا پلیتھن نکال لے۔ وہ اپنی جدتِ طبع کی خود اس قدر قائل تھی کہ ہر مرد کو اس میدان میں ہرا کر اُسے اپنی سکون ملتا تھا ——— گو بعد میں مجھے علم ہو گیا کہ یہ ذہانت بھی بالکل سطحی ہے اس میں نہ تو اصلی ذہانت کے ابرق جیسے پرت در پرت تھے۔ نہ گہرے پانیوں کا سکون اور نہ ہی خیال کی گہرائی تھی۔ زیادہ سے زیادہ وہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کی بھٹیارنوں کی طرح ضلع جگت کی ماہر تھی۔ بہت جلد مجھ پر عیاں ہو گیا کہ آم تو سارے ظفر کے لیے ہیں میری طرف وہ گٹھلیاں پھینکتی ہے لیکن میں مہ رُخ کی محبت میں اس قدر مسحور ہو چکا تھا کہ اس طرح چھچھڑے سمیٹنے سے جلنا تو درکنار۔ اُلٹا اس کی خوشنودی کا ہر وقت خیال رہتا تھا یہ گٹھلیاں اس قدر عزیز تھیں کہ میں ان ہی کی تلاش میں مہ رُخ کے دفتر جاتا اور پہروں گداگروں کی طرح بیٹھا رہتا۔

جب بھی میں تمہارے گھر جاتا تو ان باتوں کی چاپ ہمیشہ ساتھ آتی۔ پھر نہ تو زری مجھے تمہاری روتی ہوئی آنکھیں نظر آتیں۔ نہ ملائم سہما چہرہ دکھائی دیتا نہ تمہاری آواز میں دبی خاموشی سنائی پڑتی۔ میں تو سارا وقت خلوت اور جلوت میں مہ رُخ سے ہی باتیں کیے جاتا۔ اسی طرح ایک روز میں تمہارے ہاں بے دھیان بیٹھا تھا کہ نواز نے پہلی مرتبہ میری توجہ تمہاری طرف لوٹائی۔

"صبح تم نے انڈہ کھایا تھا بے بی ڈارلنگ؟ ———" نواز نے پوچھا۔

تم نے نفی میں سر ہلایا۔

"دودھ؟ ———"

"جی پیا تھا ———" تم آہستہ سے منمنائیں۔

"کہاں پیا تھا زری ——— ہاں پچھا ضرور تھا نواز۔ اللہ جانے اسے کیا ہوتا جاتا ہے نہ کچھ کھاتی ہے نہ کسی سے بولتی ہے۔ انہیں کوڈ لور آئل کی پلائیں۔ ڈامن بی اور سی کی گولیاں کھلاتی ہوں۔ ذرا رنگ تو دیکھیے اس کا۔ چھپکلی سی نکلتی آتی ہے ——— نا آصف؟ ———"

میں نے ہسپانوی بیبوں جیسی جلد پر نظر ڈالی اور پرے سے دیکھنے لگا۔ بڑے دنوں کے بعد میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے اور نیکی سکھانے آ بیٹھا تھا۔

نواز اپنی بندوق کو گز سے صاف کر رہا تھا۔ اُس نے تمہاری ممی کی بات پر کان دھرے بغیر کہا "آؤ آصف ذرا باہر چلیں دریا کی طرف۔ شاید کوئی سینڈ گراؤز مل جائے ———"

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تمہارا شکاری باپ مجھ سے تمہارے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہے۔ جب ہم آبادی سے بہت دُور نکل گئے اور فضا سے شہر کی آوازیں غائب ہو گئیں تو وہ اچانک رُک گیا اور گھاس پہ بیٹھتے ہوئے بولا: "آصف مجھے زری کے متعلق تشویش سی ہے ——— میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

میں مرغِ رُخ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ یک دم میرے گھٹنے کمزور پڑ گئے۔

"ہاں ——— ہاں ضرور پوچھو ———"

"نہ تو وہ کچھ کھاتی ہے نہ کسی سے بولتی ہے۔ نہ کسی سہیلی سے ملنے جاتی ہے اور نہ ہی اب کوئی اُس کی سہیلی گھر آتی ہے پہلے وہ کرنل افتخار کی بیٹیوں سے بہت قریب تھی۔ اب اُن کا کبھی نام بھی نہیں لیتی۔ میں بڑا فکرمند ہوں ———"

میں نے تھوک نگل کر کہا۔ "کبھی ڈاکٹر کو دکھانا تھا نواز ——— شاید معدہ sluggish ہو ..."

"دکھایا تھا۔ کرنل وسیم سے سارا چیک اپ کروایا ہے۔ بلڈ ٹسٹ لیا ہے چیسٹ کا ایکسرے کروایا ہے ——— بظاہر وہ بالکل تندرست ہے۔" نواز نے انگریزی میں کہا۔

"تعجب ہے ———" دُور کہیں چکی چلنے لگی تھی اور اس کی آواز میں مدھم آہوں کی ہوک تھی۔

شکاری کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں نے ہمیشہ نواز کو کھلنڈرے موڈ میں دیکھا تھا۔ کارتوس سے لے کر چیتے کی آنکھوں تک اُس کی باتوں کی اُٹھان تھی۔ اُس کے سامنے شکار سے ہٹ کر اگر کوئی بات کی جاتی تو وہ اونگھنے لگتا تھا۔ آج وہ گھاس پر بندوق پرے رکھے گھٹنوں کو بازوؤں میں لیے متوحش سا بیٹھا تھا۔ نواز کا یہ پہلو میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ بڑی دیر کے بعد اُس نے انگریزی میں بڑے اکھڑے پن سے پوچھا ——— "تمہارا کیا خیال ہے کیا اُسے کسی سے محبت ہو گئی ہے؟ ——— اگر مجھے علم ہو جائے کہ اُسے کس سے محبت ہے تو میں ——— میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں ——— میں . . . . . میں زری کی عزت کرتا ہوں آصف۔"

میرے لیے اس سوال کا جواب دینا سہل نہیں تھا۔ ذرا سا اعتراف بھی مجھے اتنی دُور لے جاتا کہ پھر میں لوٹ کر نہ آ سکتا۔ میں نے ساری بات کو معمولی رُو دے کر کہا۔ "ابھی کہاں نواز۔ ابھی تو وہ اپنی استانی سے [illegible] کر رہی ہوگی ———"

نواز نے لحہ بھر کو میری جانب دیکھا۔ اس نظر میں بڑی مجروح سی چمک تھی۔ پھر اُس نے بندوق اُٹھائی اور گھر کی طرف لوٹنے لگا۔ سارا راستہ اُس نے جنگلی مُرغابی، تیتر، بٹیر، فیلی کے گوشت کی تہا گانہ خاصیتوں پر بحث کی۔ شکار کے گوشت کو کوئلوں پر سینک کر پکانے اور کھانے کے طریقے بتائے لیکن ایک بار بھی پھر اُس نے تمہارا نام نہ لیا۔ لیکن اتنی ساری باتوں کے باوجود آج اس کی تشویش مجھ سے چھپی نہ تھی۔ وہ اپنی اکلوتی بچی کے لیے بڑے چکر میں تھا۔ اُس کی باتوں میں آج انہماک تو ضرور تھا لیکن وہ گہری دلچسپی نہ تھی جو عموماً اُس کی باتوں سے مترشح ہوا کرتی تھی۔ میں نواز کی مدد کرنا چاہتا تھا اور کسی قسم کی مثبت گفتگو ہم میں ممکن نہ تھی۔ پورچ کے پاس پہنچ کر میں نے اُس سے اجازت چاہی۔ اُس نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں دل ہی دل میں جو فیصلہ کر چکا تھا۔ مجھے اُس پر عمل کرنا تھا اور وہ بھی بہت جلد۔ میں بڑی عجلت میں رُخصت ہوا اور سیدھا مرغِ رُخ کے پاس پہنچا۔ وہ ایک فل سکیپ پیپر پر بول پن کے ساتھ کچھ لکھ رہی تھی۔ دفتری میز پر بہت سی تصویریں پڑی تھیں اور ہر تصویر کے اوپر ایک چٹ لگی تھی۔ میں سلام کر کے اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

اُس نے بڑے صاحب کی طرح سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور کام میں مصروف رہی۔ میں نے جھک کر صفحے پر دیکھا لکھا تھا۔۔

"میرے میاں شادی کی سالگرہ بھول گئے ـــــ"

اس عنوان کو نیک شگون سمجھ کر میں نے کاغذ پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولا ـــ "اسّلام الحفیظ ـــ"

اُس نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا ـــ "اسّلام الحفیظ بہت ذاتی نام ہے ـــ مہ رُخ کہیے ـــ"

گرم استری پر جیسے پانی کے چھینٹے پڑ گئے۔

"مہ رُخ!"

وہ کاپی پر لکھتے ہوئے بولی ـــ "انسو نیک شگون ضرور ہیں لیکن جہیز کا میک اپ خراب کر دیتے ہیں۔"

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے۔"

"وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال خود کرتی ہیں ـــ بیگم رضوانی سے ایک ملاقات۔"

"میری بات سنو مہ رُخ۔ ـــ خدا کے لیے ـــ"

"بلین کے ڈبوں سے آراستہ کھانا ـــ"

"مہ رُخ لمحہ بھر کے لیے میری طرف توجہ دو۔"

وہ قلم گھسیٹتے ہوئے بولی ـــ "فرما دیا اپنے شوہر کی چہیتی بیگم ـــ"

"اللہ کے لیے مہ رُخ مجھے تم سے محبت ہے ـــ"

"ملکہ الزبتھ دس لاکھ کی مالیت کے ملبوسات سے کر سفر کرتی ہیں۔"

میں نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام کر کہا ـــ "مجھے تم سے محبت ہے مہ رُخ ـــ"

"محبت کی شادی میں ناکامی کی وجہ ـــ"

اب میں جھنجھلا کر اُٹھا اور اس کے ہاتھوں سے کاغذ چھین کر بولا ـــ "مہ رخ مذاق کی ایک حد ہے۔"

"مذاق کون کر رہا ہے؟ ـــ"

میں نے چڑ کر کہا۔ "اور میرے ہر سوال کا یہی جواب تھا جو آپ نے دیا۔"

مہ رُخ نے کاغذ بڑی اترا ہٹ سے میرے ہاتھوں سے چھینا اور اُوپر اٹھا کر بولی: جناب میں کچھ عنوان بنا رہی ہوں نام کے لیے ـــ دیکھیے پسند فرمائیے؟"

"اچھا آج تم سنجیدہ نہیں ہو میں پھر آؤں گا ـــ"

جب میں دروازے کے پاس پہنچ گیا تو مہ رُخ اپنی میز پر بیٹھتے ہوئے بولی ـــ "اور وہ کلاسیکی موسیقی کی کنسرٹ

پر نہیں جائیں گے۔ ابھی کل تک تو بڑا جوش تھا۔"

مہ رُخ سے ناراض ہونا اور پھر اس ناراضگی کو مستقل کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میری شخصی آزادی اس کے حضور بالکل ختم ہو چکی تھی ——— میں دُم ہلاتے کتے کی طرح کرسی پر دوبارہ آ بیٹھا۔ اس کے بعد کسی قسم کی گفتگو نہ ہوئی میں اپنا بھرم اور وقار قائم رکھنا چاہتا تھا اور وہ مجھ جیسوں کو دھوئیں میں اڑاتی تھی۔ اس لیے جب تک وہ لکھتی رہی میں تصویریں دیکھتا رہا میں نے ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ پاکستان کی خواتین فینسی ڈریس کو بہت پسند کرتی ہیں۔ جا بجا کلچرل شوز میں عورتیں گھنے پلتے سے لیس، غرارے، سندھی قمیص، چوڑی دار پاجامے، پشواز، سلہٹ کے انداز کی ساڑھی، دوگھنے بینگے، پٹھانی کرتے اور شیشوں کی بنی ہوئی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھیں۔ پنجابی لڑکیوں کو پٹھانی بننے کا شوق تھا۔ سندھی لڑکیاں ساڑھی پہنے اترا رہی تھیں۔ معمر عورتیں چوڑی دار پاجاموں اور عروسی لباسوں میں ملبوس تھیں۔ غرضیکہ بڑے پیمانے پر ایک بڑا وسیع و عریض گھپلا تھا۔ فیشن کے ان مقبول شوز کے علاوہ ان خواتین کی تصویروں کا بھی پلندہ دھرا تھا جو ہیئر ڈریس بنتے بنتے کسی طرح بچ گئی تھیں۔ ایک رُخا پورا چہرہ اور تین چوتھائی چہرے کی ان گنت تصویریں تھیں۔ سب شکلوں پر وہی ایک لیمن ڈراپ قسم کی مسکراہٹ تھی۔ کچھ تصویریں ان پارٹیوں کی تھیں جو شادی، سالگرہ اور نوجوان لڑکوں کے لیڈر بن جانے کی تقریبوں پر دی جاتی ہیں۔ ان تصویروں میں مہمان خصوصی عموماً دولہا، دلہن، سالگرہ منانے والا یا سفر پر جانے والا نہیں ہوتا بلکہ وہ افسر یا لا منسٹر یا مشہور آدمی ہوتا تھا جن کے ارد گرد تمام مہمان گھسنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ میں نے تو ایک آدھ تصویر میں یہاں تک ظلم دیکھا کہ دولہا اور دولہن کے عین درمیان ایک گنجے سروالے صاحب براجمان ہیں۔ ارد گرد گھر والوں کی دو رویہ پلٹن کھڑی ہے نیچے رقم ہے دولہا دولہن کے درمیان جناب اعزاز الحق صاحب۔ ان تصویروں پر مستزاد ان معمر لیڈر نما عورتوں کی تصویروں کا اجتماع تھا جو بیرونی ممالک کے سربراہوں کا خیر مقدم کرنے ایئر پورٹ کے وی آئی پی e r n e e r a e e میں پہنچی تھیں جنھیں مقامی فنکشنز پر پہلی قطار میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ جو زنانہ جلسوں میں صدارت کے فرائض ادا کر چکی تھیں۔ ان خواتین کے چہرے فوٹو گرافروں کی چابکدستی کے باوجود وہیل مچھلی کی طرح تھل تھل اور بے جان نظر آتے تھے۔ میں یہ تصویریں دیکھنے میں مصروف تھا کہ مہ رُخ اُٹھتے ہوئے بولی ——— "کیوں چلیے گا کہ ناراض رہیے ابھی؟ ———"

ابھی ہم مال تک پہنچے تھے کہ مجھ پر پھر دورہ پڑا۔

"مہ رُخ! یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟"۔

"کونسا سلسلہ۔ دیکھیے دیکھیے آہستہ چلیے رکشا آ رہا ہے ادھر سے۔"

"میری گرویدگی اور تمہاری بے رُخی؟"

"جب تک آپ چلانا چاہیں۔ ساری کارروائی یک طرفہ ہے ———"

میں نے پینتالیس کی رفتار پر موڑ کاٹا ———

"اللہ آج آپ گھر صحیح سالم سے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے —۔"

"مہ رُخ ـــــ میں اُن مردوں میں سے نہیں ہُوں جو شادی کے بعد عورتوں کی آزادی سلب کیا کرتے ہیں۔ تم چاہے ساری عمر عورتوں کا کالم لکھنا خدا قسم مجھے اعتراض نہ ہوگا ـــــ"

"یہ تو میری مرضی پر منحصر ہے شاید میں جرنلزم فوراً چھوڑ دوں ؟ ـــــ"

ایک تانگے سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔

"ہم دونوں کی مرضی ہمیشہ ایک ہوگی مہ رُخ ـــــ ہمیشہ۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی ـــــ "یعنی بالا ہی بالا سب کے سب جملہ حقوق آپ کے نام محفوظ بھی ہو گئے۔"

"تمنا تو میری یہی ہے ـــــ"

"خوب! ـــــ اللہ کے لیے اتنی تیز نہ چلایئے گاڑی ـــــ"

مجھ پر اپنی محبت کا بوجھ بڑا شدید ہو چلا تھا اور گاڑی بے قابو ہو کر کبھی دائیں کبھی بائیں مڑنے اور جھولنے لگی تھی۔

"آصف صاحب کیوں مفت میں بدنام کرنے لگے ہیں مجھے ـــــ صبح اخبار میں چھپے گا۔ مہ رُخ خواتین کی کالم نگار ـــــ سنیلا مندر کے پاس حادثے کا شکار ہو گئیں ـــــ"

میں نے گڑگڑا کر کہا "تم دن بھر میں کسی وقت سنجیدہ بھی ہوتی ہو کہ نہیں۔"

اس نے پکّا سا مُنہ بنا کر جواب دیا ـــــ "میرا خیال ہے سارا دن میں مجھے غیر سنجیدہ ہونے کا ایک لمحہ بھی میسّر نہیں آتا ـــــ"

"خدا کے لیے مہ رُخ ـــــ مجھ سے شادی کر لو ـــــ پلیز ـــــ"

"اب اگر آپ نے مجھ سے ایسا مذاق کیا تو میں یہیں اُتر جاؤں گی ـــــ اسی لمحہ ـــــ!"

میں خاموش ہو گیا۔ اور کنسرٹ کے اختتام تک خاموش رہا۔

لان پر رنگدار نواڑی کرسیاں پڑی تھیں اور کنسرٹ شروع ہونے میں ابھی تھوڑی دیر تھی۔ ہمیں ایسی جگہ ملی جہاں سے ہر آنے جانے والا آدھ فٹ کے فاصلے سے گزرتا تھا۔ شامیانے تلے اکابرین شہر کا سیلاب آیا ہُوا تھا۔ مجمع میں عورتوں کی اکثریت تھی۔ اور ان میں بھی وہ خواتین زیادہ تھیں جو شوہروں کے شانہ بشانہ بڑے ٹھسے سے آئی تھیں۔ عورتوں کی تعداد کچھ اس لیے زیادہ نہ تھی کہ یکدم لاہور کی مستورات کن رس ہو گئی تھیں اور انھیں موسیقی سے عشق ہو گیا تھا۔ بلکہ اکثر اس لیے آئی تھیں کہ اُن کے پاس کچھ ایسے لباس تھے جو لوگوں کو دکھانا بہت ضروری تھا۔ کچھ اس لیے تشریف لائی تھیں کہ صبح ہی اُنھیں اپنی ہمسائی اور دوستوں کو بتانا تھا کہ رات وہ بھی کنسرٹ پر موجود تھیں۔ کچھ محض اس لیے چلی آئی تھیں کہ آج شام کنسرٹ سے بہتر شہر میں کوئی اور پروگرام نہ تھا ـــــ بیگمات کی خیرہ کُن زیبائش ایسی تھی کہ بڑی بڑی رشک گیر طوائفیں کان پکڑتی اور ان سے لباس پہننے کا سبق حاصل کرتیں۔ مجھ سے ایک مرتبہ ایک ٹیکسی گرل نے شکایتاً کہا تھا۔

"جناب جب سے بیگمات طوائف گیری کرنے لگی ہیں۔ اُنھوں نے ہمارے رزق پر لات مار دی ہے ـــــ"

"وہ کیسے؟" میں نے سوال کیا تھا۔

"پہلے مرد طوائفوں کے پاس اس لیے زیادہ آتے تھے کہ گھریلو بیبیاں سادہ لباس پہنتی تھیں۔ اور اپنے آپ کو ڈھانپے رکھتی تھیں۔ اب تو بیگمات ہر پہلو سے اپنے آپ کو یوں پیش کرتی ہیں۔ کہ طوائف دنگ رہ جاتی ہے ——— اب ہم لوگوں کو کون پوچھے بھلا۔"

آج چونکہ میں بظاہر مہ رُخ سے ناخوش بیٹھا تھا اس لیے میری نظروں میں تنقید زیادہ تھی اور تحسین کم۔ سبھی سجائی عورتوں کو دیکھ کر مجھے سالم فرگرش کا روسٹ یاد آنے لگا۔ ایسا روسٹ جو بڑے سلیقے سے سٹین لس ٹرے میں پیش کیا گیا ہو ——— ان عورتوں کا ہر رنگ آپ کے سامنے تھا۔ آپ کے تخیل کے لیے کچھ باقی نہ تھا۔ یہ مرد کی فطرت کی تواضع تھی ——— سوئے ہضم پیدا کرنے کی حد تک تواضع!

کنسرٹ ختم ہونے کے بعد ہم دونوں مہ رُخ کے گھر چل دیے۔ ساری راہ نہ میں نے اُسے بلایا اور نہ ہی اُس نے مجھ سے کوئی بات کی۔ لیکن جونہی وہ میکلوڈ روڈ کے پہلو میں ایک بند گلی کے پاس اُتری میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"مہ رُخ! ———"

مہ رُخ نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ چھڑا لیا اور تنک کر بولی۔ "مسٹر آصف میرا خیال تھا کہ مرد اور عورت میں افلاطونی محبت ممکن ہے لیکن یہ تجربہ غلط نکلا۔ مرد اور عورت میں کیسا ہی لاتعلق رشتہ کیوں نہ ہو۔ دونوں میں سے ایک کو ضرور توقع پیدا ہوتی ہے ——— محبت کی ——— خدا حافظ ———"

"سنو مہ رُخ ——— سنو تو۔"

"کیا سُنوں۔ خدا جانتا ہے کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس نے آپ کو غلط امید دلائی ہو۔ پھر بھی غلط فہمی پیدا ہو گئی ——— ہو گئی ناں ———"

"مہ رُخ! تم لوٹ کر ضرور مجھ تک آؤ گی۔"

"فی الحال تو میں ظفر کی طرف مراجعت کر رہی ہوں خدا حافظ ——— مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ یہ بات طے ہے۔"

مہ رُخ جلدی سے روانہ ہو گئی اور میں کتنی ہی دیر وہاں کھڑا رہا۔ ظفر ——— مہ رُخ۔ چوپ سٹک جیسی ٹانگیں چلانے والا نیم مسخرہ ——— نیم فلاسفر اس آتشبازی کا منظورِ نظر ہے یہ حقیقت مجھے سمجھ نہ آتی تھی۔ بڑی دیر بعد جب میں کار میں بیٹھا تو ونڈسکرین پر مجھے تمہاری صورت نظر آئی۔ ہسپانوی لیموں جیسی جلد ——— گُم سُم آنکھیں ——— سینے پر لٹکتے ہوئے دو لمبے لمبے سانپ اور سانپوں کے منہ میں گُلِ صل کے انتشیں پھول! میں نے تم سے ایسی کوئی بات نہ کی تھی جس سے محبت کی بو آتی ہو پھر تم نے آپ ہی آپ یہ فیصلہ کیوں کر لیا کہ میری محبت کے بغیر تمہارا وجود ناممکن ہے؟ شاید مہ رُخ ٹھیک کہتی تھی مرد اور عورت کا رشتہ کبھی لاتعلق نہیں ہو سکتا۔ یہاں ہمیشہ ایک واقعی رس موجود رہتا ہے جو مکمل بھولپن اور سادگی کو مفلوج کر دیتا ہے ——— یہ وہ بتیاں ہیں جو آپ ہی آپ نیلے پانیوں میں منعکس ہو جاتی ہیں۔

دُوسرے دن سہ پہر کے وقت میں تمہارے ہاں پہنچا۔ یہ میری خود غرضی تھی کہ میں تمہاری عقیدت کے چھا بے سے اپنی زخمی انا کو سینک دینا چاہتا تھا۔ میں ہمدردی وصول کرنے اُس جگہ پہنچا تھا جہاں کا ہر ذرّہ محبت کی دائمی رس میں ڈوبا ہوا تھا۔ جب میں نے کار کو پورچ میں روکا تو پہلی بار مجھے احساس ہُوا کہ شاید تمہارے ممی ڈیڈی گھر پر نہ ہوں۔ لیکن بھاگ جانے کی راہ مسدود ہو چکی تھی۔ کار کا شور سنتے ہی تم برآمدے میں آپہنچی تھیں۔ تمہارا چہرہ زرد تھا۔ کبھی یہ آتشی ٹانک اور غازے کی سُرخی سے بے نیاز نظر آیا کرتا تھا۔ مجھے دیکھ کر تمہارے کانوں کی لوئیں سُرخ ہو گئیں۔

تم بھاگ کر ڈرائیور والی سیٹ کی جانب آگئیں اور ہینڈل گھماتے ہوئے بولیں۔ "آئیے ——"

"ڈیڈی کہاں ہیں تمہارے ؟"

"وہ جی ہرن سنار سے گئے ہیں۔"

"اور ممی جان ؟ ——"

"وہ بھی ساتھ گئی ہیں جی ——"

"تم نہیں گئیں اُن کے ساتھ ؟" میں نے سوال کیا۔

"میرے سینیئر کیمرج کے امتحان ہیں جی —— پرسوں سے۔"

میں نے بالکل انکلوں جیسی مشفق آواز میں کہا۔ "ٹھیک ٹھیک پھر تم تو پڑھو بے بی۔ میں تو چلتا ہُوں فوراً کر بتا دینا میں آیا تھا ——"

تم نے پہلی بار جرأت سے دروازہ کھول کر بات کی۔ "جی ممی ڈیڈی آنے والے ہیں بس —— آپ ذرا تو آ تو آئیے ——"

تمہاری آواز میں جو التجا تھی۔ میں نے اُس کے سامنے اپنے آپ کو ننّھا محسوس کیا۔

"نہیں بھئی تمہاری پڑھائی میں ہرج ہو گا ——"

"پانچ منٹ رُک جائیے سچ ڈیڈی آنے والے ہیں ابھی ——"

تمہاری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اِن آنسوؤں کا دُکھ میں نے پہلی بار محسوس کیا۔ اپنی محرومی کے احساس سے میرا اپنا حلق نمکین ہو گیا۔

تم مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ میں اُسی مخصوص صوفے میں بیٹھ گیا جو آتش دان کے قریب تھا۔ سارے کمرے میں کمائے ہوئے چمڑے کی ٹہک تھی۔ چیتے کے سر، بارہ سنگھوں کی آنکھیں اور شیر ببر کی کھال یکدم بہت جاندار ہو گئی تھی۔ مجھے جنگل کا سناٹا کمرے میں مقید محسوس ہو رہا تھا۔

"پہلا پرچہ کس کا ہے ؟ ——"

"انگلش کا —— "

"پھر؟"

دو سکنڈ وہ سفارت سے ہے جی ——"

اچھا جی میں تو چلتا ہوں۔ تمھارے ڈیڈی تو مچھلی کا شکار کھیلنے گئے ہوں گے۔"

یکدم میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور چلنے کی نیت سے دو ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ تمھاری آواز آئی۔ یہ آواز ایک بچے کی تھی لیکن اس میں میرا بانی کا سارا غم تھا۔ اس آواز پر آنسو غالب بھی تھے اور ان کا تعاون بھی کر رہے تھے۔

"مجھ سے شادی کر لیجیے —— دو دن کے لیے —— ایک دن کے لیے —— ساری لڑکیاں مجھے چھیڑتی ہیں آصف صاحب خدا کے لیے مجھ سے نکاح کر لیجیے —— ایک گھنٹہ بھر کے لیے پھر چاہے آپ مجھے طلاق دے دیجیے گا ———

میں ہمیشہ آپ کی احسان مند رہوں گی ——"

میرے سر کے عین اوپر بم کا گولا پھٹا۔

"لڑکیوں کو اس بات کا علم کیسے ہوا زری؟ ——"

"ہو گیا ہے جی —— ہونا ہی تھا۔ میں آپ کی تصویر جو ساتھ لے جاتی تھی ہنستے ہیں!"

میں اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میری تصویر اُس کے پاس کہاں سے آئی۔ لیکن جب میں نے مڑ کر اُس کی طرف دیکھا تو وہ مجھے بے حد چھوٹی مل بد اشتہ نظر آئی۔ بالکل جنگی قیدی کی طرح مجبور اور بدحال —— میں نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھے اور آہستہ آہستہ بولا۔ "سنو زری! میں تمھاری محبت کی عزت کرتا ہوں لیکن ابھی تم بچہ ہو۔ یہ دور گزر جائے گا تو تم خود اس جذبے پر ہنسو گی۔ بچپن میں سبھی اس طرح محبت کرتے ہیں۔ لیکن نواز میرا جگری دوست ہے۔ ہم دونوں چاہے برسوں نہ ملیں ہماری دوستی بہت گہری ہے میں ایک خاص اعتماد پر یہاں آتا ہوں ——"

تمھاری آنکھیں بند تھیں اور پلکوں سے بھری برسات ٹوٹ رہی تھی۔

"اور ایک اور بات بھی ہے زری ——"

تم نے آنکھیں کھول دیں۔ آنسوؤں سے لبالب بھری آنکھیں۔

"مجھے کسی اور سے محبت ہے —— بالکل ایسی ہی محبت جیسی تمھیں مجھ سے ہے —— میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ سمجھیں زری ——"

"جی! ———"

نہ جانے وہ سارے آنسو کیسے یکدم خشک ہو گئے؟

میں بھاری قدم اٹھاتا باہر آیا کار میں بیٹھا اور پورچ سے رخصت ہو گیا —— کاش میں پلٹ کر ایک بار، تمھیں دیکھ ہی لیتا!

رات کو پونے دو بجے مجھے نواز کا فون ملا۔ جب میں ہسپتال پہنچا تو نواز باہر ٹہل رہا تھا۔

"بڑی دیر لگادی تم نے آصف —"

مجھے معلوم نہ تھا کہ نواز میرے متعلق کس قدر جانتا ہے۔ میں خاموش رہا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اس قدر جلد مرنا چاہتی ہے تو میں اُسے خود شوٹ کرتا —— اُسے دو گھنٹے مرنے میں نہ لگتے۔"

"آئی ایم سوری نواز ——"

"ابھی تک میرا خیال تھا کہ زری اتنی سخت دل نہیں ہوسکتی۔ اُس کے دل میں میری محبت ضرور رہو گی —— لیکن ——"

میں بلا مقصد اُس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

"ایک شکاری کی بیٹی، نشانہ اتنا خراب —— پورے دو گھنٹے سسکتی رہی۔ بہت دیر کر دی تم نے آصف بس

کاش میں اُسے ہسپتال نہ لایا ہوتا آصف۔ گھر اور ہسپتال میں خدا تو وہی رہتا ہے —— ہے نا؟ ——"

میں خاموشی کے ساتھ اُس کے برابر ٹہلنے لگا۔

"وین ابھی تک نہیں آئی۔ ——"

"وین؟ ——" میں نے بے دھیانی سے سوال کیا۔

"زری کو گھر لے جائیں گے اُسے نہلائیں گے دھلائیں گے۔ میں اُس کے ماتھے کا زخم خود صاف کروں گا۔ بڑی

— [illegible] لڑکی تھی —— تھی نا آصف ——"

میرے پاس اُس کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

"میں اصل وجہ سمجھ نہ سکا۔ میں ہرن مار کے لوٹا تو وہ بے ہوش پڑی تھی۔ خانساماں بد بخت تک گھر پر نہیں تھا۔

ای ایڈیٹ!"

"چلو ذرا لان پر بیٹھ جائیں ——"

اُس نے میری نصیحت پر عمل نہ کیا۔ "زری مجھے ہمیشہ شکار سے منع کیا کرتی تھی۔ کہا کرتی تھی ڈیڈی اللہ میاں سزا

دیتا ہے۔ یہ گناہ ہے ——"

اُس کی آنکھوں میں تھوڑا تھوڑا پاگل پن پر اتر آیا تھا۔

"آصف! کیا اُسے کسی سے محبت تھی —— تم ہمارے گھر آتے تھے۔ تمہارا کیا خیال ہے کیا کوئی ایسا بھی اس صفحۂ ہستی

پر تھا جو زری کو نہ چاہ سکا —— ہم کبھی اُس کے خلاف نہ ہوتے۔ زری نے یہ کیوں سمجھا کہ میں اُس کی محبت پر معترض ہوتا —؟

کیوں کیوں کیوں؟ ——"

میں تمہارے ڈیڈی کو کیا سمجھاتا کہ نیل کے پانیوں میں منعکس ہونے والی تیتریوں کا کوئی قصور نہیں؟ میں تمہارے ڈیڈی

کو کیا بتاتا کہ زری کی محبت تو امر بیل کی مانند ہے جس درخت پر اس کی زرد زرد ڈالیاں چڑھ جاتی ہیں۔ وہ درخت آپ ہی آپ مر جاتا ہے۔

میں تمہارے باپ کو کیا سمجھاتا —— اور کیوں سمجھاتا؟

میں تو تمہیں بھی بتا نہ سکا زری کہ تمہارے جانے کے بعد ——— مہ رُخ کی محبت چھن جانے کے بعد مجھ پر کیا گزری ——— تمہاری محبت مجھ تک مہ رُخ کے توسط سے پہنچی ہے زری ——— اس محبت کا تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکا، لیکن میں نے تمہارا قرض لوٹا دیا ہے ——— میرے ارد گرد ابر بیں چڑھ چکی ہے' اس میں بنفشہ کے پھول کھلے ہیں۔ پشیمانی کے ارغوانی پھول ——— ندامت کے آسمانی پھول ——— میں تمہارا قرض لوٹا رہا ہوں بھولے ہوئے' آنسو بہ آنسو ——— آہ در آہ ———

تمہاری محبت کی تتلیاں میرے دل کے آس پاس پانیوں میں منعکس ہو چکی ہیں زری ——— لیکن میں یہ تتلیاں تمہیں نہیں دکھا سکتا۔ میرا کوئی مستقبل نہیں ——— میرا کوئی ماضی نہیں۔ میں وہ مریض ہوں جس کی شریانوں میں کلوروفارم کا نشہ نشاں نشاں کر رہا ہے اور وہ آپریشن تھیٹر سے بھاگ آیا ہے۔

بارش بہت زور سے آئی ہے۔ بادلوں کے غفت کپڑے میں شگاف آ گئے ہیں۔ مٹی کے گرم وجود سے ٹھنڈی بوندوں نے لپٹ کر سوندھی خوشبو اٹھائی ہے۔ تمہاری یاد کا گھٹا ٹوپ اندھیرا میرے چاروں طرف پھیلنے لگا ہے ——— میں اس طفل نادان کی طرح تھا جو محبت کے نذرانے کو ٹھوکریں مار مار کر بے وقعت کر دیتے ہیں ——— لیکن اب نہیں ——— اب نہیں زری ———

لیکن اب کیا فائدہ ؟

اب کیا فائدہ زری ؟

کوڑیوں کے مول

بنگالی: بمل مترا اردو: احمد سعدی (چھٹی قسط)

"کرن!"

کرن بھی حیرت زدہ تھا اور دینکر بھی۔ ایک چوکی تھی اور اس پر میلے کچیلے لحاف، سوزنی اور توشک اور تکیہ کے درمیان کرن لیٹا ہوا تھا اور دوا کی شیشیاں نیچے فرش پر رکھی ہوئی تھیں اور قریب ہی ایک لالٹین جل رہی تھی۔ دینکر کو دیکھتے ہی کرن اچھل پڑا۔ بولا "تم آئے ہو دینو؟"

کرن دینکر سے لپٹ گیا۔ "تمہاری ماں خفا نہیں ہوگی؟"

"میں ماں سے اجازت لے کر آیا ہوں" دینکر نے جواب دیا۔

"پھر اتنی رات کیوں ہوگئی؟ اس سے قبل نہیں آسکتے تھے؟ بہت ساری باتیں کی جاتیں۔"

"تم لیٹے رہو، سو جاؤ۔" دینکر نے کہا۔ "تمہیں تکلیف ہوگی، اب کیسے ہو؟"

کرن یکایک چیخ اٹھا۔ "ماں، ماں، سن جاؤ۔"

کرن کی ماں اوسارے پر بیٹھی ہوئی جنیو کات رہی تھی۔ کرن کی آواز سن کر کمرے میں آئی۔

کرن نے کہا۔ "یہ دیکھو ماں، دینکر آیا ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا، اور کوئی آئے نہ آئے دینو خبر ملتے ہی ضرور آئے گا۔ دینو آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

کرن کی ماں کو زیادہ باتیں پسند نہیں تھیں۔ بولی۔ "نہیں آنا ہی تو اچھا ہے۔ بیمار کے گھر زیادہ آنا کیا اچھا ہے!"

دینکر نے کہا۔ "لیکن میں تو ماں سے کہہ کر آیا ہوں، ماں نے مجھے یہاں آنے کی اجازت دے دی ہے۔ اگر تم یکایک ایسے وقت میں بیمار کیسے ہوگئے؟"

"بیمار ہونا تو اچھا ہے۔" کرن نے جواب دیا۔ "میں تو بیمار ہونا ہی چاہتا ہوں۔ بہت کڑوی دوائیں پینے کو ملتی ہیں، فاقہ کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ بیمار ہونے سے تکلیف برداشت کرنے کی عادت ڈالی جاسکتی ہے۔"

"یہ کیا؟ بیمار ہونے سے آدمی کو تکلیف نہیں ہوتی؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

کرن مسکرایا، بولا۔ "دور، تم نہیں جانتے، بیمار نہ ہونے سے تکلیف برداشت کرنے کی عادت کیسے پڑے گی؟ فاقہ کرنے کی عادت کیسے پڑے گی؟"

اتنی دیر میں کرن کی ماں باہر جا چکی تھی۔

کرن نے کہا۔ "میں نے ڈاکٹر سے کہہ دیا ہے کہ مجھ کو میٹھی دوا ہرگز مت دیجیے گا، صرف کڑوی دوا دیجیے گا!"

"کیوں؟"

کرن نے کہا ۔ "جیل جانے کے بعد تو وہ لوگ بہت تکلیف دیں گے ۔ اسی لئے ابھی سے تکلیف برداشت کرنے کی عادت ڈال رہا ہوں۔ تم بھی عادت ڈالو، ابھی سے تکلیف برداشت کرنے کی عادت رہے گی تو اس وقت کچھ محسوس نہ ہوگا ۔ کاکا بابو نے اس دن تمھیں بلا کر کیا کہا تھا دینو؟ بہت خوش ہوئے ہیں نا ۔ کیوں؟"

دینکر کوئی جواب نہ دے سکا ، اسے کاکا بابو کی باتیں یاد آگئیں ، مگر وہ کرن کے سامنے وہی باتیں کیسے دہراتا ، وہ کیسے کہتا کہ کاکا بابو نے اُسے کرن سے ملنے کو منع کر دیا ہے ۔

کرن نے کہا ۔ "تمھارے کاکا بابو تو اچھے آدمی ہیں ، پر میں پہلے نہیں جانتا تھا بھائی ، کتنے اچھے آدمی ہیں ! اس کے بعد تم تو چلے گئے تھے اور میں ناچتا رہا ، مجھے تمام رات ناچتا رہا ، نہ کھانا کھایا ، نہ سویا ، صرف ناچتا رہا ۔"

اس کے بعد تھوڑے رک کر اس نے پھر کہا ۔ "پڑھے لکھے آدمی ہیں نا ، اسی لیے لائبریری کی اہمیت کو سمجھتے ہیں ۔ ہاں ، تو کیا کہہ رہے تھے تمہارے کاکا بابو؟"

دینکر کی زبان پر آکر بات رُک گئی ۔

کرن نے کہا ۔ "خوب تعریف کر رہے تھے شاید ! بتاؤ نا ۔"

دینکر نے اپنا چہرہ دوسری طرف گھما لیا ۔

کرن نے پھر کہا ۔ "میں جانتا ہوں ، تعریف تو کریں گے ہی ، میں تو چہرہ دیکھ کر ہی آدمی کو پہچان لیتا ہوں ! 'یو تعمیر والی' کتاب لا کر میں پہلے کاکا بابو کو ہی پڑھنے کے لئے دوں گا ، میں نے سب سے پہلے کاکا بابو ہی سے اس کتاب کا تذکرہ بھی کیا ہے ! تم نے تو خود ہی سنا ہے کیسی حوصلہ افزائی کر رہے تھے ، کتنی نصیحتیں کر رہے تھے ! محلے میں ان کے جیسے دو ایک آدمی اور ہوتے تو پھر فکر ہی کیا تھی ! تم بولتے کیوں نہیں ؟ بولو ۔ باتیں کرو ؟"

اس کے بعد چند ثانیے کے رک کر کرن نے پھر کہا ۔ "ہاں ، یاد آیا ، ان دونوں لڑکیوں کو تم نے ممبر بنایا ؟"

"بنا لیا ہے ۔" دینکر نے جواب دیا ۔ "مگر تم زیادہ باتیں نہ کرو ، تمھاری بیماری بڑھ جائے گی بھائی !"

"بنا لیا ہے ؟ تم نے ممبر بنا لیا ہے ؟ دونوں نے کتنا دیا ؟"

"دونوں نہیں ، ایک !"

"ایک کیوں ؟" کرن نے پوچھا ۔ "دونوں کیوں نہیں ؟ یہ لڑکیاں تو بڑی کنجوس معلوم ہوتی ہیں ۔"

"ابھی صرف چھوٹی لڑکی ممبر بنی ہے ۔" دینکر نے جواب دیا ۔ "وہی جس کا نام ستی ہے ! بعد میں بڑی لڑکی کو بھی ممبر بنا لوں گا ۔ بڑی لڑکی زیادہ اچھی اور نیک ہے ، جانتے ہو جس کا نام لکھی دیدی ہے ! سنا ہے اب بڑی لڑکی کی شادی ہو جائے گی بھائی ۔"

"پھر اُسے شادی سے پہلے ہی ممبر بنا لو ، شادی کے بعد سسرال چلی جائے گی تو پھر اس کا ملنا مشکل ہوگا ! اس وقت وہ بچوں کی ماں بن کر بالکل ہی بدل جائے گی !"

دینکر فکر مند سا ہو گیا ــ "شادی کے بعد کیا لڑکیاں بدل جاتی ہیں؟"

"بدلیں گی نہیں؟" کرن نے جواب دیا ــ "کیا تم سمجھتے ہو کہ شادی کے بعد بھی تمھارے ساتھ وہ اسی طرح پیش آئیں گی۔ دیکھو گے، وہ تمہیں پہچاننے گی بھی نہیں۔ اس وقت وہ اپنے شوہر کے ساتھ مگن رہے گی! اس کے بعد جو بچے پیدا ہونا شروع ہوں گے تو سلسلہ بندھ جائے گا، اس وقت بچوں کی ماں ماں کے شور میں تمہاری بات ایک دم بھول جانے گی! تب ہم لوگوں کو بھی لائبریری کے رجسٹر سے ان کا نام کاٹ دینا ہو گا۔"

دینکر کوئی جواب نہ دے سکا۔ لکھی دیدی بدل جائے گی؟ یکسر تبدیل ہو جائے گی؟ بدل جانے کے بعد اس کا چہرہ کیسا دکھائی دے گا۔ دینکر دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ لیکن لکھی دیدی بدل سکتی ہے کیا؟ لکھی دیدی تو اسے سب سے زیادہ مانتی جانتی ہے، سب سے زیادہ اعتماد کرتی ہے اور وہ اسے بے حد چاہتی ہے، اس پر اعتماد کرتی ہے اسی لئے تو اپنے دل کی بات کہہ دیتی ہے۔

کرن نے کہا ــ "میں نے بھوجدا سے تمہارے بارے میں کہا تھا۔ جانتے ہو، بھوجدا نے ایک دن تمہیں وہاں لے جانے کے لئے کہا ہے۔"

اس کے بعد چند لمحوں تک رک کر پھر بولا ــ "ہماری طرح جتنے لڑکے جماعت میں آ جائیں اتنا ہی اچھا ہے، بھوجدا کی جماعت میں ہماری طرح بہت سے لڑکے ہیں، اب تک کتنے آ چکے ہیں، کوئی ٹھیک نہیں۔ سبھی ہمایہ پر تیار ہو رہے ہیں، سمجھے، بھوجدا کی ایک آواز پر سب کے سب ہوا کی طرح تیزی سے نیچے آ جائیں گے۔"

اس کے بعد کرن کہتا ہی چلا گیا ــ "ہندوستان میں کتنے انگریز رہ گئے ہیں تمام بنگالی لڑکے اگر قطار باندھ کر سامنے آ جائیں تو جتنے انگریز ہیں سبھی باپ باپ کر کے انگلستان بھاگ کھڑے ہوں گے دیکھتے نہیں۔ جتنی اچھی اچھی عمارتیں ہیں، اچھی اچھی کاریں ہیں، جتنی اچھی اچھی چیزیں ہیں، ان سب پر انھیں کا قبضہ ہے، یہ لوگ ہمارے سروں پر بیٹھ کر ان کا استعمال کر رہے ہیں اور ہم لوگ اپنے ہی ملک میں ان کے غلام بن کر زندگی گزار رہے ہیں۔ اب یہی جو میرے بابا کی بیماری ہے، یہ اچھی نہیں ہو رہی ہے، دوا خریدنے تک کو پیسے نہیں، اور تم خود اپنے کو لو، دوسروں کا کھانا پکا کر تمہاری ماں تمہاری پرورش کر رہی ہے اور تم بھیک مانگ کر تعلیم حاصل کر رہے ہو، اس کے لئے قصور وار کون ہے؟ تم نے اس مسئلے پر کبھی سوچا ہے؟ ہم لوگوں کو کیوں کھانے کو نہیں ملتا اور اس طرف وہ لوگ کیوں آرام سے زندگی گزار رہے ہیں، عیش کر رہے ہیں؟ کیوں ہمارے ملک کے لوگ، ہمارے ہم وطن پولیس میں ملازم ہو کر ان کے حکم سے ہمارے ہی سروں پر گولیاں چلاتے ہیں؟ چورنگی اتنا صاف ستھرا علاقہ کیوں ہے اور کالی گھاٹ کیوں اتنا گندہ ہے؟ کبھی تم نے یہ سب سوچا ہے؟ کیوں، تم جواب کیوں نہیں دیتے؟ بولو تم نے سوچا ہے؟"

دینکر نے یکایک زبان کھولی ــ "لیکن لکھی دیدی شادی ہو جانے کے بعد بھی نہیں بدلے گی، تم دیکھ لو گے۔"

کرن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ چند لمحوں تک دینکر کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتا رہا، پھر بولا ــ "تم ابھی تک یہی باتیں سوچ رہے ہو؟"

دینکر نے کہا ــ "نہیں، لکھی دیدی تو عام لڑکیوں کی طرح نہیں ہے!"

"عام لڑکیوں کی طرح نہیں ہے؟"

وینکرنے کہا۔" تم نے تو دیکھا ہے۔ تم ہی بتاؤ، ہلکی دیدی کیا عام لڑکیوں جیسی ہے؟"

"عام لڑکیوں جیسی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟" کرن نے جواب دیا۔" دو کان، ایک ناک، جو سب لڑکیوں کے ہوتا ہے وہی ہے، ہلکی دیدی کے اندر ایسی کون سی غیر معمولی بات ہے؟"

وینکر نے کہا۔" نہیں، اس کے چہرے پر بڑی ملاحت ہے، نہیں ہے؟"

"او بابا۔ کرن بلکے سے ہنسا۔" تم تو شاعری کرنے لگے ہو۔ دیکھتا ہوں تم تو خوبصورت چہرہ دیکھ کر سبھی کچھ بھول گئے ہو۔"

وینکر نے کہا۔" نہیں بھائی، تم نہیں جانتے، ہلکی دیدی کو بہت دکھ ہے، تم خود سوچ کر دیکھو، اپنا باپ اور اپنی بہن بھی جب ہلکی دیدی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے، تو اُسے کتنا دکھ ہوگا بھلا۔"

کرن بگڑ گیا، اس نے کہا۔" دیکھو، تم میرے سامنے لڑکیوں کی باتیں نہ کیا کرو۔ لڑکیوں کے بارے میں سوچنا بھی پاپ ہے لڑکیوں سے ملنا بھی پاپ ہے، بھوجوا کہتے ہیں۔ اس عمر میں لڑکیوں سے زیادہ میل جول کرنا بہت خطرناک ہوتا ہے، دنیا اور عاقبت دونوں خراب ہوتی ہیں۔"

"لیکن میں تو زیادہ ملتا جلتا نہیں ہوں بھائی۔" وینکر نے جواب دیا۔

"ہاں! میں تمہیں اچھی بات سمجھا رہا ہوں، زیادہ میل جول نہیں رکھو گے، اس سے تمہارا تمام کام کاج چوپٹ ہو جائے گا۔ یہ لوگ کام بگاڑنے والی پریاں ہیں۔"

"نہیں، میں تو اپنے تمام کام کرتا ہوں۔ لکھتا پڑھتا بھی ہوں، بازار بھی کرتا ہوں اور ان کے یہاں جانے کا اصل مقصد کیا ہے جانتے ہو۔ کاکا بابو کے ذریعے سے نوکری حاصل کرنا۔"

اُسے یاد ہے، ان دنوں وینکر کم از کم اپنے دل کو یہی کہہ کر تسلی دیتا تھا، اُسے ان کے یہاں جانے میں راحت ملتی تھی، ہلکی دیدی کو دیکھنے میں راحت ملتی تھی، ستی کو دیکھنے میں راحت ملتی تھی۔ لیکن اصل میں یہ ایک بہانہ تھا، ورنہ سچ پوچھیے تو اُسے نوکری کی ضرورت تھی، نوکری ہی کے لئے وہ پڑھ رہا تھا اور نوکری نہیں تھی اسی لئے لائبریری کھولی تھی اور نوکری نہیں ہو رہی تھی اسی لئے دوسرے تمام کام کر رہا تھا۔

اُسے آج بھی یاد ہے، صبح ہوتے ہی وینکر بے چین سا ہو اُٹھتا تھا اور ہر روز، ہر گھڑی ہر وقت، دن بھر پیش آنے والے واقعات ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کی تہہ میں جیسے ستی اور ہلکی دیدی چھپی رہتی تھی۔ انہوں نے اسے اس طرح کیوں اپنا بنا لیا تھا، ان کی زندگی کے ڈرامے کے چکر میں وہ کیوں اس طرح اُلجھ گیا تھا اور وہ ان کے لئے اپنی زندگی کی قربانیاں کیوں دیتا رہا تھا، اس کا سبب کون بتا سکتا ہے۔ نہ جانے کہاں کی دو لڑکیاں تھیں، بر ملک کبھی بھوبنیشور کو، جس کا نہ جانے کہاں لکڑیوں کا کاروبار تھا اور اس کے دوست سیجیش بابو کو کون پہچانتا اگر وہ لوگ اُنیس ایک بی، ایشور گنگولی لین کا ایک مکان کرایہ پر نہ لیتے۔ انھیں تو بھوانی پور کے شرفاؤں کے محلے میں رہنا چاہیے تھا۔ انھیں تو بو بازار یا شام بازار کے رؤسا کے محلے میں رہنا چاہیے تھا، لیکن کیوں، کس مصلحت سے، کس سبب سے وہ کالی گھاٹ کے اس گندے اور گنجان محلے میں رہنے چلے گئے تھے، کیوں اگھور بھٹاچارج کے مکان میں رہنے گئے تھے، اگر یہ لوگ وہاں نہ جاتے

تو اس کا کیا نقصان ہو جاتا؟ اور اگر ان کے ساتھ ملاقات نہ ہوتی تو دینکر کا بھی کیا نقصان ہوتا؟ نقصان! نقصان! نقصان کا خیال آتے ہی دینکر سہم اُٹھتا! اگر سچ ہے اس کی ملاقات ہی کو نقصان کا باعث مان لیا جائے تو کیا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا؟ کیا اس کی زندگی میں کوئی فائدہ نہیں ہوا؟ ——————— آج اتنے دنوں کے بعد ان پرانے دنوں کو یاد کر کے دینکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان دنوں کے تمام واقعات کے درمیان کہیں پر اس کی تقدیر بنانے والے نے بڑی زبردست سازش کی تھی، ورنہ .....

اُسے یاد ہے، اس رات ملکی دیدی نے اُسے پھر بلایا تھا، کھانا کھانے کے بعد بہت رات گئے جب دینکر آنگن کے کونے میں امرود کے پیڑ کے نیچے لوٹا لے کر منہ ہاتھ دھونے گیا تھا۔ تو ملکی دیدی نے اُسے بلایا تھا، کرن کے یہاں سے لوٹنے میں اُسے کافی رات ہو گئی تھی۔ کرن کے ساتھ باتیں کرتے وقت واقعی اُسے وقت کا احساس نہیں رہتا تھا۔

دینکر نے کتنی ہی بار کہا تھا — "اب میں چلتا ہوں بھائی"۔

لیکن کرن نے اُسے روک دیا تھا — "بیٹھو نا، اتنے سویرے گھر جا کر کیا کرو گے، میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرو گے تو بھی یہ ایک کام ہوگا"۔

"تمہارے پاس بیٹھنے میں اور تم سے باتیں کرنے میں مجھے تو بہت مزہ آتا ہے" دینکر نے کہا — "اس راحت کو تم نہیں سمجھ سکتے"۔

"پھر تم بھاگے کیوں جا رہے ہو؟"

اس کا جواب دیتے وقت دینکر قدرے جھجکا، پھر بولا — "سبھی تم سے ملنے کو منع جو کرتے ہیں"۔

"کیوں میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ میں نے تمہارا کیا نقصان کیا ہے؟ تم ہی بتاؤ"۔

نقصان! واقعی تو، اس دن بھی دینکر کے سامنے کرن نے یہی ایک سوال اُٹھایا تھا، حالانکہ نفع اور نقصان کا حساب کرنے کا خیال اس وقت تو اس کے دل میں نہیں آیا تھا۔ کرن نے کیا واقعی اس کا کچھ نقصان کیا تھا؟ نقصان کی بات سوچتے ہی دینکر کو فائدے کی بات یاد آ جاتی۔ زندگی میں نقصان کا حساب کرتے وقت بار بار اس کے دل میں آیا تھا کہ دنیا میں نقصان شاید کچھ بھی نہیں ہے۔ نقصان کی طرف جیسے کوئی برابر نفع کا ہندسہ بٹھا کر بڑے انوکھے طریقے پر ملا دیتا تھا! کس طرح ملا دیتا تھا، اس بارے میں سوچ کر بھی حیرت ہوتی تھی ——

دینکر نے کہا تھا — "تم کچھ خیال مت کرو گے بھائی"۔

"دور، وہ سب خیال کرنے سے چلے گا" کرن نے جواب دیا تھا — "یہ سب زنانہ پن میرے اندر نہیں ہے، ملو گے تو ٹھیک ہے، نہیں ملو گے تو بھی ٹھیک، مجھے اس کی کیا پروا ہے"۔

کرن کی بات سن کر اس دن دینکر کو بڑی تکلیف محسوس ہوئی تھی۔

اس نے کہا تھا — "میں اگر تم سے نہ ملوں تو تمہیں ذرا بھی دکھ نہ ہوگا کرن؟ کوئی صدمہ نہیں ہوگا؟"

کرن بستر پر لیٹے لیٹے ہنسنے لگا تھا۔

"صدمہ؟ صدمہ کیوں ہوگا؟ مجھے صدمہ ودمہ نہیں ہوتا بھائی، تم نہیں ملو گے تو بھی بہت سے ملنے والے لوگ ہیں، اس دنیا میں

کمزور سا آدمی ہیں۔ تم نے دنیا کو کیا اتنا چھوٹا سمجھا ہے؟ تم نہیں ملو گے تو تم سے ملنے دکھ یا صدمہ کس بات کا؟ ملنے کی بات تو خیر چھوڑو، تم اگر مر بھی جاؤ گے تو بھی مجھے صدمہ نہیں ہوگا۔"

"نہیں ہوگا؟" دیپکر نے حیرت سے کرن کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ اور صرف تم ہی کیوں، میرے بابا مر جائیں تو بھی دکھ نہ ہوگا، میری ماں مر جائے پھر بھی دکھ نہ ہوگا، مجھے کسی کے مرنے جینے کا کوئی غم نہیں ہے! پہلے تکلیف ہوتی تھی! جب سی۔ آر۔ داس مرے تھے تو مجھے بے حد تکلیف ہوئی تھی، میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، پہلے پہل بچپن میں بابا کی تکلیف دیکھ کر مجھے رونا آتا تھا، ماں کی تکلیف دیکھ کر مجھے رونا آتا تھا، کھانا نہ ملتا تو مجھے رونا آتا تھا آخر کار اب میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ رونا زنانہ پن ہے۔"

"یہ کیا؟"

"ہاں، رونے کے معنی شکست تسلیم کر لینے کے ہیں، اس دنیا میں جو روتا ہے وہ ہار جاتا ہے۔"

دیپنکر کی زبان سے بہت دیر تک کوئی بات نہیں نکلی، کرن کی باتیں سن کر اُسے محسوس ہوا جیسے کرن بہت کٹھور ہو، سنگ دل ہو۔ اُسے محسوس ہوا تھا جیسے کرن کے دل نہیں ہو! بہت بے مروت، بہت خود غرض ہو۔

کرن نے کہا تھا۔" ورنہ میری جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو گلے میں پھندا لگا لیتا، گنگا میں ڈوب مرتا، ریل کے نیچے سر دے دیتا جانتے ہو، لیکن اتنی آسانی سے شکست تسلیم کر لینے سے تو کام نہیں چلے گا، میں اسے اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہوں۔"

"کس کو؟"

کرن ہو ہو کر کے ہنسنے لگا، بولا ۔" اس زندگی کو! یہ بہت پاجی ہے، سمجھے۔"

اُس روز کرن کا قہقہہ سن کر دیپنکر نے خود کو بہت حقیر محسوس کیا تھا اور دیپنکر کو اسی دن پہلی بار زندگی کا اسرار معلوم ہوا تھا اُسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ بھی تھوڑا تھوڑا زندگی کا مفہوم سمجھنے لگا ہے، زندگی کی تصویر دیکھنے لگا ہے، زندگی کو محسوس کرنے لگا ہے، زندگی کو برتنے لگا ہے۔

"ہاں، اس کو جتنا دو گے یہ اتنا ہی زیادہ مطالبہ کرے گی، یہ بہت حریص ہے، لالچی ہے، اس کی احتیاج کی کوئی کمی نہیں ہے، اس کی جتنی بھی خوشامد کرو گے، یہ اتنی ہی مشکل ہوتی جائے گی! جتنا دیتے جاؤ، پھر بھی لے گی، اور لاؤ، جتنا رو دو گے اتنا ہی یہ کہے گی، اور رو دو۔"

دیپنکر نے کہا۔" لیکن مجھے تو بہت دکھ ہوتا ہے بھائی، مجھے تو بات بات پر تکلیف ہوتی ہے، کاکا بابو نے جب تم سے ملنے کے لئے منع کیا تھا، اس وقت بھی مجھے بہت تکلیف پہنچی تھی بھائی، اتنی تکلیف پہنچی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا کرن! اب میں تم ہی سے پوچھتا ہوں — میں کاکا بابو کی بات مانوں یا تمہاری بات مانوں؟"

کرن نے کہا۔" جو تمہاری مرضی ہوگی وہ کرو گے! مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ تم اگر میری بات نہیں بھی مانو گے تو بھی مجھے کوئی دکھ نہ ہوگا، زیادہ سے زیادہ لائبریری بند کر دوں گا۔"

"لیکن میری خواہش تو یہ ہے بھائی" دیپنکر نے کہا "کہ میں تمہاری بات مانوں۔"

"تو پھر وہی کرو، پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"لیکن پھر سوچتا ہوں کہ کاکا بابو کی بات نہیں مانوں گا تو وہ مجھے فرصت نہیں دلوائیں گے؟ جانتے ہو سبھی مجھے تم سے ملنے کے لئے منع کرتے ہیں، میری ماں منع کرتی ہے، کاکا بابو منع کرتے ہیں، کاکی ماں منع کرتی ہیں۔ لکھی دیدی منع کرتی ہے بھائی، کوئی بھی تمہیں پسند نہیں کرتا، یہ لوگ تمہیں کیوں پسند نہیں کرتے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"چلو، یہ بھی اچھا ہوا۔ سچ کہتا ہوں، اب کوئی ڈر نہیں۔"

دیپنکر حیرت سے کرن کی طرف چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔ یکایک کرن کا چہرہ کھل اٹھا تھا، جیسے یکایک وہ بہت حسین دکھائی دینے لگا ہو، جیسے وہ صحت یاب ہو گیا ہو۔

"اب کوئی ڈر نہیں ہے دیپو۔" اس نے کہا "اب کوئی ڈر نہیں، یوں سمجھو قلعہ فتح ہو گیا۔"

کرن کو اس طرح خوش ہوتے دیکھ کر دیپنکر کو بڑا اچنبھا سا ہوا۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ سبھی لوگ اسے ناپسند کرتے ہیں یہ جان کر وہ اس قدر خوش بھی ہو سکتا ہے۔ دیپنکر تو اسے یہ بات کہتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بات وہ کرن سے کس طرح کہے گا، ایسی تکلیف دہ بات وہ شروع کس طرح کرے گا۔ لیکن وہی بات سن کر وہ اس طرح اچھل پڑے گا، یہ تو دیپنکر نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

دیپنکر نے کہا "کرن، کرن، ارے تمہیں یہ کیا ہو گیا؟"

کرن نے کہا "خوشی نہیں ہوگی، تمہارا کیا خیال ہے؟"

یکایک اس نے آواز دی "ماں، ماں۔"

دیپنکر ہکا بکا سا کرن کی حرکت دیکھنے لگا، کرن کی ماں اس وقت "تک اوسارے پہ اندھیرے میں بیٹھی ہوئی جینو کات رہی تھی، کرن کی آواز سن کر کمرے میں آئی اور پوچھا "کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟"

"ماں دیپو ایک بہت اچھی خبر لے کر آیا ہے، تم بھی سن لو" وہ چہکا "خوش خبری ہے۔"

اس کی ماں کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا اور دیپنکر بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔

ماں نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

اتنا کہہ کر اس نے دیپنکر کی طرف دیکھا، کہیں لڑکے کی نوکری کی خبر تو نہیں؟ لڑکے کو روپیہ ملنے والا ہے؟ اس دنیا میں روپیہ ملنے کی خبر سے زیادہ اچھی خبر اور کیا ہو سکتی ہے! اس دنیا میں روپیہ ہی تو سب کچھ ہے۔ روپیہ رہنے کے معنی ہی تو سب کچھ ہے اس دنیا میں، روپیہ کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے!"

"کیا خبر ہے بابا دیپو؟ کرن کی نوکری کی خبر ہے؟"

کرن نے خوش خبری سنائی "تم نے سنا ماں دیپو کیا کہتا ہے! سب لوگ مجھے ناپسند کرتے ہیں، مجھ سے نفرت کرتے

ہیں، کوئی میری صورت دیکھنا نہیں چاہتا، اُف! اتنے دنوں کے بعد آج ذرا طبیعت اچھی لگ رہی ہے، آج میری بیماری کم ہو گئی ہے ماں، اب مجھے کوئی فکر نہیں۔"

ماں کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں چھا گئیں۔

اس نے دیپکر کی طرف دیکھ کر کہا — "تم نے اس کی بات سن لی نا؟"

دیپکر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ ماں پھر کہنے لگی —

"تم تو دیکھ ہی رہے ہو! تمہاری ماں کی قسمت اچھی ہے۔ تمہاری ماں نے بہت نیکی کمائی تھی اسی لئے اُسے تم جیسا لڑکا ملا ہے۔ تم کس طرح امتحان پاس کر گئے اور اب بھی پڑھ رہے ہو اور اب نوکری بھی مل جائے گی! اور ایک میری قسمت ہے!"

اتنا کہہ کر ماں پھر باہر چلی گئی۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"ماں تو پرانے زمانے کی آدمی ہے" کرن نے کہا — "لکھنا پڑھنا تو جانتی نہیں، صرف جذبات سکتی ہے، اسی لئے گھُٹ گھُٹ کر رونے لگی ہے۔"

"لیکن تمہیں کوئی نوکری تو کرنی ہی ہو گی؟" دیپکر نے ٹوکا — "نوکری نہیں کرو گے تو خانہ داری کس طرح چلاؤ گے؟"

"اب ٹھیک چلا لوں گا" کرن بڑی بے فکری سے بولا — "دیکھو بیٹا، اب کوئی ڈر نہیں، جب کوئی مجھے پسند نہیں کرتا، جب سبھی مجھ سے نفرت کرتے ہیں، تو اب چلانے میں کس بات کا خوف ہے؟ اب تو زندگی میں کوئی کشش بھی باقی نہیں رہی اور جب آنکھ کی شرم ہی نہیں رہی تو اب مجھے کون پا سکتا ہے؟ اب تو میں راجہ ہوں، جو خوشی ہو گی کروں گا۔"

بولتے بولتے کرن جیسے جوش میں آ گیا۔

بولا — "اب مجھے کس کی پروا ہے! شرم بھی اب باقی نہیں رہی اور کسی کا خوف بھی باقی نہیں رہا، اب کوئی میرے لئے نہیں سوچے گا اور اب میں بھی کسی کے بارے میں نہیں سوچوں گا! اچھا ہی ہوا۔ تم بھی اب مجھ سے مت ملا کرو، اب تم بھی میرے یہاں مت آیا کرو، تم بھی مجھے — اپنی صورت مت دکھاؤ، اچھا ہی ہوا۔ اچھا ہی ہوا۔ دیکھو، تم صرف ایک کام کر دو۔"

"کام!" دیپکر نے کہا — "کون سا کام؟" تم بولو نا! میں ابھی کر دوں گا بھائی! تمہارے لئے میں سب کچھ کر دوں گا۔ بتاؤ کیا کام ہے؟"

"سب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں" کرن نے کہا — "صرف ایک کام کرنے ہی سے ہو جائے گا — مسٹر داتار تمہیں یاد ہے نا؟ وہی ایس۔ ایس داتار؟ تمہارے یہاں کے کرایہ دار کی لڑکی کا وہی دوست؟"

دیپکر چونک اٹھا۔ "ایس۔ ایس داتار! لکھو دیدی کا شمبھو!"

اس نے کہا — "ہاں! اچھی طرح یاد ہے! کیا ہوا اس کو؟"

"بہت دنوں پہلے اس نے پانچ روپیہ کا ایک نوٹ دیا تھا، یاد ہے؟"

"اچھی طرح یاد ہے" دیپکر نے جواب دیا — "کیوں کیا ہوا اس کا؟ تم سے ملاقات ہوئی تھی کیا؟"

"نہیں بھائی، وہ نوٹ جعلی ہے۔" کرن نے کہا۔

"جعلی ہے؟"

دینکر جیسے آسمان سے زمین پر آ گیا، اس نے انھیں جعلی نوٹ دیا ہے، اس روز اتنی مٹھائی کھلائی، اتنی خاطر کی اور دونوں کو اچھی نصیحتیں کیں، اچھی اچھی باتیں بتائیں، مگر اصل میں وہ دھوکہ باز ہے! اتنا بدمعاش آدمی ہے وہ! حیرت ہے! دینکر کی حیرانی کی انتہا نہ تھی۔ اس دنیا میں کیا کسی کا اعتبار نہیں! وہی شمبھو داتار جس کے لئے دینکر نے کتنے ہی دنوں تک نہ جانے کیا کچھ کیا تھا، کتنی ہی بارشوں میں بھیگا تھا، کتنے ہی دنوں تک گھنٹوں کھڑے رہ کر اس کا انتظار کیا تھا اور انتظار میں کھڑے کھڑے اس کے دونوں پاؤں دکھنے لگتے تھے۔ وہی شمبھو داتار ان دونوں کو بچہ سمجھ کر دھوکہ دے گیا!

دینکر نے کہا۔ "میں کل ہی لکھی دیدی کو کھری کھری سناؤں گا بھائی، میں اس سے کہوں گا کہ تمہارا وہ آدمی اچھا نہیں ہے۔ تم اس سے مت ملا کرو لکھی دیدی، وہ بدمعاش آدمی ہے۔ اس نے ہم لوگوں کو بچہ سمجھ کر دھوکہ دیا ہے۔"

کرن مسکرانے لگا۔

دینکر نے پھر کہا۔ "تم مسکرا رہے ہو، لیکن مجھے بڑا غصہ آ رہا ہے بھائی! لکھی دیدی بھی عجیب ہے! ایسے آدمی سے میل جول رکھتی ہے! اسی لئے اتنا دکھ اٹھاتی ہے، اسی لئے تو کوئی اُسے پسند نہیں کرتا، اسی لئے تو لکھی دیدی کے بابا نے اُسے یہاں بھیج دیا ہے۔ ٹھہرو، میں ابھی جاتا ہوں، میں ابھی جا کر اس سے کہوں گا۔"

اتنا کہہ کر دینکر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن کرن نے روک دیا، وہ اس وقت تک مسکرا رہا تھا۔

"تم تو پھر بھی مسکرا رہے ہو۔" دینکر نے کہا۔ "لیکن مجھے بڑا غصہ آ رہا ہے۔"

کرن نے کہا۔ "اس سے بہتر ہے تم ایک کام کرو، روپیہ لے جا کر اُسے واپس کر دو۔ شمبھو داتار نے ہم لوگوں کو اپنا پتہ بھی تو دیا ہے۔"

"نہیں، میں پہلے لکھی دیدی کے پاس جاؤں گا۔" دینکر نے کہا۔ "لکھی دیدی پر ابھی جا کر خوب بگڑوں گا۔ اُسے جلی کٹی سناؤں گا، کہوں گا کہ تم لوگ مجھے غریب سمجھتے ہو، اسی لئے اس طرح ٹھگتے ہو؟ غریب ہیں تو کیا ہوا، ہم لوگ انسان نہیں ہیں؟"

اس کے بعد کچھ سوچ کر اس نے کہا۔ "اچھا، دے دو، روپیہ دے دو، روپیہ لے جا کر لکھی دیدی کو بھی لوٹا دوں گا۔"

کرن نے اسی طرح مسکراتے ہوئے تکیے کے نیچے سے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور دینکر نوٹ لے کر فوراً باہر نکل گیا۔ باہر اس وقت بھی گہرا اندھیرا تھا، یہاں پر سے نیپال بھٹاچارج لین تنگ ہو کر بستی کے اندر تک چلی گئی تھی، دینکر کے باہر نکلتے ہی جیسے اندھیرے نے اُسے نگل لیا، بچپن سے وہ برابر یہاں آتا رہا تھا اسی لئے راستہ اسکا پہچانا ہوا تھا، پھر بھی اس نے کئی بار ٹھوکر کھائی۔

یکایک عقب سے کسی نے پکارا۔ "کھوکا!"

دینکر نے مڑ کر دیکھا، کوئی چیز بھی صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی، پھر بھی اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے دھندلا دھندلا سا ایک سفید سایہ تھوڑی دور پر کھڑا ہے۔

"کون ؟" اس نے سوال کیا۔

اب کے وہ سفید سایہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اس کی طرف بڑھنے لگا، آواز بہت بھاری تھی، لیکن اندھیرے میں پہچاننا مشکل تھا، دینکر بھی تھوڑی دور آگے بڑھ گیا، اب چہرہ صاف دکھائی دینے لگا تھا، خوب لمبا چوڑا سا چہرہ تھا، اس نے اندازہ کیا کہ وہ آدمی گورا چٹا سا تھا، بالکل دودھ کی طرح سفید۔ وہ کرتا اور دھوتی میں ملبوس تھا اور پاؤں میں پمپ جوتا چمک رہا تھا، وہ دینکر کے جسم سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے غور سے اس کے سراپا کا جائزہ لینے لگا۔ دینکر پھر بھی اُسے پہچاننے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کون ہے ؟ اس نے اسی کو پکارا تھا ؟ یا کسی دوسرے کو ؟

"آپ نے مجھے آواز دی تھی ؟" دینکر نے پوچھا۔

"تم کہاں گئے تھے ؟"

بڑی بھاری اور گرج دار آواز تھی، اس کی آواز سن کر دینکر سراپا لرز گیا۔

"کیوں ؟ آپ کون ہیں ؟" اس نے پوچھا۔

"تم اتنی رات کو کہاں گئے تھے ؟" اس نے پوچھا۔

"کرن، میں اپنے دوست کرن کے یہاں گیا تھا۔" دینکر نے جواب دیا۔ "کرن بہت بیمار ہے۔ اسی لئے میں اسے دیکھنے گیا تھا"

"تم روز جاتے ہو ؟"

"نہیں، کبھی نہیں جاتا، مجھے سب لوگ اس کے یہاں جانے سے منع کرتے ہیں۔"

"تم کہاں رہتے ہو ؟" اس آدمی نے سوال کیا۔

دینکر کہاں رہتا ہے، کہاں پڑھتا ہے، کیا کرتا ہے، گھر کا پتہ، گھر میں کون کون ہے، وطن کہاں ہے، اس آدمی نے اس سے مختلف سوالات کئے، لیکن اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا، اس کا بہت بڑا سا چہرہ تھا اس آدمی کے سامنے دینکر نے خود کو بہت حقیر اور بہت چھوٹا محسوس کیا اور اس کے سوالات کے جواب دیتے وقت اُسے بہت خوف محسوس ہوا، اتنی رات گئے اس بستی کے درمیان کھڑے ہو کر وہ اتنی پوچھ تاچھ کیوں کر رہا ہے ؟ اتنی جرح کیوں کر رہا ہے آخر ؟

وہ باتیں کرتا ہوا ایشور گنگولی لین کی طرف چلا آیا اور دینکر بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں ڈر بھی رہا تھا۔ یہ کون آدمی ہے ؟ اور جب ایشور گنگولی لین کی روشنی میں آکر اس نے اس آدمی کا چہرہ دیکھا تو اُسے اور بھی خوف محسوس ہونے لگا۔ بے حد بیچا تھا وہ شخص، اس کی رنگت دودھ کی طرح سفید تھی، انگریزوں کی طرح، اور اس کے سر کے بال بھی انگریزوں ہی کی طرح بھورے تھے۔ اس نے ادھی کا کرتا پہن رکھا تھا جس کی دونوں آستینوں میں گلے سے چنیوٹ ڈالی ہوئی تھی اور شانتی پوری دھوتی چنیائی ہو اور پاؤں میں چمڑے کا پمپ جوتا تھا۔

اُنیس ایک بی، ایشور گنگولی لین کے مکان کے سامنے آتے ہی دینکر کی ہمت عود کر آئی، اب ضرورت پڑنے پر وہ جست بھر کے اندر داخل ہو سکتا ہے، اب اُسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ اب اُسے کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

دینکر یکایک مکان کے دروازے کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

اور وہ آدمی سیدھا چلا گیا اور چلتے چلتے نیپال بھنڈار کا اسٹریٹ کے سامنے جاکر غائب ہوگیا۔ دینکر تھوڑی دیر تک کھڑا کھڑا اسی سمت دیکھتا رہا اور اس کے بعد گھر کے اندر چلا گیا۔

ماں نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "تم اتنی دیر تک کرن کے یہاں کیا کر رہے تھے؟ ملاقات کرکے جلدی کیوں نہیں آئے؟"

"اس کی طبیعت خراب ہے۔ ملاقات کرکے فوراً کیسے چلا آتا؟" دینکر نے جواب دیا۔

اس دن ماں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا تھا، شاید وہ بسنتی دیدی کی شادی کے جھمیلے میں پھنسی ہوئی تھی۔ ماں جیسے دل ہی دل میں بہت سارے اہتمام کئے بیٹھی تھی۔ نہ جانے وہ لوگ کب دیکھنے آجائیں، انھیں کہاں بٹھایا جائے، کیا کھلایا جائے۔ دینکر نے لکھمی دیدی کے جنگلے کی طرف دیکھا۔ لکھمی دیدی کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی، شاید وہ پڑھ رہی ہے۔ نیچے کے کمروں میں بھی روشنی ہو رہی تھی، اس مکان میں ابھی تک کوئی سویا نہیں تھا، اتنے سویرے تو اس مکان میں کوئی سوتا بھی نہیں تھا، کاکا بابو تیسری منزل کے کمرے میں ہوں گے اس وقت ایک بار وہ دوڑکر وہاں سے ہو آئے تو کیسا رہے، وہ جاکر صرف چند باتیں کہہ کر چلا آئے گا، روپیہ واپس دے دے گا، ویسے روپے کی ضرورت نہیں اس روپے سے دینکر کو گھن آنے لگی تھی۔ لیکن اگر وہاں پر بسنتی بھی موجود ہوئی! بسنتی کے سامنے تو لکھمی دیدی سے ایسی باتیں نہیں کہی جا سکتیں۔ اس وقت کمرے میں بسنتی اور لکھمی دیدی دونوں ہی ہوں گی۔ دونوں ایک ہی کمرے میں تو رہتی ہیں، ایک ہی کمرے میں پڑھتی بھی ہیں اور سوتی بھی ہیں۔ اس وقت اگر دینکر وہاں جائے گا تو بہت ممکن ہے اس روز کی طرح آج بھی کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جائے" اور دونوں بہنیں دینکر کی وجہ سے ایک دوسرے سے الجھ پڑیں گی۔ اور اُسے پھر لکھمی دیدی کی جھڑکیاں سننی پڑیں گی اور سخت سست باتیں برداشت کرنی ہوں گی اور بسنتی کے سامنے وہ اُسے بہت بُری طرح ذلیل کر دے گی۔ اس وقت تو دینکر کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکے گا۔ پھر؟ پھر کیا ہوگا؟

مگر آخر کار لکھمی دیدی سے اس کی ملاقات ہو ہی گئی۔

کھانا کھانے کے بعد وہ امرود کے پیڑ کے نیچے چہل قدمی کر رہا تھا کہ یکایک لکھمی دیدی کی آواز سنائی دی۔

"اے سنو!"

دینکر جیسے اسی آواز کا منتظر تھا، وہ جلدی سے سامنے چلا گیا اور بولا ———

"لکھمی دیدی، میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا، میں بڑی دیر سے تمہارے یہاں جانے کا ارادہ کر رہا تھا، ایک بہت ضروری کام تھا۔!"

"میں لکھمی دیدی نہیں بسنتی ہوں!"

جیسے یکایک آسمان سے ٹوٹ کر بجلی گری، دینکر کے ہاتھ سے پانی کا لوٹا چھوٹ کر نیچے گر پڑا اور اینٹ سے ٹکرا کر جھن جھن کی آواز پیدا کرتا ہوا ایک طرف لڑھک گیا۔

بسنتی کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا، اس کے چہرے پر پریشانی جھلک رہی تھی، اُس کا چہرہ دیکھ کر دینکر ڈر سا گیا۔

"میں نے سوچا تھا . . . ."

ستی نے اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے یکایک پوچھا۔ "لکھی دیدی کہاں گئی ہے، تم جانتے ہو؟"

"لکھی دیدی؟ لکھی دیدی کہاں گئی ہے؟ گھر میں نہیں ہے؟"

دینکر کے حیرت کی انتہا نہ تھی۔

"نہیں، صبح کو کالج گئی تھی، اب رات کے دس بج رہے ہیں، ابھی تک نہیں لوٹی۔" ستی نے جواب دیا۔

دینکر خاموش رہا۔ ستی نے پھر پوچھا۔ "کہاں گئی ہے، تم کچھ جانتے ہو؟"

دینکر نے کہا۔ "میں سچ کہتا ہوں، مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"پھر لکھی دیدی گئی کہاں؟ تم ضرور جانتے ہو!"

"کہاں گئی ہے، مجھے کیا معلوم، واہ رے۔" دینکر نے کہا۔ "وہ کہاں جاتی ہے، مجھ سے کیا پوچھ کر جاتی ہے؟ میں تو خود ہی لکھی دیدی کو ڈھونڈ رہا تھا، میں خود لکھی دیدی سے ملنا چاہ رہا تھا ابھی۔"

ستی جیسے کچھ سوچنے لگی۔

"لیکن لکھی دیدی تو اس طرح کبھی نہیں جاتی تھی۔" دینکر نے کہا۔ "اتنی رات تو اُسے کبھی نہیں ہوتی تھی!"

ستی اندر چلی جا رہی تھی، دینکر نے اُسے آواز دے کر بلایا، "سنو۔"

اس کے بعد دینکر خود ہی دروازے کے اندر چلا گیا، بولا۔ "اگر لکھی دیدی آج واپس نہیں آئی تو کیا ہوگا؟"

"اس بارے میں تمہیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔" ستی نے جواب دیا۔

دینکر نے کہا۔ "میں تلاش کرنے جاؤں؟"

"اتنی رات گئے تم کہاں تلاش کرنے جاؤ گے؟" ستی نے پوچھا۔

واقعی! اتنی رات گئے وہ کہاں تلاش کرنے جائے گا! لکھی دیدی کہاں مل سکتی ہے! لکھی دیدی کہاں گئی ہوگی!

دینکر نے کہا۔ "لکھی دیدی کے کالج میں جا کر پتہ کروں؟"

"نہیں۔" ستی نے جواب دیا۔ "کالج سے پتہ کر لیا گیا ہے، آج لکھی دیدی کالج گئی ہی نہیں۔"

"کالج گئی ہی نہیں؟ یہ کیا؟ کالج نہیں گئی تو کھا پی کر صبح ہی صبح کہاں چلی گئیں؟"

"تمہیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے دیپو۔" ستی نے کہا۔ "کاکا بابو خود تلاش کرنے گئے ہوئے ہیں۔"

اتنا کہہ کر ستی اندر چلی گئی اور دینکر تھوڑی دیر تک وہیں پہ کھڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ آنگن میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ ـــ پھر لکھی دیدی کہاں چلی گئی۔ وہ کہاں جا سکتی ہے! لکھی دیدی کہاں گئی ہو گی!

کالج جاتے وقت ایک بار نرین بابو کے یہاں جانے کی بات تھی، ماں نے ہی وہاں جانے کے لئے کہا تھا۔ کتابیں کتابیں خرید کرائی جائے۔ دوسروں کی مدد کرنے کی ایسی غرض کس کو پڑی ہوتی ہے۔ یہ دُنیا اتنی سیدھی نہیں ہے اور نہ اس دُنیا کے لوگ؟

اتنے نیک ہیں۔ بار بار یاد دہانی کرنی پڑے گی، بار بار خوشامد کرنی پڑے گی، بار بار ملاقات کرنی پڑے گی تب کہیں کام بننے کی امید ہو سکتی ہے

تیرہ چودہ برس ہو، پھر بھی نرپن بابو نے اُسے فوراً پہچان لیا، انہوں نے کہا۔" اب آئے ہو؟ اس وقت تو تم سے بات کرنے کی مجھے فرصت نہیں۔"

دینکر نے کہا۔" ماں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے ایک بار مل لوں، دراصل ماں ہی نے مجھے زور دے کر آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"پھر اب تمہیں آنے کی کوئی ضرورت نہیں، تم اپنی ماں کو ہی ایک بار بھیج دو گے۔"

اور دینکر جب واپس آنے لگا تو انہوں نے پھر اُسے بلایا۔

"اے چھوکرا، سن جاؤ۔"

دینکر کو چھوکرا کا لفظ بہت بُرا لگا، پھر بھی وہ ان کے قریب چلا گیا۔

نرپن بابو نے کہا۔" تم اپنی ماں سے کہو گے، ابھی تین چار اسامیاں خالی ہوئی ہیں تین چار دنوں میں لوگ لئے جائیں گے۔"

"اچھی بات ہے، میں کہہ دوں گا۔" دینکر نے جواب دیا۔

"ذرا جلدی کرنے کو کہو گے۔" نرپن بابو نے پھر کہا۔" کیا سمجھے، ماں سے کہو گے، بازار بہت خراب ہے، بھات پھینکنے کے بعد کوؤں کی کمی نہیں ہوتی، یہ تو جانتے ہی ہو۔"

دینکر کو یہ باتیں اچھی نہیں لگی تھیں، پچیس روپے کی معمولی سی رقم تھی، اس رقم کی نرپن بابو کے نزدیک کون سی اہمیت تھی! لیکن اتنے روپوں کا ماں کہاں سے انتظام کرے گی اور اگر کہیں سے انتظام ہو بھی گیا تو وہ یہ ملازمت نہیں کرے گا، یہ بھی تو ایک طرح کی رشوت تھی!

راستے میں ٹرامیں چل رہی تھیں، بسیں بھی چل رہی تھیں، بہت ساری نئی نئی بسیں آگئی تھیں کسی کا نام "اروشی" تھا تو کسی کا "مینکا" اور کسی کا نام "شکنتلا" تھا، یہ تمام لڑکیوں کے نام تھے۔ بسوں کو لڑکیوں کا نام دے دینے سے کیا زیادہ رش ہوتی ہے! یہ بسیں دندناتی ہوئی ٹراموں کے قریب سے گزر جاتی تھیں۔ اور دینکر آنکھیں پھیلا کر دیکھنے لگتا۔ اب لوگوں کی تعداد اور زیادہ بڑھ گئی تھی، پہلے شام کے وقت راستے سنسان ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن اس کے بعد اس طرف ٹرام لائن بچھا دی گئی اور کیوڑا تلا کی طرف سے ایک چوڑی سڑک نکالی گئی اور بڑے بڑے نالابوں کو بھر دیا گیا اور پھر یہی سڑک ٹکیا پاڑا سے ہوتے ہوئے حاجی قاسم کے باغ کو بائیں طرف چھوڑ کر سیدھی بالی گنج اسٹیشن تک جا پہنچی۔ دھان کے کھیت، میدان، دھوبی پاڑا، آگن کھاری پوکھر، اور ٹیپو سلطان کی عمارت ——— سب جیسے ایک ہی رات میں بدل گئے، ان کی ہیئت تبدیل ہو گئی! جب پہلے پہل یہ سڑک بن رہی تھی، دینکر اکثر وہاں جا کر کھڑا ہو جاتا اور قلیوں سے دریافت کرتا۔

"کیوں جی! یہاں پر کیا بنے گا؟"

"سڑک بنے گی۔" قلی سب جواب دیتے۔" سڑک پر ٹرام چلے گی۔"

دینکر پوچھتا ـــ "اس طرف بھی شیام بازار کی طرح آبادی ہو جائے گی کیا؟"

اگر اس طرف شیام بازار، بوبازار اور سیالدہ جیسی آبادی ہو جائے گی تو کیسا لگے گا، دینکر اپنے تصور میں اس کا خاکہ تیار کرنے لگا۔ اس وقت تیلیوتلا کے سامنے یہ گندا تالاب نہیں رہے گا۔ پھر بھوتوں کا کوئی خوف بھی نہیں رہے گا، پہلے ٹیپو سلطان کی عمارت کے سامنے کھڑے ہونے میں ڈر لگتا تھا۔ برگد کے پیڑ کی بڑی بڑی جٹاؤں نے پوری عمارت کو جیسے چاروں طرف سے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا ـــ اب کچھ دنوں بعد وہاں پر روشنی ہی روشنی ہوگی۔ حیرت ہے! ایک دن دینکر کا کتنا غلط خیال تھا، اس کا خیال تھا کہ ٹیپو سلطان اسی عمارت میں رہتا تھا، لیکن بڑے ہونے کے بعد اس کی غلط فہمی دور ہو گئی تھی، اس عمارت میں ٹیپو سلطان نہیں، اس کے لڑکے رہتے تھے۔ بچپن میں انسان بہت ساری غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتا ہے اور جب بڑے ہو کر ان باتوں کو یاد کرتا ہے تو خود ہنسی آجاتی ہے۔

"یہاں سے ہٹ جائیے بابو" قلی سب جواب دیتے ـــ "دھول سے آپ کا جسم بھر جائے گا"

گرمی، برسات اور سردی، کتنے ہی موسم دینکر نے یہاں گوائے تھے، اس کی نگاہوں کے سامنے وہ پتلی سی سڑک، وہ بالی گنج اور وہ ٹالی گنج پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئے تھے، اب تو پہچاننا بھی مشکل تھا۔

دینکر دریافت کرتا ـــ "ایشور گنگولی لین بھی ٹوٹ جائے گی؟"

ان دنوں دینکر سوچتا، اگر قلیوں نے ایشور گنگولی لین کو بھی توڑ دیا، اگر ایشور گنگولی لین کو بھی اسی طرح توڑ کر چور چور کر دیا گیا تب کیا ہوگا، تب دینکر کہاں رہے گا! اگھور دادو کہاں جائیں گے اور بنتی دیدی پھر کہاں جائے گی! اور چھیٹے پھونٹا پھر کہاں رہیں گے۔ پھر تو ایشور گنگولی لین کی گلی بھی اتنی تنگ نہ رہے گی اور نیپال بھٹاچارج اسٹریٹ کے نالے بھی بھر دیئے جائیں گے، پھر کرن اور اس کے گھر والے کہاں جائیں گے؟ کرن کے والدین کہاں جائیں گے، کرن کا باپ بیمار ہے، ان کے پاس روپئے بھی نہیں ہیں ـــ آخر وہ لوگ کہاں جائیں گے؟

اور کاکا بابو اور ان کے گھر کے لوگ! ان کے پاس تو روپیہ ہے۔ شاید وہ لوگ دوسرا مکان کرایہ پر لے لیں گے، ان لوگوں کی فکر نہیں ہے، وہ لوگ بڑے آدمی ہیں، ان کے پاس روپیہ ہے، وہ لوگ بھوانی پور چاوں پٹی کے کسی مکان میں چلے جائیں گے، اگھور دادو کے سرمایہ دار بھانجوں کے محلے میں تبدیل ہو جائیں گے۔ ورنہ پھر بوبازار یا شیام بازار میں شرفاؤں کے محلے میں چلے جائیں گے، جہاں نہ تو نالے ہوں گے، نہ بدبو ہوگی، نہ گندگی ہوگی ـــ وہاں تو سب بڑے لوگ رہتے ہیں۔

اس دن ستی کی زبانی خبر سن کر دینکر جیسے کہیں گم ہو گیا تھا!

ماں نے پوچھا ـــ "تم ابھی تک سوئے نہیں؟"

"نیند نہیں آرہی ہے ماں" دینکر نے جواب دیا۔

وہ بچپن سے ماں کے قریب ہی سوتا آیا تھا اور اسے اب تک ماں کے قریب ہی سونے کی عادت تھی۔

ماں نے کہا ـــ "تمام دن دھوپ میں آوارہ گردی کروگے تو نیند کہاں سے آئے گی؟"

"نہیں ماں، اس کے لئے نہیں" دینکر نے جواب دیا۔

"پھر کس لئے نیند نہیں آتی؟ کالج سے سیدھے گھر بھی تو آ سکتے ہو، کالج سے نکل کر کہاں جاتے ہو۔ میں بھی سنوں؟ اس چھوکرے کے ساتھ شاید ادھر اُدھر روں روں گھومتے پھرتے ہوگے۔"

"نہیں ماں، کرن تو بیمار ہے، اس کے علاوہ تم سے پوچھے بغیر تو میں اس کے یہاں جاتا بھی نہیں، آج بھی تم سے پوچھ کر ہی تو گیا تھا۔"

ماں نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش رہی۔ ماں بہت ذہین تھی، وہ سب کچھ سمجھتی تھی، اسی ماں کی بدولت آج دینکر زندہ تھا تعلیم پا رہا تھا اور انسان بن رہا تھا۔

"آج کون سا واقعہ ہوا ہے، تمھیں معلوم ہے ماں؟" دینکر نے پوچھا۔

"کون سا واقعہ ہوا ہے؟"

اس خبر کو دوسروں سے کہے بغیر دینکر کو جیسے چین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس طرح لکھی دیدی گھر سے چلی گئی ہے جس کے لئے گھر بھر کے لوگ پریشان ہیں۔ وہ اس خیال کو اپنے ذہن سے نکالنے میں اب تک کامیاب نہ ہو سکا تھا، لیکن کوئی اور وجہ بھی تو ہو سکتی ہے، راستے میں کتنے حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ نئی نئی بسیں چلنے لگی ہیں، اروشی، مینکا، رمبھا، مختلف نام ہیں ان کے، پھر راستوں میں گاڑی گھوڑا کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی ہے، کتنے ہی لوگ چلتے چلتے یکایک ان کے نیچے آ جاتے ہیں۔ آج کل خوب ہوشیاری سے راستہ چلنا پڑتا ہے، پہلے ہاجرہ روڈ کے موڑ پر اتنی بھیڑ نہیں ہوتی تھی، اب وہاں پر بسیں رکتی ہیں اور ان بسوں سے بہت سارے لوگ اترتے ہیں۔ اس کے بعد یہ بسیں ٹھیک کالی گھاٹ ٹرام ڈپو کے سامنے آ کر رکتی ہیں، یہاں پر آ کر بسیں رک جاتی ہیں اور آگے نہیں جاتیں، تمام پسنجر یہیں پر اتر جاتے ہیں اور ادھر اُدھر، بالی گنج کی طرف جانے والے مسافر بدل جاتے ہیں۔ یہاں پر بہت ساری بسیں کھڑی رہتی ہیں۔ ممکن ہے کسی بس سے ٹکرا کر بے ہوش ہو کر راستے میں گر پڑی ہو۔ شاید وہاں سے لکھی دیدی کو کسی ہسپتال میں پہنچا دیا گیا ہوگا اور شاید وہ ابھی تک وہاں بے ہوش پڑی ہوئی ہوگی۔ یا پھر ممکن ہے، اس رات کے وقت جبکہ سبھی لوگ سوئے ہوئے ہیں، جبکہ اشو رگنگولی لین بھی سنسان ہو چکا ہے اور اب راستے کا خارش زدہ کتا بھونک بھونک کر ملے بھر کر سر پر اٹھائے ہوئے نہیں ہے اس وقت شاید لکھی دیدی اکیلی درد و کرب کی حالت میں تڑپ رہی ہوگی۔

دینکر کی آنکھوں سے جیسے رات بھر کے لئے نیند غائب ہو چکی تھی۔

دینکر آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، ماں سو رہی تھی، ذرا سی آواز ہوتے ہی جاگ جائے گی، کمرے کے اندر اگھور دادو کا صندوق رکھا ہوا ہے، ماں کی نیند بہت ہلکی تھی، ذرا سی روشنی ہوتے ہی ماں کی آنکھ کھل جاتی تھی، دینکر نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور پھر آہستگی سے دونوں پٹ کر دیا۔ کاکا بابو کے مکان میں اس وقت تک روشنی ہو رہی تھی، حیرت ہے، ان کے یہاں شاید کسی کو بھی نیند نہیں آ رہی تھی، شاید آج کوئی سو بھی نہیں سکے گا، اس کے جی میں آیا کہ ایک بار وہاں جا کر کسی سے دریافت کرے۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر کھڑکی کے دروازے پر دستک دے سکتا ہے۔ رگھو ضرور وہیں پر سو رہا ہوگا، وہ دستک کی آواز سنتے ہی دروازہ کھول دے گا، ایک بار دریافت کیا جائے — لکھی دیدی واپس آ گئی رگھو؟

اوپر جس کمرے میں مکھی دیدی سوتی تھی، اس کمرے میں بھی روشنی ہو رہی تھی، شاید مکھی اب تک جاگ رہی ہے، وہ کس طرح سو سکتی ہے۔ اس سے ملحق کاکی ماں کے کمرے میں بھی روشنی ہو رہی تھی، اتنی رات گئے تک کوئی بھی نہیں سویا ہے، یا تو پھر کاکا بابو اب تک واپس نہیں آئے ہیں، شاید کاکا بابو اب تک مکھی دیدی کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔

یکایک کسی چیز کی ایک آواز ابھری اور دینکر چونک اٹھا۔

"کون؟ کون ہو تم؟"

دینکر نے پلٹ کر دیکھا، پھونٹا تھا، چھیٹے آیا تھا یا نہیں، کون جانے، لیکن پھونٹا ابھی آ رہا تھا، پھونٹا دیوار پھلانگ کر آیا تھا اور دیوار سے نیچے کودنے کی وجہ سے دھپ کی آواز ابھری تھی۔

"تو اندھیرے میں اتنی رات گئے یہاں کیا کر رہا ہے رے چھوکرا؟"

پھونٹے کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی، وہ قریب آ گیا اور دینکر کے چہرے کے قریب منہ لا کر بولا — "تو اتنی رات کو کیا کر رہا ہے؟"

"نیند نہیں آتی۔" دینکر نے جواب دیا۔

"بھات کھا لیا ہے؟"

"ہاں۔" دینکر نے جواب دیا۔

"موج کرو، سچ کہتا ہوں، موج کرو تم لوگ" پھونٹے نے کہا — "دوسرے کے کندھے پر سوار ہو کر خوب عیش ہو رہا ہے کیوں؟ جس کی دولت وہ کوئی نہیں پرائے کھائیں حلوہ۔ مجھ سالے کا یہ مکان ہے، یہ کمرہ ہے اور میں ہی سالا کوئی نہیں ہوں۔"

پھونٹا آگے بڑھ گیا۔ ماں نے کمرے میں پھونٹا کا کھانا ڈھک کر رکھ دیا تھا، پھونٹا جائے گا، بھات کھائے گا اور اس کے بعد علی الصباح باہر چلا جائے گا، ان دونوں بھائیوں کا یہی معمول تھا، ہمیشہ سے چھیٹے اور پھونٹا کی یہی عادت تھی۔ دوپہر میں گنگا میں نہا کر تین بجے کے قریب آ کر کھانا کھاتے اور پھر چلے جاتے۔

لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ چند قدم جانے کے بعد ہی وہ لوٹ آیا، لوٹ کر وہ بالکل اس کے منہ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہارے پاس چار آنہ پیسہ ہو گا بھائی؟" اس نے پوچھا۔

دینکر چند قدم پیچھے چلا گیا۔

"پیسہ تو میرے پاس نہیں ہے۔"

"یونہی پیسہ نہیں ہے؛ مانگنے سے تمہارے پاس پیسہ نہیں ہے!"

اتنا کہہ کر وہ پھر آگے بڑھ گیا۔ لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر لوٹ آیا۔

"ایک بیڑی دو تو۔"

دینکر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"بیڑی میرے پاس کہاں سے آئی؟"

اب کے پھونٹا نے حیرت سے دینکر کی طرف دیکھا۔

"ایک بیڑی بھی تم نہیں دے سکتے؟"

پھونٹا کا چہرہ دیکھ کر دینکر کو اچنبھا سا لگا، وہ اس کی بات کا یقین ہی نہیں کر رہا تھا۔

"سچ کہتا ہوں، بیڑی میرے پاس نہیں ہے۔" دینکر نے اپنی صفائی پیش کی۔

"تو کیا ہے رسے؟ ہم لوگوں کے کندھے پر سوار ہو کر کھا رہا ہے، پل رہا ہے، آرام کر رہا ہے اور محض معمولی سی ایک بیڑی دے کر بھی بھلائی نہیں کر سکتا؟"

اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"پیسہ نہیں، دھیلا نہیں۔" اس نے پھر کہا — "ایک پیسہ میں آٹھ بیڑی ملتی ہے۔ لوگ تو بڑی دان خیرات بھی کرتے ہیں، تو نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے، ماں قسم۔"

کہتے کہتے پھونٹا چلا گیا۔

"اچھا، میں تجھے دکھاؤں گا، پتہ لگنے دو۔"

دینکر خوفزدہ سا ہو گیا، وہ جلدی سے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اندر جا کر دروازہ بند کرتے وقت کھٹ کی ایک آواز ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ماں چونک کر جاگ گئی۔

"کون؟ کون ہے؟"

"میں، میں ہوں ماں!"

ذرا سی آواز ہوتے ہی ماں کی آنکھیں کھل جاتی تھیں، ماں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم کیا کر رہے تھے؟"

"باہر گیا تھا ماں۔" دینکر نے جواب دیا۔

"باہر گئے تھے تو مجھے جگایا کیوں نہیں؟ میں نے کہا نہیں ہے کہ کمرے سے باہر نکلتے وقت مجھے جگا دیا کرو؟"

"میں کہیں نہیں گیا تھا ماں۔" دینکر نے کہا — "صرف آنگن میں جا کر کھڑا تھا۔"

"مگر اتنی رات گئے آنگن میں جا کر کھڑے ہونے کی کیا ضرورت تھی؟" ماں نے پوچھا۔

"نیند نہیں آ رہی تھی۔" دینکر نے جواب دیا۔

"نیند نہیں آ رہی تھی تو کیا آنگن میں کھڑے ہونے سے نیند آ جائے گی؟"

ماں نے پھر بتی جلائی اور بتی جلا کر صندوق کا تالا کھینچ کر دیکھا، پھر تخت پوش کے نیچے جھانک کر دیکھا اور چاروں طرف دیکھ کر اطمینان کر لینے کے بعد پھر اپنے بستر پر چلی گئی۔

"تم نہیں دیکھتے کہ اس کمرے میں دوسروں کا کتنا روپیہ پڑا ہوا ہے، اس طرح دروازہ کھول کر باہر جانے کا ہے؟ نرپن بابو کے یہاں گئے تھے؟ مگر وہاں تم کیوں جاؤ گے؟"

"گیا تھا۔"

"کیا کہا انہوں نے؟"

"انہوں نے کہا اپنی ماں کو بھیج دو گے۔" دینکر نے جواب دیا۔ "دو تین جگہ خالی ہے، لیکن میں وہ نوکری نہیں کروں گا ماں! میں کہے دیتا ہوں۔ رشوت دے کر میں نوکری نہیں کروں گا۔"

ماں نے اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے انکسور دادو سے کہہ کر دیکھتی ہوں۔ اگر وہ بیس روپیہ دے دیں، بیس روپیہ دینے سے ہو جائے گا، پانچ روپیہ میرے پاس ہے۔"

اور اس کے بعد ماں کب سو گئی دینکر کو کچھ معلوم نہیں، وہ ماں کے سونے سے پہلے ہی سو چکا تھا۔

صبح کے وقت مندر میں پھول دے آنے کے بعد دینکر سیدھا کاکا بابو کے یہاں چلا گیا تھا۔ وہاں سب سے پہلے جس سے ملاقات ہوئی وہ رگھو تھا، وہ جھاڑو دے رہا تھا۔

اس نے پوچھا۔ "رگھو، لکھی دیدی نہیں آئی؟"

"نہیں۔" رگھو نے جواب دیا۔

"تب تو سبھی لوگ فکر مند ہوں گے۔" اس نے پوچھا۔ "کاکی ماں کہاں ہیں؟"

"اوپر ہیں۔"

"کاکا بابو؟"

"سبھی اوپر ہیں۔ دوسری منزل پر۔"

"اور ستی؟"

"ستی دیدی موتی بھی اوپر ہیں۔ سبھی سنی دیدی موتی کے کمرے میں ہیں۔"

دینکر آہستہ آہستہ زینے کی طرف بڑھ گیا لیکن اوپر چڑھتے ہوئے اس کے پاؤں نہیں اُٹھے، واقعی تو، اس وقت تو سبھی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے ہوں گے۔ ابھی اس کے جانے سے وہ لوگ اور بھی بیزار ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کاکا بابو بہت رات گئے واپس آئے ہوں۔ اتنی رات گئے تک یہاں، وہاں، اِدھر اُدھر ہسپتال اور تھانے میں تلاش کرنے کے بعد لوٹے ہوں گے۔ ممکن ہے کوئی پتہ نہ چلا ہو یا پھر ممکن ہے پتہ چل گیا ہو۔ آہستہ آہستہ وہ اوپر برآمدے تک چلا گیا، اوپر جا کر وہ کان کھڑے کر کے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ لکھی دیدی کے کمرے سے جیسے کاکا بابو کی آواز سنائی دے رہی تھی اور کبھی کبھی کاکی ماں کی آواز آ رہی تھی۔ لگتا ہے ستی کی آواز بھی آ رہی تھی۔

"اب تو تمہارے بابا کو ٹیلیگرام کرنا ہوگا! آخر کار وہ کہیں گے تم لوگوں کے رہتے ہوئے وقت پر مجھے اس کی اطلاع نہ مل سکی تب؟"

"لیکن وہ تو سات سمندر پار رہتے ہیں" کالی ماں کی آواز اُبھری — "انھیں خواہ مخواہ پریشان کرنا کیا بہتر ہوگا؟"

"بابا کی صحت بہت خراب ہے" ستی کی آواز آئی — "اس خبر کو سننے کے بعد وہ شاید زندہ نہ رہ سکیں گے کاکا بابو۔"

"اور ایک دن دیکھ لو، شاید آجائے" کالی ماں کی آواز سنائی دی۔

"مگر وہ کہاں جاسکتی ہے؟" ستی کی آواز تھی — "میں تو ہمیشہ اس کے پیچھے لگی رہتی تھی — لکھی دیدی جہاں بھی جاتی، میں بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ جاتی — وہ جس سے بھی باتیں کرتی میں اس سے دوستی کر لیتی اور دوستی کر کے معلوم کر لیتی کہ لکھی دیدی نے اس کی کیا باتیں ہوئی ہیں؟"

"لیکن یہ ہر وقت تو ممکن نہیں ہے؟ تمہارے اپنے بھی تو کام ہیں، لکھنا پڑھنا ہے، صحت ہے، آرام ہے —"

"نہیں کاکا بابو، پھر بھی میں دن رات نگاہ رکھتی تھی — میں تو پہلے ہی سے جانتی تھی — وہاں بھی اسکول میں پڑھنے کے دنوں میں وہ ایسا ہی کرتی تھی نا، وہاں ایک لڑکا تھا، وہ اسی کے ذریعہ چھپا کر خط بھیجا کرتی تھی، آخر کار میں نے ہی ایک دن پکڑ لیا تھا۔"

"مگر وہ لڑکا کہاں گیا؟" کاکا بابو کی آواز سنائی دی — "وہ جو وہاں ایک مراٹھی لڑکا تھا — کیا تو نام سنا تھا اس کا؟"

"وہ تو برما میں ہے، وہ یہاں کس طرح آئے گا کاکا بابو؟"

کالی ماں نے کہا — "وہ تو وہاں کاروبار کرتا تھا — سنا تھا بہت امیر ہے! لکڑی کا کاروبار کرتا تھا —"

ستی نے کہا — "امیر ہونے سے کیا ہوگا کاکا بابو — ذات تو ایک نہیں ہے — اس کے علاوہ بابا یہ سب پسند نہیں کرتے آپ تو جانتے ہی ہیں! اور میں بھی یہ سب پسند نہیں کرتی کاکا بابو۔ ہم لوگ ہندو ہیں، ہندو لڑکیوں کے شوہر اس کی پیدائش سے پہلے ہی سے ٹھیک ہو جاتے ہیں — ہندو بیوی اور شوہر کا رشتہ جنم جنم کا رشتہ ہوتا ہے — کیوں کالی ماں —"

"یہ تو ہے ہی" کالی ماں نے جواب دیا "اب کیا کیا جائے یہ بتاؤ؟"

کاکا بابو شاید کچھ سوچ رہے تھے، انھوں نے کہا "یہاں لکھی اور کہیں جاتی تھی؟ کالج اور گھر کے علاوہ کسی دوسری جگہ بھی جانا چاہتی تھی؟"

ستی کی آواز اُبھری — "یہاں تو اور کہیں نہیں جاتی تھی، میں یہاں آنے کے بعد تو ہمیشہ لکھی دیدی کے ساتھ ہی ہر جگہ جاتی تھی — اور کہاں جائے گی؟ یہاں تو ہماری جان پہچان کا بھی کوئی نہیں ہے۔"

"اس دن تم دونوں کہاں گئی تھیں" کالی ماں نے پوچھا — "بہت دن پہلے۔ ایک روز شام کو؟"

"وہ تو جینتی کے یہاں گئی تھی، جینتی پالت، لکھی دیدی کی کلاس میں پڑھتی ہے — ہریش مکھرجی روڈ میں بیرسٹر پالت ہیں — انھیں کے یہاں — چائے کی دعوت دی تھی — وہ تو صرف ایک دن، اس کے بعد تو پھر کہیں نہیں گئی —"

دیپنکر کان لگا کر تمام باتیں سنتا رہا، سنتے سنتے اس نے سوچا کہ وہ غلط کر رہا ہے۔ اسے یہ سب نہیں سننا چاہیئے، ان کے گھر کی کہانی سننا کیا اس کے لیے مناسب ہے! وہ تو باہر کا آدمی ہے، غیر ہے۔ لکھی دیدی خواہ اس سے جتنا بھی پیار کرے، ستی کے ساتھ اس کی کتنی ہی گہری دوستی کیوں نہ ہو، کاکا بابو خواہ اس کے ساتھ جتنی بھی ہمدردی رکھتے ہوں — پھر بھی اسے یہ سب نہیں سننا چاہیئے۔

دینکر تیزی سے نیچے اترنے جا رہا تھا کہ یکایک کاکا بابو کی آواز سنائی دی۔

"اور وہ جو اگھور رنجن پارچ کے مکان میں رہتا ہے، جس کی ماں ان کا کھانا پکاتی ہے، دیپو بابو"

کاکی ماں نے پوچھا — "ہمارا دیپو؟"

"نہیں کاکا بابو" ستی نے جواب دیا — "پہلے پہل مجھے شبہ ہوا تھا"

دینکر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اب اسی کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ اب ان کی گفتگو کا موضوع وہی تھا۔

ستی نے کہا — "لکھی دیدی کے خط سے مجھے اس کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ اس سے پہلے پہل مجھے اس پر شبہ ہوا تھا — اس کے بعد ....."

دینکر پھر کان لگا کر سننے لگا، اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر دیکھا، کوئی اُسے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ یکایک اسے عجیب خوف محسوس ہوا۔ ستی! ستی ہی نے ایک روز چار پیسہ اس کی طرف پھینک دیا تھا۔ ستی اس کی نظر میں کتنی مشتبہ تھی!

ستی بولی — "اس کے بعد میں نے دیکھا، نہیں، وہ ایسا نہیں ہے —"

کاکی ماں نے کہا — "وہ لڑکا تو اچھا ہی معلوم ہوتا ہے —"

"وہ تو ہر روز صبح کے وقت مندر میں پھول دینے جاتا ہے، اس کے بعد اپنے دوست احباب، لائبریری اور پڑھنے لکھنے میں مشغول رہتا ہے" ستی نے پھر کہا۔

یکایک دینکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے پہلی منزل پر کسی کے قدموں کی چاپ اُبھر رہی ہو، شاید رگھو اوپر آ رہا ہے۔ اب فرار کی کوئی صورت نہیں۔ وہ سیدھا لکھی دیدی کے کمرے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے دیپو بابو، تم یکایک؟"

کاکا بابو سامنے ہی تھے، کاکی ماں نے بھی نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، ستی نے بھی دیکھا، سبھی جیسے اسے دیکھ کر بے حس و حرکت ہو گئے ہوں۔

"تم کب آئے؟" کاکا بابو نے پوچھا۔

"وہ شاید لکھی دیدی کی تلاش میں آیا ہے" ستی نے کہا "میں نے کل اسے بتایا تھا نا —"

"لکھی دیدی نہیں آئی؟" اچانک دینکر نے پوچھا۔

اُسے محسوس ہوا جیسے سبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہوں، کسی نے کچھ کہا، لیکن اُسے کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ دل ہی دل میں سبھی اس پر شبہ کر رہے تھے۔ اُسے پوری فضا بڑی غیر مطمئن نظر آئی۔ اس کے بعد وہ کب نیچے چلا آیا اور کب سیدھا اپنے گھر چلا آیا، کب کھانا کھا گیا، اُسے کچھ پتہ نہ چلا۔ کالج میں بھی وہ بالکل کھویا کھویا سا رہا، وہاں کب چھٹی ہوئی اور وہاں سے نکل کر وہ بلا مقصد سڑکوں پر ادھر اُدھر کتنی دیر تک بھٹکتا رہا، اُسے یہ بھی پتہ نہ چلا لیکن پھر اچانک وہ اپنی دنیا میں لوٹ آیا۔

اُسے یکایک ایسا لگا جیسے شہر میں دا تا ربابو بیٹھے ہوں۔ ٹھیک دا تا ربابو جیسا چہرہ تھا۔ ویسے ہی کوٹ پتلون پہنے ہوئے کوئی

بیٹھا تھا۔ مجھے پیشانی جھول رہی تھی اور اسی طرح سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اُسے شبہ سا ہوا۔ چہرہ پہلے سے کافی بدلا ہوا تھا اور مدتیں وہاں سے گزرنے پر بھی نہیں کیا تھا۔

" داتا بابو، داتار بابو!"

داتار بابو نے سن لیا، پلٹ کر دیکھا اور دینکر کو پہچان لیا اور شاید پہچان کر ہی جلدی سے ٹرام سے اتر گئے۔ لیکن ٹرام رکتے رکتے بھی کافی آگے نکل گئی۔ ٹرام سے اُتر کر داتار بابو دینکر کی طرف بڑھے تو دینکر بھی آگے بڑھ گیا۔

" داتار بابو، آپ اس طرف ؟"

"تم ہو دینکر ہو نا ؟"

داتار بابو کا سوٹ پہلے جیسا صاف نہیں تھا، قدرے میلا دکھائی دے رہا تھا۔ داتار بابو پہلے دیکھنے میں بے حد مسکین تھے، مگر پہلے سے بے حد خوبرو، لیکن آج کچھ بدلے ہوئے سے تھے۔

" آپ نے میری آواز سن لی تھی ؟" دینکر نے پوچھا۔

" ہاں، ویسے بھی مجھے اسی جگہ اُترنا تھا۔ یہاں قریب ہی مجھے ایک کام ہے۔ تمہاری لائبریری کیسی چل رہی ہے ؟"

" آپ نے جو چندہ دیا تھا، یاد ہے نا ؟" دینکر نے کہا ــــ " خضر پور کے راستے میں ؟ ہم لوگوں کو خوب مٹھائی بھی کھلائی تھی ؟ اور آخر میں پانچ روپیہ چندہ دیا تھا ؟"

" اچھی طرح یاد ہے۔" داتار بابو نے جواب دیا ــــ " لیکن اس کے بعد تو تم لوگ چندہ لینے آئے ہی نہیں، میں نے تو پتہ بھی دے دیا تھا۔ تمہارا وہ دوست کیا نام تھا اس کا ؟"

" کرن !"

" ہاں، کرن کیسا ہے ؟"

" اُسے بہت تیز بخار ہے۔" دینکر نے جواب دیا ــــ " آپ کو معلوم ہے، وہ بہت غریب ہے لیکن بہت اچھا لڑکا ہے۔"

" اس سے کیا ہوا، غریب ہونا کوئی جرم تو نہیں ؟" داتار بابو نے کہا۔

" جرم نہیں ہے لیکن غریب ہونے ہی کی وجہ سے سب لوگ ہم دونوں سے نفرت کرتے ہیں۔" دینکر نے کہا ــــ " میں جس کے پاس بھی نوکری کے لئے جاتا ہوں، وہ منہ بنا کر باتیں کرتا ہے اور سیدھے منہ بات کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

داتار بابو چلتے چلتے رک گئے، بولے ــــ " اس طرح کا صدمہ برداشت کرنا ایک طور سے اچھا ہے دینو، صدمہ برداشت کئے بغیر بڑا انسان کوئی بن سکتا ہے ؟"

" لیکن کبھی کبھی ناقابلِ برداشت جو ہو جاتا ہے۔"

" تمہیں کتنے ہی صدمے کیوں نہ برداشت کرنے پڑیں۔" داتار بابو نے کہا ــــ " لیکن خود کو اپنی نظر میں کبھی حقیر نہ سمجھنا دینو۔"

" دینکر کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔

" اپنی نظر میں خود کو حقیر نہ بننے سے آپ کی کیا مراد ہے ؟" دینکر نے پوچھا۔

" روپیہ کا افلاس ایک نہ ایک دن ختم ہو سکتا ہے " داتار بابو نے جواب دیا ۔" لیکن دل کا افلاس کبھی ختم نہیں ہوتا دینو — اس کا کوئی علاج نہیں — اس کی معافی بھی نہیں ہے — میں نے زندگی میں بہت صدمے اٹھائے ہیں، بے حد محبت بھی پائی ہے، لیکن میں نے اپنی نظر میں خود کو کبھی نہیں گرایا "

دینکر کو ایسا لگا جیسے وہ داتار بابو کی زبانی بالکل نئی باتیں سن رہا ہو، وہ بغل میں کھڑا ہوا حیرت سے دیکھنے لگا، کیا آدمی ہے کتنا اچھا آدمی ہے، حالانکہ باہر سے دیکھ کر تو اس آدمی کے بارے میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا، باہر سے چہرہ دیکھ کر کسی کے بارے میں فیصلہ کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اتنا اچھا آدمی ہے۔ داتار بابو کے مقابلے میں دینکر خود کتنا معمولی، کتنا حقیر ہے! پھر بھی اسے دیکھ کر وہ ٹرام سے اتر پڑے، ان کو کتنے کام ہوں گے، کتنے معروف آدمی ہیں داتار بابو، پھر بھی وہ دینکر کے ساتھ باتیں کر کے اپنا وقت برباد کر رہے ہیں! اتنے اچھے آدمی ہیں جبھی تو سب لوگ داتار بابو سے محبت کرتے ہیں —

یکایک داتار بابو نے پوچھا —" تم کہاں جا رہے تھے ؟"

" میں کہیں جا نہیں رہا تھا یونہی گھوم رہا ہوں " دینکر نے جواب دیا۔

داتار بابو کو قدرے حیرت ہوئی۔

" یونہی گھوم رہے ہو، کیوں ؟"

" اچھا نہیں لگتا " دینکر نے جواب دیا ۔" کبھی کبھی اسی طرح مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا "

اس کے بعد یکایک اس نے کہا ۔" آپ کو تو ضرور خبر ملی ہوگی، لکھی دیدی گھر سے چلی گئی ہے "

داتار بابو نے حیرت سے دینکر کی طرف دیکھا۔ دینکر کو ایسا لگا جیسے داتار بابو کو اس خبر کی صداقت پر یقین نہیں آ رہا ہے۔

اس نے کہا ۔" ہاں داتار بابو، اس کے گھر میں سبھی لوگ بے حد پریشان ہیں۔ کاکا بابو تمام رات ڈھونڈتے رہے ہیں۔ اب تک کوئی پتہ نہیں چلا ہے —"

" تم بھی اسی فکر میں گھوم رہے ہو کیا ؟" داتار بابو نے پوچھا۔

" ہاں داتار بابو، مجھے کل سے رات کو نیند نہیں آتی۔ پتہ نہیں لکھی دیدی کہاں چلی گئی! مجھے لکھی دیدی بہت پیار کرتی تھی "

قدرے توقف کے بعد اس نے پھر کہا —" آپ کو یاد ہے، میں آپ کو خط پہنچاتا تھا؟ آپ کالی مندر کے سامنے کمرے میں رہتے تھے اور میں آپ کو خط دے آتا تھا؛ وہ اسی وقت سے مجھے بے حد چاہتی تھی!"

" اس کے گھر والے کیا کہتے ہیں ؟" داتار بابو نے پوچھا ۔" ان لوگوں کا کیا خیال ہے ؟"

" وہ لوگ کیا کہیں گے؟ چاروں طرف تلاش ہو رہی ہے۔ کاکا بابو تو بہت بڑی نوکری کرتے ہیں، بہت جگہ ان کی جان پہچان ہے، جس دن رات کو لکھی دیدی گھر نہیں آئی تھی، اسی دن سے کاکا بابو چاروں طرف تلاش کر رہے ہیں "

" کسی کو معلوم نہیں کہ کہاں گئی ہے ؟"

"یہ خبر تمہیں کس نے بتائی ؟"

"ستی نے۔" دینکر نے جواب دیا۔ "اس کی چھوٹی بہن نے ـــ اچھی لڑکی ہے، بہت اچھی، آپ کو معلوم ہے داتار بابو، لکھی دیدی کے بابا تنہا ہی رہتے ہیں، بہت ضعیف آدمی ہیں، ان کی صحت بھی بہت خراب ہے، لکھی دیدی کی یہ حرکت اگر ان کو معلوم ہوئی تو ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔"

اس کی بات سن کر داتار بابو جیسے کچھ سوچنے لگے۔

دینکر نے کہا۔ "ستی اپنے باپ سے بے پناہ محبت کرتی ہے، جانتے ہیں، لیکن لکھی دیدی اپنے باپ کی کوئی بات نہیں سنتی۔"

"تم ابھی گھر جاؤ گے تو ؟" داتار بابو نے پوچھا۔

"گھر جانے کو دل نہیں چاہتا داتار بابو، لکھی دیدی کے نہ رہنے سے سارا گھر اُجاڑ اُجاڑ سا لگتا ہے ـــ کچھ اچھا نہیں لگتا، گھر میں رہنے کو دل نہیں چاہتا، حالانکہ پہلے کالج سے سیدھا گھر چلا جاتا تھا اور پہلے لکھی دیدی کے پاس ہی جاتا تھا، آپ کو معلوم ہے داتار بابو، لکھی دیدی میرے اوپر کتنا بگڑتی تھی، مجھے کتنا پیٹا ہے، کتنی بار میرے سر کے بال کھینچے ہیں، پھر بھی مجھے یہ سب اچھا لگتا تھا ـــ پھر بھی میں لکھی دیدی کو بہت چاہتا تھا۔"

"اور اس کی چھوٹی بہن ستی ؟"

"پہلے مجھے ستی بالکل اچھی نہیں لگتی تھی داتار بابو، ایک نظر نہ بھاتی تھی، لیکن دونوں بہنیں بہت اچھی ہیں ـــ ان کے مقابلے میں ہم لوگ کتنے غریب ہیں، سچ پوچھئے تو دوسروں کے گھر میں میری پرورش ہوئی ہے، پلا بڑھا ہوں، پھر بھی ستی میرے یہاں آتی ہے اور میری ماں کو ماسی ماں کہتی ہے ـــ حالانکہ وہ ہم لوگوں سے باتیں کرنا ناپسند بھی کر سکتی تھی! ان لوگوں سے ہمارا کیا مقابلہ ہے۔ بتائیے؟"

اُسے یاد ہے، اس دن داتار بابو سے بہت ساری باتیں ہوئی تھیں، جیسے زندگی میں پہلی بار اسے اپنے دل کی بات سنانے کے لئے ایک آدمی ملا تھا اور اُسے دل کی بات سنانے کا موقعہ ملا تھا۔ داتار بابو کے ساتھ ساتھ سڑک پر چلتے ہوئے اس دن دینکر کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس سے پہلے کسی نے بھی اتنی محبت اور ہمدردی کے ساتھ اس کی باتیں نہیں سنی تھیں۔

دینکر نے کہا۔ "کبھی کبھی مجھے کیا خوف محسوس ہوتا ہے، جانتے ہیں؟ خوف ہوتا ہے کہ اگر وہ لوگ مکان چھوڑ کر چلے جائیں؟"

"چلے کیوں جائیں گے ؟"

"نہیں، شاید نہ جائیں۔" دینکر نے کہا۔ "لیکن جا بھی تو سکتے ہیں، لکھی دیدی ہی کی وجہ سے تو ایسی گندہ جگہ میں انہوں نے مکان کرایہ پر لیا تھا۔"

"کیوں ؟"

"آپ کو شاید معلوم نہیں ؟" دینکر نے کہا۔ "اس جگہ انہوں نے اس لئے مکان کرایہ پر لیا تھا تاکہ لکھی دیدی کبھی سے مل نہ سکے۔"

"تو گویا تمہارے ہاتھ سے جو لکھی دیدی مجھے خط بھجواتی تھی، یہ بات آج بھی کسی کو معلوم نہیں ہے ؟"

"نہیں۔" دینکر نے کہا۔ "کسی کو معلوم نہیں ہے، میں نے کسی کو بتایا ہی نہیں ـــ لکھی دیدی نے مجھے کسی کو بتانے سے منع جو کر دیا تھا۔"

آنا لیہ کر اس نے وانار بابو کی طرف دیکھا۔

"میں نے ماں کو بھی نہیں بتایا؛" اس نے کہا۔ "حالانکہ میں ماں سے تمام باتیں کہہ دیتا ہوں، جانتے ہیں! میں نے کرن سے بھی نہیں کہا۔ کرن کو آپ نے تو دیکھا ہے! کرن میرا کتنا عزیز دوست ہے، پھر بھی میں نے نہیں بتایا۔ اور ستی! لکھی دیدی کی چھوٹی بہن؛ اس نے مجھ سے معلوم کرنے کی کتنی کوشش کی ۔۔۔ وہ ہمیشہ میرے پیچھے لگی رہتی تھی، وہ میری طرف سے کتنی مشکوک تھی ۔۔۔ دن رات مجھ سے چمٹی رہتی تھی۔ پھر بھی میں نے نہیں بتایا! کیوں نہیں بتایا، جانتے ہیں! لکھی دیدی نے مجھے منع کر دیا تھا اسی لئے!"

اس کے بعد ذرا سا رک کر اس نے پھر کہا۔ "اگر وہ لوگ اس مکان کو چھوڑ کر چلے گئے تو بہت برا ہوگا!"

"لیکن ہمیشہ تو کوئی بھی نہیں رہتا!"

وانار بابو نے جیسے اسے تسلی دینے کی کوشش کی، بولے ۔۔۔ "ایک دن اپنے ماں باپ بھی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں ۔۔۔ یہ لوگ تو پرائے ہیں ۔۔۔"

"پرائے ضرور ہیں،" وینکر نے کہا ۔۔۔ "لیکن اتنے دنوں تک ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے اپنوں جیسے ہو گئے ہیں وانار بابو ۔۔۔ میرا جب بھی دل چاہتا بلا روک ٹوک ان کے یہاں چلا جاتا تھا، موقعہ بے موقعہ بدھا لکھی دیدی کے کمرے میں پہنچ جاتا تھا، ان کے بستر پر سو جاتا تھا، کالا بابو کے کمرے میں بھی چلا جاتا تھا، لیکن کسی نے بھی مجھے کبھی کچھ نہیں کہا ۔۔۔"

واقعی یہ بات درست تھی، چوری چھپے ناچ دیکھنے کے دن سے لے کر ستی کے آ جانے کے بعد تک ان لوگوں سے کوئی دوری کوئی غیریت باقی نہیں رہی تھی، جب کہیں بھی جانے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی، اس وقت وینکر سیدھا لکھی دیدی کے گھر چلا جاتا تھا کتنی ہی بار اس نے ان کے یہاں کھانا بھی کھایا تھا ۔۔۔ صرف سونے کے لئے وہ اپنے یہاں آ جاتا تھا خوب زور شور سے بارش ہو رہی ہوتی، کاکی ماں کھچڑی پکاتیں اور اس دن وینکر ان ہی لوگوں کے ساتھ مل کر کھانا کھاتا، صرف جنگلے سے چیخ کر کہہ دیتا ۔۔۔ ماں، آج میں یہیں کھا لیتا ہوں ۔۔۔ گھر میں نہیں کھاؤں گا ۔۔۔! ماں کے ساتھ ستی بھی کالی مندر میں پوجا کرنے جاتی، ساتھ میں وینکر بھی جاتا۔ کالی مندر کے سبھی پنڈے پروہت وینکر کو پہچانتے تھے، ستی پنڈوں سے "ڈالا" خریدتی، گیندے کے پھول کی مالا خریدتی اور مندر میں پوجا کرتی۔ پوجا کرتے وقت وہ آنچل کو گردن کے گرد لپیٹ لیتی اور پتھر پر پیشانی ٹیک کر پرنام کرتی ۔۔۔

ماں دعائیں دیتی ۔۔۔ "اچھا گھر ملے، اچھا دولہا ملے بیٹی، تمھیں ۔۔۔"

اس وقت ستی کی بھگتی قابلِ دید ہوتی، پرشاد لے کر وہ بڑی عقیدت کے ساتھ اپنی پیشانی سے اوپر لے جاتی اور پھر اسے منہ میں ڈال دیتی اور منہ میں ڈال کر اپنی ہتھیلی پھر سر کے اوپر پھیر لیتی۔ وینکر حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہتا۔ یہ ستی، یہ کالج میں پڑھنے والی لڑکی، یہ کالج کی طالبہ کتنی مذہبی ہے۔ اس کی بھگتی دیکھ کر وینکر مسکرانے لگتا۔

"ماسی ماں، دیپو اس طرح کیوں مسکرا رہا ہے، بولئے تو؟" ستی کہتی۔

ماں وینکر پر بگڑ جاتی ۔۔۔ "تم اس طرح کیوں ہنس رہے ہو دیپو، بولو تو؟"

"ہنسوں گا نہیں؟" وینکر جواب دیتا ۔۔۔ "کالج میں پڑھنے والی لڑکی کی یہ عقیدت بھی عجیب ہے؟"

"کالج میں پڑھتی ہے تو کیا ہوا؟" ماں کہتی — "لڑکی پھر بھی لڑکی ہی ہوتی ہے۔ گھر سنسار تو کرنا ہی ہوگا۔ جب لڑکی بن کر پیدا ہوئی ہے تو اسے اپنے شوہر کا گھر تو کرنا ہی ہوگا۔"

"یہی میرے بابا بھی کہتے ہیں ماسی ماں" ستی کہتی — "پہلے بابا بھی پوجا اور جپ تپ کرتے ہیں اس کے بعد دفتر جاتے ہیں۔"

ماں ستی کو ہمیشہ یاد کراتی، کہتی — "تمہیں شیو کے ایسا شوہر ملے گا بیٹی۔ دیکھ لینا — میں تمہیں پوجا کرنے کے لئے سکھا دوں گی۔"

ستی ہر روز صبح کو اٹھ کر غسل کرتی تھی اور لکھی دیدی اس وقت تک سوئی رہتی تھی۔ دیپنکر جاکر دیکھتا کہ لکھی دیدی کے بستر کے قریب رکھی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو گئی ہوتی اور لکھی دیدی اس وقت تک بے خبر سوئی رہتی۔

دیپنکر جاکر پکارتا — "اے لکھی دیدی، لکھی دیدی!"

لکھی دیدی انگڑائی لے کر کہتی — "کیا ہے رے، اتنے سویرے کیا کرنے آیا ہے؟"

"تم ابھی تک سو رہی ہو؟ ادھر سات بج چکا ہے؟ دیکھو تو تمہاری چائے برف ہو چکی ہے۔"

"رگھو کو بلاؤ تو دیپو اور ایک کپ چائے دے جائے گا؟"

لکھی دیدی لیٹی لیٹی چائے پیتی اور چائے پینے کے بعد آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھتی اور پھر آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ جاتی ——

دیپنکر کہتا "تم اتنی دیر تک کیسے سوئی رہتی ہو لکھی دیدی؟ تمہاری نیند نہیں ٹوٹتی؟"

"ستی کہاں ہے؟" لکھی دیدی پوچھتی۔

"ستی ماں کے ساتھ گنگا میں نہانے گئی ہے۔" دیپنکر جواب دیتا — "مندر میں پوجا کرنے کے بعد واپس آئے گی۔"

"تم دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتی لکھی دیدی؟" دیپنکر پوچھتا۔

"دور، وہ سب جھوٹے عقیدے ہیں، ڈھونگ ہے —— یہ سب کر کے بھی جو کچھ ہوتا ہے، نہیں کر کے بھی وہی ہوتا ہے۔" لکھی دیدی جواب دیتی۔

"لیکن میں تو ہر روز دیوی دیوتاؤں کو پرنام کرتا ہوں لکھی دیدی، سو کر اٹھنے کے بعد ہر روز مندر میں پھول بھی پہنچاتا ہوں اور پرنام بھی کرتا ہوں۔"

"اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوتا ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم، لیکن ایسا کرنے میں اچھا لگتا ہے!"

"ستی بھی یہی سب کرتی ہے، کہتی ہے، اس سے ثواب ہوتا ہے۔ ثواب ہوتا ہے نہ خاک ہوتا ہے!"

اور ایک روز جب ستی آئی تو لکھی دیدی نے پوچھا ——

"تم آج بھی گنگا میں نہانے گئی تھی ستی؟"

"ہاں —" ستی نے جواب دیا۔

"ایسے گندے پانی میں نہا کر تمہیں کیا فائدہ ہوا؟"

"فائدہ کیا ہوگا؟" ستی نے جواب دیا — "میرا دل چاہا اس لئے چلی گئی —"

"گھر میں کیا پانی نہیں تھا؟"

"گھر میں تو ہر روز ہی نہاتی ہوں، ایک دن گنگا میں بھی نہا لیا، گنگا میں کیا کوئی نہیں نہاتا؟"

"نہاتا کیوں نہیں؟" لکھی دیدی نے کہا۔ "تم جیسے لوگ نہاتے ہیں!"

ستی کو غصہ آگیا۔ "اچھا کرتی ہوں جو نہاتی ہوں، تمھیں تو گنگا میں نہانے کے لئے نہیں کہتی۔ اگر مجھے اس میں سکون ملتا ہے تو تمہارا کیا نقصان ہے؟"

"تمھیں یہ سب کس نے سکھایا ہے۔ بتاؤ تو؟"

"سکھاتے کا کون؟" ستی نے جواب دیا۔ "یہ بھی سکھانا پڑتا ہے کیا؟ لڑکیوں کے اندر تھوڑی سی بھگتی تو رہنی ہی چاہئے!"

"خاک رہنی چاہیے! میں دیکھتی ہوں تمھیں کچھ بھی نہ ہوگا!"

"نہیں ہوگا تو نہ ہو، تمھیں تو ہوگا! تم اپنی سنبھالو دیدی — میں کیا کرتی ہوں، نہیں کرتی ہوں، تمھیں دیکھنے کی ضرورت نہیں" ستی نے جواب دیا۔

"تم بہت زبان دراز ہوتی جا رہی ہو ستی! صبح ہوتے ہی جھگڑا کرنے چلی آئی؟"

ستی کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ "واہ رے! میں جھگڑا کر رہی ہوں یا تم جھگڑا کر رہی ہو؟"

"پھر میرے سامنے زبان درازی کر رہی ہے؟"

ستی بھی جھنجھلا کر بولی — "کروں گی — خوب کروں گی، بولوں گی، بولوں گی، تم ہر گھڑی میرے ساتھ اس طرح کیوں پیش آتی ہو، بولو؟"

"میں تمہارے ساتھ زیادتی کرتی ہوں نہ تم میرے ساتھ زیادتی کرتی ہو؟" لکھی دیدی نے کہا۔

یکایک ستی نے دینکر کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔ "یہ تو دیبو یہاں پہ موجود ہے، اسی سے پوچھو کہ پہل کس کی طرف سے ہوئی؟ — بولو تو دیبو، تم ہی بتاؤ۔ تم تو شروع سے دیکھ رہے ہو، میرا قصور ہے؟"

دینکر بڑی مشکل میں پڑ گیا، وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ دونوں میں سے کس کی حمایت کرے لیکن لکھی دیدی نے اس کی جان بچا دی۔

"میں اسے گواہ نہیں مانتی!" لکھی دیدی نے کہا۔ "وہ کون ہے؟ وہ کیا جانتا ہے؟"

"ہاں، سب جانتا ہے وہ — تمھیں بھی اچھی طرح پہچانتا ہے وہ —" ستی نے کہا۔

"نہیں وہ کچھ نہیں جانتا" لکھی دیدی نے کہا — "کچھ نہیں جانتا ہے وہ —"

"جانتا ہے، سب کچھ جانتا ہے! تم کس قماش کی لڑکی ہو، وہ یہ بھی جانتا ہے، اسے اتنی عقل ہے تم کس کے پاس وہاں خط لکھتی تھیں، کس سے چھپ چھپ کر ملاقات کرتی تھیں، کس کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کر رہی تھیں......؟"

"ستی!"

یکایک لکھی دیدی پھٹ پڑی اور ایسا لگا جیسے وہ جھپٹ پڑنے والی ہو۔

اس نے کہا۔ "جتنا بڑا منہ نہیں، اتنی بڑی بات! تم میرے سامنے زبان چلا رہی ہو؟ تمہاری یہ ہمت؟"

ستی بھی کم نہیں تھی، اس نے کہا۔ "سچ بات بولنے میں ڈر کیسا؟ ڈر کیسا، سنوں؟ تم قصور کرو تو کچھ نہیں اور میں بولوں تو قصور ٹھہرائی جاؤں؟ تم نہیں جانتی کہ تمہاری وجہ سے بابا کو کتنا صدمہ پہنچا ہے؟ تم نہیں جانتی کہ تم نے بابا کے دل کو کتنا زبردست صدمہ پہنچایا ہے؟ تم نہیں جانتی کہ اگر اس دن میں نہ ہوتی تو بابا کی کیا حالت ہوتی؟"

یکایک دیپنکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا زیادہ دیر تک وہاں کھڑا رہنا مناسب نہیں ہے، اُسے یہ سب باتیں بھی نہیں سننا چاہیے۔ دیپنکر آہستہ آہستہ کمرے سے نکل کر ان دونوں کی نظریں بچا کر چلا آ رہا تھا۔ یکایک ستی نے اسے پکارا۔ "اے دیپو! تم کیوں جا رہے ہو، یہیں ٹھہرو، تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟"

دیپنکر ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے ایک بار لکھی دیدی کی طرف دیکھا۔

لکھی دیدی نے کہا۔ "یہ باتیں اس کے سامنے کہے بغیر شاید تمہارے دل کو چین نہیں آئے گا، کیوں؟"

ستی نے کہا۔ "تم تو اب تک مجھی کو بدنام کر رہی ہو، اب وہ خود ہی فیصلہ کرے کہ قصور کس کا ہے، میرا یا کسی اور کا!"

"اس کے سمجھ لینے سے کیا تمہیں خوشی ہوگی؟" لکھی دیدی نے پوچھا۔ "اُسے دوسروں کی بُرائی سنا کر تمہیں کیا فائدہ ہوگا، سنوں تو سہی؟ اس سے تمہاری عزت بڑھ جائے گی؟"

"دیدی، تم اپنی عزت کی بڑائی کم از کم میرے سامنے تو نہ کرو! تم نے تو ہمارے خاندان کی عزت ڈبو دی ہے، جانتی ہو؟"

"تم مجھے عزت کی بات بتانے آئی ہو؟ مجھے عزت کا سبق مت پڑھاؤ، سمجھیں؟ دیپو کے ساتھ تمہارا اتنا میل کیوں ہے، بتا دوں؟ تم دیپو کے یہاں اتنا کیوں جاتی رہتی ہو؟ تم سمجھتی ہو مجھے کچھ معلوم نہیں ہے—؟ دیپو کے ساتھ تمہاری اتنی دوستی کس بات کی ہے، بولو تو؟"

یکایک ستی کا چہرہ سرخ ہو گیا، جیسے کسی نے سیندور مل دیا ہو۔ ستی کا چہرہ دیکھ کر دیپنکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے یکایک وہ رنگے ہاتوں دھر لی گئی ہو۔ یکایک دیپنکر کے ہاتھ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور دیپنکر کا تمام جسم کانپ گیا۔

لکھی دیدی نے اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، وہ کہتی گئی۔ "دوسروں کی خامیاں گنوانے سے پہلے اپنی خامیوں پر نگاہ ڈال لیا کرو۔ سمجھ گئیں ستی! تم نے جس طرح خط لکھ لکھ کر بابا کو میرے خلاف کر دیا ہے اسی طرح اگر میں بھی تمہارے بارے میں لکھ دوں؟ اگر میں بھی لکھ دوں کہ تم دن بھر کس کے یہاں گزارتی ہو، کس کے ساتھ تمہاری دوستی ہے؟ تب کیا ہوگا؟"

اتنی دیر بعد جیسے ستی کو ہوش آیا ہو۔ اس نے کہا۔ "دیدی، تم ایسی بات بھی کہہ سکتی ہو؟"

"کیوں، کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟ کیا میری آنکھیں نہیں ہیں؟ دیپو کے ساتھ تمہاری کس بات کی خاطرداری ہے؟"

ستی چونک اُٹھی، اس نے کہا۔ "دیپو کے ساتھ میری خاطرداری؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں، میں صحیح کہہ رہی ہوں! سبھی دیکھتے ہیں، سبھوں کی آنکھیں ہیں، تم اس کے یہاں نہیں جاتی ہو؟ اس کے یہاں جا کر گھنٹوں بیٹھی نہیں رہتی ہو؟ دیپو کے منہ سے منہ لگا کر باتیں نہیں کرتی ہو؟"

دیپنکر سر سے پاؤں تک تھر تھر کانپنے لگا۔ اس سے مزید وہاں پر کھڑے نہ رہا گیا۔ وہ سیدھا باہر نکل آیا اور نیچے آ گیا۔ کالی ماں کوٹھری

بولی تھیں، وہ دیپک کو دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

"وہ دونوں پھر جھگڑ رہی ہیں شاید؟" انہوں نے پوچھا۔

اور اسی دن، رات کے وقت ستی نے اُسے بتایا کہ ملکی دیدی واپس نہیں آئی۔

صبح کے وقت حسب معمول دونوں بہنیں کالج گئی تھیں۔ دیپک بھی کالج گیا تھا اور جس طرح اور دن گزرتے تھے، وہ دن بھی گزر گیا۔ اس دن بھی اور دنوں کی طرح صبح کے بعد دوپہر، دوپہر کے بعد سہ پہر ہوئی تھی اور پھر شام ہو گئی تھی۔ شام کے بعد دیپک گھر آیا تھا، اس کے بعد وہ کرن کے یہاں گیا تھا اور کرن سے دیر تک باتیں کرتا رہا تھا، باتیں کرتے کرتے کافی رات ہو گئی تھی اور اس کے بعد کھانا کھا کر جب وہ امرا کے پیڑ کے نیچے ہاتھ منہ دھونے گیا تھا تو اچانک ستی نے اُسے یہ خبر سنائی تھی!

اس خبر کے سننے کے بعد ہی سے دیپک کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔ اسی دن سے اُسے گھر واپس جانے کی بھی خواہش نہیں ہوتی، اس کے لئے جیسے ہر چیز بے کیف ہو کر رہ گئی تھی، اتنے دنوں تک زندگی کے گرد جو تانا بانا تھا، جو اچھائی اور برائی تھی، اتنے دنوں تک جو آسمان تھا، جو ہوائیں تھیں، اتنے دنوں تک جو دنیا تھی اور دنیا کے گرد جو رعنائیاں تھیں، وہ سب جیسے یکایک بے کیف معلوم ہونے لگی تھیں۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کچھ بھی نہیں ہے، کوئی بھی نہیں ہے۔

صبح کے وقت وہ بازار سے سڑے ہوئے آلو خرید کر لے آیا تھا اور ماں جب ترکاری کاٹنے بیٹھی تھی تو اس نے تمام آلو اٹھا کر پھینک دیئے تھے۔

"تم نے اب تک بازار کرنا بھی نہیں سیکھا؟" ماں نے خفگی آمیز لہجہ میں کہا تھا۔ "یہ سڑے آلو کون کھائے گا، بولو تو؟"

صبح کو جب وہ مندر میں پھول دینے گیا تھا تو بھی وہ بہت اداس ہو گیا تھا۔

شیو شمبھو کے مندر کے بوڑھے پنڈت نے اس سے پوچھا تھا۔

"پھول دے کر تم نے پرشاد نہیں لیا؟"

رات کے وقت جب وہ کھانے بیٹھا تھا تو اس نے نصف بھات چھوڑ دیا تھا۔

ماں نے اُسے آواز دے کر بلایا تھا اور پوچھا تھا۔

"یہ کیا، تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟"

دوسرے دن بھی وہ کھویا کھویا سا رہا۔ کرن بیمار ہے، ایک بار کرن سے جا کر مل لینا چاہیئے، اس نے سوچا تھا پھر کالی گھاٹ، شاہ نگر، بھوانی پور کے پورے علاقہ کا بے مقصد چکر کاٹتا رہا تھا اور بار بار اُسے بیتے دنوں کی یاد ستاتی رہی تھی۔ کرن کے ساتھ بچپن میں کتنی ہی بار وہ ہریش پارک میں میٹنگ دیکھنے اور تقریریں سننے آیا تھا، کتنی ہی بار پولیس کی لاٹھی کھانے کے خوف سے بھاگ کھڑا ہوا تھا، کتنے دنوں تک وہ کرن کے ساتھ [illegible] کے لئے آیا تھا، کتنے ہی دنوں تک وہ کالی گھاٹ پرائمری لائبریری کے لئے راستے راستے چندہ مانگتا پھرا تھا۔ وہ دن تک مسلسل پیدل چلتے رہنے کی وجہ سے اس کے دونوں پاؤں بری طرح دکھنے لگے تھے۔ جہاں پر بالی گنج کی نئی سڑک بن رہی ہے نئی عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں، اس طرف جا کر وہ دیر تک قلیوں اور مزدوروں کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ ان قلیوں میں سے چند اس کی

جان پہچان کے بھی نکل آئے تھے اور اُن سے وہ گھنٹوں باتیں کرتا رہا تھا ۔ وہ لوگ کہاں رہتے ہیں ، انھیں کتنی مزدوری ملتی ہے ــــ اور پھر جب وہ لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے تو دیپکر بھی گھر کی طرف چل پڑا تھا ۔ وہی ایشور گنگولی لین ، وہی نیاں بشپار ج لین ، وہی دھرم داس ٹرسٹ ماڈل اسکول ــــ اور اس کے بعد وہی اٹھتیس ایک بی نمبر کا مکان تھا ۔ گھر میں جاتے ہی اسے محسوس ہوتا ، اگر لکھی دیدی آ گئی ہو ، اگر اچانک آج لکھی دیدی گھر لوٹ آئی ہو !

ماں نے پوچھا تھا ــــ" ہاں رے ! ان کی بڑی لڑکی یکایک کہاں چلی گئی ؟ تم نے تو مجھے کچھ بھی نہیں بتایا !"

بنتی دیدی نے پوچھا تھا ــــ" کون لڑکی دیدی ؟"

" تم ان باتوں میں نہ رہا کرو بیٹی ــــ" ماں نے نصیحت کی تھی ۔

" وہ تو پٹسی لکھی لڑکیاں ہیں ، ہے نا دیدی ؟" بنتی دیدی نے کہا تھا ۔

اور دیپکر کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے سارا قصور اسی کا ہو ۔ لکھی دیدی کی بُرائی خود اس کی برائی کے مترادف ہے ۔ لکھی دیدی کی عزت اس کی عزت ہے ، لکھی دیدی کا کلنک خود اس کی پیشانی کا کلنک ہے اور دیپکر کو ایسا لگا جیسے سب اُسی کی بُرائی کر رہے ہیں ، جیسے یہ اسی کا قصور ہو ، جیسے یہ اسی کی ذمہ داری ہو اور اسے ماں کی طرف ایک نظر دیکھتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی ! ماں تو نہیں جانتی تھی کہ دیپکر ہی ہر روز صبح کے وقت چھپا کر ایک آدمی کو خط پہنچاتا تھا ، ماں تو نہیں جانتی تھی کہ اس کے لئے خود دیپکر ہی ذمہ دار تھا ! اور ستی ! ستی پہلے اس کی طرف سے مشکوک تھی ، لیکن اس کا شک کیا بالکل بے بنیاد تھا ! وہ داتار بابو کو کیوں خط پہنچاتا تھا ، اس نے کسی کو بھی کیوں نہیں بتایا ! اگر وہ اس سے پہلے بتا دیتا تو شاید لکھی دیدی کو اس طرح گھر سے بھاگنے کا موقعہ نہ ملتا ۔ لکھی دیدی کے نہ ہونے سے تمام گھر اُجاڑ اور سنسان دکھائی پڑ رہا تھا ، لکھی دیدی نہیں تھی ، لیکن لکھی دیدی کی کمی ساری دنیا میں محسوس ہو رہی تھی ۔

اور اس روز دیپکر اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا ، یکایک اُسے ایسا لگا جیسے بغل کے کمرے سے ستی کے بولنے کی آواز آ رہی ہے ــ

ماں کہہ رہی تھی ــ" اگر تمھاری ماں ہوتی تو ایسا ہرگز نہ ہوتا بیٹی ــــ"

" ماں کو تو میں نے بچپن ہی سے نہیں دیکھا ہی ماں ــ" ستی نے کہا تھا ۔

" لیکن آخر وہ گئی کہاں ، کوئی پتہ نہیں چلا ، یہ کیسے ہو سکتا ہے بیٹی ؟ تمھارے کاکا بابو نے پولیس میں خبر کیوں نہیں دی بیٹی ؟ وہ اڑ کر تو کہیں نہیں جا سکتی ، اتنی بڑی جیتی جاگتی لڑکی ہے ــ"

" کاکا بابو تو اسی دن سے تلاش کر رہے ہیں ــ" ستی کی آواز آئی ۔

" تمھارے بابا ہی کی غلطی ہے بیٹی " ۔ ماں نے کہا تھا ــ" اتنی سیانی لڑکی کو کوئی گھر میں بٹھا کے رکھتا ہے ! یہی دیکھو نا بیٹی ۔ بنتی میری کون ہے ؟ کوئی بھی نہیں ، لیکن اسی بے زبان لڑکی کے بارے میں سوچ سوچ کر میری راتوں کی نیند اڑ گئی ہے ــ"

" لڑکے اور لڑکیوں کے جوان ہونے کے بعد باپ ماں کی پریشانی اور بڑھ جاتی ہے " ماں کی آواز سنائی دے رہی تھی ــ" اسے تو میں ہی سمجھتی ہوں ــ" ۔

اور دیپکر پڑھنا چھوڑ کر کان کھڑے کئے ہوئے ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا ۔

"اب میرا دیپو بھی جوان ہو رہا ہے، یہ سوچ کر میرے سر پر بجلی کوند رہی ہے — جب تک چھوٹا تھا مجھے کوئی فکر نہیں تھی، اب اس کی طرف دیکھ کر دل میں اندیشے جنم لینے لگتے ہیں —"

اور ستی زور سے ہنسنے لگی تھی۔

"یہ آپ کی زیادتی ہے ماسی ماں —"

"نہیں بیٹی، تم نہیں سمجھو گی، جب تم بھی ماں بنو گی تب سمجھو گی! یہ لڑکے لڑکیاں سب دشمن ہوتے ہیں۔"

"دیپو آپ کا بہت اچھا لڑکا ہے ماسی ماں —" ستی نے کہا تھا۔

"تم اسے اچھا کہہ سکتی ہو، لیکن خراب ہوتے دیر ہی کتنی لگتی ہے! کال گھاٹ اچھی جگہ تو نہیں ہے —— لڑکے اور لڑکیوں کی پرورش کرنا کتنا مشکل ہے، یہ میں ہی جانتی ہوں!"

اس کے بعد بڑی دیر تک ان دونوں کی کوئی بات سنائی نہیں دی تھی اور دیپنکر آہستہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور پھر بغل کے کمرے میں چلا گیا تھا، دوسرے کمرے میں ماں اور ستی اس کی طرف پشت کئے ہوئے بیٹھی تھیں۔ اُسے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پہلے ماں نے دیکھا تھا اور پیار بھری خفگی سے کہا تھا۔

"تم پڑھنا چھوڑ کر کیوں چلے آئے دیپو؟ پڑھنا ہو گیا؟"

اب کے ستی نے بھی پلٹ کر دیکھا تھا۔

اور دیپنکر نے یکایک پوچھا تھا — "لعنی دیدی گھر واپس نہیں آئی؟"

"تمہیں اس خبر سے کیا سروکار ہے، میں بھی تو سنوں؟" ماں نے اُسے ڈانٹا تھا — "تم اپنے چرخے میں تیل دو، اپنا ٹھیک نہیں —— چلے ہیں دوسروں کی خبر لینے! دیکھ لیا نا بیٹی! سن لیا تو؟ اس کی فکر میں کون گھلا جا رہا ہے، اس کا تو ٹھیک نہیں — جاؤ، ابھی پڑھو جا کر — بھات پکنے کے بعد کھانے کے لئے بلا لوں گی۔"

اور دیپنکر پھر اپنے کمرے میں چلا آیا تھا، لیکن پڑھائی میں اس کا دل بالکل ہی نہیں لگا تھا۔ وہ پھر کان کھڑا کر کے دوسرے کمرے میں ہونے والی گفتگو سننے لگا تھا۔

ستی نے کہا تھا — "اب میں بھی جاتی ہوں ماسی ماں —"

"کچھ دیر اور بیٹھو نا بیٹی، تم آ جاتی ہو تو کچھ دیر باتیں کر کے جی ہلکا کر لیتی ہوں —"

"مجھے بھی آپ کے یہاں آ کر باتیں کرنا اچھا لگتا ہے ماسی ماں۔" ستی نے کہا تھا — "لیکن آج کئی دنوں سے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا، کاکا بابو نے بھی کھانا پینا چھوڑ دیا ہے اور کام کاج بھی چھوڑ کر دن رات ادھر اُدھر ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ میں بھی کالج نہیں جا رہی ہوں —"

"اس طرح کیسے کام چلے گا بیٹی! —" ماں نے کہا تھا۔

"دیدی کے ساتھ دن رات جھگڑتی رہتی تھی، تو بھی اچھا لگتا تھا ماسی ماں! لیکن اب دل ایسا اچاٹ ہو گیا ہے کہ گھر میں بھی جی نہیں لگتا!"

"تمہارے بابا کو خبر دے دی گئی ہے تو بیٹی؟"

"کاکا بابو تو روز ہی خبر بھیجنے کے لئے کہتے ہیں، لیکن میں ہی روک دیتی ہوں! شاید دو ایک روز میں وہ یہاں آجائیں گے! پھر خواہ مخواہ دو ایک روز کے لئے ان کے دل کو صدمہ کیوں پہنچایا جائے!"

"تمہارے بابا آجائیں تو ان سے دیدی کی شادی کر دینے کے لئے کہوں گی — اور تمہاری بھی شادی ہو جائے تو بہتر ہے بیٹی —— لڑکی کو زیادہ دنوں تک گھر میں بٹھا کر بوڑھی بنانا اچھا نہیں ہوتا — اب یہی دیکھو نا، بنتی کے لئے میں چاروں طرف سے کھوج خبر لے رہی ہوں — اور تم لوگوں کے پاس تو دینے لینے کے لئے بھی بہت کچھ ہے —"

"بابا کے پاس وقت کہاں ہے ماسی ماں؟" ستی نے کہا تھا — "پوجا ہے، دفتر ہے، کاروبار ہے، وہ کس وقت دوسرا کام کریں گے؟"

"اوماں"۔ ماں کہہ رہی تھی — "کام کاج اور کاروبار ہے تو کیا اس کے لئے بیٹی کی شادی رکی رہے گی؟ یہ بھی تو ایک کام ہے۔"

اور ستی کے چلے جانے کے بعد بھی بڑی دیر تک دیپنکر کا پڑھنے میں جی نہ لگا تھا، اس کا ذہن ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا، دماغ میں کچھ اٹ ہی نہیں رہا تھا، ہزار کوشش کے بعد بھی وہ پڑھنے پر دل کو آمادہ نہ کر سکا تھا، یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ تھی، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دیپنکر کے دل کی ایسی حالت ہے، لیکن کوئی سوچ بھی کیسے سکتا تھا، کسی کو کیا معلوم تھا کہ لکھی دیدی کے ساتھ اس کا کیا رشتہ تھا، یہ کسی کے جاننے کی بات بھی نہیں تھی، کوئی خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا! لیکن لکھی دیدی اسے پھر بھی بتا کر نہیں گئی تھی، وہ اسے بتا بھی تو سکتی تھی، بتا بھی دیتی تو بھی تو دیپنکر کسی سے ہرگز نہ کہتا، اگر لکھی دیدی منع کر دیتی تو وہ ہرگز کسی سے نہ کہتا۔ مگر لکھی دیدی نے دیپنکر کو بھی کیوں نہیں بتایا! اس نے یہ بات دیپنکر سے آخر کیوں چھپائی!

ایک دن پہلے بھی دیپنکر کی لکھی دیدی سے ملاقات ہوئی تھی اور ایک دن پہلے بھی لکھی دیدی نے اور دنوں کی طرح ہنس کر اس سے باتیں کی تھیں۔ ستی کے ساتھ جھگڑا کیا تھا، پھر بھی اس کے اندر کوئی تبدیلی تو نہیں آئی تھی، ایک روز پہلے بھی اس نے حسب معمول دیر سے چائے پی تھی اور اس وقت تک ستی نہا کر فارغ ہو چکی تھی اور جس طرح ہر روز سج دھج کر کالج جاتی تھی، اسی طرح سج دھج کر اس روز بھی کالج گئی تھی۔ روز کی طرح اس روز بھی کالج کی بس آکر گلی میں رکی تھی اور لکھی دیدی بس میں چڑھ گئی تھی۔ کالج جانے سے قبل کاکی ماں کھانے کے سامنے آکر بیٹھ جاتی تھیں اور لکھی دیدی اور ستی کو اپنے سامنے کھلاتی تھیں۔

کاکی ماں نے پوچھا تھا — "ہاں رے، اور تھوڑا سا چاول منگاؤں! اوماں، تم اٹھ کیوں گئیں، اور کھاؤ؟"

"اور نہیں کھا سکتی کاکی ماں"، لکھی دیدی نے جواب دیا تھا — "پیٹ بھر چکا ہے۔"

"تمہارے بابا دیکھیں گے تو کہیں گے کہ میں تمھیں کھانے ہی کو نہیں دیتی تھی"۔ کاکی ماں نے کہا تھا۔

"نہیں، کاکی ماں"، لکھی دیدی نے جواب دیا تھا — "اگر ایسا ہی ہے تو میں واپس آکر کھاؤں گی، اس وقت کافی دیر ہو چکی ہے۔"

"مگر یہ دیر کس کی وجہ سے ہوئی ہے، سنوں تو ذرا، میں نے تو بہت پہلے ہی کھانا تیار کر دیا تھا۔ کب سے تمھیں کھانے کے لئے بلا بھی رہی تھی —"

لیکن اس گھڑی لکھی دیدی کے پاس ان باتوں کا جواب دینے کے لئے وقت نہیں تھا، صبح کے وقت وہ ایک تو کافی دیر سے سو کر

الجھتی تھی، اس کے بعد کتابیں اکٹھا کرنے کی باری آتی تھی، ایک کتاب ملتی تو دوسری نہیں ملتی، ایک کاپی ملتی تو دوسری کا پتہ نہ چلتا، اور ستی وستی اس وقت تک نکھی دیدی کالج جانے کے لئے تیار رہتی، وہ اس وقت تک پوجا بھی کر چکی ہوتی اور چائے بھی پی چکی ہوتی۔ دونوں کی بسیں ایک ہی وقت آتی تھیں۔ بلکہ نکھی دیدی کی بس آ کر دیر تک کھڑی رہتی، بار بار ہارن بجاتی اور گلی کے موڑ پہ کھڑی کا کھٹکا جاتی تھی۔

اس دن ستی کی بس پہلے آئی تھی، ستی کھاپی کر اور سج دھج کر پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی، بس آتے ہی وہ اس پہ چڑھ کر چلی گئی تھی اور جاتے وقت حسب معمول کہہ گئی تھی۔

"میں جا رہی ہوں کاکی ماں"

اور کاکی ماں نے بھی حسب معمول جواب دیا تھا "جاؤ بیٹی"

اس کے بعد نکھی دیدی کی باری تھی۔ نکھی دیدی نے بھی جاتے وقت کہا تھا۔

"میں جا رہی ہوں کاکی ماں"

"جاؤ بیٹی" کاکی ماں نے جواب دیا تھا۔

اس کے بعد دروازے کے قریب آ کر کاکی ماں نے پوچھا تھا۔

"آج تم کس وقت لوٹو گی؟ کتنے بجے؟ دیر ہوگی؟"

"نہیں کاکی ماں، آج میں جلد ہی واپس آ جاؤں گی، چار بجے تک"

کالج جانے سے پہلے اور کالج سے آنے کے بعد ہر روز کاکی ماں سے نکھی دیدی کی ملاقات ہوتی تھی، باتیں ہوتی تھیں اور نکھی دیدی اور ستی کے لئے پہلے ہی سے کھانا تیار ہوتا تھا، جو پہلے آتی تھی، وہ کھا لیتی تھی، اس کے بعد گپ کرو، چھت پہ ٹہلو، جھگڑا کرو، جو خوشی ہو وہ کرو، کوئی کچھ کہنے نہیں جائے گا، اسی طرح اتنے دنوں تک چل رہا تھا، اسی طرح اس گھر کا روزانہ کا کام ہو رہا تھا۔ کاکا بابو گھر کے مالک تھے، وہ کب دفتر کے کام سے باہر نکل جاتے تھے، کب واپس آتے تھے، اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا، لیکن نکھی دیدی اور ستی کا ایک مقررہ وقت تھا، وہ دونوں مقررہ وقت پر جاتی تھیں اور مقررہ وقت پر گھر واپس آ جاتی تھیں اور کاکی ماں کو زیادہ تر ان کو کھلانے اور ان کے کھانے کے انتظامات میں مصروف رہنا پڑتا تھا، جب تمام کالی گھاٹ کے لوگ مختلف مسائل میں الجھے ہوئے ہوتے اس گھر میں کاکی ماں خانہ داری کے انتظامات میں الجھی ہوئی ہوتیں۔ تین بجتے بجتے کاکی ماں چولہا سلگا دیتیں، ٹھاکر کو ضروری ہدایات دیتیں، رگھو کو تاکید کرتیں۔ ــــ نلکے میں پانی آ گیا ہے، اب لڑکیاں آنے ہی والی ہیں۔ آتے ہی کھانا مانگیں گی ــــ زیادہ تر نکھی دیدی ہی پہلے لوٹتی تھی اور آتے ہی آواز دیتی ــــ

"کاکی ماں ــــ"

اس کے بعد نکھی دیدی سیدھے اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی اور کتابیں میز پہ پھینک کر بستر پہ چت لیٹ جاتی تھی۔

اور تھوڑی دیر بعد ستی بھی آ جاتی تھی۔ پھر دونوں کا کھانا آ جاتا، دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتیں، پھر دونوں بیٹھ کر گپیں اڑاتیں اور کاکی ماں خاموش بیٹھی سنتی رہتیں، قصے کہانی کا دور چلتا رہتا کہ یکایک باورچی خانے سے کاکی ماں کا بلاوا آتا اور وہ اٹھ کر چلی جاتیں۔

جب تک ان کے پاس کاکی ماں کھڑی نہ رہتیں، کام ہی نہ چلتا۔ لکھی دیدی کو ترشی پسند تھی، ستی کو نا پسند تھی۔ لکھی دیدی ترچھا کھاتی تھی، ستی روٹی کھاتی تھی، لکھی دیدی بالکل گرم کھانا کھاتی تھی لیکن ستی کو ٹھنڈی چیزیں کھانے میں بھی کوئی اعتراض نہ تھا — اس کے بعد دونوں مطالعہ کرنے بیٹھتی تھیں اور اسی وقت کبھی کبھی ستی بغل کے مکان میں گھومنے چلی جاتی تھی۔ ستی زیادہ دیر تک ایک جگہ اکیلی نہیں رہ سکتی تھی۔ باتیں کئے بغیر اس کا دم پھولنے لگتا تھا۔

وہ کہتی — "کاکی ماں، میں ذرا ان لوگوں کے یہاں سے گھوم کر آتی ہوں —"

"اس وقت جاؤ گی؟ کھانا تیار ہو چکا ہے!"

ستی کہتی — "میں گئی اور آئی کاکی ماں — ذرا سا دو چار باتیں کر آؤں —"

اس گھر میں اسی طرح دن گزر رہے تھے۔ اسی طرح روزانہ دنیا کا چکر گھوم رہا تھا، اُنیس ایک بی ایشور گنگولی لین کے کرایہ داروں کا یہی معمول تھا۔ نہ جانے برما کے کس دور دراز مقام سے ہر ماہ کاکا بابو کے نام سے منی آرڈر آتا رہتا۔ بھوبنیشور مترا اپنی دونوں لڑکیوں کے لئے روپیہ بھیجتے رہتے ——————— اور دونوں بہنوں کے کپڑے اور پڑھائی کا خرچ چلتا رہتا۔ شاید انہوں کلکتہ کی ایک تاریک گلی کی تاریکی میں ان دونوں کو چھپا کر سوچا تھا کہ اس طرح وہ کلک کی سیاہی سے بچ جائیں گے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ لڑکیوں کا مستقبل سنوارنے کے لئے کلکتہ ہی شاید محفوظ مقام ہوگا اور سوچا تھا تجارت اور کاروباری مصروفیت سے کچھ دنوں کی فرصت نکال کر دونوں لڑکیوں کی شادی کر دیں گے۔ اتنے دنوں تک کاروبار ہی نقصان ہوگا، تجارت میں تعطل آ جائے گا لیکن خواہ نقصان ہو خواہ تعطل ہو، اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا! آخر یہ دولت کس کے لئے ہے، یہ کاروبار کس کے لئے ہے، جو کچھ انہوں نے جمع کر رکھا ہے یہ کس کے مستقبل کے لئے ہے! بھوبنیشور مترا کے کوئی اولاد نہیں تھی، اس لئے ایک دن دونوں داماد ہی تمام کاروبار کے مالک ہوں گے، وہی دونوں ان کی جمع کی ہوئی دولت کے حقدار ہوں گے۔ اس لئے اچھی طرح دیکھ بھال کر داماد بھی کرنا ہوگا، سوچ بچار کرکے انتخاب کرنا ہوگا۔ لیکن انتخاب کرنا اتنا آسان تو نہیں! دیکھ بھال کے لئے وقت نکالنا بھی تو آسان نہیں! اسی لئے تو اتنے دنوں سے لکھی اور ستی کی شادی رکی ہوئی تھی اور اسی لئے تو ان دونوں کا تعلیمی سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ وہ دونوں امتحان دے رہی تھیں، پاس ہو رہی تھیں اور کلکتہ کے ایک محفوظ مقام پر رہتی تھیں۔ قابلِ اعتماد دلی اور نگران کے پاس دونوں لڑکیوں کو رکھ کر وہ مطمئن تھے۔ لیکن کون جانتا تھا کہ ایسا ہو جائے گا! کون جانتا تھا کہ وہاں اُنیس ایک بی ایشور گنگولی لین میں بھی ایک ویٹکر رہتا ہے جو چھپا چھپا کر ایک آدمی کو خط پہنچائے گا اور لکھی دیدی بھی ایک دن بغیر کچھ کہے سنے لاپتہ ہو جائے گی!

ستی اس روز بھی اپنے مقررہ وقت پر کالج سے لوٹ آئی تھی، روز کی طرح اس دن بھی اپنے کمرے میں جا کر اس نے کپڑے تبدیل کئے تھے۔ اور دنوں کی طرح کاکی ماں بھی وہاں آ گئی تھیں۔

اور کاکی ماں کے آنے پر ستی نے پوچھا تھا — "لکھی دیدی نہیں آئی؟"

"نہیں، اب آئے گی شاید" کاکی ماں نے جواب دیا تھا — "تم کھا لو"

کھانے کے بعد ستی تھوڑی دیر کے لئے پڑوس میں ماسی ماں سے باتیں کرنے چلی گئی تھی اور جب وہ وہاں سے واپس آئی تو بھی

لکھی دیدی نہیں لوٹی تھی۔

وقت گزرتا گیا، تاریکی پھیل گئی، پھر تاریکی اور بھی گہری ہو گئی، پھر گلی کے موڑ پر گاڑی کی آواز سنائی دی، پھر ہارن بجا۔ لیکن لکھی دیدی نہیں آئی۔ پھر دفتر سے کاکا بابو بھی آ گئے۔ کاکا بابو نے بھی سنا، لکھی اتنی دیر تو کبھی نہیں کرتی تھی۔ کہاں گئی، پھر کہاں چلی گئی؟

یہ تمام باتیں دینکر کو بعد میں معلوم ہوئی تھیں، اُسے سب کچھ ستی نے بتایا تھا۔ اس کے یہاں جب تلاش جاری تھی اس وقت دینکر کرن کے یہاں بیٹھا تھا اور کاکا بابو ڈھونڈنے کے لئے باہر نکل چکے تھے۔ وہ لکھی دیدی کے کالج گئے۔ تھانہ گئے۔ کتنی ہی جگہوں پر تلاش کیا اور بھاگتے دوڑتے رہے۔ پھر جب دینکر کھانا کھا کر آنگن کے کنارے امرود کے پیڑ کے نیچے ہاتھ منہ دھونے گیا تو اُسے بھی معلوم ہو گیا۔

اور اس کے بعد؟

اس کے بعد ہی سے نہ جانے دینکر کو کیا ہو گیا تھا، وہ لوگ ممکن ہے کھا رہے ہوں، وہ لوگ ممکن ہے سو رہے ہوں لیکن دینکر کو نہ کھانا اچھا لگتا تھا، نہ نیند آتی تھی، کالج جاتا اور اس کے بعد بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہتا، اس طرح گھومتے ہوئے اُسے تھکاوٹ بھی محسوس نہیں ہوتی تھی اور سکون بھی نہیں ملتا تھا۔

اُسے ابھی تک یاد ہے، اس روز بڑی دیر تک داتار بابو سے باتیں کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا تھا۔

داتار بابو نے کہا تھا۔ ”اس طرح کب تک گھومتے پھرو گے، اب گھر جاؤ۔“

دینکر نے کہا تھا۔ ”گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ ہر گھڑی لکھی دیدی کی یاد آتی رہتی ہے۔“

”سوچ کر اور کیا کرو گے؟“

”نہیں بھی سوچوں تو کیا ہو گا!“

”جو بھی ہو، تم بھول نے کی کوشش کرو۔“ داتار بابو نے کہا تھا۔

اس کے بعد داتار بابو جب اپنی بات ختم کر کے دور چلے گئے تو یکایک دینکر کو ایک بات یاد آ گئی۔ اتنی دیر میں داتار بابو کافی دور جا چکے تھے۔

دینکر نے چیخ کر آواز دی۔ ”داتار بابو، داتار بابو۔“

چلتے چلتے داتار بابو نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

دینکر نے قریب جا کر کہا۔ ”اصل بات تو میں آپ سے کہنا ہی بھول گیا۔“

”کون سی بات؟“

”وہ جو آپ نے پانچ روپے کا ایک نوٹ دیا تھا۔“ دینکر نے کہا۔ ”ہماری لائبریری کا چندہ؟ یاد ہے آپ کو؟ وہ نوٹ جعلی ہے۔“

”جعلی ہے؟ کہاں ہے، دیکھوں؟“

”میرے پاس تو نہیں، گھر میں ہے۔“

"ٹھیک ہے" داتار بابو نے کہا۔ "تم مجھے وہ نوٹ دکھاؤ گے۔ اگر جعلی ہوا تو میں بدل دوں گا۔ تم میرے دفتر میں آنا۔ پتہ تو تمہارے پاس ہے نا۔۔۔ کیوں؟"

اس دن نرپن بابو نے بہت اچھا سلوک کیا۔

بولے۔۔۔ "تم آتے کیوں نہیں؟ کبھی کبھی آ جاؤ گے، کبھی کبھی آتے نہ رہو گے تو مجھے تمہاری بات بھی یاد نہ رہے گی۔ میں کیسے یاد رکھ سکتا ہوں؟ ہزاروں ہزار کاموں کے درمیان کیا انسان کو کوئی بات یاد رہتی ہے ——— دفتر میں داخل ہوتے ہی ساری دنیا کو بھول جانا پڑتا ہے۔"

اس کے بعد قدرے رک کر انہوں نے پوچھا۔۔۔ "تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟"

"جی۔ اسی سال بی۔ اے کا امتحان دیا ہے۔"

نرپن بابو مسکرائے، بولے۔۔۔ "یہ دیکھو، تم نے تو بی۔ اے تک تعلیم پائی ہے۔۔۔ لیکن میں پرانے زمانے کا انٹرنس پاس ہوں ۔۔۔ تمہارے اسکولوں اور کالجوں میں آج کل پہلے جیسی پڑھائی ہی نہیں ہوتی۔۔۔ پہلے زمانے میں۔۔۔۔۔"

راتوں رات یکایک نرپن بابو جیسے بڑے رحم دل ہو گئے تھے، وہ بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے۔ بات بات پر مسکراہٹ پھوٹ رہی تھی۔

انہوں نے کہا۔۔۔ "تم نے تو مجھے عرضی لکھ کر نہیں دی؟ میں نے حالانکہ تمہیں اچھی طرح سمجھا دیا تھا؟"

"جی، میں تو آپ کو عرضی دے چکا ہوں۔" دیپنکر نے کہا۔۔۔ "تین عرضیاں دے چکا ہوں۔۔۔"

اب کے نرپن بابو ذرا سا اکھڑ گئے، بولے۔۔۔ "دیکھتے ہو کہ کامی آدمی ہوں۔۔۔ ہزاروں کاموں میں الجھا رہتا ہوں ——— مجھے ہر بات یاد رہتی ہے؟ تم نے اگر تین عرضیاں لکھ کر دی بھی ہیں تو کیا ہوا، اور ایک عرضی لکھ کر دینے میں کیا حرج ہے چھوکرے؟ حرج ہی کیا ہے؟"

پھر ان کا پارہ ایک دم چڑھ گیا، بولے۔۔۔ "میں اور کتنے دن ہوں چھوکرے، آئندہ ماہ ہی تو ریٹائر ہو رہا ہوں، اس وقت؟ اس وقت کون تمہیں نوکری دے گا۔ بولو؟ کون تمہیں میری طرح اتنا سمجھائے گا؟"

اُسے یاد ہے، واقعی اس دن دیپنکر کو بڑی حسرت ہوئی تھی، نرپن بابو کا سلوک دیکھ کر وہ حیران ہو گیا تھا۔ اس نے خواہ مخواہ نرپن بابو کے متعلق غلط رائے قائم کر لی تھی، کتنے اچھے آدمی ہیں! لیکن دیپنکر کا خیال تھا کہ نرپن بابو ہی شاید رشوت لے رہے ہیں۔ اور پچیس روپے کا مطالبہ بھی خود ان کا اپنا ہے۔ دیپنکر راستے بھر سوچتا رہا۔ اس طرح ہر آدمی کے بارے میں رائے قائم کر لینا غلط ہے، نا انصافی ہے، دیپنکر کو خود اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوئی، کتنا نادان ہے وہ بھی، ہر آدمی کے بارے میں بُری رائے قائم کر لیتا ہے، پھر بڑی آسانی سے اچھی رائے بھی قائم کر لیتا ہے جیسے کاکا بابو! لکھی دیدی اور ستی کے کاکا بابو! کاکا بابو کے بارے میں دیپنکر نے کتنی اچھی رائے قائم کی تھی، اچھی اور بُری، دونوں میں کتنا فرق ہے، حالانکہ باہر سے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔

گھر جاتے ہوئے ماں نے کہا ۔" پھر تم نے آتنی دیر تک کیوں نہیں بتایا! انہوں نے صبح کو تم سے کہا تھا۔ اور تم ابھی کہہ رہے ہو؟"

بات یہ تھی، جب تک نرپن بابو کی ملازمت تھی جبھی تک ان کے اختیارات بھی تھے ۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد کیا صاحب لوگ پھر ان کی بات سنیں گے ۔ ماں جلدی سے تیار ہو گئی، نرپن بابو شام کو دفتر سے آئیں گے اس کے بعد ہی ان سے ملاقات کرنی ہوگی، صابن سے کپڑے دھونے ہوں گے ، جانے سے پہلے ماں کالی کے مندر میں جاکر پوجا کرنا ہوگا ۔ دیکھو ماں، کھوکا کو نوکری مل جائے میرا کھوکا میری آرزوؤں کا سرمایہ ہے - میں نے دیپو کو بہت دکھ اٹھا کر انسان بنایا ہے ، دوسروں کے گھر میں کھانا پکا رہی ہوں، دوسروں کی سخت سست باتیں سنتی ہوں، دروازے دروازے لوگوں کی خوشامدیں کرتی پھرتی ہوں، کسی نے بھی میری باتوں پر دھیان نہیں دیا ، کسی نے بھی میری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اس مرتبہ تم میری بات رکھ لو ماں! میں نے کسی کا برا نہیں چاہا ، کسی کا کوئی نقصان نہیں کیا، کسی کو بد دعا نہیں دی، کبھی نہیں ---

دیپنکر نے شام کے وقت مکان کی طرف دیکھا ، یہ سب کہاں چلے گئے ۔ یہ لوگ آخر گئے کہاں ۔ کاکا بابو کا مکان بالکل اجاڑ دکھائی دے رہا تھا، چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا، اس سے پہلے اس وقت چاروں طرف روشنی بکھری ہوئی ہوتی تھی ۔ جیسے ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی ۔ جیسے سب کچھ مہامایں تحلیل ہو گیا ہو ۔ پہلے صبح کو اٹھ کر مندر جانا ، پھر بازار سے واپس آکر لکھی دیدی کے پاس حاضری دینا، اس کے بعد ان دونوں بہنوں کا آپس میں جھگڑنا ، سبھی کچھ تھا، ان دونوں میں جھگڑا بھی ہوتا تھا تو کیا ہوا ، اس میں لطف آتا تھا، اب تو ماں کو بھی کچھ اچھا نہیں لگتا، لکھی دیدی نہ آتے، لیکن ستی تو ہر روز ایک بار اس کے یہاں ضرور آتی تھی ، ہر روز آکر ملاقات کر جاتی تھی۔ مگر اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا ، اچانک تمام رشتے منقطع ہو گئے تھے ۔

اس وقت تک شہر میں بہت ساری تبدیلیاں ہو چکی تھیں، اس طرف ٹرام لائن پھیلتی بڑھتی ہوئی بالی گنج ریلوے اسٹیشن تک چلی گئی تھی اور پھر اس سے بھی آگے ، دور بہت دور تک پھیلتی چلی گئی تھی ۔ ٹرام لائن کا یہ سلسلہ بہت دور جاکر ختم ہوا تھا ، لیکن پھر بھی دیپنکر کو ایسا لگتا جیسے یہ لائن اور بھی دور تک جاتی تو اچھا ہوتا ، جہاں پر سڑک کے کنارے کرن جنیو بیچا تھا ، اب وہاں پر اور زیادہ بھیڑ ہونے لگی تھی بسوں پر چڑھنے اور اترنے والوں کی تعداد بھی پہلے سے کافی بڑھ گئی تھی ۔ لیکن اب کرن وہاں جنیو بیچنے نہیں جاتا تھا ، اب اسے جنیو بیچنے کی ضرورت نہیں تھی پتہ نہیں پہلے دن اب کہاں چلے گئے تھے !

دوسرے دن شام کے وقت جب دیپنکر گھر لوٹا تو اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ چاروں طرف لوچی تلنے کی میٹھی میٹھی خوشبو اڑ رہی تھی ۔ اچانک لوچی کی خوشبو پاکر اسے حیران ہونا ہی چاہئے تھا ۔ ماں صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئی تھی اور آج وہ بے حد مصروف دکھائی دے رہی تھی ۔ چھنو بھی آج دھلے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھی اور باورچی خانے میں بیٹھی مسالہ پیس رہی تھی ۔

آنگن سے گزرتے ہوئے دیپنکر نے دیکھا اس کے کمرے میں تخت پوش پر دو تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور تینوں عمر تھے ۔ دیپنکر ان میں سے کسی کو بھی پہچانتا نہ تھا ۔ سبھی اجنبی چہرے تھے ۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جب وہ باورچی خانے کی طرف آیا تو وہاں اسے ستی دکھائی دی ۔ ستی لکھی دیدی کا بناؤ سنگھار کر رہی تھی اور لکھی دیدی تو آج پہچانی ہی نہیں جا رہی تھی ۔

دیپنکر دروازے کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا ۔ لیکن کسی نے بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا ۔

پھر وہ باورچی خانے کے اندر چلا گیا۔

"یہ کون لوگ ہیں ماں؟" اس نے پوچھا۔

ماں اس وقت تک شاید تمام کام ختم کر چکی تھی اور لوٹے سے اپنے ہاتھ دھو رہی تھی۔

"آج تمہیں اتنی دیر سے آنا تھا؟" ماں نے کہا۔ "تم نہیں جانتے تھے کہ آج بنتی کو دیکھنے کے لئے لوگ آ رہے ہیں۔"

"لیکن تم نے تو مجھے بتایا نہیں تھا، واہ رے!"

ماں مزید کچھ نہ کہہ سکی، کمرے کے اندر سے ایک معمر آدمی نکل کر باورچی خانے تک آیا اور بولا۔ "دیدی، وہ لوگ زیادہ دیر تو نہیں چاہتے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" ماں نے کہا۔ "میں نے کھانے پینے کا انتظام ہو کر لیا ہے۔ اتنے سارے انتظامات کس لئے کئے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں، نہیں، آپ ذرا سمجھا کر کہئے اگوا جی۔ بغیر کچھ کھائے چلے گئے تو مجھے دکھ ہوگا۔"

اگوا جی نے کہا۔ "میں کہہ چکا ہوں لیکن وہ لوگ سنتے ہی نہیں۔"

"پھر میں خود ان سے جا کر کہتی ہوں، آئیے!"

ماں نے جلدی جلدی نئی دھوتی پہن لی، باورچی خانے کے دروازے کی زنجیر چڑھا دی اور چندو نی سے کہا۔ "ذرا خیال رکھنا لڑکی تو سے نہ کھائیں۔"

پھر ماں کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اگوا جی نے کہا۔ "لڑکی پسند ہو گئی ہے، ایسا معلوم پڑتا ہے۔ لیکن ....."

ماں نے کہا۔ "لڑکی پسند ہو یا نہ ہو، ناشتہ کرنے میں کیا اعتراض ہے؟"

اگوا جی نے کہا۔ "وہ لوگ کافی دور سے آئے ہیں، ان کا کہنا ہے واپسی میں رات ہو جائے گی۔"

ان سب کاموں میں رات تو ہو گی، کلکتہ شہر میں رات بھی ہو جائے تو کیا ہے!

کہتے کہتے ماں کمرے کے دروازے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ دو آدمی ابھی تک تخت پوش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ماں کو دیکھ کر وہ دونوں قدرے بیزار سے نظر آنے لگے، لیکن ماں کو اس وقت نہ تو کوئی جھجک محسوس ہوئی اور نہ کسی بات کی شرم۔

ماں نے آتے ہی کہا۔ "سنتا چاہ جی صاحب کہتے ہیں کہ آپ لوگ ناشتہ کئے بغیر ہی جانا چاہتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا، آپ لوگ جب اس گھر میں آئے ہیں اور زحمت کر کے جب اس گھر میں اپنے قدم رکھ دیئے ہیں تو اب آپ لوگوں کو بغیر ناشتہ کئے میں جانے نہیں دوں گی۔ خواہ جتنی دیر بھی کیوں نہ ہو۔"

ان میں سے ایک نے کہا۔ "ناشتہ کسی دوسرے دن کر لیں گے۔ پہلے رشتہ طے ہو جائے۔ اس کے بعد ناشتہ بھی کر لیں گے۔"

ماں نے کہا۔ "لیکن میں نے آپ لوگوں کے لئے آج اتنا انتظام ہو کر رکھا ہے۔"

دوسرے آدمی نے کہا— "یہ نہیں ہو سکتا ماں، رشتہ ہونے سے پہلے ناشتہ کرنے کا ہمارے یہاں دستور نہیں ہے—"

"کیا ہوا اگر ایک دن آپ نے اپنے دستور کے خلاف ہی کیا— میں زیادہ کچھ تو دیتی نہیں ہوں— صرف منہ میٹھا کر کے چلے جائیے گا"

اتنی دیر تک اگواجی نے پہلی بار زبان کھولی— "یہ سمجھئے کہ یہی لڑکی کی ماں ہیں—"

ماں نے کہا— "بغیر ماں کی بچی ہے، میں نے ہی اسے پالا پوسا ہے اور کیا، اگھور بھٹاچارج جی ہمارے گاؤں کے آدمی ہیں انہوں نے ہی مجھے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔ میں جب سے اس گھر میں آئی ہوں تبھی سے بلتی کی پرورش کی ہے۔ جب آپ یہ رشتہ کر لیں گے تب آپ کو معلوم ہوگا کہ میری لڑکی کیسی ہے، میں اپنی زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہتی"

اگواجی نے کہا— "میں بھی ان لوگوں سے یہی کہہ رہا تھا۔ بھٹاچارج صاحب کو تو دنیا سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے، سنیاسی آدمی ہیں، یہی ویو کی ماں ہی اس گھر کی سب کچھ ہے، نواسے کہئے یا نواسی کہئے، سبھوں کی پرورش انہوں نے ہی کی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو بھٹاچارج صاحب کبھی کے سبھی کچھ چھوڑ کر سنیاس لے چکے ہوتے— اب یہی دیکھئے، ان کی نواسی کو آج آپ لوگ دیکھنے آئے ہیں اور وہ خود جگانوں کے یہاں گئے ہوئے ہیں— بھٹاچارج صاحب کے بغیر ان کے جگانوں کو بھی تو چین نہیں ملتا—"

پہلے آدمی نے کہا— "لیکن کیا وہ ایک دن کے لئے بھی گھر میں نہیں رہ سکتے تھے؟"

ماں نے جواب دیا— "بابا بڑے انوکھے مزاج کے آدمی ہیں، ان کو دیکھے بغیر آپ کچھ اندازہ نہیں کر سکتے— یہ رشتہ بھی میری ہی ضد پر قائم ہو رہا ہے— وہ سنسار تیاگی انسان ہیں، انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہتا— حالانکہ اس دنیا میں اگر ان کا کوئی اپنا ہے تو وہ یہی دو نواسے اور ایک نواسی ہیں— مگر آپ دونوں نواسوں کی بات چھوڑ دیں، ان کا جو کچھ بھی ہے وہ سب داماد ہی کو ملے گا—"

"اگھور بھٹاچارج صاحب کا اور کوئی نہیں ہے؟"

ماں نے جواب دیا— "اور کون رہے گا بتایئے۔ میں بھی ان کی نواسی کی شادی ہو جانے کے بعد یہاں سے چلی جاؤں گی۔ لڑکا میرا ہے، اس کا کوئی ذریعہ نکل آئے، پھر میں بھی چلی جاؤں گی، اس کے بعد داماد ہی اس گھر کا مالک ہوگا! اس کے علاوہ اور کتنے دن رہیں گے، اب تو انہیں آنکھ سے دکھائی بھی نہیں دیتا۔ ابھی اسی دن تو زینے سے گر کر پاؤں توڑ بیٹھے تھے اور ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا—"

اور ابھی ماں کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ ستی نے آ کر پکارا۔

"ماسی ماں—"

ماں نے مڑ کر ستی کی طرف دیکھا۔

"کیا ہے بیٹی؟ تم یہاں؟"

ستی نے کہا— "بلتی دیدی رو رہی ہے ماسی ماں، وہ آپ کو بلا رہی ہے"

اتنے لوگوں کے سامنے ماں جیسے شرمندہ سی ہو گئی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ اتنے انتظامات، اتنے ا

اتنی تیاری سب جیسے رائیگاں ہو رہی تھی۔ کتنے دنوں سے باندھا ہوا منصوبہ، کتنے دنوں سے دیکھا ہوا سپنا، کیا بے کار ہو جائے گا۔ ماں آج صبح ہی سے انتظام میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے یہ سب کچھ اکیلے ہی کیا تھا۔ اگھور دادو کو سمجھا بجھا کر روپیہ وصول کیا تھا، بڑھا وں آسانی سے روپیہ دینے پر تیار ہی نہیں تھا اور اسی لئے صبح ہی صبح اگھور دادو نے کافی ہنگامہ کیا تھا۔ اس وقت کالج جانے کی جلدی ہی، دینکر نے کچھ خیال ہی نہیں کیا تھا، اس کے علاوہ آج کئی دنوں سے اس کا دل بھی اچھا نہیں تھا، لکھی دیدی کے چلے جانے کے بعد جیسے دینکر کے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس دن داتار بابو سے باتیں کرنے کے بعد اُسے بہت ساری باتیں یاد آ گئی تھیں۔ سے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ انہی کئی دنوں میں جیسے کاکا بابو کے گھر کا ماحول بھی بدل گیا تھا۔ جیسے سویرے ہی سویرے ستی بجھ جاتی تھی اور مکان کی طرف دیکھ کر دینکر سوچتا رہتا، لکھی دیدی پھر اس مکان میں آ جائے گی، گھر آ کر پھر پہلے کی طرح بس میں چڑھ کر کالج جائے گی! آج کل ستی تنہا کالج جاتی تھی! ایک روز جب ستی کالج جا رہی تھی تو دینکر وہیں پر کھڑا تھا، شاید اس دن بس اپنے مقررہ وقت سے لیٹ تھی۔

دینکر نے پکارا ــ "اے سنو ــ"

ستی نے پیچھے مڑ کر دینکر کی طرف دیکھا۔

"کیا ہے؟"

دینکر کچھ کہتے کہتے رک گیا، جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا ہے۔

"او ماں، کیا کہنا چاہتے ہو، کہو نا، خاموش کیوں ہو؟"

"تمہارے بابا کا خط آیا؟" دینکر نے پوچھا۔

"ہاں، کیوں؟" ستی نے جواب دیا۔

"تمہارے بابا کو اس خبر سے بڑی تکلیف ہوئی ہوگی؟"

"کس خبر سے؟"

"لکھی دیدی کے گھر سے چلے جانے کی خبر سن کر؟"

"میں دیکھتی ہوں لکھی دیدی کے لئے تم ہم لوگوں سے زیادہ فکرمند ہو!" ستی نے کہا۔

"کیوں؟ تم بھی تو فکرمند ہو! اس کے علاوہ یہ کوئی بڑی بات تو نہیں؟"

"بابا کو اب تک خبر ہی نہیں دی گئی ہے!" ستی نے کہا۔

"تو پھر اب کوئی اطلاع مت دینا، سمجھیں، وہ پردیس میں رہتے ہیں، اس خبر سے انہیں بہت صدمہ ہوگا۔ بہت ممکن ہے وہ یہاں چلے آئیں! اور دو روز صبر کرو، لکھی دیدی شاید اسی درمیان واپس آ جائے۔"

ستی نے تیز نگاہوں سے دینکر کی طرف دیکھا۔

"اس کا مطلب؟" اس نے پوچھا ــ "شاید تمہیں معلوم ہے کہ لکھی دیدی کہاں گئی ہے؟"

"نہیں سچ کہتا ہوں، مجھے کچھ بھی معلوم نہیں!"

"تم ضرور جانتے ہو، بتاؤ نا۔ لکھی دیدی کہاں گئی ہے؟"

"تمھیں میری باتوں کا یقین نہیں آتا؟" دینکر نے کہا — "مجھے معلوم ہوتا تو تمھیں نہ بتاتا؟ اور لکھی دیدی کیا مجھ سے کہہ گئی ہے؟"

ستی نے کچھ سوچا، پھر بولی —

"اب میں بھی چلی جاؤں گی"

دینکر یکایک پریشان سا ہو گیا۔

"تم چلی جاؤ گی؟ کہاں؟"

"لکھی دیدی جب یہاں نہیں ہے تو پھر میں رہ کر کیا کروں گی۔ لکھی دیدی ہی کی وجہ سے تو میں کلکتہ آئی تھی، بابا نے لکھا ہے کہ وہ بہت جلد یہاں آ رہے ہیں"

دینکر نے کہا — "تم چلی جاؤ گی تو یہ گھر پھر اندھیرا ہو جائے گا — پھر ہم لوگ بھی یہاں سے چلے جائیں گے"

"کہاں؟"

"کسی دوسری جگہ کرایہ پر مکان لے لیں گے" دینکر نے جواب دیا — "میری نوکری کے لئے بھی ماں بہت کوشش کر رہی ہے — پھر میں بھی اس مکان میں نہیں رہوں گا — اور اس وقت تک لکھی دیدی کی بھی شادی ہو جائے گی"

ستی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، وہ خاموش گلی کے موڑ کی طرف دیکھتی رہی — ایک بس آئی تھی۔ شاید وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

دینکر نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا — "ماں کہہ رہی تھی کہ تمہاری بھی شادی ہو جائے گی"

ستی مسکرائی — "شادی تو ہو گی ہی — شادی نہ ہو گی تو کیا میں بڑھاپے تک یونہی بیٹھی رہوں گی"

دینکر سٹ پٹا سا گیا، اس نے کہا — "نہیں، ویسے ہی کہہ رہا تھا —"

اس کے بعد مزید وہاں پر کھڑے رہنے میں اُسے شرم سی محسوس ہوئی۔

اس نے کہا — "تمھاری بس آنے میں تو آج کافی دیر کر رہی ہے دیکھتا ہوں —"

"دیر ہونے دو، میں نے تمھیں روک تو نہیں رکھا ہے؟"

دینکر نے کہا — "اچھا اب میں جاتا ہوں — مجھے ایک کام بھی ہے —"

ستی ہنسنے لگی۔

"اتنی دیر تک تو تمھیں اپنا کام یاد نہیں آیا تھا"

"نہیں، واقعی کام ہے، میں جاتا ہوں —"

دینکر چلا آ رہا تھا، اچانک وہ رک گیا اور قریب آ کر بولا ——

"تم نے اس مہینہ کا چندہ تو نہیں دیا ہے ستی؟"
"چندہ؟ کیسا چندہ؟"
دینکر نے کہا — "واہ، یاد نہیں، میں جو تم سے چندہ لے کر رسید دے گیا تھا؟"
"لیکن مجھے کتاب تو نہیں ملی!"
"پھر تم نے مانگا کیوں نہیں! میں ہر روز تمھیں دو کتابیں دے سکتا ہوں — لیکن تم مانگو گی تو؟"
ستی نے کہا — "لیکن ایسی بات تو نہ تھی — بات یہ تھی کہ تم خود کتابیں دے جاؤ گے —"
"مجھے تو یاد نہیں تھا:" دینکر نے کہا — "مگر تم یاد تو دلا سکتی تھی:"
ستی نے کہا — "اگر میں لکھی دیدی ہوتی تو پھر تمھیں یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہوتی — اس وقت تمھیں ٹھیک یاد رہتا۔"
دینکر نے غور سے ستی کی طرف دیکھا۔
"لکھی دیدی کی بات دوسری ہے:"
"کیوں، لکھی دیدی کی بات دوسری کیوں ہے؟"
"ہوگی نہیں؟ تم خود ہی کہو کہ تم نے لکھی دیدی کو کتنی تکلیف دی ہے، تم سبھوں نے مل کر کتنا صدمہ پہنچایا ہے، تم ہی لوگوں کی وجہ سے تو لکھی دیدی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے!"
"کیسی تکلیف؟" ستی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔
دینکر نے ٹلتے ہوئے کہا — "یہ میں نہیں بتاؤں گا — تمھیں خود ہی معلوم ہو جائے گا —"
دینکر کے مڑتے ہی ستی نے اس کا ہات تھام لیا۔
"بھاگتے کہاں ہو؟ تمھیں بتانا ہوگا کہ ہم لوگوں نے لکھی دیدی کو کیا تکلیف دی ہے — تمھیں بتانا پڑے گا؟"
دینکر نے کہا — "واہ رے! میرا ہات چھوڑو —"
"نہیں، پہلے بتاؤ، تم کیا جانتے ہو!"
"میں سچ کہتا ہوں، مجھے کچھ معلوم نہیں — مجھے ایسا محسوس ہوا تھا اسی لئے کہہ رہا تھا۔"
ستی پھر بھی اس کا ہات مضبوطی سے تھامے رہی۔
"میں تمھیں نہیں چھوڑوں گی۔ مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا لکھی دیدی نے تمھیں سب کچھ بتا دیا ہے۔"
"کیا بتا دیا ہے؟"
"چلو، تم کاکا بابو کے پاس چلو:" ستی نے کہا — "کاکا بابو کے پاس جا کر تمھیں سب کچھ بتانا ہوگا، چلو کاکا بابو کے پاس —"
اتنا کہہ کر ستی نے دینکر کو گھر کے اندر کھینچنے کی کوشش کی!
دینکر نے کہا — "میں تو کہہ رہا ہوں کہ مجھے کچھ معلوم نہیں، پھر کاکا بابو کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے:"

دیپکر نے اپنا ہات ستی کی گرفت سے چھڑانے کی بہت کوشش کی، لیکن ستی کی گرفت بہت مضبوط تھی، ستی اسے اپنی طرف کھینچنے لگی۔

" میں تمھیں ہرگز نہیں چھوڑوں گی — چلو، تمھیں چلنا ہوگا — تمھیں چلنا ہی پڑے گا — "

یکایک کاکی ماں یہ سب سن کر وہاں پر آگئی۔

" کیا ہے، اسے اس طرح کیوں کھینچ رہی ہو، کیا بات ہے ستی؟ "

" دیکھو نا کاکی ماں، دیپو کہہ رہا ہے کہ لکھی دیدی یہاں سے کیوں چلی گئی ہے، اسے معلوم ہے! "

کاکی ماں یکایک سنجیدہ ہو گئیں۔

" کیا یہ صحیح ہے، تم جانتے ہو دیپو؟ "

" نہیں کاکی ماں " دیپکر نے کہا — " میں کچھ بھی نہیں جانتا، لکھی دیدی کے جانے کا مجھے کیا کم دکھ ہے، — کسی کسی دن تو رات بھر نیند ہی نہیں آتی — اس کے علاوہ اگر مجھے معلوم ہوتا تو کیا آپ لوگوں کو نہ بتاتا؟ "

کاکی ماں نے کہا — " ہاں، یہ بات تو ہے، اسے کس طرح معلوم ہو سکتا ہے؟ چھوڑ دو اس کو۔ "

ستی پھر بھی اس کا ہات تھامے کھڑی رہی۔

" لیکن دیپو کا چہرہ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اسے سب کچھ معلوم ہے کاکی ماں، اسی لئے گھوم پھر کر مجھے دیکھتے ہی لکھی دیدی کی باتیں کرنے لگتا ہے — "

" تو کیا لکھی دیدی کی باتیں کرنا کوئی گناہ ہے؟ لکھی دیدی کے لئے سوچنا بھی گناہ ہے؟ "

کاکی ماں نے کہا — " چھوڑ دو ستی، اس کا ہات چھوڑ دو — سوچو تو ذرا اس کی ماں سنے گی تو کیا خیال کرے گی — "

ستی نے کہا — " میں آج ہی جا کر ماسی ماں سے کہوں گی۔ "

دیپکر نے اب کے ہات کھینچ کر اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔

" اچھا ٹھیک ہے — میرا پوچھنا ہی گناہ ہے — "

کاکی ماں قریب آ کر بولی — " واقعی بتاؤ نا دیپو، تمھیں کچھ معلوم ہے؟ تم تو دیکھ ہی رہے ہو کہ ہم لوگ اس لڑکی کے لئے کتنے پریشان ہیں، وہ تو کئی دنوں سے پورے شہر میں تلاش کر کے تھک چکے ہیں — تم تو سب دیکھ ہی رہے ہو — بتاؤ نا، لکھی کہاں گئی ہے — ہم لوگ اس کو کچھ نہیں کہیں گے، کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا، کوئی اس پر خفا نہیں ہوگا، اس کے بابا سے بھی ہم لوگ نہیں کہیں گے — اب تک ان کو خبر بھی نہیں دی گئی ہے — محلے کے لوگوں کو بھی کچھ معلوم نہیں — جیسے پہلے رہتی تھی، ویسے ہی رہے گی۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا اُسے۔ "

دیپکر نے کہا — " سچ کہتا ہوں کاکی ماں، یقین کیجئے، مجھے کچھ بھی معلوم نہیں — ستی جھوٹ موٹ مجھ پر شبہ کر رہی ہے — لکھی دیدی اگر کہیں جا کر چھپ جانا چاہتی تھی تو مجھے کیسے کہہ جائے گی؟ کوئی کسی سے کہہ کر بھی کہیں بھاگتا ہے؟ "

کاکی ماں کو اب کے اس کی باتوں کا یقین آ گیا، انہوں نے ستی کی طرف مڑ کر کہا —

"یہ تو کہہ رہا ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں، پھر تم اس کے ساتھ اس طرح کیوں کر رہی تھی اور میں تو شروع ہی سے کہتی آ رہی ہوں کہ دیپو اس معاملے میں نہیں ہے، دیپو ایسا لڑکا ہی نہیں ہے۔"

پھر انہوں نے دینکر سے مخاطب ہو کر کہا۔۔۔

"جاؤ، تم اپنے گھر جاؤ۔۔"

لیکن جب دینکر اُٹھنے لگا تو ستی نے اُسے پھر پکارا۔

"تم اپنا چندہ نہیں لوگے؟ چندہ لیتے جاؤ۔۔"

دینکر نے پلٹ کر دیکھا۔

"چندہ؟"

"ہاں، اس مہینہ کا چندہ لئے بغیر چلے جا رہے ہو؟ خفا ہو گئے شاید؟"

کاکی ماں ہنسنے لگیں۔

"تم اب اُسے مت چڑاؤ۔۔ نہیں، نہیں، تم اپنے گھر جاؤ تو دیپو۔۔"

دینکر نے چلتے چلتے کہا۔۔

"جس کو چندہ دینا ہوگا وہ میرے گھر آ کر دے جائے گا، میں اب نہیں آؤں گا۔"

بہت ممکن ہے ستی اس کا کوئی جواب دیتی، لیکن یکایک سامنے سے پوسٹ مین آتا ہوا دکھائی دیا۔ دینکر پوسٹ مین کو دیکھ کر رک گیا۔ اس کے یہاں کبھی پوسٹ مین نہیں آتا تھا، نہ کسی کا کوئی خط آتا تھا، پھر بھی پوسٹ مین کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اُسے ایک امید سی بندھ جاتی تھی۔

پوسٹ مین کے قریب آتے ہی دینکر نے پوچھا۔

"انیس ایک بی کا کوئی خط ہے؟"

"ہے۔۔"

"کس کا ہے؟" دینکر نے پوچھا۔

"ستی مترا۔"

نام سن کر دینکر نے ستی کی طرف دیکھا اور ستی خط لینے کے لئے آگے بڑھ آئی۔۔ وہ ہاتھ بڑھا کر خط لینے کے بعد جلدی سے لفافہ کا منہ چاک کر کے دیکھنے لگی۔ کیسا خط ہے؟ کس کا خط ہے؟ کہیں لکھی دیدی کا خط تو نہیں؟ لکھی دیدی نے لکھا ہے کیا؟

دینکر بڑے غور سے دیکھتا رہا۔

کاکی ماں نے پوچھا۔۔ "کس کا خط ہے ستی؟"

ستی نے خط پڑھتے ہوئے جواب دیا۔۔ "بابا کا۔۔"

ستی کے بابا کا خط ہے! ستی کے بابا نے لکھا ہے! وینکٹ کی ساری قوت یکایک جیسے سلب ہوگئی۔ خط کا مضمون معلوم کئے بغیر جیسے اُسے سکون نہیں ملے گا۔ تو کیا لکشمی ریڈی کے بارے میں اطلاع دے دی گئی ہے۔ اب کیا ہوگیا؟ لکشمی ریڈی کے بابا کی صحت بھی خراب ہے! اس خبر کو سننے کے بعد کیا لکشمی ریڈی کے بابا زندہ رہ سکیں گے! ان لوگوں نے کیوں اطلاع دے دی! دو ایک روز اور انتظار کر سکتے تھے! خبر دے کر ایسا کون سا فائدہ ہوگیا! خواہ مخواہ بوڑھے آدمی کو تکلیف دینا ——

کاکی ماں نے پھر پوچھا— "کیا لکھا ہے؟"

"بابا کلکتہ آ رہے ہیں —" ستی نے جواب دیا۔

"کب؟"

لیکن اتنے میں گلی کے موڑ پر ستی کی بس آگئی اور ستی تیزی سے بس کی طرف بڑھ گئی۔

کاکی ماں نے پھر پوچھا— "کب آ رہے ہیں ستی؟"

ستی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، وہ سیدھے بس میں جا کر بیٹھ گئی اور اس کے ساتھ ہی ہارن بجاتی ہوئی بس مشرق کی طرف چل پڑی — بالی گنج کی نئی سڑک کی طرف ——

اور وینکٹ اپنے گھر چلا آیا۔

کایا پلٹ

صالحہ عابد حسین

یوں تو اس دور میں بہت سے زمینداروں، رئیسوں اور حاکموں کے لاڈلے مرزا پھویا قسم کے بیٹے اس کالج میں پڑھنے آتے تھے جن کا خوب خوب مذاق بنتا اور اکثر وہ رو دھو کر بھاگ بھی جاتے تھے۔ مگر شفن میاں جس ٹھاٹ باٹ سے آئے وہ اور ہی تھے۔ خدمت کے لیے دو ملازم ساتھ۔ پہننے کے لیے جامہ وار کی شیروانیاں اور چاندانی کے انگرکھے، ریشمی بنیان، ریشمی موزے اور بند بند۔ چکن کے کرتے اور "تین پی" تکسٹے کے غرارہ دار پاجامے۔ انواع و اقسام کے کھانوں کے پارسل گھر سے آتے رہتے۔ جتنے روپے کی ضرورت ہوتی باپ چچا بھیج دیتے۔ کسانوں کے خون پسینے کی کمائی لاڈلے بیٹوں کے شوق پر اسی دور میں بے دریغ خرچ کی جاتی تھی نا۔

متوسط گھرانوں کے ذہین و شوقین نوجوانوں نے ابتدا میں شفن میاں کا خوب خوب مذاق اڑایا۔ کبھی لباس پر پھبتیاں اڑ رہی ہیں، کبھی جھک جھک کر تسلیمیں ہو رہی ہیں۔ "حضور ہمارے لائق کوئی خدمت؟" کبھی اس کے گھر سے آئے ہوئے حلوؤں، اچاروں اور مٹھائیوں پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے اور پھر آکر چڑا رہے ہیں "حضور ہی کا کھاتے ہیں"۔ کبھی اس کی چاندی کی ڈبیہ اور کارچوبی بٹوے میں سے پان اور مسالہ اڑایا جا رہا ہے اور پھر ان کے قہقہے جو اچھے بھلے کو پاگل بنا دیں۔

ابتدا میں وہ بہت گھبرائے۔ امیر گھرانے کا لاڈلا بڑا بیٹا جس کے آگے پیچھے جی حضور کہنے والے مصاحب پھرا کرتے۔ اسکول میں داخل ہوئے تو لڑکے تو لڑکے ہی تھے ماسٹر تک لحاظ و پاس کرتے کہ "میاں" کے صاحبزادے پڑھنے آئے ہیں تو گویا اسکول کی عزت افزائی ہوئی ہے اور یہاں یہ حال کہ پاس لحاظ تو رہا دور، الٹا لوگ بناتے، چھیڑتے، ستاتے۔ اس کا کھاتے، اسی کو بے وقوف ثابت کرتے۔ ویسے کالج کی فضا اسے پسند تھی۔ یہاں باپ چچا کی ہر وقت کی روک ٹوک اور تنبیہ نہ تھی۔ جب جی چاہے کرو۔ جہاں چاہو آؤ جاؤ۔ ماں اور چچی کی بے جا ناز برداریاں نہ تھیں جن سے وہ عاجز آ چکا تھا۔ مصاحبوں کی "جی حضور" نہ تھی جن سے وہ چڑتا تھا۔ پھر بھی چند مہینے تک وہ اس ماحول میں کھپ نہ سکا۔ مگر غیر شعوری طور پر اس نے طے کر لیا کہ وہ یہاں سے گھبرا کر بھاگے گا نہیں بلکہ ان سب لوگوں کو زیر کرے گا۔

پھر چند مہینوں ہی میں وہ طالب علموں میں ہر دلعزیز ہو گیا۔ اس کی فیاضی اور محبت اور سب سے زیادہ ہنسنے ہنسانے والی عادت جس میں دوسروں سے زیادہ اپنے پر فقرہ بازی کر کے کھلکھلا کر قہقہہ بلند ہوتا۔ نوجوانوں کو زیر کر لینے کے لیے کافی تھا۔ استاد جو ابتدا میں اسے نرا رئیس زادہ سمجھتے تھے۔ اس کی ذہانت اور شوق و محنت سے متاثر ہوئے اور تعلیمی سال کے آخر میں جب وہ اپنے گھر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا تو وہ بڑا مطمئن تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار کچھ سوچنے، کچھ سمجھنے، کچھ کرنے، کچھ بننے کا موقع ملا تھا — اس نے اسے بیکار نہیں کھویا۔

وہ اپنے قصبے میں پہنچا تو سب نے اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ نو عمر، جھینپو، دبا سہما لڑکا ایک خود اعتماد، باوقار سمجھ دار نوجوان کا روپ دھار چکا تھا۔ عمہ جان اس کے سنجیدہ انداز گفتگو سے متاثر ہوئے۔ ابو جان کو کتب بینی کے شوق نے خوش کر دیا۔ خاندان کے بزرگوں کو بڑا اطمینان ہوا

کہ گھرانے کا یہ سب سے پہلا لڑکا جو مغربی تعلیم پانے گیا ہے۔ ایک دن ضرور بڑا آدمی بن کر خاندان کا نام روشن کرے گا۔ کیا عجب کسی دن ڈپٹی کلکٹر بن جائے! (یہ وہ دور تھا جب ہندوستانی رئیسوں کی امیدوں کی معراج بیٹوں کو تحصیلدار یا ڈپٹی کلکٹر بنانا ہوا کرتا تھا)

چھٹیوں میں اس نے اپنی بہنوں اور اپنی چچازاد بہن کو اردو لٹریچر اور انگریزی کی ابتدائی کتابیں پڑھانی شروع کیں۔ ابا جان اور ان سے زیادہ مولوی صاحب یہ سن کر بہت برہم ہوئے۔ بھلا شریف رئیس گھرانوں کی لڑکیوں کے لیے کیا یہ زیبا ہے کہ عشق و عاشقی والا شعر و ادب اور بدیسی کافر زبان پڑھیں؟ لڑکوں کو تو ملازمت کرنا ہے۔ ان کا زیور تو یہ ہے کہ گھرداری سیکھیں، کروشیہ اور اون کی بنائی میں ماہر ہوں۔ عمدہ کھانا پکا سکیں؛ اور شوہر اور ساس سسر کی اطاعت کا سبق پڑھیں۔ بظاہر لڑکیوں کی تعلیم بند کردی گئی مگر وہ چھپ چھپ کر انہیں پڑھاتا رہا۔ اس کی چچازاد بہن جس شوق اور تیزی سے پڑھ رہی تھی اس سے اسے بہت خوشی تھی۔ وہ الہڑ لڑکی تو نہ جانتی تھی مگر اُسے معلوم تھا کہ بزرگوں نے اس کو شفق میاں کا شریکِ حیات بنانے کے لیے چنا ہے۔ واپس جاتے وقت اس نے وعدہ کیا کہ وہ بہت سی اور کتابیں کسی طرح ان کو بھیجے گا۔

دو سال میں اگرچہ اس میں ظاہری تبدیلی بھی تھوڑی بہت ہوئی مگر ذہنی اور اندرونی تبدیلی ایسی تھی کہ دوسروں کا کیا ذکر وہ خود بھی پوری طرح اس سے آگاہ نہ تھا۔ یہاں آنے سے پہلے سیاست و ریاست سے وہ بالکل نابلد تھا۔ ملک میں کیا ہو رہا ہے یہ تو اس کے بزرگ بھی نہ جانتے تھے مگر کالج میں چند پُرجوش نوجوان اور کچھ پروفیسر ایسے بھی تھے جن کو سیاست سے گہری دلچسپی اور دیس کی آزادی کی لگن تھی۔ وہ جونیئر طالب علم تھا۔ ان لوگوں سے اس کی دوستی تو کیسے ہوتی مگر وہ اس کے ہیرو ضرور بن گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیس کی محبت اور اس کی آزادی کی خواہش چپکے چپکے دل میں جڑ پکڑنے لگی۔

پھر سیاست نے پلٹا کھایا۔ سنہ ۲۱ء میں تیسرے سال وہ کالج آیا تو ایک نیا جوش و خروش پھیلا دیکھا۔ بیشتر کارکنوں اور بدیسی حاکموں کی لاکھ کوشش کے باوجود آزادی کی تحریک اور خلافت کی تحریک کے اثرات اس کے کالج میں بھی پہنچ چکے تھے اور سوچنے والے ذہن کچھ سوچ رہے تھے، کچھ فیصلہ کر رہے تھے۔

پھر بدیسی چیزوں کے بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ بدیسی اثرات میں دی گئی تعلیم کے خلاف بھی آوازیں اٹھنے لگیں۔ اور اس کے کالج میں ایک حق پرست مردِ مومن کی کوشش اور ایما پر ایک ننھے قومی و ملّی ادارے کی بنا پڑ گئی! وہ لوگ جنہوں نے اس ادارے کو لبیک کہا، مردود و باغی سمجھ کر کالج سے نکال دیے گئے۔ اِن سرفروش مہاجروں میں شفق میاں بھی تھے۔ گھر سے پہلے خط آئے، تار آئے، پھر لینے کے لیے آدمی بھیجے گئے مگر شفق میاں جانتے تھے کہ اس وقت جانا موت کے منہ میں جانا ہوگا۔ البتہ مہینے بھر بعد جب ان کا نیا ادارہ کچھ جم گیا، ان کا داخلہ طالب علم کی حیثیت سے ہو گیا اور تھوڑا انتظامی کام بھی انہوں نے سنبھال لیا تو وہ پھر ابا جان وغیرہ کے پاس لکھنؤ گئے جنہوں نے حال میں دیہات کی سکونت کو خیرباد کہہ کر شہر میں رہنا طے کیا تھا۔

پہلی نظر میں کسی نے اسے پہچانا ہی نہیں۔ مولانا محمد علی وغیرہ کے اثر میں رہ کر اس کی وضع قطع لباس سب کچھ بدل گیا تھا۔ بے حد موٹے کھردرے کھدر کا لمبا کرتہ اور تنگ مہری کا پاجامہ، چھوٹی سی ڈاڑھی، کندھے پر رومال۔

"اے ہے۔ یہ کون موا زنانے میں گھسا چلا آرہا ہے۔" امی جان نے دوپٹے کی آڑ کرکے ڈانٹا، مگر اس کی منگیتر کی کھلنڈری

ہنسی نے۔ جو اُسے اس درجے میں دیکھ کر ہنسی کے مارے لوٹی جا رہی تھی، راز فاش کر دیا۔

اور پھر تو کئی دن گھر میں وہ ہنگامہ برپا رہا کہ خدا کی پناہ۔ خاندان کے دور پرے کے سبھی بڑے بوڑھوں نے ڈانٹا پھٹکارا۔ ابوجان نے بھرائی آواز میں اپنی خاندانی عظمت و وقار کا واسطہ دے کر اس دیوانگی سے باز رکھنا چاہا۔ جس سے ان کے خاندان کی صدیوں کی وفاداری خاک میں مل جانے کی۔ نیچا حکمرانوں کی نظرِ عنایت عتاب میں بدلنے کا اندیشہ انہیں کھائے جا رہا تھا۔ عمو جان نے مستقبل کی مصیبتوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ کوئی اور ہوتا تو کانپ جاتا۔ انہوں نے کہا وہ اپنی اس حرکت سے باز آئے تو وہ اپنے اثر سے کام لے کر نہ صرف ناخدایان کالج سے اس کا قصور معاف کرا دیں گے بلکہ بدیسی حاکموں سے کہہ سن کر ان سے بھی معافی دلوا سکتے ہیں۔ وہ یہ سن کر اور بپھر گیا۔ وہ آزادی کی فوج کا سپاہی ہے۔ اس کا کام اپنے ملک کی غلامی کی زنجیریں توڑنا ہے خود بیڑیاں پہننا نہیں۔ ان بدیسی سامراجیوں ہی سے تو اسے اپنے ملک کو پاک کرنا ہے۔

پھر غصے کا طوفان آیا۔ عاق کر دینے کی دھمکیاں دی گئیں۔ عمو جان نے اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی ایسے سرپھرے نوجوان سے کرنے سے انکار کر دیا۔ ابوجان نے خرچ بند کرنے کا اعلان کیا۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا وہ واپس جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

اب آنسوؤں کا سیلاب اس کے راستے میں حائل ہوا۔ امی جان کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ رہی تھی اور وہ اسے گلے سے لپٹا کر ایسے بین کر رہی تھیں جیسے شفن میاں نئے کالج نہیں، اللہ میاں کے ہاں جا رہا ہو۔ چچی جان اس کے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر آنسوؤں کے ہار نچھاور کرتی جاتی تھیں اور کبھی جاتی تھیں: "بیٹا میری ستو کا کیا ہو گا؟ کیوں اپنے ساتھ اُسے بھی تباہ کرنے پر تلا ہے۔ سوچ — تو — تیرے عمو جان کیسے ضدی ہیں"۔ بہنیں سسک سسک کر رو رہی تھیں اور ان کی البیلی ستو کی نرگسی آنکھوں میں موٹے موٹے موتی کانپ رہے تھے۔

ایک لمحے کے لیے وہ کانپ گیا — کیا ان سب محبوب ہستیوں کو چھوڑنا پڑے گا؟ نہیں نہیں — یہ وہ کیسے سہار سکتا ہے — مگر اندر سے کوئی آواز اٹھ رہی تھی۔ حق کی محبت، دیس کی سیوا۔ ہر محبت سے افضل ہوتی ہے — اس محبت کے شعلے میں تپ کر اور ساری محبتیں کندن بن جاتی ہیں۔

اس نے ماں کے آنسو پونچھے، — چچی کو ہنسایا — بہنوں کو گدگدایا اور ستو کا منہ چڑا کر قہقہہ لگا کر بولا:۔

"بس بس اب یہ رونی صورتیں ٹھیک کرو — اچھا بھئی — لو — نہیں جاتے —"

ہر طرف مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اداس گھر میں چہل پہل کا دور دورہ ہو گیا۔ پھر بزرگوں میں مسکوٹ ہوئی۔ ایسے ایسے بندھنوں میں جکڑ دو کہ ہل نہ سکے۔

رات کو قاضی آیا، کنبے کے بڑے بوڑھے جمع ہوئے۔ شفن اور ستو عقد کے بندھن میں باندھ دیئے گئے۔ رخصتی تعلیم ختم ہونے پر ملتوی کر دی گئی — اور رات گئے گھر کے سب افراد بے فکر ہو کر غفلت کی نیند میں ڈوب گئے۔

صبح کا دھندلکا ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ کوئی چیز صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر بھی جب شفن میاں ڈیوڑھی سے اندر دبے پاؤں داخل ہوئے تو انہیں یہ اندازہ کرتے دیر نہ لگی کہ صحن کے اس سرے پر چچی اماں کے پلنگ سے بھڑی ہوئی چارپائی اس کی نئی نویلی دلہن کی ہے۔ آہستہ سے اس نے سرہانے کھڑے ہو کر پکارا — ستو — مگر ستو لڑکپن کی نیند میں مدہوش تھی! نیم وا آنکھوں میں سپنوں کا خمار اور ہونٹوں پر کسی کے تصور میں میٹھی سی مسکراہٹ۔ ذرا دیر وہ مبہوت کھڑا اسی دلکش صورت کو تکتا رہا جو صبح کاذب کی روشنی میں اور بھی حسین نظر آ رہی تھی — مگر وقت کم ہے —

اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے اس کے ماتھے پر رکھا ــــ "ستو!"

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور پھر اسے پہچان کر لاج سے یوں دہری ہو گئی، جیسے وہ چھوئی موئی کا پودا ہو۔

"خدا کے لیے ستو ــــ وقت کم ہے ــــ میری دو باتیں سن لو ــــ" اس نے سرگوشی کی! وہ کچھ شرمائی، کچھ سہمی، کچھ خوش۔ اُسے عجیب ادا سے دیکھ رہی تھی۔

"میں جا رہا ہوں ستو ــــ وہیں جہاں سے آیا تھا ــــ آزادی کی جنگ میں حصہ لینے ــــ شاید اب خاندان والے میرا منہ نہ دیکھیں مگر تم ــــ تم ــــ" اس کی آواز کانپ گئی۔

"میں جس کی ہو چکی ــــ اس کی ہوں ــــ اور رہوں گی ــــ" آواز باریک، دھیمی مگر پُرعزم تھی۔

"اچھی طرح سوچ لو ــــ میں افلاس، کٹھنائیوں، مصیبت اور شاید جیل کی طرف جا رہا ہوں ــــ ہے حوصلہ؟ دے سکو گی ساتھ؟" اس نے جیسے چنوتی دی۔

"ہمیشہ ــــ آخری سانس تک" ستو نے چنوتی کو قبول کر لیا۔

وہ الہڑ حسینہ اس وقت کیا جانتی تھی کہ وہ کیا عہد کر رہی ہے۔ یہ تو اسے بعد میں پتہ چلا کہ اس کے شوہر نے جو رستہ ستائیس میں چُنا تھا تیس سال تک ــــ اپنے آخری سانس تک ــــ ثابت قدمی کے ساتھ وہ اس پر چلتا رہا ــــ عشق کی اس کٹھن راہ کا ہر کانٹا اس کے لیے پھول، ہر پتھر موتی، ہر مصیبت راحت تھی ــــ اس وقت تو وہ بس اتنا سمجھی کہ اُسے اپنے نرالے مزاج شوہر کا ساتھ دینا ہو گا۔ جب وہ اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چند لمحے وارفتہ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا اور پھر ایک دم تیزی سے باہر نکل گیا تو اس کی آنکھوں سے اس جدائی کے احساس سے برکھا ہونے لگی! ــــ صبح کو بزرگوں کو پتہ چلا کہ شفق میاں بے کہے سُنے کہیں چلے گئے ــــ کہاں، یہ ظاہر ہی تھا ــــ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ لڑکی کی قسمت تو پھوٹ ہی گئی تھی!

اور پھر چند دن بعد یہ خبر خاندان بھر پر بم کے گولے کی طرح گری کہ شفق میاں گرفتار ہو کر دو سال کے لیے جیل سدھارے۔

باپ چچا خاندانی وقار اور اپنی قسمت کا ماتم کر رہے تھے۔ ماں کی ممتا تڑپ رہی تھی، بہنیں، بھائی کے جیل جانے کے تصور سے لرزاں تھیں، چچی اپنی بیٹی کی پھوٹی قسمت پر بین کر رہی تھیں اور ان کی بیٹی ان سب سے بے نیاز اخبار میں چھپی شفق میاں کی تصویر کو دیکھے جا رہی تھی، جس پر عزم و یقین کا وہ نور تھا جو صرف شہیدوں کے چہرے پر نکھرتا ہے اور ہونٹوں پر وہی مخصوص دلکش ہنسی! وہ ایک مجاہد کی شریک حیات ہے، اور اس احساس کے ساتھ اس کے گلابی ہونٹوں پر مدھر مسکراہٹ کھیل گئی۔

ماں اور ساس نے روتے روتے سینے پر ہاتھ مارا "ہے ہے صدمے نے بچی کے دشمنوں کو پاگل کر دیا۔"

انجام بخیر

کوثر چاند پوری

گاڑی رات کے مہیب سناٹے کو چیرتی پھاڑتی تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ آسمان پر جھلملاتے تارے انجن کے اُٹھتے ہوئے دھوئیں میں چھپتے جا رہے تھے اور وہ سوتے سوتے بے چین ہو کر کروٹیں بدلنے لگتا تھا۔ کبھی گھبرا کر پتلون کی جیبیں ٹٹولتا۔ کبھی جھک کر سیٹ کے نیچے رکھے ہوئے بکس کو چھو کر اطمینان کرتا کہ ملکاس ہے یا کہیں غائب ہو گیا۔ پھر بیٹھ کر بیرونی مناظر پر نگاہیں جما دیتا۔ جن پر حدِ نظر تک تاریکی کا سیاہ غلاف پڑا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالتا اور یہ سوچ کر کہ ابھی اس کا اسٹیشن بہت دور ہے۔ وہ دوبارہ سیٹ پر لیٹ جاتا اور جمائیاں لیتے ہوئے پہلو بدلنے لگتا۔ یہ دھیان آتے ہی کہ آج وہ کتنے دن بعد گھر جا رہا ہے۔ خوشی سے اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ بچپن کی حسین اور سنہری یادیں دھنک کی طرح ذہن میں لہرانے لگتیں اسے کھیل کا وہ میدان یاد آ جاتا جس کے دوسرے کونے سے قبرستان شروع ہو جاتا تھا۔ اس میدان میں کھیلتے کھیلتے وہ بارہا گر کر زخمی ہوا تھا۔ اس کے جسم کی وہ تمام چوٹیں کسکنے لگتیں جو کبھی کھیل کے دوران میں لگی تھیں ایک مرتبہ دائیں گھٹنے میں اتنا بڑا زخم ہو گیا تھا کہ چپنی کی پوری ہڈی کھل گئی تھی۔ اسی گھٹنے میں بے اختیار جلن ہونے لگتی وہ دیر تک اسے سہلاتا رہا پھر لڑکپن کی کوئی یاد آ جاتی جو حسین بھی ہوتی اور شوخ بھی اور جلن اس میں اس طرح گھل جاتی جیسے تیزاب کا قطرہ پانی میں حل ہو جاتا ہے۔ پھر بہت سی یادیں رنگین تتلیوں کی طرح ذہن کی فضا اڑتی رہتیں یہ سوچ کر کہ وہ کتنی دور پردیس میں نوکری کر رہا ہے۔ اس کا جی چاہتا کہ اپنی ہمت کی داد دے۔ اس کا لڑکپن شہر کے مشہور صوفی شیخ جمال کی سرپرستی میں گزرا تھا وہ بڑی محبت سے اس کی پرورش کرتے رہے تھے۔ شیخ جمال اس کے دادا تھے۔ ہر شخص ان کی عزت کرتا تھا۔ وہ اس ارادہ سے وطن جا رہا تھا کہ شیخ جمال کا مزار تعمیر کرائے گا یہ اس کی دیرینہ خواہش تھی۔ لیکن ماحول سازگار نہ تھا عرصہ تک وقت کے ساتھ جنگ کرنے کے بعد اس نے حالات کا رُخ موڑا تھا۔ مزار کا چھوٹا سا خوب صورت نقشہ بھی اس کے ایک آرٹسٹ دوست نے بنا دیا تھا وہ اپنے دادا کی زندگی میں ان کی شان و شوکت دیکھ چکا تھا، چاہتا تھا کہ مرنے کے بعد بھی مُردوں کی دنیا میں وہ امتیاز قائم رہے اور ان کا مزار ساری قبروں سے اونچا نظر آئے اس کا خیال تھا کہ پختہ مزار بن جانے کے بعد وہ سبز رنگ کی ریشمین چادر چڑھائے گا۔ ایک قیمتی چادر بھی وہ خرید لایا تھا۔ جب وہ اس قسم کی باتیں سوچ رہا تھا۔ دادا جان کے عرس کا دلفریب نظارہ اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا درمیان میں شیخ جمال کا مزار تھا چاروں طرف جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہر طرف لوبان کے خوشبودار دھوئیں سے مہک رہی تھی۔ جگہ جگہ گیس کے لیمپ رکھے ہوئے تھے وسط میں قوالی کی مجلس جمی ہوئی تھی۔ قوال جھوم جھوم کر گا رہا تھا۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

آہستہ آہستہ گھڑی کی سوئی آگے سرکتی رہی۔ وقت گزرتا رہا پہلے چار پھر پانچ اور چھ بج گئے۔ مناظر دھندلکوں سے نکل کر روشنی میں آنے لگے۔ صبح کا اجالا پھیلنے لگا، مشرق میں سُرخی نمودار ہوتی گئی، گاڑی نربدا کا آہنی پل پار کر کے ان حدود میں آگئی جو کسی زمانہ میں

اس کے وطن کی محبوب سرزمین کو سی۔پی سے جدا کرتی تھیں۔ اب ان حدود کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا تھا پرانی جغرافیائی لائن مٹ گئی تھی۔ انگریزی حکومت کا وہ علاقہ بھی جو پہلے پردیس کہلاتا تھا، اس کا وطن بن گیا تھا۔ وہ اتنے لمبے چوڑے وطن کو دیکھ کر خوشی سے پھولا جا رہا تھا ہندوستان کا نقشہ جس پر وہ جانے کتنی ریاستیں آباد تھیں جن کے الگ الگ فرمانروا تھے۔ اب وہ سب اس کا اپنا دیس تھا جس میں ایک ہی حکومت تھی اور ایک ہی قانون تھا۔ آفتاب گوشۂ مشرق سے بہت اونچا ہو گیا تو اس نے جلدی جلدی بستر لپیٹنا شروع کیا بکس اٹھا کر سیٹ پر رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ باتھ روم گیا۔ شیو کیا اور غسل کر کے کپڑے تبدیل کیے۔ پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں؛ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک بار اور بچپن کی ان وادیوں میں اڑنے لگا ہے جو ارم سے زیادہ حسین ہیں پہلے آموں کا اندھیریا باغ آیا جس میں پیڑوں کی کثرت کے باعث دن میں بھی تاریکی چھائی رہتی تھی۔ اس باغ کی چھاؤں میں اس نے نہ جانے گرمی کے کتنے دن گزارے تھے۔ کچے آم توڑ کر کھائے تھے، رکھوالوں کی کھٹی کھٹی گالیاں کھائی تھیں۔ پھر کھجور کے اونچے درخت دکھائی دیئے اس کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے ایک پکی ہوئی کھجور جھاڑنے کے لیے ایک ایک سو کنکریاں ہوا میں اچھالی تھیں آخر وہ اسٹیشن آ گیا جہاں اسے اترنا تھا گاڑی کی رفتار مدھم ہوتے ہی اس نے قلی کو پکارنا شروع کر دیا۔ جب ریل رک گئی تو ایک قلی ڈبے میں آ گیا۔ اس نے اپنا سامان اسے دکھاتے ہوئے کہا:

یہ بکس

ہولڈ آل

ناشتہ دان

اور

کنڈی ——— اتار لو

قلی نے حسبِ ہدایت سب چیزیں پلیٹ فارم پر رکھ کر کہا:

گن لو صاحب!

اس نے احتیاط سے گن کر اطمینان کیا اور جواب میں سر ہلا کر ظاہر کیا کہ سامان پورا ہے۔

اسباب ٹیکسی میں رکھنے کے بعد وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی جانی پہچانی سڑکوں پر دوڑنے لگی وہ غور سے دونوں طرف کی عمارتوں کو دیکھ رہا تھا جو یکسر بدل گئی تھیں جہاں پہلے خس پوش جھونپڑی تھی وہاں سر بفلک کوٹھی کھڑی تھی۔ چند سال کے اندر اس کے وطن کی صورت ہی بدل گئی تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر جوانی آ گئی ہے۔ بڑھاپے کی ایک جھری تک باقی نہیں ہے۔ سڑکوں پر جا بجا بجلی کے کھمبے کھڑے تھے؛ بڑے بڑے میدان خوبصورت پارکوں میں بدل گئے تھے۔ ذرا دیر بعد وہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ جس میں اس کی خالہ اپنے بچوں کے ساتھ رہنے لگی تھی وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اس نے بڑی عجلت اور بیتابی سے آنے کا مقصد بیان کیا۔

دادا جان کا عرس کرنے آیا ہوں۔ پہلے مزار بنواؤں گا پھر چادر چڑھاؤں گا۔

خالہ حیرت سے اس کو دیکھتی رہی اس نے منہ سے کچھ نہ کہا نہ خوشی کا اظہار کیا نہ اس کی تعریف کی بس ایک لمبا سانس لے کر آنکھوں سے آنسو برسانے لگی۔ وہ ایک منٹ ضائع کیے بغیر شیخ جمال کی قبر پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لیکن خالہ نے اصرار کے ساتھ اسے روک کر ناشتہ کرنے کو کہا

چائے پینے کے بعد وہ پیدل ہی اس چھوٹے سے قبرستان کی طرف چل پڑا جو تالاب کے کنارے واقع تھا۔ ایک طرف ویران ساحل تھا۔ دوسری طرف پل سے ٹکراتا ہوا تالاب اور پھر ایک اور محلہ تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا پل سے گزر کر ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں تالاب کا کنارا تو تھا۔ مگر وہ ویران محلہ اور قبرستان نہ تھا اور جہاں کسی زمانہ میں دور ہی سے قبروں کے چھوٹے بڑے نشان نظر آیا کرتے تھے وہاں اونچے اونچے مکانات کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے سے ہو کر وہ ان پیڑوں کے سائے میں جا کھڑا ہوا جن کے قریب ہی اس کے دادا شیخ جمال کو دفن کیا گیا تھا۔ وہ حیرانی کے عالم میں چاروں طرف نگاہیں دوڑا رہا تھا کہ ایک بڑھا گورکن اسے تنہا دیکھ کر وہاں آ گیا اور پوچھا:

کیا ڈھونڈ رہے ہو؟

صوفی شیخ جمال کی قبر

کون تھے وہ تمہارے؟

وہ میرے دادا تھے۔

کمال احمد ہو تم؟

جی ہاں.

میرے ساتھ آؤ۔

کمال احمد بوڑھے کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ ایک شاندار عمارت کے قریب ٹھہر گیا اور ہانپتے ہوئے بولا:

یہ ہے تمہارے دادا کی قبر!

وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ آنکھیں بھیانک انداز سے پھیل گئیں۔ اس کے سامنے ایک "سیپٹک ٹینک" تھا جس کا تعلق اسی قریب والی عمارت سے تھا!

سرِشام روشن کی جاتی تھیں۔ عجیب بات تھی کہ گزشتہ اکیس بائیس برس سے یہ چاندی کی شمعدانیں جو بڑے نواب صاحب حج کے موقعے پر واپسی میں عراق سے لا سکے تھے۔ یہ تھی دونوں قبروں کی محرابوں میں رکھی تھیں اور آج تک کسی چور اچکے کے دل میں انہیں چرانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ برسی کے دنوں میں منشی ہردیال دس دن کے لئے پرانی کارچوبی چھت گیری بھی قبروں پہ لگوا دیتے تھے۔ دن بھر بستی کے لوگ اور نواحی بستیوں کے رہنے والے قبروں پہ فاتحہ پڑھنے آتے رہتے تھے۔ اور روزانہ شام کو عصر کی نماز کے بعد اور فاتحہ خوانی کے بعد محفل برخاست ہوتی تھی۔ ان تمام رسومات کے لئے کم سے کم دس ہزار روپے کی ضرورت پڑتی تھی جو شروع میں ریاست تاج نگر کی مالگزاری میں سے بڑی آسانی سے نکل آتی تھی اور اس کے لئے نہ تو چھوٹے نواب کو اور نہ منشی ہردیال کو فکرمند ہونا پڑتا تھا لیکن پندرہ سال پہلے یعنی بڑے نواب صاحب اور بہو بیگم کی موت کے چند سال بعد چھوٹے نواب نے بُری صحبت میں پڑ کے اور بے فکرے اور غیر ذمہ دار حضوریوں کے مشورے سے بمبئی جا کے بسنے اور فلم کمپنی بنانے کی ٹھانی ——— اس وقت سے منشی ہر دیال اور چھوٹے نواب دونوں ہی برسی کے دنوں سے ماہ دو ماہ پہلے ہی پریشان پریشان سے رہتے تھے اور بمبئی میں فلم کمپنی ٹوٹنے کے بعد تو بس نواب کا آخری سہارا بیگم کا زیور ہی تھا۔ لاکھوں کا زیور ضرورت کے وقت کوڑیوں کے مول بک جاتا تھا ——— برسی ہو جاتی تھی ——— دھوم مچ جاتی تھی اور چھوٹے نواب بڑی شان سے اپنی پرجا کو خوب دان خیرات کر کے بمبئی لوٹ آتے تھے اور اپنے بدبو دار فلیٹ میں منہ چھپا کے پڑے رہتے تھے۔ چھوٹی بیگم اندر ہی اندر لاکھ کڑھتیں مگر وہ اس مزاج کی عورت تھیں جن کے خمیر میں شوہر کی عزت اور محبت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ وہ تو جانے کس صدی کی عورت تھیں۔ ان کا تو ایمان تھا کہ خاوند کا درجہ خدا کے بعد دوسرا ہی ہوتا ہے۔

. . پھر وہ کیسے نواب صاحب کی مرضی کے خلاف کچھ کہتیں یا کرتیں . . . خود ان کے باپ نواب حاتم صرف نام ہی کے نہیں عمل کے بھی حاتم ہی تھے۔ مرتے مر گئے سخاوت کے دروازے کے دونوں پٹ ہمیشہ کھلے رہے تھے۔ نواب حاتم کی ڈیوڑھی سے کوئی بھی ضرورتمند خالی ہات نہیں لوٹا تھا۔ اکلوتی بیٹی بیاہنے کے بعد نواب حاتم ہجرت کر کے مکہ شریف چلے گئے تھے۔ اور ان کے جانے کے بعد ان کی حویلی پر ساہوکار کا قبضہ ہونے والا تھا۔ کیونکہ ان کا بال بال ساہوکار کے قرضے میں جکڑا ہوا تھا ——— مگر بڑے نواب پہ جو اب نواب حاتم کے سمدھی تھے اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور انھوں نے راتوں رات اپنے چار گاؤں بیچ کر نواب حاتم کی حویلی خرید لی تھی۔ اور مشہور کروا دیا تھا کہ حج پر جانے سے پہلے نواب حاتم اپنی حویلی اپنی اکلوتی بیٹی چھوٹی بیگم کو یعنی بڑے نواب کی بہو کو سونپ گئے ہیں ——— حویلی کے بڑے پھاٹک پر اب تک "حویلی نواب حاتم کی" موٹے موٹے پتھریلے حروف میں کھدا ہوا تھا۔ عام طور سے تاج نگر والوں کو چھوٹے نواب کی نجی زندگی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ تاج نگر بمبئی سے اتنی دور تھا اور دیہات کے رہنے والے اپنی چھوٹی چھوٹی مصروفیتوں میں اتنے مگن تھے کہ کسی کو نواب صاحب کے زوال کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ اصل میں ریاست کے میر منشی ہردیال کی کوششیں بھی اس راز کو افشا نہیں ہونے دیتی تھیں۔ حالانکہ وہ خود حالات سے دھیرے دھیرے واقف ہوتے جا رہے تھے ———

پچھلے دو سال سے حویلی انتہائی مرمت طلب حالت میں تھی۔ پچھم کی طرف کی دیوار جدھر پائیں باغ تھا بالکل ڈھے چکی تھی ——— دالان کی چھتوں کی شہتیریں عجب تذبذب کے عالم میں چھت اور فرش کے درمیان میں لٹکنے لگیں تھیں۔ دروازوں کا رنگ و روغن زمینداری کے رنگ و روغن کی طرح اتر چلا تھا۔ قالینوں کو دیمک چاٹ رہی تھی۔ بڑی بڑی قلمی رنگین تصویروں کے فریم ٹوٹ چلے تھے۔ باقی کچھ

رنگ اڑ چکے تھے۔ چاندی کے چھپر کھٹ پہ چاندی جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ منشی ہردیال سب سے یہی کہتے تھے کہ بڑے نواب کی خوابگاہ پہ جنوں کا سایہ ہو گیا ہے اس لئے کہ جنوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جہاں کہیں ان کو صاف ستھرا خالی گھر نظر آیا۔ اس پہ قبضہ کر لیتے ہیں ہو نہ ہو جنات کسی ضرورت یا مصلحت کے تحت چھپر کھٹ کی چاندی وقتاً فوقتاً ادھیڑ لیتے ہوں — گاؤں کے سادہ لوح عوام اس بات کو بالکل سچ سمجھتے تھے، بلکہ گاؤں کی اکثر عورتیں جمعرات کی شام کو گڑ کے گلگلے اور کہیں بتاشے کی نیاز بھی بڑے نواب کی خوابگاہ کے باہر دلوانے لگی تھیں — اور منشی ہردیال نے سکھ کا سانس لیا تھا — لیکن یہ بات تو صرف منشی ہردیال اور چھوٹے نواب کو ہی معلوم تھی کہ چاندی کو کونسے جنات لے جاتے ہیں — بیچارے معصوم دیہاتیوں کو کیا خبر کہ بمبئی میں انسانوں سے زیادہ جنات ہی بستے ہیں جو دھیرے دھیرے نادار انسانوں کے دل و دماغ اور ہر خوبصورت جذبے کی چھپر کھٹ کی چاندی ناخنوں سے نہیں دانتوں سے ادھیڑتے رہتے ہیں اور ہر سال جب کسی غریب کی دھنستی ہوئی قبر پہ ایک مٹھی مٹی ڈال جاتی ہے، تو ان جناتوں کی ایک بلڈنگ کھڑی ہو جاتی ہے . . . اور اس طرح اس بات کا بھی یقین ہو جاتا ہے کہ بمبئی کا سارا کاروبار ان جناتوں کے قبضے میں ہے جو سب کچھ اپنے لئے رکھ لیتے ہیں "انسانوں" کے لئے کچھ نہیں چھوڑتے اور اگر کچھ چھوڑتے ہیں تو صرف فٹ پاتھ چھوڑتے ہیں، بدبودار دھوئیں سے اٹی ہوئی چالیں چھوڑتے ہیں، موٹروں سے اڑتی ہوئی گیلی کیچڑ چھوڑتے ہیں۔ جیل کی تاریک کھولیاں چھوڑتے ہیں، بھیل پوری کے پتے چھوڑتے ہیں، کیلے کے چھلکے چھوڑتے ہیں اور ہر وہ جگہ بھی غریبوں کے لئے چھوڑ دیتے ہیں جہاں جھونپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں اُگ سکتا — خلیل جبران نے ایسے ہی موقع پہ کہا تھا:

تم خوشی کے بیٹے ہو
ہم دکھ کی اولاد ہیں
ہم تمہارے لئے محل تعمیر کرتے ہیں
تم ہمارے لئے قبریں کھودتے ہو

جوں جوں نگریا کا اسٹیشن قریب آتا جا رہا تھا چھوٹے نواب اور چھوٹی بیگم کے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ نگریا چھوٹی بیگم کا میکہ تھا — اور چھوٹی لائن کی گاڑی یہیں سے ہو کر گذرتی تھی۔ تاج نگر یہاں سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔ اور وہاں جانے کے لئے نگریا ہی کے اسٹیشن پہ اترنا پڑتا تھا — نگریا کے قریب آنے کی ایک پہچان آموں کے وہ وسیع باغ تھے جو ریلوے لائن کے دونوں طرف میلوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ آج کل آم کا موسم نہ تھا اس لئے باغ ویران پڑے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں اکا دکا جھونپڑے بنے ہوئے تھے اور کنوئیں کے پاس بچے — "اونچا نیچا ٹیلا" کھیل رہے تھے۔ چھوٹی بیگم کا دل بھر آیا۔ عورت بوڑھی ہو جاتی ہے، مگر بوڑھا نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں میکے کی کنواری اور کچی یاد ہمیشہ آباد رہتی ہے۔ چھوٹی بیگم کے دل میں بھی اپنے میکے کی یاد کسی گمنام شہر کی طرح بسی ہوئی تھی۔ وہ بے فکری اور فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ یوپی میں زمینداری کا عروج تھا۔ سچ مچ دودھ دہی کی نہریں بہتی تھیں۔ نوکر چاکر، ماما اصیلیں، گھر کی پلی ہوئی لونڈی باندیاں ہر طرف خدمت کرنے اور دل بہلانے کے لئے موجود رہتی تھیں۔ ساون کے مہینے میں جب آم کی فصل بہار پر ہوتی تو دور دور کے گاؤں اور قصبوں سے رشتے دار آم کھانے اور ساون منانے نگریا آتے

تھے۔ آم کے باغوں میں جھولے پڑتے، کڑھاؤ چڑھتے، پانی کی بھری ہوئی ناندیں رکھی جاتیں . . . اور جیسے باغ کو جو پردہ باغ کہلاتا تھا۔ چاروں طرف سے قناتوں سے گھیر دیا جاتا تھا اور بوڑھا چوکیدار شکھوا اپنا ڈنڈا اور چلم سنبھال کے باغ کے پھاٹک پہ بیٹھا رہتا تھا۔ بہلی اور رتھ پہ سوار ہو کے نواب حاتم کے گھر کی بیگمات آم کھانے اور جھولا جھولنے پردہ باغ میں آتی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں لہریئے دوپٹے اور دھانی چوڑیاں پہنتی تھیں، بڑی بوڑھیاں اپنے اپنے غرارے اور پاندان سنبھالے کھاٹوں پر ادھر ادھر بیٹھی ہوتیں اور چوسر پچیسی کی بازی جماتیں اور لڑکیوں کو درختوں پہ چڑھنے اور زیادہ شور و شغب کرنے پر ٹوکتی جاتی تھیں۔ جسے لڑکیاں ایک کان سے سن کر دوسرے اڑا دیتی تھیں۔ برابر کے باغ میں مردوں کے ڈیرے پڑتے، جوان لڑکے تو آم توڑنے کے بہانے درختوں پہ چڑھ کے پردہ باغ میں کسی کسی کی ایک جھلک دیکھنے کو بے قرار رہتے اور ادھیڑ عمر کے مرد اور بوڑھے حقے پیتے رہتے۔ اور شطرنج کھیلتے رہتے۔ چھوٹے بچے کبڈی جمانے تھے۔ نواب حاتم خود ایک ہی آدھ بار ساون کے موسم میں باغ میں آتے تھے، ایک تو بالکل پہلے دن پردہ باغ میں آتے تھے جہاں بستی کی مہتاری لڑکیوں کو ساون کی چوڑیاں پہنا کے اپنا نیگ لیتی تھیں۔ اور نواب صاحب کی خدمت میں باغ کا پہلا آم جو ان کے والد مرحوم نواب عالم کے نام کی نسبت سے "عالم پسند" آم کہلاتا تھا پیش کیا جاتا تھا۔ آم کو بڑے احترام سے نواب حاتم تراشتے، اس کی چھوٹی چھوٹی قاشیں کی جاتیں اور بسم اللہ کہہ کے بڑے اہتمام سے پہلی قاش نواب صاحب نوش فرماتے، "واہ، واہ: ماشاء اللہ، سبحان اللہ" کہتے جاتے۔ چاندی کے لوٹے سے چاندی کے آفتابے میں ہاتھ پاک کرتے، پھر ململ کے صاف ستھرے انگوچھے سے ہاتھ منہ پونچھتے بیگم کے ہاتھ کی گلاب اور کیوڑے میں بسی ہوئی دو گلوریاں کھاتے۔ زعفرانی قوام کو چٹکیاں میں لے کے چاٹتے۔ پھر دعائیں دے کے واپس اپنی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کے حویلی واپس چلے جاتے۔ یہ ایک طرح سے ساون منانے اور آم کھانے کا باضابطہ افتتاح ہوتا۔ ۱۹۴۵ء ۴۶ء ۴۷ء تک نگریا میں یہی پرانا دستور جاری تھا۔ دھیرے دھیرے زمینداری کو گھن لگتا گیا۔ ملک کے ساتھ ساتھ نگریا بھی انقلاب کی زد میں آ گیا۔ اب کسے ساون منانے اور آم کھانے کی فرصت تھی۔ عجب افراتفری کا عالم تھا۔ بڑے نواب اور بہو بیگم کا انتقال ہو گیا۔ چھوٹی بیگم بیاہ کے تاج نگر آ گئی تھیں، رشتے ناطے دار پاکستان جا بسے تھے۔ نواب حاتم ہجرت کر کے مکہ شریف چلے گئے تھے اور جو باقی رہا سو اللہ کا نام —! باہر دیکھتے دیکھتے چھوٹی بیگم کی آنکھ میں کوئی کوئلے کا ذرہ پڑ گیا۔ انہوں نے گھبرا کے برقعے کی نقاب اپنے منہ پہ ڈال لی۔ نواب صاحب بھی کھڑے ہو کے اپنی اچکن پہننے لگے . . . اب نگریا کا اسٹیشن اور بھی قریب آ رہا تھا۔ بستی شروع ہونے لگی تھی۔ حویلی کی تیسری منزل کی برجی پہ کھجور کا ایک تنہا درخت کسی ہارے ہوئے اکیلے سورما کی طرح آسمان کی طرف تک رہا تھا۔ دور سے مسجد کے مینارے نظر آ رہے تھے۔ سرسوں بوئی جا چکی تھی اور اس کی تازہ کونپلیں شریر بچوں کی طرح اپنا سر اٹھا کے ہنستی کھلکھلاتی ہوئی ہوا کی مدھم لہروں پر جھوم رہی تھیں۔ سرسوں کے کھیت دیکھ کے چھوٹی بیگم کو بسنت پنچمی کا تہوار یاد آ گیا۔ اس دن کتنا مزہ آتا تھا۔ بستی کے ہر گھر میں بسنتی کپڑے رنگے جاتے۔ سرسوں کی پیلی پیلی بالیاں . . لمبی لمبی کنواری چوٹیوں میں سجائی جاتیں، کھانے میں چاولوں کی پیلی پیلی تہری اور پیلی میٹھی پیڑی کھائی جاتی تھی — حویلی کے باہر ڈیوڑھی کے بڑے پھاٹک پر سرسوں کے پھولوں کے بندھن وار لٹکائے جاتے تھے۔ اور شوالے کے پجاری پنڈت شونارائن کی بہو بیٹیاں حویلی کے دالان میں صبح سویرے آ کے رنگولی بناتی تھیں۔ عجیب منظر ہوتا تھا۔ وہ صحن کے ایک گوشے میں مہندی اور ہارسنگھار کے جھاڑ کے نیچے سنگ مرمر کی چھوٹی سی چبوتری پہ

ہو بیگم نماز فجر کے لئے وضو کر رہی ہوتیں۔ دوسری طرف پنڈت شو نارائن کے گھر کی لڑکیاں چھوٹی بیگم ساتھ ساتھ دالان میں رنگولی بنا رہی ہوتیں باہر مردانے میں نواب حاتم نماز کے بعد اپنی تسبیح پھیر رہے ہوتے اور آہستہ آہستہ صحن میں ٹہلتے جاتے اور بیس گز کے فاصلے پر مہادیو کے مندر میں پجاری مقدس گھنٹیاں بجا رہا ہوتا۔ اذان اور سنکھ کی آوازیں کسی آسمانی نغمے کی طرح فضا میں بکھرتی ہوتیں... عید کے دن سب سے پہلے شیر خورمہ بھیجنے اور عید مبارک کہنے پنڈت شو نارائن حویلی میں داخل ہوتے تھے اور ہولی کے موقعے پر سب سے پہلا رنگ نواب حاتم پر ڈالا جاتا تھا۔ محرم میں گھسیٹا رام حلوائی کی سبیل سب سے شاندار ہوتی۔ جہاں پانی اور شربت کے علاوہ فالودہ بھی پیاسوں کو دیا جاتا تھا اور دیوالی پر سب سے پہلا دیا حویلی کی شہ نشین پر رکھا جاتا تھا — یہ سب باتیں اب خواب کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اب تو سب کچھ بٹ چکا ہے۔ تہوار، روشنی اور رشتے بھی اپنے اور پرائے کے خانوں میں بٹ چکے ہیں رنگ بھی ہمارے تمہارے بن چکے ہیں، جذبوں کو بھی غیریت کی دیمک چاٹ رہی ہے... کہاں گئے تیج تہوار، کہاں گئی وہ رنگوں کی پھوار، وہ مشترکہ کلچر کی بہار... کہاں کھو گئے سب پیار کے رشتے۔ یہ بیگانگی کے اژدھے... کہاں سے آ گئے... اور کیسے وہ خون بٹ گیا... جو ایک تھا... جس کا رنگ ایک تھا...!

ٹرین ایک جھٹکے سے رک گئی۔ چھوٹی بیگم نے اپنا برقعہ سنبھالا، چھوٹے نواب نے باہر جھانکا — سامنے منشی ہردیال منیجر ریاست تاج نگر سفید دھوتی کرتہ اور پیلا صافہ باندھے چاندی کی موٹھ والا ڈنڈا بغل میں دبائے کھڑے تھے۔ ساتھ دو چار مزدور تھے۔ گاڑی صرف دو منٹ رکتی تھی۔ پہلے چھوٹی بیگم پھر چھوٹے نواب نیچے اترے۔ منشی جی نے آگے بڑھ کے چھوٹے نواب کے سامنے ہاتھ باندھے اور کورنش بجا لائے — چھوٹی بیگم کے قدموں میں جھک کے "پائی لاگن" کہا.... اور سامان مزدوروں سے اٹھوانے لگے۔ دو آدمی دو لمبی سفید گاڑھے کی چادریں چھوٹی بیگم کے ادھر ادھر تان کے کھڑے ہو گئے تاکہ وہ پالکی تک جائیں تو بے پردگی نہ ہو۔ سامنے پالکی رکھی ہوئی تھی۔ سرخ ساٹن کا پردہ جس پر پشت ماہی کا جال بنا ہوا تھا، پالکی پر پڑا تھا۔ مگر پردے کی حالت ابتر تھی۔ جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا اور کارچوبی مسالہ جگہ جگہ سے جھڑ چلا تھا۔ یہ پالکی اور پردہ چھوٹی بیگم کو ان کے باپ نواب حاتم نے جہیز میں دیا تھا۔ اور اسی میں بیٹھ کے وہ شادی کے بعد اپنے میکے نگریا سے اپنے سسرال تاج نگر آئی تھیں۔ آج چھوٹی بیگم کی زندگی کی طرح ان کی پالکی بھی عجیب بے سروسامانی کے عالم میں تھی۔ شادی کے دن رخصتی کے وقت اس پالکی پہ سے ہزار روپے کی "کھیچڑی" نچھاور کی گئی تھی (کھیچڑی... سونے اور چاندی کے ملے جلے سکوں کو کہتے تھے) آج یہ پالکی صرف چار کہاروں کے رحم و کرم پر تھی۔ سواری وہی تھی لیکن زمانہ بدل گیا تھا — اور زمانے کو بدلنے سے کون روک سکتا ہے —؟

چھوٹے نواب کے لئے گھوڑا نہیں بلکہ ایک پرانا سا تانگہ کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر نواب صاحب چونک کر بولے — "ارے منشی جی یہ کیا؟ وہ ہمارا شہ پر (گھوڑا) کیوں نہیں آیا؟" منشی ہردیال نے کچھ کہنے کے لئے گلا صاف کیا مگر ان سے کچھ کہا نہ گیا.... رام سرن کہار نے پالکی کا ایک سرا پکڑتے پکڑتے کہا — "ارے اُو آپن سہ پہ تو مر گوا... چارے کی دقت ہو گئی رہی نا"

چھوٹے نواب نے ایک لمبا سا سانس لیا اور چپ چاپ تانگے کی طرف بڑھ گئے۔ منشی ہردیال نے خاموشی سے سر جھکا لیا — اور تانگے میں آگے کی طرف بیٹھ گئے۔

آگے آگے پامال کھیتوں کی منڈیر پر سے ہوتی ہوئی جا رہی تھی۔ ساتھ کی کچی سڑک پر تانگہ رینگ رہا تھا۔ پیچھے پیچھے دو مزدور ہانپتے کانپتے سامان اٹھائے ہوئے چل رہے تھے۔ کھیت میں ایک طرف رہٹ چل رہا تھا اور کسان اپنا ہل بیل سنبھالتے ہوئے گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایک دھوبی گھاٹ سے واپس آ رہا تھا۔ گدھے پر کپڑوں کا بوجھ لدا ہوا تھا اور اس کا کتا سر جھکائے دم دبائے بڑی فرمانبرداری سے دھوبی اور گدھے کے درمیان چل رہا تھا۔

دن ڈھل رہا تھا — سورج ڈوب رہا تھا۔ یہ چھوٹا سا قافلہ بستی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خاموشی اور دھندلکے کا سناٹا فضا پہ طاری تھا — کچھ دور جاکے کہاروں نے آلہا چھیڑ دیا۔

"آلہا اُودل بڑے لڑیا .... ہو..!"

اگلے دن بڑے نواب کی برسی کا دن تھا۔ صبح سویرے نہا دھو کے اور نماز فجر سے فارغ ہو کے چھوٹے نواب باہر مردانے میں آ گئے تھے۔ اندر چھوٹی بیگم حویلی کے صحن کے بیچوں بیچ لٹکے ہوئے بڑے ترازو میں اناج تُلتے دیکھ رہی تھیں۔ اس دن سوا من زردے اور سوا من پلاؤ کی نیاز دلوائی جانے والی تھی۔ چند سال پہلے جب برادری والے پاکستان نہیں گئے تھے یہ نیاز ڈھائی ڈھائی من کی دلوائی جاتی تھی۔ اب تو کئی سال سے سوا سوا من کی نیاز کا بھی کچھ حصہ بچ رہتا تھا جو شام کو زمین کھود کے دفن کر دیا جاتا تھا — برسی کے تیسرے دن چھوٹی بیگم فاتحہ خوانی کے بعد بستی کی پرجا سے باضابطہ ملاقات کرتی تھیں۔ بوڑھی، کمزور، نادار اور مفلس اور ضرورتمند عورتیں اپنی اپنی تکالیف اور ضرورتیں چھوٹی بیگم سے بیان کرتیں اور روپیہ سے لے کر اناج، لحاف، گدّا۔ اور پہننے کے کپڑے پاتیں — یہ دن سال میں بس ایک بار آتا تھا اس لئے لینے والے اور دینے والے دونوں کو اس کا بہت احساس رہتا تھا کہ کسی سے کوئی کوتاہی نہ ہو جائے۔ چھوٹی بیگم اس دن کے لئے خاص طور سے اپنا کوئی زیور چپکے سے بکواتی تھیں تاکہ اپنی رعیت کے سامنے ان کا سر اونچا رہے — اس بار وہ بہت مجبور تھیں، ان کا تمام زیور بک چکا تھا۔ قیمتی کپڑے تک اونے پونے میں بک گئے تھے۔ لنگن کے روپے میں سے مالک مکان کو دینے کے بعد صرف چار ہزار روپیہ بچا تھا۔ سفر خرچ کے علاوہ جو کچھ بھی بچا تھا وہ چھوٹے نواب نے منشی ہردیال کو سونپ دیا تھا۔ تین ہزار کی رقم دیکھ کر منشی جی سناٹے میں آ گئے تھے۔ بہت کچھ خرچے کم کرنے پر بھی برسی کا خرچ کسی طرح سات ہزار سے کم نہیں بیٹھ رہا تھا۔ روزانہ منشی جی رات گئے تک بہی کھاتہ کھولے خرچ اور نقد کا حساب کرتے رہتے تھے۔ بڑی کوششوں سے انہوں نے ڈیڑھ ہزار روپیہ چھپرکھٹ کی چاندی بیچ کر اور کچھ ادھر ادھر سے کر کے جمع کیا تھا۔ مگر ساڑھے چار ہزار تو خرچے کے سامنے چٹنی ہو جاتیں گے۔ یہ سوچ سوچ کر منشی ہردیال پریشان ہوتے جا رہے تھے۔ پچھلی رات کو سب کے سو جانے کے بعد چھوٹی بیگم نے اپنی خاص ملازمہ صنوبر کو منشی جی کو بلانے کو بھیجا اور خود زنان خانے کی ڈیوڑھی میں آ کر اُن سے منشی جی سے یہ کہا تھا کہ کم سے کم ایک ہزار روپے کا بندوبست تو وہ کسی بھی طرح کل ان کے دان کرنے کے لئے کر ہی دیں — منشی جی تھوڑی دیر سکتے کے عالم میں رہے۔ پھر جیسے ہوش میں آ گئے۔ سوچنے لگے کیا کریں کیا نہ کریں۔ اپنے ہی تین ہزار کا انتظام نہیں ہو پا رہا تھا پھر وہ تو خود اس بار چھوٹی بیگم سے ایک خاص بات کرنا چاہتے تھے، نگریا کی حویلی کے بارے میں جو اب سیوک رام مہاجن کے قبضے میں جانے ہی والی تھی۔ اس پہ لیا گیا قرض اسّی ہزار سے تجاوز کر گیا تھا اور گاؤں میں ایک حویلی کی قیمت آج کل اس سے زیادہ کو

دنیا ہے! یکلی چھوٹی بیگم نے منشی جی سے پہلی بار کوئی فرمائش کی تھی۔ گھر کی بہو کا پہلا فرمان تھا۔ ان کی آقا زادی کی پہلی مانگ تھی ——
انہیں فیصلہ کرنے میں کچھ دیر نہ لگی اسی وقت ایک ہزار روپے کی تھیلی صنوبر کو تھما دی کہ چھوٹی بیگم کی خدمت میں پیش کر دے ——
اور خود دونوں ہاتھوں سے اپنی پگڑی سنبھالتے ہوئے اس طرح اپنے گھر کی طرف چلنے لگے جیسے ان کے سر پہ پگڑی نہیں ان کے آقا بڑے نواب اور بہو بیگم کی عزت آبرو اور آن بان کا تاج رکھا ہو —!

تیسرے دن فاتحہ خوانی ختم ہونے کے بعد چھوٹی بیگم صحن میں سنگ مرمر کی چبوتری پہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ رہیں۔ سامنے ایک بڑے ریشمی رومال میں روپے کی ریزگاری رکھی تھی۔ قریب ایک پیڑھی پہ صنوبر بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے بستی کی غریب عورتوں کے لئے دری بچھا دی گئی تھی۔ جانے کیوں اس سال غریب عورتوں کی تعداد ہمیشہ کی نسبت بہت کم تھی۔ چھوٹی بیگم کی آنکھیں کچھ شناسا چہرے ڈھونڈ رہی تھیں جو ان کو نظر نہیں آ رہے تھے۔ گلابو کی ماں بیچاری بھی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ صنوبر نے جھک کے آہستہ سے چھوٹی بیگم کو بتایا کہ گلابو قصائی کے بیٹے کے سنگ بائیسکوپ میں کام کرنے کلکتہ بھاگ گئی ہے۔ اس کی ماں بیچاری چھ ماہ ہوتے مر گئی تھی۔ رحمان کی خالہ بھی نہ آئی تھی۔ رحمان نے شہر جا کر پلاسٹک کے کارخانے میں نوکری کر لی تھی۔ اور اپنی خالہ کو بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اکبری خانم کے دونوں بیٹے میٹرک پاس کر کے اب دفتروں میں کام کرنے لگے تھے اور اب اکبری خانم پردے میں رہنے لگی تھیں، بڑے گھر کی عورتوں کی طرح —.. مہترانی کٹوریہ کا میاں چنگی میں سو سو روپیہ پا رہا تھا اور وہ تو اپنے کوارٹر میں بیٹھ کے ٹرانسسٹر سنتی تھی اسے خیرات لینے کی کیا ضرورت تھی ——

تین چار گھنٹے کے عرصے میں صرف آٹھ دس عورتیں چھوٹی بیگم سے ملنے آئیں۔ وہ بھی بس جیسے مروت کی وجہ سے آئی تھیں، ضرورت سے نہیں ... بمشکل تین سو روپیہ چھوٹی بیگم نے خرچ کیا تھا باقی سات سو رومال میں یونہی پڑا تھا۔ چھوٹی بیگم کا دل بھر آیا وہ پانی پی پی کر اپنے آنسو روک رہی تھیں —— ہائے جیتے جی ان کی ایسی بے عزتی ہوئی کہ خود ان کی رعیت کو ان کی ضرورت باقی نہ رہے گی! سال بھر وہ اس دن کا انتظار کرتی تھیں —— آج وہ انتظار ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا۔ چھوٹی بیگم کا دل جیسے ڈوب سا رہا تھا۔ وہ صنوبر کا سہارا لے کر آہستہ سے کراہ کر اٹھیں، وضو کیا اور نماز میں مشغول ہو گئیں۔ سلام پھیر کے منہ پہ ہاتھ پھیرتی ہوئی بولیں —— "شکر ہے تیرا پروردگار تیرا ہر حال میں ...!" اتنے میں ان کو باہر مردانے سے کچھ زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں ... وہ گھبرا گئیں، جلدی سے صنوبر کو باہر بھیجا کہ معلوم کر کے آئے کہ کیا بات ہے —— اور خود "الٰہی خیر .. یا الٰہی خیر ...!" کہتی جاتی تھیں۔ صنوبر نے بتایا کہ بیٹھک میں چھوٹے نواب کے پاس منشی ہردیال بیٹھے ہیں۔ بستی کے مولوی صاحب ہیں اور بستی کے دو تین آدمی اور بھی ہیں اور سیوک رام مہاجن چیخ چیخ کر اپنا پیسہ مانگ رہا ہے —— کہتا ہے "اصل سے بیاج دگنا ہو گیا ہے۔ کب تک صبر کریں؟ ایسا موقع کب ملتا ہے چھوٹے نواب تو بمبئی جا کے بیٹھ رہتے ہیں۔ منشی جی سے کچھ کہو تو بات جوڑنے لگتے ہیں۔ بڑے نواب اور نواب حاتم کا واسطہ دینے لگتے ہیں۔ اب ہم فیصلہ کرا کے ہی چھوڑیں گے —!"

بات بڑھنے لگی تو چھوٹی بیگم حویلی کے سب سے پیچھے کے کمرے میں سے ہوتی ہوئی توشہ خانے کے آگے کے کمرے میں جا کے سانس روک کے کھڑی ہو گئیں۔ وہاں دروازے کی دراڑ میں سے انہوں نے جھانکا —— چھوٹے نواب کا چہرہ دیکھ کے وہ کانپ

گئیں۔ سیوک رام مہاجن چیخ رہا تھا۔ چھوٹے نواب سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ منشی ہردیال بار بار سیوک رام کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سیوک رام نے زور سے تپائی پہ ہاتھ مار کے کہا۔ "بس بس! بہت ہو چکا... ہم نے بہت چھپایا سب کے سامنے تمہاری حویلی کی ساکھ بنائے رکھی ارے تم کا ہے کے نواب رہے اب۔ اب دیکھنا جب کل نگریا کی حویلی... نواب حاتم کی حویلی کی ڈگی پٹے گی"..."

"نگریا کی حویلی... نواب حاتم کی حویلی... ڈگی..." اس سے زیادہ چھوٹی بیگم کچھ نہ سن سکیں۔ انہیں لگا کہ وہ ہوا میں معلق ہیں، نہ ان کے پاؤں تلے زمین ہے نہ سر کے اوپر چھت... جیسے ان کے سر کے اوپر تو ان کی اوڑھنی بھی نہیں ہے... کانپتی تھرتھراتی وہ الٹے پاؤں زنانی حویلی کے دالان میں آگئیں... صنوبر نے آگے بڑھ کے انہیں تھام لیا مگر وہ بے سُدھ ہو کر مسہری پر گر پڑیں۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دل کو دبا رکھا تھا۔ اور ان کے چہرے پر پانی کے سفید سفید قطرے چمک رہے تھے... ! صنوبر چیختی ہوئی باہر بھاگی۔ چھوٹے نواب اندر آئے، چھوٹی بیگم نے بڑی کوشش سے آنکھیں کھولیں ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ دھیرے دھیرے پھولے پھولے سانسوں کے بیچ... جیسے خوابوں میں بولیں..."تم جانتے ہو نگریا کی حویلی بک گئی۔ میرے میکے کا نیلام ہو گیا... !" یہ کہا اور چھوٹے نواب کی باہوں میں آخری ہچکی لی۔

دوسری شام تک بڑے نواب اور بہو بیگم کی قبروں کے قریب ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا۔ جس پر پہلے مٹی چھوٹے نواب نے ڈالی۔ چھوٹی بیگم کو دفن کر کے چھوٹے نواب خاموشی سے اندر حویلی میں چھوٹی بیگم کے کمرے میں آئے۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں شادی کی رات چھوٹے نواب اور چھوٹی بیگم نے گذاری تھی۔ جب نواب کمرے میں داخل ہوتے تو اچانک انہیں ایسا محسوس ہوا... جیسے سارے کمرے میں ——— عطر سہاگ ابٹنی اور پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی ہے... لیکن فوراً ہی وہ خوشبو کافور کی بو میں بدل گئی ——— نواب ننگے سر گھبرا کے باہر نکل گئے ——— منشی ہردیال نے کچھ دیر نواب کا انتظار کیا۔ پھر کمرے میں جا کر دیکھا... پیچھے کا دروازہ کھلا تھا۔ نواب کا کوئی پتہ نہ تھا۔ رات کے اندھیرے میں نواب جانے کہاں چلے گئے تھے ——— دنوں، ہفتوں، مہینوں منشی ہردیال نے پولیس کی مدد سے چھوٹے نواب کو بہت تلاش کیا۔ مگر وہ نہ ملے۔ بمبئی جا کے ان کے مالک مکان سے پوچھا تو وہ نواب کے غائب ہو جانے کی خبر سے بہت خوش نظر آیا... کہنے لگا ——— "ارے بابا اپن کو کیا مالوم کیدھر گیا تمہارا نباب وباب، ہمارا بھاڑا بھر گیا تھا جانے دیم... اب ہم کو مطلب وہ کدھر گیا۔ کدھر نہیں گیا... !!"

کتنی ہی خزائیں اور بہاریں بیت گئیں ——— نگریا کی حویلی میں حکومت نے سینے ٹوریم کھول دیا ہے۔ بڑے نواب کی حویلی میں آٹا پیسنے کی بجلی کی چکی لگ چکی ہے۔ سیوک رام مہاجن کا عالیشان بنگلہ بن چکا ہے اور وہ اگلے الیکشن میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہونے والے ہیں۔ سب کچھ بدل چکا ہے۔ بڑے نواب اور بہو بیگم کی قبروں کی محرابوں سے چاندی کے شمعدان بھی کوئی اٹھا لے گیا ہے۔ لیکن مزاروں پہ آج بھی دن ڈھلے مٹی کے چراغ روشن کئے جاتے ہیں۔ تین قبروں پر چار دیئے جلتے دیکھ کر بہت سارے لوگوں کو حیرت ہوتی ہے۔ لیکن منشی ہردیال کو بالکل کوئی حیرت نہیں ہوتی ہے۔ وہ تو چوتھا چراغ اپنے چھوٹے نواب کی اس قبر پر روشن کرتے ہیں جو صرف ان کو نظر آتی ہے.... !

دھرتی کے لال

نصیر انور

"....ہر چیز کا ایک موقع ہوتا ہے اور ہر کام کا جو آسمان کے نیچے ہوتا ہے ایک وقت ہے۔ پیدا ہونے کا ایک وقت ہے اور لگائے ہوئے کو اکھاڑنے کا ایک وقت ہے۔ ڈھانے کا ایک وقت ہے اور تعمیر کرنے کا ایک وقت ہے۔ رونے کا ایک وقت ہے اور ہنسنے کا ایک وقت ہے۔ غم کھانے کا ایک وقت ہے اور ناچنے کا ایک وقت ہے۔ پتھر پھینکنے کا ایک وقت ہے اور پتھر بٹورنے کا ایک وقت ہے۔ ہم آغوشی کا ایک وقت ہے اور ہم آغوشی سے باز رہنے کا ایک وقت ہے۔ رکھ چھوڑنے کا ایک وقت ہے اور پھینک دینے کا ایک وقت ہے۔ پھاڑنے کا ایک وقت ہے اور سینے کا ایک وقت ہے۔ چپ رہنے کا ایک وقت ہے اور بولنے کا ایک وقت ہے۔ محبت کا ایک وقت ہے اور عداوت کا ایک وقت ہے۔ جنگ کا ایک وقت ہے اور صلح کا ایک وقت ہے....."

پھر وہ وقت بھی آیا جب آواز آئی۔ "اگر کوہِ گراں پیغمبر کے حضور پیش نہیں ہوتا تو پیغمبر کو کوہِ گراں کے حضور پیش ہونا پڑتا ہے!"

اس آواز پر مقدس باپ نے رختِ سفر باندھا اور آن کی آن میں اُس سرزمین پر قدم رکھا جہاں خداوند خدا کی رحمتیں ۲۲ بہتر خاندانوں پر نازل ہوتی ہیں — یہ خاندان سرمایہ داروں کے ہیں۔ یہ سرمایہ دار، سرمایہ داری نظام کو برقرار رکھنے کے لئے کوہِ گراں بن چکے ہیں۔ اس کوہِ گراں کی چوٹی سے یہ آواز سنائی دیتی ہے۔ "مبارک ہیں وہ لوگ جن کے پاس ایٹم اور ہائیڈروجن بم ہیں، کیوں کہ زمین کی بادشاہت انہوں ہی کی ہے!"

زمین کی یہ بادشاہت زمین کے سینے پر ناسور پیدا کرنے سے قائم ہوئی تھی۔ ساری دنیا چیخ اٹھی تھی، جب ہیروشیما اور ناگاساکی پر قیامت ٹوٹ پڑی مگر کوہِ گراں کے پتھر سے بنے ہوئے پتلے نے یہ چیخ نہ سُنی۔ اُس نے خود اپنی سرزمین کی یہ چیخ نہ سُنی۔ کیوں کر سُنتا، وہ اپنی سرزمین کے عوام کا نمائندہ نہ تھا، وہ ان ۲۲ بہتر خاندانوں کا نمائندہ تھا جو سرمایہ داری نظام کی خاطر کوہِ گراں بن چکے ہیں۔

وہ آج بھی اسی کوہِ گراں کی چوٹی پر کھڑا ہوا پتھر لڑھکا رہا ہے:

"یہ کیسی چیخ و پکار ہے؟"

ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا، تو پھر اس کی تلافی کا تقاضا کیوں؟

سب گناہوں کی تلافی کب کی ہو چکی!

خداوند یسوع مسیح نے مصلوب ہو کر کفارہ ادا کر دیا۔

اُن سب کا جو اُس وقت موجود تھے۔

اُن سب کا جو اُس کے بعد آئے۔
اُن سب کا جو اس وقت موجود ہیں۔
اُن سب کا جو اس کے بعد آئیں گے۔!"

———— کفارہ ادا ہو چکا ہے۔ اب کوئی گناہ، گناہ نہیں۔ اِسی لیے وہ گناہ و ثواب کی قید سے آزاد، آزادی سے گناہوں کا مرتکب ہو رہا ہے۔ ان گناہوں کی سزا دُنیا بھر کے عوام کا نصیب بن چکی ہے۔ نصیب بنانے والا وہی ہے جو اپنی ہی سرزمین کے عوام کا نہیں، اُن بہتر خاندانوں کا نمائندہ ہے جن کے ہر فرد نے سیاسی طاقت کو خوشحالی کی کنجی بنایا، جس کے ہر فرد نے اس کنجی کے حصول کو اپنی جد وجہد کا محور بنایا اور اسی محور کے گرد جب انھیں یہ کنجی مل گئی تو اُنھوں نے غریب عوام کے خوشحالی کے دروازوں پر تالے ڈال دیے۔

اب وُہی صاحب اقتدار ہے۔ وہ غریب عوام کے نام پر سرمایہ داروں کے اقتدار کو عزیز رکھتا ہے، اُنھی سرمایہ داروں کا جو انقلاب نہیں چاہتے البتہ انقلابی حالات کو مراعات حاصل کرنے کا آلۂ کار بناتے ہیں کیوں کہ وہ اپنے مفاد کی حد تک انقلابی تحریکوں کے ساتھ ہوتے ہیں وہ انھی سرمایہ داروں کا محبوب ہے جو امریکہ میں پائے جاتے ہیں، ہر اُس ملک میں پائے جاتے ہیں جہاں سرمایہ داری نظام کی بدولت خداوند خدا کی رحمتیں چند خاندانوں پر نازل ہوتی ہیں۔

رحمت خداوندی کے انھی پھولوں کو چن کر اُس نے ایک گلدستہ بنایا۔ گلدستہ مقدس باپ کی خدمت میں پیش کیا اور پھر وہ مقدس باپ کو اُس عمارت میں لے گیا جہاں تاریکی، روشنی بن کر پھوٹتی ہے۔ اس تاریکی کو چھپانے کے لیے اُس نے اس عمارت پر "سفید ایوان" کی تہمت لگا رکھی ہے۔

اِسی "سفید ایوان" کی اُونچی مسند پر اُس نے بڑے ادب سے مقدس باپ کو بٹھایا اور خود دو زانو ہو کر اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔ اپنی آنکھیں بند کیں، ہاتھ جوڑے اور بھرائی آواز میں یوں مخاطب ہوا:

"اے خدا مجھ کو بچا لے
میں گہری دلدل میں دھنسا جاتا ہوں، جہاں
کھڑا نہیں رہا جاتا
مجھ سے بے سبب عداوت رکھنے والے میرے سر کے
بالوں سے زیادہ ہیں
میری ہلاکت کے خواہاں اور ناحق دشمن زبردست ہیں
تیرے نام کی خاطر میں نے ملامت اٹھائی ہے
شرمندگی میرے مُنہ پر چھا گئی ہے
میں اپنے بھائیوں کے نزدیک بیگانہ ہوں۔
اور اپنی ماں کے فرزندوں کے نزدیک اجنبی"

اِس پر مقدس باپ نے فرمایا " خداوند خدا کا یہ ارشاد ہے کہ جب کسی سردار سے خطا سرزد ہو اور وہ اُن کاموں میں سے جنھیں خداوند نے منع کیا ہے کسی کام کو نادانستہ کر بیٹھے اور مجرم ہو جائے تو جب وہ خطا جو اس سے سرزد ہوئی ہے اُسے بتا دی جائے تو وہ بے عیب بکرا اپنی قربانی کے واسطے لائے اور اپنا ہاتھ اُس بکرے کے سر پر رکھے اور اُسے اُس جگہ ذبح کرے جہاں سوختنی قربانی کے جانور خداوند کے آگے ذبح کرتے ہیں۔ یہ خطا کی قربانی ہے!"

مقدس باپ کے یہ الفاظ سن کر اُس نے اپنی آنکھیں بھر لیں اور پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مخاطب لہجے میں کہنے لگا: " اے مقدس باپ! وہ بے عیب بکرا افریقہ اور ایشیا میں پایا جاتا ہے۔ میں نے اپنا ہاتھ بکرے کے سر پہ رکھا ہے اور اُسے اُسی جگہ ذبح کرتا ہوں جہاں سوختنی قربانی کے جانور خداوند کے آگے ذبح ہوتے ہیں۔ خطا کی یہ قربانی جاری ہے اور جب تک افریقہ اور ایشیا کا ایک بکرا بھی باقی ہے، یہ قربانی جاری رہے گی۔"

مقدس باپ نے کہا " اِسی قربانی پر اخبار تو ایک طرف تیرے اپنے ہی لوگ تیری ہلاکت کے خواہاں ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ قربانی نہیں، فتنہ و فساد ہے، جنگ ہے . . . . ."

اُس نے بات کاٹتے ہوئے کہا " مقدس باپ! قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔ عام لوگوں کی باتوں پر نہ جائیے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ خداوند خدا فرماتا ہے کہ آخری دنوں میں ایسا ہوگا کہ میں اُوپر آسمان پر عجیب کام اور نیچے زمین پر نشانیاں یعنی خون اور آگ اور دھوئیں کا بادل دکھاؤں گا۔ سورج تاریک اور چاند خون ہو جائے گا ——— تو اے مقدس باپ! خداوند خدا کے اس ارشاد کے مطابق زمین پر آگ اور خون کی نشانیاں دکھانا میرا فرض ہے۔ ابھی تو سورج کو تاریک اور چاند کو خون کرنا باقی ہے!"

مقدس باپ نے پوچھا " کیا تم ایسا کر سکو گے!"

اُس نے کہا " مقدس باپ، ایسا ہی کر رہا ہوں۔ کبھی یُوں بھی ہوتا ہے کہ صدیوں کا فاصلہ چند لمحوں میں طے ہو جاتا ہے اور کبھی یُوں بھی ہوتا ہے کہ چند لمحے صدیوں پر محیط ہو جاتے ہیں ——— دیکھ لیجیے، میں نے خود صدیوں کا فاصلہ چند لمحوں میں طے کر لیا ہے اور میری ہی کوشش سے پس ماندہ ممالک میں چند لمحے صدیوں پر محیط ہو رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ آن کی آن میں زندگی سے ہمکنار ہو جائیں۔ مگر یہ زندگی انقلاب پر آمادہ ہے!"

مقدس باپ کے ان الفاظ پر اُس نے کہا " انقلاب تو اُسی وقت رُونما ہو سکتا ہے جب کہ عوام ملک کے حالات و واقعات کے مطالعے سے خود سیاسی نتائج نکالنے لگتے ہیں اور اپنے انقلابی رُجحانات کے مطابق ملکی معاملات میں دخل دے کر مستقبل کی تشکیل کرتے ہیں۔ وہ اپنے رہنماؤں کی اندھی تقلید نہیں کرتے بلکہ اُن کے اعمال و افعال پر نظر رکھتے ہیں ——— مگر اے مقدس باپ! میرے ہوتے ہوئے ایسی انقلابی فضا کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ موجودہ نظام میں امیر طبقے کی زندگی غیر ملکی سرمائے سے وابستہ کر دی گئی ہے۔ اور یہ طبقہ ہمارے ساتھ ہے۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے، اُنھیں بنیادی ضروریات پُورا کرنے کی تگ و دو میں یُوں لگا دیا ہے کہ وہ کسی انقلاب کا تصوّر کر ہی نہیں سکتے۔"

اِس پر مقدس باپ نے کہا " عوام کو راہِ راست پر لانے اور زندگی کا احساس دلانے کے لیے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے کبھی کوتاہی نہیں کی اور آج بھی وہ کیوں کر چپ رہ سکتے ہیں!"

اُس نے کہا "مقدس باپ! مجھے زمانے کی رفتار کا پورا پورا احساس ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ زندگی کو اصل مقام سے ہٹانے کے لیے یکے بعد دیگرے نت نئے مسائل پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ کیوں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بحث و تمحیص کے بڑے بڑے دروازے کھولے جا سکتے ہیں۔ اے مقدس باپ! میری نظر زندگی کے ہر شعبے پر ہے۔ زندگی کی اقدار کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کے لیے میں نے دُنیا میں جگہ جگہ بڑے بڑے دارالاشاعت، تجارتی مرکز، صنعت و حرفت سے متعلق ادارے، کارخانے، فرمیں، چھاپے خانے، سٹیم شپ کمپنیاں، سیاحت کی ایجنسیاں، درآمد و برآمد کی کمپنیاں یا دوسرے کئی ادارے قائم کر رکھے ہیں کیوں کہ سیاسی جوڑ توڑ، دھونس، دھمکی، دھاندلی، فوجی طاقت کا دباؤ، اکھاڑ پچھاڑ میرا ایک محبوب شغل ہے!"

مقدس باپ نے پوچھا "تم نے یہ شغل کیوں اختیار کیا؟"

اُس نے جواب دیا "تاکہ ہر کہیں بے اطمینانی اور خطرے کا احساس قائم رہے!"

"اِس خطرے اور بے اطمینانی میں عوام کو زندگی کا احساس زیادہ ہونے لگا ہے!"

مقدس باپ کی اِس بات پر اُس نے کہا "عوام کو یہ احساس ہو جائے تو سمجھ لیں کہ حکومت کمزور ہے ——— ورنہ یہ عوام تو پرچے ہیں۔ یہ اگر ڈھیلے پڑ جائیں تو مشین نہیں چلتی۔ انھیں کس کر رکھنا چاہیے!"

مقدس باپ نے کہا ——— "مگر کب تک ——— آخر کوئی تو اُن کی راہنمائی کرے گا!"

اُس نے کہا "انقلابی فضا اقتدار پسند راہنماؤں کو پر پرزے نکالنے کا موقع دیتی ہے۔ ورنہ وہ تو مزے سے اپنے نشیمن میں خرخر کرتے ہیں۔ رہے وہ راہنما جو عوام میں سے ہوں، تو اُن کے لیے ہر راہ اتنی دُشوار اور پُرخار بنا دی گئی ہے کہ ایک قدم اُٹھانا بھی جان جوکھوں میں ڈالنا ہے۔ پھر اُس کی سنے گا کون، کہنے کا موقع ہی کب پا جائے گا اور اگر وہ ڈھیٹ اور سخت جان ہے تو پھر اُسے ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔"

مقدس باپ نے کہا "ٹھکانے لگانے کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے!"

اُس نے کہا "مقدس باپ! جب کتے کو مار ڈالنا ہو تو پہلے اُس کو پاگل کہنا شروع کر دینا چاہیے۔"

ابھی وہ اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ ایک نوجوان اور صحت مند عورت پیارے اور حسین مستقبل کو سینے سے لگائے کمرے میں داخل ہوئی۔

آہٹ پا کر وہ چونکا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ پھر حیرت اور غصّے میں کہا "کون ہو تم یہاں کیوں کر آئی ہو؟"

اُس نوجوان عورت نے کہا "میں دھرتی ہوں۔ میری گود میں یہ بچہ میرا روشن مستقبل ہے اور میں یہاں مقدس باپ سے کچھ کہنے آئی ہوں!"

مقدس باپ نے اُس سے کہا "کہو، کیا کہنا چاہتی ہو؟"

دھرتی بولی "تو بھی میرا ہی بیٹا ہے مگر تجھ میں یہ ہمت نہیں کہ تم اس سے کہو اے صبح کے روشن ستارے، تو کیوں کر آسمان پر سے گر پڑا۔ اے قوموں کو پست کرنے والے تو کیوں کر زمین پر پٹکا گیا۔ تو تو اپنے دل میں کہتا تھا، میں آسمان پر چڑھ جاؤں گا۔ میں اپنے تخت کو خدا کے ستاروں سے بھی اُونچا کروں گا اور میں شمالی اطراف میں جماعت کے پہاڑ پر بیٹھوں گا۔ میں بادلوں سے بھی اُوپر چڑھ جاؤں گا۔ میں

خدا تعالیٰ کی مانند ہوں گا ـــــ لیکن تُو ـــــ تُو گڑھے کی تہ میں اُتارا جائے گا اور جن کی نظر تجھ پر پڑے گی، تجھے غور سے دیکھ کر کہیں گے کہ کیا یہ وہی دھرتی کا لال ہے جس نے زمین کو لرزا دیا اور مملکتوں کو ہلا دیا، جس نے جہان کو ویران کیا اور اس کی بستیاں اجاڑ دیں۔"

پھر دھرتی نے مقدس باپ سے نرمی سے کہا: "میرے بیٹے، تُو کچھ نہیں کہہ سکتا! میرے اس لڑکھڑاتے ہوئے ضدی بچے کو تُو راہِ راست پر نہیں لا سکتا۔ پہلے تو کبھی شاہ گر تھا مگر آج تُو اس کے ہاتھوں میں محض ایک مقدس کھلونا ہے ـــــ مستقبل قریب میں تم اور یہ، دونوں عجائب گھر کی زینت ہو گے ـــــ!"

پھر اس نے گود میں اٹھائے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "پھر میرا یہ لال تم دونوں کو دیکھ کر افسوس سے کہے گا، کیا یہ وہی میری ماں کے بیٹے تھے جو اپنی ہی ماں کے دشمن اور اپنے ہی بھائیوں کے خون سے ہولی کھیلتے تھے!!"

کلب ٹائم

جوگندر پال

میں حسبِ معمول شام کے وقت یم فورڈ پرائیویٹ کلب کے لان میں مودب کھڑا اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا ہوں۔ حسبِ معمول میری بیٹ میز نمبر تین سے میز نمبر سات تک ہے۔ میں سات نمبر کے قریب کھڑا ہوں جہاں صرف تین نفوس بیٹھے ہیں بلکہ ڈھائی ہی کیونکہ ریحا کی عمر مشکل سے بارہ برس ہوگی۔ ریحا کی دائیں طرف مس کرسچین' ریحا کی بڑی بہن ——— بس اتنی بڑی کہ کوئی اسے بائیں سے اوپر نہیں کہہ سکتا ——— اپنے ہونٹ بند کرکے مٹن کٹلس چبا رہی ہے (اس کا منہ اتنا چھوٹا اور باریک ہے کہ کھلا بھی ہو تو بند ہی معلوم ہوتا ہے) ابھی اس کی پلیٹ میں ایک کٹلس باقی ہے۔ جب آدھا رہ جائے گا تو وہ آہستہ سے گھنٹی بجا کر کہے گی "وائین' بیئرر!"

اور مجھے معلوم ہے کہ اس کی وائین کی پسندیدہ برانڈ کون سی ہے اور کہ ایک وقت وہ کتنی وائین پیتی ہے اور کہ وہ اپنا گلاس کم از کم پون سو چھوٹے چھوٹے گھونٹوں میں خالی کرتی ہے' اور کہ یہ پون سو گھونٹ وہ اپنے ننھے سے منہ سے پورا آدھ گھنٹہ بھرتی رہتی ہے' اور پھر وہ ایک پلیٹ مٹن کٹلس کا مزید آرڈر دیتی ہے۔

مس کرسچین آج گلابی اسکرٹ اور گلابی فراک پہنے ہوئے ہے۔ اس کے جھمکے بھی گلابی ہیں اور دائیں کلائی میں دو چوڑیاں' وہ بھی گلابی۔ اس کے سینڈل بھی نرم نرم گلابی رنگ کے ہیں۔

میں اپنا سر کھجانے لگا ہوں

گلابی گلابی ———

میرے دل میں گراموفون ریکارڈ بجنے لگا ہے۔

گلابی گلابی ———

"بے ۔ راہ!"

یہ ہمارے لالہ چرنجی داس کی آواز ہے۔ کم بخت کو "بیرر" کہنا نہیں آتا۔ اس لئے اس کی جہالت سے میں اچھا خاصا گریجویٹ "بے راہ" بن کر رہ گیا ہوں۔

"بے راہ!" ———

اور میں لپک کر لالہ کے پاس جا کھڑا ہوا ہوں۔

"دو' برانڈی!" وہ آرڈر لکھوا رہا ہے۔

"تم بھی پیو گی' سرسوتی؟" اس نے اپنی سفید پوش، موٹی تازی بیوی کی طرف منہ کرکے پوچھا ہے۔ "ہاں' ہاں ضرور پیو ———

ایک ڈبل اور ایک سنگل' بے راہ۔"

"میرے لئے سنگل کیوں؟"

"سنگل تمہارے لئے نہیں' میری ——" وہ اپنی بیوی کو ہمیشہ یوں ہی مخاطب کرتا ہے۔ شاید "میری" کے بعد اس کے منہ میں "ماں" آتے آتے رہ جاتا ہے۔ "سنگل میرا ہے۔"

"آپ کے لئے بھی سنگل کیوں؟" لالہ کی بیوی نے لالہ سے فلرٹ کرنے کے انداز میں اپنے چہرے کے "میڈاپ" زاویے کچھ یوں ترچھے کرلئے ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ کھکھلا کر ہنس پڑوں۔ "کیا یہاں سے لوٹ کر ریسٹورانٹ تک دکان کا حساب کتاب کرنا ہے؟"

"اچھا بھئی" لالہ نے بیری جانب سر اٹھالیا ہے۔ "دونوں ڈبل ہی لے آؤ —— ارے ٹھہرو' ایک دوہرا ڈبل لاؤ اور ایک سنگل ڈبل۔"

"میرے لئے سنگل ڈبل کیوں؟"

"کیونکہ تمہارے لئے سنگل ڈبل ہی ٹھیک ہے میری ——"

"دوہرا ڈبل میں پیوں گی اور سنگل ڈبل آپ ——"

"تم ابھی تک بس کھڑے ہوئے ہو؟" لالہ نے خفا ہو کر مجھ سے کہا ہے "جاؤ' جاؤ!"

میں لان سے نکل کر کلب بلڈنگ کے برآمدے سے ہو کر بار کی جانب جارہا ہوں اور میرے ذہن میں لالہ اور للاتن کا روز کا جھگڑا چل رہا ہے۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم عورتیں انسان نہیں جو تم دوہرا ڈبل پیو اور میں سنگل ڈبل؟" لالہ کی بیوی استری سدھار منڈل کی اپ منتری ہے۔ "اب وہ سمے گیا جب مرد شراب پی کر گھر آتا تھا اور عورت گھونگھٹ لٹکا کر اس کے سامنے شراب کی رنگدار بوتل بنی کھڑی ہو جاتی۔" لو بتی دیو' مجھے پی جاؤ۔"

اب چپ بھی ہو جاؤ میری —— لالہ گویا اپنی کسی ناراض بزنس پارٹی سے گفتگو کر رہا ہو جو اسے دھمکی دے رہی ہو کہ اگر تم نے سیدھا بدھا دھندا نہ کیا تو تمہارے بلیک مارکیٹ کے سارے راز فاش ہو جائیں گے۔

"چپ کیوں ہو جاؤں؟ وہ کوئی اور ہوگی جسے تم ایک ہی گھونٹ میں پی جاؤ اور وہ بے چاری چپ سادھے رکھے۔"

"میں تو یہی چاہتا ہے کہ تم کوئی اور ہی ہوتیں۔ بڑی کڑوی اور نشہ آور ہو ——"

بار کاؤنٹر پر پہنچ کر میں بے اختیار ہنس پڑا ہوں۔

کیوں پگلے۔ وہاں حمید کئی بیروں کو پیمانے سے ناپ کر شراب دے رہا ہے۔ "شراب دوسرے پی رہے ہیں اور شرابی تم ہوئے جا رہے ہو۔!"

"لالہ کے لئے دو دوہرے ڈبل دو۔"

"ٹھیک ہی کہہ لو یار۔" کشن بیرا اپنا ٹرے اٹھا کر جاتے جاتے رک گیا ہے۔ "تمہاری للاتن ہے بڑی لچھے دار۔ دوہرا ڈبل یوں غٹ غٹ چڑھا جاتی ہے جیسے میری ماں ایک ہی ڈیک میں لسی کا سارا چھنّا خالی کر دیا کرتی تھی۔"

"تو یار! اس دو ہرے ڈبل سے ایک چھوٹا سا سنگل تم چڑھا جاؤ۔ سالی لالتی پہ ترس کھاؤ، ایکدم اتنی پی کر الٹ جاتی گی۔ الٹ جاتی گی؟ کش ہنس دیا ہے۔ شراب کی پوری بالٹی بھر کے لالتی کا منہ اس پہ لگا دو، دم بلا بلا کر سب خالی کر دے گی اور اپنی چاروں ٹانگوں پر ویسی ہی کھڑی رہے گی۔"

میں اپنا شعر تیز تیز پی کر مسکرا رہا ہوں اور اس وقت تک متواتر مسکراتے چلا جاتا ہوں جب تک لالتی میز کے قریب لوٹ کر اس کی کنار موتیوں کی چیں مجھے اپنے گلے میں گھستی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔

"آتنی دیر کیوں کی؟ —— جاؤ!"

میں اپنی جگہ پر واپس آکھڑا ہوا ہوں۔

سات نمبر پہ مس کرسچین کی کٹلس کی پلیٹ خالی ہو چکی ہے۔ میں اس کی وائیٹ وائن لانے کے لئے بار کی طرف مڑنے کی سوچ ہی رہا ہوں کہ اس نے مجھے اشارے سے بلایا ہے۔ ابھی میں اس کی میز سے کچھ فاصلے پہ ہی ہوں کہ بنجیرن تھیٹریکل کمپنی کا مشہور جنٹلمین مسخرا رام لعل رو کھا سا منہ بناتے وہاں آپہنچا ہے۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ مسخرا مس کرسچین سے بڑا زوردار عشق کرتا ہے، پھر بھی وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ شاید اس لئے کہ جب محبوب کے وصل کی توقع نہ ہو تو ہم اسے کسی دوسرے کی پر امید آنکھ سے ہی دیکھ لیتے ہیں اور پھر وہ شخص بھی ہمیں محبوب ہی معلوم ہونے لگتا ہے۔ روز روز رام لعل اور مس کرسچین کو اکٹھا دیکھ دیکھ کر میری عادت سی ہو گئی ہے کہ رام لعل کو اپنی ہی ذات سے تعبیر کروں۔ رام لعل مس کرسچین کی طرف بڑی محبت سے تک رہا ہے، گویا وہ نہیں، میں ہوں۔ مس کرسچین رام لعل کی جانب دزدیدہ محبت سے تک رہی ہے، گویا میری طرف ہی —— رام لعل میں ہی ہوں۔ اگر —— اگر اتفاق سے مس کرسچین رام لعل کی بجائے میری طرف محبت بھری آنکھوں سے دیکھنے لگے تو میں شاید انجانے میں رام لعل کی طرف نگاہ اٹھاؤں گویا اس چاہ سے کہ مجھ غریب کی بجائے وہی مس کرسچین کی محبت آمیز قیمتی نگاہ کے دام چکائے۔ رام لعل ہی میری محبت کی توفیق ہے۔ میری اپنی بھلا کیا توفیق؟ غریب کے ہاتھ گوہر آجاتے تو وہ بے چارا گھبرا کر اسے راہ میں ہی ڈال دیتا ہے۔ رام لعل بڑا پیارا ہے، بڑا سجیلا ہے، بڑا امیر۔

کیا میں واقعی مس کرسچین سے محبت کرتا ہوں؟

اسے بھی کرسی لاؤ۔ رام لعل مجھ سے مخاطب ہے۔

نمبر چھ پہ ایک کرسی خالی پا کر میں اسے سات پر لے آیا ہوں۔

مسخرے کا سنجیدہ منہ دیکھ دیکھ کر ریجا، مس کرسچین اور ان کا بوڑھا باپ ہنسنے لگے ہیں۔

"رام چا چا یہ تم نے اپنی ناک پر اتنی موٹی عینک کیوں ڈال رکھی ہے؟"

"چچا نہیں، بھیا کہو۔"

"میں چچا تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں" ریجا نے جواب دیا ہے۔ "چا —— چا!" اس نے پاپ سانگ گانے کے انداز میں آواز نکالی ہے۔

"اچھا بتاؤ اب یہ اتنی بڑی عینک کیوں چڑھا رکھی ہے؟"

"عینک کے بغیر میں ایک بھی لفظ نہیں پڑھ سکتا۔"

"مگر اس وقت تم پڑھ تھوڑا ہی رہے ہو۔ کتابیں کہاں ہیں؟"

"تم لوگوں کے چہروں پر!" مسخرہ ریا سے منہ موڑ کر مس کرسچین کے چہرے کی طرف یوں دیکھتا ہے جیسے فلسفہ کی کسی خوشنما۔ ویلی باؤنڈ بک کی ورق گردانی کرنے لگا ہو۔ "مس کرسچین، تمہیں میرے یہاں بیٹھنے پر اعتراض تو نہیں؟"

"ڈیڈی سے پوچھو۔" مس کرسچین نے مذاقاً کہا ہے۔

"او ۔۔۔ میرا خیال تھا کہ تم بالغ ہو۔ خیر، مسٹر کرسچین" اس نے اپنا منہ مسٹر کرسچین کی طرف پھیر کر پھر مس کرسچین کی طرف کر لیا ہے "کیا پوچھوں؟ یہ کہ ۔ کہ مسٹر کرسچین کیا میں آپ کی بیٹی کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟ ۔۔۔" بہ آواز بلند "مسٹر کرسچین کیا میں آپ کی بیٹی کے ساتھ بیٹھ سکتا ہوں؟ ۔۔۔"

"نہیں بیٹا" بھرے باپ نے اپنی ہاٹ ڈاگز کی پلیٹ صاف کرتے ہوئے جواب دیا ہے۔ "میں اور نہیں کھاؤں گا؟"

"نہیں ایک پلیٹ اور!" مسخرے نے بڑی متانت سے اپنی انگلی سے ایک کا اشارہ کیا ہے۔

"اچھا تمہاری مرضی۔"

"کنگ!" کلب میں کوئی مجھے بیئرر پکارتا ہے کوئی کنگ۔ "بڑے میاں کے لئے ہاٹ ڈاگز، ریا، تمہارے لئے ایک اور آئس کریم؟ ۔ ریا کے لئے آئس کریم اور مس کرسچین ۔؟"

"میں آج اپنی وائن کی بجائے رم پیوں گی۔"

"ایک رم اور میرے لئے ۔۔؟"

"جن!" مس کرسچین نے مسکرا کر تجویز کیا ہے۔

"تمہیں، جن سے میری دوستی اس وقت تھی جب میں چھ سات برس کا بچہ تھا مگر تم کہتی ہو تو مجھے بچہ بننا بھی قبول ہے۔"

"سدا بچہ یا بوڑھا ہی بنتے ہو؟" مس کرسچین نے آس پاس کے لوگوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا ہے۔ "ان سب لوگوں کی طرح کبھی جوان بننے کی بھی سوجھ آئی ہے؟"

"ان سب کی طرح؟" اتفاق سے آس پاس ادھیڑ عمر یا بوڑھے لوگ ہی بیٹھے تھے۔ "تمہارا دوش نہیں مس کرسچین۔ آجکل سبھی لڑکیاں یہی چاہتی ہیں کہ ان کی شادی متمول بوڑھوں سے ہو اور ان سے اظہار محبت بوپلے منہ سے کیا جائے۔"

"ویسا ہی تو کر رہے ہو۔"

"تم ہنس کیوں نہیں رہے چاچا ۔۔۔ بھیا۔"

"کیونکہ میرا ابھی تمہاری بہن کی ٹوتھ پیسٹ کمپنی سے معاہدہ نہیں ہوا۔" مس کرسچین کسی ٹوتھ پیسٹ کمپنی کی منیجر ہے۔ "کہ اپنے شفاف دانتوں کی نمائش کرتا رہوں"۔ رام لعل سٹیج پر بھی اپنے تماشائیوں کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیتا ہے مگر خود آپ متانت کی تصویر بنا رہتا ہے۔ "او ۔۔۔ تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو کنگ۔ جاؤ بادشاہ جو کہا ہے لے آؤ ۔۔۔ اور سنو اپنے لئے بھی جو کچھ چاہتے ہو میرے حساب سے چپکے سے وہیں کاؤنٹر پر پی لینا" ہم سب "بادشاہ" رام لعل کی حکومت میں بڑے خوش ہیں کہ ان کے ٹپ اوروں سے تگنے

چھ گنے ہوتے ہیں اور سلوک جیسے سکندرِ اعظم پورس کو غلام بنا کر بھی اسے شہنشاہ ہی تسلیم کرتا ہو۔

میں اپنے "فاتح" کا حکم بجا لانے کے لئے تیز تیز بار کی جانب جا رہا ہوں کہ راستے میں نمبر تین پر گنگا داس نے زور سے گھنٹی بجائی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ سیاہ رُسو، کھردرا اور بوڑھا رعونت پسند سرکاری افسر مجھے زور زور سے گالیاں بک رہا ہے اور میں انجان سا بنا آگے نکل جاتا ہوں۔ نکل تو آیا ہوں مگر بار کاؤنٹر کے قریب آ کر ڈر محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ پہلے بھی دو ایک بار کلب کے منیجر سے میری شکایت کر چکا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بنی بنائی نوکری ہاتھ سے نکل جائے۔ رام لعل کا آرڈر جلدی جلدی لکھوا کر میں الٹے پاؤں گنگا داس کی میز پر چلا آیا ہوں۔

"گھنٹی کی آواز سن کر رُکے کیوں نہ تھے۔؟"

"سار ی سَر" میں نے سوچا ہے کہ سالے کی کافی میں گندا پانی ملا کے لاؤں گا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا" اُس کی میز پر پروفیسر تیرا گنگا داس کی بیوی کو بتا رہا تھا کہ آج کا نام نہاد متمدن انسان اولین انسان کے مانند بدستور جاہل ہے۔"

گنگا داس مجھے آرڈر دینا بھول کر پروفیسر کو جھڑکنے کے انداز میں گویا ہوا ہے۔ "نہیں صرف اپنے آپ کو جاہل کہنے کا حق حاصل ہے پروفیسر۔ دوسرے لوگ جاہل نہیں ہیں۔"

"نہیں آپ سب جاہل ہیں۔ آپ میں اور اولین انسان نما ننگی دھڑنگی مخلوق میں کوئی فرق نہیں۔"

"تم اندھے ہی تو ہو سکتے ہو" گنگا داس پروفیسر کو اندھا کہہ کے بڑے اطمینان سے مسکرانے لگا ہے۔

"آپ لڑتے کیوں ہیں؟" گنگا داس کی بیوی اپنے شوہر کو ٹوکتی ہے۔ "سب لوگ آپ کے دفتر کے کلرک یا آپ کی بیوی تو نہیں۔"

"بھائی صاحب" چندر شاید گنگا داس کا سالا ہے، یا شاید گنگا داس اس کا سالا۔" آپ ہمارے کھانے پینے کا آرڈر دیجئے اور میں آپ کی باتیں کرتا ہوں۔"

گنگا داس میری طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن میرے کان پروفیسر تیرا کی بات پر ہیں۔

"پہلے پہل آدمی لاعلم تھا اور علم کی کھوج میں اس نے اَن گنت صدیاں گزار دیں مگر اپنی مسلسل کھوج کے بعد آج اسے کیا پتہ چلا ہے؟ —— یہ کہ لاعلم علم سے لطف اندوز ہوتا ہے اور عالم لاعلمی سے ——"

"سمجھے؟ جلدی لاؤ!"

گنگا داس کی آواز سن کر میں چونک پڑا ہوں۔

"جاؤ اب جاتے کیوں نہیں"

"میں ——"

"میں وِیں کے بچے، جاؤ اب۔ جو آرڈر دیا ہے، جلدی لاؤ۔"

"یس سر!" میں سر ہلا کر بار میں لوٹ آتا ہوں۔

"کشن تین نمبر پہ پہنچ کر میں نے اپنے ساتھی سے کہا ہے "تین نمبر پر پتہ نہیں اس لنگوٹیلی کے بچے نے کیا آرڈر دیا ہے۔ میں دوبارہ گیا تو گاڑی پٹڑی سے اُتر جائے گی۔"

"ڈرو نہیں میرے یار دیکھو میں چٹکی میں ریچھ کو رام کر کے آتا ہوں۔"

کشن کو مڑتے دیکھ کر میں رام لعل کا آرڈر ٹرے میں سیٹ کرنے لگا ہوں۔ یہ مسٹر کرسچین کے ہاٹ ڈاگز' بوڑھے کو ہاٹ ڈاگز بہت مرغوب ہیں۔ کلب میں وہ اپنا نصف وقت ہاٹ ڈاگز کھانے میں صرف کرتا ہے اور باقی نصف' یہ سوچ سوچ کر کہ شاید اور ہاٹ ڈاگز کھانے کو مل جائیں۔ ہاٹ ڈاگز چوبیس گھنٹے اس کے پیٹ اور ذہن میں بھونکتے رہتے ہیں۔ اور یہ لگاتار بھونک سن سن کر بہرے کو کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ——— مس کرسچین کا رم کا گلاس ٹرے میں رکھتے ہوتے میں ذرا رک گیا ہوں۔ اسے کئی بار اپنی جھوٹی شراب پلا چکا ہوں اور اب بھی میرا جی چاہ رہا ہے کہ اس گلاس کو ذرا سا جھوٹا کر دوں۔ جب مس کرسچین اسے پینا شروع کرے گی تو اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کر مجھے یہی محسوس ہوگا کہ اس کے ہونٹوں سے میری تشنگی بجھ رہی ہے۔ اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں کے قریب آ رہے ہیں۔ قریب تر ——— اور قریب ——— اور ——— ! رام لعل ——— پھر وہی رام لعل! شاید ——— شاید مجھے رام لعل اس لئے اتنا پسند ہے کہ میں دراصل اُس سے نفرت کرتا ہوں' یا شاید اس لئے نفرت کرتا ہوں کہ وہ مجھے بہت پسند ہے۔ رام لعل' وہ مسخرا میری محبت کا ایک جرأت آمیز اشارہ ہے ——— میں نے ادھر اُدھر دیکھ کر گلاس کو ذرا سا جھوٹا کر ہی دیا ہے۔

"ہیہ ہیہ ہا ہہ ——— ہہ ہا" حمید نے میری چوری پکڑ کر قہقہہ لگایا ہے۔ اوئے کبوتر کے بچے' اور سب کی چوری کھلے بندوں کرتے ہوں پر اپنی اس یار کی چوری چوری چوری ——— ہہ ہہ - ہا!"

یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ مس کرسچین میری کمزوری ہے، صرف ایک مس کرسچین ہے جسے اپنی طاقت کا علم نہیں اور جو اپنی طاقت سے اتنا بے پروا، لاعلم سا ہو وہ اور زیادہ طاقتور معلوم ہوتا ہے۔

"تو بھائی، اپنی ماں کے باپ کا یہ آرڈر" کشن اندر داخل ہوا ہے 'میں نے اُس گنگا داس کے بچے سے کہا کہ سرکار' ہمارا کنٹی غریب بی اے پاس ہے۔ پر آپ کو دیکھ کر یوں سہم جاتا ہے مانو دماغ منہ میں آ گھیا ہو اور زبان تالو میں۔ بڑا خوش ہو کر کہنے لگا' جاؤ اُس سے کہو ڈرنے کی کوئی بات نہیں ——— بھائی میرے، میں صرف میٹرک ہوں۔ اگر تمہاری طرح بی اے ہوتا تو اس کالے چور سے ڈرنے کی بجائے اس سے گتھم گتھا ہو جاتا۔ اسے چاروں شانے چت گرا لیتا اور پھر یہاں پیٹ میں گھونسہ دیتا۔ یہاں دائیں جبڑے پر' بائیں پر ———" کشن جی ہی جی میں گنگا داس کو پیٹ پیٹ کر بہت خوش ہو رہا ہے گویا جو ابھی ابھی اس کی خوشامد کر کے آیا ہے اس کا بدلہ اتار رہا ہو۔

گنگا داس کا آرڈر حمید کے حوالے کر کے میں رام لعل کے آرڈر کا ٹرے اٹھا کر باہر لان کی طرف ہو لیا ہوں۔

"ارے او مسخرے" گنگا داس مجھ سے اس قدر اونچی آواز میں مخاطب ہوا ہے کہ دور سے جواباً رام لعل اس کی طرف دیکھنے لگا ہے (سات نمبر پر بڑی بھیڑ جمع ہو گئی۔)

گویا ابدی زندگی میں داخل ہونے سے پہلے میرا یہاں موت کے پڑاؤ پر رکنا ناگزیر ہو۔

"مسخرے ! کیا میں بچھو ہوں جو تمہیں کاٹ کھاؤں گا؟"

"یس سر!"

پروفیسر بترا اس کی بیوی گنگا داس کی بیوی ۔ سب ہنس پڑے ہیں ۔

"یس سر"! اس نے میری آواز کو دہرا لیا ہے ۔ "کیا بکواس ہے!"

"ہاں' کیا بکواس ہے؟" گنگا داس کے دفتر کے ہیڈ کلرک شیخ لعل نے سرکاری طور پر لال پیلا ہو کر اپنے افسر کی طرف سے مجھ سے باز پرس کی ہے ۔

اور شیخ لعل کی زرد زرد بیوی اپنے شوہر کی طرف تکٹکی لگا کر متعجب ہو رہی ہے کہ میرا میاں اتنی اونچی آواز میں کسی سے اپنی خفگی کا اظہار کر سکتا ہے ۔

"ساری سر" میں سات نمبر کی طرف بڑھ رہا ہوں' پہلے ذرا سست پھر تیز تیز ۔

سات نمبر پر ادھر ادھر سے کئی نئے لوگ چلے آتے ہیں ۔ سول سپلائز کا ڈپٹی سیکرٹری مسٹر براپنچے' مسز براپنچے اور مس براپنچے ۔ (مس براپنچے نے حسب عادت اپنے ہونٹوں کو یوں بھینچ رکھا ہے جیسے اسے ڈر ہو کر ذرا بھی کھلے تو اپ اسٹک کی تہ کا ستیاناس ہو جائے گا) وہ ٹھیکے دار کنول کشور اور رتن لعل جو پارٹنر ہیں ان دونوں میں سے ایک کی بیوی (وہ ہمیشہ ان دونوں کے ساتھ ہی کلب میں آتی ہے) وہ بوڑھا سائنسدان شری رام جسے حال ہی میں سرکار کی طرف سے کوئی اعزاز دیا گیا ہے اس کی جوان بیوی ۔ اُردو کا شاعر جاوید (اس کی بیوی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ کون بے وقوف لڑکی کسی پیشہ ور شاعر سے اور وہ بھی اُردو کے پیشہ ور شاعر سے شادی کر کے تمام عمر کے افلاس کا خطرہ مول لے گی ؟) اور انگریزی کا وہ زندوا جرنلسٹ رانا راؤ ـــــ یہ لوگ آس پاس اپنی اپنی خورد و نوش کی اشیا اور کرسیاں لئے یہاں چلے آتے ہیں ۔ اور تین چار میز جوڑ کر ایک اچھے خاصے جمگھٹے کی نشست کا اہتمام کر لیا ہے ۔

"سائنس! سائنس! سائنس!" بوڑھے سائنسدان کی جوان بیوی تنگ کر اپنے شوہر سے کہہ رہی ہے "میرا تو سائنس سے جی بھر گیا ہے ۔ جاوید صاحب' آپ کوئی پیاری سی تازہ غزل سنایئے"۔

"غزل تو سناؤں پر 'پیاری سی' کی شرط ذرا کڑی ہے"۔ شاعر کسرِ نفسی سے کام لے کر مسکرانے لگا ہے ۔

"آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سائنس سے شاعرانہ عشق کریں"۔ بوڑھے سائنسدان نے اپنا وسکی کا گلاس خالی کر کے کہا ہے ۔ "اور شاعری سے ـــ"

"سائنسی عشق!!" اس کی بیوی کے لہجے میں تمسخر ہے ۔ "نان سنس! کیا کوئی سائنسی ادراک سے محبت کر سکتا ہے؟ مجھے سائنس سے نفرت ہے کیونکہ سائنس نہ محبت کرتی ہے نہ نفرت ـــ"

"کچھ کرتی تو ہے مسز شری رام"! ٹھیکیداروں کی بیوی نے شوخی سے کہا ہے ۔

"کیا کرتی ہے ؟"

"بچہ پیدا کرتی ہے" ٹھیکیدارنی نے اپنا مفہوم واضح کرنے کے لئے شری رام کی طرف دیکھ کر ایک آنکھ میچ لی ہے۔

شری رام ہنسنے لگا ہے۔

"ہونہہ!" مسز شری رام نے گویا اپنے شوہر سے یہ کہنا چاہا ہے کہ تمہیں کیا پتہ کہ میرے بچے واقعی تمہارے بھی ہیں۔

"سنا ہے آنے والے زمانے میں بچے ماں کے پیٹ کی بجائے سائنس لیبارٹری میں شیشے کی ٹیوب سے جنم لیں گے۔"

ایک ٹھیکیدار نے دوسرے سے کہا ہے۔

"تو کیا بُرا ہے؟" مسز براینچے نے پوچھا ہے "اگر ہم میکانکی آلے سے مرغی کے انڈوں سے بچے برآمد کر سکتے ہیں تو کیا یہ ضروری ہے کہ انسانی بچے ماں کے پیٹ سے ہی پیدا ہوں؟" مسز براینچے نے اپنی وائٹ واتین کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا ہے۔

ریکا اپنی ہنسی کو دبانے کی کوشش میں مزید ہنس رہی ہے۔

"چپکے سے بیٹھو" مس کرسچین نے اس سے کہا ہے۔

جواب میں ریکا نے رام لعل کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس قدر سنجیدہ نظر آرہا ہے کہ فوراً اس کے مسخرا ہونے کا خیال آتا ہے۔

"ہمارا ملک پس ماندہ ہے۔" سول سپلائز کے ڈپٹی سیکرٹری مسٹر براینچے نے ٹھیکیداروں کی طرف سر گھما کر بات کرنے کے لئے اپنا سگار منہ سے نکال لیا ہے "مگر مغرب کے ترقی پسند لوگ اب اپنی صدیوں پرانی عادتوں کو بدل دینے کے درپے ہیں۔ مثلاً ——" بات کرتے کرتے وہ سگار کا کش لگانے کے لئے رک گیا ہے۔ "مثلاً وہاں کے مرد و زن شادی کرنے کی بجائے شادی کئے بغیر اکٹھا رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، ساری ساری عمر ایک ہی مرد یا عورت سے بور ہونے کی بجائے چند روز ہنسی خوشی سے گزار کر ہنسی خوشی ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاتے ہیں ——" اس نے پھر اپنے منہ میں سگار فٹ کر کے ایک کش لیا ہے۔ "کیا یہ سچ ہے" ڈاکٹر شری رام، کہ مغرب میں حال ہی میں ایک ایسی دوائی دریافت کی گئی ہے جسے پی کر آدمی دن میں عین اتنا ہی ہنستا ہے، روتا ہے، سوچتا ہے، پیار یا نفرت کرتا ہے جتنا اس کی صحت کے لئے ضروری ہو؟ ——"

"یہ دوائی مجھے لا دیجئے مسٹر براینچے۔" رانا راؤ ابھی تک انہماک سے کھا پی رہا تھا۔ "میں ہر شے ضرورت سے زیادہ کرتا ہوں اور دیکھو نا میری صحت کتنی گر رہی ہے۔ جی چاہتا ہے اپنے آپ کو گولی مار دوں۔"

"کیا آپ ملٹری میں ہیں؟" مسز شری رام نے رانا راؤ سے پوچھا ہے۔

"ہماری ملٹری بہت پاورفل ہے"!

"دنیا کی سب سے پاورفل ملٹری کس کی ہے؟"

"گنگا داس کا آرڈر؟! ——" میں اچھل پڑا ہوں اور گھبرا کر اس کی میز کی طرف آنکھ اٹھائی ہے۔ وہاں کش کھڑا ہے۔ اطمینان کا سانس لے کر میں پھر ان لوگوں کی بات چیت سننے لگا ہوں۔

"بھئی، آج اپنا رام لعل کیوں خاموش ہے؟" شری رام نے کہا ہے۔

"ہاں، رام لعل صاحب، آپ کیوں خاموش ہیں؟ کوئی جوک سنائیے نا" کنول کشور ٹھیکیدار نے کہا ہے۔

رام لعل نے اپنا جن کا گلاس ختم کر کے ان سب کا جائزہ لیا ہے۔

"اگر مجھے آپ کا جوک سن کر ہنسی آ گئی" کنول کشور ٹھیکیدار نے چیلنج کرنے کے انداز سے کہا ہے "تو میں ـــ"

رام لعل اسے ٹوک دیتا ہے "تو آپ ہم سب کو ایک ایک ڈرنک پیش کریں گے۔ ڈن؟"

"یس، ڈن!"

"تو ادھر آیئے، کان میں میرا جوک سنئے۔"

ٹھیکیدار اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے قریب آ جاتا ہے اور اپنا کان اس کے منہ سے لگا لیتا ہے اور پھر کان ہٹا کر بے تحاشا ہنستا ہوا اپنی جگہ پر آ بیٹھتا ہے۔

"ہو گیا بھئی" ٹھیکیدار نے آخر بمشکل ہنسی روک کر کہا ہے "بیرا، سب کے لئے ایک ایک ڈرنک لے آؤ اور رام لعل کے لئے دو لاؤ۔"

"اور میرے لئے ایک آئس کریم" ریحا کیونکر چپ رہ سکتی ہے؟ "اور پپا، آپ کے لئے؟ ـــ"

"نہیں بیٹی، دو نہیں، ایک ہی پلیٹ اور کافی ہو گی" بہرے کی ہاٹ ڈاگز کی دوسری پلیٹ بھی خالی ہو رہی تھی۔

"بیرا، جاؤ لاؤ!" ٹھیکیدار رام لعل کے لطیفے کا خیال کر کے بے تحاشا ہنسنے لگا ہے۔

"تم کیوں اتنی خاموش ہو بیٹی؟" مسٹر پرانجپے نے اچانک اپنی بیٹی کی جانب دیکھ کر پوچھا ہے اور پھر گویا وہ اس خیال پر چونک پڑا ہے کہ کہیں کسی سر پھرے کے عشق میں تو نہیں پھنس گئی "خاموش کیوں ہو؟"

مس پرانجپے جواباً سر ہلا کر دبے منہ مسکرا دی ہے۔

"لپ سٹک کی دریافت ہی اس لئے کی گئی تھی۔" شری رام نے مس پرانجپے کے باریک ہونٹوں پر لپ سٹک کی موٹی تہہ کا معائنہ کر کے کہا ہے "کہ عورت کے منہ پر کسی طور تالا ڈالا جائے۔ پر کیا فائدہ اپنی دھرم پتنی کو تو کھلے منہ رہنا ہی پسند ہے۔"

"تو تم ہی اپنے منہ پر تالا ڈال لو نا" اس کی بیوی نے جواب دیا ہے "بولو، کونسا لپ سٹک لاؤں؟ ـــ"

"ارے بیرا، جاؤ بھئی، لاؤ نا!" ٹھیکیدار متواتر ہنس رہا ہے۔

"رام لعل کا یہ جوک ہمیں بھی سننا پڑے گا" مسٹر پرانجپے نے اپنا سگار بجھا دیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ جوک سن کر ہی جاؤں مگر ٹھیکیدار نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا ہے اور میں جلد جلد بار کی جانب ہو لیتا ہوں۔ راستے میں میری اور اس کالے بھوت گنگا داس کی آنکھیں چار ہوتی ہیں۔

"آنکھیں چار ہونا، نظریں ملنا، محبت پیدا ہونا ـــ" مجھے اچانک ماسٹر گوبند رام یاد آنے لگا ہے۔ جو ہمیں چھڑی سے پیٹ پیٹ کر محاورے یاد کروایا کرتا تھا۔ مگر اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ محاوروں کا مطلب سدا ایک نہیں رہتا۔ کیا اس منحوس گنگا داس سے کوئی محبت کر سکتا ہے؟ ـــ گنگا داس کی بیوی اپنے شوہر سے ذرا پیچھے ہو کے پروفیسر بنرا کے عین سامنے بیٹھی ہے، شاید اس لئے کہ پروفیسر سے فلرٹ کرتے ہوتے اسے اپنا شوہر نظر نہ آئے۔ پہلے پہل جب شوہر اور بیوی کی آنکھیں چار ہوئی ہوں گی یعنی ٹکرا

ہوں گی تو اس ایکسیڈینٹ میں وہ بے چاری اندھی ہو کے رہ گئی ہو گی۔

"بیرا!"

گویا میں انسان نہیں ہوں بلکہ دو پہیوں کی خودکار مشین ہوں اور گنگا داس نے میرا بریک کا ہینڈل زور سے کھینچا ہے اور ٹھہر گیا ہوں۔

"کیا میں ہوّا ہوں جو تمہیں کھا جاؤں گا۔؟"

"یس سر! نو سر!"

گنگا داس کا سالا ہنسنے لگا ہے۔ "کیا ہوّا سفید رنگ کا ہوتا ہے جو آپ ہوّا نہیں ہو سکتے؟"

گنگا داس کی بیوی کی دبی ہوئی ہنسی بھی چھوٹ گئی ہے۔

"جاؤ میرا سگریٹ کا پیکٹ لاؤ۔"

"یس سر!" میں نے قدم بڑھا لیا ہے لیکن پروفیسر نیّر کی آواز سن کر رفتار سست کر لی ہے۔

"انسان کو ذہن دے کر قدرت نے اپنی اس مشین کو آٹومیٹک بنا دیا ہے۔"

"بیئرر!"

میں چار نمبر پر ٹھہر گیا ہوں۔

"نہیں، انسان اپنی کسی آٹومیٹک مشین کے مانند آٹومیٹک نہیں بلکہ قدرت اسے دھکّے دے دے کر چلا رہی ہے۔" یہ آواز مسز نیّر کی ہے۔

"مجھے یہ تسلیم نہیں۔" گنگا داس کسی سکوٹر کی طرح چٹ چٹ کرنے لگا ہے۔ "آج کا انسان آج کی مشینوں کی طرح آٹومیٹک ہے، تیز کار، خوشحال اور خوش شکل ہے۔" گنگا داس کی بیوی کی ہنسی کی آواز۔ "آزاد اور خودکار ہے۔"

"بہن" گنگا داس کا سالا بول رہا ہے۔ "ذرا اپنے شوہر کا بٹن دباؤ، دیکھیں بھلا یہ خودکار پہیّہ کے میل فی گھنٹہ چلتا ہے۔"

"خودکار پہیے ریلوں پر چلتے ہیں یا سڑکوں پر۔"

"ہاں" پروفیسر نے اپنی بیوی کی ہٹ سے خوش ہو کر اس کی بات کو فوراً آسمان سے اترتے ہوتے گیند کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ "اور ان سڑکوں اور ریلوں کے راستے اور منزلیں سدا ایک رہتی ہیں۔ وہی پرانی منزلیں مانو انسان کا علم اسے جہالت اور تاریکی کی طرف سرپٹ دوڑا رہا ہے۔"

"ہہ ہہ ہا ہہ —— ہہ!"

نمبر سات پر قہقہوں کی بارش ہونے لگی۔

"رام لعل کا وہ لطیفہ؟" میں جلدی جلدی بار کاؤنٹر کی طرف چلنے لگا ہوں۔

"حمید بھائی جلدی کرو۔"

میں آرڈر کا سامان ٹرالی میں سیٹ کرنے میں جُٹ گیا ہوں۔

"مس بھجنگ کے لئے سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی نکالو ——— ہری تم بوڑھے کرسچین کی ہاٹ ڈاگز کی دو پلیٹوں پر حیران ہو رہے تھے! لاؤ وہ ایک اور مانگ رہا ہے ——— جلدی کرو! لاؤ رم اور وہسکی اور برانڈی اور وائیٹ وائین کی بوتلیں ہی رکھ دو۔ میں وہیں ناپ کر گلاسوں میں انڈیل دوں گا۔ ارے بھئی جلدی کرو!"

میں چار پہیوں کی ٹرالی کو باہر لان میں اتار لیتا ہوں اور اس کا ہینڈل تھامے سات نمبر کی طرف چلنے لگتا ہوں۔

سات نمبر کے آس پاس چند اور لوگ جمع ہو گئے ہیں۔

"لیجئے سر" گنگا داس کی میز پر سگریٹ کا پیکٹ رکھ کر اس کی جانب دیکھے بغیر میں نے ٹرالی کو آگے دھکیل لیا ہے اور سات نمبر پر مس کرسچین کے بازو میں آ کھڑا ہوں۔

"لو بھائی، سب کی ڈرنک آ گئی۔ دوسرے ٹھیکیدار رتن لعل نے کہا ہے "مسٹر رام لعل! اب آپ ہم سب کو وہ لطیفہ سنا دیجئے جسے سن کر میرا پارٹنر اب تک ہنسے جا رہا ہے"

"چھوڑیئے، کوئی ایسا خاص لطیفہ نہیں" رام لعل بدستور نہایت متین نظر آ رہا ہے۔

"اچھا مجھے بھی کان ہی میں سنا دیجئے" ٹھیکیدار کنول پرشاد کا پارٹنر ٹھیکیدار رتن لعل رام لعل کے پاس آ گیا اور اپنے کان اس کے منہ سے لگا دیتے ہیں اور پھر ہنس ہنس کر دوہرا ہونے لگا ہے۔

ان دونوں کو ہنستا پا کر ان کی عورت بھی بلا وجہ ہنسنے لگی ہے جیسے کسی دوسرے ہارمونیم کے ساتھ تان پورا بج رہا ہو، اور پھر نشے میں لہراتے ہوئے کئی دوسرے لوگوں کے دلوں میں بھی ہنسنے کی ترنگ اٹھی ہے اور سالم آرکسٹرا عمل میں آگیا ہے۔

ان کی بڑھتی ہوئی ہنسی کا تماشا کر کر کے رام لعل مزید سنجیدہ ہوتا جا رہا ہے، جیسے چند مسخروں میں گھرے ہوئے کسی فلسفی کی کلبیت آمیز سنجیدگی گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔

"کیا یہ لوگ مجھ پر ہنس رہے ہیں؟"

"نہیں ڈیڈی" ریما نے اپنے باپ کو جواب دیا ہے۔ "اپنے آپ ہنس رہے ہیں، کسی جوک پر۔"

"کیا؟"

"جوک، جوک، ڈیڈی"

"سوگ! میں نے کب کہا ہے کہ سوگ میں نظر آئیں۔ مزے سے ہنسیں کھیلیں، مجھے کیا؟"

ریما نے اپنے بوڑھے باپ کو نظر انداز کر کے رام لعل کے چہرے کی طرف دیکھا ہے۔ اور پھر گویا اس کی متانت سے گدگدی محسوس کر کے ہنسنے کی خواہش کی تاب نہیں لا سکی ہے۔

"اتنا ہنس کیوں رہی ہو؟" مس کرسچین خود آپ بہت کم ہنستی ہے اور جب ہنستی ہے تو جانے کیوں کچھ ایسا بے چین سا احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ ہنس نہیں رہی، بلکہ اپنے دانتوں کی خوبصورت سفیدی دکھا رہی ہے، اور جب اس کے پیارے سے

نت تماشائی کی نظر کا مرکز بن جاتے ہیں تو وہ اپنا منہ بند کر لیتی ہے اور بیچارے تماشائی کی چاہ اس کے منہ میں محبوس ہو کر رہ جاتی ہے۔ اپنی موجودہ ٹوتھ پیسٹ کمپنی میں مینیجر بننے سے پہلے وہ کہیں ماڈل گرل تھی، اس لئے خواہ وہ ہنس رہی ہو، خواہ رو رہی ہو، اور خواہ نہ ہنس رہی ہو اور نہ رو رہی ہو، ہر پوز میں اسے پیشہ ورانہ کمال حاصل ہے یا شاید خوبصورت چہرے ہر پوز میں بھلے معلوم ہوتے ہیں، یا شاید اس کی خوبصورتی بھی اس کے پیشہ ورانہ پوز کا ہی کمال ہو۔ سر جھکا کر اس کے گلاس میں رم انڈیلتے ہوئے میں بوکھلا سا گیا ہوں۔ اور میرے چہرے کا بایاں پروفائل اس کے منہ کے اتنا قریب ہو گیا ہے کہ اس کے سانس ——— ان سانسوں میں ایک عجیب بے نام سی مہک رچی ہوتی ہے ——— میرا گال چھونے لگے۔

"اوپر کیوں چڑھے آ رہے ہو کنگ؟" مس کرسچین کی آواز سن کر میرے چہرے میں مجرمانہ سرخی سمٹ آتی ہے۔

سب لوگ ہنس رہے ہیں، مانو مجھ ہی پر۔ انہیں اس طرح ہنستا پا کر مجھے اپنے عشق کی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا ہے۔ آدمی بے مایہ ہو تو اس کی محبت مسخرہ پن سے کم نہیں۔ مفلس کو ایک سو پینتیس روپے اسی پیسے ماہوار ——— یہ میری تنخواہ کی رقم ہے ——— سے غرض ہے۔ محبت کے عزو بن کی قیمت تو کلب کے سینکڑوں کے بلوں سے بھی بھاری بھر کم ہوتی ہے، پھر غریب بے چارہ تنگی چھپی محبت کر کے آخرش جیل نہ جائے گا تو کیا کسی بھرے سسر کا داماد بنے گا؟

"ہہ ہا ہہ ہہ ——— !"

میں منہ لٹکائے کھڑا ہوں اور وہ سب لوگ جیسے میرے ذہن میں اپنی اپنی کرسی کی ٹانگیں کھو کر ٹھاٹھا ہنس رہے ہیں اور میرا جی چاہ رہا ہے کہ اپنا سر جھٹک کر سب کو وہاں اپنی اپنی نشست سے اٹھا دوں، مس کرسچین کو بھی، سب فراڈ ہیں، مس کرسچین بھی فراڈ ہے۔ فلرٹ ہے۔ ہر شام کو دو پلیٹ مٹن کٹلس کھانے، ایک گلاس وائٹ وائن پینے اور ایک یا دس عدد مردوں سے فلرٹ کرنے یہاں آتی ہے اور رات کو گھر جا کے اپنے اس بھورے کتے کے ساتھ سو جاتی ہے۔ "شٹ اپ!" میں نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو ڈانٹا ہے "شٹ اپ!" کلب کے ممبروں کی بھانت بھانت کی تھوڑی تھوڑی شراب پی پی کے اب تک میں کوئی ڈھائی یا تین دوہرے ڈبل تو چڑھا چکا ہوں گا۔ مس کرسچین فراڈ ہے! شٹ اپ! ———"

"ہہ ہہ ہا ہہ ——— !" سب ہنس رہے ہیں، دونوں ٹھیکیدار رام لعل کے لطیفے کا خیال کر کر کے چندا وڑ یہ سوچ سوچ کر کہ وہ لطیفہ واقعی بڑا پُر لطف ہوگا۔ چندا وڑ یونہی انہیں ہنستا دیکھ دیکھ کر، اور چندا وڑ نشے کے عالم میں۔ رام لعل بدستور بڑا متین نظر آ رہا ہے اور اسے دیکھ دیکھ کر خیال آ رہا ہے کہ گویا اسٹیج پہ ہے اور بڑی پیشہ ورانہ سنجیدگی سے اس نے اپنا کوئی کمال دکھایا ہے اور سب تماشائی لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔ یہ سماں دیکھ دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ لگتا ہے کہ اس کے تماشائی نرے پورے مسخرے ہیں اور وہ تماشائی، کہ وہ اسے نہیں دیکھ رہے، بلکہ وہ ان سب کو دیکھ دیکھ کر غور و خوض کر رہا ہے کہ بے معنی ہنسی ہنستے ہوئے انسانوں کے چہرے جانوروں کے چہروں کے مانند ایکسپریشن سے عاری اور مضحکہ خیز کیوں ہو جاتے ہیں۔

"تم کیوں نہیں ہنس رہے، رام لعل؟"

"میں صرف اسٹیج کا مسخرہ ہوں۔ آپ لوگوں کی طرح چوبیس گھنٹے کا مسخرہ نہیں۔"

"ارے ذرا ٹھہرو، میری —" لالہ اور اس کی بیوی بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر یہیں آ گئے ہیں۔

"بڑھاپے میں پرانی بیویاں اتنی بور لگتی ہیں کہ انہیں ماں کہنے کو جی چاہتا ہے۔" انگریزی کا جرنلسٹ رامارا ؤ بوڑھے مسز کرسچین کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر اس سے مخاطب ہوتا ہے۔

"آپ مسز کرسچین کو آج اپنے ساتھ کیوں نہیں لاتے مسٹر کرسچین؟"

بہرہ ہنسنے لگتا ہے۔ میری بڑی بیٹی میرے ساتھ ہو تو میں ہر جگہ "ایٹ ہوم" محسوس کرتا ہوں۔

"اچھا، اب بتاؤ رام لعل" سول سپلائز کا ڈپٹی سیکرٹری مسٹر پرانچپے پوچھتا ہے "وہ کیا جوک تھا؟"

"آیئے آپ کے بھی کان میں بتائے دیتا ہوں۔"

"نہیں، سب کو سناؤ!"

"ہاں، سب کو! سب کو!"

"تو لو سنو، میرا کیا بگڑتا ہے؟"

سب ہمہ تن گوش ہو گئے

"میں نے ان دونوں ٹھیکیداروں سے کہا تھا کہ اگر تم ہنس دو تو مسٹر پرانچپے سے تمہارے ٹھیکے کے ٹنڈر منظور کرانا میرے ذمے! ——"

ڈاکٹر برق (میری ایک پسندیدہ شخصیت)

سیّد عبد الباقی

ڈاکٹر برق کا نام سب نے سنا ہوگا لیکن سب نے انھیں دیکھا نہ ہوگا۔ اگر کسی نے ان کو دیکھا ہے تو شاید ان کا نام نہ سنا ہوگا۔ اور اگر اتفاق سے کوئی ان کے نام کا واقف ہوا اور انھیں دیکھا بھی ہو تو انھیں سمجھا نہ ہوگا۔ کیوں کہ یہ بات بہت عام ہے کہ زندہ اور چلتا پھرتا آدمی کم سمجھ میں آتا ہے اور پس مردن سب ہی اس کو سمجھنے لگتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ نے تینوں شرطیں برق صاحب کی پوری بھی کر لی ہوں تو مجھے یقین ہے، آپ نے اُن کے ساتھ برج نہ کھیلی ہوگی۔

مجھے بھی ان کا نام معلوم نہیں اور کسی کو ان کا نام معلوم کرنے کی نہ جانے ضرورت کیوں پیش نہیں آتی کیونکہ یہاں ہر شخص جب کہتا ہے "ڈاکٹر صاحب" تو اس سے بلاشبہ ڈاکٹر برق ہی مراد ہوتے ہیں۔ البتہ نہایت پرانی سی پیتل کی ایک سیاہ تختی ان کے صدر دروازے پر لٹکی ہوئی ہر آنے جانے والے کی طرف حسرت سے تاکتی رہتی ہے کہ کوئی اُسے پڑھے اور سمجھے کہ وہ کس شخصیت کی نشاندہی کر رہی ہے۔ اس تختی کو میں نے بغور کبھی نہیں دیکھا اور شاید ہی کسی نے اس پر توجہ دی ہوگی — پر اس قدر کہ اس پر آپ G. J. Barq. Ph.D. لکھا ہوا پائیں گے۔ قیاس ہے کہ G. J. کے اختصار سے Great Journalist یا [illegible] of [illegible] بھی مراد ہو سکتا ہے۔

ہر شام نماز مغرب کے فوراً بعد کیمبل پور کے ایک بلاک سے جسے برق بلاک کہتے ہیں۔ ایک شخص ہاتھ میں بائیسکل تھامے کواڑ کو دھکیل کر کھولتا ہے، اور سائیکل کو سڑک پر کھینچ کر بغیر ایک اینچ پیدل چلے سوار ہو کیمبل پور کی مخصوص اور نورانی شام میں تیرتا ہوا کلب کی طرف جاتا ہوا دکھائی دے گا۔

یہی ڈاکٹر برق ہیں۔

معاف فرمائیے — کیا یہی ڈاکٹر برق ہیں؟

۵۶ء میں خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک قابل پرنسپل نے راقم الحروف کے لئے نہایت ضروری سمجھا کہ وہ کیمبل پور تبدیل کر دیا جائے اس لئے وہ ان کی کوششوں سے یہاں پہنچا۔ میرے تبادلہ کے موقع پر، میرے اکثر دوست احباب کیمبل پور کی شکل بنا بنا کر مجھ سے کثیر ہمدردی کا دلی اظہار کرتے تھے لیکن میرے ایک رفیق ایسے بھی تھے جو میرے تبادلہ کیمبل پور پر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے میرے کیمبل پور تبادلہ پر مجھے مبارکباد پیش کی۔ جیسے میں صرف اپنی خوش نصیبی اور اللہ تعالےٰ کے خاص فضل و کرم سے تم بک ٹو جیسے انٹرنیشنل اور کاسمایالی ٹن شہر کو انتقال کر رہا ہوں۔ پھر انہوں نے مجھے اپنے مخصوص انداز میں ڈاکٹر صاحب سے غائبانہ متعارف فرمایا۔ اور میرے حال پر نہایت کرم نوازی فرماتے ہوئے، ذیل کے مضمون کا ایک تعارفی خط بھی سرفس میل سے برق صاحب

کے نام سپردِ خاک کیا ۔

بھائی برق صاحب!

ایک چیچ بھیج رہا ہوں ۔ رسید سے مطلع فرمائیے ۔

ایک شے

غلام محی الدین مرزا

تو اس طرح ایک شے نے کیمبل پور کو ایک چیچ بھیج دی ۔

رات بھر کا سفر تھا ۔ برتھ پر نیند نہ آئی تو لیٹے لیٹے یہی سوچتا رہا کہ کیمبل پور کیا شے ہوگی اور برق صاحب بھی کیا چیز نہ ہوں گے ۔ دن نکل آیا تو میری پیشانی تلے کیمبل پور پہ ۲ مارچ کا سورج سونا بکھیر رہا تھا ۔ کٹورہ سا خوبصورت شہر صبح کی مہتابی میں مسکرا کر مجھ سے کہنے لگا ۔ آؤ ۔۔ آ جاؤ پروفیسر ہم کوئی کاٹنے والی چیز نہیں ہیں :

میں دل میں خوب خوب شرمندہ ہوا ۔۔ اتنا پیارا شہر جیسے کوئی مرزا غیاث اپنی ننھی منی مہرالنساء کو شاہراہ عظیم کے کنارے سنہری ریت پر چھوڑ کے آگے بڑھ گیا ہو ۔ برلب جو ایسی لطیف ہوا اتنے پیارے پیارے نشیب و فراز ۔ ایسے موڑ زندگی میں کہاں اور کب آتے ہیں یہ کیمبل پور میرے احباب کے تصورات سے کس قدر مختلف تھا ۔

رہائش پر پہنچ کر پہلے برق صاحب کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کہیں قریب ہی رہتے ہیں ۔ دس بجے اُن کے مکان پر پہنچا ۔ دروازہ پر دستک دی اور جواب کا انتظار کرنے لگا ۔۔ پندرہ سیکنڈ بعد ننھی منی سی گڑیا کی ایک شہزادی نے دروازے کی اوٹ سے سر نکال کر کچھ دیر مجھے بغور دیکھا پھر کہا " بابا معاف کرو "

میں نے کہا : چندا ہم کوڑی معاف نہیں کیا کرتے ۔ جاؤ اپنے آبا کو بھیج دو ۔ بھلا ہو وہی " گڑیا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور غڑاپ سے دروازے کے اندر چلی گئی کھٹاک سے دروازہ بند ہوگیا ۔

میں برق صاحب کے بارے میں یہی کچھ سمجھتا تھا ۔ کہ وہ منحنی سے نرم و نازک بلند و بالا پیشانی والے دراز قامت نہایت سڑیل قسم کے سنجیدہ اور سینئر پروفیسر ہوں گے ۔ پان ضرور کھاتے ہوں گے اور یہ قیاس تھا کہ چہرے پر ہلکی سی داڑھی بھی ہوگی ۔ جو پان نہ کھاتی ہو تو شوربہ ضرور چکھتی ہوگی ۔ آنکھوں میں سُرمہ پہنے بالوں میں مہندی رچائے کاندھے پر رومال ڈالے عطر عنبر میں ڈوبے ہوئے بنفس نفیس دروازے سے دنق افروز ہوتے ہوئے مجھ سے بہ آواز بلند فرمائیں گے السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ " تب میرے ساتھ کیا ہوگا ۔ مجھے قدرے وحشت ہونے لگی ۔ میں کیا جواب دوں گا ۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ؟

یہ جواب مجھے مناسب معلوم نہ ہوا کیونکہ اس کے معنی مجھے اچھی طرح معلوم نہیں تھے ۔ اس لئے میں نے اپنے حواس کو یکجا کرنے کی کوشش کی تو جو بات فوراً میرے سمجھ میں آئی وہ یہی تھی کہ میں فوراً وہاں سے بھاگ کھڑا ہوں گا ۔ اس لئے میں نے گلی کو بغور دیکھا یہ گلی ایک طرف اپنی وسعتوں میں کالے پہاڑ تک اور دوسری طرف اصلاح گیسو والے ہیئر ڈریسر اور گرم حمام پر جا کر رک جاتی تھی گلی کے ہر دو.

کنارہ سے مایوس ہو کر میں نے فیصلہ کیا ایسا کرنا مناسب نہیں کیونکہ کل سے کالج میں ان سے ملاقات پیہم کا باب کھلنے والا ہے، یہاں سے ہم بھاگ بھی نکلے تو وہاں سے بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ اس پہ دل نے کہا کہ اے شخص —— تو کہو وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ امّا بعد واجازتہٗ

اب مجھے ایک جیّد عالم، تجربہ کار پروفیسر، مشہور ادیب اور ملک کے ایک فلسفی مفکر سے ملاقات کرنی تھی دریں حالات کہ خاکسار کو صرف اس قدر معلوم تھا کہ واٹر کا کیمیائی فارمولا ایچ ٹو او (H_2O) ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ غلام محی الدین مرزا میرے حقیقی دشمن نے بھی برق صاحب کو خط لکھ کر مطلع کر دیا تھا کہ چیچ بھیج رہا ہوں۔ اب میرا دم گھٹنے لگا تو میں نے گلی میں ادھر ادھر نظریں چیر دوڑائیں۔ تاکہ میری توجہ کہیں اور منعطف ہو تو اختلاج قلب میں کمی آئے۔ اب مجھے ڈاکٹر صاحب کے مکان کے ساتھ بندھی ہوئی دو بھینسیں نظر آئیں وہ دونوں بہنیں گھور گھور کر مجھے دیکھتی ہوئی جگالی کر رہی تھیں۔ گویا مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ بھائی تو یہاں کیا لینے آیا ہے —— دیکھتا نہیں کہ ہم یہاں کتنی مدت سے بندھی ہیں پھر بھی بھینس کی بھینس ہیں۔ میں بھینس کے ان خیالات اور تجربے سے خوش ہو رہا تھا کہ۔

ادھر دروازہ کھلا ——

ایک سیکنڈ دو سیکنڈ دفعۃً ذہن کے پردہ خیال کو شدید دھکا لگا اور میں نے خود کو ایک کابوس سے چونک کر ایک حسین شخصیت کے روبرو پایا۔ ایک ایسی دلاویز مسکراہٹ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے نمودار ہوئی جس میں یگانگت کا رس اور محبت کا چلتا ہوا جادو مضمر تھا۔

آؤ بھائی باقی۔ میں تمہارا ہی منتظر تھا۔ آئیے ہم اوپر چلیں۔ مری سمجھ میں بجز اس کے اور کچھ نہیں آیا کہ جیسے ہم مدتوں کے بچھڑے ہوئے اتفاق سے دفعۃً اس جگہ آمنے سامنے ہو گئے ہوں۔ ہم زینہ طے کرتے ہوئے اوپر منزل کی طرف جا رہے تھے چھ سات براق سفید کبوتر منڈیر پہ بیٹھے اپنے پروں کو سنوار رہے تھے۔

میں پیچھے پیچھے برق صاحب آگے آگے، زینہ طے ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کبوتر میری طرف متوجہ ہوئے۔ میرے راستے سے کافی ہٹے ہوئے ہونے کے باوجود انہوں نے ضروری سمجھا کہ احتیاطاً ایک آدھ گز کا فاصلہ اور دے دیا جائے چنانچہ وہ سمٹ کر مجھ سے بہت ذرا اور پرے کو۔ اکٹھے ہو گئے۔ جیسے انہوں نے انسان پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ مجھے ہلکی سی خفت کا احساس ہوا تو غیر شعوری طور پہ میری انگلیوں کے درمیان سلگتا ہوا سگریٹ نیم دائرے میں چکر کاٹتا ہوا ہونٹ پہ آ لگا۔ کبوتر ایک دم پھڑپھڑا کر ہوا میں معلّق ہو گئے۔ ہم زینہ طے کر چکے تھے۔ برق صاحب نے پلٹ کر کبوتروں پر پھر ایک نظر مجھ پہ ڈالی۔

"کبوتر ہیں"۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

"جی ہاں بہت ہی پیارے پیارے"۔ میں نے جواب دیا۔

غٹر غوں۔ غٹر غوں۔ یہ بھی کیا چیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"یہ بھی کیا چیز ہے" یہ سن کر میں ایک دم سرد ہو گیا محی الدین مرزا کا خط کھلا ہوا میز پہ پڑا تھا۔ یا اللہ اب کیا ہو گا! ؟ مرزا کا خط کہیں راستے میں غارت نہیں ہوا!!!؟

اب میں خود کو سپرد خاک ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا "غلام غلام ..... مرزا ..... کو ..... آپ ..... ؟ غلام کو آنکھیں پیچھے

ہم کچھ پیچھے ترتیب دیتے وقت میری آواز میں ایک نمایاں کبوتریت پیدا ہو گئی " ڈاکٹر صاحب ذہین آدمی ہیں یا نہیں اس کے قطع نظر اس وقت خدا سنے ہر ان کی ضرور رہبری فرمائی ہو گی کہ میرا مطلب ان پہ واضح ہو گیا چنانچہ انہوں نے فوراً مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "جی ہاں — مرزا صاحب ن م راشد کے سالے ہیں ایک دفعہ مجھ سے کہیں ملاقات ہوئی تھی " — "اجی صاحب" میں نے دل میں کہا " دو چار مرتبہ ملاقات ہوتی تو آپ کو بھی کچھ پتہ چلتا کہ وہ ن م کے سالے ہیں یا بے دال کے کچھ اور " مرزا کے بارے میں ایسا سہرا سن کر میرے دل کا بار بہت کچھ کم ہوا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔" جی ہاں درست ہے " اس مرتبہ آواز کو ہمت کے ساتھ بلند کرنے کی پوری کوشش کی گئی تو آواز بکری کی طرح پھٹ گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے میری طرف بغور دیکھا تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"جی نہیں — م ن راشد امریکہ میں ہیں "

"جناب عالی!" ڈاکٹر صاحب نے کچھ اس طرح فرمایا کہ میں سمجھا کہ وہ فرماتے ہیں شمالی۔

"جی ہاں — جنوبی " میں نے فوراً عرض کی۔

ہنسی کو روکتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے منہ سے دھوئیں کا ایک ہلکا سا پٹاخہ سر ہوا —

اب برق صاحب نے تو یقین ہی کر لیا ہو گا کہ یہ کوئی چیز نہیں ضرور ایک چیچ ہے،

اب میرا ذہن تاریک ہو گیا اور نظروں کو تمام کمرے میں ہر طرف چیچیں ہی چیچیں دکھائی دینے لگیں۔

ڈاکٹر صاحب ایک منٹ کی اجازت لے کر نیچے گئے۔ میں نے پسینہ پونچھا۔ دو چار سانسیں گہری لیں اور اچھی طرح گلا صاف کیا اور دوسرے راؤنڈ کا انتظار کرنے لگا۔

چائے آئی — چائے پی گئی تو حواس یکجا ہوئے۔

" آج کل کیا کام ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب " میں نے کہا۔

" بھئی یہ دیکھئے بورڈ اور یونیورسٹی کے پرچے پڑے ہیں۔ آدھے دیکھ لیے ہیں آدھے باقی ہیں۔ سخت بور ہو رہا تھا۔ شکر ہے، آپ تشریف لے آئے۔

گفتگو کا انداز اور بہاؤ خوب صورت موضوعات کی لہلہاتی وادیوں میں اتر آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے علم و فضل کا دریچہ کھول دیا جس سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں روح کو تازگی اور دل کو سرور بخشنے لگیں۔ دوپہر کے قریب میں اپنی رہائش پہ لوٹا تو رات کی تھکن اور کوفت دور ہو چکی تھی۔

کلین شیو، بھاری بھرکم جسم، میانہ قد، فراخ پیشانی گفتگو کے دوران میں تلوار کی طرح چلتی ہوئی بھنویں۔ آنکھیں ایسی جیسے کسی نے دو بڑے بڑے کاغذی بادام ملا کر رکھ دیئے ہوں ستواں ناک اور کشادہ نتھنوں کے نیچے بھرپور ہونٹ اور ایسی ٹھوڈی جیسے سنگِ ماق کی ایک تراشیدہ سل، اور ان سب کے اوپر ایک ایسا سر جس کی ساخت ذہانت کا پتہ دیتی ہے۔ دمخہ نیجہ ایسا گویا مولانا کبھی بٹیر پالتے اور مرغی کے انڈوں کو ہاتھ سے سہہ کر انھیں مرغ نکالتے اور لڑاتے ہوں گے۔ اہرامِ مصر شاید ایسے ہی ہاتھوں نے بنایا ہو گا۔ ایسے ہاتھو

نے زندگی کے کتنے کٹھن مسئلے ڈالے ہوں گے۔ ان کی روداد ان ہاتھوں کی لکیروں اور تحریروں میں پڑھی جا سکتی ہے۔ چال میں ایک وجاہت اور ایک ایسی تمکنت کہ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئی۔ کاش اس کے لئے کوئی لفظ ہوتا یا تشبیہہ ہی مل جاتی۔ ایک انوکھا پن ایک دھیرج، ایک ٹھہراؤ، اٹھتا ہوا ہر قدم زندگی کی کٹھن منزلوں اور اس کی تلخ حقیقتوں پر ایک گہرا طنز ہوتا ہے۔

برق ایک زندگی ہے، ایک طرزِ زندگی بھی اور مرنے کا ایک اسلوب بھی۔ ایک رقصِ شرر یا ایک کرن جو دل میں داخل ہوئی اور وہیں رہ گئی۔ اب جب وہ باتیں کرتے کرتے ایک گہری سانس کے بعد خاموش ہو جاتے ہیں تو ان کے اندر کا تلاطم ان کے چہرے پر ابھر آتا ہے۔ پھر جب اللہ کی بھرپور صدا لگاتے ہیں تو اندر کی کسک گم ہو جاتی ہے۔ اور پھر دیکھئے کوئی شیرینی و خوش اندازی گفتار۔

آج سے نصف صدی پہلے اس ضلع کے ایک فاضل اجل مولانا گلاب شاہ کا فیض کیمبل پور میں جاری تھا۔ آپ ایک صاحب نظر بزرگ تھے۔ ان کے حلقۂ فیض میں ایک چھ سالہ لڑکا آج سے ساٹھ سال پہلے داخل ہوا۔ مولانا بیک وقت تیس چالیس طالب علموں کو مختلف علوم سے مالا مال فرماتے۔ کوئی گلستان پڑھ رہا ہے، تو کوئی ہدایہ کوئی منطق پڑھ رہا ہے تو کوئی فلسفہ، کوئی علم حدیث تو کوئی تفسیر۔ اس نوخیز طفل کو حکم ہوا کہ جب مولانا صبح کو جنگل کی طرف نکلیں وہ پیچھے پیچھے کتاب پڑھتا جائے۔ مولانا اس کی تشریح فرماتے جائیں گے۔ یہ چھ سالہ لڑکا اس طرح زندگی میں داخل ہوا۔ اپنے تمام رفیقوں میں سب سے چھوٹا ہونے کے سبب اسے اکثر گاؤں سے روٹیاں جمع کرنے کی خاطر بھیج دیا جاتا۔ جب اسے ایک گھر سے ایک روٹی ملتی تو اس گلی کا کتا اس کے پیچھے پڑ جاتا۔ یہ روٹی اس کے آگے پھینک کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ دوسرے مکان سے ایک روٹی ملتی تو اگلی گلی کا کتا اس کا منتظر رہتا۔ یہ حضرت نصف روٹی تو خود چٹ کر جاتے اور نصف اس کتے کی نذر کر کے تیسرے گھر کا رُخ اختیار کرتے۔

دو گھنٹوں سے اس کی نذر روٹی کھیل میں پانچ سات کتے اور یہ لڑکا سیر ہو چکے ہوتے اور جو روٹیاں اس کے بعد بچ رہتیں وہ انہیں لے کر اپنے دوستوں تک پہنچتا۔ وہ علم کے پروانے نانِ جویں پر ٹوٹ پڑتے ۔۔۔ اس بچے کو عموماً کہا جاتا۔

”پرے بیٹھو ۔۔۔ تو بہت کچھ کھا پی آیا ہے۔“

تو ایک پٹھان کہتا۔

”بس جی ۔۔۔ اُدھر کا آیا ہے، تو خو کیا ہوا۔ اب ادھر نہیں کائے گی اس کو بیٹھنے دو۔“

وہ مدرسہ وہ فرشتہ استاد وہ ایک پاکیزہ روح جو گھر اپنے سکول کے بچوں کے لئے خوشی خوشی پکاتا اور ان کے انتظار میں اپنا دروازہ کھلا رکھتا۔ اب صرف تاریخ اور جغرافیہ کے کرم خوردہ اوراق میں ۔۔۔۔۔۔ وہ کتا تا ہنوز کتا ہی ہے، جس نے جانی سے دھمکا کر روٹیاں وصول کی تھیں۔ وہ جانی اب ڈاکٹر برق ہے۔ ڈاکٹر برق نے مولانا گلاب شاہ کے مکتب سے گورنمنٹ کالج تک ایک طویل سفر کیا ہے راستے میں نیلا گنبد اور پنجاب یونیورسٹی بھی آئے اور گزر گئے۔ اب گورنمنٹ کالج بھی گزر گیا ہے۔ اور ایک ایسی منزل آ گئی ہے، جہاں ڈاکٹر برق بذات خود ایک ([illegible]) ہیں۔ گلاب شاہ کا مدرسہ نیلا گنبد پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج۔

انگریزوں کی حکومت سے پاکستان تک۔

سعدی سے برٹرینڈرسل تک
نیلے گنبد سے پنجاب یونیورسٹی تک
ریش سے کلین شیو تک
برج سے تہجد تک
آدھیم حبشی سے سکھوں کے لطیفوں تک
انگریز پرستی سے انگریز دشمنی تک
انگریزی زبان کے دبدبہ سے اردو زبان کی سحر کاریوں تک
اندھیرے سے اجالے تک
طالب علم سے پروفیسر تک
بیگانگی سے یگانگت تک
شر سے خیر تک
بوجہل سے مصطفیٰ تک

ایک طویل مسافت ڈاکٹر برق نے طے کی ہے۔ ہر منزل ان کی کتاب زندگی کا صرف ایک ایک باب نہیں بلکہ ایک ایک کتاب ہے، یا چھوٹے چھوٹے کتب خانے جس میں زندگی کا راز طشت از بام ہوتا ہے، تو حیات رسوا نہیں ہوتی بلکہ نکھرتی سنورتی اور قبلہ رو ہو جاتی ہے،

اب ڈاکٹر برق تھکے تھکے سے دکھائی دیتے ہیں تو دل بیٹھ جاتا ہے اور جب شعلہ کی طرح بھڑکتے ہیں تو گم کردہ راہ منزل کا پتہ پاتے ہیں یہ بات انہوں نے کیونکر حاصل کی — ہزاروں بار بھٹک کر۔

ہزاروں فریب کھا کر
ان گنت چھالوں سے خار مغیلاں کی پیاس کو بھڑکا کر۔
زندگی سے دست گریباں ہو کر
وقت کو منا کر اس کی گلے میں باہیں ڈال کر
یہی ہے حدیث زندگی جو میں نے ان سے سنی
وما علینا الا البلاغ ۰

ڈاکٹر صاحب کو ایک بلند پایہ مصنف اچھے شاعر اور پختہ کار فلسفی کی حیثیت سے اہل فکر و نظر جانتے ہیں۔ لیکن یہ بات بہت سوں سے چھپی ہوئی ہو گی کہ ڈاکٹر صاحب کیسے رفیق، کیسے دوست اور بزم احباب میں کیا کچھ ہیں۔

ان کی طبیعت کا مزاح حقیقت میں زندگی کی تلخیوں کا ایک استہزاد ہے، وہ ہر اس حادثہ کا جو جان گسل ہوتا ہے، مذاق

اُڑاتے اور اُسے بہت لائٹ پینے کے عادی ہیں۔

ایک مرتبہ ایسا ہُوا کہ اُن کی نوشی دامنہ صاحبہ کے انتقال پر ہم لوگ اُن کے ساتھ قبرستان گئے، تدفین کے بعد ہم لوٹ رہے تھے کہ برقی گورستان کے دروازے پر رک گئے ہم دونوں نے سگرٹ سلگائی اور کھڑے ہو کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

" یار — اب کون جائے یہاں سے۔ آخر یہیں تو آنا ہے — آؤ ہم کوئی پرانی قبر ڈھونڈیں، جہاں جگہ خالی ہو لیٹ جائیں۔"

" میں ذرا تاش کی دو چار گڈیاں کلب سے اٹھا لاؤں آپ کچھ دیر میرا انتظار کیجیے۔" میں بولا

ڈاکٹر صاحب نے اپنا مخصوص قہقہہ بلند کیا اور ہم وہاں سے چل پڑے مجھے اس واقعہ سے اس کرب کا اندازہ ہُوا۔ جو ڈاکٹر صاحب کے دل میں پیدا ہو رہا تھا جس کو انہوں نے حقیقی معنوں میں امر ربی کی طرح سمجھا اور راضی بہ رضائے امر ہو گئے ۔

ہم نے ہنس ہنس کے تیری بزم میں اے پیکرِ ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے، تجھے کیا معلوم

میں نے انھیں کبھی کبیدہ خاطر۔ خاموش خاموش، بجھا بجھا سا نہیں پایا آخر یہ زندگی ہی تو ہے — یہاں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ پھر کیا بات ہے کہ میں نے انھیں ہمیشہ مسکراتے قہقہے لگاتے اور لطیفوں میں ڈوبے ہوئے پایا — مگر ایک موقع پر ان کی آنکھوں میں بے پناہ چمک، پیشانی پر کشیر یں اور بھنووں میں سخت تناؤ اور آواز میں گھمبیرتا اور بے پناہ کرب نمودار ہوتا ہے، جب انھیں یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ہم میں سے کوئی نماز کی ادائیگی میں باقاعدگی نہیں برت رہا۔ تب وہ کہتے ہیں۔

" اور سنا تم نے کہ تمہارا چہرہ منحوس بن جائے گا۔ تمہارے سارے گناہ اس پر لکھے ہوئے نظر آئیں گے۔ جنھیں ہر شخص نفرت کے ساتھ پڑھے گا اور تمہاری تمام دعائیں، خدا سے تمام التجائیں عرش بریں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گی اور تم اپنے آپ کو آلام کے سمندر میں بالکل تنہا دکھتا پاؤ گے۔"

" یعنی وحدہٗ لا شریک کا مفہوم پیدا ہو گا۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔ پھر مجھ پر کیا گزری۔ ان کی کیا کیفیت ہوئی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ان کا سارا عالمانہ جلال، ان کا سارا دوستانہ خلوص ان کی تمام بزرگانہ شفقت اور بے شمار گالیوں کا طوفان مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ بادل خوب برسے — پھر مہر و محبت کا وہی آفتاب جو دوستوں کے دلوں کو گرماتا ہے نکل آیا — ڈاکٹر صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا۔

" آؤ یار اب چلیں ایک بج رہا ہو گا — اور ہاں کلب میں آج ذرا جلدی ہی آجانا — سمجھے!"

میں دس منٹ لیٹ پہنچا تو تین آدمی کٹ تھرو ٹ کھیل رہے تھے۔" او خدا نوں مَن — کدی تے وقت دا خیال کیتا کر۔" ڈاکٹر صاحب گرجے۔" میاں جی کدی تے معاف کر دتا کرو۔"

" معاف کر دیا — جاؤ کیا یاد کرو گے — لو — ڈیل کرو۔"

آدھی رات گئے پتے کٹتے رہے، ڈیل ہوتی رہی۔ فساد ابھرتے اور دبتے رہے۔ چائے چلتی رہی۔ سگریٹ کا دھواں

رات کی خاموشی میں تحلیل ہوتا رہا۔

رات کی پرشکوہ خاموشی تاروں کے ملکوتی جمال سے جھکا ہوا آسمان کھلی آزاد اور تندرہوائیں اور ڈاکٹر برق۔ ایک ہاتھ میں سائیکل اور دوسرا ہاتھ واسکٹ کی جیب میں ہے بسا اوقات ہر پانچ منٹ کے وقفہ سے پتلون کو بیٹ پر باقاعدگی سے لاٹتے ہوئے گھر کی طرف ایک سرشاری اور کیف میں ڈوبے ہوئے رواں ہوتے ہیں۔

رات گئے ان کے گھر کا دروازہ کھلا رہتا ہے جس کے دستہ کو برق صاحب ایک ہی انداز سے مروڑ کر گذشتہ بیس سالوں سے کھولتے چلے آتے ہیں۔ ہر رات کھول کر اندر داخل ہوجاتے ہیں۔ اور نہ معلوم گھر میں کس کی ڈیوٹی ہوتی ہوگی کہ وہ دروازہ بند کرے یا نہ کرے اس کی انھیں کبھی چنتا نہیں ہوئی۔ ان کی طبیعت کی افتاد کا اس روزمرہ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ دروازہ ان کے گھر کے لئے بے معنی چیز ہے۔ خواہ وہ بند ہو یا کھلا۔

پھر ایک شمع اور ہے، جو ڈاکٹر برق رات گئے اپنی خلوتوں میں روشن کرتے ہیں جس کا حال بعینہٖ کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ بجز اس کے کہ ہر سال کاغذوں کی ایک موٹی سی گٹھری اس گھر کے صدر دروازے سے برآمد ہوتی ہے اور وہ ڈاک سے چل کر مشینوں تک پہنچتی ہے اور خوبصورت جلدوں میں ایک روشنی کی صورت ملک کے اندھیروں میں تہلکہ ڈال دیتی ہے، بے بنیاد اور جھوٹی حدیثوں کی سازش کا وہ آہنی جال جو خواجہ کونین کی عظیم ترین ذات کے گرداگرد اغیار نے بچھا رکھا تھا اسے جس کے نوک قلم نے کاٹ کر اپنی انگلیاں خونچکاں کی ہیں اس کا دل آج تک ان زخموں سے نگار نہیں۔ ؎

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا

اب ڈاکٹر برق رخت سفر باندھ رہے ہیں تاکہ

اپنے محبوب کے حضور پہنچیں اور ان کو دکھلائیں۔ ؎

انگلیاں نگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

ڈاکٹر صاحب کو آج تک کسی نے کسی موتراشی کی دکان پہ نہیں دیکھا۔ ان کی بیگم نے ان کے ہاتھ پہ ایک گھڑی باندھ رکھی ہے، جس سے وقت دیکھنے کا کام انہوں نے کبھی نہیں لیا۔ بجز اس کے کہ اس گھڑی کو دیکھنے سے یہ فوراً معلوم ہوجاتا ہے کہ کمرے کے باہر دن ہوگا یا رات۔

اسی طرح خیاط آج تک ان کے جسم کے ناپ کو ترستے ہیں سنا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں چند دوست احباب کی زبردستی سے ان کے کوٹ پتلون قمیض۔ واسکٹ شلوار وغیرہ کا ناپ لیا گیا تھا اور وہ نسخہ آج تک بخق محاتی خیر دین محفوظ ہے۔ بالعموم کپڑا خود نہیں خریدتے اور کبھی خریدنا بھی پڑے تو اس طرح کہ کسی دوکان کے سامنے سائیکل روک کر ایک پیر کو زمین پہ ٹیک دیتے ہیں اور صرف اس قدر فرماتے ہیں۔!

بھئی وہ تین قمیضوں کا کوئی کپڑا ــــ ذرا جلدی۔ اس سے آگے کا کام کپڑے والے کو جاننا چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تین قمیضوں کا کپڑا کتنے پجاموں کے برابر ہوتا ہے۔۔ یا یہ کہ وہ کپڑا جو دکاندار قمیضوں کے عنوان سے دے رہا ہے۔

لحاف کے مشابہیں بھی پوشیدہ رکھتا ہے۔ وہ کپڑا اسے کر سیدھے بھائی خیر دین کی دکان کے سامنے تیزی سے گزرتے ہوئے کپڑے کا بنڈل ایک بھاری پارسل کی طرح زمین پر پٹک کر صرف آنا کہتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں۔

"بھائی قمیضیں ہی قمیضیں — دیکھیے مجھے شلوار نہیں چاہیئے" پھر بھائی خیر دین کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ اور جب قمیضیں سل کر آجاتی ہیں تو ڈاکٹر صاحب اس کو بطور قمیض ہی استعمال کر ڈالتے ہیں۔

ایک دن محفل گرم تھی۔ پہلی جنگِ عظیم پر بات ہو رہی تھی Lead ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ فرمانے لگے "صرف کیمبل پور سے تیس ہزار نفری کی بھرتی ہوئی، جنھیں نہ جانے کون سا آسمان نگل گیا"۔ ایک صاحب نے فرمایا "حضرت اس وقت کیمبل پور کی پوری آبادی بھی بیس ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "بھائی آدھے پر تصفیہ کر لو کہو منظور ہے" بلند قہقہہ کے بعد مجلس برخواست ہو گئی طبیعت کا شاعرانہ لا ابالی پن، مزاج کی فلسفیانہ وارفتگی۔ دنیا و لذائذ دنیا سے بے نیازی پُرسوز دل مضطرب روح من کی دنیا میں رہنے والے غلام جیلانی ؎

جانے کہاں سے آنکلے ہیں
جانے کہاں کو جانے ہارے

پہچان

احمد سعید

"بیگم جلدی چلیے بیگم صاحب ۔ کوئی آپ سے ملنے آیا ہے" ہمارے ملازم نے مجھے ہراساں لہجے میں کہا۔ میں نے ابھی گلی کی نکڑ پر واقع اپنی سہیلی کے گھر میں مشکل سے قدم رکھا تھا کہ مجھے نواب سنے آلیا۔ ابھی میرے پاؤں کے تلوے سنسنا رہے تھے اور تین منزلہ مکان کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے پھولا ہوا دم معمول پر بھی نہیں آرہا تھا کہ کسی انجانے ملاقاتی کے آنے کی خبر نے نہ جانے دماغ کیوں چکرا دیا۔ "ایک بیگم صاحب آئی ہیں" نواب بار بار دہرا رہا تھا اور اس کے حیرت زدہ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ ملاقاتی نے اسے خاصا متاثر کیا تھا۔ چونکہ وہ ہمارے خاندان میں پچیس تیس برس سے کام کر رہا تھا۔ اس لیے وہ اس کے ہر فرد، بوڑھے بچے، مرد عورت، سب کو جانتا پہچانتا تھا۔ ان کے حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے ان کی خاطر مدارت کرتا تھا۔ میری عدم موجودگی میں بوقت ضرورت ایک وضع دار میزبان کا کام بھی بخوبی انجام دیتا تھا۔ پر آج کی بیگم صاحب ۔ جو رشتے میں اپنے تئیں میری بہن بتاتی تھی، نواب کے لیے ایک معمہ بن گئی۔ وہ اس وقت کوکا کولا STRAW کے ذریعے آہستہ آہستہ نوش کر رہی ہوگی، یہ تو میں جانتی تھی۔ لیکن میرے لیے بھی نواب کی مانند ایک سوال ۔

"بڑی خوب صورت ۔۔ ہیں پچیس برس کی عمر ۔ کسی اونچے گھرانے کی لگتی ہیں ۔ ساتھ دو بچے ہیں"

"ان کی عمر؟"

ایک کوئی پانچ سات برس کا ہوگا، اپنے ڈیڈی جیسا ۔ دوسرا، دوسری ۔ جو لڑکی ہے ۔ کوئی آٹھ دس برس کی ۔ شاید اس وقت میرا ذہن ایسے سوال کسی اور مقصد کے لیے کر رہا تھا۔ کہ نواب سارے گھر بار اور بچوں کو یونہی تو کسی اجنبی کے حوالے نہیں کر آیا ۔ نہیں ۔ وہ تو خود بڑا شکی ہے ۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اوّل تو کسی کو گھر میں قدم رکھنے نہ دیتا۔ تاہم میرا دل نہ جانے کیوں ڈانواں ڈول کر رہا تھا۔ جیسے بعض اوقات کسی غیر متوقع واقعہ کے رونما ہونے سے پیشتر ہو جاتا ہو ۔ بہر صورت مجھے فوراً گھر پہنچنا چاہیے۔ راستے میں جیسے میں نواب سے غیر ارادی طور پر اپنے اطمینان کے لیے ملاقاتی کا حلیہ بھی پوچھتی گئی ۔

بیگم صاحب ۔ میں ان پڑھ کیسے بتاؤں ۔ بڑی بڑی آنکھیں اور کٹے ہوئے بال جنہیں آپ لوگ نہ جانے کیا کہتے ہو۔ اور چند ہی منٹ بعد ازاں مجھے اپنے بچوں کی "امی امی" کی آواز میں سے "خالہ" کی آواز ابھرتی سنائی دی ۔

"امی ! رضیہ خالہ آئی ہیں ۔

"رضیہ خالہ؟"

یہ میرے دو بڑے بچے تھے ۔ "یہ کون من گھڑت خالہ آدھمکی ؟" میں نے اپنے سے سوال کیا ۔ لیکن میرے بچے اس معاملے میں مجھ سے زیادہ خبر رکھتے معلوم ہوتے تھے ۔ انھوں نے میرا تعارف جو کرا دیا "خالہ رضیہ ۔ رضیہ" میرے ذہن میں یہ نام بے طرح؟

نیلی ملاوی کے گھینکی مانند۔ اس میں کوئی چمک نہ تھی۔ تاہم پل جھپکتے ہی ایک ارغوانی سا بگولہ میری طرف لپکا اور میرے سینے سے لگ گیا۔ "باجی! یہ جو ہیں۔ تو یہ تھیں نواب کی بتائی ہوئی "بیگم صاحب"" اس کا چہرہ میرے قریب ترین تھا۔ حتیٰ کہ میں اسے یوں ملتے جھینپ گئی۔ لیکن رضیہ کے انتہائی تپاک کے باعث اسے بدتمیزی سے اپنے آپ سے یکدم الگ بھی تو نہ کر سکتی تھی، نہ ہی اس سے ہو سکتی تھی۔

"معاف کیجیے، میں نے آپ کو پہچانا نہیں" میں نے اپنے ملاقات کے دونوں ہاتھ تھام کر اس سے قدرے پیچھے ہٹ کر اپنے چہرے پر انتہائی وضعدارانہ مسکراہٹ پھیلا کر پوچھا۔ "سچ پوچھیے۔ اس عرصہ میں میری نظریں اس کے چہرے پر گڑی سی گئی تھیں۔ وہ واقعی بڑی خوبصورت تھی۔ جی چاہے پسند کرنے والا گورا شہابی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، لانبی اور گھنی پلکیں جو ان پر جھک کر انہیں معصوم ہوئیں، ان میں دنبالہ دار سرمہ، بھرے بھرے ہوئے تراشیدہ ہونٹ، انگریزی وضع کی اوپر کو اٹھی ہوئی ناک، خم دار، پیاری سے نتھنے، ان میں دمکتا ہوا سرخ رنگ کا کوکا جو آجکل لگانا پھر فیشن ہو گیا ہے قدرے گول چہرہ، ٹھوڑی میں چاہِ ذقن، مانو نوکی طرح اپید، فراخ ماتھا جو برا نہیں لگتا تھا، نیم جوکور بالوں کی محراب کانوں کے پیچھے بالوں کی صورت میں ختم ہوتی تھی۔ بھرا بھرا جسم، درمیانہ قد، گدرائے ہوئے موٹے اور مضبوط ہاتھ۔ رضیہ، حالا رضیہ، یعنی وہ صبیحہ کے اعتبار سے۔ اس نے عجب اوج دار اور قدرے کھنکتی آواز میں مجھ سے کہا۔

"پہچانیے"

چاروں طرف سے مجھے یہ سوال تیروں کی بوچھاڑ بن کر لگا۔ میرے کرنے یعنی نواب بلکہ گھر کے در و دیوار بھی ایک سراپا سوال سا بن گئے۔ بعد نہایت پُرعلت اور اس کے جواب کے لیے میری نظریں نیچے ملاقاتی کا سراپا ٹٹولنے لگیں۔ اس کے سر سے پاؤں تک اور پاؤں سے سر تک واپس لوٹ جاتی اور جبراً ادھر ہی پر اس کے چہرے پر تم گئیں۔ اس کی آنکھوں میں تو پُر اسرار سیاہی تھی۔ دفعتہً! تب سے اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک خطرناک چٹان پر کھڑی ہو۔ اس کی نم آلود آنکھیں جن میں تم وحشت اور حسرت جھلک رہے تھے مجھے عجب انداز میں تک رہی تھیں جب ہماری نظریں چار ہوتیں تو وہ قدرے خفت آمیز انداز میں مسکرا بھی دیتی۔۔ ۔ لوکا کولا کی بوتل اس نے اس اثنا میں شاید دو تین گھونٹ ہی پی ہوگی۔ وہ دو تہائی کے قریب اب تک بھری ہوئی تھی۔ کس اضطراب کے تحت اس نے بمشکل ایک ایک قطرہ پیا ہوگا۔ کیوں ؟ !

"آئیے" میں نے ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے قریب ہی بیٹھ جانے کو کہا۔ "اندر گرمی ہے۔ باہر اچھا رہے گا" وہ اس پر چند لمحات کچھ تذبذب کی حالت میں کھڑی میری طرف کنکھیوں سے یوں دیکھتی رہی جیسے کہہ رہی ہو "آپ سے ایک ضروری بات کرنے آئی ہوں" لیکن اس وقت میں نے اس کی طرف کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ یوں سمجھا کہ احتراماً مجھ سے کتراتی ہے۔ اس کی نظروں کو ایک طرف جھٹکنے کے لیے اور اپنی بے چینی اور تجسس کم کرنے کے لیے میں نے نواب کو بلا کر اُسے مخصوص اشارہ کیا، جس کا مطلب چائے وغیرہ کا بندوبست کرنا تھا۔ اور اس بہانے سے برتن نکال کر دینے کے بہانے، اس کے بچوں کو میں ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ تو ہمارے بچوں سے یوں گھُل مل گئے تھے۔ جیسے ان کے سگے لگتے ہوں۔ لیکن یہ تربیت کا نتیجہ تھا یا بچوں کو خاص ہدایات کا اثر جو ان کی والدہ نے انہیں اس موقعہ کے لیے دی تھیں۔ اس کا جواب میں اس وقت نہ دے سکی۔ بہرطور وہ بڑے سمجھے ہوئے بچے معلوم ہوتے تھے۔ اپنی جگہ پر اٹھ کر مجھے بڑی تعظیم سے "خالہ جی" اور "خالہ جی" کہہ کر سلام کرنا۔ یہ کوئی معمولی باتیں نہ تھیں۔ خیر میں اس کے ساتھ ساتھ دل ہی دل میں یہ سوچ رہی تھی کہ ان کی والدہ کی کس درجے کی خاطر تواضع کروں۔ لیکن مجھے اس کی ارغوانی ساڑھی کھلتی تھی یا میں اس سے جل گئی تھی۔ کیونکہ اس میں اس کا رنگ کتنا کھل گیا تھا ؛ اور میں اس کے سامنے کتنی ماند پڑتی تھی۔ میرا رنگ !

یہ خالہ رضیہ بچوں کے لیے کافی مشاق لاتی تھی۔ ایک طرف دو تین ٹوکریاں دھری تھیں۔ خالہ رضیہ کی نظریں جیسے میری ہر حرکت پر لگی تھیں اور منتظر تھیں کہ میں کب اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہوں۔ وہ بڑی بے صبری سے اپنی کلائی پر لگی گھڑی میں وقت دیکھتی تھی۔ جب نواب باورچی خانے میں چلا گیا اور بچے کھیل کود میں مصروف ہو گئے تو رضیہ نے کہا: "آپ خواہ مخواہ اتنا تکلف کیوں کرتی ہیں۔ میں کوئی اوپری تھوڑی ہوں"۔

"میں بڑی کوڑ مغز ہوں۔ خدا جلدی سے اپنا تعارف کروائیے ورنہ میں شرم کے مارے ۔۔ ۔۔"

"تو پھر اندر چلیے"۔

"اندر!" میں نے میکانکی انداز میں دہرایا۔ اس کا مطلب صریحاً یہ تھا کہ وہ تخلیہ چاہتی تھی۔ چنانچہ میں اسے سیدھی ڈرائینگ روم میں لے گئی، جس کے حبس سے میرا دم گھٹا کرتا۔

جب ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے تو رضیہ یکدم سنجیدہ ہو گئی۔ اس کا رنگ فق پڑ گیا۔ اس نے اپنی مخروطی انگلیوں کو چٹخاتے ہوئے یکلخت مجھ سے پوچھا:

"کیا آپ نے کبھی فاطماں کا نام نہیں سنا؟"

اس پر میں نے جب نفی میں سر ہلایا تو اس نے کہا:

"آپ کے ہاں کوئی پچیس تیس برس ہوتے نواب نام کا کوئی ملازم ہوا کرتا تھا۔ اس پر میرے ذہن کو قدرے جھٹکا لگا۔ اس میں ایک لہری اٹھی ایک سیاہی مائل لہر۔ میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ بولی: "اب آپ کو شاید یاد آیا۔ ۔۔ اس نواب کی ایک بیوی تھی، دوسری بیوی فاطماں ۔ جو نہایت خوب صورت تھی"۔

"مجھے اسے دیکھنے کا تو اتفاق نہیں ہوا چونکہ یہ میری شادی سے کہیں پہلے کی بات ہے" میں جواب دیا۔

اَب میری مخاطب کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس کی سیاہ پتلیاں تھگیلتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اس مقام پر پہنچ کر اس نے یکدم اٹھ کر دروازہ بھیڑ دیا۔ پھر میرے اور قریب ہو کر بیٹھ گئی اور سرگوشی میں بولی: "نواب کی ایک سوتیلی لڑکی تھی۔ خالدہ ــــ جو گھر سے بھاگ گئی تھی۔۔ ۔۔ کیا آپ نے اس کے بارے میں بھی کبھی کچھ نہیں سنا؟"

خالدہ! بڑی خوب صورت لڑکی تھی وہ۔ میرا ذہن جھنجھنا اٹھا۔ یہ ان دنوں کا واقعہ تھا جب میں فسٹ ایئر میں پڑھتی تھی اور چند روز کے لیے اپنی خالہ کے ہاں حیدرآباد گئی تھی۔ نواب ان دنوں ہمارے خالو کے ہاں ملازم تھا۔ یہی نواب جوان دنوں سننے میں آیا تھا، برس ہا برس سے اپنی دوسری بیوی، فاطماں کی موت پر مسلسل سوگ منا رہا تھا۔ فاطمہ کو نہ جانے وہ کہاں سے بیاہ کر لایا تھا۔ لیکن اتنا سننے میں ضرور آیا تھا کہ وہ بڑی خوبصورت تھی۔ وہ شادی شدہ بیوہ تھی اور نواب بھی رنڈوہ۔ چونکہ گھر کی نوجوان لڑکیوں کو ایسی باتوں پر کان دھرنا منع تھا اس لیے ہمارے لیے یہ معاملہ ایک راز کی طرح دبا دیا گیا۔ یوں بھی نوکروں کی باتوں میں اشراف کا دلچسپی لینا بھی تو خلاف تمیز بات تھی۔

"کیوں؟ آپ کو کچھ یاد آیا؟" رضیہ نے مجھ سے پوچھا۔

"تو ــ تو ــــ کیا تم؟ ــ آپ؟"

جی جی ــــ وہی جو آپ سوچ رہی ہیں ــــ میں خالدہ ہوں۔ نواب کی سوتیلی لڑکی!" اس نے ایک تیر سا چھوڑتے ہوئے کہا اور

جسم میں اس کے نتیجے میں بجلی کی سی دوڑ گئی۔" خالدہ — رضیہ — رضیہ — خالدہ .. .. " میں ان دونوں ناموں کے مترادف ہونے کی تصدیق کرنے کے لیے انھیں شاید دہرانا چاہتی تھی کہ خالدہ نے مجھے خاموش رہنے کے لیے اپنے منہ پر اشارۃً انگلی رکھ لی اور دوڑنے سے سرک کر میرے زانو کے قریب بیٹھ گئی۔

"خالدہ!" میں نے چونک کر دہرایا اور ایک لمحہ کے لیے لرز گئی۔ اسے اپنے پاؤں میں بیٹھے دیکھ کر مجھے بڑی شرم آئی اور ملال سے گھن بھی۔ گھن — ہاں۔ پھر میں نے بے اختیار ہو کر اسے فرش سے اٹھا کر اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ اور اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ استفسار کرتی اس نے خود ہی گھبرا کر کہا۔

"میں آپ کو تفصیلات کبھی پھر بتاؤں گی۔ اس وقت میں آپ سے مدد مانگنے آئی ہوں۔ چونکہ آپ کے سوا میرے ماضی اور ماں باپ کے متعلق کسی شخص کو علم نہیں۔ دیر ہو رہی ہے۔ وہ نیچے انتظار کرتے ہوں گے .. ۔

"کون؟"

"میرے شوہر ایک مِل کے مالک ہیں۔ بڑے اونچے خاندان سے ہیں۔ نہایت شریف۔ میری خاطر انھوں نے اپنے سارے گھرانے، ماں باپ تک سے قطع تعلق کر لیا ہے .. .. اس لیے .. اس نے"

"گھبراؤ نہیں — خالدہ — تمہارا راز اس چار دیواری سے باہر نہیں نکلے گا۔

یہ سن کر وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اس نے سر نیہوڑا لیا اور سر ساڑھی کے پلو سے ڈھانپ لیا۔

"انھوں نے مجھے گناہ کی زندگی سے بچایا .. .. میں اکیلی تھی۔ خوبصورت۔ میرا پہلا شوہر جس نے مجھے پالا تھا، مجھے کسی زمانے میں دغا کر کے گیا تھا، اچانک مر گیا۔ اچھا ہوا کہ .. .. وہ یکلخت رک گئی .. .. وہ مجھے بڑا پیار کرتا تھا" یہ کہتے کہتے خالدہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"گناہ کی زندگی" .. .. میرے ذہن میں اب تک ایک خوفناک گونج باقی رہی۔

"آپ معاف کر دیجیے" اس نے میرے ہاتھ پکڑ کر ان پر اپنا سر رکھتے ہوئے کہا۔ "انھیں مجھ پر ترس آیا۔ انھوں نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ لیکن میں نے انھیں بتایا تھا کہ میں ہوں تو بڑے شریف ماں باپ کی بیٹی اور ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہوں — آپ کے .. آپ کی رشتے میں دور سے بہن لگتی ہوں — پر حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر —" اس کی باتیں — داستان سن کر — میں تو رو رہی تھی۔ کم بخت تو نے آخر اپنے ذاندشے ہم سے کیوں ملائے۔ اپنے آپ کو بچانے کے لیے، سکھ کی زندگی بسر کرنے کے لیے تو نے ہمیں ہی ذلیل کرنا تھا۔ میں دل ہی دل میں کہنے لگی،

میں قسم کھا کر کہتی ہوں اس کے بعد آپ کو اپنی منحوس صورت کبھی نہ دکھاؤں گی .. .."

"نہیں نہیں خالدہ — یہ کیا کہتی ہو — تم فکر نہ کرو — تم فکر نہ کرو .. " میں نے اس کی خانگی زندگی کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہوئے بے قابو ہو کر کہا،

انھوں نے کئی بار کہا ہے مجھے اپنے عزیزوں سے ملاؤ، خاص طور سے آپ کو چونکہ میں جب بھی اس بارے میں ان سے سوال کا جواب

دیتی تو میری نظر آپ ہی پر جاتی۔

ایک غریب عورت کو اپنی دور کی رشتہ دار یا بہن بتلانے میں کیا حرج ہے۔ میں نے سوچا۔

"آپ کسی قسم کا خوف نہ کھائیے۔۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔۔ وہ نیچے بیٹھے ہیں۔ اور آپ کو ملنے کے لیے بڑے بیتاب ہوں گے۔ مجھے اوپر آتے اتنی دیر ہوگئی ہے۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھڑی دیکھ کر مجھے مخاطب ہو کر کہا:

میں اپنے وکیل میاں کی طرح اپنے سائل کا مقدمہ لڑنے کے لیے پہلے اس سے چند ایک اور ضروری باتیں پوچھنا چاہتی تھی تاکہ کہیں بنا بنایا کھیل بگڑ نہ جائے۔ چنانچہ میں نے اس سے چند سوالات کیے۔ ان کے جواب میں اس نے مجھے بتایا کہ وہ زیادہ تر کراچی اور حیدر آباد میں رہتی تھی۔ وہ دو تین مرتبہ ہمارا پتہ کرنے لاہور آئی تھی۔ چھپ چھپا کر۔ اس کا شوہر حیدر آباد میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ اس کی شادی کو سات آٹھ برس ہوئے تھے۔ اس کا ایک بچہ کسی ایسے شخص کا تھا جس کا اس سے وقتی طور پر معاشقہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس سے شادی کرنے کا وعدہ کر کے، حاملہ ہونے پر اسے چھوڑ گیا تھا۔ اس قسم کی معلومات سے لیس ہو کر میں اپنے میاں کو، جو ہائی کورٹ سے واپس آنے والے تھے۔ خالدہ عرف رضیہ سے تعارف کرانا چاہتی تھی۔

اس عرصہ میں میں نے نواب سے کہا کہ وہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر جلدی جلدی ڈرائینگ روم میں آئے اور بعد ازاں "بیگم صاحب" اور ان کے شوہر کی بڑے شاندار طریقے سے خاطر تواضع کرنے کے لیے شیزان سے عمدہ عمدہ چیزیں لے آئے۔ میں نے اس اثنا میں خالدہ کے شوہر کے ہر ممکن سوال کا جواب دینے کا پلان تیار کر لیا اور اپنے میاں کو بھی خالدہ وغیرہ سے ملوانے کا خاکہ اپنے ذہن میں مرتب کر لیا۔ میرے نزدیک ایک بات اب بالکل واضح تھی کہ زیادہ باتیں مجھے ہی کرنا ہوں گی، اس لیے کہ میرے میاں تو غیر خاندان سے تھے لیکن خالدہ کا تعلق تو ہمارے ہی سے رہا تھا، نواب جس کی ایک زندہ کڑی تھا۔ چنانچہ جب وہ دس منٹ کے اندر اندر گھر کے ملازم کی بجائے ایک دفتری بابو کا روپ دھار کے ڈرائینگ روم میں آیا تو میں نے اسے اور خالدہ، دونوں سے بس اتنا کہا: "پہچانو"؟

اس کے جواب میں نواب، جس کا نام میں نے خالدہ کو اکرم بتایا تھا، نے انتہائی تعظیم سے اپنی ناف پر یوں ہاتھ باندھ لیے جیسے کسی بہت بڑی ہستی کے حضور میں آ کھڑا ہو۔ اس نے ایک دو بار نظریں اٹھا کر خالدہ کو چھپے چوری انداز میں دیکھنے کی جرأت کی اور لوکھلا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ خالدہ کا ردِ عمل بھی ایسا تھا۔ جھریوں دار چہرہ، نیچے کو جھکی ہوئی مونچھیں، ملگجی داڑھی، اس پر گلگتی ٹوپی، اس میں خالدہ اسے پہچاننے سے قاصر معلوم ہوتی تھی، اور پھر اس کی زندگی میں تو شاید جوان تر اور فیشن ایبل لوگ آئے ہوں گے۔ اس لیے وہ گھر کے پرانے ملازم کو کیسے پہچان سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اب نواب کو دو تین بار کہا کہ ذرا حافظے پر زور دے کر اس "بیگم صاحب" کو پہچاننے کی کوشش کرے۔ ایک دو منٹ تک وہ خالدہ کو بڑے غور سے دیکھتا رہا سر سے پاؤں تک، پھر اس کے چہرے کا بال قدرے ڈھیلے پڑتا دکھائی دیا اور آنکھوں میں خفیف سی چمک پیدا ہوتی نظر آئی۔

کہیں بچپن میں دیکھا ہے۔ بیگم صاحب جب چھوٹی تھیں۔ اور بس۔ اس کے آگے اس کی یادداشت نے اس کی کچھ مدد نہ کی۔

"یہ خالدہ ہے، نواب! فاطماں کی بیٹی۔۔"

"خالدہ۔ فاطماں"۔ ایک ہی سانس میں اس کی چیخ نکلتی نکلتی رہ گئی۔ "میری بیٹی"! یہ کہتے ہوئے والہانہ خالدہ کی طرف لپکا اور اسے اپنے کندھے سے لگایا اور سسکیاں لینے لگا۔ خالدہ تو پہلے ہی بڑی نروس تھی۔ وہ بھی اس کے سینے سے لگ کر جی بھر کر رونے لگی۔ اتنے میں مجھے اپنے میاں

کی سیڑھیاں چڑھنے اور میرا نام لے کر مجھے پکارنے کی آواز آئی۔ میں ایک ہی جست میں باپ بیٹی دونوں کو یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی کہ وہ اس ڈرامے کو بھول جائیں۔

خالدہ نے اپنا ہینڈ بیگ کھول کر اس میں سے سنگار کی چیزیں نکالیں۔ اپنا میک اپ درست کیا۔ پھر بچوں کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ در اصل اپنے میاں کو جلد از جلد اور پرلوانے کی خواہشمند نظر آتی تھی۔ جب وہ راستے میں کھڑے میرے میاں کو بڑے احترام اور قدرے بے تکلفی سے سلام کر کے آگے نکل گئی تو انھوں نے مجھ سے اس کی تعریف پوچھی۔ میں نے انھیں سارا واقعہ سنایا اور بتایا کہ میں خالدہ کی مدد کرنا چاہتی تھی اور اس بارے میں ان کی قانونی رائے سے کیا ہے۔ انھوں نے بھی خالدہ سے بڑی ہمدردی ظاہر کی۔ لیکن اس کے ساتھ مجھے متنبہ بھی کر دیا کہ یہ تعلقات آگے نہ بڑھ پائیں۔ "ہم ایک آدھ بڑا جھوٹ بول سکتے ہیں۔ لیکن اسے چھپانے کے لیے اور بولتے بولتے کسی اور بڑی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔" انھوں نے بعد میں خالدہ سے مل کر اس کی ہی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے جواب میں اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں۔"

اس کے بعد میرے میاں خالدہ کے ہمراہ خود بازار میں اترے اور اس کے شوہر کو اس کے بتائے ہوئے پتے پر سے لے آئے۔ وہ مال روڈ پر ایک بہت بڑے ہوٹل میں مقیم تھا۔

کوئی دس پندرہ منٹ میں ہی وہ مسٹر نصیر، خالدہ کے شوہر کو ساتھ لے کر واپس آئے۔ اس کی خمار آلود آنکھیں اور کم گوئی مجھے اب تک یاد ہے۔ اس کے کلّے میں ہر وقت خوشبودار پان رہتا تھا۔ مجھے اپنے میاں کی زبانی اس کے چلے جانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ شخص شراب کا خاصا عادی دکھائی دیتا تھا۔ اپنے ہوٹل سے باہر نکلتے وقت بھی وہ غالباً ایک آدھ جام حلق میں انڈیل کر آیا تھا۔ امیر آدمی اور شراب اور شریف خاندان اور — اور خالدہ جیسی لڑکی — جیسے ایک تار میں پروئے گئے تھے۔ ہمارے سامنے آ گئے۔

خالدہ اپنے میاں کے ساتھ بڑی خوشی خوشی واپس آئی۔ بات بات پر وہ یوں کھلکھلا کر ہنس پڑتی جیسے اسے ہم سے مل کر کوئی بہت بڑی دولت ہاتھ آ گئی ہو۔ ہمیں تو مجبوراً اس کی خوشی میں ظاہری طور پر شریک ہونا پڑا۔ لیکن سچ پوچھئے ہم دونوں کے دل، خاص طور پر میرا دل، اندر ہی اندر پیچ رہے تھے کہ ہم یہ کیا سوانگ رچا رہے تھے۔ جب کبھی خالدہ کی اور میری نظریں چار ہوتیں تو وہ مجھے بڑی متفکرانہ اور ملتجیانہ نظروں سے دیکھتی اور ایک آدھ بار تو اس نے اشارے اشارے میں میرے سامنے چھپے چوری ہاتھ بھی جوڑ دیئے کہ میرا بھرم رکھ لینا۔ چنانچہ میں نے حتی الوسع یہی کوشش کی کہ میاں نصیر کو پر تکلف جائے پینے میں بھی مصروف رکھوں۔ لیکن وہ اس طرف زیادہ متوجہ ہونے کی بجائے "رضیہ" کے والدین اور اس کے ہم سے دور رہنے کے بارے میں گول مول سے سوال کرتا تھا۔ جس مقام پر مجھے کوئی قطعی جواب بن نہ آتا۔ وہاں عورت کی مشہور تریا چرتر کام دیتی۔ خالدہ اور میں ایک دوسرے کو اشارتاً جواب مہیا کرتے۔ خالدہ نے اپنے شوہر کو شروع ہی سے یہ بتا رکھا تھا کہ اس کے والد اور میرے چچا کی، جو قیام پاکستان سے قبل ہی انتقال کر گئے تھے۔ جائداد کے معاملے میں اتنا شدید تنازعہ ہو گیا تھا۔ اس سے ان کی آپس میں بول چال بند ہو گئی۔ وہ دونوں آپس میں ہم زلف تھے۔ اس کے والد فسادات میں شہید ہوئے تھے اور ماں بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھی۔ . .

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ اگر میں رضیہ کی باتوں پر یقین نہ کرتا۔ کہ وہ آپ کے خاندان سے ہے — تو اس سے شادی نہ کرتا۔ . ."

شکر ہے وہ اس وقت سنبھل گئی۔"

"سنبھل گئی" پر میں اور میرے میاں نے ایک دوسرے پر ایک معنی خیز چھلتی نگاہ ڈالی اور ہم پسینے میں غرق ہو گئے۔ رضیہ نے نظریں نیچی کر لیں۔

"چلیے۔ اب تو آپ کا اطمینان ہو گیا نا" رضیہ نے قدرے طنز آمیز لہجہ میں اپنے شوہر سے کہا۔

"بیگم۔ ہمیں آپ پسند تھیں، اس لیے ہم نے آپ کو اپنا لیا۔ رہے سسرال والے۔ انہیں اب یہاں لا کر ان کی تسلی کرا دیں گے۔"

"تو ابھی مزید تحقیقات اور تفتیش کرنا باقی ہے۔ جیسے میں عورت نہیں مجرم ہوں۔۔۔" اس دفعہ رضیہ نے اپنے شوہر کی بات ہنسی ہنسی میں اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "چلئے۔ پہلے تو ان کی اتنی شاندار چائے کا قرض انہیں کراچی یا حیدرآباد بلا کر اتاریں۔۔۔" "کیوں نہیں۔ کیوں نہیں" رضیہ کے شوہر نے اس کی دی ہوئی دعوت اور مشورے کو لبیک کہتے ہوئے ہمیں حیدرآباد آنے اور ان کے ہاں ٹھہرنے کی بھی دعوت دیتے ہوئے کہا۔ وہ تو خود اس بات کا انتہائی خواہشمند تھا کہ وہ رضیہ کا نجیب الطرفین ہونا ثابت کر کے اپنے والدین کو اسے قبول کرنے پر مجبور کر دے۔ یہ سن کر ہم دونوں کا چہرہ اتر گیا۔ رضیہ بھانپ گئی کہ ہم اس کے شوہر سے میل ملاپ رکھنا پسند نہیں کرتے۔ اس وقت یکلخت وہ نہ جانے کن خیالات میں کھو گئی اور اس کی نظریں لبدا زاں بار بار نواب کو ڈھونڈتیں۔ اس کے چند منٹ بعد رسمی علیک سلیک کے بعد رضیہ اپنے شوہر کو ساتھ لے کر ہم سے رخصت ہوئی۔ وہ ہمارے گھر سے یوں جا رہی تھی جیسے دلہن سسرال کے ہاں جاتے وقت سوگوار ہوتی ہے۔ لیکن اس کی ہر نظر میں مجھے عجب معنی پنہاں معلوم ہوتے جس کی نوعیت میں اس وقت نہ سمجھ سکی۔ اس کی طبیعت کو پانا، پارے کو پکڑنے کی کوشش کرنا تھا۔

اس کے جانے کے کوئی پانچ ماہ بعد ہمیں اس کے شوہر کا ایک بڑا دکھ بھرا خط ملا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں رضیہ کے بارے میں چند باتیں لکھی تھیں اور میرے میاں کی مدد چاہی تھی۔

"۔۔۔ جب سے رضیہ آپ سے مل کر آئی ہے اس نے پرانی آوارگی شروع کر دی ہے۔ میری عدم موجودگی میں وہ غیر مردوں سے ملتی جلتی ہے وہ ایک ماہ سے اس نے مجھ سے طلاق اور ہمارا بچہ لینے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ مجھے اس امر پر سخت افسوس ہے۔ آپ اسے ایسا کرنے سے منع کیجئے۔ ورنہ میں اس کا تقاضا پورے کرنے پر مجبور ہوں گا۔ لیکن اپنا بچہ اسے کسی قیمت پر نہیں دوں گا۔ امید ہے اس ضمن میں مجھے آپ کی اگر کچہری میں ضرورت پڑی تو آپ میرے حق میں گواہی دے کر ممنون فرمائیں گے۔۔۔"

آپ کا رہین منت — نصیر

حصار

قیوم راہی

انجن نے وسل دی تو تھرڈ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں گہری نیند سوئے ہوئے انجم کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر ایک دم اٹھ بیٹھا اور اس کے چہرے پر ایک گھبراہٹ سی نمودار ہو گئی، جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھتے دیکھتے جاگا ہو۔

پھر جیسے ہوا کا کوئی تند جھونکا شور مچاتا ہوا تیزی سے گزر جائے اور اس کے بعد فضا کا سارا ارتعاش، ساری ہلچل ختم ہو کر چاروں طرف سکون کا دور دورہ ہو جائے۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی یہ عارضی گھبراہٹ بھی ہوا کے اس آوارہ جھونکے کی طرح گزر گئی۔

اور یہ تو اس کی ایک مستقل عادت بن گئی تھی۔ گہری نیند دیر تک سوتے رہنا اور جب اس کو کسی بہانے سے جگایا جاتا تو ایک لمحے کے لیے اسی طرح پریشان سا ہو جاتا۔

فوزیہ نے بڑے سوچ بچار کے بعد اپنے شوہر کے لیے ایک بہت ہی پیاری شرارت کا انتخاب کیا تھا۔ جب کبھی وہ دیر تک پڑا سوتا رہتا اور دفتر کا وقت قریب آجاتا، فوزیہ الارم بجا کر ٹائم پیس اس کے کان کے قریب لے جاتی۔ وہ بڑے میکانکی انداز میں فوراً اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اور فوزیہ کی دل آویز مسکراہٹ کو دیکھتے دیکھتے ہی اس کے اپنے چہرے پر بھی کچھ اسی قسم کی لہر دوڑ جاتی۔

اس نے سوچا برابر والے کمپارٹمنٹ میں فوزیہ شاید اس وقت بہت خوش ہو رہی ہو گی۔ کیونکہ اس کا فرض انجن ڈرائیور نے ادا کر دیا تھا لیکن ابھی تو رات کا کچھ حصہ باقی ہے۔ یہ چار بجے جگانے کی آخر کونسی تُک تھی۔ انجن ڈرائیور بڑا بیوقوف اور بد مذاق معلوم ہوتا ہے۔ کم بخت نے نیند کا سارا مزا کرکرا کر دیا۔

اس نے ایک سرسری نظر پورے کمپارٹمنٹ پر گھمائی۔ دو مسافر شاید اس کی تقلید میں جاگ گئے تھے۔ باقی جو چند مسافر تھے۔ وہ بدستور نیند کے گہرے ساگر میں غوطے لگا رہے تھے۔ وہ موٹی توند والا ادھیڑ عمر مسافر جو سرِ شام ہی لمبی تان کر سو گیا تھا، خراٹے لے لے کر مزے سے سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی کمسن بچے کی سی معصومیت چھائی ہوئی تھی۔

اسے ایک بار پھر انجن ڈرائیور پر غصہ آگیا۔ ابھی اس کی منزل آنے میں مزید تین گھنٹے باقی تھے۔ یہ اتنا طویل وقت وہ جاگ کر کس طرح گزارے گا۔

اس نے کھڑکی کا شیشہ اوپر چڑھا دیا۔ شاید کوئی اسٹیشن قریب ہو جس کی وجہ سے وسل دی گئی ہو۔ لیکن وہاں تو دور دور تک روشنی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ چاروں طرف گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے ڈیرے تھے۔ کہیں کوئی ستارہ، کوئی جگنو نظر نہیں آرہا تھا۔ ساری کائنات اندھیرے کی دبیز چادر تلے چھپی ہوئی تھی——سوئی پڑی تھی

دنعتہ بادل زور سے گرجے اور بجلی اتنی تیز آواز سے کڑکی کہ اس کا دل دہل سا گیا۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے گرا دیا۔ دونوں مسافر اور جاگ گئے تھے۔ لیکن وہ موٹی توند والا ——— وہ کمسن بچہ کچھ اس انداز سے سویا پڑا تھا۔ جیسے اس کے منہ میں ماں کا دودھ ہو اور اس کو دنیا و مافیہا کی کچھ خبر ہی نہ ہو۔

اچانک اسے خیال آیا کاش اس وقت فوزیہ بھی یہاں موجود ہوتی تو وہ کچھ سرخرو تو ہو جاتا۔ اس کو بتاتا کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی نیند کے سامنے اس کی نیند کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی۔ جن پر انجن کی وسل کی تیز آواز اور بجلی کی گھن گرج کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔

صبح کو جب وہ یہ سب کچھ فوزیہ کو بتائے گا تو شاید وہ یقین نہ کرے۔ یہی کہے گی کہ جناب اس طرح محض باتیں بنانے سے تو کام نہیں چلتا۔

اپنا کام چھوڑیئے چلیے میری رانی، پر اس موٹی توند والے لالہ جی کا تو خوب کام چل رہا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں "گھوڑے بیچ کر سونا" تو یہ مثل اسی پر صادق آتی ہے۔ ظالم نے کس قدر محویت کی نیند پائی ہے۔ کمال ہی کر دیا۔

اس نے سگریٹ سلگا کر کل کا پڑھا ہوا اخبار تکیہ کے نیچے سے نکالا اور یونہی سرخیوں پر نظریں دوڑانے لگا۔!

لیکن پھر اس مشغلہ سے بھی وہ جلد ہی اچاٹ ہو گیا۔ اس نے اخبار تہہ کر کے پھر تکیہ کے نیچے رکھ دیا اور سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔ سگریٹ ہمیشہ سے ہی اس کی تنہائی اور سفر کا بہترین ساتھی تھا چنانچہ اس نے سگریٹ سے سگریٹ سلگانی شروع کر دی۔

اور پھر جیسے چراغ سے چراغ جل اٹھے، ایک سگریٹ کے ساتھ اس کا دل بھی سلگ اٹھا۔ اور پرانی یادوں کا ہلکا ہلکا دھواں اس کے ذہن پر چھاتا چلا گیا۔

ایک پل میں وہ یہاں سے دور چھوٹے سے قصبہ کے ایک حویلی نما مکان میں پہنچ گیا۔ جہاں اس نے زندگی کی اکیس٭۲۱ بہاروں کا رنگ روپ دیکھا تھا۔ اکیس٭۲۱ خوش رنگ پھولوں کی مہک سونگھی تھی۔ اور جہاں اب وہ پورے چودہ سال بعد جا رہا تھا ——— پورے چودہ سال بعد ———

حویلی میں زندگی ہمیشہ جھومتی ہوئی، رقص کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اول تو گھر کے افراد ہی کچھ کم نہ تھے۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ آئے دن مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

یہ اس کا کمرہ تھا۔ ایک طرف مسہری بچھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب کارنس کے ساتھ چھوٹی میز پر ریڈیو رکھا تھا۔ اور کارنس پر بڑے سلیقہ سے کتابوں کی قطار بنی ہوئی تھی۔ کارنس کے دونوں کونوں پر ہلکے پیازی رنگ کے گلدان رکھے ہوئے تھے۔ جن میں کاغذ کے پھول سجے ہوئے تھے۔ چھوٹی میز کے قریب ایک دوسری میز تھی جو قدرے بڑی تھی اور جس کے ارد گرد تین چار کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر کلینڈر اور چند سینریاں آویزاں تھیں۔ یہ چھوٹا سا کمرہ اس کے اٹھنے بیٹھنے سونے اور مطالعہ کا کمرہ تھا۔ جس کا ایک دروازہ باہر کی طرف کو بھی کھلتا تھا۔ اسی وجہ سے بوقت ضرورت یہ کمرہ یار دوستوں کی بیٹھک کا کام بھی دیتا تھا۔

باقی بچا تعداد کمرے تھے۔ ان میں اس کے ماں باپ اور بہن اور دو مدد چچاؤں کے خاندان آباد تھے۔ سب سے منجھلے چچا قصبہ کے مانے ہوئے ڈاکٹر تھے جن کی بیٹی طلعت اپنے خاندانی وقار کی نمایاں نشانی تھی۔ جس کے خدوخال بڑے دلآویز تھے۔ لیکن جس کی نظروں میں ایک خاص قسم کے غرور کی جھلک پائی جاتی تھی۔ یہی حال طلعت کے بڑے بھائی ارشد کا تھا جو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

چھوٹے چچا وکیل تھے۔ اور ان کے صرف ایک لڑکی تھی، خالدہ —— جو بہت کم عمر تھی اور جو زیادہ وقت نوکر، نوکرانیوں کی گود میں کھیلتی کودتی تھی۔

اس کے والد چونکہ اپنے ماں باپ کے سب سے لاڈلے بیٹے تھے۔ اس لیے ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی تھی۔ اور ان کی گزراوقات جوں توں کرکے جائداد کی آمدنی سے ہوتی تھی۔ یہ خاندان بستی میں بڑا مانا ہوا تھا اور اونچا خاندان مشہور تھا اور اس کے ہر فرد کو بڑی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے والد نے کسی ملازمت یا چھوٹی موٹی تجارت کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ آخر خاندان کی عزت کا سوال تھا۔

شروع شروع میں تو کوئی خاص فرق محسوس نہ ہوا۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب حویلی کا ایک رنگ دو رنگوں میں بدل گیا۔ ایک رنگ ذرا میلا تھا۔ جس کی لپیٹ میں وہ، اس کے ماں باپ اور عالیہ آگئی۔ اور دوسرا رنگ بہت اجلا صاف و شفاف اور چمکدار تھا۔ جس کی روشنی نگاہوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ کیونکہ اس پر ڈاکٹر صاحب اور وکیل صاحب کی امارت کی چمک دمک اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر تھی۔

پھر آپس میں ایک ان دیکھی دیوار حائل ہوگئی۔ ملنا جلنا تو بدستور تھا۔ لیکن وہ یہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے یہ سب کچھ محض رسمی یا بناوٹی ہو۔ اسے اکثر یہ احساس ہوتا جیسے طلعت جب بھی اس سے بات کرتی تو کچھ اس انداز میں جیسے اس پر کوئی احسان کر رہی ہو، یا رحم کھا رہی ہو۔ طلعت جو عالیہ کی چھوٹی بہن ہی نہیں گہری سہیلی بھی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی بزرگ بن گئی۔

ایک شام جب وہ باہر سیر و تفریح کے لیے جانے کو اپنے کمرے میں تیار ہو رہا تھا۔ تو اچانک وہاں طلعت آ پہنچی۔ اس نے بھی بے نیازی کا مظاہرہ کیا اور اس طرح مشغول رہا جیسے اس کو کچھ خبر ہی نہ ہو۔

"انجم بھائی آج تو بڑے کھوئے کھوئے سے ہیں —— خیریت تو ہے؟" طلعت نے خفت مٹانا چاہی۔

"جی ——!" اس نے بھی جیسے چونک کر کہا۔

"میں نے کہا کوئی کمرے میں گھس آئے اور جناب کو خبر تک نہ ہو۔ اس قدر مصروفیت، اس قدر محویت —— یہ حالت تو صرف اس شخص کی ہوتی ہے جو کہیں کھو جائے۔"

"تو پھر ——؟"

"پھر کیا" طلعت نے بھی بات جاری رکھی۔

"پھر یہ کہ آپ کس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئیں۔"

اور طلعت کچھ جھینپ سی گئی۔
"ارے انجم بھائی آپ تو برا مان گئے۔ میں تو مذاق کر رہی تھی ——— اور ہاں مجھے تو اس وقت آپ کی ڈکشنری کی ضرورت تھی"
"تو گویا مشکل کے وقت ہم یاد آئے"
"توبہ کرو انجم بھائی ——— توبہ ——— مشکل کے وقت تو خدا یاد آتا ہے ——— خدا"
"تو تمہیں بھی خدا یاد آتا ہے"
"کیوں نہیں"
"میرا خیالِ خام تو یہ ہے کہ تم سراسر جھوٹ بول رہی ہو"
"کیا مطلب ہے آپ کا؟"
"مطلب یہ کہ اوّل تو تمہارے لیے کوئی مشکل ہی پیدا نہیں ہوتی۔ اور اگر خدانخواستہ ایسا ہو بھی جائے تو تمہیں خدا یاد نہیں آ سکتا
خیر چھوڑو وہ سامنے کارنس پر ڈکشنری رکھی ہے لے جاؤ ——— کیا یاد کرو گی"
دوسرے دن جب طلعت ڈکشنری دینے آئی تو حسبِ معمول بڑی کھٹی تھی وہ آتے ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔
"لیجئے اپنی ڈکشنری، مشکل حل ہو گئی ——— بہت بہت شکریہ" وہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔
"بہت رکھی ہوتی جا رہی ہو ——— خدا خیر کرے"
"واہ بھئی ——— یہ بھی کوئی بات ہوئی ——— شکریہ ادا کرنے پر بھی جناب کو اعتراض ہے۔"
طلعت نے یونہی ڈکشنری کا ورق الٹا۔
"شکریہ پر تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے"
"تو اور"
"اعتراض تو تمہارے لہجے اور انداز پر ہے"
اس نے سوچا یہ طلعت خواہ مخواہ اس کا تمسخر اڑا کر اپنی انا کو تسکین دینا چاہتی ہے۔ نادان ——— بیوقوف لڑکی۔
"پتہ نہیں آپ چند دنوں سے کچھ کچھے کچھے ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ وجہ سمجھ میں نہیں آئی"
طلعت نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔
ایک دم اس کی نظروں کے سامنے چاندی کی وہ دیوار آگئی جس نے اس حویلی کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ یہ سب کچھ طلعت کو بتا دے۔ لیکن اس سے فائدہ؟ اس نے سوچا۔ پتھر پر ٹھوکریں مارنے سے اپنے ہی پیروں پر چوٹیں آتی ہیں۔ اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔
طلعت نے اٹھ کر ڈکشنری کارنس پر رکھ دی۔ اس کی نظریں گلدان پر پڑیں تو وہ کسی بچے کی طرح خوشی سے اچھل پڑی۔
"ارے انجم بھائی پھول تو بہت خوبصورت ہیں"

"شکریہ۔"

"اب آپ بھی رسمی ہوتے جا رہے ہیں۔"

"کیا کریں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہی ہے۔"

"تو آپ ——— میرا مطلب ... ..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں ہاں ——— میں ——— میں خربوزہ ہی تو ہوں" اس نے بات پوری کر دی۔

طلعت ایک دم ہنس پڑی۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد طلعت پھر چہکنے لگی۔

"آپ برا نہ مانیں تو ایک بات اور کہوں"

"ضرور ——— ایک نہیں دس باتیں کہو ——— دس"

"یہ کاغذ کے پھولوں کے بجائے اصل پھول کیوں نہیں سجاتے ہیں آپ؟"

"اس لیے کہ یہ کبھی دغا نہیں دیتے ہیں۔"

"بڑی گہری باتیں کر رہے ہیں آپ ——— بھئی میرے تو کچھ پلے نہیں پڑا۔"

"صاف بات ہے"

"کیا"

"اصلی پھول تو دو ایک ہی دن مرجھا جاتے ہیں۔ اور یہ کاغذ کے پھول تم دیکھ ہی رہی ہو کتنے دنوں سے گلدانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں اور روز اول کی طرح بہار دکھا رہے ہیں۔"

"یہ تو محض آپ کی خود فریبی ہے۔"

"یہی سہی ——— لیکن خود فریبی میں بھی اکثر ایک بہت بڑا سہارا ہوتا ہے۔ شاید تم ابھی یہ بات نہ سمجھ سکو"

"ابھی سے آپ کی کیا مراد ہے۔"

"بس ——— شاید ... ... بس یونہی منہ سے نکل گیا ——— میرا مطلب ہے تم اس کو نہیں سمجھ سکتیں۔"

"آجکل میرا خیال ہے آپ فلسفہ کا مطالعہ کچھ زیادہ ہی کر رہے ہیں۔"

"ہاں ——— زندگی بھی تو آخر ایک فلسفہ ہی ہے"

"اچھا"

"ہاں ——— اس ناچیز کا تو یہی خیال ہے۔"

باہر کسی دوست نے آواز دی تو یہ سلسلہ ادھورا رہ گیا، اور طلعت ایک شانِ استغنائی کے ساتھ اٹھلاتی ہوئی واپس چلی گئی۔

کئی دن بعد ایک خوشگوار شام کو ڈاکٹر صاحب کے چند دوستوں کی دعوت تھی۔ مردوں کے ساتھ مستورات بھی آئی ہوئی تھیں۔ اور حویلی میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ بچوں کا شور، عورتوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی باتیں، قہقہے، مسکراہٹیں —— اور باہر بیٹھک میں مردوں کی محفل —— جہاں حقوں کے دور چل رہے تھے۔

یہاں دعوت کی خبر صیغۂ راز میں رکھی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وقت سے قبل نہ تو اس کی والدہ کو علم ہوا۔ اور نہ ہی اس کے والد کو خبر ہوئی۔ عالیہ اور وہ جماعت میں تھے۔ چنانچہ یہ لوگ کوئی اہتمام ہی نہ کر سکے۔ وہی عام گھریلو کپڑے پہنے رہے۔ اور یوں ان کا کوئی فرد بھی جاگتی محفل میں شامل نہ ہو سکا۔ ان زمانوں میں تیرا مہمان والا معاملہ تھا۔ اس سے قبل کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

اور یہ بات کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ بات تو ایک نشتر کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ اور اس کے دل سے گاڑھا گاڑھا خون رس رس کر بہنے لگا۔ —— اور وہ پاتال میں اترتا چلا گیا۔ اور اس کے چاروں اُور اندھیرا چھاتا چلا گیا۔ اور اس کا دم بری طرح گھٹنے لگا۔

زندگی کا محور گردش میں آچکا تھا۔ جس کی رفتار دن بدن تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

اس تضحیک آمیز رویہ اور حویلی کی بدلی ہوئی فضا نے اسے اور سنجیدہ بنا دیا۔ اور وہ فلسفہ حیات میں اس قدر اُلجھ گیا کہ اس نے اُسے سلجھانے کی ٹھان لی۔ اس کے سامنے جو راستہ تھا۔ وہ بڑا ہی کٹھن اور ناہموار تھا —— سنگلاخ چٹانیں تھیں، غیر معمولی نشیب و فراز تھے اور جا بجا کانٹے بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے پرے جو ایک روشنی کا مینار تھا۔ اس تک پہنچنے کا تصور اتنا پرکشش تھا کہ وہ ساری صعوبتیں جھیلنے کے لیے تیار تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے تو وہ اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتا تھا۔

اس کے سینے میں تو ایک جوالہ مکھی پھٹ پڑا تھا۔ جس کی تپش اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ آخر کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اس کو ذلیل و حقیر سمجھے، اس کا خواہ مخواہ مذاق اڑائے۔

ایک اونچی چٹان پر بیٹھی زرق برق لباس زیب تن کیے ہوئے طلعت ہر وقت مسکراتی رہتی تھی جیسے اس کے وجود کے چیتھڑے اڑ رہی ہو۔

وہ ضرور اس روشنی کے مینار تک پہنچے گا، ضرور —— چاہے اسے انگاروں پر چل کر ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ دنیا کی کوئی مشکل اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ وہ تو بس دیوانہ ہو گیا تھا —— دیوانہ اور اس دیوانگی میں بلا کی شدت تھی —— بلا کی طاقت تھی۔

وہ شام کس قدر اداس اور غمگین تھی جب وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر لاہور کے لیے رختِ سفر باندھ رہا تھا۔ ماں باپ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی خواہش اور ضد کا خیال کرتے ہوئے دل پر پتھر رکھ لیے تھے۔ اس کو پاکستان جانے کی اجازت دے تو دی تھی، لیکن اس جدائی کے صدمے کی آنکھیں بے اختیار بہہ نکلی تھیں۔ یہی حال عالیہ کا تھا۔ گھر کے باقی افراد بھی چپ تھے۔ لیکن خاص طور سے طلعت بہت خاموش تھی۔ شاید اسے خیال ہے کہ اب اس کے احساس برتری کو کھیلنے کے لیے کوئی کھلونا نہ مل سکے گا۔ اس کی نگاہوں میں اس وقت بھی طنز کا رنگ نمایاں تھا۔ گویا تمسخر آمیز لہجے میں کہہ رہی ہو" جاؤ —— پاکستان جا کر آخر کون سا قلعہ سر کر لوگے۔"

اس نے جونہی کمرے سے باہر قدم نکالا گھر کے بے رنگ در و دیوار نے سسکیاں بھریں۔ اس سے بہت کچھ کہنا چاہا ——— اس کے پیروں میں زنجیریں ڈالیں ——— ایک پل کے لیے اس نے حسرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور پوری قوت سے زنجیریں توڑ ڈالیں۔ پھر آنسوؤں کے کئی جام پی کر اس نے من ہی من میں سب کو الوداع کہا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل آیا۔

نئے دیس میں وہ بالکل تنہا تھا۔ کوئی سر پہ ہاتھ رکھنے والا نہیں تھا۔ سر پہ ہاتھ رکھنا تو بزرگوں کا ہی مقدس فرض ہوتا ہے۔ البتہ لاہور میں اس کے ایک دو پرانے ساتھیوں نے دلاسہ ضرور دیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی بہت کچھ ڈھارس بندھ گئی تھی۔

اس نے ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کا آغاز کیا اور ساتھ ہی اپنی تعلیم کا بھی سلسلہ شروع کر دیا۔

اس کا تو مقصد حیات ہی روشنی کے مینار تک پہنچنا بن گیا تھا۔ چنانچہ اس کا ہر قدم اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ہی سہی، آخر کبھی نہ کبھی تو منزل آ ہی جائے گی۔ اس لگن میں اس قدر تند رتھا اس قدر روانی تھی کہ ہر شے بہتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ عزیز و اقارب کی جدائی کا غم بھی راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کر سکا۔ ارادوں کی جو حسین شاہراہ اس نے تعمیر کی تھی۔ وہ اس پر بڑی مستعدی کے ساتھ گامزن تھا۔

ایک طویل مدت کی سخت جانکاہی کے بعد آخر اس کو اپنی محنتوں کا صلہ مل گیا۔ وہ انجینیرنگ کا ڈپلوما امتیازی حیثیت سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور حکومت نے اس کو مزید تعلیم کے لیے امریکہ جانے کے لیے منتخب کر لیا۔

روشنی کے مینار کے نیچے پہنچ کر وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو دور دھندلی دھندلی روشنی میں طلعت پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔ اسے آج اس کے زرق برق لباس کی چمک دمک ماند پڑتی ہوئی نظر آئی۔

اس نے سوچا ابھی تو اسے اس مینار کے اوپر چڑھنا ہے۔ اور اس جگہ پہنچنا ہے۔ جہاں روشنی کا منبع ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ طلعت کو آواز دے گا۔ اور تب طلعت کی اپنی آواز شاید اس کے حلق میں اٹک کے رہ جائے گی۔ اور اس وقت وہ ہنسے گا اور طلعت پتھر کی مورتی بن جائے گی۔

امریکہ سے آتے ہی اس کو کراچی میں ایک انتہائی معقول ملازمت مل گئی اور اس نے اپنے ماں، باپ اور عالیہ کو مستقل طور پر کراچی بلوا لیا۔

ماں سے اس کو وہاں کے مفصل حالات معلوم ہوئے۔ اس کو بڑی حیرت ہوئی، ایک امتیازی حیثیت والے خاندان کی حسین و جمیل پڑھی لکھی لڑکی طلعت ابھی تک کنواری بیٹھی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ پیغام نہ آئے ہوں۔ کافی رشتے آئے۔ کچھ تو تعلیمی اور مالی حیثیت سے ہی ناقابل غور سمجھے گئے تھے اور جو ہر لحاظ سے موزوں تھے۔ ان میں خاندانی معیار آڑے آ گیا۔ آخر ایسی ویسی جگہ رشتہ جوڑ کر اونچے خاندان کی ناک تھوڑی ہی کٹوانی تھی۔ چنانچہ اسی لایعنیت کے باعث رہے سہے رشتے آنے بھی بتدریج کم ہو کر ختم ہوتے گئے۔

اس کے لیے یہ خبر مژدہ جانفزا ثابت ہوئی۔ اس نے دیکھا طلعت چپ چپ، اداس کھڑی تھی۔ پتہ نہیں وہ رعنائیاں، وہ مسکراہٹیں کہاں روپوش ہو گئی تھیں۔ اور وہ چاندی کی دیوار پتھر کی ایک تپتی ہوئی دیوار میں بدل گئی تھی۔ جس کی آنچ میں غرور اور تکبر کے سانپ سسک سسک کر دم توڑ رہے تھے۔

اور تب اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں ایک بار ضرور وہاں جائے گا۔ سرخرو ہونے اور اپنی توہین کا خاموش انتقام لینے کے لیے۔

زندگی کا کھیت دیکھتے دیکھتے لہلہا اٹھا تھا۔ اب دنیا کی ہر آسائش اس کے قدموں میں تھی۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ، کار، امپلائمنٹ ——— آسمان پر سے گہرے سیاہ بادل چھٹے تو ایک دم قوسِ قزح کے رنگ بکھر گئے۔

فوزیہ سے اس کی کوئی بات پوشیدہ نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی ساری کہانی اسے سنا دی تھی۔ سارے کونے کھدرے اس کو دکھا دیئے تھے۔ لیکن ایک کونے پر اس نے جان بوجھ کر پردہ ڈال رکھا تھا۔ یہ بات وہ کیسے ظاہر کر سکتا تھا۔ یہ تو سراسر اس کی تذلیل تھی ——— زبردست توہین تھی ———

اس نے تو فوزیہ کو صرف یہی بتایا تھا کہ وہ ہندوستان محض اپنی خالہ سے ملنے جا رہا ہے اور طلعت کے گھر والوں سے اس کے والدین کے تعلقات کچھ کشیدہ ہیں۔ اس لیے وہ وہاں جائے گا تو ضرور لیکن صرف چند گھنٹوں کے لیے۔ اس نے فوزیہ کو یہ بھی ہدایت کر دی تھی کہ اگر وہ لوگ کچھ دن قیام کرنے کے لیے اصرار کریں تو وہ اس بات میں دخل انداز نہ ہو۔ بلکہ اس کا اختیار اس پر چھوڑ دے۔ اس نے تو یہاں تک فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس گھر کا پانی تک نہیں پیئے گا۔

لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ وہ تو اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ کر کے طلعت کے غرور کو کچل دینا چاہتا تھا ——— ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا۔

طلعت بہن، تم تو غلیظ اور گندے پانی کے گڑھے میں پڑے ہوئے اس مینڈک کی مانند ہو جس نے باہر کی دنیا دیکھی ہی نہ ہو۔ فوزیہ کو دیکھو ——— اس کے خوب صورت خدوخال، ریشم کی طرح نرم و نازک بال، رنگ و روپ اور زیبائش کو دیکھو اور اپنی ذات سے مقابلہ کرو ——— تم خود کو سمجھتی کیا ہو۔

تو اس نے یہ ساری دوڑ دھوپ، بے جا مصارف کا بوجھ اور طویل سفر کی تکالیف محض اسی ایک بات کی خاطر قبول کی تھی۔ اس ایک بات نے تو اسے کیا سے کیا بنا ڈالا تھا۔

انجن زور سے چنگھاڑا تو اس کے تصورات کا آبگینہ ایک چھناکے کے ساتھ گر کر چکنا چور ہو گیا۔

اس نے گھڑی دیکھی سات بج گئے تھے باہر آسمان دُھل دھلا کر صاف ہو گیا تھا۔ چاروں طرف سنہری دھوپ پھیل گئی تھی۔ اور درخت، کھیت، کھلیان اور بجلی کے کھمبے تیزی سے مخالف سمت دوڑ رہے تھے۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ اوپر چڑھا دیا۔ اور سگریٹ سلگا کر کمپارٹمنٹ کا جائزہ لینے لگا۔ مونی توند والا مسافر مزے سے پوری کچوری کھانے میں مصروف تھا۔ وہ اس تیزی سے نوالے چبا رہا تھا جیسے اس نے کئی وقت سے کچھ نہ کھایا ہو۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی کی رفتار دھیرے دھیرے دھیمی ہو گئی اور دور آبادی کے نشان نظر آنے لگے۔ اس کی منزل قریب آ چکی تھی۔

اس نے اپنا سامان درست کیا۔ شیو بنایا، منہ ہاتھ دھویا، کپڑے تبدیل کیے اور اپنی سیٹ پر آ بیٹھا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے

ملا۔ اس کے دل میں مسرت کی ایک نئی کرن اجاگر ہو گئی۔ بارہ سال بعد ——— بارہ سال بعد ——— اس نے نظروں ہی نظروں میں اس سرزمین کو بوسہ دیا۔ اور پھر طرح طرح کے خیالات کے ہجوم میں گم ہو کر وہ جذباتی سا ہو گیا۔

گاڑی کی رفتار دھیمی ہو گئی پھر ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ سامنے قصبہ کا چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔

قلی نے سامان نیچے رکھا اور وہ فوزیہ کو اتارنے برابر والے کمپارٹمنٹ تک چلا گیا۔

فوزیہ بھی ہنستی مسکراتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

"فوزی، تمہاری کفایت شعاری نے ایک پنتھ دو کاج کا کام کیا ہے۔"

"اچھا"

"ہاں ——— انٹر کلاس کے ٹکٹ خریدنے سے ایک تو خاصی رقم کی بچت ہو گئی۔ دوسرے سفر میں تنہائی کی اذیت بھی نہیں ہوئی سیکنڈ کلاس تو قریب قریب خالی پڑا تھا۔"

"جب انٹر کلاس میں رش ہی نہ ہو تو سیکنڈ کلاس کی ٹکٹ خریدنا کہاں کی عقلمندی ہے۔"

"یہی تو میں عرض کر رہا ہوں حضور ——— کفایت شعاری بہرحال ایک اچھی عادت ہے۔"

"شکریہ" فوزیہ نے مسکرا کر کہا۔

پھر اس نے قلی کو تانگہ منتخب کرنے کا حکم دیا۔ اسے تانگوں کی بھیڑ بھاڑ میں تانگے والوں کی بوچھاڑ قطعی پسند نہ تھی۔ اس نے فوزیہ کو خاص نظروں سے دیکھا۔ وہ اس وقت سبز رنگ کی ساڑھی میں بڑی دلآویز نظر آ رہی تھی۔

"کہاں کھو گئے ہو ——— خیریت تو ہے۔"

"ہاں" اس کے منہ سے خود بخود نکل گیا۔

وہ تو اس وقت فوزیہ اور طلعت کو حسن کی ترازو میں تول رہا تھا۔ اور فوزیہ کا پلڑا بھاری دیکھ کر دل ہی دل میں مسرور ہو رہا تھا۔

اس نے گفتگو کا موضوع بدلا۔

"ہاں، وہ بات تو ادھوری ہی رہ گئی۔"

"کونسی بات"

"راستے میں بڑا مزا آیا"

"اچھا"

"ہاں ——— ایک بات سنو گی تو دنگ رہ جاؤ گی"

"سناؤ گے بھی یا یونہی طول دیئے جاؤ گے"

"تمہیں میری خیسند سے شکایت ہے نا"

"ہاں ہاں ——— یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے"

"پریتم نے اس موٹی توند والے لالہ کو نہیں دیکھا، جو شام سے ہی آنکھیں موند کر لیٹ گیا تھا۔ اور صبح تک خراٹے لیتا رہا۔
"آپ کا اثر پڑ گیا ہو گا بے چارے پر" فوزیہ کو شرارت سوجھی۔
"یہ بات ہرگز نہیں ہے فوزی ——— وہ تو اس کھیل میں مجھ سے بہت آگے نکل گیا ہے"
"وہ کس طرح"
"وہ اس طرح کہ انجن نے ہزار ہا سیٹیاں بجائیں، بادل کئی بار زور سے گرجے، پر اس اللہ کے بندے کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی ——— کروٹ تک نہیں بدلی ظالم نے"
"بات آپ نے خوب بنائی ہے"
"یقین نہ آئے تو حلفیہ گواہی دلوا دوں"
"ارے آپ تو سیریس (SERIOUS) ہو گئے ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے ——— مجھے یقین آ گیا ہے"
اتنے میں قلی نے نزدیک آ کر کہا "صاحب تانگہ تیار ہے"
"چلو سامان اٹھاؤ"

خالہ کے ہاں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وہ طلعت کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے اپنا سب سے قیمتی سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ فوزیہ بھی قرمزی رنگ کی ساری میں بڑی حسین اور بھولی بھالی نظر آ رہی تھی۔ دونوں اس قدر احتیاط سے بنے سنورے ہوئے تھے جیسے حسن اور فیشن کے کسی مقابلہ میں شریک ہونے جا رہے ہوں۔

حویلی کی ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں ایک دم تیز ہو گئیں۔ چند لمحے تک اس نے وہیں کھڑے ہو کر اس کیفیت پر قابو پایا پھر اندر داخل ہو گیا۔ وہ سیدھا منجھلی چچی کے کمرے میں چلا گیا۔ فوزیہ اس کے دوش بدوش تھی۔ حویلی میں یکایک کھلبلی سی مچ گئی۔ چھوٹی چچی اور ان کی لڑکی خالدہ بھی فوراً وہیں آ گئیں۔ نوکر چاکر بھی بھاگتے ہوئے آ پہنچے۔ سب نے ان کو اس طرح گھیر لیا، جیسے ان کا انٹرویو لینا چاہتے ہوں۔

دونوں چچیاں اسے یوں حیران کن نظروں سے دیکھ رہی تھیں، جیسے یک زبان ہو کر کہہ رہی ہوں "ارے انجم، یہ تم ہو انجم ——— وہی انجم ——— یقین نہیں آتا" طلعت بھی خاموش تھی اور چور نظروں سے اسے اور فوزیہ کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ وہ پھٹا کا پٹو سر پر ڈالے بڑی احتیاط سے بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے اس کا فوٹو کھینچا جانے والا ہو۔

اس نے فوزیہ کا سب سے تعارف کرایا۔ پھر پوچھنے لگا "یہ راشد کہاں ہے؟"
"علی گڑھ گیا ہے، بیوی بچوں کو لانے کے لیے" منجھلی چچی نے جواب دیا۔
"اچھا تو حضرت بال بچوں میں گھر گئے ہیں"
اس نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی یہ بھی نہیں کہ شادی کہاں ہوئی ہے کب ہوئی ہے۔
"تمہاری امی اور ابا تو خیریت سے ہیں" چھوٹی چچی نے دریافت کیا۔

"ہاں ——— خدا کا شکر ہے۔"

"اور عالیہ ———؟"

"وہ بھی اپنے گھر خوش ہے۔"

"اچھا تو اس کی بھی شادی ہو گئی۔ !"

"ہاں اس کی شادی کو تو ڈیڑھ سال ہو گیا۔"

فوزیہ کچھ اکھڑی اکھڑی تکلیف کے سے انداز میں بیٹھی تھی۔ شاید اسی وجہ سے مجھلی چچی نے اس کو ہدایت دینی ضروری سمجھی۔

"دلہن آرام سے بیٹھو ——— یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔"

"میں تو بہت آرام سے بیٹھی ہوں ——— آپ بالکل فکر نہ کریں" فوزیہ نے پہلو بدل کر جواب دیا۔

"اور ہاں انجم تم نے یہ اچھا نہیں کیا کہ یہاں نہیں ٹھہرے" چھوٹی چچی نے شکایت کی۔

"کوئی بات نہیں ہے چچی جان ——— دو چار دن تک حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔"

"اتنے عرصے میں تم نے کوئی خط بھی نہیں لکھا" مجھلی چچی نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

"بس غیر معمولی مصروفیات حائل رہیں۔"

"کم از کم آنے کی اطلاع ہی کر دی ہوتی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ——— ویسے میرا خیال ہے کہ یوں اچانک پہنچنے میں بڑا (CHARM) ہوتا ہے، خالہ کے گھر بھی میں نے اطلاع نہیں کی۔"

"چھٹی کتنے دن کی لائے ہو۔"

"بڑی مشکل سے پندرہ دن کی اجازت ملی ہے۔"

خالدہ بڑے پُر اشتیاق انداز سے اس کو اور فوزیہ کو تکے جا رہی تھی، جیسے کہہ رہی ہو "کچھ ہم سے بھی بات کرو۔"

اس نے فوراً ہی خالدہ کی اس خواہش کا احترام کیا "کیا دیکھ رہی ہو خالدہ ——— مگر ہاں تم کیا جانو؟" اس نے بات کا اشارہ کیا۔ "اتنی سی تھیں تم جب میں یہاں سے گیا تھا ——— کون سی کلاس میں پڑھتی ہو۔"

"دسویں کی تیاری کر رہی ہوں" خالدہ نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت خوب، بہت خوب"

چھوٹی چچی نے اٹھ کر اچانک اعلان کیا۔

"اچھا تو دلہن اب آرام سے بیٹھو۔ کھانا کھا کر جانا۔"

"دیکھئے چچی جان اس وقت تو معافی چاہوں گا۔ خالہ انتظار کر رہی ہوں گی ——— انشاء اللہ پھر آؤں گا۔"

اس جواب پہ جیسے سب نے برا منایا ہو۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد سوائے طلعت کے سب اپنے اپنے کمروں میں

چلے گئے۔

اور تب اس نے طلعت کی طرف توجہ کی۔

"کہو طلعت اچھی تو ہو؟"

"ہاں" طلعت نے نیچی نگاہوں سے جواب دیا۔

اس نے غور سے دیکھا۔ طلعت کا دوپٹہ سر سے ڈھلک گیا تھا۔ اس کے بالوں میں اکثر بال سفید تھے۔ وہ مسکراہٹیں، وہ قہقہے، وہ حسن، وہ رنگ وہ روپ سب کچھ پھیکا پڑ چکا تھا ——— معدوم ہو چکا تھا۔ شوخ چنچل خوشی میں جھومتی ہوئی طلعت کی جگہ ایک سنجیدہ اور بجھی بجھی لڑکی بیٹھی تھی۔ جو قبل از وقت جوانی کو خیرباد کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی مخمور چمک تو اب وہ تصور ہی میں دیکھ سکتا تھا، وہاں تو بس ویرانی ہی ویرانی برس رہی تھی۔ حزن و یاس کا سماں بندھا ہوا تھا۔

اسے یوں احساس ہوا جیسے یہ ساری حویلی ہی غیر آباد، سنسان اور اجاڑ ہو گئی ہو، بالکل طلعت کے دل کی طرح:
انتقام کی وہ آگ جو بارہ سال سے دہک رہی تھی اور جس کو لے کر وہ سیکڑوں میل سے یہاں آیا تھا۔ آپ ہی آپ سرد پڑ گئی۔ اس کا دل ہمدردی اور غمگساری کے جذبے سے معمور ہو گیا۔

یہ اس کو کیا ہو گیا ہے ——— کیوں ہو گیا ہے ——— کیسے ہو گیا ہے۔

فوزیہ شاید اس خاموشی سے اکتا گئی تھی۔ اس نے قریب میز پر پڑا ہوا رسالہ اٹھا لیا اور ورق گردانی کرنے لگی۔

آخر طلعت نے ہی مہر سکوت توڑی۔

"بھائی آپ تو اس قدر جلدی نہ کیجئے۔ کھانا تو آپ کو ضرور کھانا پڑے گا۔"

"اپنے بھائی سے کہو" فوزیہ نے رسالہ میز پہ رکھ دیا۔

طلعت نے اداس نظروں سے انجم کو دیکھا اور تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

"کیوں انجم بھائی آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال" وہ چونک سا گیا۔ "اب تمہاری خواہش ہے تو کھانا ضرور کھائیں گے اور پہلے چند دن تمہارے گھر ہی قیام کریں گے خالہ کے ہاں بعد میں دیکھا جائے گا۔"

فوزیہ کو اس غیر متوقع تغیر پر بڑا تعجب ہوا۔ اس نے بڑی حیرت و استعجاب کے ساتھ انجم کو دیکھا۔ اور میز پر سے رسالہ اٹھا کر پھر ورق گردانی کرنے لگی۔

حافظ اور ذال فارسی

قاضی عبد الودود

(۱) فارسی میں اب محض چند لفظ رہ گئے ہیں جو ذال معجمہ سے لکھے جاتے ہیں: پذیرفتن، گذشتن، آذر، کاغذ وغیرہ۔ لیکن چند سو سال قبل یہ کیفیت نہ تھی۔ اس زمانے میں یہ بتانے کی غرض سے کہ کون سے فارسی الفاظ ذال معجمہ اور کون سے دال مہملہ سے لکھے جائیں، متعدد شعرا نے نظمیں لکھی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

آنانکہ بفارسی سخن میرانند — در معرض ذال دال را بنشانند

ماقبل وی ار ساکن جز وای بود — دالست وگرنہ ذال معجم خوانند

مطلب یہ کہ حرف ماقبل ساکن ہے اور صحیح (غیر از ا، و، ی) تو دال مہملہ چاہیے ورنہ ذال معجمہ۔ اس قاعدے کے مطابق 'برد'، 'وزد'، 'درد'، 'گزند' (الفاظ ۱ تا ۳ میں حرف 'ر' اور لفظ ۴ میں حرف 'ز' ساکن، حرف آخر دال مہملہ ہے) اور 'باد'، 'شاد'، 'بود' (حرف متحرک) اور 'رد'، 'دو'، 'ید' (حرف متحرک) وغیرہ کا حرف آخر ذال معجمہ۔ شعرا قوافی میں اس کا خیال رکھتے تھے کہ عربی کے دالیہ قوافی فارسی کے ذالیہ قوافی کے ساتھ اور عربی کے ذالیہ قوافی فارسی کے دالیہ قوافی کے ساتھ مخلوط نہ ہوں، اور احیاناً ایسے قوافی آجاتے تھے تو اسے عیب سمجھتے تھے، اور اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ شاعر نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے؛ چنانچہ انوری ایک رباعی میں جو کلیات مطبوعہ میں موجود ہے، 'بنموذ'، 'افزوذ' اور 'بوذ' کے ساتھ عربی لفظ 'جود' بطور قافیہ لایا، تو اس کا اس نے ذکر کیا ہے:

دستت بسخا چون ید بیضا بنموذ — از جود تو بر جہان جہانی افزوذ

کس چون تو سخی نیست و نی خواہد بوذ — گر قافیہ دال شوذ زہی عالم جود

(۲) ایران کے نامور محقق محمد قزوینی نے باشتراک ڈاکٹر قاسم غنی دیوان حافظ کا جو نسخہ مرتب کیا تھا اس کے مقدمے میں انھوں نے لکھا ہے: "در بسیاری از نسخ قدیمہ "قوافی دال" را از قوافی ذال" فارسی بمقتضای قاعدۂ معروف" از ہم مجزا ساختہ، و قوافی دالی را قبل از قوافی ذالی نوشتہ اند، ولی چون در عصر ما بلکہ از چندین قرن باین طرف دیگر اصلاً و ابداً نہ در تلفظ و نہ در کتابت فرقی مابین دال' و ذال" نمیگذارند و ہر دو را بصورت "دال" ہم مینویسند و ہم تلفظ میکنند (اگرچہ اکثر شعرای اساتید در قوافی اشعار خود ہرگز مابین آن دو خلط نمیکنند)، و اگر ما میخواستیم کہ مابین این دو نوع قوافی تفکیک نماییم، این تفکیک موجب نقض غرضی میشد کہ ما بدان غرض قوافی را کاملاً و دقیقاً بحروف تہجی مرتب نمودہ ایم، یعنی تسہیل یافتن ہر غزلی مطلوبہ برای خوانندہ" اس نسخے سے پذیرفتن کی قسم کے الفاظ اور ص۳۶۶ کے لفظ 'امیذ' سے قطع نظر، کل فارسی الفاظ جو پہلے ذال سے لکھے جاتے تھے، دال سے مرقوم ہیں۔

(۳) ذال فارسی کے بارے میں مسلک حافظ کا علم امور ذیل سے ہو سکتا ہے:

۱؎ تفاصیل کے لیے راقم کا مقالہ "غالب اور ذال فارسی" شائع کردہ آجکل دہلی ملاحظہ ہو۔

(الف) غزلہائے ذیل صرف فارسی کے ذالیہ قوافی ہیں (۱) ساقیا آمدن عید مبارک بادت ۱۴ (۲) برو بکار خود ای واعظ اینچہ فریاد است ۲۵ (۳) بیا کہ قصر امل سخت سست بنیاد است (۴) دی پیر میفروش کہ ذکرش بخیر باد ۶۹ (۵) دوش آگہی زیار سفر کردہ داد یاد ۷۰ (۶) یاد باد آنکہ زما وقت سفر یاد نکرد ۹۸ (۷) در خاتم لعل ابروی تو بیاد آمد ۱۱۷ (۸) کلک مشکین تو روزی کہ زما یاد کند (۹) ابر آذاری برآمد باد نوروزی وزید ۱۹۲ (۱۰) روی بنمای و وجود خودم از یاد ببر ۱۹۹ (۱۱) زلف بر باد مدہ تا ندہی بربادم ۲۱۵ (۱۲) فاش میگویم و از گفتہ خود دلشادم ۲۱۶ (۱۳) خیال نقش تو در کارگاہ دیدہ کشیدم ۲۱۹ (۱۴) ما بیغایت سست دل از دست دادہ ایم ۲۵۱ (۱۵) از من جدا مشو کہ توام نور دیدۂ ۲۹۴ (۱۶) دامن کشان ہمی شد در شرب زرکشیدہ ۲۹۲ (۱۷) بشنو این نکتہ کہ خود را ز غم آزادہ کنی ۳۰۴

(ب) مثنویوں میں بعض اشعار ایسے ہیں جن قوافی کا اختلاط ہو سکتا تھا، لیکن ایسا نہیں ہُوا

(ج) ۳ قطعوں میں صرف فارسی کے ذالیہ قوافی ہیں (۱) بعہد ابو اسحق / پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد ۳۹۳ (۲) دل اسباب او / زانکہ از دی کس وفاداری ندید ۳۹۶ (۳) برسد "میز نند / بشنوید ای ساکنان کوی رندی بشنوید[1] ۳۹۷

(د) رباعی "از چرخ بہر گونہ ہمی دار امید" ۳۷۹ میں صرف ذالیہ قوافی فارسی

(ہ) غزل "کنوں کہ درچمن آمد گل از عدم بوجود" ۱۴۸ اور قطعہ "روح" قرخ / برقبۂ طارم زبرجد[2]"

(و) غزل "جہان بر ادی عید از وصال دسمہ کشید" ۱۶۱ اور غزل "رسید مژدہ کہ آمد بہار و سبزہ دمید" ۱۶۰ میں عربی لفظ نبید[3] بطور قافیہ آیا ہے

(ز) غزل "شراب و عیش نہان چیست کار بی بنیاد" ۶۹ کا ایک قافیہ "قباد[4]" ہے۔

(ح) غزل "خیز تا از در میخانہ گشادی طلبیم" ۲۵۴ جس مرادی، مرادی، مدادی، زادی، سوادی، قوافی بھی گشادی، نہادی، دادی، شادی کے ساتھ آئے ہیں

(ط) ایک غزل کے بیشتر مصرعے عربی، قوافی (ہادی وغیرہ) سبت سلمی بصدغیہا فوادی ۳۰۴ اس میں بعض بعض ذالیہ فارسی قوافی بھی نشادی، نشادی

(ی) سہ بیتی قطعۂ تاریخ وفات متعلق عہد حافظ ۶۶۲ ۔ قوافی سجود، وجود اور جود ہیں۔ اس کے مادۂ تاریخ میں جو مصرع ۲ میں ہے لفظ امیذ آیا ہے اور اس کے عدد ۷۱ لیے ہیں:

تا کس امید جود ندارد دگر زکس   آمد حروف سال وفاتش امیذ جود

لفظ "امیذ" اگر دال مہملہ سے لکھا جائے تو "امید جود" سے ۶۸ نکلے گا جو کسی طرح عدد مطلوب نہیں۔

(۴) حافظ بعض اوقات معیوب قوافی لاتے ہیں، مثلاً ایک غزل کا افتتاحی شعر ہے:

صلاح کار کجا و من خراب کجا   ببین تفاوت رہ کز کجاست تا بکجا

۱۔ بشنوید کی ی مجہول ہے اس لیے اس کا قافیہ اگر کوئی عربی لفظ نہ آئے تو جائے تعجب نہیں؛

۲۔ زبرجد قاموس میں دال مہملہ کے ساتھ۔

۳۔ عربی میں ذال کے ساتھ، متاخر شعرای فارسی میں سے بعض کے یہاں دالیہ قوافی کے ساتھ آیا ہے

۴۔ قباد معرب لفظ ہے، اور عربی میں حرف آخر دال مہملہ نہیں، ذال معجمہ ہے۔ رجوع بہ تاریخ طبری طبع یورپ جلد ۲ متاخر ساسانی بادشاہوں کا بیان۔

مصرعِ ثانی میں روی متحرک ہے، لیکن اسے چھوڑ کر جس مصرع میں بھی قافیہ ہے، روی ساکن ہے۔

که خواهد شد بگوییدای رفیقان   رفیق بے کسان یارِ غریبان ۳۵۴

مثنوی کی اس بیت میں صریحاً ایطائے جلی ہے۔ اس بنا پر محض اس بنا پر کہ کہیں کہیں عربی کے ذالیہ قوافی کے ساتھ فارسی کے ذالیہ قوافی آئے ہیں، قطعی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ حافظ ذال فارسی کے متعلق قاعدۂ مذکورہ پر عمل کرتے تھے۔ مزید یہ کہ ان کے یہاں عربی کے دالیہ قوافی کے ساتھ فارسی کے ذالیہ قوافی بھی آئے ہیں۔ مگر یہ بات کہ حافظ نے امیذ کا عدد ۱۱ لیا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ ذال معجمہ سے ہو، قطعی طور پر ثابت ہے کہ وہ قاعدۂ مذکورہ سے واقف اور اسے صحیح سمجھتے تھے۔ رہی ان کی کبھی کبھی خلاف ورزی، تو انھوں نے بعض دوسرے قاعدوں کی بھی خلاف ورزی کی ہے۔

فضلی کی کربل کتھا

ڈاکٹر گیان چند

کئی سال ہوئے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے یورپ سے پچاس سے زیادہ نادر اور نایاب مخطوطات کے عکس حاصل کئے اور انھیں سلسلۂ اشاعت مخطوطات اردو کے نام سے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب فضلی کی کربل کتھا اور دوسری کتاب تذکرہ عمدۂ منتخبہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں جواہر لال نہرو کے نام معنون ہیں اور پہلی اپریل ۱۹۶۱ء کو ایک خاص تقریب میں انھیں پیش کی گئیں۔ سکریٹری شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے اس تقریب کی رپورٹ ہماری زبان بابت یکم مئی ۱۹۶۱ء میں شائع کی ہے کربل کتھا کے نسخے کی نقل ٹیوبن گن یونیورسٹی جرمنی کے ذخیرۂ اشپرنگر سے حاصل ہوئی ہے پیشکش کی تقریب کی تاریخ پہلے سے مقرر ہو چکی تھی شاید اس وقت تک نسخہ حسب دل خواہ تیار نہ ہو سکا جس کی وجہ سے پنڈت نہرو کو تو جلد پیش کر دی گئی لیکن نسخہ بازار میں نہیں دیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۶۵ء میں جب میرا تقرر جموں کشمیر یونیورسٹی کی شاخ جموں میں اردو پروفیسر کی حیثیت سے ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایم اے کے نصاب میں منجملہ اور کتابوں کے کربل کتھا : فضلی شائع کردہ شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی بھی ہے۔ ایک پریشانی ہوئی کہ اس گوہر نایاب کو کیونکر حاصل کیا جائے خوش قسمتی سے ۲۲ر اکتوبر اور یکم نومبر ۱۹۶۵ء کے ہماری زبان میں دلی کے شعبۂ اردو کی جانب سے اشتہار ہوا کہ اب کربل کتھا شائع کر دی گئی ہے ..... لیکن پیالے اور ہونٹوں کے بیچ پھر کوئی افتاد درپیش آئی اور اشاعت معرض التوا میں پڑ گئی۔ ادھر اکتوبر ۱۹۶۵ء میں جناب مالک رام و ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اپنے طور پر کربل کتھا شائع کر دی۔ مقدمے میں مرتبین نے دعویٰ کیا ہے۔

"یہ کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی اور پہلی بار منظر عام پر آ رہی ہے" یہ دعویٰ نیم حقیقت ہے۔ کربل کتھا کو پہلی بار ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے چھپایا لیکن ان کا مرتبہ نسخہ صرف ایک فرد تک پہنچا عام قارئین تک نہیں۔ بازار میں پہلی بار مالک رام و مختار الدین احمد کا نسخہ آیا ہے جس میں کربل کتھا کا مکمل متن یعنی بارہ کی بارہ مجلسیں اور خاتمے کی پانچوں فصلیں شامل ہیں۔ یہ سطور اسی نسخے کو پیش نظر رکھ کر لکھی جا رہی ہیں۔

دنیا کے سامنے کربل کتھا کا تعارف پہلی بار مولوی کریم الدین نے اپنے تذکرے طبقات شعرائے ہند (مطبوعہ ۱۸۴۸ء) کے ذریعے کیا۔ ان کے پاس کربل کتھا کا ایک نسخہ تھا۔ اشپرنگر کے کتب خانے میں بھی اس کا ایک مخطوطہ تھا۔ ۱۸۵۴ء میں اشپرنگر کے کتب خانے کی جو فہرست شائع ہوئی اس میں نمبر ۳۰ کے تحت دہ مجلس کا ذکر ہے۔ کریم الدین کے بیان کو دیکھ کر آزاد نے آب حیات میں اس کا تعارف کرایا اور وہیں سے تاریخ ادب اردو کے ہر طالب علم کو اس کتاب کے بارے میں علم ہوا۔ بیسویں صدی کے جتنے مؤرخین نے فضلی کی کتاب کا ذکر کیا ہے وہ کریم الدین کے اندراج ہی پر مبنی ہے۔

ابھی چند سال پیشتر تک کربل کتھا کا کوئی مخطوطہ موجود نہ تھا۔ ڈاکٹر زور کو تو اس کے وجود ہی میں شک ہو گیا تھا۔ لکھتے ہیں[1]۔

"مشہور ہے کہ فضلی نام ایک اردو کے اہلِ قلم نے فارسی کتاب روضۃ الشہدا کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کا ذکر آبِ حیات میں کیا گیا ہے اور اسی بنیاد پر یہ روایت مشہور ہے لیکن اس کا صرف نام ہی سنا جاتا ہے۔ کوئی قلمی نسخہ اس اردو روضۃ الشہدا کا موجود نہیں ہے"

حامد حسن قادری کو مفتیان گوپامئو کے قدیم کتب خانے میں روضۃ الشہدا کا ایک بے نام و نشان اردو ترجمہ ملا۔ چونکہ ان کے علم میں کربل کتھا کے سوا اس کتاب کا کوئی اور قدیم ترجمہ نہ تھا اس لئے انہوں نے فرض کر لیا کہ یہ فضلی کی کربل کتھا ہی ہے[2] اور اس کی مجلس چہارم سے ایک نمونہ پیش کیا۔ اس اقتباس کی زبان فضلی کی کربل کتھا سے زیادہ صاف ہے اور یہ عبارت کربل کتھا کی مجلس چہارم میں کہیں موجود نہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ روضۃ الشہدا کا کوئی اور اردو ترجمہ ہے جو فضلی سے کافی بعد کا ہے۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد اپنی تحقیق کے سلسلے میں ۱۹۵۵ء میں یورپ گئے تو قاضی عبدالودود نے فرمائش کی کہ کہیں سے ذخیرۂ اشپرنگر کا پتہ چل سکے تو کربل کتھا کی تلاش کیجیے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے جس انتھک لگن اور محنت کے ساتھ اس کتاب کی تلاش کی ہے اس کی تفصیل ان کے مطبوعہ نسخے کے مقدمے میں درج ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ڈاکٹر احمد نے یورپ کے متعدد کتب خانوں میں بنفسِ نفیس تلاش کی اور بقیہ کو خط و کتابت کے ذریعے ٹٹولا۔ آخر آخر وہ اپنا تحقیق کا کام چھوڑ کر جرمنی کے کتب خانوں میں اس مخطوطے کے سراغ میں لگ گئے۔ جو تندہ یابندہ۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں ٹیوبن گن یونیورسٹی لائبریری کے تہ خانہ نما نمات میں اس چشمۂ آبِ حیات ہندوستان کا سوتا نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اپریل ۱۹۵۶ء میں جب وہ ہندوستان واپس آئے تو کربل کتھا کا عکس ان کے ساتھ تھا۔

ڈاکٹر عبدالحق اور دوسرے حضرات نے دکنی کے بیش بہا نادر مخطوطات دریافت کر کے شائع کئے اور اس طرح اردو ادب کی تاریخ میں کئی صدیوں کا اضافہ کر دیا لیکن شمالی ہند کے ادب میں آج تک مخطوطۂ کربل کتھا کے برابر اہم کوئی دریافت نہیں ہوئی۔ اس طرح ڈاکٹر مختار الدین احمد بلاشبہ اردو کے بہت بڑے محسن ہیں۔ موصوف مخطوطے کا عکس تو لے آئے لیکن اسے شائع نہ کیا۔ شائع کرنا تو درکنار اس پر ایک مضمون بھی نہ لکھا۔ ہاں نجی بات چیت میں ضرور کچھ لوگوں سے اس بازیافتِ غیر مترقبہ کا ذکر کیا۔

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

چند سال بعد ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی جرمنی گئے تو وہ بھی اس گنجِ گراں مایہ کا عکس لے آئے اور انہوں نے ۱۹۶۱ء میں اس کو چھاپ دیا۔ اس کے بعد بھی ڈاکٹر مختار الدین نے اپنا نسخہ شائع نہ کیا۔ آخر مالک رام صاحب کے اشتراک سے انہوں نے اکتوبر ۱۹۶۵ء میں کربل کتھا شائع کی۔ ادارت اس خوبی سے کی گئی ہے کہ باید و شاید۔ محض ایک نسخے کی بنا پر کسی متن کو پڑھنے میں جو دشواریاں آتی ہیں ان سے وہی حضرات واقف ہیں جنہیں مخطوطوں کا کچھ تجربہ ہے لیکن اس کے باوجود کربل کتھا اس صحت اور دیدہ زیبی سے شائع ہوئی ہے کہ دیر آید درست آید کا اطلاق ایسے ہی کارناموں پر ہوتا ہے۔

---

[1] تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر زور ص۳۵ ۔ [2] داستانِ تاریخ اردو طبع دوم ص۵۰

کربل کتھا جیسی کتاب کی ترتیب محض اردو کے ادیب کے بس کی بات نہ تھی اس کے لئے عربی اور اسلامیات کا ماہر ہونا ضروری تھا
ڈاکٹر مختار الدین احمد تو اس شعبے کے ماہر ہیں ہی مالک رام صاحب بھی ان فنون سے بے بہرہ نہیں۔ متن کے ساتھ فٹ نوٹ میں دیئے
ہوئے حواشی سے مرتبین کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آخر میں جو عربی فارسی اور اردو کی فہرست کتابیات دی ہے وہ مرتبین کی کا
کاوش کی آئینہ دار ہے۔ زیادہ تر کتب مشرقِ وسطیٰ یا یورپ کی مطبوعہ ہیں۔ ان میں کئی کمیاب بلکہ نایاب ایڈیشن شامل ہیں۔

مرتبین نے پورا زور صرف کر کے اس کتاب کو ترتیب کا مکمل نمونہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں کس درجہ عرق ریزی
کام لیا ہے اس کا بہترین مظہر متن کے آخر میں شامل اشاریہ ہے۔ آج تک اردو کی کسی کتاب میں اتنا مفصل اور مکمل اشاریہ دیکھنے میں نہ
آیا۔ اشاریے کو موضوعات کے لحاظ سے مختلف حصوں میں اس ترتیب سے بانٹ دیا گیا ہے

فہرستِ اعلام۔ فہرستِ امم و قبائل۔ فہرستِ غزوات و ایام۔ فہرستِ بلاد و اماکن۔ فہرستِ آیاتِ قرآنی۔ فہرستِ احادیث۔
فہرستِ اقوال و حکم۔ فہرستِ کتب واردہ در متن۔ فہرستِ الفاظِ مستعملۂ قدیم۔

مورخ الذکر فہرست سب سے زیادہ کام کی ہے۔ جو حضرات شمالی ہند کی قدیم اردو کا مطالعہ کرنا چاہیں ان کے لئے یہ مختصر فہرست
بڑی مفید ہے۔ اس فہرست میں لفظوں کے معنی نہیں دیئے گئے کیونکہ یہ اشاریہ ہے فرہنگ نہیں۔ ان الفاظ کے معنی متن کے درمیان
فٹ نوٹ میں درج ہیں "تاکہ قاری کو اوراق الٹ کر کتاب کے آخر میں دیکھنے کی زحمت نہ کرنی پڑے"۔ اس فہرست سے معلوم
ہوا کہ بعض قدیم الفاظ جو میرامن کی بدولت مشہور ہوئے تھے فضلی کے یہاں بھی ملتے ہیں مثلاً جھونڈ پیری۔ رنجہ ہونا۔ قدیم الفاظ کی فہرست
کے علاوہ متن کے آخر میں عربی عبارتوں اور فقروں کی فرہنگ بھی دی ہے۔

یہ تو طے شدہ ہے کہ ٹوبنگن کا مخطوطہ وہی ہے جو اشپرنگر کے کتب خانے میں تھا چنانچہ اس پر وہی نمبر پڑا ہے۔ جو
۱۸۵۷ء کی مطبوعہ فہرست میں ہے لیکن مرتبین کو اپنے اس قیاس پر اصرار ہے کہ یہی نسخہ اول کریم الدین کی ملک تھا جنھوں نے اپنے
تعلقات کے پیشِ نظر یہ اشپرنگر کو پیش کر دیا۔ کریم الدین تذکرے میں کربل کتھا کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"اس جاتے تک مصنف کے کلام تمام ہوئے اب میں کہتا ہوں کہ اس کتاب کو میں نے دیکھا وہ میرے
پاس موجود تھی"۔

ماضی مطلق کے صیغے موجود تھی، سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں یہ کتاب ان کے قبضے سے جاتی رہی۔ انہوں نے ایسی نا
کتاب کو کسے دے دیا؟ ظاہر ہے اشپرنگر کو۔ لیکن ۱۵ دسمبر ۱۹۶۵ء کے ہماری زبان میں ڈاکٹر محمود الہٰی نے اپنے مضمون "کربل
کتھا کے بارے میں" میں قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ اشپرنگر کا نسخہ کریم الدین کے نسخے سے مختلف ہے۔ کریم الدین نے اپنے نسخے
کا ایک طویل اقتباس اپنے تذکرے میں دے دیا ہے۔ اس کے اور مطبوعہ کربل کتھا کے مقابلے سے یہ نکتہ سامنے آجاتا ہے۔ اس
وقت کریم الدین کا تذکرہ میری دست رس میں نہیں لیکن کربل کتھا کا متعلقہ اقتباس ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ[1] نے پورے کا پورا درج کر دیا ہے
دونوں متن قدم قدم پر اتنے مختلف ہیں کہ ایک نسخے سے ہو ہی نہیں سکتے مثلاً اقتباس کے آخر کے چند جملے دیکھیے۔

---

[1] اردو نثر کا آغاز اور ارتقاء ص ۲۵۹ تا ۲۶۴

"الحمدللہ کہ بعد ادائے فرض کے دو رکعت شکر بجا لایا۔ یہ مصنف یوں کہتا ہے کہ یہ گوہر گراں بہا، ذکر خواب کہ بہ تائید بحر رحمت الٰہی کہ صوفِ اُمید سے سلک عبارت میں منسلک ہوا ..... ومع ہذا تہمت بر جناب حضرت امام حسین باعث کفر ہے۔ اگرچہ مجھ سا نالائق روسیاہ اس مظہر سبحانی کے دیدار مطلع انوار کو دیکھنے کی طاقت کہاں رکھتا تھا لیکن اس کے نفس خاص اور فیوض عام سے بعید نہیں

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

یہ رسالہ مسعود اوپر بارہ مجلس اور ایک خاتمہ کے ہے۔"

(نسخہ کریم الدین بحوالہ اردو نثر کا آغاز ص ۳۶۳)

"الحمدللہ کہ بعد ادائے فرض کے دو رکعت شکر ایں موہبت عظمیٰ بجا لاکہ اسے فضلی اشارت ہے بشارات غیبی سے اور بشارت ہے بشارات لاریبی سے۔ چاہیے کہ خاطر فاطر اپنی کو من کل الوجوہ سب امور دینی سے مجبور کر کے بیچ حاصل کرنے اس دولت اخروی اور سعادت سرمدی و عبادات ابدی کے بدل و جان مشغول ہووے اور حضرت ابا عبداللہ الحسین علیہ الصلوٰۃ والسلام آگے مقبول والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

قطعہ

.. ..

.. ..

لیکن اوپر ضمیر ارباب فضل اور اصحاب دانش کے مبین اور مبرہن ہو جیو کہ یہ گوہر گراں بہا ذکر خواب کہ بہ تائید بحر رحمت الٰہی صوف امید سے سلک عبارت میں منسلک ہو: ..... ومع ہذا تہمت بر جناب حضرت ابا عبداللہ الحسین علیہ الصلوٰۃ والسلام باعث کفر ہے خلاف۔ اگرچہ مجھ سا نالائق روسیاہ اس مظہر سبحانی کے دیدار مطلع انوار دیکھنے کی لیاقت کہاں رکھتا تھا لیکن اس نفس خاص اور فیض عام سے کیا بعید۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را"

اس کے بعد مطبوعہ کربل کتھا میں چار سطریں ہیں جو نسخہ کریم الدین میں غیر حاضر ہیں۔ اس کے آگے .....

"اما یہ مجموعۂ محمودہ اور یہ رسالۂ مسعودہ مشتمل ہے اوپر ایک مقدمہ اور بارہ مجلس اور ایک خاتمے کے۔"

(مطبوعہ کربل کتھا ص ۴۰ - ۴۱)

کریم الدین نے فضلی کے سلسلے[1] میں لکھا ہے

---

[1] طبقات شعرائے ہند ص ۷۰ بحوالہ مقدمہ کربل کتھا ص ۱۳

"اس نے ایک کتاب 'دہ مجلس' اردو زبان میں قدما کے محاورات پر لکھی ہے - وہ خود کہتا ہے کہ ان ایام میں میری عمر بائیس برس کی تھی - اس کتاب کا نام اس نے کربل کتھا رکھا ہے ۔"

کربل کتھا کے متن میں[1] اس کا نام محض کربل کتھا درج ہے 'دہ مجلس' کہیں نہیں - اس پر مرتبین کو اعتراض[2] ہے -

"کتاب کا صحیح نام کربل کتھا ہے نہ کہ 'دہ مجلس'۔ کریم الدین نے اس کا نام 'دہ مجلس' اپنی طرف سے لکھا اور غلط لکھا ۔"

کریم الدین کے اس صریح بیان "اس کتاب کا نام اس نے کربل کتھا رکھا ہے" کے بعد یہ اعتراض مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ کریم الدین کے مندرجہ بیان میں کتاب 'دہ مجلس' کی جگہ کتاب 'دہ مجلس' زیادہ قرین قیاس ہے یعنی کریم الدین کا یہ مطلب نہیں کہ کتاب کا نام 'دہ مجلس' ہے بلکہ کتاب کا موضوع 'دہ مجلس' ہے - اس زمانے میں روضۃ الشہدا کے مضامین کو 'دہ مجلس' کا عام رواج تھا کیونکہ عشرۂ محرم میں روزانہ ایک مجلس ہوتی تھی اس لئے اس موضوع کا نام روضہ کی طرح 'دہ مجلس' بھی پڑ گیا چنانچہ فضلی سے پیشتر فارسی روضۃ الشہدا کے کئی خلاصے 'دہ مجلس' کے نام سے ملتے ہیں۔ دراصل غلط فہمی محمد حسین آزاد کو ہوئی کہ انہوں نے آبِ حیات میں کتاب کا نام محض 'دہ مجلس' درج کیا کربل کتھا نہیں اور آبِ حیات میں جو کچھ لکھا گیا وہ نقشِ دوام بن کر قبولِ عام پا گیا -

کریم الدین کے مندرجہ بالا اقتباس میں کربل کتھا کی تصنیف کے وقت فضلی کی عمر کا تعین ۲۲ برس کیا گیا ہے جبکہ فضلی[3] نے لکھا:

"ابتدائے سنِ رشد و تمیز سے تا اب کہ سنِ عزیز اس کے نے حدودِ عشرین سے دو تین منزل تجاوز کیا ہے ۔

اس پر مرتبین[4] معترض ہیں -

"کریم الدین نے عمر ۲۲ برس لکھی ہے .... تعین بے بنیاد ہے ۔"

یہ اعتراض بھی کچھ زیادہ سخت گیری ہے کیونکہ فضلی نے اپنی عمر ۲۲ - ۲۳ سال لکھی ہے اور کریم الدین نے محض ۲۲ سال لکھ دی ہے۔ کوئی بڑا فرق نہیں -

کربل کتھا کی تاریخ خود مصنف کے قول کے مطابق سنہ ۱۱۴۵ھ ہے جو ۳۳ - ۱۷۳۲ء کے مطابق ہے۔ نہ معلوم کیوں شعبۂ اردو[5] دہلی یونیورسٹی نے اس کی تاریخ سنہ ۱۷۴۱ء لکھی ہے ۔

فضلی کے حالات کا واحد ماخذ اس کی کربل کتھا ہے۔ تعجب ہے کہ کریم الدین کے علاوہ کسی قدیم اہلِ قلم نے فضلی اور اس کے ترجمے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ میر، قائم اور میر حسن وغیرہ کا ہم عصر تھا لیکن اس سے کوئی بطور شاعر بھی واقف نہیں۔ اس زمانے میں تو اردو نثر بھی ایک اعجوبہ سمجھی جاتی تھی لیکن پھر بھی کسی نے اس کی طرف گوشۂ چشم نہ کیا جس کے معنی یہی ہیں کہ اس کتاب کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا گیا -

---

۱؎ مطبوعہ کربل کتھا ص ۳۷ ؛ ۲؎ مقدمہ کربل کتھا ص ۱۵ ؛ ۳؎ کربل کتھا ص ۳۹ ؛ ۴؎ ایضاً مقدمہ ص ۱۷ فٹ نوٹ ؛
۵؎ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں پنڈت نہرو کی آمد۔ ہماری زبان یکم مئی سنہ ۱۹۶۱ء ص ۸ ؛

فضلی نے یہ ترجمہ محمد شاہی دہلی کے نواب شرف علی کے اہلِ خانہ کے لئے کیا ہے۔ فضلی نے شرف علی کے لئے نواب بابا ام اور بندگاہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں جس سے کربل کتھا کے مرتبین[1] نے بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ فضلی کے والد تھے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے طبقاتِ شعرائے ہند کے مخطوطہ مملوکہ شمس اللہ قادری سے استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے مخطوطے سے کربل کتھا کا جو دیباچہ نقل کیا ہے اس کا پہلا جملہ[2] یہ ہے۔

"اس کتاب کا سبب تالیف یہ ہے کہ قبلۂ حقیقی اور کعبۂ تحقیقی میرے والد نواب مستطاب معلےٰ القاب اعلیٰ نواب بابا ام نواب شرف علی خان سلمہ ...."

مطبوعہ کربل کتھا میں ان جملوں کے متن میں کافی اختلاف ہے۔ معلوم نہیں کہ طبقاتِ شعرا مطبوعہ میں لفظ 'والد' ہے کہ نہیں بہرحال اس کی بنا پر کربل کتھا کی اشاعت سے بہت پہلے ڈاکٹر رفیعہ[3] نے لکھ دیا تھا کہ فضلی نواب شرف علی خان کے بیٹے تھے۔

مرتبین کو مقدمے کی طباعت کے بعد پروفیسر مسعود حسن رضوی سے کچھ مفید معلومات حاصل ہوئیں جو کتاب کے آخر میں 'استدراک' کے تحت درج ہیں۔ فضلی کے ایک چھوٹے بھائی کرم علی تھے جو فضلی کے انتقال کے بعد تک زندہ رہے۔ فضلی کا انتقال شاہ عالم کے سفرِ بنگال سے پہلے ہو چکا تھا۔ پروفیسر رضوی کے پاس کرم علی کے کئی اردو مرثیے اور فضلی کا ایک اردو مرثیہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ فضلی کا وہ مرثیہ کربل کتھا میں شامل ہے کہ نہیں۔

گارساں دتاسی کی تاریخِ ادبیاتِ ہندوستانی کے پہلے ایڈیشن کی جلد اوّل ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی۔ کریم الدین اور فیلن نے طبقاتِ شعرائے ہند کی بنا اسی پر رکھی ہے جیسا کہ تذکرے کے سرورق پر صراحت کر دی گئی ہے۔ دتاسی نے اپنی تاریخ کا دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۸۷۰ء میں شائع کیا۔ اب کی بار اس نے طبقاتِ شعرا سے استفادہ کیا جیسا کہ اس نے مقدمے[4] میں صراحت کی ہے۔ معلوم نہیں نقشِ اوّل میں بھی یہ ذکر ہے کہ نہیں۔ اگر ہو تو یہ بہت اہم بات ہوگی کیونکہ اس طرح کربل کتھا کو پہلی بار متعارف کرنے کا سہرا کریم الدین کے سر نہیں دتاسی کے سر ہوگا۔ چونکہ یہ قطعاً قرینِ قیاس نہیں کہ دتاسی نے کربل کتھا دیکھی ہوگی اس لئے میرا خیال ہے کہ دتاسی نے ۱۸۷۰ء کے ایڈیشن میں کریم الدین کے تذکرے سے اخذ کر کے ترجمۂ فضلی کا اضافہ کیا۔ دتاسی اردو ادب کا خادم اور محسن ہے لیکن خرابی یہ ہے کہ وہ اردو کے علاقے سے اتنی دور بیٹھے بیٹھے سنی سنائی لکھتا ہے جس کی وجہ سے اس کی تصانیف میں متعدد اغلاط بار پا گئے ہیں۔ کربل کتھا کے بارے[5] میں لکھتا ہے۔

"فورٹ ولیم میں ظاہرا اس کا قلمی نسخہ تھا حیدری کی گلِ مغفرت کا نہیں۔ فضلی نے یہ کتاب شرف علی کی ماں کے لئے لکھی تھی۔ اشپرنگر کے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ تھا اور یہ دہلی میں ۱۸۶۲ء میں طبع ہوئی ہے۔ فضلی شیعی

---

[1] مقدمہ ص ۱۹ ؛ [2] اردو نثر کا آغاز اور ارتقا ص ۳۵۹ ؛ [3] ایضاً ص ۳۵۴ ؛
[4] بحوالہ بازیافت از ڈاکٹر محمود الٰہی ص ۴۴۔ جموں میں اردو کتابوں کا اتنا قحط ہے کہ کوئی بھی مضمون لکھتے وقت قدم قدم پر قلت کا احساس ہوتا ہے ؛ [5] تاریخ جلد اول ص ۵۰۸-۵۰۷ بحوالہ اردو نثر کا آغاز ص ۳۵۶ ؛

تھے۔ انھوں نے اس کتاب کے علاوہ بہت سے مراثی۔ مناقب اور مدح ائمہ اور اماموں کی مدح لکھی۔

قاضی عبدالودود[۵۱] نے اس اندراج کی غلط بیانیوں پر تنقید کی ہے۔ یہ یقینی ہے کہ فورٹ ولیم میں اس کتاب کا کوئی مخطوطہ نہ ہوگا ورنہ گل کرسٹ یا کسی اور یا انگریز کی نظر اس پر ضرور پڑ جاتی۔ فضلی نے یہ کتاب شرف علی کی ماں کے لئے نہیں بلکہ اہل خانہ کے لئے لکھی تھی۔ ۱۸۰۳ء میں اس کی طباعت کا کوئی سوال نہیں اور جہاں تک علم ہے فضلی نے اس کتاب کے علاوہ اور کوئی مراثی و مناقب وغیرہ نہیں لکھے۔ کریم الدین[۵۲] کربل کتھا کے سلسلے میں لکھتا ہے۔

"مصنف کا مذہب شیعہ ہے۔ اس نے مرثیہ اور مناقب اور مدح ائمہ میں بہت شعر کہے ہیں۔"

ونا سی کے مندرجہ اقتباس کے آخری دو جملوں اور کریم الدین کے ان جملوں کی مطابقت ظاہر ہے۔ کریم الدین کا مطلب تھا کہ فضلی نے کربل کتھا میں مرثیہ اور مناقب اور مدح ائمہ میں شعر کہے ہیں۔ ونا سی کو غلط فہمی ہوئی کہ فضلی نے کربل کتھا سے ہٹ کر یہ تصانیف کی ہیں۔

جیسا کہ آگے درج کیا جائے گا کربل کتھا کی زبان پر دکنی اثرات بھی ہیں۔ اسی سے بعض حضرات کو مصنف کے دکنی الاصل ہونے کا شبہ ہوا۔

احسن مارہروی لکھتے[۵۳] ہیں :

"اس لحاظ سے کہ ۱۱۶۱ھ میں فضلی نے دوبارہ اپنے ترجمے کی اصلاح کی ہے اور اس گمان پر کہ شاہ فضل اللہ فضلی حنفی و نقشبندی کے سوا دوسرے فضلی کا پتا نہیں ملتا حسب تحریر مذکورہ 'محبوب الزمن' مذکور کی وفات ۱۱۸۴ھ میں بعید از قیاس نہیں سمجھی گئی۔"

احسن مارہروی کی اس غلط فہمی پر کئی مورخین نے اشارہ کیا ہے۔ فضلی نے جب خود اپنا نام فضل علی لکھا ہے تو وہ فضل اللہ نہیں ہو سکتا۔ کربل کتھا کا مصنف مذہب اثنا عشری سے ہے۔ اس نے تو اپنی کتاب کی تاریخ ہی۔ ع

شیعیوں کی نجات کا مظہر

سے نکالی ہے پھر اسے ایک سنی بزرگ سے کیوں خلط ملط کیا جائے۔

کربل کتھا کی زبان پر مقدمہ نگاروں نے بڑی تفصیل سے نظر ڈالی ہے اور اس پر پنجابی اور دکنی کے اثرات کی نشان دہی کی ہے لیکن چند صورتوں میں انہوں نے جن الفاظ یا خصوصیات کو پنجابی یا دکنی سے مختص کیا ہے وہ محض انھیں زبانوں تک محدود نہیں۔ دو الفاظ کھلیان (مقدمہ ص ۳۵) اور (چوسئے یعنی ٹپکنا (مقدمہ ص ۳۶) کی پنجابی سے کوئی تخصیص نہیں۔ خرمن کے معنوں میں کھلیان سے ہر اردو داں واقف ہے اور چوسئے مغربی یوپی میں عام طور سے بولا جاتا ہے۔

---

۵۱ دو مجلس فضلی از قاضی عبدالودود مطبوعہ معاصر جلد ۴ شمارہ ۴ بحوالہ اردو نثر کا آغاز و ارتقا ص ۳۵۹ ؛ ۵۲ اردو نثر کا آغاز و ارتقا ص ۳۵۰

۵۳ تاریخ نثر اردو ص ۷۰ بحوالہ اردو نثر کا آغاز و ارتقا ص ۳۵۴

دکنی کے اثرات کے سلسلے میں ذیل کی مثالیں مشکوک ہیں ۔

(الف) کوں اور سوں (مقدمہ ص ۳۸) دکنی ہی نہیں شمالی ہند کی ابتدائی شاعری میں بھی رائج تھے ۔

مثالِ بحر موجیں مارتا ہے — کیا ہے جس نے اس جگ سوں کنارا (حاتم)

دیکھ سرو چمن ترے قد کوں — خجل ہے پا بہ گل ہے بے بہے (حاتم)

آخری مصرع میں خجل بہ سکونِ اوسط نظم کیا گیا ہے ۔ فضلی نے سوں ، سیتی اور سے تینوں کا استعمال کیا ہے سیتی محض نظم میں آتے ہیں اور یہ ضرورتِ شعری کی وجہ سے ہے کیونکہ نظم میں حسبِ موقع سوں اور سے بھی باندھتے ہیں ۔ نثر میں عموماً سے اور کبھی کبھی سوں کا استعمال کیا ہے ۔ کوں کی بجائے کو کا استعمال نہایت شاذ ہے ۔ دو ایک جگہ نظم میں ضرورتِ قافیہ سے کوں کی بجائے کو باندھا ہے ۔

واسطے کے گرد تب تصدق ہو — چاشت تصوتی سے لوہو ہو — ص ۲۱۰

ہائے ماں بھائیوں سے دور پڑے بے وطن ہو — یہ خبر کون دے شبیر سے اب وارث کو — ص ۱۲۹

(ب) جمع کی حالت میں ''ون'' یا ''ین'' کی جگہ ''ان'' کا اضافہ بھی دکنی سے مخصوص نہیں ۔ پنجابی اور ہریانی میں یہ عام ہے ۔ یہ ہے کہ یوپی میں سہارن پور تک ان والی جمع مثلاً آنکھاں بولتے ہیں ۔ شمالی ہند کی قدیم اُردو میں جمع کا یہ طریقہ عام تھا ۔ دو شعر ملاحظہ ہوں

حق میں عاشق کے تجھ لباں کا بچن — قند ہے نے شکر ہے شکر ہے — حاتم

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ — ان سے بھی تو پوچھیے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے — میر

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اس دور کی دہلوی زبان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔

''ندا کی حالت میں اور حروفِ مفرد کے ساتھ الفاظ کی فارسی جمع لاتے تھے ۔ مثلاً اے بتو کے بجائے اے بتاں ۔ اسی طرح بتاں کا عاشق ۔ آوارگاں کو''

مرتبین نے کربل کتھا کی زبان پر دکنی نحو کے سب سے نمایاں اثر کی طرف اشارہ نہیں کیا ۔ یہ ہے حالتِ فاعلی میں نے کا حذف اور فعل کی جنس اور تعداد کا مفعول کی بجائے فاعل کے مطابق ہونا ۔ مثالیں متعدد ہیں :-

حضرت فرماتے ص ۲۵۸	حضرت کہے ص ۱۳۵
اسی شمشیر کوں زہر کے پانی میں بجھائے ص ۹۰	ایک مرتبہ بقوتِ ازہر شہید میں ملا امام مظلوم کوں کھلائی ص ۹۵
اسی لوہے کوں زہر کے پانی میں بجھائے ہیں ص ۹۸	اور خبر کو دیکھ پانی نوش کئے ص ۱۰۰
ایک چشمہ پانی کا دیکھے ۔ ص ۱۲۲	اور اپنا خونِ جگر کھائی ص ۱۲۳
خیمے میں سدھارا اس کی ماں شہربانو کوں کہے ص ۱۸۹	گیسوؤں کے ملا کر باندھا اور باہر نکل کنجی پنے پاس رکھا ص ۱۲۵

آخری مثال میں کنجی کو مذکر نہیں باندھا ہے بلکہ فعل کی جنس فاعل کے مطابق رکھی ہے ۔ مقدمہ نگاروں نے تذکیر و تانیث کے خلفشار کی جو مثالیں

---

[1] مقدمہ ص ۳۸ ۔ [2] ولی کا دبستانِ شاعری طبع دوم ص ۳۸۳

مثالیں ان میں سے کم از کم دو کی حسبِ ذیل اسی طرح کی جا سکتی ہے۔

قبول کیا اور رفیقِ علی پر کمر باندھا ص ۸۳   قبول کیا اور سوگند کھایا ص ۱۱

فعل کی جنس اور تعداد کا یہ انداز خاص دکنی ہے۔ اسے دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کہیں فضلی کا بچپن دکن میں تو نہیں گزرا اور بعد میں یہ شمالی ہند چلا آیا ہو۔ شمالی ہند کا باشندہ بھولے بسرے ایک آدھ بار اس طرح بول سکتا ہے مثلاً ع

جو گائیں تھیں تمہاسنے گائیں   گلزارِ نسیم

لیکن بار بار اس انداز میں بولنا اور لکھنا اسی سے ممکن ہے جس نے عمر کا کچھ نہ کچھ حصہ دکن میں گزارا ہو۔ کربل کتھا میں شمالی ہند کے عام انداز پر سے نے کا استعمال کر کے فعل کو فاعل کی بجائے مفعول کے مطابق استعمال کرنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں گو نسبتاً کم

تب حضرت نے فرمایا ص ۵۴   مسلم نے کوٹھے سے تلے نظر کی ص ۱۱۹

فاطمہ نے صبر کیا ص ۷۲   شیث لعین نے شمشیر چلائی ص ۸۶

حضرت نے سر سجدے سے اٹھایا ۸۶   دونیں دروان نے تلوار چلائی ۸۶

مشدّد الفاظ کی تسہیل دکنی میں بہت عام ہے۔ شمالی ہند کی قدیم اُردو میں اس کا بھی رواج نہیں لیکن فضلی کی شاعری میں اس کی مثالیں ملتی ہیں

ع   اس مجلس اول میں نبی کا وصال ہے ص ۵۹

ع   سکینہ کے نیچے جیو سے نہ ہاتھ اٹھاتا ہے ص ۲۷۳

ع   بچی بچاری کا اب مفت جان جاتا ہے ص ۲۷۳

ع   اسے سنبھلے کر اپنے بابا سیتی بات ص ۱۸۳

لفظ کے درمیان آنے والی نونِ اعلان کو اس طرح مغنون کر دینا کہ تقطیع میں حذف ہو جائے دکنی کا خاصہ ہے۔ فضلی کے یہاں اس کی بھی مثالیں ہیں :

ع   شمر کاٹا اب خنجر کے گھاؤ سوں

ع   کون اوّل منزل اس کو پہنچا دے رکھ پُست

(فعولن فعولن فعولن فعولن) کون کی ن حذف ہو گئی ہے

نظم میں متحرک حروف کو ساکن کر دینا بھی دکنی میں عام ہے۔ فضلی نے بھی ایسا کیا ہے۔

یہ کہہ کے پھل پڑی اور زمیں پہ لوٹ گئی کہیں نہ آج جدا ہووں گی میں باپ سیتی ص ۲۷۲

ع   عورتیں ایک پل میں کر وندسے   فرشتوں کو کر دیں گمراہ راہ سے ۹۴

ع   پالی اٹھارہ برس میں اکبر کوں تس کا کاٹے سر ۱۹۴

ع   تو تب لگ تو ماس اس کا گل اتر جاوے ۲۲۴

مرتبین نے استدراکات (ص ۲۲۳) میں اس مصرع کو غیر موزوں کہا ہے لیکن اترَ کی ت کو ساکن پڑھا جائے تو مصرع موز

ہو جائے گا اور فضلی کے لئے یہ انداز روی خلاف معمول نہیں ۔

ساکن حرف کو متحرک کرنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں :

ع ہر حرف جس کا گویا برچھیوں کی بھال ہے ص ۲۴۲

اس قسم کی لفظی آزادیاں شمالی ہند کی شاعری میں شاذ ہیں۔ شمالی میں شاہ حاتم نے زبان کی اصلاح کی اور ان سب کو رد کیا لیکن فضلی چونکہ بہت خام قسم کا شاعر ہے اس لئے اس نے یہ مجوز روا رکھے ہیں۔ شعروں میں ایسے جوڑ کو وہ اس طرح دباتا ہے کہ انھیں موزوں پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے مصرع

ع یہاں تا مش ہم یہ منیکی باد

میں "ہم" کی "ہ" گر رہی ہے۔ اور دیکھیے:

دل نہ رکھتا تھا طاقت بار فراق | یہ دل ہے اے شاہ عجب خارہ نہیں | ص ۱۸۵
صبر کرنا تجھ جدائی بیچ اسے | سخت مشکل ہے کی بیکس چارہ نہیں |

اس قطعے کی بحر ہے رمل فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔ پہلا مصرع تو بہر حال غیر موزوں ہے۔ دوسرے مصرع میں "ہے" "نہیں" اور چوتھے مصرع میں "نہیں" کی "ہ" گرا دیجیے تبھی مصرع موزوں ہوں گے۔

ہم کو لڑائی دشمن بد دیں کی عادت ہے اور باغیوں سے جنگ ہماری سعادت ہے۔ ص ۲۳۲

ع دو جگ گر ہوئیں کاغذ ہوئیں دریا مداد ص ۲۵

اشندراکات (ص ۱۴۱ ۳) میں مرتبین لکھتے ہیں کہ

"مصرع ناموزوں ہے۔ 'گر' حذف کر دینے سے موزوں ہو جائے گا"

یہ مصرع جس نظم کا جزو ہے اس کا وزن فعولن فعولن فعولن فعول ہے اس مصرع سے 'گر' بھی حذف کر دیا جائے تو بھی دوسرے "ہوئیں" کو "ہوں" پڑھنا ہوگا تاکہ اس لفظ میں "ہ" کے بعد کے تمام حروف کو گرا کر موزوں پڑھا جا سکے۔ اگر اسی نہج پر پہلی "ہوئیں" کو بھی "ہوں" پڑھا جائے تو گر کے حذف کی قطعاً ضرورت نہیں رہتی۔

مرثیوں میں زبان اور شاعری کے اصولوں کی پابندی سختی سے نہیں ہوتی تھی اسی لئے بگڑا شاعر مرثیہ گو کی کہاوت رائج ہو گئی تھی لیکن فضلی کچھ زیادہ ہی بگڑا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی شاعری کی زبان و بندش کافی پوچ اور پھسپھسی ہے ہاں شدت جذبات میں کلام منزہ ہیں۔ نثر کے بیچ بیچ بڑی تعداد میں مرثیے اور نوحے لکھے ہیں جو رقت و تاثر میں بھرپور ہیں۔ ان کی وجہ سے اردو مرثیہ گویوں کی تاریخ میں فضلی کو یقیناً جگہ دینی ہوگی۔ کربل کتھا کے تمام طویل مرثیے مربع کی شکل میں ہیں۔ مختصر پاروں میں کہیں کہیں مثنوی یا قطعہ بھی دکھائی دے جاتا ہے۔

فضلی کا زمانہ شمالی ہند میں شاعری کا دور اول ہے۔ اس وقت تک نثر تو در کنار شاعری میں بھی اردو زبان غیر متعین حالت میں تھی۔ کربل کتھا کی تصنیف سے چوتھائی صدی بعد شاہ حاتم نے دیوان زادہ مرتب کیا اور اس میں اصلاح زبان کے کچھ اصول مرتب کئے ہیں

وجہ ہے کہ فضلی کی نظم و نثر میں ایک ہی لفظ کی قدیم و جدید دونوں شکلیں ملتی ہیں۔ نثر میں یہ پہلی کوشش تھی۔ اگر شمالی ہند میں اس سے پہلے کوئی نثر لکھی گئی ہو تو وہ ہمارے سامنے موجود نہیں اور غالباً فضلی کے سامنے بھی موجود نہ تھی اسی لئے انہیں اردو ترجمہ کرتے وقت بڑا تامل تھا۔ مجبوراً انہوں نے اردو نثر کو فارسی کے ڈھنگ پر ڈھال دیا۔ ان کی نثر میں نہ صرف عربیت اور فارسیت کی بہتات ہے بلکہ عبارت آرائی، رنگینی اور قافیہ پیمائی کی بھی کوشش ہے۔ دیباچے کی ابتدا یوں کرتے ہیں۔

"حمد بے غایت اور ثنائے بے نہایت شایستہ و سزاوار اس کبریائے واجب الوجود کوں کہ بزرگی صفاتِ کمال اس کی کی درکِ افہام سے مبرا ہے اور لائق حمد و جوہر ثنا تحفہ وار شایاں اس شاہِ عالی بارگاہ کوں کہ کمال صفاتِ جلال اس کے کا احاطہ اوہام سے معرا۔ عقل عقلاؤں کی درک کرنے حقیقت ذات اور صفات اس کی سے بیچ مضیق عجز و قصور کے اور فہم بلغاؤں کے پاؤں نے بلاغت اور فصاحت اعجاز کلام مجید اس کے سے بیچ مقام حیرت و فتور کے ذاتِ پاک اس کی بیچ ہر جہت کے بہ حقیقت موجود ہے۔"

اور سببِ تالیف کے یہ جملے تو مشہور ہی ہیں:

"و لہذا پیش ازیں کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نہیں ہوا مستمع۔ پس اس اندیشہ عمیق میں سر بہ گریبانِ تفکر ڈال دریائے اندوہ تحیر میں غوطہ کھایا اور بیابانِ تامل اور تدبر میں سرگشتہ ہوا لیکن راہ کنہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایتِ الٰہی گلشن افکار پر اہتزاز میں آ یہ بات آئینہ خاطر میں مونھ دکھلائی۔" ص ۳۸

قافیے کی خاطر جملے کی نحوی ساخت مجروح کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ استعاروں کی افراط سے رنگینی بھی پیدا کرتے ہیں۔ اس اندازِ نگارش کا سلسلہ سودا کے دیباچہ دیوان اور تحسین کی نو طرزِ مرصع سے ہوتا ہوا فسانۂ عجائب سے مل جاتا ہے۔ ابتدائی مصنفین کی یہ آرائشی اکھڑی اور ناہموار نثر تراش و خراش کے بعد فسانہ عجائب کی نثرِ معلا ہو جاتی ہے۔ فضلی نے مضاف مضاف الیہ کے ترجموں میں جگہ جگہ اردو کے برعکس فارسی ترتیب روا رکھی ہے مثلاً

گنجائش اس کی ص ۵۰

وعدہ ہمارا ص ۴۸

بزرگی صفاتِ کمال اس کی کی۔ کمال صفات جمال اس کے کا ص ۱۹

قائم رکھ حکم ہماروں کو ۵۴

گردن میری سے ۶۳

لیکن یہ فارسیت زدگی یہ ترصیع و تصنع۔ نثر کی یہ غیر فطری ترتیب کتاب کے شروع ہی میں ہے۔ جیوں جیوں وہ آگے بڑھتے ہیں انہیں اردو نثر کی مشق ہوتی جاتی ہے اور روانی و صفائی بڑھتی جاتی ہے۔ ممکن ہے وہ دقیق رنگین طرز کو مرجح سمجھتے ہوں لیکن آگے چل کر تھک گئے ہوں اور نباہ نہ پائے ہوں۔ بہرحال خوش قسمتی سے کربل کتھا کا غالب رنگ مندرجہ بالا نہیں بلکہ اکثر متن کی عبارت

ایسی صاف ستھری ہے۔

"تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ حضرت ابھی اذان میں تھے کہ شیث لعین نے دردان ملعون کو کہا آہم دونوں تلوار چلاویں اگر ایک سے خطا ہووے تو دوسرے کی لگے اور ابن ملجم کہا لکھا تون اندر قدم دھر" ص ۸۶

"غلام نے کہا اے خواجہ مجھے ان کے مارنے کی قدرت نہیں۔ حارث لعین نے کہا اگر تون ان کون نہ مارے میں تجھے ماروں غلام کہا جب لگ تون مجھے مارے میں ہی تیرا سر اتاروں۔ ملعون نے ہاتھ لنبا کر غلام کے بال پکڑے۔ غلام نے ڈاڑھی اس بدبخت کی پکڑ اینچی اور چاہا کہ شمشیر مارے۔ ملعون نے قوت کر غلام کے ہاتھ سے تلوار چھنا لی تب غلام نے اپنی شمشیر اینچ حملہ کیا" ص ۱۲۶

اس طرح کربل کتھا میں دو اسالیب ہیں دقیق اور سادہ۔ آزاد نے آب حیات میں کربل کتھا کے جو چند جملے درج کئے تھے وہ دقیق رنگین تھے جس کی وجہ سے اسے کربل کتھا کا عام رنگ سمجھ لیا گیا حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ کربل کتھا کے کافی حصے میں وہ نثر ہے جو واقعہ نگاری اور مکالمے کے ڈھب کی ہے۔ میرے نزدیک فضلی کا فقرہ فقرہ بھی چہتے ہیں۔ عربی فارسی سے گراں بار عبارت نہیں۔ لیکن چونکہ کربل کتھا سے اس کے زمانے میں یا اس کے ایک صدی بعد تک کوئی اہل قلم شناسا نہیں اس لئے اردو نثر کے ارتقا پر اس کارنامے کا کوئی اثر نہیں پڑا ؛

سندھ اور ایران کے تعلقات[1]

(سیاسی اور ثقافتی)

سید حسام الدین راشدی

سندھ، جو اس وقت مملکتِ پاکستان کا ایک اہم ترین جزو ہے، مجھے یقین ہے کہ اس سے ——— اس کی قدامت اور اس کے شاندار تمدنی اور علمی ماضی کی وجہ سے ——— کوئی پڑھا لکھا غیر واقف نہیں ہے۔ موہن جو دڑو کی اس قدیم سرزمین اور ایران کے درمیان ظہورِ تاریخ سے ہی گہرے روابط کے آثار پائے جاتے ہیں۔ تاریخی[2] کھنڈرات سے کشف شدہ چیزیں، سماجی اور تجارتی تعلقات کا پتہ دیتی ہیں۔ قدیم دارالسلطنت بھن آباد ساسانی ساخت کا اُرنی کوٹ، جو دیوارِ چین کا چھوٹا سا نمونہ ہے[3]، یا خود میرے تاریخی قصبے بھن کے نام سے اس بات کی شہادت آج بھی موجود ہے کہ ہمارے سیاسی روابط کے نقوشِ زمانہ قدیم سے ہی کس قدر گہرے ہیں۔ علاوہ ازیں بہرام گور اور شنگل کا واقعہ[4]، سندھ پر بہرام گور کے اثرات، اور سندھ سے ہزاروں "لولیاں شوخِ شیریں[5]" کا ایران جانا، کس کو معلوم نہیں ہے۔ فردوسی کے یہ اشعار کس نے نہیں پڑھے ہوں گے:

بنزدیک شنگل فرستاد کس! — چنیں گفت: اے شاہِ فریاد رس

ازاں لولیاں برگزیں، دہ ہزار! — نر و مادہ بر زخم بربط سوار

کہ استادہ بر زخمِ دستان بود! — در آوازِ او، رامشِ جاں بود!

—— (۲) ——

اسلام کے بعد ایران اور سندھ کے باہمی روابط اتنے گہرے اور اس طرح مرتب رہے ہیں کہ چودہ سو برس میں کبھی یہ سلسلہ ٹوٹنے نہیں پایا۔ سیاسی ہو یا ثقافتی، فرہنگی ہو یا فنی۔ بہرحال کسی نہ کسی روپ اور ڈھنگ میں یہ روابط ہر دور اور ہر سمے میں قائم اور مستحکم رہے ہیں۔

ان روابط کی تاریخ کو، تعلقات کے گوناگوں صورتِ حال، اور کثرتِ مواد اور وسیع واقعات کی بنا پر میں کہاں سے شروع کروں، کن کن عنوانوں کے تحت بیان کروں، اور پھر کہاں تک بیان کروں، میرے لیے واقعی حیران کن بات ہے:

سرِ ایں رشتہ ندانم، ز کجا بکشائم

داستاں طویل اور وقت قلیل ہے۔ لہٰذا یہاں پر میں اس حکایتِ شیریں کا فقط ایک مختصر سا خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

آپ سب جانتے ہیں کہ سندھ میں اسلام ایران کے ذریعہ پہنچا۔ اگرچہ تاریخی راستوں اور راہوں کے ذریعے ہمارے درمیان تجارتی آمد و رفت قدیم سے موجود تھی[6] لیکن شیراز سے محمد بن قاسم کے ساتھ ایرانی لشکری جب سندھ میں وارد ہوئے تو ان عمومی روابط نے مذہبی رشتہ کی صورت اختیار کی اور عربوں کے ساتھ ساتھ ایرانیوں کی بستیاں اور نو آبادیاں از سرِ نو سندھ میں آباد ہو گئیں ——— سیستان کے مرکز طاہر زرنج[7]

---

[1] یہ مقالہ ستمبر ۱۹۶۶ کو ایران شناسوں کی بین الاقوامی کانفرنس (تہران) میں پڑھا گیا +

۲۰۱-۲۰۶ ھ) یا یعقوب بن لیث صفار (۲۶۵-۲۴۰ ھ) کے زمانے میں سندھ میں ایرانی عمّال اور سپاہیوں کے آنے جانے کے واضح آثار تاریخ میں مل جاتے ہیں۔[۶]

عرب عہدِ تسلط میں جہاں عربی زبان کو سیاسی بنا پر سندھ میں قدم جمانے کے مواقع ملے، وہاں یہ فطری امر ہے کہ تجارتی تعلقات اور آنے جانے والے قافلوں[۷] یا ان ایرانیوں کی وجہ سے جو عربوں کے ساتھ بس گئے۔ ایرانی اثرات کے ساتھ ساتھ ایرانی زبان کو بھی یہاں متعارف ہونے کے مواقع ملے ہوں گے۔[۸] اگرچہ عرب جغرافیہ نویسوں نے اس بات کو اپنے خیال میں غیر اہم سمجھ کر بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ لیکن اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ایران اور ایرانی زبان اس وقت محکوم تھی۔ اس کے اثرات[۹] وضاحت سے ذکر نہ کرنا، کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔

سندھ کی فارسی زبان سے آشنائی اور اس سے لگاؤ اگر پہلے سے پیدا شدہ نہیں تھا تو عربی زبان کے تسلط ختم ہو جانے کے بعد، فارسی زبان کا بعد کے ادوار میں اس کی جگہ لے لینا کس طرح ممکن تھا۔

(۲)

عربوں سے زمامِ حکومت ــ تھوڑے سے عرصہ کی طوائف الملوکی کے بعد ــ سندھ کے ایک مقامی قبیلے نے لے لی۔ جو سومرہ خوانوادہ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے، ان کے زمانے میں قرامطہ کا اقتدار[۱۰] اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس دور کا ایرانی لگاؤ، اثرات سندھ پر زیادہ قوی ہو گئے تھے، محمود نے جب ملتان (۴۰۱ھ) اور منصورہ (۴۱۶ھ) محکوم کیا تو ظاہری طور پر قرامطہ[۱۱] ہی کے وجود کو شرعی جواز کے لیے استعمال کیا تھا۔

محمود کے متواتر حملوں اور اس کے سندھ اور پنجاب پر حکومت قائم کرنے کی وجہ سے سندھ میں ایرانی اثرات اور اس کے فرہنگ میں ایک تازگی پیدا ہو گئی۔ اس دور کے بہت سے فارسی شعراء نے سندھ کو اپنے اشعار میں مختلف صورتوں سے یاد کیا ہے، جو سندھ اور اس میں رہنے والوں سے ان کی گہری واقفیت اور دلچسپی کا پتہ دیتا ہے۔ رفیقی (وفات قبل ۴۰۴ھ)، فرخی (وفات ۴۲۹ھ)، عنصری (وفات ۴۳۱ھ)، قطران تبریزی (وفات بعد ۴۶۶ھ)، ناصر خسرو (وفات ۴۸۱ھ)، مسعود سعد سلمان (وفات ۵۱۵ھ)، عمیدی مروزی (۵۱۲ھ)، امیر معزی (وفات ۵۱۸-۵۲۱ھ) اور مختار غزنوی (وفات ۵۲۵ھ) کے اشعار[۱۲] اس سلسلے میں مطالعہ کرنے کے قابل ہیں۔

غزنوی اثرات کے دور میں فارسی شعراء اور مصنفین کی آمد و رفت نے سندھ کے اندر جو کچھ پیدا کیا، ہمیں افسوس ہے کہ زمانے کے دست برد نے سارے وہ آثار کچھ اس طرح مٹا دیے ہیں کہ آج ہم ان علمی یادگاروں میں سے کوئی چیز پیش نہیں کر سکتے۔ بہر حال یہ تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ملتان اور منصورہ پر تسلط کی وجہ سے علمی تخلیقات لازماً ہوئی ہوں گی۔

(۳)

غزنویوں کے دور (۴۰۱-۴۴۱ھ) کے علمی اثاثے غائب ہو جانے کا ہم کیوں افسوس کریں، جبکہ ہمارے یہاں اس دور کے بعد ناصر الدین قباچہ کے عہد (۶۰۲-۶۲۵ھ) کا علمی ذخیرہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔

ناصر الدین اور اس کے علم پرور وزیر عین الملک ماہرو کی معارف نوازیوں نے تاتاریوں کی غارت گری اور خونریزی سے ترکِ وطن کر کے یہاں آئے ہوئے کئی اصحابِ علم و فضل اور نامی شعراء کو اپنے دربار میں لا کر جمع کر دیا تھا۔[۱۳]

مولانا قطب الدین کاشانی[17]، قاضی شرف الدین اصفہانی[18]، سید الندما تاج الفضلا مفخر القدما شمس الدین محمد بلخی، مفخر الشعرا ضیاء الدین سجزی، منہاج سراج (قاضی جوزجانی ۶۵۸ھ) سدید الدین عوفی (۶۳۰ھ)، بغروش شاعر اور فضلی ملتانی[19] کے وہ چند نام ہیں جو ہم تک اتفاق سے محفوظ رہ گئے ہیں۔ جن کا علم اور کلام ضائع ہو گیا وہ نہ جانے کتنے ہوں گے جو اس دربار اور دور سے متعلق تھے۔

"جوامع الحکایات"، "الفرج بعد الشدۃ" کا ترجمہ، "طبقات ناصری" کی تالیف کا آغاز، اور "چچ نامہ" (۶۱۳ھ) اسی عہد زریں کی وہ علمی یادگاریں ہیں جو خوش بختی کی وجہ سے دست و برد زمانہ سے بچ کر ہم تک پہنچی ہیں۔

"چچ نامہ" کا فارسی مترجم سندھ کے ایک عالم مولانا کمال الدین اسمٰعیل کے لیے ——— جن سے ان کو "فتح نامہ" کا عربی متن ملا ——— لکھتا ہے کہ: وہ فارسی کے علوم و فنون میں بے نظیر تھے[20] ——— یہ بزرگ الور کا تھا۔ جو شہر سندھ کے سابق بادشاہوں کا دارالسلطنت تھا۔

محمد بن علی کے اس قول سے سندھ میں فارسی علوم کی ترویج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ——— یہ فارسی مترجم خود بھی شاعر تھا؛ "چچ نامہ" میں اس کے اشعار موجود ہیں[21]

یہ عجیب اتفاق نیز افتخار کی بات ہے کہ فارسی شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ جس کو "دیوان" کہا گیا ہے[22]، سرزمین سندھ میں ترتیب پایا اور پھر دوسرا قدیم ترین تذکرہ "لب الالباب" کی تکمیل کا شرف بھی سندھ ہی کو حاصل رہا۔

اس دور کے فارسی شاعری کے نمونے ہمیں "لب الالباب" میں ملتے ہیں ——— خود عوفی کا وہ قصیدہ جو قلعہ بھکر کی فتح پر اس نے لکھا۔ ہمارے نزدیک ایک قیمتی ادبی نشان ہے[23]

بہر حال یہ سب علمی آثار اور نوادر غزنوی عہد کے بعد کی بچی کھچی چیزیں ہیں۔ جو کچھ ضائع ہوا اس کا نقصان نہ فقط سندھ کے لیے بلکہ فارسی ادب کی تاریخ کے لیے ایک ابدی خسارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی (وفات ۶۶۶ھ)[24] اس دور کے جید صوفی اور صاحب حال و قال بزرگ تھے، ان کے پاس سماع کا دور تھا جس میں زیادہ تر فارسی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس شعر نے شیخ کو عرصہ تک وجد کی کیفیت میں بے حال رکھا:

مستان کہ شراب ناب خوردند
از پہلوئے خود کباب خوردند[25]

اسی شیخ بہاء الدین ذکریا کے پاس فخر الدین عراقی (۶۸۸ھ) وارد ہوا اور ان کی غزل جس کا مطلع ہے:

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
ز چشم مست ساقی وام کردند

اور اس مطلع والی غزل:

در کوئے خرابات کسے را کہ نیاز است
ہوشیاری و مستیش ہمہ عین نماز است

یہاں کی یادگار ہیں۔ [۲۲]

مرند سے شیخ عثمان تخلص بہ لعل شہباز، جس کی خانقاہ سندھ کے تاریخی شہر سیوستان میں آج تک مرجعِ خلائق ہے، بلبن کے دور میں جبکہ اس کا بیٹا خان شہید (۶۸۳ھ - ۶۶۸ھ) ملتان کا عامل تھا [۲۳]، مرند سے سندھ پہنچا۔ بہت سی فارسی غزلیں اسی شیخ عثمان مرندی (متوفی ۶۵۰ھ) [۲۴] سے منسوب ہیں۔ [۲۵]

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جلال الدین خوارزم شاہ (۶۱۷ - ۶۱۸ھ) کی آمد اور سندھ میں سال بھر تک رہنا، اور نواحِ دیبل میں جامع مسجد بنا جانا زیرِ بحث دور کے آغاز کا اہم سیاسی واقع ہے۔

—— ۵ ——

تغلقوں کے سندھ پہنچنے (۷۵۲ھ - ۱۳۵۱ء) سے شروع ہوتے ہیں۔ جبکہ یہاں سومرہ خاندان کی جگہ پر سمہ خانوادہ حکمران ہو چکا تھا۔

اس دور میں سندھ میں فارسی شعرگوئی کے مقامی طور پر رواج پانے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس اس فارسی شعر کا ایک مصرع ثبوت کے لیے موجود ہے جو سندھی نژاد والئ سندھ نے فیروز تغلق کے سامنے پڑھا تھا:

شاہ بخشندہ توئی بندہ شرمندہ منم [۲۵]

اس دور سے متعلق ملتان کے حاکم عین الملک ماہرو کے مکاتیب کا مجموعہ "منشآت ماہرو" کے نام سے موجود ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس دور میں فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی اور سندھ کے سلسلے میں نوشت و خواند کے لیے بھی فارسی ہی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس مجموعہ میں سندھ کے حکمران کے نام جو خطوط ہیں وہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں۔ [۲۶]

سندھ کے اندر یہ بھی رواج اسی زمانے میں پایا جاتا ہے کہ لوگ اپنے بزرگوں کے مقابر پر فارسی کے کتبے اور اشعار کندہ کر کے لگاتے تھے چنانچہ حاجی ترابی کا کتبہ (۷۸۱ھ) [۲۷] اور محمد تغلق کی عارضی قبر پر سیوہن کے کتبے [۲۸] اس کی گواہی دیتے ہیں۔

برصغیر ہند و پاک میں کلام مجید کے دو فارسی ترجمے بھی پہلے سندھ میں ہی ہوئے ہیں، جن میں سے مخدوم جہانیاں جہاں گشت (متوفی ۷۸۵ھ) کا ترجمہ [۲۹] اس زیرِ بحث دور کی یادگار ہے اور دوسرا ترجمہ، اگر شہاب الدین دولت آبادی کی تفسیر "بحر مواج" کو تفسیر کی حیثیت تک رکھا جائے، تو دسویں صدی ہجری میں مخدوم نوح ہالائی کا کیا ہوا ہے۔ فارسی ترجمہ ہے جو ہند و پاک کے تمام فارسی تراجم سے مقدم تر ہے [۳۰]

اگرچہ موضوع سے متعلق نہیں۔ لیکن ایک عجیب اتفاق کا یہاں ذکر کر دینا دلچسپ ہونے کی وجہ سے میرے خیال میں گراں نہ گزرنا چاہیے۔ وہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ کلام مجید کا پہلا ترجمہ جو کسی بھی غیر زبان میں ہوا، وہ بھی سندھ ہی میں اور یہاں کی زبان میں ہوا ہے [۳۱]

—— ۶ ——

---

[۲۳] اسی زمانے میں خان شہید نے شیخ سعدی کو بھی دعوت بھیج دی تھی۔ دیکھئے حواشی

آٹھویں صدی ہجری یا اس کے بعد ہمیں بہت سے شرفا اور علمی خانوادے ایسے ملتے ہیں جنہوں نے ایران کو چھوڑ کر سندھ میں مستقل سکونت اختیار کی جن کی بود و باش، مجالس اور صحبتوں کی وجہ سے سندھ میں فارسی زبان کی ترویج اور اشاعت کو بڑی تقویت حاصل ہوئی[31]

اس سلسلہ میں شیراز کے انجوی سادات کی ایک شاخ کے مورث سید محمدؒ کا نام لیا جا سکتا ہے جو ۷۸۶ھ میں شیراز سے منتقل ہو کر سندھ میں آ کر بسا — خاندان کی تاریخی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ شیرازی اسی سید محمدؒ کا بے حد معتقد تھا، اور اس نے بھی ترکِ وطن کیا تھا، لیکن قندھار میں پہنچنے کے بعد سید صاحب نے اسے باصرار واپس کر دیا — تاریخ یہی ہے کہ: حافظ گریہ میکرد در ہرات ماند[32]۔

اس دور میں دار السلطنت ٹھٹہ کے اندر خواہ سندھ کے دوسرے بڑے بڑے شہروں میں کثرت سے مدارس موجود تھے[33] جن میں عربی کے ساتھ ساتھ فارسی کتابیں بھی پڑھائی جاتی رہی ہوں گی۔

— — (۷) — —

خراسان کا آخری تیموری سلطان شاہ حسین بایقرا (۹۱۲ - ۸۶۲ھ) اور سندھ کے والی جام نظام الدین (۸۶۶ - ۹۱۴ھ) نہ فقط معاصر تھے بلکہ ہم ذوق بھی تھے۔ معارف نوازی اور ہنر پروری میں دوش بدوش تھے۔ جس کی وجہ سے ہرات اور ٹھٹہ ایک ہی وقت میں شعراء اور علماء کے مرجع بنے ہوئے تھے[34] اور ما بین مشابہت کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت تیموریوں کی اس آخری سلطنت کی بساط الٹی تو عین اسی وقت سندھ کی سمہ سلطنت کا چراغ بھی گل ہو گیا۔

آزاد سندھی حکومت کا یہ آخری تاجدار جام نظام الدین نہ فقط علم دوست اور ہنر پرور تھا بلکہ خود بھی فارسی کا شاعر تھا۔ یہ رباعی اسی کی ہے:-

اے آں کہ، ترا نظام الدین می خوانند   تو مفتخری، ترا چنیں می خوانند

گر در رہِ دین، از تو خطائے افتد!   شک نیست کہ ترا، کافر لعین می خوانند

مولانا عبد العزیز ابہری اپنے خاندان کو ساتھ لے کر اسی دور میں سندھ آ کر مستقل طور پر مقیم ہو گیا[35] اور علوم کی نشر و اشاعت کے لیے ایک بڑے مدرسے کی بنا ڈالی۔ علامہ جلال الدین دوانی (م ۹۰۸ھ) نے بھی اسی سلطان کی معارف پروریوں کا شہرہ سن کر یہاں آنا چاہا تھا۔ لیکن ان کے دو شاگرد میر شمس اور میر معین سلطان نظام الدین سے زاد راہ لے کر جب تک وہاں پہنچے، اس سے پہلے علامہ دوانی دوسری دنیا کا سفر اختیار کر چکا تھا[36]۔

۹۰۱ھ میں مشہد مقدس سے سید یعقوب اور سید اسحاق تشریف لائے جن کا خاندان سادات مشہدی کے نام سے ٹھٹہ میں اس وقت تک چلا آ رہا ہے[37]۔ مشہدیوں کا دوسرا خانوادہ جو دو بھائیوں سید احمد و سید محمدؒ فرزندان سید محمدؒ عابد مشہدی پر مشتمل تھا ۹۰۶ھ میں منتقل ہو کر آیا۔[38]

مکلی کے قبرستان میں خواجہ شرف الدین شیرازی کی قبر بھی اس دور کی یادگار ہے۔ جس پر یہ کتبہ موجود ہے:-

وفات مرحوم الواصل الی رحمۃ اللہ
خواجہ شرف الدین شیرازی
فی تاریخ شہر جمادی الاول ۹۱۱ھ سنہ

یہ بزرگ بھی انہی آنے والوں میں سے ایک ہے۔ جس کو سلطان نظام الدین کی معارف پروریاں ایران سے سندھ کھینچ لائی

ٹھٹھہ میں مغلواڑہ اسی سلطان کی یادگار ہے۔ یہ محلہ اس لیے سرکاری خرچ سے بنایا گیا تھا کہ ایران سے آنے والے شرفاء اور علماء آسانی سے اس کے ساتھ منسلک ہی اس میں بس جائیں۔ — یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس دور میں ایرانیوں کے لیے مغل اور "ولایت زاد" کے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔ مغل لفظ غالباً اس لیے ایرانیوں کے لیے مشہور ہو گیا تھا کہ اس دور میں ایران کے مختلف حصے تیموری مغلوں کے قبضہ میں تھے۔

دسویں صدی ہجری کی ابتدا جس طرح ایران کے لیے ہلاکت اور انتشار کا باعث تھی۔ اسی طرح سندھ کے لیے بھی اس صدی کی ابتدا مستقبل کے مستقل سیاسی نحوست کا باعث بن گئی۔ ایران میں تیموریوں کا چراغ بجھنے لگا تھا۔ شیبانی، صفوی اور بابری قوتیں جدا جدا حصوں میں ایک دوسرے سے برسر پیکار تھیں۔ یہاں سندھ میں سلطان نظام الدین کے انتقال نے خاندانی نزاع کا وہ سلسلہ پیدا کیا جس نے سندھ کی آزاد سلطنت کی جڑیں اکھاڑ کے رکھ دیں۔

ایران شاہ اسماعیل صفوی (۹۰۶ - ۹۳۰ھ) کے ذریعے جلد ہی ایک مستقل خاندان کے تحت نہ صرف انتشار اور طوائف الملوکی کی ہلاکت سے بچ گیا۔ بلکہ از سر نو آزادی حاصل کر کے اپنے تمام منتشر اجزاء کو پھر سے جمع کر کے، مستقل سلطنت کی بنیادیں استوار کر کے، صحیح راستہ پر گامزن ہو گیا —— لیکن سندھ کی حالت درست نہ ہو سکی کیونکہ تین چار افراد پر مشتمل ارغون خاندان، جو سلطنت ہرات کی طرف سے قندھار، کابل، بست اور زمین داور پر نیابت کر رہا تھا، وہ بابر کے قندھار اور کابل پر قبضہ کرنے کے بعد سندھ کی اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر فوراً سندھ پر قابض ہو گیا۔

ابھی خانہ جنگی چل ہی رہی تھی کہ ہرات کے تیموری سلطنت کا آوارہ گرد شہزادہ بدیع الزمان [۲۱] سندھ میں آکر جام نظام الدین کے جانشین جام فیروز کے پاس پناہ گزین ہوا (۹۱۸ - ۹۱۹ھ) لیکن پھر جلد ہی یہاں سے تتلی کی طرف نکل گیا۔

(۸)

کہا جاتا ہے کہ تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ارغونی تسلط کی تصویر کا سیاسی رخ، جس کی تاریخ (۹۲۷ھ) "خرابی سند" سے نکلتی ہے، [۲۲] بلاشبہ تاریک نہیں بلکہ تاریک تر رہا۔ لیکن دوسرا رخ جو خالص علمی اور فرہنگی تھا وہ روشن بلکہ منور تھا۔

سندھ اگرچہ فارسی زبان کو گزشتہ ادوار میں ہی درباری اور فرہنگی زبان بنا چکا تھا، لیکن اس خالص فارسی گو خاندان کے تسلط کے بعد، زبان اور ایران سے ہمارے روابط نہ فقط اور گہرے بلکہ زیادہ استوار ہو گئے — شیراز، مشہد، سبزوار اور دیگر ایرانی شہروں سے سینکڑوں روحانی اور علمی خانوادے منتقل ہو کر سندھ میں آباد ہو گئے۔ جن کی وجہ سے فارسی اور فارسی تمدن کی گویا ایک پوری دنیا سندھ کے اندر پیدا ہو گئی۔

یہی دور ہے جس میں غیاث الدین منصور دشتکی شیرازی کے خانوادے سے سید شکر اللہ شیرازی [۲۳] سندھ میں چلے آئے جن

اس خاندان نے سندھ میں کئی ایک جید علماء، فارسی شعراء، اصحابِ طریقت اور اصحابِ تصنیف کو جنم دیا۔

شیرازی سادات کا دوسرا خاندان سید کمال اور سید جمال نامی دو بھائیوں پر مشتمل اسی سید شکر اللہ کی معیت میں ٹھٹھہ پہنچا۔ جن کی اولاد سے بھی کئی ایک مشاہیر وجود میں آئے[۴۴]۔

مولانا جامی رح کے دوست اور رفیقِ روحانی شیخ جلال الدین بایزید پورانی سے ہر وہ پڑھا لکھا بخوبی واقف ہے جس نے 'نفحات الانس' پڑھا ہے۔ اسی شیخ جلال الدین پورانی کے نواسے میرک شیخ محمود وغیرہ سندھ میں اسی زیرِ بحث دور میں تشریف لائے[۴۵] اور دو سو برس تک اس خاندان نے سندھ میں علماء، شعراء اور مصنفین کو پیدا کیا۔ تاریخِ سندھ میں یہ خاندان میرکان سبزواری عرب شاہی کے نام سے بھی مشہور رہے، اور پورانی بھی کہلاتا ہے۔

میر غیاث الدین محمد معروف، سلطان رضائی مرتضیٰ سبزواری صاحب 'حبیب السیر' یعنی خواند امیر کا نواسہ تھا[۴۶] یہ بھی اپنے اہل و عیال کو لے کر اسی دور میں منتقل ہو کر آگیا تھا۔ اس کے سندھی اخلاف نے بھی سندھ کے اندر فارسی کے بہت سے یادگار علمی نقوش چھوڑے ہیں، یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ صاحب 'حبیب السیر' کے تعلقات ارغون خاندان سے بہت گہرے اور دوستانہ تھے۔ خواند امیر خود بھی یہاں آیا تھا۔ لیکن پھر ہندوستان جا کر رہا جہاں ان کی وفات ہوئی[۴۷]۔

مولانا مصلح الدین لاری[۴۸] مولانا عبدالخالق گیلانی[۴۹]، مولانا یار محمد یاری بھوراں[۵۰] اور مولانا یونس سمرقندی[۵۱] بھی اسی دور میں آنے اور بسنے والوں میں سے ہیں اور حیدر کلوچ بھی اسی دور میں سندھ میں آکر بسا اور یہیں انتقال کیا[۵۲]

شاہ جہانگیر ہاشمی کرمانی کی مثنوی 'مظہر الآثار' (۹۴۰ھ)[۵۳] فخری ہروی کا تذکرہ 'روضۃ السلاطین' (۹۳۰ھ[۵۴]) اور فخری شاہ میں 'ضایع الحسن'[۵۵] اور خواتین شعراء کا تذکرہ 'جواہر العجائب'[۵۶] یا قتادلسۂ پورانی[۵۷] اور 'آداب المریدین'[۵۸] اسی دور کی، جلا ہاں کی اولاد پر ذکر کیے ہوئے خانوادوں کی چند علمی یادگاریں ہیں۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ روضۃ السلاطین، فارسی شعراء کے تذکروں کے سلسلے میں دوسرا قدیم ترین تذکرہ ہے جو سندھ میں لکھا گیا۔ اسی طرح فخری ہروی کا 'جواہر العجائب' غالباً پہلا تذکرہ ہے جو خاص خواتین شاعرات کے سلسلے میں لکھا گیا ہے۔

ہند کے مغل بادشاہ ہمایوں کا ایران میں جا کر پناہ گزین ہونا اس دور کا اہم ترین سیاسی واقعہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ شاہ حسن ارغون ہی تھا جس نے سندھ میں (۴۷ - ۹۵۰ھ) ہمایوں کے پاؤں نکنے نہیں دیے، اور وہ اپنی تمام تر کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد دوسرا چارہ نہ پاکر ایران کی طرف 'صراطِ مستقیم' (۹۵۰ھ)[۵۹] سے روانہ ہوا تھا۔ شاہ طہماسپ صفوی کو ہمایوں نے جو خط لکھا ہے۔ اس میں ان مصائب کی طرف، جو شاہ حسن ارغون کی سیاست کاری کی بنا پر ان کو پہنچے تھے۔ ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"از فضائے سوادِ اعظم ہند، بتنگنائے اقلیم سندھ، رسیدہ شدہ"

بگذشت از سرما آنچہ گذشت

چہ بدریا چہ کہسار وچہ دشت[۶۰]

(۹)

ارغونوں کے بعد (۹۶۲ھ) سندھ کو اس کے دو امرا تقسیم کر کے قابض ہو گئے۔ زیریں سندھ (ٹھٹھ) میرزا عیسیٰ ترخان نے دبالائی سندھ (بکھر) محمود بھکری کے حصے میں آئے۔

یہ وہی عیسیٰ ترخان ہے جس کے نام پر فخری نے "جواہر العجائب" معنون کیا تھا۔ لیکن جب اکبر ہندوستان میں تخت نشین ہوا (۹۶۳ھ) تو اس وقت ایک معمولی امیر کے مقابلے میں دوسرے قوی تر بادشاہ کی دایہ ماہم انگہ کے نام فخری نے اپنے پہلے انتساب کو تبدیل کر دیا۔

میرزا عیسیٰ اور اس کے جانشینوں (۹۶۲ - ۱۰۰۰ھ) کے تعلقات ایران سے اس طرح مستحکم رہے جس طرح ارغونوں کے دور میں ہم دیکھ آئے ہیں۔ اسی عہد میں بھی کئی ایک ایرانی خانوادے اپنے زاد بوم سے منتقل ہو کر سندھ میں وارد ہوئے سید بدرالدین مازندرانی[11] اسی دور کے آنے والوں میں سے ہیں۔ تاریخ نگارستان کے مؤلف قاضی احمد غفاری قزوینی اسی زمانے میں سندھ پہنچے اور یہیں انتقال کیا (۹۷۵ھ)[12]۔ کاشان سے میر عزیز کا خاندان بھی اسی ترخانی عہد کے اقامت گزینوں میں سے ہے جو آگے چل کر کاشانی سادات کی نسبت سے سندھ میں مشہور ہوا۔[63]

آستانہ قدس سے میرزا عیسیٰ ترخان کی بڑی گہری وابستگی تھی۔ چنانچہ اظہارِ عقیدت کے طور پر اس نے مشہور سندھی مشعلیں خاص اہتمام کے ساتھ بنوا کر بھیجی تھیں۔ میرزا عیسیٰ اس وقت سیاسی طور پر بھی ایران سے وابستگی کے لیے مجبور تھا۔ وہ سندھ میں ایک طرف اپنے رقیب سلطان محمود والیِ بکھر سے بہت خائف تھا، اور دوسری طرف اکبر سے بھی ان کو خطرہ تھا جو کہ نیا نیا، فتوحات کے تازہ ہنگاموں اور ولولوں کے ساتھ تخت نشین ہوا تھا۔ لہٰذا میرزا کے لیے ازبس لازم تھا کہ وہ اپنی ہمسایہ سلطنت بلکہ قوی تر مملکت، یعنی ایران سے روابط پیدا کرے۔ عقیدے کے لحاظ سے وہ کٹر سنی تھا، لیکن مشہد کی طرف اس کا میلان یقیناً بر بنائے سیاست تھا۔

محمود بکھری، جس کا نام ہم نے ابھی ابھی لیا ہے، وہ اس وقت کا نہ فقط بے مثل بہادر اور جنگجو امیر تھا بلکہ سیاست اور تدبیر میں بھی اپنی مثال آپ ہی تھا۔ ایران کی طرف میرزا عیسیٰ کا یہ میلان دیکھ کر اس نے بھی اپنے سفراء بھیج کر شاہ طہماسپ صفوی سے اپنے تعلقات استوار کر لیے تھے۔

میر ابوالمکارم بن میر غیاث الدین سبزواری، جن کے خاندان کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ محمود بکھری کی طرف سے جاتا رہا اور نزدی بیگ یا حق بردی بیگ ایرانی دربار سے سندھ میں آتا رہا (۹۶۷ھ[64])۔ شاہ طہماسپ نے نہ فقط اپنی طرف سے محمود بکھری کو 'خان' اور 'سلطان'، کا خطاب دیا بلکہ محمود کی درخواست پر اکبر کو بھی خط لکھا کہ محمود کو ان کے دربار سے بھی خان لارخانی (خانخانان) کا خطاب دیا جائے۔ ہندوستانی دربار میں چونکہ ایک وقت میں ایک ہی خانخانان ہوتا تھا اور اس وقت منعم خان اس منصب پر فائز تھا، اس لیے اکبر نے شاہ طہماسپ کو معذرت کا خط لکھا۔[65]

——— (۱۰) ———

ارغون و ترخان خاندان پون صدی تک سندھ پر حکومت کرتا رہا۔ اور سال ۱۰۰۰ھ میں سندھ ہندی مغلوں کی سلطنت کا جزو بن گیا۔ جنہوں نے اگلے ڈیڑھ سو برس تک اس پر اپنا تسلط قائم رکھا۔

اس گیارھویں صدی ہجری کے اوائل ہی میں جو سفیر ایرانی دربار میں پہنچا، ایک سندھی تھا یعنی اکبر کا مشہور امیر، مورخ اور شاعر میر معصوم بکھری متخلص بہ نامی جو ایران کی طرف سے (۱۰۱۲-۱۰۱۱ھ) شاہ عباس کبیر صفوی (۹۸۵ - ۱۰۳۸ھ) کو دربار میں گیا اور اس نے جا کر نہ فقط کامیابی سے سفارت کے فرائض انجام دیے بلکہ ذاتی طور پر بھی ایران کے منبر اپنے مستقل تاریخی اور ادبی نقوش چھوڑے۔ چنانچہ حکیم شفائی اصفہانی (متوفی ۱۰۳۷ھ)، محمد رضا فکری اور تقی اوحدی جیسے شعراء کے ساتھ ان کی صحبتوں اور مشاعروں کا ذکر ایران اور سندھ کے ادبی روابط کا ایک مستقل عنوان ہے [33] اور اصفہان کی مسجد علی کا کتبہ [34] اور کاشان و سورچہ کے مابین کاروانسرائے شاہ عباس کا کتبہ [35] یا احمد جام زندہ پیل کے مزار کا کتبہ [36] منجملہ ان دیگر کتبات کے جو میر معصوم نے جگہ جگہ ایران میں نصب کیے، آج بھی موجود ہیں۔ میر معصوم (متوفی ۱۰۱۹ھ) فارسی کا بہترین شاعر، تاریخ سندھ (۱۰۰۹ھ) کا مؤلف، صاحب دیوان اور ایک خمسہ کا مصنف ہے۔ "طبقات اکبری" خواجہ نظام الدین (۱۰۰۳ھ) نے ان ہی کی تحریک اور کمک (۱۰۰۳ھ) سے لکھی تھی۔ [37]

سندھ اور ایران کے درمیان سیاسی روابط کو قائم رکھنے والا اسی دور میں دوسرا سندھی امیر، ترخانی خانوادہ کا آخری جانشین مرزا غازی "وقاری" تھا جس کی شخصیت نہ فقط دلچسپ ہے بلکہ گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے بے انتہا دلکش بھی ہے۔ جب (۱۰۱۰ تا ۱۰۲۱ھ) وہ قندھار میں مغلوں کی نیابت کر رہا تھا۔ اس وقت اس کا اپنا ذاتی دربار ان کی غیر معمولی علم پروری اور شخصی جاذبیت کی وجہ سے، ایرانی شعراء سے بھرا ہوا تھا۔ طالب آملی پہلے ان ہی کے دربار کا شاعر تھا جس نے ان کی مدح میں اس طرح کے گرم قصیدے لکھے ہیں، ملک الشعراء بننے کے باوجود جہانگیر کو بھی کم نصیب ہوئے۔ شمسائے زرین قلم، مرزا فصیحی ہراتی، ملا شانی تکلو، میر الہی اسد آبادی، سحر کاشی، محوی ابدہلی، نرمی قزوینی، میر نعمت اللہ وصلی شیرازی، ملا اسد قصہ خوان، شیدا اصفہانی، ملا مرشدی بروجردی، عتابی تکلو، مولانا صوفی مازندرانی صاحب بتخانہ، مسندی یزدی، میر عبد الباقی قصہ خوان، حکیم مغفور گیلانی [38] مرزا کے مدح خوان اور اس کے دامن دولت سے وابستہ رہے۔

مرزا غازی کے تعلقات شاہ عباس کبیر سے بہت گہرے تھے دونوں کے مابین ایلچی نامہ و پیام لایا کرتے تھے۔ مرزا غازی کی طرف سے سید عبد اللہ سلطان عریضی سبزواری اس خدمت کو انجام دیتا رہا۔ [39]

ابتدا میں تو سیاسی روابط رہے لیکن پھر جلد ہی شاہ اور میرزا کے درمیان تعلقات شخصی پیدا ہو گئے اور وہ اس درجہ بڑھ گئے کہ جہانگیر کی طرح شاہ عباس بھی اپنے خطوط میں مرزا کو "فرزند" سے مخاطب کرنے لگا۔ مرزا غازی نے شاہ عباس کی مدح میں جو قصیدے لکھے ہیں ان میں سے ایک قصیدہ کا ایک ہی شعر ہم تک پہنچا ہے :-

نزہر مار زمان، دامان بود آنکس
کہ، شاہ مہرۂ مدح تو، در دہن گیرد! [40]

مرزا رستم صفوی (ف ۱۰۵۱) شاہ اسمٰعیل کبیر کا پرپوتا تھا۔ ایران سے ترک وطن کر کے جب سندھ میں پہنچا اس وقت (۱۰۰۱ھ) اکبر کا سپہ سالار عبد الرحیم خانخانان اور سندھ کے والی مرزا جانی بیگ ترخان کے درمیان معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔ اگرچہ اس سلسلہ کی متعلقہ تاریخوں میں میری نظر سے نہیں گزرا لیکن عالم آرائے عباسی میں ہے کہ ان دونوں کے مابین مرزا رستم صفوی ہی صلح کا باعث بنا۔ [41]

مرزا غازی کے عین جوانی میں وفات (۱۰۲۱ھ) پا جانے کے بعد جب مغلوں نے براہِ راست سندھ پر صوبیدار بھیجنے شروع کیے تو سب سے پہلا صوبیدار یہی مرزا رستم صفوی تھا جو ۱۰۲۲ھ میں ٹھٹہ پہنچا۔ دراصل مرزا رستم کو بھیجنے سے پہلے مرزا غازی ہی کے ایک عزیز مرزا عیسیٰ ترخان ثانی کو صوبیدار بنانے کی تجویز زیرِ غور آئی۔ لیکن اس کے بھیجنے سے اس لیے پرہیز کیا گیا کہ مبادا وہ قدیم روابط کی بنا پر شاہ عباس کی مدد سے سندھ میں اپنے اجداد کی مسند دوبارہ واپس لے لے اور ہندی مغلوں کے ہاتھ سے سندھ نکال لے جائے [۶۹]۔ چند سال پیشتر شاہ عباس کی طرف سے قندھار پر حملہ ہوا تھا جس کی وجہ سے شاہ اور جہانگیر کے درمیان تعلقات کچھ خوشگوار نہیں تھے گو کہ طرفین نے نظر بظاہر نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رکھا تھا [۷۰]۔ جہانگیر نے سندھ کے مسئلے میں عافیت اور عاقبت اسی میں سمجھی کہ سندھ سے ایران کے تعلقات کی کاٹ مرزا رستم صفوی کو بھیج کر کرے جو کہ شاہ عباس کا مخالف تھا۔ اور اسی مخالفت کی بناء پر ترکِ وطن کر کے یہاں پہنچا ہوا تھا

اس گیارھویں صدی ہجری میں جو مغلوں کے عہد کی صدی ہے، کئی کئی ایرانی شعراء ہندوستان پہنچنے سے پیشتر سندھ میں مقیم رہے، مثلاً مرزا صائب تبریزی اور اس کا شاگرد ملک تعلیماتی [۷۱] ہندوستان بعد میں پہنچے تھے۔ پہلے سندھ میں قیام پذیر رہے۔ اسی طرح کئی ایک مثالیں سندھ کی ادبی تاریخ میں موجود ہیں۔

محمد سعید سرمد کاشی شہید (۱۰۷۰ھ) اسی دور میں ایران سے ٹھٹہ پہنچا تھا اور کافی عرصہ تک یہاں قیام کیا تھا۔ ٹھٹہ ہی کے ایک پسرِ رعنا نے اسے خرد و آگاہی کے حدود سے نکال کر خدا آگاہی کی دنیا میں پہنچایا تھا۔ یہ کوئی ترک بچہ نہیں تھا بلکہ "ہندو پسر" ابی چند تھا جس کے لیے سرمد نے کہا ہے کہ:

خدائے کیست ابی سرمد! دریں دیر!
نمی دانم ابی چند است، یا غیر

ایران اور فارسی زبان اور فرہنگ کے اثرات صدیوں کے تواتر کی وجہ سے سندھ میں اس حد تک سرایت کر چکے تھے اور سندھی فطرت کا جزو بن چکے تھے کہ اسی گیارھویں صدی میں جب رضائی ٹھٹوی نے اپنی مثنوی "زیبا نگار" (۱۰۵۳ھ) لکھی تو عشق کا پورا مواد اگرچہ سندھ سے لیا لیکن عاشق و معشوق کے مقامی نام اس لیے بدل دیے کہ فارسی کی لطیف فطرت ان ناموں کی اجنبیت کی گرانی کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی باوجود اس کے کہ وہ اپنی مادری زبان سندھی کو بہترین اور شیریں قرار دیتا ہے:۔

زبانِ سندھ شیریں است شیریں!
بجائے خویش رنگیں است رنگیں!

— — — —

نمی سازم بیاں را سندھی آمیز!
نیایم از زبانِ سندھ پرہیز!

— — — —

ز ملکِ پارس آدم پرنیاں را!

بیوشانم عروس داستاں را
چو حرف از عاشق و معشوق رانم؛
بلفظِ فرس ہریک را بخوانم
بگویم نام ہریک تا بدانی
بہ ہنگام کہ ایں دفتر بخوانی
چو در معشوق حسن و زیب دیدم
پے او نامِ زیبا برگزیدم

— — — — —

ہماں شہرے کہ می باشد مقامش
نہادم شہرِ حسن آباد نامش
نگار از بہرِ عاشق ساختم نام
کہ نقشِ اوست زیبِ لوحِ ایام [۸۱]

(۱۱)

بارھویں صدی ہجری میں سندھ سے مغل تسلط کا خاتمہ ہوا اور سندھی نژاد خاندان جو کلہوڑا کے نام سے مشہور ہے سریر آرائے حکومت ہوا۔ اگرچہ یہ خالص سندھی تھے اور ان کا عہد سندھی زبان و ادب کا عہدِ زریں کہلاتا ہے اور باوجود اس کے کہ فارسی گو مغلوں سے ابھی ابھی نجات پائی تھی، لیکن فارسی زبان اور فرہنگ کو انہوں نے برابر اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ چنانچہ ان کے دور میں سندھ کے اندر نہ صرف فارسی زبان میں تمام علوم پر قابلِ قدر کتابیں لکھی گئیں بلکہ ایک صاحبِ دیوان فارسی شاعر ایسے پیدا ہوئے جن کا درجہ اس دور کے ہند میں رہنے والے شعرا سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ 'تحفۃ الکرام' اور 'مقالات الشعرا' وغیرہ اسی دور کی اہم ترین علمی نشانیاں ہیں۔

اس دور کا سب سے اہم سیاسی واقعہ، جس کا ایران سے تعلق ہے - نادر شاہ کی دہلی سے واپسی پر سندھ میں آمد ہے (۱۱۵۲-۱۱۵۳ھ) اس وقت کے حکمران نور محمد (۳۲-۱۱۶۷ھ) نے سالانہ خراج دے کر اپنے سیاسی تعلقات ایران سے استوار کر لیے اور نادری شمشیر کی خون آشامیوں سے اپنے وطن اور اپنے ہم وطنوں کو بچا لیا جو محمد شاہ کی بے دانشی کی وجہ سے، دلی اور دلی کے عوام کو بھگتنی پڑی تھی!
سندھ میں نادر شاہ کی آمد نے مستقل علمی اور ادبی نشانات چھوڑے ہیں۔ علمی نشانات والیٔ سندھ نور محمد کی تصنیف 'منشور الوصیت' اور تاریخ شاہ پر کوئی ایک کتابیں ہیں، اور ادب میں وہ موافق اور مخالف تاریخی قطعات اور قصائد ہیں جو نادر شاہ کی آمد پر سندھی شعراء نے کہے ہیں۔ سندھی شعراء نے تلمیح کے طور پر بھی نادر شاہ کو اپنے اشعار میں یاد کیا ہے، مثلاً:

کرد غارت، دہلیٔ دل، آں شہ سہ پیکراں
شورِ غم من، اندر ستم کم ز نادر شاہ نیست [۸۲]

اسی نادری دور میں سرکاری خواہ غیر سرکاری طور پر ایران کے کئی امیر، عالم اور شاعر سندھ میں وارد ہوئے جن میں سے عاشق صفاہانی، میرزا جعفر شیرازی[83] اور دیگر کئی شعراء اور صاحبانِ علم کا ذکر مقالات الشعراء اور تحفۃ الکرام، میں موجود ہے۔ عاشق صفاہانی یہیں سندھ میں فوت ہوا اور مکلی کے قبرستان میں ان کی قبر آج تک موجود ہے۔ شیخ علی حزیں[84] اور مازندران کا مشہور مرثیہ گو شاعر ملا متقبل[85] (متوفی در گجرات، ۱۱۵۰ھ) اسی دور میں سندھ پہنچے تھے۔

نادر شاہ نے ۱۰ محرم ۱۱۵۲ھ کو سندھ سے ایران کی طرف مراجعت کی تو چلنے سے پیشتر نور محمد کو "شاہ قلی خان" کا خطاب دیا گیا۔ جس کی تاریخ سندھی دربار کے شاعر نے یوں کہی ہے:۔

اے آنکہ توئی بملک دوست قائم
از خوانِ تو افطار کند ہر صائم
تا مملکت سندھ شہنشاہیت داد
تاریخ تو شد: شاہ قلی خاں دائم[86] (۱۱۵۲ھ)

نادر شاہ جب تک زندہ رہا ہمارے سیاسی تعلقات ایران سے برابر قائم رہے۔ سندھ کے ایلچی اور خود والیٔ سندھ کے دو بیٹے مستقل طور سے نادر شاہ کے قتل (۱۱۶۰ھ) تک ایران میں رہے۔ چنانچہ محمد مراد جب ۱۱۶۴ھ میں واپس سندھ پہنچا تو شعراء نے ان کی آمد پر قصائد اور تاریخیں کہیں، مثلاً:۔

بامژدہ رسید خانِ عالی بہ وطن (۱۱۶۰ھ)
بافضل خدا خانِ جواں بخت رسید
از راہِ خراساں بہ وطن باز رسید[87]

شیخ غلام محمد بھی اس سلسلہ میں بطور ایلچی نادری دربار میں آخر وقت تک رہا[89]۔ میر ابراہیم شاہ حیدرآبادی دوسرا ایلچی تھا جو سندھ سے ایرانی دربار میں بارہا جاتا رہا[90]۔

والیٔ سندھ میاں نور محمد کلہوڑا کی ایران پرستی کی مستحکم اور مقدس نشانی ایک اور بھی ہے جو آج بھی ہمیں ان ایام کی یاد دلا رہی ہے۔ اور یہ کتب خانہ مشہد کے میوزیم کا وہ عدیم المثال کلام مجید ہے جو اس نے نادر شاہ کی آمد سے پہلے (۱۱۴۸ھ) میں آستانہ قدس میں بھیجا تھا جس کی زیبائش اور آرائش کی مثال شاید ہی دنیا کے کتب خانوں میں ملے۔[91]

— (۱۲) —

تیرھویں صدی ہجری میں سندھ پر دوسرا مقامی خانوادہ حکمران (۱۱۹۰ھ تا ۱۲۵۰ھ) تھا جو "تالپور" کہلاتا ہے۔ خود تال۔ پور کی لفظی ترکیب ایرانی اور سندھی تعلقات کی ایک نشانی ہے۔ ایران سے اس خانوادے کا تعلق اس حد تک قوی ہو گیا تھا کہ انہوں نے ایران دوستی میں نہ فقط اسے اختیار کیا بلکہ ان کے طور طریق، حکمرانی کے قواعد و ضوابط، رہن سہن، پوشش اور خورد و نوش، خواہ عمارت سازی پر ایرانی اثرات

غالب تھے۔

قاچاری سلاطین سے گہرے روابط ہو گئے تھے۔ وکلاء کی آمد و رفت اور تحفہ تحائف کا لین دین آخر تک قائم رہا۔ مرزا محمد علی کو ایلچی کے طور پر ۱۲۱۴ھ میں ایران بھیجا گیا جو واپسی کے وقت فتح علی شاہ قاچار کے سفیر مرزا اسمٰعیل کو ہمراہ لیتا آیا۔ ان سفراء کی آمد و رفت کی تاریخیں مقامی شعراء کے دواوین میں موجود ہیں۔[۹۲]

سندھ کا مشہور مرثیہ گو شاعر سید ثابت علی ۱۲۱۹ھ میں ایران کی سفارت سے واپس پہنچا تھا جس کی تاریخ میر مائل نے کہی ہے۔ میر غلام محمد نقشوی سفارت سے ۱۲۲۵ھ میں واپس آیا۔ اس کی آمد کی تاریخ بھی کہی گئی۔[۹۳]

تالپوری حکمران خود فارسی کے مصنف اور صاحبِ دیوان شاعر تھے چنانچہ نظم اور نثر میں ان حکمرانوں نے کثیر تصانیف چھوڑی ہیں۔ ان کا دربار فارسی شعراء اور خاص طور پر ایرانی شعراء سے بھرا رہتا تھا۔ کتب خانے بنانے کا انہیں خاص شوق تھا۔ ہر سلطان اور اہلِ حرم میں ہر خاتون کا کتب خانہ علیحدہ علیحدہ ہوتا تھا جن میں فارسی کی اہم ترین کتابیں موجود تھیں۔ یہ سب کتابیں، خاص طور پر شاہی کتب خانوں کے لیے، لکھوائی جاتی تھیں اور اکثر کاتب ایرانی ہوتے تھے۔

یہ کتب خانے انگریزوں نے تسلط کرتے وقت (۱۸۴۳ء) لوٹ لیے۔ روس سے پیرس اور لندن سے جرمنی تک مختلف کتب خانوں میں ان کے اجزاء موجود ہیں۔ اس وقت بھی جو کچھ کتابیں ہمارے یہاں بچ گئی ہیں، وہ اپنی جگہ پر بے حد قیمتی ہیں۔ زیادہ تر کتابیں ایسے ایرانی کاتبوں کی کتابت شدہ ہیں جو اکثر و بیشتر ایران میں غیر معروف ہیں اور اپنے دور کی تاریخ خطاطان میں یہ کاتب قیمتی اضافہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ وصالی شیرازی کے لکھے ہوئے کئی کلام مجید موجود ہیں۔ مولانا جامی کا مکمل خمسہ انہی کے اپنے خط سے لکھا ہوا موجود ہے۔ ماضی کے دیگر ہندی سلاطین کے علاوہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ آریہ مہر کے دستخط مبارک بھی موجود ہیں۔ جو سندھ کے آخری دارالسلطنت حیدرآباد میں ورود مرکب ہمایونی کے موقعہ پر بطور یادگار ثبت فرمائے تھے۔

اس تالپوری دور کی ایک اور بھی یادگار ہمارے پاس ہے اور وہ ہے معاصر شعراء کا تذکرہ جو سید میر حسن الحسینی شیرازی نے "زبدۃ المعاصرین" کے نام سے تالپوری سلاطین کے لیے (۱۲۴۰ھ) میں تالیف کیا۔ اس تذکرہ میں زیادہ تر ایسے ایرانی شعراء کا ذکر ملتا ہے، جن سے خود ایران کے علمائے ادب بھی واقف نہ ہوں گے۔

اس کتب خانے میں دیگر قیمتی اسناد جو ایران اور سندھ کے روابط سے تعلق رکھتی ہیں اور ایرانی بادشاہوں کے بھیجے ہوئے تحائف بھی محفوظ ہیں۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ رہن سہن اور عمارت سازی پر ایرانی اثرات غالب تھے۔ اس مماثلت کی ایک آخری نشانی حیدرآباد کے قلعہ میں وہ چھوٹی سی عمارت اب بھی زبوں حالت میں موجود ہے جو اصفہان کی علی قاپو کی معمولی سی نقل معلوم ہوتی ہے۔

(۱۴)

تیرھویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں پہلے اور بعد میں سندھ میں انگریز کے اور اس کے تسلط کے آثار گہرے ہوتے گئے۔ مسلمان کو اس کا شدید احساس تھا۔ لیکن مسلمان حکمران اس حد تک کمزور ہو چکے تھے۔ اور مغل سلطنت کی وحدت اس قدر ٹوٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں

بن بیٹھی تھی کہ کسی باہر کی تازہ دم قوت کا مقابلہ کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ اس دور کے جرائد، مجلات، کتابیں اور شعراء کے دواوین اس بات کا پتا دیتے ہیں کہ ہند کا ہو خواہ سندھ کا مسلمان، ایران کی طرف نظریں لگائے ہوئے تھا۔ یقین تھا کہ ایران کی کمک انھیں ضرور اس آڑے وقت میں بچانے جائے گی۔

اس دور کا ایک ہندی شاعر ظہور اللہ نوا جس کے اجداد ساتویں صدی ہجری میں ایران سے ہند میں وارد ہوئے تھے ہند اور سندھ کی اس حالت سے متاثر ہو کر ایران کی طرف چلا اور وہاں پہنچ کر اس نے 'تاریخ جہانکشائے نادری' کے مؤلف مرزا مہدی کے نواسے میرزا ذکی کے سامنے یہ شعر پڑھا:-

تنگ دل، بیمار، جاں برلب، بہ ایران آمدم

اندریں دارالشفار، محتاجِ درماں آمدم!

یہ دور فتح علی شاہ قاچار (۱۷۹۷-۱۸۳۴) کا تھا۔ میرزا ذکی نے شاہی دربار کے شاعر فتح علی خان صبا تک اس کو پہنچا دیا، اور صبا کی وساطت سے نوا جب شاہ کے سامنے پیش ہوا تو ہند اور سندھ کی حالت زار پر اس نے ایک دردناک قصیدہ پڑھا جس کی ابتدا ہی اس شعر یاد سے ہوتی ہے:-

در ہند از بدگوہران، آفت پدیدار آمدہ!

سبز نخل فتنہا، ظلم و بلا بار آمدہ!

اور آگے چل کر کہتا ہے کہ:-

احوال ہندوستان زمن، کن گوش اے شاہِ زمن

در ہند و سند و ہم دکن، رایت نگونسار آمدہ!

نوا نے قصیدے میں کہا ہے کہ: اے دوستو! جس دن ہمیں پیغامبر یہ خوش خبری لا کر دے گا کہ شاہ ایران ہندوستان کے ارادے سے قندھار تک آ پہنچا ہے، اس وقت ہم اس کا منہ شکر سے بھر دیں گے۔

سازد ز قندش پر دھن، گوید چو پیغمبر ناگہاں:

یاران! پئے ہندوستان، شاہم بقندھار آمدہ

قندھار، ایران اور سنٹرل ایشیا کی طرف جانے کی راہ صاف کرنے کی خاطر بہر حال انگریزوں نے یہ ضروری سمجھا کہ پہلے سندھ پر قبضہ کر لیں، چنانچہ دہلی پر تسلط (۱۸۵۷ء) کرنے سے ۱۴ برس پیشتر انہوں نے (۱۸۴۳ء) میں سندھ کو محکوم کر لیا۔

سندھ کی آزاد حکومت اور مملکتِ ایران کے تعلقات کی آخری نشانی، ہمارے پاس بطور یادگار کے، وہ لاجواب کلام مجید ہے، جو تالپوروں کے آخری آزاد سلطان امیر محمد نصیر خان نے ۱۲۵۸ھ میں آستانہ قدس کے لیے سندھ سے بھیجا تھا جو اب تک وہاں کے میوزیم کی زینت بنا ہوا ہے، یہ کلام مجید [۱] اس قرآن کریم سے، جو ایک سو سال پیشتر سندھ سے بھیجا گیا تھا۔ زینت اور زیبائش میں کسی صورت سے کم نہیں ہے۔

آخری دور کے نویسندۂ بزرگ شاد رواں فرصت شیرازی (۱۲۷۱ - ۱۳۳۹ھ) کا وہ تاریخی قطعہ بھی ہمارے لیے ایک عزیز یادگار ہے جس کو انہوں نے سندھ کے تالپر امیر محمد علی خان کے کہنے پر تصنیف کیا ہے، جبکہ دونوں مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے ہم سفر تھے۔

بزرگ خطۂ ہند و امیر کشور سند — کہ نام نامی او، محمد علی محمد خاں شد
بزرگواری، کز عقل و دانش و تدبیر — بدہر غیرت آصف و رشک عثماں شد

پس آنکہ از پی تاریخ این زیارت میر — خرد بہر جہۂ فکر و خیال، پویاں شد
ز بہر فرصت آوردسر، پس آنگہ گفت — علی مرد، مردش از علی عمران شد

۱۲۸۹ × ۵ = ۱۲۹۴ھ

بہر حال اگرچہ انگریز کے تسلط کے بعد، سندھ اور ایران کے تعلقات بظاہر ختم ہو گئے۔ لیکن روحانی اور فرہنگی روابط برابر اسی طرح قائم مستحکم اور محکم رہے، جس طرح کہ سینکڑوں سال پہلے سے چلے آ رہے تھے۔

اس وقت سندھ پاکستان کا جزو ہے۔ پاکستان اور ایران کے مراسم نے جو صورت اختیار کی ہے ــــ نظر بدور ــــ وہ بھی شرح کے محتاج نہیں ہیں۔

کراچی ۲-۸-۶۶

حواشی

(۱) ۱۶۲-۱۴۸، ۴۷، ۳۸ J.S: PP

(۲) رشید۔ ص ۴۳ - ۴۹

(۳) Smith: PP 107 ـــــ قصص: ص ۱۱۸

(۴) عزیز: ص ۵۶۳ - مسعودی: ج ۲، ص ۱۹۱ - ۲۰۰

(۵) E.I: PP 38

(۶) Khan: P.P 12-14 - خرد: ص ۹۲ - مسعودی: ج ۱، ص ۳۴۹

(۷) تاریخ: ص ۱۳۴ - ۱۳۶ - ۲۱۹ - ۲۲۳ - تحفہ: ج ۳، ص ۴۴۳ - سعید۔ ص ۲۴۱

(۸) ایران کے لوگوں اور قافلوں کی آمد و رفت کا ذکر عربوں کی کتابوں میں موجود ہے۔ مثلاً مسعودی (۳۴۶ھ) ــ "... و بلاد الہند متصلۃ ببلاد خراسان والسند مما یلی المنصورۃ والملتان والقوافل المتصلۃ من السند الی خراسان" (ج ۱، ص ۱۵۷) اور ادریسی (۴۹۳ - ۵۶۰ھ) نے لکھا ہے کہ اہل خراسان و ایران بلخ کی بختی نسل نیز سمرقندی نسل اونٹنیوں کے لیے نسل بڑھانے کی غرض سے سندھ کے اونٹ لے جایا کرتے تھے۔ "و بہا اہل یرف فیہا اہل خراسان وغیرہم من اہل فارس و اشباہہا النتاج البختیۃ البلخیۃ والنوق السمرقندیۃ" (ص ۲۹)۔ اسی طرح ابن بطوطہ (۷۷۴ھ) نے بادام کے

بارے میں لکھا ہے کہ: "از خراسان بادام ماردی کردند، زیرا در اینجا در سند، درخت بادام وجود نداشت"۔ شرفا، علما اور شعرا کی آمد و رفت کا حال بھی
ان کتابوں میں ملتا ہے۔ چنانچہ مقدسی (تالیف ۳۷۵ھ) نے شیراز میں ایک عالم سے ملاقات کی تھی، جو وقت سے سندھ میں مقیم تھے، اور انھوں نے یہاں
کے طور طریقے اور حالات مقدسی سے بیان کیے تھے۔ نیز ایک اور فاضل و دانشور سے بھی مقدسی کی ملاقات ہوئی تھی، جو ابوالہیثم نیشاپوری کے احباب میں
سے تھے، اور انھوں نے سرزمین سندھ کے بہت سے مقامات کو دیکھا تھا — ... "وسألت رجلا من اہل العلم والحکمۃ وکان بمجلس بشیراز والا بوانہ یفتی
علیہم ویعرف بالزہد وقد اقام بتلک البلدان مدۃ مدیدۃ (ص ۴۷۷) ... وکذالک سألت فقیہا آخر من اصحاب ابی الہیثم النیسابوری وقد وطئ تلک النواحی
عن اسبابہا فضبع عندی من قولہا (ص ۴۷۷)

مقدسی ان سفیروں سے بھی ملا تھا جو حکومت منصورہ کی جانب سے عضد الدولہ (۳۳۸ - ۳۷۲) کے دربار میں متعین ہوئے تھے — ...
ورأیت رسولہم قد وافی الی ابنہ ونحن بشیراز (ص ۴۸۵)

جس وقت ابن بطوطہ (۷۳۴ھ) میں کھمبا آئے تھے، تو وہاں انھوں نے شمس الدین محمد شیرازی سے ملاقات کی تھی — ..." ولقیت
بہا الشیخ العابد الزاہد شمس الدین محمد الشیرازی وہو من المعمرین" (ج ۲، ص ۸)

مذکورہ حالات اور تعلقات پر نظر کر کے یقین کیا جا سکتا ہے کہ عربوں کی حکومت کے عہد میں ایران کے اثرات سندھ میں نمایاں تھے۔

(۹) اگرچہ عرب کے جغرافیہ دانوں نے منصورہ میں زبان فارسی کے رواج کا ذکر صریح طور پر نہیں کیا، تاہم انھوں نے مکران اور ملتان کے بارے
میں لکھا ہے کہ وہاں کے لوگ فارسی بولتے اور بخوبی سمجھتے تھے۔ مکران اور سندھ نہ صرف یہ کہ باہم متصل تھے، بلکہ بڑی حد تک، مکران، سرزمین سندھ
کا ایک حصہ تھا، اور ملتان اگرچہ اس وقت منصورہ سے الگ ہو چکا تھا، لیکن جغرافیے اور تاریخ کی رو سے سندھ کا ایک حصہ خیال کیا جاتا تھا۔ اصطخری:
(وارد ہند ۳۴۰ھ) ... "ولسان اہل مکران فارسی ومکرانی" (ص ۳۰) — یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا لباس تک ایرانی تھا۔ نیز دیکھیے: اصطخری (ص
۱۷۷) — اسی طرح مقدسی (تالیف ۳۷۵ھ) نے ملتان کے بارے میں لکھا ہے: ... "وفارسیۃ مفہومۃ" (ص ۴۸۰)

اگر ملتان اور مکران میں فارسی رائج تھی اور لوگ اس زبان میں بات چیت کرتے تھے تو پھر یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ سندھ فارسی زبان سے محروم
تھا، جبکہ منصورہ اور دیبل وغیرہ بڑے تجارتی مرکز تھے۔

(۱۰) ER.E: PP ۲۲۲

(۱۱) زین: ص ۷۰ — نیز سندھ اور ملتان کے اسماعیلیوں کے بارے میں دیکھیے:
سیر: ص ۳۱۵ تا ۳۲۹ و ۳۴۲ تا ۳۵۵ — فرشتہ (ج ۱، ص ۱۷ اور ۲۷) —
کامل: ص ۱۳۲ — عنصری نے اس سلسلے میں کہا ہے:

نہ قلعہ ماند کہ نگشاد و نہ سپہ کہ نزد
نہ قرمطی کہ نکشت و نہ گبر نہ کافر — دیوان: ص ۱۱۱

(۱۲) دقیقی:
شہ بربرستان و شاہان ہند
گزینش بدادند و شاہان سند — دیوان: ص ۸۰

فرخی: (جبکہ وہ محمود کا ہمسفر تھا)

شنیده ام که فرامرز رستم اندر سند

بگشت مار و بدان فوز کرد پیش تبار — دیوان: ص ۵۴

بسند و هند کسی نیست مانده کان ازدو

کز آن تو شود آنجا بجنگ یک چاکر — ص ۴۳

ژنده پیلان کز در دریای سند آورده ای

سال دیگر بگذرانی از لب دریای نیل — ص ۲۲۱

رایت تو سایه افگنده است بر دریای سند

کی بود شاها که سایه افگند بر کوه شام

سند و هند از بت پرستان کرد پاک

رفته زین سو تا بدریای روان — ص ۲۶۳

عنصری: بسند و هند زعکس رخ هزیبقیسان

هزار خوار نتوان شناختن ز زریر — دیوان: ص ۴۳

بسند و ناحیت هند شهریار آن کرد

کجا بمردم خیبر نکرده بد حیدر! — ص ۱۱۱

هم اندر این سفر این حرب کرد و رفت بسند

بحرب کوره و تارا چو تیر کان کبسه — ص ۱۱۲

قطران: اگرچه زاد تو این جا وگرچه جای تو ایدر

بتو ترسانند اندر سند و چین اطفال را مادر — دیوان: ص ۱۴۴

ناصر خسرو: از پارسی و تازی و از هندی و از ترک

وز سندی و رومی و زعبری همه یکسر — دیوان: ص ۱۴۴

بپیغمبر عرب یکسر مشرف گشت و فرستاد

ز ترک و رومی و هندی و سندی گیلی و دیلم — ص ۲۶۹

بعلم هندسه سر برکشیدی

بسند و هند و اطراف خراسان — ص ۲۱۳

بسند اندانست گاهم گه بمغرب

چنین هرگز ندیدستم فلاخن — ص ، ۴۷۱

من همی نازش بآل حیدر و زهرا کنم

تو همی نازش بسند و هند و بر گوهر کنی

.. ..

هند ای را سند بخش پیکاری را طرازنده

کهتری ما به زمین خاوران مهتر کنی — ص ، ۴۲۳

نخواهد خورد مر پروردگان خویش را گیتی

نخواهد رستن از چنگال او سندی و هندی — ص ، ۴۹۳

چو فضل دین احمد را ز فضل خویش بگشتی

چه باشد فضل سوی او ترا بر هندی دمشقی — ص ، ۴۹۴

مسعود سعد سلمان: رایان هند را و هژبران سند را

در بیشها بیاب و بیک جا شکار کن — دیوان : ص ، ۴۳۷

عسجدی: (جبکہ سومنات اور سندھ میں محمود کے ساتھ تھا)

تا شاه خسروان سفر سومنات کرد

کردار خویش را علم معجزات کرد — دیوان بتصحیح طاہری شہاب

امیر معزی: به زمین هند و سند از هیبت شمشیر او

شیر غرنده گردد بی‌زبان غائب ز غاب — دیوان : ص ، ۶۶

از ناحیه سند کنون تا بحد هند

بس کس که ازین رنج بدرد است و بیقرار — ص ، ۲۰۲

خصم ملک از گریزی صد لشکر آورده بهم

از حد کالنجر و قنوج و سند و ملتان — ص ، ۵۲۰

مختار غزنوی: (جو صرف جنگ خلجی اور مسعود سعد سلمان کی ملاقات کے لیے سندھ میں آیا تھا (مقدمہ ۹۵))

ترا بحاکمی سند تهنیت چه کنم

که گشت از هنرت هند در زمانه سمر

همه ممالک مشرق سپرده گیر بتو

چه هند بر تو نوشته سند را چه نظر — دیوان ، ص ۱۲۹

(۱۳) ناصری میں لکھا ہے کہ: چوں ممالک سند بدست (ناصرالدین) قرار گرفت، مدحادث کنار چین اکابر خراسان و غور و غزنین بسیار بخدمت او پیوستند، و او در حق جملگان انعام و اکرام فرمود (ج ۱، ص ۴۱۹)۔

(۱۴) ملوکیہ: ص ۲۰۶ (بحوالہ فرشتہ)

(۱۵) بزم: ص ۹۳

(۱۶) لباب: ص ۲۳، ۲۷۶۔ ملوکیہ: ص ۲۰۱۔ میگزین: ص ۹۳ (شمارہ نومبر ۱۹۳۵ء) یہ عبارت تذکرہ گل رعنا (شفیق) سے نقل کی گئی ہے "فضلی ملتانی ملقب بتاج الفضلا از علمای ملتان بود، در خدمت ناصرالدین قباچہ بسر می برد"

(۱۷) تاج نامہ: ص ۱۱

(۱۸) ناصرالدین قباچہ کی مدح میں لکھا ہے، مطلع یہ ہے:

خسروا ملک بر تو خرم باد
کل گیتی ترا مسلم باد!

بقیہ دیکھئے تاج نامہ، ص ۷

(۱۹) عوفی: ج ۲، ص ۲۱۴ - میگزین: ص ۹۱ (شمارہ نومبر ۱۹۳۶ء) - تاج: ص ۲۷ (مقدمہ)

(۲۰) عوفی: ص ۴۴

(۲۱) بزم: ص ۴۴ (بحوالہ فرشتہ)

(۲۲) بزم: ص ۴۴ (بحوالہ فوائد الفواد، ص ۱۳۷)

(۲۳) بزم: ص ۱۵۸

(۲۴) PP. 7 - 9 : PPS. 5 ... مظہر: حاشیہ عثمان - لب: ص ۸ - ۶ "در دربار خان شہید (۶۸۳ - ۶۶۸ھ) شعر و ادبیات فارسی رونق خاصی داشت اشعار فردوسی، سنائی، خاقانی و نظامی قرائت می شد و مورد بحث قرار می گرفت - برنی نے لکھا ہے: ... "و ندیمان او شاہ نامہ و دیوان سنائی و دیوان خاقانی و خمسہ شیخ نظامی خواندندی و در اشعار بیندگان متکرر دلیلیان در پیش او بحث کردندی ... " (ص ۶۷) جس زمانے میں شیخ عثمان مرندی اس سرزمین میں مقیم تھے، خان شہید نے دو دفعہ شیخ سعدی (متوفی ۶۹۱ھ) کو ملتان میں بلانا چاہا، لیکن شیخ علیہ الرحمہ نے ضعف پیری کی بنا پر عذر کر دیا۔ برنی میں لکھا ہے: ... "شیخ عثمان مرندی کہ بزرگ بود در ملتان رسید ... خان شہید ... او را با فراط تواضع کرد ... و خان شہید ... دو کرت از ملتان در طلب شیخ سعدی قاصد و حاملان اکمان خرج بر شیراز فرستاد و شیخ را در ملتان طلب کرد، و خواست کہ بجہت او در ملتان خانقاہ سازد و مواضع خانقاہ او وقف کند - خواجہ سعدی از ضعف پیری نتوانست آمد و ہر دو کرت بکان سفینہ غزل بخط خود، نزد خان فرستاد و عذر نیامدن خود در قلم آورد ... " (ص ۶۸)

(۲۵) عفیف: ص ۲۴۶

(۲۶) تحفۃ: ص ۲۴۹ - ماہرو: مکاتیب، شمارہ ۱ (ص ۲)، ۸ (ص ۱۹)، ۲۴ (ص ۱۰۰)، ۹۹ (ص ۱۸۶)، ۲۳ (ص ۲۲۹) — مکلی (راقم الحروف کے حواشی) ص ۱۳۷ تا ۱۷۶۔

(۲۷) مکلی: (راقم الحروف کے حواشی) ص ۸۷-۱۰۷ - میگزین: (شمارہ فروری ۱۹۳۵ء) ص ۱۴۰۔

(۲۸) میگزین: (شمارہ فروری ۱۹۳۵ء) ص ۱۴۲ تا ۱۵۶۔

(۲۹) ایبب: ص ۲۹۲ و ۲۹۳۔ قلمی نسخہ جو اس وقت ڈاکٹر معین الحق کے ذاتی کتب خانے (کراچی) میں محفوظ ہے۔

(۳۰) نسخہ قلمی جو خانقاہ مخدوم نوح کے کتب خانے (ہالا) میں محفوظ ہے۔

(۳۱) بزرگ: ص ۴۰۔

(۳۲) مکلی: (راقم الحروف کے حواشی) ص ۴۱ تا ۴۷ - معارف: ص ۱۵۱ - تحفۃ: ص ۱۸۶۔

(۳۳) رحیمی: ج ۱، ص ۲۷۳۔

(۳۴) رحیمی: ج ۱، ص ۲۷۲ - معصومی: ص ۴۷-۵۰۔

(۳۵) قانع: ص ۸۱۶۔

(۳۶) معصومی: ص ۷۶، ۱۹۹ - حبیب: ج ۴، ص ۴۹۳ - حاشی: راقم الحروف کا مقدمہ - رحیمی: ج ۱، ص ۲۷۵ - تحفۃ: ج ۳، ص ۱۴۱

(۳۷) رحیمی: ج ۱، ص ۲۷۴ - معصومی: ص ۷۵ - علامہ دوانی کو محمود گاواں وزیر نے بھی دعوت دی تھی کہ بیدر میں تشریف لائیے، دیکھیے: گاواں: مکتوب نمبر ۱۴، ص ۱۶۲۔

(۳۸) تحفۃ: ج ۳، ص ۱۹۱

(۳۹) تحفۃ: ص ۱۹۲

(۴۰) مکلی: (راقم الحروف کے حواشی) ص ۵۵۰۔

(۴۱) حبیب: ج ۴، ص ۳۹۰ تا ۳۹۴ - ترخان: شجرہ ۱۷ - مکلی: راقم الحروف کا مقدمہ۔

(۴۲) فرشتہ: ج ۲، ص ۶۲۰ - طاہری: ص ۶۱۔

(۴۳) تحفۃ: ج ۳، ص ۱۹۲ - قانع: راقم الحروف کا مقدمہ، نیز ص ۵۳۱ - قصائد: راقم الحروف کا مقدمہ — سندی: میر قانع کے حالات از راقم الحروف۔

(۴۴) تحفۃ: ج ۳، ص ۱۹۸

(۴۵) معصومی: ص ۹۱ - ۹۲ - ۱۸۱ - تحفۃ: ج ۳، ص ۳۰۰ - پورانی:

(۴۶) معصومی: ص ۴۴ - ۴۶ - ۴۷ - ۵۲ - ۱۱۲ - ۲۱۵ - ۲۲۵ - ۲۳۹ - تحفۃ: ج ۳، ص ۲۰۲

(۴۷) شیخ نظام الدین دہلوی کی خانقاہ میں دفن ہوئے، قبر موجود ہے۔

(۴۸) معصومی: ص ۴۷-۴۸۔

(۴۹) معصومی: ص ۲۴۳، ۲۰۳، ۲۱۷، ۲۳۹ -

(۵۰) معصومی: ص ۲۴۳ -

(۵۱) تلک: ج ۳، ص ۱۴۱ -

(۵۲) معصومی: ص ۲۰۶ -

(۵۳) مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، بتصحیح راقم الحروف -

(۵۴) زیر طبع، بتصحیح و مقدمہ راقم الحروف -

(۵۵) نسخہ قلمی کتب خانہ بانکی پور، اور اس کا عکس راقم الحروف کے پاس موجود ہے -

(۵۶) مطبوعہ: نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۰ء طبع دوم؛ نولکشور لکھنؤ ۱۹۰۳ء طبع سوم؛ ماہنامہ اردو: اورنگ آباد (شمارہ جولائی ۱۹۲۸ء)
اور نسخہ قلمی مملوکہ راقم الحروف -

(۵۷) نایاب -

(۵۸) نسخہ قلمی مملوکہ راقم الحروف -

(۵۹) قانع: ص ۸۶۲ - معصومی (ص ۱۸۰) میں لکھا ہے: ... "پل پر نہر مقابل قصبہ جون بستند و تاریخ مصالحہ و پل بستن را بادشاہ (ہمایوں) "صراط مستقیم" یافتہ اند" - نیز دیکھیے: بیگم: ص ۹۳

(۶۰) ۶۵ RAY. P.P - عباسی: ص ۹۷

(۶۱) تلک: ج ۳، ص ۱۹۹

(۶۲) قانع: ص ۱۷

۶۳ قانع: ص ۴۱۴ - تلک: ج ۳، ص ۲۰۳

(۶۴) معصومی: ص ۲۲۵، ۲۳۹ -

(۶۵) عباسی: ص ۱۱۶ - اکبر: ج ۲، ص ۲۳۷ - ردطو: ص ۲۲۴ - اور وہ خط جو شاہ طہماسپ نے لکھا تھا، وہ عالم آرائے عباسی (برٹش میوزیم نمبر ۵۴ ۱۶۴۷۶-۱۶۴۷۷/۵/ورق ADD -) کے قلمی نسخے کے حاشیے پر ایک غیر معلوم شخص کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے میں اپنے دوست جناب ڈاکٹر ریاض الاسلام کا ممنون ہوں، جنہوں نے یہ اطلاع فراہم کی -

(۶۶) تحفہ: ورق ۴۰۲ تا ۴۰۶ - روز: ص ۶۷۹ - نشتر: ورق ۳۲۷ - مخزن: ص ۱۴۰۱ تا ۱۴۰۶

(۶۷) معانی: ص ۵۲۳ - ۵۲۴

(۶۸) زنجی: ورق ۲۵۳ - ہنر: ص ۳۷۷ - آثار: ص ۷۲

(۶۹) ہنر: ص ۳۷۹

(۷۰) سیر: ص ۱۹۹ - معانی: ص ۱۱۶ بحوالہ عرفات

مرشد نامی شیخ گرامی احمد جامی عمّ برّہ
سال وفاتش یافتہ نامی احمد جامی قدس سرّہ (۵۳۶ھ)
سورہ محمد معصوم بکھری نامی سنہ ۱۰۱۲ھ

۱۲ ستمبر ۱۹۶۲ء کو راقم یہ کتبہ دیکھنے اور اس کا عکس لینے خود گیا تھا۔ کتبہ مزار احمد جام کے سنگی کٹہرے کے اوپر والے کنارے پر کندہ ہے۔

(۷۱) عباسی: ص ۶۴۷-۶۶۳- اکبر: ج ۴: ص ۸۲۵- بکھری: خط میر معصوم، شاہ عباس کے نام سے گئے تھے۔ وہ جامع طرائق قلمی اور فیاض القوانین (برٹش میوزیم، نمبر ۹۶۱۷ - OR) میں موجود ہے۔ نیز- اکبر: ج ۳، ص ۸۳۶

(۷۲) ترخان - معانی: ص ۲۹۳ - ۲۹۴ - ۳۲۵ - ۴۳۷ - ۴۵۳ - ۴۷۷ - ۵۵۵ - ۵۷۹ - ۵۹۸ - ۶۰۳ - ۶۰۵ - ۶۷۱ -

(۷۳) تک: ج ۲، ص ۸۵ - ۱۳۸ - ترخان: ص ۹۱ - مآثر: ج ۲، ص ۳۴۶ -

(۷۴) ذخیرہ: ص ۱۶۲

(۷۵) عباسی: ص ۴۵۰

(۷۶) ذخیرہ: ص ۲۸۶ - مآثر: ج ۳، ص ۵۸۴ - مکلی: (راقم الحروف کے حواشی) ص ۲۶۷ تا ۲۷۶ - تزک: ۱۲۹- ۱۳۰- ذخیرہ: ص ۸ -

(۷۷) مکلی: (راقم الحروف کے حواشی) ص ۲۷۷ تا ۲۸۰ - تزک: ص ۳۵۰ - ۳۵۶ - ۳۵۹

(۷۸) قانع: ص ۱۳۰ - ۷۵۹

(۷۹) قانع: ص ۳۰۰

(۸۰) قلمی نسخہ مملوکہ راقم الحروف: ص ۵۱

(۸۱) وصیت: راقم الحروف کا مقدمہ

(۸۲) مہران: ص ۱۴۵

(۸۳) قانع: ص ۳۹۰ - مکلی: راقم الحروف کے حواشی -

(۸۴) قانع: ص ۱۵۰

(۸۵) حزیں: ص ۳۲۷ - قانع: ص ۱۶۸ - سفینہ: ص ۱ تا ۴۵ - آزاد: ص ۱۹۳

(۸۶) قانع: ص ۷۶۶ - روئداد: ص ۳۸۴

(۸۷) محسن: ص ۷۸۴

(۸۸) وصیت: ص ۱۲

(۸۹) ... بیت، ص ۳۳

(۹۰) مہران، ص ۱۸۰

(۹۱) نمبر ۲۵۵، روزنامہ آستانہ قدس، اوراق ۹۰۶ = ۲۳ × ۳۶/۴

(۹۲) مہران، ص ۱۷۹ - ڈاکٹر برنس نے لکھا ہے کہ تالپوروں نے ایران کے اثرات کے تحت مذہب اختیار کیا تھا۔

"The Talpurs were originally Soonnees like Balochees and Sindhians in general but their connection with Persia has infected the Court with the Heresies of that Kingdom, and with the Exception of Murad Ali and Sobdar, who are still attached to the orthodox Doctrines, they have become Sheah's or followers of Ali" (P. 81)

—— جب محمد علی وکیل، سلطان فتح علی خاں قاچار کے وکیل کی معیت میں ایران سے سندھ میں آئے تو میر مائل نے مبارکباد میں ایک قطعہ کہا:

بنازم کز ایران دگر در وطن — محمد علی میرزا آمدہ!
ز سلطان ایراں گرفتہ وکیل — باقبال شاہان ما آمدہ
خوش آمد کہ خوشنودی طبع من — ز بشنیدن ایں صدا آمدہ
دل من بشکرانہ ایں نوید — بشارت دہ مرحبا آمدہ
بحمداللہ کایں مسلم پاک دیں — سلامت بفضل خدا آمدہ
فبلّغ دعائی اِلےٰ من لہٗ — نوید حصول رجب آمدہ
فبلّغ تسالیم شوقی الیہ — پیامم بپیک صبا آمدہ
ببزم شاں باردی سرخرو — ز "مائل" بحق ایں دعا آمدہ

مہران: ص ۱۷۹

—— میر مائل نے ایک اور قطعہ، میرزا محمد اسماعیل، وکیل سلطان ایران کے سندھ میں تشریف لانے کی مبارکباد اور تاریخ پر مشتمل کہا، جو حسب ذیل ہے۔

مژدہ ای دل کایں زماں از حضرت خاقان و شاہ
مژدہ تشریف مرزای بما خوش آمدہ
میرزایم سید اسماعیل ذوالمجد و شرف
بارک اللہ خیر مقدم مرحبا خوش آمدہ

خوش ز سوی شاہِ ایراں جانبِ شاہان سند
از صداقت آں وکیل با صفا خوش آمدہ

در قدوم پر نشاطِ آں نشاط افزائی دل
گفت از شادی دلم جمع و صفا خوش آمدہ

از صداقت شادِ دل آمد ز ایراں چوں بسند
شادی دوراں بکام اصدقا خوش آمدہ

سال تشریف شریفش زاں مکاں در ملک سند
چوں ز دل جستم بگفتا "میرزا خوش آمدہ"

۱۲۱۴ھ

باد دائم فضل حق بر مدعایش کام بخش
ز دل مائل بحق عرض دعا خوش آمدہ

(۹۳) مہران: ص ۱۵۶

(۹۴) مریخ: مقالہ شاد رواں احسن کربلائی

(۹۵) یہ تذکرہ حال میں جناب ڈاکٹر محمد باقر نے لاہور میں طبع کرایا ہے۔

(۹۶) بدایوں: ص ۱۸ تا ۴۵

(۹۷) موزہ آستانہ قدس، شمارہ ۳

(۹۸) دیوان فرصت: ص ۲۰۴، مطبوعہ تہران، ۱۳۳۷ش

فہرست منابع

ادریسی: نزہتہ المشتاق، شریف ادریسی بتصحیح مقبول احمد۔ علی گڑھ، ۱۹۵۴ء

اصطخری: ممالک والمسالک، الاصطخری لیڈن، ۱۹۲۷ م

اکبر: اکبرنامہ جلد ۳، ابوالفضل، کلکتہ، ۱۸۷۷ م

ایوب: شرح حال مخدوم جہانیاں جہاں گشت، محمد ایوب قادری، کراچی، ۱۹۶۳ م

آثار: مجلہ آثار ایران تہران، ۱۹۳۷ م

آزاد: خزانہ عامرہ، غلام علی آزاد نولکشور لکھنؤ، ۱۹۰۰

بدایوں: بدایوں ۱۹۵۷م میں (اردو) سلیمان ندوی کراچی، ۱۹۶۰ م

برنی: تاریخ فیروز شاہی، ضیاء الدین برنی کلکتہ، ۱۸۹۲

بزرگ: عجائب الہند، بزرگ بن شہریار، اسدی، تہران

بزم: بزم صوفیا (اردو) سید صباح الدین، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴م

بطوطه :	رحله جلد ۳ ، ابن بطوطه	مصر ۱۹۳۸
بهری :	میر معصوم بهری (اردو) ، تالیف سید حسام الدین راشدی ، زیر چاپ	
بیگم :	همایون نامه ، گلبدن بیگم ، بیورج ،	لندن ۱۹۰۲م
پورانی :	سادات پورانی در سند (سندی) تالیف سید حسام الدین راشدی ، زیر چاپ	
تاریخ :	تاریخ سیستان ، بتصحیح بهار ،	تهران ۱۳۱۴ ش
ترخان :	ترخان نامه ، سید محمد تتوی ، بتصحیح سید حسام الدین راشدی ، سندی ادبی بورد	۱۹۶۵ م
تزک :	تزک جهانگیری ، جهانگیر بادشاه ،	نولکشور ، لکهنو
تقی :	خلاصة الاشعار ، تقی کاشی	خطی ، نسخه مانچستر نمبر ۲۱۲
تک :	تحفة الکرام ، میر علی شیر قانع ،	مطبع ناصری ، دهلی
تیموریه :	بزم تیموریه (اردو) ، سید صباح الدین	اعظم گره ۱۹۴۸ م
جامع :	جامع القوانین	خطی ، موزه بریطانیا
چچ نامه :	فتح نامه (چچ نامه) علی کوفی ، بتصحیح دکتور داؤد پوته ،	دهلی ، ۱۹۳۹ م
حبیب :	حبیب السیر ، خواند امیر ،	تهران ۱۳۳۳ ش
حزین :	سوانح شیخ علی حزین ، BELFOAR	لندن ۱۸۳۱ م
خرد :	المسالک والممالک ، ابن خردازبه	لیدن ۱۸۸۹
خل :	تاریخ ابن خلدون جلد ۳ ،	مصر
ذخیره :	ذخیرة الخوانین ، فرید بکری	خطی ، کتابخانه سید حسام الدین راشدی
رحیمی :	مآثر رحیمی جلد ۱ ، عبدالباقی نهاوندی	کلکته ، ۱۹۲۵ م
رشید :	مقاله بر قلعه رنی کوت ، کرنل خواجه عبدالرشید مجله اقبال ریویو ، شماره اپریل	کراچی ، ۱۹۶۵
روز :	روز روشن - مظفر حسین صبا ،	بهوپال ۱۲۹۷ هـ
روملو :	احسن التواریخ ، حسن روملو ، بتصحیح C.N. Seddon	برودا ، ۱۹۳۱ م
رودداد :	اداره معارف اسلامیه اجلاس دوم ۱۹۳۶ م	لاهور ، ۱۹۳۸ م
زخمی :	انیس العاشقین ، رتن سنگهه زخمی	خطی ، نسخه دانش گاه پنجاب
زین :	زین الاخبار ، گردیزی	برلن ، ۱۹۲۸
سفینه :	سفینه علی حزین ، مقدمه از مهاراج کشن پرشاد	حیدرآباد (دکن) ، ۱۹۳۰ م
سندی :	تحفة الکرام (ترجمه سندی)	سندی ادبی بورد ۱۹۵۷

سنیہ :	عرب و ہند کے تعلقات (اردو)، سید سلیمان ندوی،	الہ آباد، ۱۹۳۰ م
سیر :	سیر ایران (اردو)، محمد حسین آزاد،	لاہور
طاہری :	تاریخ طاہری، طاہر محمد نسیانی،	سندی ادبی بورد، ۱۹۶۴ء
عباسی :	عالم آرائی عباسی	تہران
عظیم :	دیوان عظیم تتوی، دکتور غلام مصطفیٰ خاں	سندی ادبی بورد ۱۹۶۲ م
عفیف :	تاریخ فیروز شاہ، سراج عفیف، تصحیح ولایت حسین،	کلکتہ، ۱۸۹۰ م
عوفی :	جوامع الحکایات، عوفی، بتصحیح دکتور محمد معین	تہران، ۱۳۳۵ ش
غازی :	مرزا غازی اور اس کی بزم ادب (اردو)، تالیف سید حسام الدین راشدی : زیر چاپ	
عزرد :	تاریخ غزر والسیر، الثعالبی،	اسدی، ۱۹۶۳
فخری :	تذکرہ روضۃ السلاطین، فخری ہروی، بتصحیح	ء
فرشتہ :	تاریخ فرشتہ جلد (۲)، ہندو شاہ فرشتہ	بمبئی، ۱۸۳۲ م
فیاض :	فیاض القوانین، شمارہ ۹۶۱۰ OR	خطی، موزہ برطانیا
قانع :	مقالات الشعراء، میر علی شیر قانع تتوی، بتصحیح سید حسام الدین راشدی	سندی ادبی بورد، ۱۹۵۰ م
قصائد :	مثنویات و قصائد قانع، مرتبہ سید حسام الدین راشدی	
قصص :	مجمل التواریخ و القصص، بتصحیح بہار،	تہران، ۱۳۰۸ ش ۱۹۶۱ م
کامل :	کامل جلد ۹، ابن اثیر،	لیدن
گاوان :	ریاض الانشا، محمود گاوان، مرتبہ شیخ چاند	حیدرآباد، دکن، ۱۹۴۸ م
لب :	لب تاریخ سندھ، خداداد خان،	امرتسر، ۱۹۰۰ م
لباب :	لباب الالباب، عوفی، بتصحیح نفیسی،	تہران، ۱۳۳۳ ش
ماہرو :	منشآت ماہرو، بتصحیح شیخ عبدالرشید	لاہور، ۱۹۶۵ م
مائل :	دیوان مائل تتوی، غلام علی مائل تتوی	سندی ادبی بورد،
مآثر :	مآثر الامرا جلد ۳، شاہ نواز خان، بتصحیح مرزا اشرف علی	کلکتہ، ۱۳۰۹ ھ
محسن :	دیوان محسن تتوی، محمد محسن تتوی،	سندی ادبی بورد، ۱۹۶۳ م
مخزن :	مخزن الغرائب، سندیلوی -	خطی، ذخیرہ آذر، دانش گاہ پنجاب
مسعودی :	مروج الذہب، مسعودی -	سعادۃ مصر ۱۹۴۸ م
مظہر :	مظہر شاہ جہانی، میرک یوسف، بتصحیح سید حسام الدین راشدی	کراچی

[illegible] : معارف الانوار، ملا زکریا تتوی، — خطی، کتابخانۂ سید حسام الدین راشدی

[illegible] : تذکرۂ میخانہ، عبدالنبی فخرالزمان بتصحیح گلچین معانی، — تہران، ۱۳۴۰ ش

معصومی : تاریخ سند، میر معصوم نامی بتصحیح دکتر داؤد پوتہ — بمبئی، ۱۹۳۸ ش.

مق : احسن التقاسیم، المقدسی، — لیدن ۱۹۰۶

مکلی : مکلی نامہ میر علی شیر قانع تتوی، بحواشی سید حسام الدین راشدی — ادبی بورد ۱۹۶۶ء

ملوکیہ : بزم ملوکیہ (اردو)، سید صباح الدین، — اعظم گڑھ ۱۹۵۴م

مہراج : مہران جون موجون (سندی)، تالیف سید حسام الدین راشدی — کراچی محکمہ اطلاعات

مہر : تاریخ کلہورا جلد (۱)، (اردو) غلام رسول مہر، — سندی ادبی بورڈ، ۱۹۵۸م

مہران : شرح حال میر مائل تتوی (سندی)، مقالہ سید حسام الدین راشدی، مجلہ مہران شمارہ بہار، سندی ادبی بورد ۱۹۵۵م

میگزین : اورینٹل کالج میگزین، شمارہ فبروری، — لاہور ۱۹۳۵

" : " شمارہ نومبر، — " ۱۹۳۸

" : " شمارہ فروری، — " ۱۹۳۹

ناصری : طبقات ناصری، بتصحیح استاد حبیبی — کابل ۱۳۴۲ ھ

ندوی : ہندوستان عربوں کی نظر میں دو جلد (اردو)، معین الدین ندوی — دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۶۲-۱۹۶۱م

نشتر : نشتر عشق — خطی ذخیرۂ آذر، دانشگاہ پنجاب

وصیت : منشور الوصیت، میاں نور محمد کلہورا بتصحیح سید حسام الدین راشدی، — سندی ادبی بورڈ، ۱۹۶۴م

ہاشمی : مثنوی مظہر الآثار، شاہ جہانگیر ہاشمی، " — "

ہنرفر : گنجینۂ آثار اصفہان، دکتر ہنرفر — تہران، ۱۳۴۴ ش

E.I : Encyclo Paedia of Islam. Vol III

E.R.E : Encyclo Paedia of religion and ethics - Vol. III 1953.

J.B : Foreign influece on ancient India - R.A. Jairaz Bhoy N.Y. 1963.

KHAN : Indus Valley and early Iran - Dr. F.A. khan. Karachi-1964.

P.P.S : Persian poets of Sind - Sadarangani S.A.B - 1956.

RAY : Humayun in Persia - Sukumar RAY - R.A.S. of Bengal - Cal. 1948.

SMITH : The early history of India - V.A. Smith OXFORD - 1962.

ظرافت نگار، راجہ مہدی علی خان

دوراں زیدی

اب سے پہلے کی طرح، آج کی اردو شاعری بھی اپنے متنوع موضوعات کے سبب، دنیا کی ترقی یافتہ شاعری میں شمار ہوتی ہے۔ کل تک کی تاریخ میں میرؔ، مومنؔ، غالبؔ اور داغؔ وغیرہ عشقیہ شاعری کی نمائندگی کرتے رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی نظیرؔ اکبرآبادی سے حالیؔ اور اقبالؔ تک ایک الگ گروپ بنتا رہا ہے۔ آج ایک طرف جگرؔ کا تغزل اور اس کے پیرو ہیں۔ دوسری طرف جوشؔ کی لفظی کاری گری کو سراہا جا رہا ہے۔ تیسری طرف ترقی پسند نظریات کو فیضؔ اور سردار جعفری ایک فلسفے کی صورت میں، اپنے ساتھ لیے چل رہے ہیں۔ (کچھ اس عہد میں ایسے بھی ہیں، جن کے یہاں آج کا ذہن تو ہے، لیکن وہ صرف انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کو جدت پسند کہنا کافی ہوگا)

اردو کی اس متنوع اور رنگا رنگ شاعری میں، اگر یہ دیکھا جائے کہ کوئی سب سے الگ بھی ہے: تو یہ تجزیہ بہت مشکل ہوگا۔ اور اگر یہ تجزیہ ہو سکا تو پھر (اس عہد میں) صرف ایک ذات ایسی نکلے گی، جو سب سے علیحدہ ہے، سب کے رنگ سے اس کا رنگ جدا ہے۔ وہ ذات ہے راجہ مہدی علی خاں! (ان کے یہاں میرؔ کا سوز و گداز اور مومنؔ، داغؔ اور جگرؔ ایسا تغزل نہیں ہے۔ نظیرؔ، حالیؔ، اقبالؔ اور جوشؔ میں سے کسی کی کوئی جھلک بھی نہیں۔ حتیٰ کہ اکبرؔ الٰہ آبادی اور شادؔ عارفی کی طنزیہ گل کاریاں بھی نہیں)

میں نے بہت غور کیا! راجہ صاحب کے کلام پر طنز یا مزاح کا اطلاق ہرگز نہیں ہوتا۔ البتہ اُن کا کلام طنز و مزاح کی حد تک پہنچ کر ٹھہر جاتا ہے یا کبھی کبھی طنز و مزاح کا دھوکہ دیتا ہے۔ اصلاً طنز و مزاح نہیں ہے! اس طرح از خود سوال پیدا ہوا کہ آخر راجہ مہدی علی خاں کا کیا رنگ ہے؟ ہم آپ جانتے ہیں! دو مختلف رنگ کو آپس میں گھول دینے کے بعد، ایک تیسرا رنگ وجود میں آتا ہے۔ ایسا ہی ایک رنگ راجہ صاحب کے کلام کا ہے، جو طنز و مزاح کے پیمانوں سے مخلوط ہو جانے کے بعد ظہور میں آیا ہے۔ میں اس کو راجہ صاحب کی ظرافت کا نام دوں گا۔

طنز، مزاح اور ظرافت یہ تینوں لفظ اپنے چلن کی خاطر، ایک دوسرے سے مختلف مزاج کے مالک ہیں۔ طنز خود کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ حقیقت کو جھٹلانے کا ایک ذریعہ ہے؛ یہ حقیقت کے کمزور پہلوؤں پر نشتریت کا کام بھی دیتا ہے؛ اور اکثر ایسی بیباکی، ایسی بیدردی کے ساتھ کہ انسان رو پڑے۔ مزاح کا کام صرف ہنسنا ہے، ہنسانا ہے! اور کبھی کبھی جی کھول کر ہنسا دینا ہے۔ اس کے شدید عمل سے رونق بھی خوب ہضم ہوتی ہے۔ ظرافت ان دونوں سے پرے، بھولے پن کی ہمت افزائی کرتی ہے! سیدھے سادے طور پر خوشی اور مسرت عطا کرتی ہے! اور خوش رہنے کی دعوت دیتی ہے (مزاح کی طرح، اس (ظرافت) سے رونق ہضم نہیں ہوتی۔ طنز کی طرح، کوفت میں مبتلا کرنا اور جھٹلانا یا رلا دینا اس کا شیوہ نہیں ہے)

دراصل ظرافت زندگی سے الجھ کر رہنے میں نہیں ہے؛ زندگی سے کھیلنے میں ہے۔ جیسے ہاکی کا ایک کامیاب کھلاڑی، یا فٹ بال کا، جب چاہتا ہے! اور جس طرح چاہتا ہے، گیند پھینک دیتا ہے۔ جس کا کام سب کو ہرا دے کر سب سے بچ کر سبھوں سے اپنے آپ کو بچا کر

[illegible]

راجہ مہدی علی خاں کے نظریے کے مطابق زندگی کوئی خواب خانہ نہیں ہے؛ جہاں اس کا رونا رویا جائے۔ اس پر ماتم کیا جائے، یا اس پر مرثیہ پڑھا جائے، یا اس کا قصیدہ لکھا جائے؛ یا اس کے دکھ درد میں سوز گائے جائیں۔ راجہ مہدی علی خاں کے نزدیک تو زندگی اور دنیا ہاکی یا فٹ بال کا میدان ہے، جوئے یا گنجفے کا اکھاڑہ، یا پھر کسی دوسری دنیا سے آئے ہوئے انسان کی طرح یہ پاپوں بھری دنیا صرف ایک سیرگاہ ہے۔ وہ راجہ صاحب یہاں ہنس کر مسکراتے نہیں، اس میں دوسروں کو مسکرانے اور خوش رہنے کی تلقین نہیں کرتے۔ ایک سیاح کا کام صرف تفریح کرنا ہے اور ان ہی اوقات میں دنیا اور سماج کی ہر ایک بری حرکت پر مسکرا دینا۔

میں نے راجہ مہدی علی خاں کی کتاب "انداز بیاں اور" پڑھی ہے؛ اور ان کا وہ کلام بھی جو چھپ تو چکا ہے، لیکن کسی کتابی صورت میں نہیں ہے۔ اسی بنیاد پر میں نے محسوس کیا کہ راجہ صاحب کے کلام میں یہ خصوصیات بہت نمایاں ہیں۔

اوّل: راجہ صاحب کے سارے کلام میں ظرافت ہی ظرافت ہے۔ اس نے ذالاوقت راجہ صاحب کو، راجہ صاحب کی ظرافت کے نام سے یاد رکھے گا بہ شکوہ طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے۔

دوم: راجہ صاحب کے تمام تر کلام میں بے پناہ روانی ہے۔ ایسی روانی کسی اور کے یہاں نہیں (اقبال اور ظفر علی خاں کو چھوڑ کر) اس روانی میں ہندوستانی کلچر اور مزاج اچھلتی کودتی ندی کی طرح موجزن ہے۔

سوم: راجہ صاحب کے یہاں اساتذہ کے مصرعے اور اشعار بھی بہت کثرت سے ملتے ہیں۔ جن کو انہوں نے یا تو بجنسہٖ رہنے دیا ہے؛ یا کہیں کہیں تھوڑی سی ترمیم کر کے اپنایا ہے۔ مثلاً

م: ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز

م: لیوے نہ میرا نام ستم گر کہے بغیر!

یا

س: نکلنا نوکروں کا گھر سے سنتے آئے تھے، لیکن!
بہت بے آبرو ہو کر تری کوٹھی سے ہم نکلے!

چہارم: اساتذہ کی زمینوں میں طبع آزمائی کرنا بھی، اردو شعراء کی ریت رہی ہے۔ راجہ مہدی علی خاں نے اس راہِ عمل میں، غالب کی لاتعداد زمینوں میں نظمیں کہی ہیں، اگر ان کو الگ اکٹھا کر کے شائع کیا جائے تو ان نظموں کا ایک بڑا کتابی مجموعہ ہوگا! اور غالب کی جس زمین میں جیسی نظم کہی گئی ہے، اس کا ویسا ہی نام، غالب کے نام کے ساتھ رکھ دیا ہے۔ ان نظموں کو مسلسل غزل بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ تخلیقیں (غالب کی زمین میں) ایک قسم کی ہلکی پھلکی پیروڈی ہیں۔ ان کے مطالعے سے ذہنی دلچسپیاں نکھرتی ہیں (میں یہاں طوالت سے گریز کے سبب چند نام دینے پر ہی اکتفا کرتا ہوں) مثلاً:

غالب مال روڈ لاہور پر۔ غالب فائر بریگیڈ والوں سے ٹیلیفون پر۔ غالب آؤٹ ڈور شوٹنگ میں۔ غالب ایک ریسٹورنٹ میں، ایک اینگلو انڈین حسینہ کے ساتھ۔ غالب منٹو کے گھر میں۔ وغیرہ وغیرہ۔

انداز ایک شعر بھی ملاحظہ کر لیجئے :

لیجے قریب آ گئی یہ اسٹنٹ فلم ہے ، ڈرتا ہوں تیرے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

نظم : غالب آرٹ فلم شو میں ۔

ایسی اچھوتی جہات راجہ صاحب کے علاوہ ، کسی اور کے یہاں نام کو بھی نہیں ہے !

بجنم : راجہ صاحب ایک وسیع النظر ، بڑے با اخلاص اور ظریف ، شاعر ہیں ۔ اس مادی دنیا سے خیالی جنت تک ، کوئی بھی شے ، کوئی بھی شعبہ ، یا انسانی نظریہ باہر نہیں ہے ۔ اس وجہ سے ، ان کے یہاں کبھی کبھی بالکل اچھوتے اور نئے عنوانات کثرت سے ملتے ہیں ، مثلاً :

SS820 " چونکیے نہیں ۔ یہ نظم کا عنوان ہی ہے ، جو ایک ٹیلیفون نمبر سے متعلق ہے ۔

ایسے ہی موضوعات میں سے چند ایک کو زیر بحث کیا جاتا ہے !

راجہ صاحب کے یہاں بعض جگہ زندگی کے بچکانہ خیالات کی فطری ترجمانی ہے ، جس میں جھوٹ نہیں ہے ، سچ ہے اور ایسا سچ ، جس میں کوئی ریا ہے نہ عقل نہیں ہے ۔ عقلیت بھی نہیں ہے ۔ صرف معصومانہ خیالات ہیں جو بچوں میں ہوتے ہیں ، یا ایسے بچوں میں جو بڑے ہو جانے کے بعد بھی بچے ہیں ، یا زندگی کی اصل راہ سے بھٹک جانے والوں میں ۔

بسم اللہ ارے واہ میں قربان میں قربان ، کیا خوب لگی ہے گھنٹہ اللہ تری شان

نظم : " چھوٹی دعا " ہے ۔

فطری جذبہ ہے کہ زندگی اپنے جذباتی عہد میں ، صنف مخالف کے قریب رہنا چاہتی ہے ۔ شانہ بشانہ ۔ قدم بہ قدم ! اور جب یہ خواہش جاگے ، اس وقت ، اس نوع کی وقتی دل بستگی سے ہی لطف اندوز ہونے کو دل امنڈتا رہتا ہے ۔ پھر یہ جذبہ ، جب جنس لطیف میں ہو تو اس کی اظہاریت ، اپنی نایاب مثال ہوتی ہے ۔ ایسی فضا ، ایسی طرح داریوں کو جنس لطیف کا شیوہ کہنا غلط نہ ہوگا ۔ اسی فطری جبلت کی ایک نشان دہی ہے :

تو ہی جا کوٹھے پہ سوسن میں تو بس اب جا چکی
توبہ توبہ کون واں جائے گا ، میں باز آ چکی
جب بھی میں اوپر ہوں جاتی
سامنے اس کو ہوں پاتی
وہ نگوڑا عید کو تک کر جلنے کیوں کہتا ہے ہائے !
اب کہو سوسن کوئی کیا خاک اس کوٹھے پہ جائے !
.. ..
.. ..
آ ذرا کوٹھے پہ جائیں ۔

آؤ ہمیں چُنری سکھائیں

اُس نکھڑے مردوے کو مُنہ لگائیں گے نہ ہم
وہ جدھر ہوگا اُدھر چُنری سکھائیں گے نہ ہم

نظم : "نگوڑا" سے

راجہ مہدی علی خان کے کلام کا بیشتر حصہ ایسا ہے، جو ہماری معاشرتی زندگی سے بہت قریب ہے۔ راجہ صاحب اس فضا میں، ایک منچلے نوجوان کی حیثیت سے مختلف کردار پیش کرتے ہیں۔ ایسے تمام ہتھکنڈوں کے ساتھ جو آج کے تمام ترپ ٹکے قسم کے نوجوانوں کا وطیرہ ہیں۔ یہ عشق کیا کہ صدیوں سال پرانی روایات کے ساتھ شروع ہوا، اور ختم ہو گیا۔ اخیر میں لڑکی کسی اور کی ہو گئی؛ یا کسی اور کے پلو سے باندھ دی گئی؛ اور چاہنے والا گھٹ گھٹ کے مر گیا، یا مُردہ نما زندہ رہ گیا۔ نہیں۔ یہ ریت اور اس طرز کی کوئی بھی دوسری غمازی راجہ صاحب کے یہاں نہیں ہے۔ راجہ صاحب کے یہاں عشق ہے: آج کی ماڈرن طرز کا عشق؛ اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے ہزار طور طریقے ہیں۔ جن میں دھوکا فریب، جھانسہ پٹی اور طرح طرح کی پینترے بازی، سب کچھ ہی کارفرما ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے سماج میں روز ہوتا ہے، اور روز دیکھنے سننے میں آتا ہے۔ ایسے عمال کی ترجمانی ہو تا یوں بھی اَزبس ضروری تھی؛ چند ایسی مثالیں نیچے کی سطروں میں دی جاتی ہیں:

لڑکا : نہیں آتی تو کیا ہے، ہم تمہیں انگلش پڑھا دیں گے۔ کتابیں مت منگانا سب کی سب ہم کل ہی لا دیں گے۔

اور پھر اس طرح لڑکے اور لڑکی میں مکالمہ جاری رہتا ہے۔ آخر میں لڑکی کہتی ہے ؎

لڑکی : ابھی چھوڑو یہ باتیں اپنا دل تم کو چکے ہو تم ۔۔۔ کہو نا صاف مجھ سے عشق کرنا چاہتے ہو تم

نظم : "بنتِ عم" سے

لے کے اپنی اداؤں کے لشکر ۔۔۔ وہ دبے پاؤں گھر سے آتی ہے
چاند حیرت سے اس کو تکتا ہے ۔۔۔ سوچتا ہے کدھر وہ جاتی ہے

گلستاں کی حسیں ہواؤں میں ۔۔۔ اُس کی ہر اک مُراد کھلتی ـــ
دن میں کہتی ہے جس کو وہ بھائی ۔۔۔ رات کو چھپ کے اس سے ملتی ہے

نظم : بھائی بہن

محبت کروں تجھ سے میں اے حسینہ ۔۔۔ مگر میری صورت بھی اچھی نہیں ہے
یہی سوچتا ہوں کروں پھر بھی کوشش ۔۔۔ مگر تیری صورت بھی اچھی نہیں ہے
چلو پھیر لیں اپنی اپنی نگاہیں! ۔۔۔ نہ تم ہم کو چاہو نہ ہم تم کو چاہیں

نظم : فیصلہ

چاہا ہم کو بہن کہا پھر فسکر ہمیں سے شادی کی
یہ بھی نہ سوچا بہن سے شادی کرکے کیا کہلائیں گے

نظم : "آخری گالی" سے

کہتی ہے چھوڑ دو قاضی راضی
میں بھی راضی تم بھی راضی

نظم : بیوی کا خواب " سے

تمہاری اُلفت میں ہارمونیم پہ میر کی غزلیں گا رہا ہوں
بہتر ان میں چھپے ہیں نشتر جو سب کے سب آزما رہا ہوں
لحاف عصمت کا اوڑھ کر تم فسانے منٹو کے پڑھ رہی ہو
پہن کے بیدی کا گرم کوٹ آج تم سے آنکھیں چرا رہا ہوں

نظم : "ادیب کی محبوبہ" سے

سماجی زندگی میں ازدواجی زندگی، گھر گرہستی، آس پڑوس، میکا، سسرال اور ان کے بکھیڑے، ایسے عوامل ہیں جو رہتی دُنیا تک انسانی زندگی کے ساتھ ہیں۔ اِن سے مفر نہیں ہے۔ اس کی روزانہ کی دلچسپیاں، روز کے جھنجھٹ، رنجش و دردمندی ہی اِس کا سنگھار ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں نے اِس ہی نقطۂ نظر سے، اِس فضا کو پرکھا اور ظاہر کیا ہے۔

یہ ساس ہے کہ شیر چھپا ہے نقاب میں
اللہ کسی کو ساس نہ دیوے شباب میں

— — — — — — - -

دیور ہیں یا کہ زہر ملا ہے گلاب میں
جیٹھوں کا ذکر بھول گئی اضطراب میں

نظم : "سسرال کی جیل" سے

شکیلہ : تمہارے بچے ہماری بلّی کی دُم پکڑتے ہیں ان کو روکو
تمہارے مُرغے ہماری چھت پر اذان دیتے ہیں ان کو روکو
افتید : تمہارا بکرا ہمارے آنگن میں آگھسا تھا ہلا کے داڑھی
دو ہتڑوں سے اُسے بھگایا وہ جا رہا تھا اُٹھا کے ساڑھی

نظم : "دو ہمسایاں" سے

سو جا ہیبت خاں کے پوتے، سو جا چنگیز دھاڑ خاں
تیرے رونے سے بہت تنگ آ گئی ہے تیری ماں

نظم : جلال زادہ " سے۔

تھا باپ میرے گھر سے مجھے ورغلا کے لایا
ہما را اصل جہنم جو مجھے بھگا کے لایا
وہ کواڑ بند کرکے مجھے روز پیٹتا تھا
کبھی مثل چارپائی وہ مجھے گھسیٹتا تھا
مری چوٹیا اس نے کاٹی، مری ٹانگ اس نے توڑی
میرا کون ہے جہاں میں، کہاں جاؤں میں نگوڑی
وہ جو عاشقی کے دن تھے، وہ کبھی کے کٹ چکے ہیں
مرے بِک چکے ہیں زیور، میرے کپڑے پھٹ چکے ہیں
نہ لبوں پہ اب ہے سُرخی نہ وہ منہ پہ اب ہے غازہ
لیے جا رہی ہے قسمت مرے عشق کا جنازہ

نظم : "جمال زادہ " سے۔

انسانی زندگی میں روحانی اور اخلاقی نظام کو سنوارنے کے لیے بیعت لازم (پیری مُریدی) کو بڑا رتبہ حاصل رہا ہے۔ مثلاً پنڈت

اور سارے سماج کی بنیادی کڑیاں ہیں۔ یہ لوگ بھی ہم آپ جیسے ہی ہیں، اور اسی دنیا میں رہتے بستے ہیں، جہاں ہم آپ سانس لے رہے ہیں۔ ان میں ہمارے مقابلہ میں بہت زیادہ خوبیاں ہیں، افسوس ہے کہ اکثر اس نظام کی سچائی سے غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے بلکہ سماج دشمن عناصر ہمیشہ ہی اس نظام کا سہارا لے کر بھی رہ جاتے رہے ہیں، ان ہی کی بدولت، اکثر یہ شعبہ بدنام ہوا ہے۔ راجہ صاحب بھی ایسوں کی تاک میں لگے رہے ہیں، اور مناسب بے باکی سے ان کے ہر عیب کو طشت از بام کیا ہے۔ مثلاً:

لیا ہے اک چیز مرید مستانہ — جنت کا دروازہ کھولیے مولانا
شیطان کے داؤ چلا کے — لایا ہوں اک حور بھگا کے
رکھ لیجیے آغوش میں بیرا نذرانہ — جنت کا دروازہ کھولیے مولانا

نظم: "پیر اور مرید" سے

یا

جب شام جنت میں ہوئی
باغوں میں ہر سو گھوم کر
حوریں مرے گھر آ گئیں
جو سب سے پیاری ان میں تھی
تھی وہ ہی گم
رہتا تھا گھر کے پاس ہی
کافر ادا اک مولوی
میں نے گرج کر یہ کہا
اُس سے کہ او ملعون ادھر
آ تو ذرا
سچ سچ بتا کیا بات ہے
ورنہ دبوچوں گا ترا موٹا گلا!

نظم: جب شام جنت میں ہوئی

پھر راجہ صاحب دنیا کے لیے ہی نہیں، اپنے لیے بھی اتنے ہی بیباک اور بے پروا ہیں، یہی نہیں کہ انھوں نے دنیا کی ہانڈی بیچ چوراہے میں پھوڑی ہے، یا دنیا کی گندگی کا مجمع لگایا ہے۔ انھیں تو خود بھی اپنے گناہوں کا اعتراف ہے۔

تری دنیا میں کس سے آج تک کیا کیا کیا میں نے — کوئی پوچھے سوستاروں سے رنگوں کو دل دیا میں نے
شبستانوں میں میرے رات بھر اکثر رہیں پریاں — سدا روشن رکھا اپنے گناہوں کا دیا میں نے

برہنہ لڑکیاں جب میرے آگے رقص کرتی تھیں   اِنھیں آنکھوں سے لوتھڑان کے جسموں کی قبائیں تھے

نظم: "شاعر خدا کے دربار میں" سے

اس طرح کی دوسری نظمیں نوابوں کا قبرستان، منکر نکیر، راجہ صاحب علی خاں کی صلوٰۃ پر اور راجہ مہدی علی خاں کا جنازہ بھی ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ صاحب کو اپنی زندگی کی کوئی فکر نہیں ہے۔ وہ موت سے نہیں ڈرتے اور جہنم کی آگ سے بھی۔ انھیں خدا کا خوف ہے نہ جنت کی خواہش! نہ اپنے کیے پر پچھتاوا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے تصورات کی دنیا خود اُن کی اپنی ہی کوئی دنیا ہے۔ یہ یہاں کے خود بادشاہ ہیں؛ یا خود خدا بننا چاہتے ہیں! نعوذ باللہ۔

لاہور کا چیلسی
(۲)
حکیم احمد شجاع

میں اس بازار کا ذکر کر رہا تھا جو شہزادیوں کے بازار سے ہیرا منڈی کو جا نکلتا ہے۔ اس کے درمیانی حصے میں ایک منارہ ہے جسے میتھر میر کا منار کہتے ہیں۔ اس کے پہلو میں ایک گلی ہے جو "کوچہ سبز پیر" کہلاتی ہے۔ اس گلی سے ملحق ایک احاطے میں ایک کوٹھڑی تھی جو اپنے مالک کے نام کی نسبت سے "کوٹھڑی امیر حیدر" سے موسوم تھی۔ جب مولانا ظفر علی خاں دکن سے واپس آئے تو اس کوٹھڑی میں رہنے لگے۔ یہیں سے انھوں نے "پنجاب ریویو" کے نام سے ایک ادبی رسالہ شائع کرنا شروع کیا۔ ان کے علاوہ مولوی سراج الدین احمد خاں اور ان کے چھوٹے بھائی مولوی حامد علی خاں (جو آج کل مکتبہ [illegible] کے ناظم الامور ہیں) اور پروفیسر حمید احمد خاں (جو آج کل پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں) انھی کے ساتھ رہتے تھے۔

جب مولوی عزیز مرزا بی۔ اے ایم۔ اے او کالج علی گڑھ کے بعد حیدر آباد میں ہوم سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے تو انھوں نے مولانا ظفر علی خاں کو بھی حیدر آباد میں بلا لیا۔ خیال کچھ ایسی الجھنیں پیدا ہو گئیں کہ برٹش ریذیڈنٹ کو مولوی عزیز مرزا اور مولانا ظفر علی خاں کا حیدر آباد میں رہنا کھٹکنے لگا۔ آخر کار یہ دونوں خوددار اور حق پرست عہدے دار معتوب ہوئے اور رخت سفر باندھ کر اپنے اپنے وطن کو واپس لوٹ آئے۔

پنجاب میں اردو کی ترویج و ترقی کی تاریخ جب کبھی لکھی جائے گی تو مولانا ظفر علی خاں کے ادبی کارنامے اس کے سنہری اور روشن باب ہوں گے۔ ان کے سیاسی مشاغل اور ان کی ادبی مصروفیات کے کئی پہلو تھے۔ یہ جگہ ان کی سیاسی اقدار کے جائزے کے لیے موزوں نہیں۔ ہاں یہ بات کسی قدر وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کے سیاسی رجحانات نے ان کی زندگی کو ہمیشہ مبتلائے آلام رکھا اور نتائج و عواقب کے اعتبار سے بھی یہ خار زار ان کے لیے کانٹوں کی سیج بنا رہا۔

مولانا ظفر علی خاں کا ادبی ذوق اردو ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ ان کی ادبی صلاحیتوں میں ایسی جامعیت اور ہمہ گیری تھی کہ ان کے اشہب فکر پر کسی صنف ادب کی راہ بند نہ تھی۔ فکر شعر میں ان کو یہ کمال حاصل تھا کہ فی البدیہہ ایک ہی نشست میں بیسیوں اشعار موزوں فرما دیتے تھے۔ صحافت کو ان کے زور قلم سے جو پایۂ بلند نصیب ہوا اس سے ایک دنیا آگاہ ہے۔ ترجمے میں ان کو وہ ید طولیٰ حاصل تھا کہ اقبال کی نگاہ انتخاب نے اپنے اس مشہور و معروف انگریزی خطبے کے ترجمے کے لیے جو انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے افتتاح کی تقریب میں پڑھا مولانا ظفر علی خاں پر پڑی۔ غرض نثر ہو یا نظم ہر صنف میں ہر منزل کو وہ بڑی بے تکلفی سے طے کر جاتے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں اپنی نظم ترنم سے پڑھا کرتے تھے اور وہ المناک سانحہ میرے ذہن میں محفوظ ہے، جب وائی ایم سی

اسے الم ناک حادثہ کہیے کہ آخری برس میں کسی پرانی یاد سے مجبور ہو کر اپنا کلام ترنم سے پڑھنے کی کوشش میں بے ہوش ہو گئے۔ البتہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ فتح مند شہسوار جس نے ادب کے سنگلاخ میدان میں کئی ہفت خواں طے کیے تھے، زمانے کی دستبرد اور کبر سالی کی یلغار سے گر گیا ہے۔

ان کے سینے میں ایک دردمند دل تھا جو قوم کے درد سے ہمیشہ تڑپا کیا اور ان کے دل کی اس دردمندی کی تہ میں عشقِ رسولؐ کا وہ جذبہ تھا، جس کی بدولت انھیں ہر اس چیز سے جو حضورؐ کی ذات سے منسوب ہو محبت تھی۔ نعت رسولؐ کے چمن میں ان کی عقیدت نے وہ گل کھلائے کہ ان کی خوشبو سے آج تک مشامِ جان معطر ہے، اور تحفظ ناموسِ رسولؐ کے باب میں انھوں نے وہ جوہر دکھائے جن کا لوہا دنیا مان گئی۔

شمعِ رسالتؐ کا یہ پروانہ جب عشقِ رسولؐ کے سوز سے شعلہ نوا ہوتا تو اس کی نوا سے ایسی بجلیاں کوندتیں کہ سننے والوں کے خرمنِ صبر و قرار کو جلا کر راکھ کر دیتیں۔ وہ غزل لکھنے بیٹھتا تو ایسی خاردار زمین ڈھونڈتا اور سنگلاخ قافیے تلاش کرتا کہ سامعین تو کیا اچھے اچھے پلے کے شعرا داد سخن دیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ انگریزی زبان کو اردو کا جامہ پہنانا ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اردو ہی کا اصل ہے جو انگریزی نے پہن رکھا تھا۔ غرض ظفر علی خاں کا اندازِ بیان اور اسلوبِ نگارش، اس کا جذبۂ حریت اور پاسِ وفا قیدِ تحریر میں نہیں آ سکتا۔ وہ فطری صلاحیتوں کا ایک مظہرِ عظیم تھا اور قدرت کی نادرہ کاریوں کا ایک پیکرِ جمیل، اگرچہ مولانا ظفر علی خاں نے ایک ایسی عمر پائی جو اس زمانے میں ان کی زندگی کی صعوبتوں اور مصروفیتوں کے پیشِ نظر غیر طبعی اور موجبِ حیرت نظر آتی ہے لیکن ان کا دل جب تک ان کے ہوش و حواس قائم رہے، جوان رہا۔ اس حد تک کہ ان کے عہدِ پیری کی سحر پر ایک گونہ کیف شامِ جوانی کا گمان ہوتا تھا۔

اردو زبان کی حمایت میں ان کی جدوجہد ۱۸۹۸ء سے شروع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوؤں نے ملک کے گوشے گوشے میں ہندی زبان کی ترویج اور اس کو سرکاری زبان کی حیثیت سے ہندوستان کی واحد زبان منوانے کی تحریک کا طوفان برپا کر رکھا تھا۔ اور نواب محسن الملک اس روز بروز بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے سینہ سپر ہو کر میدان میں اتر آئے تھے۔ اگرچہ ظفر علی خاں پر اس وقت عنفوانِ شباب کا عالم تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے نامور باپ مولوی سراج الدین احمد خاں کے نقشِ قدم پر چل کر اردو کو نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ ہندوستان بھر کی عام فہم زبان ثابت کرنے کے لیے بڑی جوانمردی سے حصہ لیا۔

جب پہلی جنگِ عظیم کی آگ بھڑک اٹھی تو اخبار "زمیندار" کو ان کی قیادت میں وہ فروغ حاصل ہوا، جو اس سے پہلے کسی اخبار کو نصیب نہ ہوا تھا اور ان کی انشا پردازی کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ دوسروں کے بازار ٹھنڈے پڑ گئے۔ جو لوگ ان کی صحافتی اور سیاسی زندگی سے واقف ہیں، خوب جانتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ایمان کی ہر آزمائش کا کس بے جگری اور حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا، اور اپنے وقارِ نفس کے بلند پرچم کو کبھی سرنگوں نہ ہونے دیا۔

آج جب کہ ہمیں سیاسی آزادی نصیب ہے۔ ہم ان مجبوریوں اور معذوریوں کا اندازہ نہیں کر سکتے جو انگریزی عہد میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی راہ میں ایک مدت تک حائل رہیں۔ لیکن کوئی ایسا میدان نہ تھا جس میں توحید کے اس علمبردار نے اپنے زبان

اور قلم کے جوہر نہ دکھا سکے ہوں۔ قید و بند کی سختیاں، مالی مشکلات کی صعوبتیں، عزیزوں کی مفارقت، دوستوں کی دشمنی، غرض کوئی ایسی آفت نہ تھی جس نے اس مردِ مجاہد کا تعاقب نہ کیا ہو اور اس کے جواب میں خود اپنے ہی منہ پر طمانچہ نہ کھایا ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظفر علی خاں کا دل جس خمیر سے بنا تھا وہ اسلامی اخوت کے ایسے اجزا سے اٹھایا گیا تھا جس نے اس کی فطرت کو غیرتِ اسلام کے مترادف اور اس کے دل کی ہر تڑپ کو مسلمانانِ عالم کے درد کا آئینہ دار بنا دیا۔

لاہور کے مشہور و معروف روزنامے "پیسہ اخبار" کے مالک اور ایڈیٹر منشی محبوب عالم کی زندگی کی ابتدا بھی جہاں تک ان کے صحافی اور ادبی کاروبار کا تعلق ہے اسی بھاٹی دروازے سے ہوئی۔ ان کے لاہور آنے کی داستان بھی بہت عجیب اور سبق آموز ہے۔ وہ گوجرانوالہ کے ایک قصبے فیروز والے میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے انھیں پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ اگرچہ ان کے مالی حالات بہت ہی ناساز تھے۔ لیکن بڑی ہمت سے کام لے کر انھوں نے ۱۸۸۷ء میں ایک ہفت روزہ اخبار "ہمت" نامی جاری کیا۔ اور اسی برس ایک دوسرا ہفتہ وار پرچہ "پیسہ اخبار" کے نام سے بھی شائع کرنا شروع کیا۔ یہ آٹھ صفحوں پر چھپتا تھا اور اس کا سالانہ چندہ صرف بارہ آنے تھا۔ اس وقت ان کی عمر ان کے اپنے بیان کے مطابق کوئی بیس بائیس برس کی تھی۔ دن رات کی محنت کے باوجود انھیں فیروز والے کی فضا کچھ سازگار نظر نہ آئی۔ جتنی پونجی ادھر اُدھر سے جمع کی تھی سب ان اخباروں پر لٹا بیٹھے۔

ایک دن جو دل میں سمائی تو ایک چھوٹا سا بستر سر پر رکھ کر پیادہ پا گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور لاہور کا رُخ کیا۔ جب دریائے راوی کے پُل کو عبور کیا تو لاہور کے جس بازار میں سب سے پہلے پہنچے وہی بازار تھا جو ٹکسالی دروازے سے بھاٹی دروازے کو جا نکلتا ہے۔ اس زمانے میں بھاٹی دروازے کی اُونچی مسجد کے سامنے شیش محل کے کوچے کے پہلو میں گوکل نامی ایک عطار کی دوکان تھی۔ اس کی دوکان کے ساتھ پکّی اینٹوں کی چار پانچ سیڑھیاں تھیں۔ اس نووارد مسافر نے سیڑھیوں کو خالی دیکھا تو ان پر اپنا بستر جما دیا۔ منشی محبوب عالم رات بھر سڑک پر لگی ہوئی لالٹین کی روشنی میں گوکل کی دوکان کی "چوکیداری" بھی کرتے اور لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتے۔ دن کو بستر لپیٹ کر گوکل کی دوکان میں رکھ دیتے اور خود لاہور سے اپنا اخبار جاری کرنے کی دھن میں دوڑ دھوپ کرتے رہتے۔ گوکل عطار میرے والد اور میرے بھائی کے نسخوں کی دوائیں تیار کرتا تھا۔ ایک دن خدا جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ وہ اس ہونہار نوجوان کو میرے بھائی حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں لے گیا۔ اس بیٹھک میں بیٹھنے والوں کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ایک دن اسی بیٹھک میں باتوں باتوں میں منشی محبوب عالم نے ایک اخبار جاری کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب لوگوں نے یہ تجویز پسند کی۔

اللہ اللہ وہ کیا زمانہ تھا اور اس زمانے کے لوگ کیسے بامروت تھے۔ آج کل تو دوستوں کا کیا ذکر بھائی بھائی کا غم نہیں کھاتا۔ اسی لاہور میں ایسے ہزاروں لوگ مارے مارے پھرتے ہوں گے جنھیں اگر ذرا سا سہارا مل جاتا تو ان کی کایا پلٹ جاتی اور ان پر ایک نئی دُنیا کے دروازے کھل جاتے۔ یہ جوہرِ قابل لاہور میں ایک اجنبی مسافر کی حیثیت سے آیا مگر ان جوہر شناس جوہریوں نے اس جوہر کو پرکھا اور اس کا دل بڑھایا۔ آخر کار "پیسہ اخبار" جاری ہوا اور اسے ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر

ایک شخص کی زبان پر پیسہ اخبار ہی کا نام تھا۔

منشی محبوب عالم ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے پنجاب میں صحافت کو ایک نئی روش پر ڈالا۔ ان کے "پیسہ اخبار" سے پہلے لاہور سے صرف دو اخبار نکلتے تھے۔ ایک تو مولوی محرم علی چشتی کا "رفیق ہند" اور دوسرا پنڈت گوپی ناتھ کا "اخبار عام"۔ پیسہ اخبار کی شہرت کے سامنے ان دونوں اخباروں کی شہرت ماند پڑ گئی۔ منشی محبوب عالم اب بھی اکثر شام کے وقت حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے اور دنیا بھر کے سیاسی مسائل پر بحث کرتے۔ جب تک میرے بھائی زندہ رہے یہ سلسلہ جاری رہا۔

جب ۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور آئے اور بازار حکیماں کے مشاعروں میں اپنی غزلیں پڑھنے لگے تو منشی محبوب عالم بھی بڑے شوق سے شریک ہوتے۔ ان مشاعروں کی روداد میں منشی محبوب عالم کا نام موجود ہے۔ رفتہ رفتہ انھیں اقبال سے بڑی عقیدت اور محبت ہو گئی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ایک نظم پڑھی جس کے ان اشعار میں اس زمانے کے مولویوں کی چیرہ دستیوں کی طرف اشارہ تھا —

بھاٹی دروازے کی جانب ایک دن جاتا میں
شام کو گھر بیٹھے رہنا قابل الزام ہے

خضر صورت مولوی صاحب کھڑے تھے اک وہاں
ہم مسلمانوں میں ایسی مولویت عام ہے

وعظ کہتے تھے نہ مسلم کوئی انگریزی پڑھے
کفر ہے آغاز اس بولی کا کفر انجام ہے

جب اقبال نے یہ نظم "پیسہ اخبار" میں چھپنے کے لیے بھیجی تو منشی محبوب عالم نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اقبال کو غصہ آ گیا اور انھوں نے یہ طنزیہ شعر کہہ ڈالا۔

آج کل لوگوں میں ہے انکار کی عادت بہت
نام محبوبانِ عالم کا یونہی بدنام ہے

منشی محبوب عالم کی ابتدائی زندگی کوئی پھولوں کی سیج نہ تھی۔ کانٹوں کا بستر تھی۔ شروع شروع میں وہ اپنے اخبار کی کتابت اور طباعت خود ہی کرتے تھے جب اخبار چھپ جاتا تو اسے خود ہی گلی گلی پھیر کر بیچتے۔ آخر کار ان کی ہمت بار آور ہوئی اور انھیں اس کاروبار میں ایسی کامیابی نصیب ہوئی کہ وہ ایک عظیم الشان مطبع کے مالک و مختار بن گئے۔ جب روزانہ "پیسہ اخبار" کی مانگ بڑھی تو انھوں نے اس کا ایک ہفت روزہ ایڈیشن بھی نکالا۔ پھر ایک ہفتہ وار رسالہ "انتخاب لاجواب" شائع کرنا شروع کیا جو بہت ہی مقبول ہوا۔ اس کے بعد کم عمر بچوں کے لیے "بچوں کا اخبار" اور عورتوں کے لیے "شریف بیوی" کے نام سے دو رسالے اور زمینداروں کے مفاد اور تحفظ کے لیے "زمیندار" اور "باغبان" کے نام سے دو اور رسالے جاری کیے۔

رفتہ رفتہ ان کی مالی حالت اتنی مستحکم ہو گئی کہ پیسہ اخبار سٹریٹ میں ایک عالیشان مطبع کی دو منزلہ عمارت کے علاوہ مکانوں اور دکانوں کا ایک سلسلہ تعمیر کیا۔ جن کے کرائے کی رقم ان کے مطبع کی آمد سے زیادہ ہو گئی۔ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ منشی محبوب عالم کے اس تمام کاروبار میں ان کے دو چھوٹے بھائیوں منشی عبدالعزیز اور منشی عبدالکریم نے ان کے دوش بدوش بڑی محنت اور تندہی سے کام کیا۔ اور اگر منشی عبدالعزیز کی انتظامی قابلیت اور منشی عبدالکریم کی فنی صلاحیت ان کا ساتھ نہ دیتی تو منشی محبوب عالم کا عزم کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوتا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے عبدالحمید نے جو لڑکپن میں میرے ہم جماعت رہے ہیں ان کا کام سنبھالا مگر جب وہ افریقہ چلے گئے تو یہ سارا کاروبار بند ہو گیا۔ عزم راسخ اور جفاکشی کا وہ پیکر عظیم جو محبوب عالم کے محبوب نام سے موسوم تھا جب تک پیسہ اخبار کا نام زندہ ہے اور صحافت کی دُنیا قائم ہے زندہ رہے گا۔

ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما

میں سر عبدالقادر کے مشہور رسالے "مخزن" کے دورِ قدیم کا ذکر کر چکا ہوں۔ جب وہ سرکاری وکیل ہو کر لائل پور چلے گئے اور شیخ محمد اکرام دہلی میں اپنے رسالے "عصمت" کی اشاعت کے کاروبار میں مصروف ہو گئے تو یہ دیکھ کر کہ وہ مخزن کی پُرانی شان قائم نہ رکھ سکیں گے۔ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں مولوی غلام رسول تحصیلدار کے ہاتھ "مخزن" کا کاپی رائٹ گیارہ سو روپے میں بیچ دیا۔ مولوی غلام رسول تحصیلداری کے عہدے سے سبکدوش ہو کر کوئی ایسا کاروبار کرنا چاہتے تھے جس کا تعلق علم و ادب سے ہو پہلے تو انھوں نے ایک چھاپہ خانہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا پھر ایک دارالاشاعت قائم کرنے کی تجویز کی۔ لیکن آخر کار تجربے کے طور پر "مخزن" کا کام کاج سنبھال لیا اور جب تک وہ زندہ رہے "مخزن" کو اس کے پُرانے ڈگر پر واپس لانے کی کوشش کرتے رہے۔ اس زمانے میں وہ بھاٹی دروازے میں کوچہ چابکسواراں کے قریب اس محلے میں رہتے تھے جو "تلواڑہ جہاں داد خاں" سے موسوم تھا اور آج کل محلہ اسلام خان کہلاتا ہے۔ اسی محلے میں وہ مکان واقع ہے جہاں سے ۱۹۱۲ء کے بعد "مخزن" شائع ہوتا رہا۔ اور اسی نسبت سے وہ مکان "مخزن بلڈنگ" کے نام سے مشہور رہا ہے۔

سر عبدالقادر اور شیخ محمد اکرام کی علیحدگی کے بعد مولوی غلام رسول کو جو سب سے بڑی مشکل پیش آئی وہ یہ تھی کہ رسالے کے لیے کوئی اچھا ایڈیٹر نہ ملتا تھا۔ آخر کار ان کی قسمت نے یاوری کی۔ مولانا احسان اللہ خان تاجور جو نجیب آباد کے رہنے والے تھے اور لدھیانہ میں "نالۂ بلبل" اور "آفتاب" دو اُردو رسالوں کے ایڈیٹر رہ چکے تھے لاہور آ نکلے۔ اور سناتن دھرم مڈل سکول میں جو اس وقت بھاٹی دروازے کے تحصیل بازار اور سید مٹھا بازار کے درمیان ایک گلی میں واقع تھا اور جس کے ہیڈ ماسٹر لالہ رگھوناتھ سہائے تھے اُردو اور فارسی پڑھانے لگے۔ انھیں لالہ رگھوناتھ سہائے کے حسبِ منشا انھوں نے چھوٹی عمر کے بچوں کے لیے "پریم" نامی ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ مگر وہ اس رسالے کو اپنی ادبی تشنگی کو بجھانے کے لیے محض ایک نظر فریب سراب سمجھتے تھے۔

جب مولوی غلام رسول کو "مخزن" کے لیے ایڈیٹر کی تلاش ہوئی تو ان کی نگاہِ انتخاب مولانا تاجور پر پڑی۔ مولانا تاجور کے دل میں یہ شوق پیدا ہوا کہ مخزن کی پُرانی شہرت سے فائدہ اٹھا کر ایک نئی بزمِ ادب سجائیں۔ مگر جو رنگ بگڑ چکا تھا وہ پھر نہ جما۔

کہاں وہ زمانہ تھا کہ مخزن کی بساطِ ادب اقبال، سر عبدالقادر، مرزا اعجاز حسین، امیر نیرنگ، چوہدری خوشی محمد، عبدالرشید چشتی مرزا محمد سعید اور اس دور کے دوسرے نامور ادیبوں اور شاعروں کے دم قدم سے آراستہ تھی اور کہاں یہ زمانہ کہ "مخزن" کے لیے مضمون نگاروں کا تو کیا ذکر کسی موزوں ایڈیٹر کی تلاش بھی مولوی غلام رسول کے لیے بڑی صبر آزما ہو رہی تھی۔

آخر کار ۱۹۱۹ء میں مولانا تاجور نے "مخزن" کی ایڈیٹری کا کام سنبھالا اور اس کام کو اس انہماک سے شروع کیا کہ مخزن کے دفتر ہی میں اقامت گزیں ہو گئے۔ اور دن رات مخزن کو ایک بار پھر اس بلند مقام پر پہنچانے کے لیے جو اسے سر عبدالقادر کے زمانے میں حاصل تھا ان کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ لیکن یہ سلسلہ کچھ زیادہ عرصے تک جاری نہ رہا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ دیال سنگھ کالج لاہور میں فارسی اور اردو کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اور اسی سال جسٹس شاہ دین کے بلند اقبال صاحبزادے میاں بشیر احمد بیرسٹر ایٹ لاء کے رسالے "ہمایوں" میں بحیثیت مدیر معاون کام کرنا شروع کر دیا۔ مولانا تاجور کی طبیعت میں کچھ ایسی خود پسندی تھی یا یوں کہیے کہ ان کے ذوقِ ادب کی روش دوسروں کے ذوقِ ادب کی روش سے ایسی مختلف تھی کہ انھوں نے ۱۹۲۹ء میں اپنا ذاتی رسالہ "ادبی دنیا" شائع کرنا شروع کیا۔ یہ رسالہ بھی ان کے اپنے تحریری اعتراف کے مطابق ان کی انتظامی کوتاہی اور زود اعتمادی کے سبب ان کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں چلا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں انھوں نے ایک اور اردو رسالہ "شاہکار" کے نام سے جاری کیا۔ اور ساری رہی سہی پونجی اس پر صرف کر دی۔ اس امر کے باوجود کہ ان کے رسالے علم و ادب کے سرمایہ دار تھے ان کو اپنی زندگی کے دن آرام و آسائش سے بسر کرنے کے لیے کوئی سرمایہ دستیاب نہ ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں "اردو مرکز" کے نام سے انھوں نے تصنیف و تالیف کا ایک ادارہ بھی قائم کیا۔ اور پنجاب میں اردو زبان کو ہر دلعزیز بنانے کے لیے وہ عمر بھر مشاعروں کا اہتمام بھی بڑے شوق و ذوق سے کرتے رہے۔

غرض پچیس برس کی لگاتار محنت سے انھوں نے لاہور میں ایک ایسی ادبی فضا پیدا کر دی جس نے نہ صرف اردو زبان کی ترویج کے مسئلے کو مسلمانوں کی نظر میں ایک قومی وقار کا مسئلہ بنا دیا بلکہ ادیبوں اور شاعروں کی ایک ایسی کھیپ تیار کر دی کہ گھر گھر شعر و شاعری کے چرچے ہونے لگے۔ ان کے حلقۂ ارباب علم کا مشاعرہ ہر ہفتے موری دروازے کے باہر ایس. پی ایس۔ کے ہال میں منعقد ہوا کرتا تھا۔ اس سے پہلے جتنے مشاعرے ہوتے تھے ان کا حلقۂ اثر محدود اور مخصوص ہوتا تھا. مولانا تاجور نے اپنے مشاعروں پر عمومیت کا کچھ ایسا رنگ چڑھایا کہ خاص و عام بڑے ذوق و شوق سے ان میں شریک ہونے لگے۔ وہ اپنی عمر کے آخری ایام تک اسی سعیِ پیہم میں سرگرداں رہے کہ پنجاب اردو زبان کی نشأۃ ثانیہ کا گہوارا بن جائے اور ایک دن ایسا آئے کہ پنجاب کے لکھے پڑھے لوگ اردو ہی کو اپنی مادری زبان سمجھنے لگیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اردو نثر اور نظم کی ہر صنف کی اصلاح اس انہماک سے کی جیسے کوئی ایک مقدس فرض ادا کرتا ہے۔ یا جیسے یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن تھا۔ مجھے اس امر کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں کہ دورِ حاضر میں اردو زبان کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے جب اس کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا تاجور اور مولانا صلاح الدین احمد کے اسمائے گرامی زریں حروف سے لکھے جائیں گے۔ اور میں ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ان سب بزرگوں نے اپنی

زندگی بھر محنت اور اپنی عمر بھی کی کمائی اسی بازی پر لگا دی اور اسی دھن میں لٹا دی کہ اُردو زبان کو پنجاب میں عروج بر ملا نیاز فروغ حاصل ہو۔ آج یہ لوگ خود موجود نہیں ورنہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ان کی محنت اور کاوش رائیگاں نہیں گئی۔ اور اُردو زبان کا وہ عشق جو ان کے دل و دماغ پر ایک جنون کی طرح طاری ہو چکا تھا آخر کار رنگ لا کر ہی رہا ———

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اس امر کی طرف تو میں نے اشارا کر دیا ہے کہ موجودہ صدی کی ابتدا سے اب تک پنجاب میں اُردو کو جو فروغ حاصل ہوتا ہے وہ انہی بزرگوں کا مرہون منت ہے۔ اور دور حاضر میں پنجاب میں اُردو زبان کے جتنے ادیب شاعر اور ہر قسم کے مضمون نگار پیدا ہوئے وہ ہندو تھے یا مسلمان یا سکھ پیدا کیے ہیں اگر ان کی حوصلہ افزائی اُردو زبان کے یہ نامور سر پرست اور محسن نہ کرتے اور ان کے رشحات تحریر و قلم کی نشر و اشاعت کے باب میں اپنا تن من دھن وقف نہ کر دیتے تو نہ تو کوئی ان نو وارد ادیبوں اور شاعروں کے نام ہی سے واقف ہوتا اور نہ اُردو کا سرمایۂ ادب ہی اتنا بھرپور ہوتا۔ جتنا اس وقت نظر آتا ہے۔ یہ تو ایک واضح حقیقت ہے کہ دریاؤں کی سیرابی ان ندی نالوں سے ہوتی ہے۔ جو ان چشموں سے بہہ نکلتے ہیں جو پہاڑوں کے قلب و جگر میں پرورش پاتے ہیں۔ یہی کیفیت علم و ادب کے بحر بیکراں کی ہے۔ اگر علم و فضل کا آب جاری اس سمندر کی آبیاری نہ کرتا رہے اور اس آب جاری کو علم و فضل کے وہ سرچشمے اپنے ابر کرم سے بہرہ مند نہ کرتے رہیں۔ جنھیں بہتے پایاں سوتوں کی طرح فطرت نے اس لازوال دولت سے مالا مال کیا ہے۔ تو یہ سمندر بھی خشک ہو جاتے۔ جن بزرگوں کا میں نے نام لیا ہے علم و فضل کے اسی قسم کے سرچشمے تھے جن کی آبیاری سے علم و ادب کی خشک زراعت پھول پھل لائی۔ اور پنجاب نے اُردو زبان کے ایسے سحر نگار ادیب اور شاعر پیدا کیے جنھیں دُنیا کے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے دوش بدوش جگہ مل سکتی ہے۔ اوروں کا تو کیا ذکر میں نے خود انہی بزرگوں کے قدموں میں بیٹھ کر ایسا فیض پایا ہے کہ اس کا احسان نہ ماننا انتہائی ناشکر گزاری ہوگی۔

میری عمر ابھی کوئی سولہ برس ہی کی تھی کہ سر عبدالقادر نے اپنے مقتدر رسالے "مخزن" میں میری ایک نظم جو "جوزفین کے نام نپولین کے ایک منظوم خط" کا ترجمہ تھی۔ شائع کر کے میرا حوصلہ بڑھایا۔ اور میری عمر ابھی اٹھارہ برس کی بھی نہ ہوئی تھی کہ مولانا ظفر علی خاں نے اپنے جریدہ فریدہ "پنجاب ریویو" میں میری ایک نظم جو میں نے اقبال کی شان میں لکھی تھی شائع کر کے میری دلنوازی کی۔ مولانا تاجور تو ایک عرصے تک میری حقیر تحریروں کو "جواہر قدس" کے عنوان سے "مخزن" میں شائع کرتے رہے۔ اور مجھے اس اعتراف سے خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اگر علم و فضل کے ان دیوتاؤں کی برکت اُردو ادب کے مندر کے ایک عقیدت مند پجاری کی دل سوزی اور عرق ریزی کا چڑھاوا قبول نہ کرتی تو ادب کی مختلف اصناف میں جو تھوڑی بہت سوجھ بوجھ مجھے حاصل ہو سکی ہے کبھی حاصل نہ ہوتی۔

یہ سچ ہے کہ اورینٹل کالج کے عالی قدر اساتذہ نے اس دارالعلوم کی ابتدا ہی سے پنجاب کے چمنستان علم و فضل میں اپنے فیضان کرم سے ایسے گلہائے تر کی نشو و نما کی جن کی مہک سے آج مشام عالم معطر ہے۔ لیکن جہاں تک اُردو زبان

کی ترویج اور تنقید کے باب میں ان علمی اور عملی تحریکوں کا تعلق ہے انھیں علم و فضل کے اس نادرِ روزگار سرچشمے کے آبِ رواں سے فیض یاب ہونے کی سعادت میسر نہیں آئی۔ ان بزرگوں کی مساعی قابلِ صد ہزار تحسین ہیں۔

جب مولانا تاجور "مخزن" کی ادارت سے سبکدوش ہوئے تو مولوی غلام رسول "مخزن" کے لیے پھر کوئی ایڈیٹر تلاش کرنے لگے۔ اتفاق سے اس زمانے میں مولانا حامد بیدل بھی فکرِ معاش میں لاہور آئے ہوئے تھے۔ مولانا حامد حسین بیدل کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ متعارف کرا دیا جائے۔ وہ شاہجہان پور کے رہنے والے تھے۔ ان کی نثر اور نظم کا ایک خاص انداز تھا۔ اور ۱۹۱۳ء میں ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اتنی شہرت حاصل کر چکے تھے کہ جب مولانا محمد علی نے دہلی سے اپنا مشہورِ عالم روزنامہ "ہمدرد" جاری کیا اور اس کی ایڈیٹری کے لیے مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی اور اس کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے مولوی محفوظ علی بدایونی جیسے مشاہیر کو بلایا تو اخبار کے ایڈیٹوریل سٹاف میں مولانا بیدل کو بھی شامل کر لیا۔ مولانا بیدل حقیقی معنوں میں شاعر تھے۔ بڑے نازک مزاج اور زود رنج۔ مولانا محمد علی اپنے عملے سے کام لینے میں کبھی کسی کی رُو رعایت نہ کرتے تھے۔ جب مولانا بیدل کا زیادہ تر وقت دہلی کی ادبی محفلوں میں گزرنے لگا۔ اور انھوں نے اپنے فرضِ منصبی سے کچھ غفلت برتی تو مولانا محمد علی ان سے کچھ ایسے بیزار ہوئے کہ انھیں بلاتکلف رخصت کر دیا۔ کچھ روز دہلی میں اس امید میں اِدھر اُدھر پھرتے رہے کہ ان کے جوہر کو پرکھنے والا کوئی جوہری کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔ مگر نہ تو دہلی میں انھیں کوئی ایسا کام میسر آیا جو ان کی پسند کے مطابق ہوتا اور نہ انھوں نے کسی ادبی ادارے ہی کو اس قابل سمجھا کہ ان کے ذوقِ ادب کی تشنگی مٹا سکے۔ اس زمانے میں انھیں روز و شب بسر کرنے کے لیے دو ہی ٹھکانے میسر آئے۔ ایک تو نظام المشائخ کے ایڈیٹر ملّا واحدی کا دولت کدہ اور ایک پنڈت کے کوچے میں منشی نثار احمد کا مکان۔ ملّا واحدی تو اپنے ادبی اور صحافتی کارناموں کے باعث اس قدر مشہور ہوئے کہ محتاجِ تعارف نہیں۔ لیکن منشی نثار احمد کو متعارف کرنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔ بالخصوص اس لیے کہ جب تک وہ لاہور میں رہے۔ بھاٹی دروازے کے اندر تحصیل بازار ہی میں اس مکان میں رہے جس میں کبھی شمس العلما سید ممتاز علی رہتے تھے۔ وہ بہت دنوں تک پنجاب میں منصفی کے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ اس لیے عوام و خواص میں "منصف صاحب" کے نام سے مشہور تھے۔ قلم ان کی محبت کی وسعت کی ادراک سے قاصر ہے قلم اس مخزنِ احسان و مروت کے مکارمِ اخلاق کے اوصاف بیان کرنے سے عاجز ہے۔ راگ رنگ کے شیدائی اللہ والوں کے نیازمند دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار تھے۔ پنشن اور جائیداد کا کرایہ اور وہ سب کچھ جو انھیں کسی طرح بھی میسر آ سکتا تھا دوستوں کی خاطر مدارات میں اُڑا دیتے تھے۔ اور پھر خاطر مدارات بھی ایسی نہیں کہ جو ان کا جی چاہے مہمان کو کھلائیں بلکہ جو کچھ مہمان کھانا چاہے ویسا ہی بہم پہنچایا جاتا تھا۔ وہ دوستوں کی صحبت کے اس قدر شائق تھے کہ خود کرایہ خرچ کر کے انھیں دلّی سے بلایا کرتے تھے۔ اور اس وقت تک واپس نہ جانے دیتے تھے جب تک یہ لوگ یکے بعد دیگرے ان کی آنکھ بچا کر یا کبھی کسی ناگزیر ضرورت کا بہانہ کر کے نہ چلے جاتے۔ مولانا بیدل سے میری ملاقات بھی سب سے پہلے انھی کے دولت کدے پر ہوئی۔

جب مولانا بیدل لاہور آئے تو موچی دروازے کے باہر ڈپٹی برکت علی خاں کی کوٹھی میں ٹھہرے۔ ڈپٹی برکت علی خاں بھی شاہجہان پور کے رہنے والے تھے اور ان کے مہمان خانے کے دروازے ہر اس شخص کے لیے جو دیار شیخ کے اس پاس سے آ جاتا تو کھلا۔ دن رات کھلے رہتے تھے۔ اب مولانا بیدل کے دل میں اپنی غریب الوطنی کا احساس پیدا ہو چلا تھا۔ دوستوں کے کہنے سننے سے انھوں نے ایک بہت ہی قلیل مشاہرے پر "مخزن" کی ایڈیٹری قبول کر لی اور ڈپٹی برکت علی خان کی کوٹھی سے اٹھ کر مخزن کے دفتر میں آ گئے اور ایک مدت تک بھاٹی دروازے کے اسی کوچے میں رہے جس میں "مخزن" کا دفتر واقع تھا۔ مخزن کے دفتر سے جو مشاہرہ انھیں ملتا تھا وہ ان کے اخراجات کی کفالت کے لیے کافی نہ تھا، میں نے منشی گلاب سنگھ کے چھاپہ خانے کے مالک رائے بہادر موہن لال سے کہہ سن کر انھیں پروف ریڈری کا کام دلوا دیا لیکن یہ دونوں کام محنت طلب تھے اور مولانا بیدل محنت سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ میں اس زمانے میں اپنے گھر میں تنہا رہتا تھا جب مجھے مولانا بیدل جیسا صاحب ذوق دوست کچھ پریشان خاطر نظر آیا تو انھیں اپنے مکان پر لے گیا۔ وہ بہت دن تک میرے پاس رہے اور پھر دہلی چلے گئے اور غالباً اپنی زندگی کے آخری ایام انھوں نے دہلی میں جسے وہ ہمیشہ جہان آباد کہا کرتے تھے گزار دیے۔

(مسلسل)

میری ڈائری کے چند اوراق

سیلاب سے پہلے

نواب مشتاق احمد خان

بروز اتوار ۲۳ مئی سنہ ۴۸ء میں یعنی "پریم پرکاش" ہوائی جہاز سے حیدرآباد کے سفر پر روانہ ہوا۔ بنظر احتیاط میں نے گھر والوں کو اپنی آمد کے بارے میں مطلع نہیں کیا اور ارادہ یہ تھا کہ صرف ایک رات قیام کروں۔ تاکہ حتی الامکان کسی کو اور خاص کر پولیس والوں کو میری آمد کی خبر نہ ہو۔ جب ایک مسافر فرضی نام سے ایک ایسے سفر کا قصد کرے جس کا مقصد انتہائی نزاکت کا حامل ہو تو اندازہ لگائیے کہ اس سفر کی ابتداء سے انتہا تک اس کے تاثرات کیا ہوں گے، اور موہوم اور نامعلوم خطرات کا اندیشہ کس حد تک اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو سکتا ہے۔ میں نے کاہے کو کبھی اس قسم کا سفر کیا تھا۔ یہ محض ایک فرض کی پکار تھی جس نے مجھے اس انتہائی خطرناک سفر کے لیے آمادہ کیا۔ اور اس کے ان گنت خطرات سے نمٹنے کے لیے ہمت دی۔ پرواز کے دوران میں میں نے اپنا سارا وقت اخبار پڑھنے کی کوشش میں گزارا۔ مگر آنکھیں اخبار پر تھیں اور خیالات نہ معلوم کہاں تھے۔ خیالات کی پرواز ہوائی جہاز کی پرواز سے بھی تیز تھی اور میں خیال کی دنیا میں اپنا سفر ختم کر کے حیدرآباد میں اپنے مشن کی تکمیل کے لیے تجاویز سوچ رہا تھا۔ لیکن جب رہ رہ کر مجھے قائد اعظم کا وہ انتباہ یاد آتا تھا جو انہوں نے ۲۰ مئی ۴۸ء کو مجھے دیا تھا یعنی "خیال رکھو۔ کیونکہ میری اطلاع ہے کہ حکومت ہند پہلے ہی سے تمہاری فکر میں ہے"، تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں اپنی خیالی دنیا سے پھر حقیقت کی تلخیوں کی سرزمین پر لوٹ آیا ہوں۔ اسی شش و پنج کے عالم میں بمبئی کے سینٹا کروز کے ایئرپورٹ پر اترا۔ انتظار گاہ میں داخل ہی ہوا تھا کہ میرا سامنا ایک حیدرآبادی واقف سے ہو گیا۔ جس نے نہایت بے تکلفی سے میرا نام لے کر مجھے مخاطب کیا اور راز کی کچھ باتیں کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ میں ایک فرضی نام سے ایک انتہائی نازک مشن پر جا رہا ہوں۔ ایسی حالت میں ایک پبلک جگہ پر راز کی باتیں کرنے یا سننے کا کیا موقع ہے۔ بہرحال مجبور ہو کر انہیں میں ایک طرف لے گیا اور کہا کہ خدا کے لیے جو کچھ کہنا ہے جلدی سے کہہ دو۔ اور چونکہ ایک پبلک مقام پر طویل سرگوشی پیچیدگیوں کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لیے اختصار سے کام لو۔ معلوم نہیں کہ وہ میری بات پوری طرح سمجھے یا نہیں۔ بہرحال انہوں نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا جس پر کوڈ کے کچھ الفاظ تھے اور مجھے دکھایا اور اُن کا مفہوم مجھے سرگوشی میں سمجھانے کی کوشش کی۔ میں بمشکل تمام ان کو اس کوشش سے باز رکھنے میں کامیاب ہوا۔ اور بات اس پر ٹلی کہ وہ کراچی جا کر ٹھہریں میری واپسی پر ان سے اطمینان سے تفصیلی گفتگو کروں گا۔ اس واقعہ نے میری پریشانی میں اضافہ کر دیا۔ آخر یہ کیا ستم ہے کہ ایک فرد کے بعد دوسرا فرد اور ایک وفد کے بعد دوسرا وفد بغیر کسی حقیقی مقصد کے نازل ہو رہا ہے اور میرے کام میں پیچیدگیاں پیدا کر رہا ہے۔ ان حالات میں سینٹا کروز کی انتظار گاہ کا ماحول میرے لیے انتہائی ذہنی کوفت کا باعث بن گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ جب ایک نو آموز اناڑی مجرم پہلی بار کوئی جرم کرتا ہے تو اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ سینٹا کروز کے ایئرپورٹ پر اس دن جو میری کیفیت تھی وہ اس سے زیادہ مختلف نہیں ہو سکتی۔ حیدرآباد کے جہاز کے لیے کچھ وقت باقی تھا۔ میں نے انتظار گاہ کی ایک کونے کی سیٹ سنبھالی اور اپنے آپ کو ٹائمز آف انڈیا کے صفحات کے پیچھے چھپا لیا۔ تاکہ دیکھنے والوں کو یہی تاثر ہو کہ کوئی شخص بڑی توجہ اور انہماک سے اخبار کا مطالعہ کر رہا ہے۔ بالآخر جہاز پر سوار ہوا اور

حیدرآباد پہنچا۔ ایئرپورٹ سے اپنے گھر ٹیلیفون کر کے موٹر منگوائی۔ موٹر کے آنے تک وہیں انتظار کیا۔ یہ محض ایک اتفاقیہ امر تھا کہ ایئرپورٹ پر مجھے وہاں کوئی واقف نہ ملا ورنہ سارا کھیل بگڑ جاتا۔

گھر پہنچنے کے نصف گھنٹہ کے بعد وزیرِ خارجہ سے ملنے گیا۔ انہیں اپنے آنے کے مقصد سے مطلع کیا۔ انہی سے پتہ چلا کہ صدرِ اعظم بھارتی گورنمنٹ سے مذاکرات کے لیے دہلی گئے ہوئے ہیں۔ میرے مشن کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ بھی اس بارہ میں مجھے ہدایت دے سکتے ہیں۔ اس لیے وزیرِ خارجہ کا مشورہ یہ تھا کہ میں صدرِ اعظم سے دہلی جا کر ملوں۔ یہ خبر زیادہ تسکین بخش نہیں تھی۔ کیونکہ اس طرح لا محالہ میرے سفر کی میعاد جس کو میں کم از کم رکھنا چاہتا تھا، بڑھ جائے گی اور اسی مناسبت سے خطرات میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ مگر مجبوری تھی۔ خالی ہاتھ جانے کے خیال سے میں نے یہ سفر اختیار نہیں کیا تھا۔ اس لیے دہلی جانے کا ارادہ کرنا پڑا۔ میرے لیے یہ بات ضرور تعجب خیز تھی۔ مگر پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ اگر دہلی میں سیاسی گفت و شنید ہو رہی ہے۔ تو وزیرِ خارجہ وہاں کیوں نہیں ہیں اور یہ کیسے مذاکرات ہیں جس میں خارجی امور کے وزیر کی شمولیت کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔

وزیرِ خارجہ کی رہائش گاہ سے واپسی پر میں نے کنگ کوٹھی ٹیلیفون کیا اور اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے کہ ناگزیر حالات کے تحت مجھے کل صبح واپس ہونا ہے۔ فوری باریابی کی درخواست کی۔ درخواست کی پذیرائی ہوئی۔ وقت مقررہ ½ ۶ بجے شام میں شاہی محل کے بڑے دروازہ پر پہنچا۔ متعینہ پولیس افسر حبیب محمد میرا منتظر تھا۔ اور اس نے مجھے فوراً ہی حضور کی خدمت میں پہنچا دیا۔ حضور نظام کی خدمت میں یوں تو کئی بار والدِ محترم کی ہمرکابی میں حاضری ہو چکی تھی پھر سرکاری تقریبات میں ہر سال بلا ناغہ پیشی ہوتی رہتی تھی، مگر اعلیٰ حضرت کی خدمت میں تن تنہا باریابی کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اس لیے موقعہ کی نزاکت کی وجہ سے کسی قدر اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اسی اضطرابی کیفیت کا نتیجہ تھا یا محض لاپرواہی کا کہ سونے کی ایک اشرفی جو میں نذر پیش کرنے کے لیے سفید رومال میں لپیٹ کر اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے تھا۔ دروازہ میں داخل ہوتے ہی گر گئی۔ یہ محض حسنِ اتفاق تھا کہ ایک شاہی چوبدار نے اس حادثہ کو دیکھ لیا اور دوڑ کر زمین پر گری ہوئی اشرفی اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ جسے میں نے پشیمانی کے ساتھ قبول کر لیا۔ اگر یہ چوبدار صاحب اپنے روائتی رویہ پر قائم رہتے۔ تو میرا حشر جو ہوتا اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ داخلہ کے دروازہ سے کوئی دو سو گز کے فاصلہ پر ایک چھوٹے سے برآمدہ میں آصف سابع رہن سہن اور لباس کی اپنی روائتی سادگی کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور چند گز کے فاصلہ سے فرشی سلام کیا۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے ہاتھ سے آگے بڑھنے کے لیے فرمایا۔ اور شاہی چوبدار کو ایک کرسی لانے کا حکم دیا۔ میں نے خود بھی بارہا دیکھا تھا اور دوسروں سے بھی سُنا تھا کہ حضور میں باریابی کے وقت گھٹنوں با دب کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ اس لیے میں بھی اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ جیسے ہی میں آگے بڑھا سرکار نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے ذرا تامل کیا تو حضور نے دوبارہ بیٹھنے کے لیے حکم دیا۔ حکم کی تعمیل ہوئی میرے بیٹھتے ہی پہلا سوال یہ تھا کہ کیا انہوں نے مجھے پہلے بھی دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ والدِ محترم کی ہمرکابی میں کئی بار باریاب ہو چکا ہوں!

والدِ محترم کا نام سنتے ہی انہوں نے بڑے استعجاب سے دیکھا "اچھا۔ تم نواب یار جنگ کے بیٹے ہو" اور فرمایا "تمہارے والد میرے جاں نثاروں میں بھی منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ صحت کی خرابی نے انہیں قبل از وقت اور ایسے نازک موقعہ پر اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے پر مجبور کر دیا۔ جبکہ مجھے ان کے مشورہ کی ضرورت تھی"۔ اعلیٰ حضرت نے پھر مجھ سے پوچھا کہ پاکستان میں اپنے فرائض سنبھالنے سے پہلے ان

کی خدمت میں کبھی حاضر نہیں ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ اعلیٰ حضرت کی قدم بوسی کے بغیر اپنا نیا عہدہ سنبھالنے کے لیے روانگی میرے لیے ذاتی صدمہ تھا۔ لیکن اتنی جلدی میں اپنے مقام تعیناتی پر روانگی خود سرکار کے حکم کی تعمیل تھی۔ میں نے اعلیٰ حضرت کو یاد دلایا کہ اسی وجہ سے میں نے اپنے عہدہ کا حلف آدھی رات کے وقت اٹھایا تھا۔ پھر مجھ سے سوال کیا گیا کہ کراچی میں ان کی سالگرہ کی تقریب کیسی رہی؟ میں نے ساری تفصیلات بتائیں اور عرض کیا کہ اس تقریب کی برکت اور واسطے سے سفارتی حلقوں، خواص اور عوام میں حیدرآباد اور اس کے سیاسی موقف کا مؤثر طریقہ سے تعارف ہو گیا۔ کراچی میں مقیم سفارتی نمائندوں نے بشمول انڈین ہائی کمشنر اس میں شرکت کی۔ اخباروں نے اپنے خصوصی نمبر نکالے۔ اور عوام نے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا۔ اعلیٰ حضرت نے سوال کیا کہ قائد اعظم اس تقریب میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟ میں نے جواب دیا کہ قائد اعظم کی صحت ان دنوں اچھی نہیں ہے۔ مگر انہیں آخر وقت تک امید تھی کہ وہ شریک ہو سکیں گے۔ لیکن بالآخر صحت کی خرابی کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے مجھ سے حیدرآباد آنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جس خاص مقصد کے لیے میں نے یہ سفر اختیار کیا تھا اس کا ذکر اوائل گفتگو ہی میں کروں۔ اس لیے عرض کیا کہ چند ضروری امور پر صدر اعظم سے تبادلۂ خیال کر کے رہبری حاصل کرنا ہے۔ اب چونکہ وہ دہلی گئے ہوئے ہیں۔ اس لیے مجھے وہیں جا کر ان سے ہدایات حاصل کرنی پڑیں گی۔ میرے دہلی جانے کا سن کر حضور نے فرمایا "بہتر ہے میں نے بھی ایک خط لائق علی کے نام لکھا ہے۔ تم اسے خود لے جا کر دے دینا" وہ اس خط کی اہمیت پر بار بار زور دیتے رہے۔ اس کے بعد چند منٹ تک وہ برآمدے میں خاموشی سے ٹہلتے رہے۔ میں نے ایک دو بار کرسی چھوڑ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ مگر انہوں نے ہر بار ہاتھ کے اشارہ سے بیٹھے رہنے کا حکم دیا۔ چند لمحات کے بعد ٹہلتے ٹہلتے انہوں نے مجھ سے ایکدم سوال کیا کہ ہمارے سیاسی موقف کے بارہ میں پاکستانی رائے عامہ کا رجحان کیا ہے؟ حکومت کا نقطۂ نظر کیا ہے اور وہ کہاں تک اس موقف کی تائید اور حمایت کرے گی؟ میں نے عرض کیا کہ سات ہفتوں کی قلیل مدت میں جبکہ ہمارے موقف کی ابھی پوری طور سے نہ وضاحت ہوئی ہے اور نہ تشہیر۔ اس بارہ میں کوئی قطعی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ البتہ میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ جہاں تک رائے عامہ اور پریس کا تعلق ہے وہ یقیناً ہمارے ساتھ ہے اور ہماری حمایت کرے گی۔ بشرطیکہ ہمارا اپنا کردار صاف اور واضح ہو۔ اور اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کا جذبہ اور استقامت ہو۔ حکومت کی طرف سے ابھی تک مجھے کوئی خاص تیقنات نہیں دیے گئے۔ البتہ میرے تقرر کو قبول کرنے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ حکومت نے حیدرآباد کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر لیا ہے۔ عام طور پر بھی حکومتی حلقوں نے حیدرآباد کے نمائندہ کے تقرر کو بنظر استحسان دیکھا ہے۔ لیکن اگر حالات کسی نازک مرحلہ پر پہنچ گئے تو ہم کہاں تک ان کی حمایت کی توقع کر سکتے ہیں۔ اس بارہ میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اکابر حکومت سے تبادلہ خیال کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے موقف کے بارہ میں ہنوز کچھ شبہات ہیں جن کو میں نے اپنی حد تک رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ اس مرحلہ پر میں نے موقع دیکھ کر اپنی آمد کے صحیح مقصد کی طرف گفتگو کو موڑنے کی کوشش کی۔ میں نے بطور تمہید عرض کیا کہ اب تک میری ساری ملازمت ایک ایسے محکمہ میں رہی ہے۔ جہاں حکمران اور شاہی خاندان سے ذاتی رابطہ پیدا ہونے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ اس لیے مجھے شاہی آداب سے پوری طرح واقفیت نہیں ہے۔ میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اس کو اس کو پیش کرنے میں مروجہ شاہی آداب پوری طرح ملحوظ نہ رکھ سکوں تو عفو شاہانہ سے سرفراز فرمایا جائے اور اپنا معروضہ پیش کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ اجازت ملنے پر میں نے عرض کیا کہ سیاسی حالات کی رفتار اور بھارتی حکومت جس پالیسی پر کاربند ہے۔ اس سے ذرا

[illegible] نہیں رہا کہ حیدر آباد کے معاملہ میں بھارتی حکومت شرارت پر تلی ہوئی ہے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کسی اقدام سے گریز نہ کرے گی۔ اس لیے مستقبل کی غیر یقینی صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ قرینِ مصلحت ہے کہ حیدر آباد کی املاک جو سو سال سے مسلمانوں کے خون اور پسینہ کا ثمرہ ہے اور ان کی امانت ہے کسی محفوظ مقام پر منتقل ہو جائیں۔ اعلیٰ حضرت میری اس جسارت کو سن کر ذرا چیں بجبیں ہوئے۔ غالباً میری طرف سے اس طرح کا سوال اٹھانا غیر متوقع تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میری رائے میں کن خدشات کا احتمال ہے جن کی بنا پر میں یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ ابھی میں کوئی جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ ایک شاہی چوبدار نے کورنشات بجالاتے ہوئے عرض کیا کہ سرکار نے آموں کا ایک پارسل بمبئی بھیجنے کے لیے جو حکم صادر فرمایا تھا، اس کی تعمیل نہیں ہو سکی۔ کیونکہ حیدر آباد کے سٹیشن ماسٹر نے بمبئی کے لیے یہ پارسل لینے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ سنتے ہی اعلیٰ حضرت نے انتہائی غصہ کے عالم میں میری طرف مڑ کر دیکھا اور پھر انگریزی زبان میں فرمایا " اب میرے اپنے ملازمین کا مجھ سے یہ رویہ ہے اور میری یہ حیثیت بنا دی ہے " پھر انہیں اتفاقیہ یاد آ گیا کہ میرا تعلق بھی محکمہ ریلوے سے رہ چکا ہے۔ اور معاً فرمایا اور " یہ تمہارے محکمہ والوں کی حرکت ہے " میں نے ادب سے جواب دیا کہ حیدر آباد کی رعایا دل و جان سے سرکار کی ذات اور خانوادہ آصفیہ کی جاں نثار ہے۔ اس لیے یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سرکار کے کسی حکم کی تعمیل میں عذر یا لیت و لعل سے کام لیں گے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ جی۔ آئی۔ پی ریلوے نے بھارتی حکومت کے ایماء سے ہمارے جنکشن واڑی سے آگے پارسل یا مال لینا بند کر دیا ہے۔ یہ سب کچھ حیدر آباد کے خلاف معاشی مقاطعہ کی سکیم کے تحت ہو رہا ہے۔ اگر سٹیشن ماسٹر حیدر آباد یہ پارسل لے بھی لیتا تو وہ ہمارے جنکشن سے آگے نہیں جا سکتا تھا اور لامحالہ واپس آ جاتا۔ ایسی صورت میں سٹیشن ماسٹر کا طریقِ کار غلط نہیں ہے۔ اعلیٰ حضرت اس وضاحت کو سن کر ذرا متعجب ہوئے اور کہا کہ جب پارسل بمبئی نہیں جا سکتا تھا تو اس کا واپس کر دینا ہی مناسب تھا۔ " مگر یہ سب باتیں مجھے کیوں نہیں بتائی جاتیں۔ اور بھارتی حکومت میری قوتِ ارادی کو متاثر کرنے کے لیے یہ اوچھے حربے کیوں استعمال کر رہی ہے " میں نے موقعہ دیکھ کر عرض کیا کہ میرے ذہن میں یہی حربے ہیں جن کا استعمال بھارتی حکومت آزادانہ کر رہی ہے اور آئندہ کرتی رہے گی۔ اور اس کا قوی احتمال ہے کہ جارحانہ اقدامات سے بھی گریز نہ کرے۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ خارجی اثرات کے تحت اور معاشی ناکہ بندی کے نتیجہ سے اندرونی خلفشار پیدا ہو جائے۔ بھارت کی طرف سے جارحانہ اقدامات اور اندرونی خلفشار۔ ان دونوں صورتوں میں ہماری املاک کا کا بروقت تحفظ قرینِ مصلحت ہے۔ میری ان گزارشات کو حضور نظام نے پریشانی کے عالم میں سنا۔ چند لمحے خاموشی اختیار کی اور اپنی نشست والے کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک برابر ٹہلتے رہے۔ اُن کے چہرہ پر پریشانی اور فکر کے آثار دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ اسی دبدبہ اور جاہ و جلال والے بادشاہ ہیں جن کے سامنے چند سال پہلے بڑے سے بڑے آدمی کو بھی دم مارنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی بالآخر جب اعلیٰ حضرت نے مہرِ سکوت کو توڑا تو مجھ سے سوال کیا " اگر بالفرض خدشات کے بارہ میں میں تمہاری رائے مان لوں تو املاک کے مناسب تحفظ کے لیے کیا انتظام تمہارے ذہن میں ہے " میں نے روہانسی آواز میں جواب دیا " مجھے حال ہی میں سرکار نے پاکستان میں اپنی نمائندگی کے شرف سے نوازا ہے۔ میرے والد اور بھائی سرکار کی خدمت میں اپنی جاں نثاری اور وفاداری کا ثبوت دے چکے ہیں۔ اب اس غلام کی باری ہے۔ وہ ہر اس ذمہ داری کو قبول کرنے میں اپنی عزت سمجھتا ہے جو اس کے تفویض فرمائی جائے اور سرکار کی امانت کے تحفظ کے لیے اپنی اور اپنے خاندان کی جاں نثاری کی ضمانت پیش کرتا ہے۔ اعلیٰ حضرت میرے اس جذباتی اندازِ گفتگو سے کافی متاثر

ہوئے اور چند لمحوں کے لیے پھر خاموشی اختیار کرلی۔ حضور نظام کی روپیہ پیسہ کے معاملہ میں غیر معمولی اور روایتی احتیاط کے پیش نظر میں نے موقع دیکھ کر عرض کیا کہ املاک کی منتقلی کے لیے باربرداری پر کچھ خرچ نہیں آئے گا۔ میں نے یہ کہہ تو دیا۔ مگر فوراً ہی محسوس کیا کہ اتنی سی بات کہہ کر میں نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو اُلجھن میں ڈال لیا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے جو ایک انتہائی ذہین آدمی ہیں اس بات کو پکڑ لیا اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا "لیکن یہ کیسے ممکن ہے"۔ میں نے جھجکتے ہوئے عرض کیا کہ جب سرکار کو علم ہے میں نے فضائی نقل و حمل کا ایک خصوصی انتظام کیا ہے جس کا مقصد حیدرآباد کے لیے اُن تمام ضروری اشیاء کا حمل و نقل ہے جن کی تجارت کے معاشی مقاطعہ کی پابندی کی وجہ سے قلت یا مکمل بندش ہوگئی ہے۔ اس فضائی تنظیم کے ذریعہ میری گزارش پر بھی آسانی سے عمل ہوسکتا ہے اور میں اس کے لیے پوری ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ سنتے ہی اعلیٰ حضرت ایک دم میری طرف پلٹے اور تعجب سے پوچھا "تم تو ریلوے کے آدمی تھے۔ ہوائی جہاز کب سے چلانے شروع کردیے؟" میں نے یہ سوال بڑی تشویش سے سنا۔ کیونکہ یہ سوال دو ہی صورتوں میں پوچھا جاسکتا تھا۔ ایک تو یہ کہ اس اہم معاملہ میں اعلیٰ حضرت کو اعتماد میں نہیں لیا گیا اور وہ حکومت کے دفاعی اور دیگر انتظامات کی نوعیت، اہمیت اور وسعت سے ناواقف ہیں۔ اور اگر یہ صورت ہے تو ممکن ہے میں نے اس کی نشاندہی کرکے حکومت کی مصلحت اور منشا کے خلاف یہ بات کہہ دی ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت اصل واقفیت کے باوجود مجھ سے یہ سوال پوچھ کر دانستہ مجھے اُلجھن میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اسی شش و پنج میں میرے لیے اعلیٰ حضرت کے مزید سوالات کا جو تفصیلات معلوم کرنے کے لیے انہوں نے کیے۔ جواب دینا بہت دشوار ہوگیا۔ بڑی مشکل سے رُخ بدلنے میں کامیاب ہوا۔ — اس دوران میں اعلیٰ حضرت نے لائق علی صاحب کے موسومہ خط پر اپنی پرائیویٹ مہر لگائی اور مجھ سے تاکیداً فرمایا کہ یہ خط دہلی پہنچتے ہی صدر اعظم کو دے دوں۔ اب شب کے آٹھ بج چکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ چونکہ اب وقت بہت ہوگیا ہے اس لیے اجازت حاصل کروں۔ اتنے میں اعلیٰ حضرت نے چند لمحات سوچنے کے بعد فرمایا "اچھا جو تجویز تم نے پیش کی ہے۔ اس پر میں غور کروں گا۔ ایسے نازک مسائل پر پورا غور و فکر کرنے کے بعد ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے"۔ میں سلام پیش کرتے ہوئے پھر عرض کرنے کی جرأت کی "سرکار حالات اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں اور اتنے مخدوش ہوتے جارہے ہیں کہ میری رائے ناقص میں یہ معاملہ سرکار کی فوری توجہ اور فیصلہ کا محتاج ہے"۔ اپنے جوش اور جذبہ میں میں نے مزید یہ عرض کرنے کی جسارت کی کہ "خطرہ کی صورت میں یہ املاک نہ صرف ہمارے قبضہ تصرف سے نکل جائے گی۔ بلکہ ہمارے خلاف بھی استعمال ہوگی۔ اس لیے مصلحت یہی ہے کہ مسلمان قوم کی ۸ سو سالہ دولت جس کے سرکار امین ہیں۔ اس کے تحفظ کے لیے بروقت اور مؤثر حفاظتی انتظامات ہوجائیں۔ اس پر حضور نظام نے تیز نگاہ سے میری طرف دیکھا اور بعد ذرا درشتی سے فرمایا "تو تمہاری رائے میں میں صرف امین ہوں اور یہ میری ملکیت نہیں ہے۔ تمہارے والد بھی ایسی ہی بات کہہ دیا کرتے تھے"۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اپنے جوش جذبہ اور سادگی میں کیا کہہ دیا۔ لیکن والد محترم کی ذات کے حوالہ ہی نے مجھے سہارا دیا چنانچہ معذرت طلب کرتے ہوئے عرض کیا "سرکار میرے والد جو کچھ عرض کرتے تھے وہ سرکار کی وفاداری اور جاں نثاری کے جذبہ کے تحت ہی کیا کرتے تھے۔ میں نے جو بھی کچھ عرض کیا ہے۔ اس کا محرک بھی وہی جذبہ وفاداری ہے"۔ اس پر حضور کا غصہ ذرا کم ہوا۔ اور فرمایا "ہاں۔ ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ تمہارے والد کے کیا کہنے! میں ان کی اصابت رائے کی بہت قدر کرتا تھا۔ افسوس ہے کہ میرے پاس اب کوئی ایسا آدمی نہیں ہے۔ جو مجھے صحیح اور دیانت دارانہ مشورہ دے سکے"۔ ایسے دبدبہ والے بادشاہ کی طرف سے اس طرح کی بے بسی کا اظہار ایک عبرت کا مقام

[illegible] بیٹے بیٹھے سوڈا پیتے رہے ۔ پھر میں نے پھر یہ عرض کرنے کی جسارت کی کہ " اگر صرف خاص کے املاک کے بارہ میں فی الوقت کوئی رکاوٹیں ہیں تو پھر یا تنگ پور نواب زاہد سالار جنگ کی املاک کے بارے میں غور فرمایا جائے " ۔ اعلیٰ حضرت کو میرا یہ اصرار پسند نہیں آیا ۔ اور غالباً ٹالنے کی غرض سے فرمایا کہ " انہیں ان املاک سے کیا مطلب ؟ یہ معاملہ تو امرائے پائیگاہ اور سالار جنگ کے طے کرنے کا ہے " ۔ میں نے عرض کیا " اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کرنے کی اجازت دی جائے کہ " حیدر آباد میں ۲۵ برس رہنے کے بعد غلام کے لیے یہ باور کرنا دشوار ہے کہ امرائے پائیگاہ اور سالار جنگ سرکار کی مرضی اور منشا کے بغیر اس قسم کا کوئی اقدام کر سکتے ہیں " ۔ یہ سن کر اعلیٰ حضرت تھوڑی دیر خاموش رہے ۔ پھر فرمایا " اچھا ۔ میں تمہاری دونوں تجاویز پر غور کروں گا ۔ فی الوقت میں کسی ایک کے بارہ میں بغیر مزید غور و خوض کے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا " ۔ اس پر میں نے فرشی سلام کر کے رخصت چاہی اور ۱۱ بجے رات کو اس تاریخی ملاقات کی یاد بھرے دل کے ساتھ لے کر گھر واپس ہوا ۔

بروز پیر ۲۴ مئی ۱۹۴۸ء میں دکن ایئرویز کے جہاز سے دہلی پہنچا ۔ نظام پیلس میں صدر اعظم کی خدمت میں جو اس وقت ظہیر احمد معتمد امور خارجہ کے ساتھ ایک میٹنگ میں مصروف تھے ۔ پیش ہوا ۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے میں نے فضائی معاہدہ کا سوال اٹھایا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ انتظام ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ہی کیا گیا ہے ۔ اب اس بارہ میں مزید کچھ نہیں ہو سکتا ۔ میں نے عرض کیا کہ سارے انتظام کا ڈھانچہ میرے پاکستان آنے سے قبل تیار ہوا تھا ابھی تک مجھے اس کا پس منظر اور تفصیلات نہیں بتائی گئیں ۔ صدر اعظم نے ایک طویل گفتگو میں ساری باتوں پر روشنی ڈالی ۔ اس ضمن میں میں نے اپنی اُس یادداشت کا حوالہ دیا جس میں میں نے حیدر آباد سے مختلف افراد اور وفود کے پاکستان بھیجے جانے پر اعتراض کیا تھا ۔ کیونکہ میرے علم اور مشورہ کے بغیر اس قسم کے اقدامات سے میری سفارتی حیثیت متاثر ہوتی ہے ۔ میرے سفارتی علاقہ میں کسی فرد یا کسی وفد کا بھیجا جانا اسی وقت کار آمد ہو سکتا ہے ۔ اگر مجھ سے اس کی ضرورت اور طریق کار کے بارہ میں پہلے سے مشورہ کر لیا جائے ۔ صدر اعظم نے میرے نقطۂ نظر سے اتفاق کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اس بارہ میں ضروری ہدایات جاری کر دیں گے ۔ اس کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ پاکستان میں حکومت اور عوام کی نظر میں ہمارے فوجی نمانڈر جنرل العیدروس کی فوجی اہلیت اور وفاداری مشتبہ ہے ۔ صدر اعظم نے کہا کہ انہیں کمانڈر پر پورا اعتماد ہے ۔ وہ اس سے پہلے بھی پاکستان میں اس قسم کے غلط تاثر کے بارہ میں سن چکے ہیں ۔ میں نے عرض کیا کہ چونکہ مجھے یہ اطلاع سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ذرائع سے ملی ہے ۔ اس لیے میں نے اسے اپنا فرض گردانا کہ وہ ان تک پہنچا دوں ۔ میرا منشا یہ ہے کہ اس اطلاع میں اصلیت ہو یا نہ ہو ۔ جن حالات سے ہم دوچار ہیں ان کے پیش نظر ہر قسم کی احتیاط لازم ہے ۔ پھر میں نے اعلیٰ حضرت سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا وہ دیر تک دلچسپی سے ساری روئداد سنتے رہے ۔ میں نے بتایا کہ اثنائے گفتگو میں جب فضائی عمل و نقل کا ذکر آیا تو اعلیٰحضرت کے سوالات سے مجھے یہ تاثر ہوا کہ وہ ساری تجویز سے ناواقف ہیں ۔ صدر اعظم نے فرمایا کہ یہ بہت اچھا ہوا کہ میں نے انہیں پوری تفصیلات نہیں بتائیں ۔ کیونکہ خیالوں کی جس دنیا میں وہ رہتے ہیں اگر انہیں اعتماد میں لیا جائے تو وہ فوراً اپنے درباریوں کو بتا دیں گے اور شام تک ساری بات شہر میں پھیل جائے گی ۔ مجھے یہ سن کر تعجب بھی ہوا اور تشویش بھی ہوئی ۔ تعجب اس لیے کہ قومی زندگی کے اس نازک مرحلہ پر ایک دوسرے پر اعتماد کا فقدان ایک ناقابل فہم بات ہے اور تشویش اس لیے کہ اس سے حکمران اور حکومت میں ایسے وقت ایک ذہنی بُعد کا پتہ چلتا ہے ، جب مکمل اتحاد کی ضرورت ہے ۔ اسی تاثر کے تحت میں نے دبی زبان سے عرض کیا کہ قوم کی زندگی کے مخدوش حالات میں اتحاد خیال و عمل بے حد ضروری ہے ورنہ نتیجہ بربادی ہے ۔ صدر اعظم نے کامل اتحاد کی ضرورت اور اہمیت پر مجھ سے اتفاق کیا ۔ مگر یہ کہا کہ حقیقتوں سے اغماض کیسے کیا جا سکتا

۴۔ میں نے عرض کیا کہ اگر صورتِ حال اس نازک مرحلہ پر پہنچ گئی ہے تو پھر ضروری ہے کہ یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ اتحاد المسلمین کی پشت پناہی سے حکومت اس موقف میں ہے کہ اپنی پسند کے مطابق اپنی پالیسی پر کاربند ہو سکے۔ اگر ہے تو پھر اعلیٰ حضرت کو اپنی مرضی پر چلانے کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھانا چاہیئے۔ اگر نہیں ہے تو پھر اعلیٰ حضرت کو اپنے اعتماد میں لیجئے۔ ان پر صورتِ حال کو واضح کیجئے اور قومی زندگی کے نام پر ان سے اپیل کیجئے کہ وہ صحیح فیصلہ کریں۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ اس نازک مرحلہ پر ہماری ایک آواز ہونی چاہیئے اور جو کچھ بھی اقدامات زیرِ غور ہوں ان کے بارہ میں بغیر کسی ذہنی تحفظات کے مکمل اتحاد ہونا چاہیئے اور کسی مرحلہ پر کسی قسم کے بددلی کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیئے۔
صدرِ اعظم نے گفتگو کے اس رُخ پر پلٹنے کو شاید پسند نہیں کیا اور وہ خاموش ہو گئے اور حیدرآباد الیسین کے نظم و نسق کے بارہ میں باتیں ہونے لگیں، رات کو دیر تک یہ نشست رہی۔ دو دن کی مسلسل گفتگوؤں سے مجھے کافی تکان ہو گئی۔ دیر تک نیند نہیں آئی۔ لیکن نیند جب آنے لگتی ہے تو سولی پر بھی آجاتی ہے چنانچہ باوجود انتہائی اعصابی کھچاؤ کے بالآخر میری آنکھ لگ گئی۔ مگر رات میں کئی بار دونوں دنوں کی مصروفیتوں کو خواب میں دیکھتا رہا۔ صبح چار بجے اُٹھ بیٹھا اور کراچی کی واپسی کے لیے تیاری میں مصروف ہو گیا۔

(مسلسل)

افریقہ کی سیاست

بصیر عالم

افریقہ کی نو آبادیاتی تقسیم

افریقہ پر یورپ کی سامراجی طاقتوں نے انیسویں صدی کے آخری ربع میں غلبہ حاصل کرنا شروع کیا اور ۱۹۱۲ء تک سارے افریقہ کے حصے بخرے کر لیے یورپی طاقتوں کا یہ غلبہ صنعتی انقلاب کے معاشی اور سیاسی تقاضوں کا لازمی نتیجہ تھا۔

انگلستان میں سب سے پہلے صنعتی انقلاب آیا۔ ۱۸۷۰ء تک انگلستان کو صنعتی، تجارتی اور سیاسی اعتبار سے یورپ کی دوسری قوموں پر فوقیت حاصل رہی۔ لیکن انیسویں صدی کے آخری ربع میں جرمنی، فرانس، امریکہ اور یورپ کی چند دوسری قوموں نے بھی صنعتی ترقی کر لی اور وہ بین الاقوامی بازار میں انگلستان کے مقابلہ پر آ گئیں۔ ان کی صنعتی پیداوار میں دن دونا اور رات چوگنا اضافہ ہو رہا تھا لیکن انہوں نے باہمی تجارت کی راہ میں درآمدی محصولوں کی دیواریں کھڑی کر لی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصنوعات کی کھپت کے لیے منڈیاں تقریباً ناپید ہو گئیں۔ ۱۸۸۵ء میں جو حالت تھی وہ فرانس کے وزیر اعظم جولے فیری نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

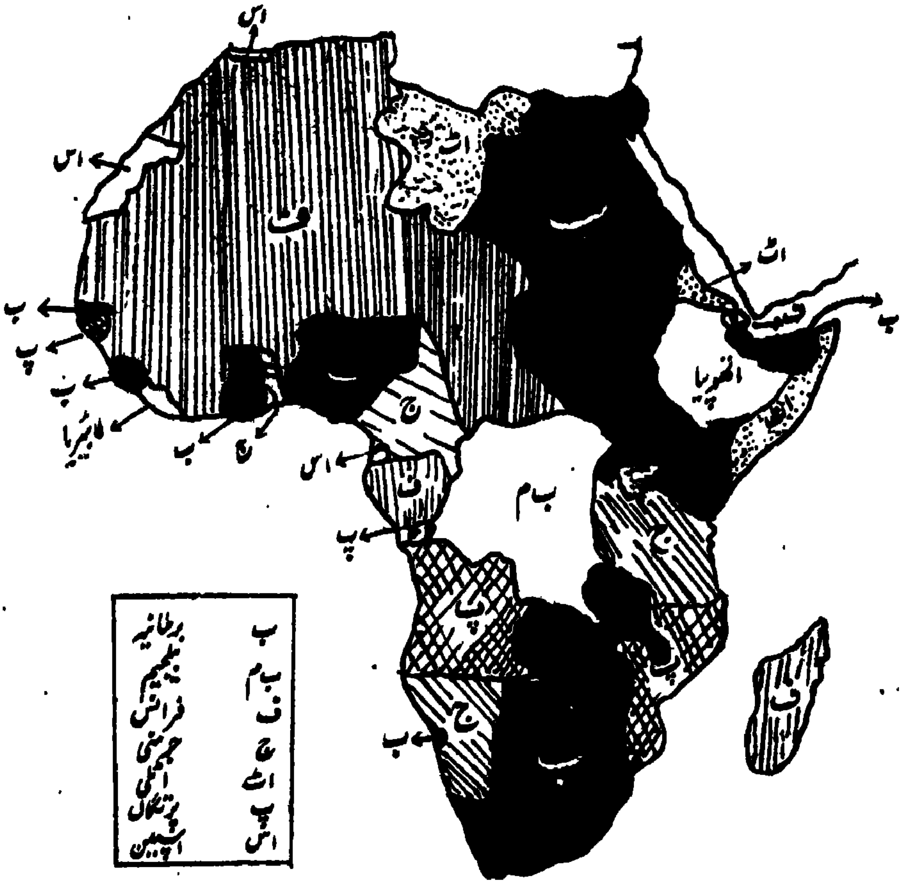
"ہماری عظیم صنعت کو جو چیز درکار ہے اور جس کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے وہ ہے "منڈی"
— کیوں؟ اس لیے کہ جرمنی اپنے اردگرد (محصول کی) دیواریں کھڑی کر رہا ہے۔ اس لیے کہ سمندر کے اس پار امریکہ محض تحفظ پسند نہیں بلکہ انتہائی تحفظ پسند ہو گیا ہے۔"

صنعتی ملکوں کی بین الاقوامی تجارت میں جو ٹھہراؤ آ گیا تھا اُسے دور کرنے کی آسان تدبیر یہی تھی کہ دنیا کے غیر صنعتی اور پس ماندہ علاقوں پر قبضہ کر کے ایک طرف ان کے سستے معدنی، زراعتی اور افرادی وسائل کے ذریعے صنعتوں کو مزید منافع بخش بنایا جائے اور دوسری طرف انھیں اپنی مصنوعات کی نئی منڈیوں کی حیثیت سے استعمال کیا جائے۔

مشینی، بخاری اور برقی طاقتوں کے باعث یورپی اقوام افریقہ کے وحشی اور نیم وحشی لوگوں پر آسانی سے غالب آ گئیں۔ اور اُن قدرتی رکاوٹوں کو دور کرنے میں کامیاب ہو گئیں جو معاشی و سیاسی غلبہ قائم رکھنے کی راہ میں حائل ہو سکتی تھیں۔

افریقہ کے اندرونی علاقوں پر قبضہ کرنے سے پہلے یورپ کی سامراجی طاقتوں کے لیے ضروری تھا کہ جغرافیائی حالات پوری طرح معلوم کر لیے جائیں۔ یہ کام عیسائی مبلغوں اور سیاحوں نے انجام دیا۔ عیسائی مبلغ لونگسٹون کانگو اور رہوڈیشیا وغیرہ کے علاقوں میں سرگرداں رہا۔ اس کے نقشِ قدم پر ایک انگریز سیاح سٹینلے نے سفر کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دریائے کانگو کا دہانہ دریافت کیا جائے۔ اس نے وسط افریقہ کے شرقی ساحل سے اپنا سفر شروع کیا اور بحر اطلانتک کے کنارے کانگو کے دہانہ پر پہنچ گیا۔ جب وہ اپنا سفرنامہ شائع کرنے

افریقہ کی نوآبادیاتی تقسیم
(سنہ ۱۹۱۴ء)



کے یورپ پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے کارناموں کی خبریں پہلے ہی یورپ پہنچ گئی ہیں۔ ۱۸۷۸ء میں جب اس کا جہاز برسلز بندرگاہ پر پہنچا تو اس نے بلجیم کے شاہ لیوپولڈ دوئم کے نمائندوں کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے شاہ بلجیم کی طرف سے سٹینلے کو یہ پیشکش کی کہ وہ شاہ کے نمائندے کی حیثیت سے ایک "خفیہ مقصد" کے تحت افریقہ واپس چلا جائے۔ اس خفیہ مقصد کو خفیہ رکھنے کے لیے شاہ بلجیم نے پہلے ہی انتظام کر لیا تھا۔ اس نے ۱۸۷۶ء میں ایک جغرافیہ کانفرنس منعقد کی تھی جس میں کہا تھا کہ "اس ترقی کے دور میں ہمارا یہ مقدس فریضہ ہے کہ ان علاقوں کے دروازے وا کریں جہاں ہنوز تہذیب کا گذر نہیں ہوا ہے اور وہاں روشنی پہنچائیں جہاں انسانی آبادیاں آج بھی تاریکی میں مبتلا ہیں"۔

شاہ لیوپولڈ کے "مقدس فریضہ" کی حقیقت اس وقت واضح ہوئی جب سٹینلے کا "خفیہ مقصد" پورا ہو گیا اور کانگو بلجیم کی نو آبادی بن گیا کہ سٹینلے نے سستے تحفے دے کر قبائلی سرداروں کے نشانِ انگشت معاہدے کے سادہ کاغذوں پر حاصل کر لیے۔ جب سٹینلے کانگو کے دہانہ کے نزدیک پہنچا تو اس نے دریا کے دوسرے کنارے پر فرانس کے ڈی برازا کو موجود پایا۔ وہ وہاں پندرہ مہینے پہلے ہی پہنچ گیا تھا اور اس نے مقامی سردار مکوکو کا نشانِ انگشت حاصل کر کے دریائے کانگو کا شمالی علاقہ فرانس کی حفاظت میں لے لیا تھا۔ شاہ لیوپولڈ کی ریشہ دوانیوں کے پیشِ نظر فرانس کی حکومت نے اس معاہدے کی فوراً توثیق کر دی اور سٹینلے کا "خفیہ مقصد" ادھورا رہ گیا۔ ادھر برطانیہ بلجیم اور فرانس کے عزائم واضح ہو گئے تھے۔ معاملات طے کرنے کے لئے کوئی مناسب کارروائی ضروری تھی۔ چنانچہ برطانیہ نے پرتگال سے ایک معاہدہ کیا جس میں کانگو کے دہانہ پر پرتگال کی سرداری تسلیم کی گئی اور پرتگال نے وعدہ کیا کہ دریائے کانگو میں برطانیہ کو جہاز رانی کے تمام حقوق حاصل ہوں گے۔ یہ معاہدہ بلجیم اور فرانس کے "خفیہ مقاصد" پر ایک کاری ضرب کے مترادف تھا۔ شاہ لیوپولڈ نے فرانس اور جرمنی سے رجوع کیا۔ فرانس نے اس معاہدہ کے خلاف سخت احتجاج سے بھی گریز نہیں کیا۔ دراصل یہ اس کا اپنا معاملہ تھا۔ جرمنی نے فرانس کی حمایت کی کیونکہ وہ افریقہ میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے فرانس سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کے مقاصد یہ تھے کہ کیمرون، ٹوگو لینڈ اور جنوب مغربی افریقہ پر قبضہ کیا جائے۔ فرانس اور جرمنی کے دباؤ سے مجبور ہو کر برطانیہ نے پرتگال سے معاہدہ کی توثیق نہیں کی اور فرانسیسی وزیرِ اعظم جولے فیری کی اس تجویز کو مان لیا کہ کانگو کے مسئلہ پر برلن میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی جائے۔ کانفرنس کے انعقاد سے قبل امریکہ نے کانگو پر لیوپولڈ ساختہ بین الاقوامی جغرافیہ ایسوسی ایشن کی سرداری تسلیم کر لی۔ اس لیے یہ بات گویا پہلے سے ہی طے تھی کہ کانفرنس کانگو کو لیوپولڈ کے حوالے کر دے گی۔ کانفرنس کی کارروائی تین ماہ تک جاری رہی کافی بحث و تمحیص اور سودے بازی کے بعد افریقہ کے متعلق ایک "عام قانون" اتفاق رائے سے منظور کیا گیا اس قانون کی رو سے دستخط کنندگان نے طے کیا کہ "وہ افریقی باشندوں کی اخلاقی اور مادی بہبود کی حفاظت کریں گے، غلامی اور بردہ فروشی کو ختم کرنے کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ مقامی باشندوں کو تعلیم دیں گے۔ انہیں مہذب بنائیں گے اور عیسائی مبلغوں، سائنس دانوں اور سیاحوں کا تحفظ کریں گے"۔

برلن کانفرنس کے مندرجہ بالا مقاصد بظاہر بہت نیک تھے لیکن عملی لحاظ سے اگر کوئی مقصد تھا تو وہ صرف یہ کہ دستخط کنندگان خود اپنے ضمیر اور دنیا کے لوگوں کو دھوکا دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب کانفرنس میں مطلب کی باتیں طے کرنے کا وقت آیا تو اخلاق تہذیب اور انسانی خدمت کے نام نہاد مقاصد پس پشت ڈال دیئے گئے۔ مثلاً شراب اور اسلحہ کی منافع بخش تجارت پر کوئی پابندی

مائنر منہاں کی گئی ۔ دریائے کانگو اور دریائے زیمبیسی کے راستے آزاد تجارت کے لیے کھول دیئے گئے ۔ نوآبادیوں کی حدیں مقرر کی گئیں اور مزید نوآبادیاں حاصل کرنے کے لئے یہ اصول طے کیا گیا کہ کوئی ایک طاقت حد سے زیادہ نوآبادیاں حاصل نہیں کرے گی اور جب بھی کوئی طاقت کسی نئی نوآبادی پر قبضہ کرنا چاہے گی تو اُسے دوسری نوآبادیاتی طاقتوں کو قبل از وقت نوٹس دینا ہوگا۔ اس سلسلہ میں تنازعات کو ثالث کے ذریعے طے کئے جائیں گے ۔

۱۸۷۹ء میں شاہ لیوپولڈ نے سٹینلے کو "خفیہ مقاصد" کی تکمیل کے لیے بھیج کر دراصل افریقہ میں نوآبادیوں کے حصول کا ایک مقابلہ شروع کر دیا تھا ۔ ابھی کانگو کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا کہ افریقہ کے دوسرے علاقوں میں نوآبادیوں کی لوٹ کا بازار گرم ہوگیا - دریائے نائیجر کے ڈیلٹا کے لیے فرانس اور برطانیہ میں کشمکش شروع ہوگئی ۔ بعد میں جرمنی بھی اس مقابلے میں شامل ہوگیا - اس مقابلے میں برطانیہ کی جیت ہوئی لیکن فرانس اور جرمنی نے بھی آس پاس کے علاقے حاصل کر لیے ۔

برطانیہ ۱۸۷۵ء سے پہلے ہی راس امید اور جنوب مغربی افریقہ کے ساحل میں والفش خلیج پر قابض ہو چکا تھا ۔

۱۸۸۳ء میں جرمنی کے ایک تاجر لوڈرٹز نے راس امید اور والفش خلیج کے درمیان انگراپکوئینا نامی ایک بندرگاہ خرید لی۔ انگلستان کے اعتراض کا جواب جرمنی نے یہ دیا کہ لوڈرٹز کو سرکاری تحفظ کی ضمانت دے دی، ۲ر جولائی ۱۸۸۴ء کو جرمن نمائندہ ناچتی گل خلیج گنی پہنچا- اس نے مقامی بادشاہ سے معاہدہ کیا اور اس علاقے پر جرمنی کا پرچم لہرا دیا - یہ علاقہ بعد میں جرمن ٹوگو لینڈ کہلایا - ٹوگو لینڈ کے بعد ناچتی گل دریائے کیمرون کے دہانہ پر پہنچا ۔ وہاں پہلے ہی جرمن تاجروں نے مقامی سرداروں سے معاہدے کر رکھے تھے ۔ ناچتی گل نے یہاں کے بادشاہ بیل کو پانچ ہزار ڈالر کے تحائف دیئے اور اس کے بعد کیمرون کے علاقے پر جرمنی کا پرچم نصب کر دیا - اس کے ایک ہفتہ بعد برطانوی قونصل، مسٹر ہیوٹ مسلح کشتی میں سوار کیمرون پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ناچتی گل جرمنی کی طرف سے قابض ہو چکا ہے - لیکن ہیوٹ بھی خالی ہاتھ واپس جانے کے لیے تیار نہیں تھے ۔ انہوں نے مغربی ساحل کے دوسرے علاقوں پر پرچم کشائی کا کام جاری رکھا - لیکن مشکل یہ آپڑی تھی کہ جرمنی اور فرانس نے برطانیہ کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا تھا ۔ ناچار برطانیہ کو نئے مقبوضات پر جرمنی کی سرداری تسلیم کرنی پڑی اور بادل نخواستہ برطانوی وزیر اعظم گلیڈسٹون نے جرمنی کو سامراجی ٹولی میں ان الفاظ کے ساتھ خوش آمدید کہا ۔

"اگر جرمنی ایک نوآبادیاتی طاقت بننے پر مصر ہے تو میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ خدا اس کی مدد کرے ۔ خدا نے نوع انسان کی بہبود کے لیے کچھ عظیم مقاصد ہمیں تفویض کئے ہیں - جرمنی ان مقاصد کی تکمیل میں ہمارا دوست اور شریک بن جائے گا ۔"

اس مرحلے میں فرانس بھی نوآبادیوں کی لوٹ میں سرگرم رہا ۔ ۱۸۸۰ء سے پہلے صرف سینیگل اور دریائے گیبون کے دہانے پر فرانس کا قبضہ تھا ۔ ۱۸۸۰ء کے بعد فرانس نے کانگو کے شمالی علاقے پر قبضہ جمالیا ۔ داہومے اور پورٹو نوو پر سرداری قائم کی - آئیوری کوسٹ پر قبضہ کیا اور گنی پر بھی غلبہ حاصل کر لیا ۔ ساحلی علاقوں پر قابض ہونے کے بعد فرانس نے اندرونی علاقوں کی طرف بڑھنا شروع کیا اور صحارا کے تقریباً تمام علاقے پر اپنی سرداری قائم کر لی ۔ اس علاقے میں فرانس کا خاص مقابلہ برطانیہ سے تھا۔ ۱۸۹۸ء میں بورگو کے مسئلہ نے نازک صورت اختیار کر لی اور ان دونوں طاقتوں کے درمیان جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی ۔ آخر ایک معاہدہ کی رُو سے بورگو فرانس

اور برطانیہ کے درمیان تقسیم کر لیا گیا۔

مشرقی افریقہ کی تقسیم بھی تقریباً اُسی وقت ہوئی جبکہ مغربی افریقہ تقسیم کیا گیا۔ ۱۸۸۴ء سے پہلے موزمبیق پر پرتگال کا قبضہ تھا اور وہاں کی سرحدیں بھی متعین نہیں تھیں موزمبیق کے شمال کا تمام علاقہ زنجبار کے مسلمان سلطان کی سلطنت میں شامل تھا۔ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں جرمنی کے پیٹرز اور فیل نے ایک کمپنی بنائی اور خفیہ طور پر زنجبار پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے ایک جرمن تاجر کی حمایت اور مدد حاصل کر لی۔ وہ مشرقی ساحل پر اترے۔ اندرونی علاقوں میں پہنچے اور دس دن کے اندر اسیگوہا، نگورو، اُساگرا اور اکامی کے بادشاہوں سے معاہدے کر کے اُن کے علاقوں پر کمپنی کا تحفظ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی جرمنی نے اس علاقہ کو جو بعد میں ٹنگانیکا کہلایا اپنے تحفظ میں لے لیا۔

جرمنی کے اس غاصبانہ اقدام نے برطانیہ اور فرانس کو چوکنا کر دیا۔ کینیا میں امپیریل برٹش ایسٹ افریقہ کمپنی کا نمائندہ، جانسٹن پہلے ہی سرگرم عمل تھا۔ فرانس بھی مشرقی افریقہ کے علاقوں کا حصہ دار بننا چاہتا تھا۔ اگر مہم جو افراد اور تجارتی کمپنیوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تو تنازعہ کا امکان تھا اس لیے مناسب یہی تھا کہ حکومتوں کے نمائندے معاملات طے کریں۔ چنانچہ برطانیہ فرانس اور جرمنی نے مشرقی افریقہ کے حصے بخرے کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ سب سے پہلے تو اس کمیشن نے اس مسئلہ پر غور کیا کہ آیا مشرقی افریقہ زنجبار کی سلطنت میں شامل ہے یا نہیں۔ ۱۸۸۶ء میں کمیشن نے یہ فیصلہ کیا کہ زنجبار کی سلطنت پمبا اور زنجبار کے جزیروں اور ایک ہزار میل لمبے اور دس میل چوڑے ساحلی علاقہ پر تسلیم کی جائے اور بقیہ سارا مشرقی افریقہ آپس میں تقسیم کر لیا جائے۔ یہ تقسیم اس طرح ہوئی کہ جنوب کے چھ سو میل جرمنی کے حصے میں آئے، شمال کے چار سو میل برطانیہ کو دیئے گئے۔ اور وکٹوریہ جھیل تک کا اندرونی علاقہ برطانیہ اور جرمنی نے آپس میں نصف نصف تقسیم کیا۔ فرانس کے حصہ میں مڈغاسکر کا بڑا جزیرہ آیا۔ ۱۸۹۰ء میں جرمن پیٹرز نے مسلمانوں کی بغاوت کچلنے کے لئے یوگنڈا کے بادشاہ کی مدد کی اور اس کے علاقہ پر قبضہ کر لیا لیکن جرمنی نے ہیلی گولینڈ کے بدلے یوگنڈا، وٹو، نیاسالینڈ اور اشانتی کے افریقی علاقے برطانیہ کو دے دیئے۔ بعد میں جرمنی نے زنجبار سے افریقہ کا ساحلی علاقہ دس لاکھ ڈالر کے بدلے خرید لیا۔

افریقہ کے مشرقی علاقے کی نوآبادیاتی تقسیم میں اٹلی بھی کسی سے پیچھے رہنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۸۹ء میں اٹلی کے وزیر اعظم کرسپی نے سومالیہ کو منتخب کیا۔ اس علاقہ پر زنجبار کے سلطان کی سرداری چلی آتی تھی۔ اس لیے اٹلی کے وزیر اعظم نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے سالانہ کے حساب سے سومالیہ کو کرایہ پر لے کر مسٹر فلونارڈی کی کمپنی کے حوالے کر دیا۔ یہ کمپنی سرکاری مالی امداد کے باوجود چند سال میں دیوالیہ ہو گئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایک دوسری کمپنی کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ محصول وصول کرے اور معدنیات تلاش کرے۔ اس کمپنی کو محصول و معدنیات کی آمدنی کے علاوہ دو لاکھ لیرا سالانہ کی مالی امداد بھی دی گئی۔ لیکن سومالیہ میں سوائے ریت کے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس طرح یہ نوآبادی اٹلی کو بہت مہنگی پڑی۔ سلطان کو ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے سالانہ کرایہ، کمپنی کو دو لاکھ لیرا سالانہ کی امداد ــــ اور آمدنی صفر یعنی اطالوی عوام کو بیوقوف بنانے اور نجی سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے سومالیہ حاصل کیا گیا تھا۔

لیکن اٹلی سے پہلے ہی کچھ دوسرے سامراجی ملک کر چکے تھے۔ انہوں نے بھی سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچانے کے لیئے نوآبادیاتی مہمات پر سرکاری روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا اور نوآبادیوں سے اگر کسی کو فائدہ پہنچا تھا تو وہ صرف سرمایہ دار تھے۔ عام آدمی کے لئے تو صرف

یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک ایسی قوم کا فرد ہے جو دور دراز کے ملکوں پر حکومت کرتی ہے۔ سرمایہ دار جب نجی کمپنیوں سے منافع اور سرکاری امداد سے اپنا پیٹ بھر لیا تو ۱۹۰۵ء میں اس علاقہ کی ذمہ داری اطالوی حکومت کو منتقل کر دی گئی۔ یہ بھی کوئی انوکھی بات نہیں تھی ہندوستان کا بھی اور دوسری نو آبادیات میں اس سے قبل یہی ہوا تھا کہ پہلے کمپنیوں اور نجی اداروں نے خوب خوب لوٹا اور پھر اپنی حکومتوں کو اختیارات منتقل کر دیئے۔

افریقہ کی سرزمین کو یورپ کے سامراجی فتح نہیں کر رہے تھے بلکہ دغا اور فریب کے ذریعے آپس میں تقسیم کر رہے تھے۔ لاکھوں مربع میل کے علاقے صرف چند تحفوں یا سکوں یا محض نشانِ انگشت کے ذریعے حاصل ہو رہے تھے۔ لٹنے والوں کی طرف سے مزاحمت کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن حبشہ نے ۱۸۹۶ء میں اٹلی کے جارحانہ حملہ کا منہ توڑ جواب دے کر ایک مثال قائم کر دی۔ اس زمانے میں حبشہ پر شاہ مینیلک کی حکومت تھی۔ اٹلی نے حبشہ سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے بمقام اُسیالی ایک معاہدہ کیا۔ دوستی کے اس معاہدہ کی تاویل اٹلی کے سامراجی وزیر اعظم کرسپی نے اس طرح کی کہ گویا حبشہ نے اٹلی کی حفاظت میں رہنا منظور کر لیا ہے۔ کرسپی کی اس تاویل نے شاہ مینیلک کے شبہات کو تقویت بخشی اور انہوں نے ۱۸۹۳ء میں اسیالی کا معاہدہ منسوخ کر دیا۔ فرانس نے اٹلی اور حبشہ کے مناقشہ سے فائدہ اٹھایا۔ فرنچ فوجی افسروں نے حبشہ کی فوجوں کو تربیت دی اور فرانس نے جدید اسلحہ بھیجے، لیکن اس کے بدلے میں ایک فرانسیسی کمپنی نے فرانسیسی سرمایہ کے بندرگاہ جبوتی سے وادئ نیل تک ریل بچھانے کے حقوق حاصل کر لیے۔ اٹلی یہ سب خاموشی سے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۵ء میں اطالوی فوجوں نے اریٹریا سے ملحقہ ابی سینیا (حبشہ) کے تگرے صوبہ پر قبضہ کر لیا۔ شاہ مینیلک نے اٹلی کی اس جارحیت کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے فوجی تیاریاں کرتا رہا۔ اس خاموشی کو اٹلی نے حبشہ کی کمزوری پر محمول کیا اور مارچ ۱۸۹۶ء میں حبشہ پر حملہ کر دیا۔ یکم مارچ کو اڈووا کے مقام پر حبشہ کی فوج کے ہاتھوں اطالوی حملہ آوروں کو شکستِ فاش ہوئی۔ اس شکست سے اٹلی پر مایوسی چھا گئی۔ کرسپی کی کابینہ کو مستعفی ہونا پڑا اور اٹلی نے سینیا کی فتح کا ارادہ ترک کر دیا۔

یوں تو افریقہ کی تقسیم میں یورپ کی چھوٹی بڑی سبھی طاقتیں شریک ہونا چاہتی تھیں لیکن بڑی سامراجی طاقتوں کے نو آبادیاتی سپنے بھی بڑے تھے۔ برطانیہ چاہتا تھا کہ قاہرہ سے کیپ ٹاؤن تک شمالاً جنوباً افریقہ پر قبضہ کر کے ان دونوں شہروں کو ایک ریلوے لائن سے جوڑ دے اور فرانس کی یہ خواہش تھی کہ غرباً شرقاً بحر اطلانتک سے بحر قلزم تک اور شمالاً جنوباً بحر روم سے خط استوا تک سارا افریقہ اپنے قبضے میں کر لے۔ اس علاقے کا زیادہ تر حصہ فرانس نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اگر مشرقی سوڈان، وادئ نیل اور ابی سینیا پر قبضہ ہو جاتا تو فرانس کا نو آبادیاتی سپنا پورا ہو جاتا۔ لیکن فرانس جو لکیر غرباً شرقاً کھینچ رہا تھا اس کا ٹکراؤ کہیں نہ کہیں اس لائن سے ہونا تھا جو برطانیہ شمالاً جنوباً ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ مقام جہاں ان دونوں خطوط کا ٹکراؤ ہوا فیشوڈا تھا۔

سوڈان میں انیسویں صدی کے آخری ربع میں محمد احمد نے اعلان کیا کہ وہ دورِ حاضرہ کا مہدی ہے۔ ۱۸۸۱ء میں مہدی نے اپنے وطن سے مصریوں کو نکالنے کی مہم کا آغاز کیا۔ مصر نے اس بغاوت کو کچلنے کے لئے جو فوج بھیجی وہ مہدی کے آگے نہ ٹھہر سکی اور اسے شکستِ فاش ہوئی اور مصر ۱۸۸۲ء میں برطانوی فوجوں نے مصر پر قبضہ کر لیا اور سوڈان برطانیہ و مصر کی مشترکہ ملکیت قرار پایا۔ جنرل گورڈن کی

[illegible] برطانوی فوج موجود تھی یہ فوج تعداد میں کم تھی۔ ۲۵ جنوری ۱۸۸۵ء کو مہدی کے درویشوں نے خرطوم فتح کر لیا اور جنرل گورڈن مارا گیا لیکن برطانیہ نے چند سال تک سوڈان میں کوئی کارروائی نہیں کی۔ برطانیہ فی الحال سوڈان میں اپنی طاقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن ڈر تھا کہ کہیں فرانس ابی سینیا پر قبضہ کر کے سوڈان پر پیش قدمی نہ کرے۔ اس لیے برطانیہ نے ابی سینیا پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں اٹلی کی حوصلہ افزائی کی۔ لیکن اٹلی کی فوج کشی کا جو حشر ہوا وہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ اب صرف برطانیہ اور فرانس ہی میدان میں رہ گئے تھے۔ اڈوا میں اٹلی کی شکست کے فوراً بعد مصر میں فوجوں کے کمانڈر لارڈ کچنر کو احکام موصول ہوئے کہ وہ سوڈان میں ڈونگولا پر قبضہ کر لے۔ ادھر فرانس بھی غافل نہیں تھا۔ فرانسیسی حکمرانوں نے کیپٹن مرچانڈ کو حکم دیا کہ وہ فرنچ کانگو سے ایک جمعیت لے کر نیل کی وادی میں پہنچ جائے۔ اس کے ساتھ ہی فرانس کے دو فوجی افسروں کو حکم دیا گیا کہ وہ ابی سینیا سے اپنی جماعتیں لے کر وادی نیل میں کپتان مرچانڈ سے جا ملیں۔ ۱۰ جولائی ۱۸۹۸ء کو مرچانڈ نیل کے کنارے فیشودا کے گاؤں پہنچ گیا اور وہاں اس نے فرانسیسی جھنڈا نصب کر دیا۔ لیکن ابی سینیا سے فرانسیسی کمک نہ پہنچ سکی تاہم مرچانڈ فیشودا میں ٹھہرا رہا اور اس نے مقامی سرداروں سے معاہدہ کر کے نیل کے بائیں کنارے کے علاقہ پر فرانسیسی تحفظ کا پروانہ حاصل کر لیا۔

ادھر لارڈ کچنر درویشوں سے لڑنے میں مصروف رہا۔ ستمبر ۱۸۹۸ء کو بمقام ام درمان کچنر نے درویشوں کو شکست فاش دی۔ بیس ہزار درویش قتل کئے اور گورڈن کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے مہدی کی قبر سے لاش برآمد کی اور اس کی خاک فضا میں بکھیر دی۔ جب کچنر کو معلوم ہوا کہ فرانس کی ایک جمعیت نے جنوبی نیل کے علاقے پر قبضہ کر لیا ہے تو وہ ایک فوج لے کر فیشودا پہنچ گیا۔ اگر وہ چاہتا تو مرچانڈ اور اس کی جمعیت کو ختم کر دیتا لیکن ڈر تھا کہ کہیں برطانیہ اور فرانس میں جنگ نہ چھڑ جائے اس لئے مناسب یہی سمجھا کہ دونوں ملکوں کی حکومتوں کو صورت حال سے آگاہ کیا جائے۔ برطانوی اور فرانسیسی حکومت کے درمیان جو مذاکرات ہوئے ان کے نتیجہ میں مرچانڈ کو فیشودا خالی کرنا پڑا۔ دراصل بات یہ تھی کہ سوڈان کے معاملہ میں برطانیہ جنگ کے لئے تیار تھا اور فرانس کے نزدیک جنوبی سوڈان کے لئے برطانیہ سے جنگ مول لینا ایک مہنگا سودا تھا۔ فیشودا کا خطرہ ٹلنے کے بعد ۱۸۹۹ء میں ایک معاہدہ کے ذریعے فرانس اور برطانیہ نے سوڈان اور مشرقی افریقہ کے متعلق معاملات طے کر لیے۔ اس معاہدہ کی رو سے مصری سوڈان اور بحرالغزل کے علاقے برطانیہ کو مل گئے لیکن فرانس کو اس علاقہ میں تجارتی راہداری کی مراعات مل گئیں۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ نے یہ منظور کر لیا کہ فرانس ودائی، وسطی سوڈان، مغربی سوڈان اور صحارا کو اپنے حلقۂ اثر میں رکھ سکتا ہے۔

جنوبی افریقہ میں سفید اقوام کے عمل دخل کی تاریخ بقیہ افریقہ سے زیادہ پرانی ہے۔ ۱۶۵۲ء میں راس امید کے نزدیک ولندیزی ملاحوں نے کیپ ٹاؤن کا بندرگاہ کو آباد کیا تھا۔ ابتدا میں اس بندرگاہ کا مقصد صرف اتنا تھا کہ مشرقی مجمع الجزائر جانے والے ولندیزی جہازوں کو ٹھہرانے اور انھیں ایندھن اور رسد فراہم کرے۔ رفتہ رفتہ یہاں ولندیزی کسان (ولندیزی زبان میں کسان کو بوئر Boer کہتے ہیں) بھی آباد ہونے لگے وہ زمین کے بڑے بڑے قطعات پر حبشی غلاموں کی مدد سے کھیتی کرنے لگے۔ جنوبی افریقہ کی معتدل آب و ہوا یوروپ کے نوآبادکاروں کے لئے بہت مناسب تھی۔ ۱۶۹۰ء میں شاہ لوئی کے ظلم سے ہیوگناٹ فرانسیسی ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے انھوں نے جنوبی افریقہ میں پناہ لی اور وہ ولندیزی نوآبادکاروں میں گھل مل گئے۔ ۱۸۰۶ء میں نپولین کے خلاف جنگ کے دوران ایک برطانوی بحری بیڑہ راس امید پہنچا اور ساحل کے چند مقامات پر قابض ہو گیا۔ یہ گویا برطانوی اقتدار قائم کرنے کی طرف پہلا قدم تھا۔

۱۸۲۰ء میں پانچ ہزار برطانوی نوآبادکار جنوبی افریقہ پہنچے۔ وہ کیپ کالونی کے مشرقی ساحل پر آباد ہونا چاہتے تھے۔ لیکن یہاں انھیں

سیاہ فام قوموں سے کتنی جنگیں لڑنی پڑیں اور وہ انھیں ختم کرنے کے بعد ہی اطمینان کا سانس لے سکے۔ جنوبی علاقوں میں برطانوی اقتدار سے ولندیزی کسان خوش نہیں تھے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ برطانیہ نے غلامی کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ وہ کیپ کالونی چھوڑ کر شمالی علاقوں کی طرف چلے گئے اور وہاں ٹرانسوال اور آرینج فری سٹیٹ کی نوآبادیاں بنالیں۔

۱۸۷۰ء میں سیسل رہوڈز جنوبی افریقہ میں وارد ہوا۔ یہ ایک انگریز نوجوان تھا جسے اس کے پادری باپ نے اس لئے بھیجا کہ انگلینڈ کی سرد آب و ہوا میں اسے دق ہو جانے کا خطرہ تھا۔ بعد میں یہی نوجوان افریقہ کے سونے اور ہیروں کی کانوں کا مالک بنا اور جنوبی و شمالی رہوڈیشیا کی برطانوی نوآبادیات کا بانی کہلایا۔ اس نے اپنی بے حساب دولت برطانوی سامراج کی ترقی اور وسعت کے لئے استعمال کی اور اس کے عوض برطانوی سامراج نے رہوڈز کی دولت میں اضافہ کیا۔ رہوڈز ایک سرمایہ دار اور سامراجی فلسفی تھا۔ اس نے خدا کا تصور اپنے پادری باپ سے وراثت میں پایا تھا۔ لیکن یہ خدا نہ تو حضرت عیسیٰ کا خدا تھا اور نہ ہی ایک معمولی اور سیدھے سادے پادری کا خدا تھا۔ یہ تو سامراج پرست رہوڈز کا خدا تھا جس کے مقاصد بھی سامراجی تھے۔ رہوڈز کے بقول خدا نے یہ کائنات اس لیے پیدا کی ہے کہ "تدریجی ارتقا ایک بہتر انسانی نسل کو وجود میں لائے۔" اور یہ بہتر نسل اینگلو سیکسن نسل ہی ہو سکتی تھی۔ اس لئے دنیا پر اینگلو سیکسن نسل کا غلبہ اور برتری قائم کرنا گویا خدا کے مقدس مقصد کی تکمیل کے مترادف تھا۔ اس طرح رہوڈز نے سامراجیت کو مذہب اور قومیت کے نظریات سے مسلح کر دیا۔ دیگر سامراج پرستوں کی طرح رہوڈز کا مسلک بھی یہ تھا کہ پس ماندہ اور وحشی قوموں کو تہذیب سے آشنا کیا جائے اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے ایک سوچے سمجھے پروگرام پر عمل کیا جائے۔ وہ مغلوب قوموں کا خیر خواہ تھا لیکن اس کی خیر خواہی میں بھی سامراجی استحصال شامل تھا۔ اس کا یہ قول ساری دنیا میں مشہور ہے کہ "محض خیر اپنی جگہ اچھی چیز ہے لیکن خیر مع پانچ فیصد شرح سود اس سے کہیں زیادہ اچھی چیز ہے۔" سیسل رہوڈز کا سامراجی خواب بہت شاندار اور عظیم تھا وہ ساری دنیا پر برطانوی غلبہ کا خواہاں تھا اس مقصد کی تکمیل کے لیے ابتدائی پروگرام یہ تھا کہ راس امید سے وسطی افریقہ تک کا علاقہ برطانیہ کے زیر نگیں کر لیا جائے۔ کیپ کالونی کے شمال میں بیشوانا لینڈ کا خشک علاقہ سیسل رہوڈز کے سامراجی عزائم کا پہلا شکار بنا۔ اس کے جوڑ توڑ اور پروپیگنڈے سے مجبور ہو کر ۱۸۸۵ء میں برطانیہ نے ایک فوج بھیجی اور بیشوانا لینڈ پر قبضہ کر لیا۔ اس علاقہ کے شمال میں ایک بلند پلیٹو واقع تھا۔ جس کی آب و ہوا معتدل اور زمین زرخیز تھی۔ اس علاقے پر ماسون قبیلہ کے سردار شاہ لوبنگولا کی حکومت تھی۔ رہوڈز نے بنگولا کے دربار میں رڈ، میگوئر اور تھامپسن نامی تین نمائندے بھیجے۔ ان لوگوں نے ایک ہزار رائفل، ایک ہزار کارتوس اور ایک سو پاؤنڈ فی ماہ کے بدلے بنگولا کی سلطنت میں معدنیات نکالنے کے حقوق حاصل کر لیے۔ بعد میں جب بنگولا کو معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے تو اس نے ملکہ وکٹوریہ کو ایک خط لکھوایا جس میں امر واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"کچھ عرصہ پہلے چند لوگ میرے پاس آئے جن میں سے ایک کا نام رڈ تھا۔ انہوں نے مجھ سے ایک ایسی جگہ دینے کو کہا جہاں سے وہ سونا حاصل کر سکیں اور یہ وعدہ کیا کہ وہ اس کے عوض مجھے کچھ چیزیں دیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ چیزیں لاؤ جو تم مجھے دو گے اور میں وہ چیز دکھاؤں گا جو میں تمھیں دوں گا۔ اس مرحلہ پر وہ میرے دستخط کرانے کے لیے ایک لکھا ہوا کاغذ لے آئے۔ میں نے پوچھا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس میں وہ لکھا ہوا ہے جو میں نے کہا ہے اور وہ بھی جو انہوں نے کہا ہے۔ میں نے کاغذ پر اپنا نشان انگشت ثبت کر دیا۔

تین ماہ بعد میں نے وہاں سے فرماتے سے سنا کہ اس کا فخر یا انگوٹھا لگا کر میں نے اپنی سلطنت کے تمام معدنیات پر ان لوگوں کا حق تسلیم کر لیا ہے۔

بیگولا کی یہ فریاد کسی نے نہیں سنی اور دوسرے سامراج پرستوں کی طرح رہوڈز نے بھی اس معاہدہ کی یہی تاویل کی کہ بیگولا نے اپنا ملک برٹش ساؤتھ افریکہ کمپنی کے حوالے کر دیا ہے۔ ۲۹ اکتوبر ۱۸۸۹ء کو ملکہ وکٹوریہ نے بیگولا کے ملک (جو بعد میں جنوبی رہوڈیشیا کہلایا) پر حکومت کے تمام اختیارات دے دیئے۔ اس کے بعد رہوڈیشیا کی حدیں وسیع ہوتی گئیں۔ نیاسا جھیل کے آس پاس کا علاقہ نیاسالینڈ کہلایا اور شمالی علاقے کو شمالی رہوڈیشیا کا نام دیا گیا۔

ٹرانسوال اور آرینج فری اسٹیٹس کی بوئر ریاستوں کو برطانوی نوآبادیات کا حصہ بنانے کے لئے رہوڈز نے جو کوششیں کیں وہ ناکام ہو گئیں۔ در اصل بات یہ تھی کہ یہاں اسے سیاہ فام وحشیوں سے نہیں بلکہ سفید فام ولندیزیوں سے واسطہ تھا۔ دسمبر ۱۸۹۵ء میں رہوڈز کے ساتھی جیمسن نے پانچ سو آدمیوں کی جمعیت لے کر جوہنسبرگ پر حملہ کیا۔ ۲ جنوری ۱۸۹۶ء کو تھوڑی بہت لڑائی کے بعد جیمسن اور اس کے ساتھی گرفتار کر لئے گئے۔ اس واقعہ کے بین الاقوامی اثرات خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ کیونکہ جرمنی علانیہ بوئر ریاستوں کی حمایت کر رہا تھا۔ اس حملہ کے نتیجے میں ولندیزیوں اور انگریزوں کے درمیان دشمنی شدید ہو گئی اور ولندیزی حکمرانوں نے برطانوی تاجروں صنعت کاروں اور کان کنوں کا قافیہ تنگ کر دیا۔ ٹرانسوال میں برطانوی اور دیگر سفید فام نوآبادکاروں کی تعداد ایک لاکھ اسی ہزار تھی لیکن بوئر ولندیزیوں کی تعداد صرف اسی ہزار تھی۔ اس کے باوجود عنانِ حکومت ولندیزیوں کے ہاتھوں میں تھی اور انہوں نے دیگر سفید فام باشندوں کو سیاسی حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔ برطانیہ یہ صورت حال زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جنوبی افریقہ میں برطانوی سفیر سر الفریڈ ملنر یہ چاہتا تھا کہ فوجی کارروائی کے ذریعے بوئر ریاستوں کا قصہ پاک کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء میں برطانیہ اور بوئر ریاستوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی جو ۱۹۰۲ء میں بوئر ولندیزیوں کی شکست پر ختم ہوئی۔ اس طرح راس امید سے کانگو تک کا علاقہ برطانوی نوآبادی بن گیا۔

۱۹۰۲ء تک (شمالی افریقہ کو چھوڑ کر) افریقہ سامراجی طاقتوں کے درمیان پوری طرح تقسیم ہو چکا تھا۔ اس تقسیم کا گوشوارہ مندرجہ ذیل ہے:-

نمبر شمار	سامراجی طاقت کا نام	نوآبادیات کے نام
۱	برطانیہ	سوڈان، برطانوی سومالی لینڈ، یوگنڈا، کینیا، گیمبیا، گولڈ کوسٹ، سیرالیون، نائیجیریا، ولفش کیپ کالونی، نیٹال، ٹرانسوال، آرینج فری اسٹیٹ، بسوتو لینڈ، سوازی لینڈ، بیچوانا لینڈ، نیاسالینڈ، جنوبی رہوڈیشیا، شمالی رہوڈیشیا۔
۲	فرانس	فرنچ سومالی لینڈ، مڈغاسکر، موریطانیا، صحارا، فرنچ ویسٹ افریقہ (سنیگل، مالی، گنی، آئیوری کوسٹ، دوہومے، اپر وولٹا، نائیجر) فرنچ ایکویٹوریل افریقہ (گیبون، فرنچ کانگو، وسطی افریقہ، چاڈ)۔
۳	جرمنی	ٹوگو لینڈ، کیمرون، جنوب مغربی افریقہ، ٹنگانیکا، روانڈا یورنڈی۔
۴	پرتگال	انگولا، موزمبیق، کیبنڈا، پرتگالی گنی، جزیرہ پرنسپا، جزیرہ کیپ ورڈ۔
۵	اٹلی	اطالوی سومالی لینڈ، ایریٹریا۔
۶	اسپین	اسپینی صحارا، ریو ڈی اورو۔

(باقی آئندہ)

ماں کا دل

خواجہ احمد عباس

ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔

سٹوڈیو میں حسبِ معمول ہنگامہ تھا۔ ہیرو کے سر پر نقلی بالوں کی "وگ" بٹھائی جا رہی تھی۔ ہیروئن بار بار آئینہ میں اپنی لپ سٹک کا معائنہ کر رہی تھی۔ ڈائرکٹر کبھی ڈائلاگ رائٹر سے اُلجھ رہا تھا کبھی کیمرہ مین سے۔ پروڈکشن مینجر ایکسٹرا سپلائر سے ایک کونے میں اپنی کمیشن طے کر رہا تھا۔

کیمرہ مین کے اسسٹنٹ نے روشنیوں کو کالے شیشے میں سے دیکھ کر کیمرہ مین سے کہا۔ "شاٹ ریڈی" کیمرہ مین نے اپنے کالے شیشے میں سے سین کا معائنہ کر کے ڈائرکٹر سے چلا کر کہا: "شاٹ ریڈی"

ڈائرکٹر نے ہیرو کی کرسی کے پاس جا کر دھیرے سے کہا۔ "شاٹ ریڈی"۔

ہیرو نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کا کش لیا، پھر دو آئینوں میں اپنے سر کو آگے پیچھے سے دیکھا، وگ کو دو تین بار تھپ تھپایا، نقلی بالوں کی ایک لٹ کو ماتھے پر گرایا اور کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی طرف دیکھ کر (جو ڈائلاگ کا فائل لئے کھڑا تھا) ہیرو نے پوچھا: "پکچر کون سی ہے؟"

"ماں کا دل"

"سین کون سا ہے؟"

"جی یہ وہ بچے والا سین ہے"

"بچے والا سین؟ مگر اس فلم میں تو میری شادی ہی نہیں ہوتی۔ بچہ کیسے ہو گیا؟"

"جی نہیں یہ آپ کا اپنا بچہ نہیں ہے۔ راستہ چلتے آپ کو ایک لاوارث بچہ مل جاتا ہے، بچے کو دیکھ کر آپ کو اپنا بچپن یاد آجاتا ہے، اپنی ماں یاد آجاتی ہے، آپ بچے کو گود میں اٹھا لیتے ہیں، آپ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور آپ بولتے ہیں ....."

"ہاں تو ڈائلاگ سناؤ" اور یہ کہہ کر ہیرو پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

ڈائلاگ ڈائرکٹر نے فوراً فائل کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

"یہ بچہ بھی کسی کی آنکھوں کا نور ہے ....."

ہیرو نے پوچھا: "نور؟ نور کیا ہوتا ہے؟"

ڈائلاگ ڈائرکٹر نے پنسل سے اپنا گنجا سر کھجاتے ہوئے جواب دیا: "جی۔ نور۔ نور تو بس نور ہوتا ہے۔ جیسے نور محمد، نورالحسن

وغیرہ۔ دراصل رائٹر نے نور کا قافیہ سرور سے ملایا ہے :

"پورا ڈائلاگ پڑھو :

"یہ بچہ بھی کسی کی آنکھوں کا نور ہے کسی کے دل کا سرور ہے، اگر آج یہ بھوکا ہے۔ مجبور ہے تو یہ سماج کا قصور ہے۔ کل یہی بچہ بڑا ہو کر ڈاکٹر، وکیل یا لیڈر بن سکتا ہے . . . ."

"یہ سب کیا بکواس ہے ؟" ہیرو نے کہا۔ اور پھر ڈائرکٹر کی طرف مخاطب ہو کر "اتنا بڑا ڈائلاگ مجھے یاد بھی نہیں ہوگا"۔

ڈائرکٹر نے کہا "مجھے بھی ڈائلاگ ضرورت سے زیادہ لمبا لگتا ہے" اور پھر ڈائلاگ ڈائرکٹر سے "کمار صاحب جیسا کہتے ہیں اسے چھوٹا کر دو۔"

ڈائلاگ ڈائرکٹر نے ڈائلاگ کے پورے صفحے پر نیلی پنسل سے کانٹے کا نشان بناتے ہوئے کہا "کمار صاحب آپ ہی بتائیے نا"۔

ہیرو نے سوچ کر کہا۔ "تو لکھو۔ یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے . . . . ."

"جی ؟ آگے ؟"

"بس اور کچھ نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے۔ یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے"۔

ڈائلاگ ڈائرکٹر نے ایک بار پھر وہی الفاظ دہرائے "یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔ واہ واہ کیا بات کہی ہے۔ کمار صاحب آپ کو تو رائٹر ہونا چاہئے تھا"۔ اور پھر ڈائرکٹر سے مخاطب ہو کر "سر یہ تو بچے کا تھیم ڈائلاگ ہوگیا"۔

"تو پھر چلیے شاٹ تیار ہے" ڈائرکٹر نے ہیرو کو اشارہ کیا۔ اور جیسے ہی ہیرو اپنی کرسی سے اٹھا اور سب بھی کھڑے ہوگئے۔

"بچہ لاؤ" پہلے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی آواز گونجی۔

"بچہ لاؤ" دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا۔

"بچہ لاؤ" تیسرے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے آواز دی۔

"سپلائر !" پروڈکشن مینیجر نے نعرہ لگایا "بچہ کہاں ہے ؟"

"مسٹر جانسن" ایکسٹرا سپلائر چلّایا۔

ایک موٹی تازی اینگلو انڈین عورت جو نہ جوان تھی نہ بوڑھی آگے بڑھی۔ اُس کی گود میں ایک بھورے بالوں والا گول گول چہرے گول گول آنکھوں والا بچہ تھا جو نائلون کا فراک پہنے ہوئے تھا۔

"اس کا فراک تو بہت بڑھیا لگتا ہے۔ غریب بچے کا فراک ایسا کیسے ہو سکتا ہے ؟" تیسرے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے اعتراض کیا۔ "ستیہ جیت رے کی فلموں میں دیکھئے کتنی ریالزم (REALISM) ہوتی ہے"۔

"ڈریس مین !" دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلّایا۔

"جی صاحب" ڈریس مین نے جواب دیا۔

"بچے کا فراک بدل کر دو۔ کوئی میلا پھٹا ہوا کپڑا پہنا دو" پہلے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے حکم دیا۔

زرین میم نے ایک بکسے میں ہاتھ ڈالا اور چند میلے گندے چیتھڑے لئے ہوئے بچے کی طرف بڑھا۔

بچے کی ماں نے جیسے ہی اُن گندے چیتھڑوں کی طرف دیکھا تو اُس نے جلدی سے بچے کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ "نو۔ نو۔ ہمارا بی بے ڈی پیڑا نہیں پہنے گا۔ کوئی بیماری لگ گئی تو۔۔۔۔۔"

"مگر میم صاحب دیکھئے ریالزم (REALISM) کے لیے ضروری ہے —" تیسرے اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے کہنا شروع کیا۔

بچے کی ماں بات کاٹتے ہوئے بولی "ہمارا بےبی اونلی ہائی کلاس پکچرز میں کام کرتا ہے۔ ہم پہلا ڈے سے ہی بولا تھا ہمارا بچہ پیڑا نہیں پہنے گا۔"

ڈائرکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو اشارہ کیا "رہنے دو۔ آج کل غریبوں کے بچے بھی نائلون کے کپڑے پہنتے ہیں۔"

کیمرے کے سامنے کھڑے ہوئے ہیرو نے میم صاحب کی گود کی طرف ہاتھ پھیلائے "کم آن بے بی۔"

بچہ جھک کر ہیرو کی گود میں چلا گیا سب نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ فلمی دنیا کا محاورہ ہے کہ "شوٹنگ کرتے وقت تین مصیبتیں ہیں۔ گھوڑا، کتا اور بچہ۔"

میم صاحب نے اپنے بھورے گھنے بالوں کو جھٹکی دیتے ہوئے ہیرو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "ہمارا بےبی سویٹ ہے نا؟ یہ بھی فلم کا ہیرو بنے گا۔"

کیمرہ مین نے ایک لائٹ کو بائیں سے ذرا دائیں سرکایا پھر واپس بائیں کو سرکا کر اسی جگہ رکھ دیا۔ پھر کیمرہ کی آنکھ میں جھانک کر دیکھا۔

"بس ذرا آگے۔۔۔۔ بس بس بس۔۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے۔" اور پھر چلا کر "ریڈی فار ساؤنڈ ٹیسٹ۔"

ساؤنڈ اسسٹنٹ نے مائکروفون آگے بڑھایا "کمار صاحب۔ ڈائلاگ بولیے گا ایک بار۔"

ہیرو نے مائکروفون کی طرف پیار بھری نظر سے دیکھا اور کہا "یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔"

"ہاوزدیٹ" تینوں اسسٹنٹ ایک ساتھ چلائے جیسے کرکٹ کے میدان میں کسی کھلاڑی کو L.B.W کرنے کے لیے سب فیلڈر چلا کر اپیل کرتے ہیں "ہاوزدیٹ۔"

ساؤنڈ روم سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے جواب آیا "اوکے۔ ریڈی فار ٹیک"

پہلا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا "خاموش۔"

دوسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا "سائلنس!"

تیسرا اسسٹنٹ ڈائرکٹر چلایا "بات چیت بند۔"

ڈائرکٹر نے کہا "ساؤنڈ اسٹارٹ۔"

ساؤنڈ روم سے جواب آیا "کیمرہ۔"

کیمرہ مین نے بٹن دبا کر کہا "رننگ" (RUNNIG)

ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ پھر کیمرے کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھ کر بولا "یہ بچہ بھی کسی۔۔۔۔۔"

ابھی وہ مقام طے پایا تھا کہ بچے نے ہیرو کے ماتھے پر گرے ہوئے بالوں کی لٹ پر ایک جھپٹا مارا اور "وِگ" اُس کے ہاتھ میں آگئی۔ ہیرو کی گنجی چندیا سٹوڈیو کی تیز روشنی میں چمک اُٹھی۔

ڈائریکٹر گھبرا کر چلایا "کٹ! کٹ!"

پہلا اسسٹنٹ ڈائریکٹر چلایا "کٹ اِٹ!"

دوسرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر چلایا "کٹ اِٹ!"

تیسرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر چلایا "میک اَپ۔ ہیرڈریسر کو بلاؤ۔"

تین نوجوان کالج کی لڑکیاں جو کمار کی "فین" (FAN) تھیں اور خاص طور سے اُس کی شوٹنگ دیکھنے آئی تھیں یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں کہ اُن کے محبوب ایکٹر کے سر کی چندیا بالکل صاف تھی ـــــ اور انڈے کی طرح سفید۔

"ہائے رام!" ایک نے دوسری سے کہا "یہ تو گنجا ہے!"

دوسری نے "شش شش" کر کے کہا "آہستہ بولو کہیں سُن نہ لیں۔"

کمار غصے میں سیدھا سٹوڈیو کے باہر جا چکا تھا اور اب اُس کے پرائیویٹ میک اَپ روم میں ہیرڈریسر دوبارہ اُس کی "وگ" کو فٹ کر رہی تھی۔

"اس بار میں چار ہیر کلپ لگا دیتی ہوں" تاکہ کھینچنے پر بھی وِگ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔"

مگر کمار نے غصے سے کہا "میں اُس بچے کے ساتھ کام نہیں کروں گا۔"

جب دوبارہ وِگ لگوا کر ہیرو واپس سٹوڈیو میں پہنچا تو ڈائریکٹر بے بی کی ممی سے کہہ رہا تھا "سوری میم صاحب۔ آپ کے بچے کو اب چھٹی۔ آگے کسی سین میں ہم ضرور اُس کے لئے کوئی کام نکالیں گے۔"

"دیٹس آل رائٹ THATS ALL RIGHT" میم صاحب بولیں "ہم کو معلوم ہے شوٹنگ میں ایسا گول مال ہو جاتا ہے۔ اپنے مینیجر کو بولو ہمارا چکتا کر دو۔"

پروڈکشن مینیجر نے ایکسٹرا سپلائر کو ساٹھ روپے دے کر پچھتر روپے کی رسید لی، سپلائر نے میم صاحب کو چالیس روپے دے کر پچاس کی رسید لی۔ میم صاحب بچے کو لے کر ٹیکسی میں بیٹھ ہی رہی تھیں کہ بے بی نے ایک اور جھپٹا مارا اور اپنی ماں کے سر سے اُس کی "وگ" بھی کھینچ لی۔ میم صاحب نے جلدی سے اپنے نقلی بالوں کو دوبارہ سر پہ رکھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کسی نے دیکھ تو نہیں لیا اور جب اطمینان ہو گیا تو بولیں "یو ناٹی بے بی۔ ڈرائیور ہم کو دادر سٹیشن چھوڑ دینا۔ اُدھر سے ہم بائیکلہ ٹرین میں جائے گا۔"

سٹوڈیو میں پھر ہنگامہ تھا۔

ڈائریکٹر پہلے اسسٹنٹ سے کہہ رہا تھا "دوسرا بچہ" لاؤ۔"

پہلا اسسٹنٹ پروڈکشن مینیجر سے کہہ رہا تھا "دوسرا بچہ لاؤ۔"

پروڈکشن مینیجر نے ایکسٹرا سپلائر کو کونے میں لے جا کر کہا "آج تو تیری چاندی ہو رہی ہے۔ ایک بچہ اور لے آ۔ جتنا شریر ہو اچھا ہے"

ایک دو اور بچوں کا بھی انتظام کر رکھنا۔"

اکسٹرا سپلائر پروڈیوسر کی طرف سے کر گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ایک تین چار برس کا موٹا تازہ بچہ لے کر آ گیا۔ ساتھ میں ایک کالا موٹا سا بھدا بالوں والا پہلوان نما آدمی۔ دھاریوں والی بنیان اور چار خانے کا تہمد باندھے۔

"ہم حاضر ہیں جی" پہلوان نما آدمی نے ڈائرکٹر کو ایک فوجی سلام مارتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہو؟"

"آپ نے پہچانا نہیں، میں ماسٹر گلشن ہوں۔ انڈسٹری کا پرانا آدمی ہوں۔ شہزادہ گلفام میں ولین گیا ہے۔ باغی شہزادی میں سائڈ ہیرو تھا۔ لال گھوڑا میں سائڈ ولین۔ اب بھی کیرکٹر کر لیتا ہوں۔ بولیے کیا حکم ہے؟ ہم حاضر ہیں۔"

ڈائرکٹر نے بے زار ہو کر کہا "بھئی ہمیں اس وقت صرف ایک بچے کی ضرورت ہے۔"

"بچہ بھی حاضر ہے، سرکار" یہ کہہ کر پہلوان نما آدمی نے بچے کو آگے کر دیا۔

"اسے ڈائرکٹر صاحب کو سلام کرو۔"

بچہ ہرے رنگ کی مخمل کا نیکر اور بش شرٹ پہنے تھا ہاتھ میں ایک جھنجھنا لیے ہوئے تھا مگر اس کا چہرہ بچوں جیسا نہ تھا۔ یہ لگتا تھا جیسے کسی جادوگر نے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو چھوٹے قد کا بنا دیا ہو۔ باپ کا حکم سنتے ہی اس نے بھی ایک فوجی سلام کیا اور ماتھے سے ہاتھ نہ ہٹایا جب تک باپ نے اگلا حکم نہ سنایا۔

"ابھی صاحب کو ٹوسٹ کر کے بتاؤ بیٹا۔"

اور وہ بچہ جس کا چہرہ بچوں جیسا نہیں تھا دفعتاً ٹوسٹ کرنے لگا جیسے وہ چابی والی گڑیا ہو۔

"شاباش بیٹا۔ شاباش" باپ ٹوسٹ کی لے پر تالیاں بجاتا ہوا بولا۔ بچہ تھرک رہا تھا، اپنے کولہے مٹکا رہا تھا، کبھی آگے بڑھتا تھا کبھی پیچھے ہٹتا تھا، کبھی دائیں کبھی بائیں۔

آہستہ آہستہ سیٹ پر جتنے لوگ جمع تھے وہ بچے کا ٹوسٹ ڈانس دیکھنے لگے۔ کیمرہ مین۔ اس کے اسسٹنٹ۔ لائٹوں والے چھوٹے موٹے کیرکٹر ایکٹر۔ ایکسٹرا۔

تب پروڈیوسر نے ڈائرکٹر کے کان میں کہا "یہ سب بند کرو۔ کمار جی کو دن بھر کی شوٹنگ کا دس ہزار دینا ہے اور شاٹ اب تک ایک نہیں ہوا۔"

ڈائرکٹر نے چلا کر کہا "کٹ اِٹ۔"

ٹوسٹ ڈانس کرتے کرتے بچہ ایک دم رک گیا جیسے اس کی چابی ختم ہو گئی ہو۔

ڈائرکٹر نے پہلے اسسٹنٹ کو حکم دیا "کمار جی کو بلاؤ۔"

پہلے اسسٹنٹ نے دوسرے اسسٹنٹ کو حکم دیا "کمار جی سے کہو بچہ آ گیا ہے۔ شاٹ تیار ہے۔"

تیسرا اسسٹنٹ میک اپ روم کی طرف بھاگا۔

ہیرو نے سٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی پوچھا: "بچہ کہاں ہے؟"

ہرے رنگ کی نیکر والے بچے نے ہیرو کو فوجی سلام مارتے ہوئے کہا۔

"گڈ مارننگ، ہاؤ ڈو یو ڈو؟" اور یہ کہہ کر ہیرو کی طرف دیکھ کر اتنے زور سے آنکھ ماری کہ ہیرو گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

ہیرو نے بچے سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا: "کیوں پہلوان کام کرو گے؟ گھبراؤ گے تو نہیں؟"

بچے نے تتلاتے ہوئے جواب دیا: "گھبلائیں گے تو آپ؟" اس پر ایک اور فرمائشی قہقہہ پڑا۔ اور ہیرو نے کھسیانا ہو کر پوچھا۔

"کیا اس آفت کے پرکالے کو مجھے گود میں اٹھانا ہوگا؟"

کیمرہ مین چلایا۔ "ریڈی فار ٹیک۔"

مختلف آوازیں سٹوڈیو میں گونجیں۔ "ریڈی فار ٹیک۔ آل لائٹس۔ میک اپ ہیر ڈریسر۔ ساؤنڈ ٹسٹ۔"

ہیرو نے کہا: "ٹھیرو بھائی۔ پہلے میں اس پہلوان کو اٹھا کر دیکھتا ہوں۔"

ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھا تو لیا لیکن بچہ پتھر کا بنا ہوا تھا ہیرو ہانپنے لگا۔

"ساؤنڈ اسٹارٹ۔" ڈائرکٹر نے آواز دی۔

"کیمرہ"۔ ساؤنڈ ریکارڈسٹ کی آواز آئی۔

"رننگ!" (RUNNIG) کیمرہ مین نے اعلان کیا۔

ہیرو نے بچے کی طرف پیار بھری آنکھوں سے دیکھا۔ بچے نے آنکھ ماری۔ ہیرو کی زبان سے نکلا: "یہ بچہ بھی ..... یہ بچہ بھی ....."

اور پھر اس کے بجائے بچہ بولا: "کیوں بیٹا ڈائلاگ بھول گئے نا؟"

ہیرو کو ایسے لگا جیسے اس کی گود میں آدمی کا بچہ نہ ہو کسی راکشس کا بچہ ہو اور اس نے "کٹ اٹ" کہہ کر بچے کو اس کے باپ کی طرف پھینکا۔

اور سو پہلوان صاحب بھی دس دس روپے کے کچھ نوٹ جیب میں ڈال بچے کا ہاتھ پکڑے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

تیسرا بچہ لایا گیا۔ اس نے شاٹ شروع ہونے سے پہلے ہی ہیرو کے سوٹ پر پیشاب کر دیا۔ ہیرو نے کہا میں اس کے ساتھ کام نہیں کروں گا۔

چوتھا بچہ لایا گیا۔ یہ دیکھنے میں بڑا بھولا بھالا اور معصوم تھا۔ سب کو یقین تھا اب شاٹ بخیر و خوبی ہو جائے گا لیکن جیسے ہی ہیرو نے اسے گود میں لیا، بچہ پچھاڑیں کھانے لگا۔ رو رو کر آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ بچے کو ماں کی گود میں واپس دیا گیا تو فوراً چپ ہو گیا۔ دوبارہ ہیرو کی گود میں دیا تو چپکے سے چلا گیا۔ لیکن جیسے ہی کیمرہ چلنا شروع ہوا اور ہیرو نے ڈائلاگ بولا "یہ بچہ بھی ....." کہ بچے نے نہ صرف رونا شروع کر دیا بلکہ اپنے ننھے سے پاؤں سے اتنے زور کی لات ماری کہ ہیرو کی آنکھ پھوٹتے پھوٹتے بچی۔

ہیرو نے فیصلہ سنا دیا: "میں اس بچے کے ساتھ بھی کام نہیں کروں گا۔ یا تو کوئی سیدھا سادا چپ چاپ بچہ لاؤ نہیں تو میں

کینسل کرو۔ گھنٹہ بھر میں شوٹنگ شفٹ بھی ختم ہونے والی ہے۔"

سپلائر نے کہا "اب میں گیٹ تک نیچے لاتا رہوں۔ اس طرح تو ساری ممبئی کے بچے ختم ہو جائیں گے۔"

پروڈکشن مینیجر نے کہا "تجھے کیا؟ تیری تو چاندی ہو رہی ہے ......"

"اور تمہاری نہیں؟" سپلائر نے چڑ کر کہا۔

"اچھا بھئی ہم دونوں کی۔ اب ایک چپ چاپ سا بچہ سے آکہیں سے۔"

"میں تو جتنے فلمی بچوں کو جانتا ہوں سب کو لے آیا۔ ہر ماں اپنے بچے کو فلم میں کام کرنے نہیں بھیجتی۔ یہی دو چار لوگ ہیں جو اپنے بچوں کا دھندا کرتے ہیں۔"

"ارے بھئی پیسوں کی خاطر کوئی بھی اپنے بچے کا دھندا کر سکتا ہے۔"

یہ بات کرتے کرتے وہ سٹوڈیو کے باہر مل آئے تھے جہاں ایک بھنگن سڑک پر جھاڑو دے رہی تھی۔

"اری ذرا ٹھہر"۔ پروڈکشن مینیجر چلایا "سارے میں مٹی اڑا رہی ہے۔ یہ وقت ہے جھاڑو دینے کا۔ صبح سویرے کیوں نہیں جھاڑو دی؟"

"بابوجی۔ آج مجھے دیر ہو گئی تھی۔"

"دیر ہو گئی تھی تو پگھار کٹے گی۔ کوئی مفت کام کرتی ہے کیا؟"

"بابوجی" بھنگن کام بند کر کے گڑگڑاتی ہوئی بولی "میرا بچہ بیمار ہے۔"

"بیمار ہے۔ کیا بیمار ہے؟"

"بابوجی۔ پتہ نہیں کیا بیمار ہے۔ دس دن سے بخار نہیں اترا۔"

"تو پھر ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھائی؟"

"محلے کے ڈاکٹر کو دکھایا تھا بابوجی۔ دو روپے فیس بھی دی تھی۔ وہ کہیں اسے بچوں والے بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ اُن کی فیس بیس روپے ہے۔ پھر دوا انجکشن کے لیے بھی دام چاہئیں۔ اگلے مہینے کی پگھار ابھی مل جاتی تو بچے کا علاج ہو جاتا۔"

"جا بچے کو لے آ۔ اُس کے علاج کے لیے روپے مل جائیں گے۔ پورے چالیس"۔ اکسٹرا سپلائر نے پروڈکشن مینیجر کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

پروڈکشن مینیجر بولا "اری تیرے بچے کا فلم میں فوٹو آ جائے گا کماری جی کے ساتھ۔ اور پیسے بھی ملیں گے۔ جلدی سے لے آ۔"

"ابھی لاتی ہوں، بابوجی......" بھنگن نے جھاڑو ٹوکری پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر سن، بچہ روئے گا چلائے گا تو پیسے نہیں ملیں گے۔ چپ چاپ رہنا چاہیئے۔"

بھنگی سٹوڈیو کے پیچھے ہی ایک جھونپڑیوں کی بستی میں رہتی تھی، اپنی جھونپڑی میں جانے سے پہلے اُس نے پڑوسن کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔

"کیا ہے چاؤلی؟"

"بچہ بہت رو رہا ہے۔ میں ابھی کام پر جا رہی ہوں۔ وہ دوا دے دو جو تم کام پر جاتے ہوئے اپنے بچے کو دیتی ہو۔"

پڑوسن نے ایک پڑیا پکڑا دی: "بس تھوڑی سی پانی میں گھول کے دے دیجیو۔"

چاؤلی پڑیا لے کر جھونپڑے میں گئی۔ بچہ جھلنگا چارپائی پر اکیلا لیٹا رو رہا تھا۔ چاؤلی نے بیٹے کو گود میں لیا۔ بدن جل رہا تھا۔ روئے ہی جا رہا تھا۔ چاؤلی نے بھینچ کر بچے کو پیار کیا: "نا رو میرے لال۔ چل میں تجھے فلم کمپنی میں لے چلتی ہوں۔ میرا بیٹا فلم کا ہیرو بنے گا۔ پھر تجھے اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔"

"نا رو میرے لال۔ نہ رو۔" یہ کہہ کر اس نے پانی میں گھلی ہوئی کالی کالی دوا بچے کو چٹا دی۔ بچہ روتے روتے ہلکان ہو کر اب ہچکیاں لینے لگا تھا۔ ہچکیاں لیتے لیتے نڈھال ہو کر سو گیا۔ چاؤلی نے بچے کو چند چیتھڑوں میں لپیٹا اور سٹوڈیو کی طرف چل دی۔

ایکسٹرا سپلائر نے کہا: "روئے گا تو نہیں۔"

چاؤلی نے کہا: "نہیں بابو جی مزے سے سو رہا ہے۔"

ڈائرکٹر نے پوچھا: "اسے یہ رونے گا تو نہیں؟"

پروڈکشن منیجر نے کہا: "نہیں صاحب۔ بڑا شریف بچہ ہے۔ ماں کا دودھ پی کر مزے سے سو رہا ہے۔ آپ جتنے چاہے شارٹ لیجیے۔"

ہیرو نے بچے کو گود میں لینے سے پہلے پوچھا: "روئے گا تو نہیں؟"

"نہیں سرکار جی۔" ڈائرکٹر نے اسے یقین دلایا۔ "بڑا خاموش بچہ تلاش کر کے منگوایا ہے۔"

ہیرو نے بچے کو گود میں لے لیا اور سوچا: "شکر ہے اس کا وزن زیادہ نہیں ہے۔" پھر وہ بولا: "جلدی شاٹ لے لو۔ ابھی تو سو رہا ہے اٹھ گیا تو یہ بھی ناک میں دم کرے گا۔"

"ریڈی فار ٹیک۔"

"ریڈی فار ٹیک۔"

"آل لائٹس۔"

"ساؤنڈ ریڈی؟"

"شارٹ ساؤنڈ۔"

"کیمرہ۔"

"رننگ۔ کلیپ۔"

"ماں کا دل۔ سین نمبر پچپن۔ شاٹ نمبر سیون۔ ٹیک نمبر فور۔"

ہیرو نے بچے کو گود میں اٹھایا۔ اس کے چہرے کو دیکھا۔ بچہ اطمینان سے آنکھیں بند کیے سو رہا تھا۔ اس کے معصوم چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ہیرو نے کیمرہ کی طرف دیکھ کر دل کی گہرائی سے آواز نکالی: "یہ بچہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔"

شاٹ کٹ ہو گیا۔ مگر کیمرہ مین نے کہا ایک ٹیک اور چاہیے بچّے کے چہرے پر روشنی ٹھیک نہیں پڑ رہی تھی۔

ایک اور بار شاٹ دہرایا گیا۔ ایک بار پھر ہیرو نے کہا: "یہ بچّہ بھی کسی ماں کا دل ہے۔"

اُسی وقت ایک ہوائی جہاز سٹوڈیو کے اوپر سے گونجتا ہوا گزر گیا لاؤڈ سپیکر میں سے ساؤنڈ ریکارڈسٹ کی آواز آئی۔ "کٹ کٹ۔ ہوائی جہاز۔"

کسی نہ کسی وجہ سے تین بار اور شاٹ دہرایا گیا۔ ٹیک نمبر نو کو "او کے" کیا گیا۔

ہیرو نے بچہ پروڈکشن منیجر کے حوالے کیا۔ بچّہ اب تک سو رہا تھا۔

پروڈکشن منیجر نے بچّہ ایکسٹرا سپلائر کی گود میں دیا۔

ایکسٹرا سپلائر نے چاؤلی کی گود میں بچّہ دیا اور ساتھ ہی چالیس روپے دے کر اس سے پچھتّر روپے کی رسید پر انگوٹھا لگوا لیا۔

"جا اب اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا اور اچھی طرح علاج کروا۔"

"بابو جی۔ سیدھی وہیں جاتی ہوں ٹیکسی کر کے۔ آپ کی کرپا سے اِس کا اِلاج ہو جائے گا۔ آپ کے بچّے جئیں۔"

بچّوں کے سپیشلسٹ ڈاکٹر کے سیکرٹری نے پہلے فیس لے لی پھر ڈاکٹر نے بچّے کا معائنہ کیا۔

"مگر یہ تو مر چکا ہے۔" ڈاکٹر نے ہاتھ لگاتے ہی کہا اور چاؤلی کو ایسے لگا جیسے اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک دم اندھیرا چھا گیا ہے۔

پھر بھی وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی: "ڈاکٹر صاحب کیا ہوا میرے لال کو۔ اسے تو صرف بخار آ رہا تھا!"

"بخار سے نہیں لگتا ہے تمہارا بچّہ زہر سے مرا ہے۔ کیا دیا تھا اِسے کھانے کو؟"

"کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب ذرا سی افیم دی تھی چپ کرنے کو۔"

.. ..

سال بھر بعد "ماں کا دل" کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک بڑے نیتا نے تقریر کرتے ہوئے کہا: "میں اس فلم کے پروڈیوسر، ڈائرکٹر، ہیرو اور ہیروئن کو مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کی فلم میں سچ مچ ایک ہندوستانی ماں کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔"

تبصرے

۴۲ نظمیں از کلیم الدین احمد

کلیم الدین احمد اُردو کے مشہور نقاد ہیں اور اب وہ شاعر کے رُوپ میں بھی سامنے آئے ہیں۔ اُن کی مشہور کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" نہایت دلچسپ تنقیدی کتاب ہے۔ انہوں نے اگرچہ غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیا اُس کی ریختگی اور انتشار کو بھی واضح کیا ہے اور نظم نگاری کے مستقبل کو درخشاں کہنے کی کوشش کی ہے اگرچہ کتاب کے آخر پر یہ "مستقبل الغین" تاریک ہی نظر آیا ہے۔ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ مستقبل تاریک ثابت نہیں ہوا اور کلیم الدین احمد (معلوم نہیں وہ سال بعد کی اُردو شاعری سے خوش ہیں کہ نہیں) کی خواہشات بہت حد تک بروئے کار آچکی ہیں۔ اپنی تنقیدی کتاب میں جو ایک لحاظ سے قدرے سنسنی خیز بھی تھی انہوں نے یہ تحریر فرمایا تھا:-

"اُردو شاعری نے فارسی کے سایہ میں پرورش پائی۔ اس ابتدائی اثر کا نتیجہ تاسف خیز نہ ہوتا اگر اردو شاعری اپنی ترقی کے اوّل مدارج طے کرنے کے بعد اس اثر سے آزاد ہو کر اپنی دنیا الگ ایجاد کر لیتی لیکن یہ آزادی اُس کی قسمت میں نہ تھی۔ اسے کورانہ تقلید ایسی پسندِ خاطر ہوئی کہ یہ ہمیشہ کے لیے لکیر کی فقیر بن گئی۔ فارسی بحور اور قواعدِ عروض کے اتباع کا تو نتیجہ معلوم تھا ہی استعجاب تو اس پہ ہے کہ کبھی ان بحور و قواعد میں کسی کو تغیر یا اضافہ کا خیال بھی نہ ہوا۔ اسی ناموزوں اور بے جا افتادِ طبیعت نے مختلف بندشوں اور جملہ مضامین کو بھی فارسی سے اخذ کرنے پر آمادہ کیا اور دفعتاً وہی فرسودہ خیالات اور پرانے الفاظ و نقوش اُردو شاعری کا سنگِ بنیاد بن گئے۔"

یہ باتیں ایک طرح سے درست ہیں بھی اور نہیں بھی۔ اُردو کی تخلیقی نظموں اور غزلوں میں فارسی شاعری کا تتبع اس طرح ہُوا ہے کہ پرانے مضامین نیا ڈھنگ روپ لے کر سامنے آئے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ غالبؔ نے فارسی شاعری سے تخلیقی استفادہ نہیں کیا؟ مگر پھر بھی کلیم الدین احمد نے جو کچھ کہا ہے وہ ایک طرح سے مولانا حالیؔ اور محمد حسین آزادؔ کی نئی شاعری کے دور سے پہلے کی شاعری پر لاگو ہوتا ہے۔

کلیم الدین احمد کی اپنی نظمیں (اگرچہ یہاں کوئی تاریخیں نہیں دی گئیں) اُردو شاعری کے رومانوی دور کی پیداوار معلوم ہوتی ہیں۔ میری مراد اُس دَور سے ہے جو اخترؔ شیرانی۔ حفیظؔ جالندھری اور ساغرؔ نظامی کی شاعری سے منسوب ہے اُن کی شاعری پر اس روایت کا گہرا اثر ہے۔ اقبالؔ کا نمایاں اور گہرا اثر ہے اور کسی حد تک ترقی پسند شاعری کا بھی۔ یعنی یہ شاعری ۱۹۳۵ء–۴۵ء سے منسوب ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے یہ نظمیں یا ان میں سے بعض نظمیں بعد کی تاریخوں کی ہوں لیکن روحانی طور پر یہ شاعری انہیں برسوں سے تعلق رکھتی ہے اس شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں جذبات کی شدت کم ہے اور ایسے ہی دردانگیزی بھی۔ رومانی روائتی پیرایۂ اظہار پر سوچ و تفکر کی نقاب کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے لئے شاعری وہ شاعری بھی نہیں جہاں شاعر سوچ کی لہروں سے نغمگی تخلیق کرتا ہے اس لئے اس شاعری میں جدت یا نیا پن مفقود ہے شاعر کی ذہانت اور فکر

اپنی جگہ مسلم ہیں لیکن انہوں نے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے۔ زبان استعارے، رمز یہ تصاویر، رومانی شاعری اقبال کے رہینِ منت ہیں اور ایسے ہی خیالات و جذبات بھی ان نظموں میں کہیں کہیں حقیقت پرستی کی بھی کوشش کی گئی ہے اور فطرت نگاری کی بھی۔ ترقی پسند نظریۂ حیات بہت سی نظموں میں واضح صورت اختیار کر لیتا ہے مثلاً اُن کی نظم نمبر ۱۲ میں :

یہ جی میں آئی کہ پوچھوں خدائے دنیا سے
یہ دنیا تو نے بنائی تو کیوں بنائی ہے
رحیم تو ہے تو کیوں درد و غم کے کوہِ گراں
غریب و بے کس و مجبور کو کچلتے ہیں!
حسین تو ہے تو پھر اس عروسِ گیتی کے
حسین چاند سے چہرے میں یہ گہن کیوں ہے
یہ ظلم کیوں ہے اذیت ہے کیوں - بدی کیوں ہے

یہی نظم اقبال کی نظم پر لکھی گئی ہے اور ان دونوں کا ماخذ سان آگسٹائین کا نغمہ ہے۔ کوئی بیسویں نظم ہے اُن کی شاعری قدرے انفرادی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ وہ نہ صرف نئی دنیا کی تعمیر کی خواہش رکھتے ہیں بلکہ اس دنیا کے رموز و اسرار کو بھی پانے کی فکر کرتے ہیں مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ اُن کا محبوب عورت ہے یا مرد یا خدا مثلاً نظم نمبر ۴۲ میں۔ اور ایسے ہی بعض اور نظموں میں۔ یہاں بھی اُن کا اسلوب روایتی معلوم ہوتا ہے۔ مگر بعض نئے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں اور اُن کے بعض مصرعے مسلسل جملوں کا سا رنگ اختیار کر لیتے ہیں جہاں پہ آکر اُن کی بحر بھی کسی حد تک خود ساختگی کا رنگ لیے ہے مثلاً

دیکھو دیکھو وہ ظلمتِ شب میں
ننھے جگنو سے کچھ چمکتے ہیں
اور رستہ مجھے بتاتے ہیں
ہیں جگنو۔ یہ میرا فکرِ بلند
دو ظلموں کی کرنیں سے لے کے آیا ہے
اور کرنوں کے تیز نیزوں سے
ظلمتِ دل کو صید کرتا ہے

مگر اُن کی شاعری بیشتر روایتی بھی ہے اور باوجود اپنے تنقیدی اور شعری دعوے کے کہ یہ روایت سے دور بھاگتے ہیں۔"

(پروفیسر صدیق کلیم)

تفسیر صغیر

ہر زمانہ اور ہر قوم اور ہر ملک میں مسلمانوں نے قرآن کریم کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ خدا کی اس پاک کتاب کا عشق اُمتِ مسلمہ کے ہر صغیر و کبیر کو اس درجہ رہا ہے کہ اس کی مثال دنیا کے کسی اور مذہب کے پیروں میں قطعاً نہیں مل سکتی۔ مسلمانوں نے قرآن کریم کی ہر

کی بہت خدمت کی ہے۔ اُس کے مستند حالات بیان کر کے اُس کی آیات کی تفسیر کر کے اُس سے علوم و فنون کا استخراج کر کے اُس کے ... کر کے مختلف مواعظ کے متعلق اُس کے مضامین کی ترتیب کر کے اُس کے الفاظ کے معانی کی صرفی، نحوی اور لغاتی تفصیلات بیان کر کے اُس کو طرح طرح سے خوبصورتی، نفاست اور خوبی کے ساتھ لکھ کر اور شائع کر کے مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کر کے اُس کی آیات اور ... کی بے شمار تفسیریں لکھ کر اُس پر اعتراضات کے تحقیقی جوابات دے کر اُس کی ایک ایک آیت پر تفصیلی تبصرہ کر کے اُس کی طرح طرح کی ڈکشنریاں اور قسم قسم کی لغات لکھ کر اس کی ہر آیت ہر سورت کا تاریخی تجزیہ کر کے غرض کہاں تک بیان کیا جائے کہ خود مسلمانوں نے اور مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں کے فضلاء نے کس کس رنگ میں قرآن کریم کی خدمت کی ہے۔ مسلمانوں میں سے بہت سے ایسے بزرگ گذرے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں قرآن پاک کی خدمت اور اشاعت میں وقف کر دیں آج بھی دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں اور قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے جن کا اوڑھنا بچھونا قرآن اور صرف قرآن ہے۔ انہوں نے قرآن کو ہاتھ میں لے کر ہر مخالف کو مقابلہ پر بلایا لیکن کوئی بھی زمانہ کے لئے مقابلہ پر نہ آیا۔ قرآنی خزائن، قرآنی معارف اور قرآنی نکات خدا کے برگزیدہ بندوں نے ہر زمانہ میں اتنے کثرت کے ساتھ تقسیم کیے ہیں جن کی انتہا نہیں۔

ہمارے اس زمانے میں قرآن کریم کی جو خدمت ہو رہی ہے اُس کا تازہ ترین نمونہ زیر تبصرہ قرآن مجید ہے جو انتہائی خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور اس قدر حسین دلکش اور دیدہ زیب ہے کہ دیکھتے ہی دل خوش اور آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ تمام قرآن مجید بلاکوں سے چھاپا گیا ہے۔ طباعت نہایت روشن، خوبصورت اور دل فریب ہے۔ کاغذ اعلیٰ درجہ کا آرٹ پیپر لگایا گیا ہے۔ سرورق بھی خوشنما کئی رنگوں میں طبع ہوا ہے۔ جلد پائیدار اور مضبوط ہے۔ غرض ظاہری لحاظ سے جو آرائش و زیبائش ممکن تھی اس کا پورا مظاہرہ اس قرآن مجید کی کتابت و طباعت میں کیا گیا ہے۔ اور اسے خوبصورتی و خوشنمائی کے ساتھ پیش کرنے میں کوئی دقیقہ سعی اور کوشش کا باقی نہیں چھوڑا گیا۔ لیکن ظاہری نفاست کے ساتھ اس مقدس صحیفہ میں باطنی حسن کا بھی پورا پورا التزام رکھا گیا ہے شروع میں کئی مفید فہرستیں لگائی گئی ہیں، پورے قرآن مجید کے مضامین کا ایک انڈکس ایک سو صفحات پر محیط ابتدا میں بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ اصل متن میں آیات کا ترجمہ بالمقابل ہے اور نہایت صاف، واضح اور بامحاورہ ہے کہ موجودہ تمام متراجم میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ علاوہ اس کے جو آیات تشریح طلب تھیں، یا جن پر مخالفین کی طرف سے کوئی اعتراض پڑتا تھا، یا جو بظاہر مشکل سمجھی جاتی تھیں، اُن کی تشریح اور وضاحت حاشیہ میں بڑی عمدگی اور خوبی کے ساتھ کر دی گئی ہے اس قرآن مجید کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ترجمہ اور تفسیر دونوں کی عبارت اتنی آسان اور سہل ہے کہ عورتیں اور بچے بھی بخوبی اسے سمجھ لیتے ہیں۔ تفسیر کے بعض بیانات سے شاید بعض لوگوں کو اختلاف ہو۔ لیکن ایسا اختلاف ہر تفسیر میں پایا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی کوئی بھی تفسیر آج تک ایسی نہیں لکھی گئی جس کے ہر لفظ سے ہر عقیدہ کے اصحاب کو کامل اتفاق ہو۔ اس قرآن مجید کی تفسیر حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب مرحوم امام جماعت احمدیہ کی لکھی ہوئی ہے اور ترجمہ بھی اُن ہی کا ہے۔ ادارۃ المصنفین ربوہ نے شائع کیا ہے۔ تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ صفحات مع انڈکس ۹۵۸، ہدیہ مبلغ پچیس روپے علاوہ محصول ڈاک۔

حیاتِ فخر

نواب فخر یار جنگ ریاست حیدرآباد کے وزیر مالیات تھے۔ حیاتِ فخر اُن کی سوانح عمری ہے جو مرحوم کے فرزند نواب مشتاق احمد نے لکھی ہے۔ بظاہر یہ ریاست کے ایک اعلیٰ عہدیدار کے حالاتِ زندگی ہیں۔ مگر در حقیقت بڑی ہی عجیب اور نہایت ہی دلچسپ اور بجد سبق آموز کتاب ہے۔ کتاب کے ہیرو نواب فخر یار جنگ عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے اور اُن کے جو عجیب واقعات و حالات کتاب میں لکھے ہوئے ہیں وہ ایسے ڈرامائی انداز کے ہیں کہ اُن کو پڑھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور تعجب بھی! بلاشبہ کتاب اتنی پُر لطف اور مزیدار ہے کہ شروع کر کے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ یوں سمجھیے کہ ساری کتاب نہایت ہی دلچسپ اور سبق آموز، سچے فسانوں کا ایک دلکش مرقع ہے۔ نواب فخر یار جنگ مرحوم عام ریاستی عہدہ داروں کے برخلاف نہایت با اخلاق، با مروت، با اصول، ہمدرد بنی نوع، متواضع، منکسر المزاج اور شفیق و مہربان بزرگ تھے۔ ان اوصاف حمیدہ کے علاوہ انتہائی طور پر مذہب کے شیدائی اور انتہائی پابند صوم و صلوٰۃ شخص تھے جب تک جیے مخلوق کی ہمدردی اور خالق کی اطاعت کو انہوں نے اپنا سب سے ضروری فرض سمجھا۔ بڑے بڑے سخت ابتلاؤں اور امتحانوں سے انہیں گزرنا پڑا لیکن وہ نہایت ثابت قدمی کے ساتھ اپنے اصول پر قائم رہے اور امانت، دیانت، سچائی، فرض شناسی، عدل و انصاف کے برخلاف کبھی کوئی کام نہ کیا۔ اور حق و صداقت کے مقابلہ میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی مرعوب نہیں ہوئے۔ کیرکٹر کی مضبوطی، کردار کی خوبی، دلیری و بے خوفی اور اظہارِ حق و صداقت میں نواب صاحب مرحوم ساری ریاست میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ اُن کی روزمرہ کی پاکیزہ زندگی کے بیسیوں واقعات کتاب میں ایسے لکھے ہیں جن پر حقیقت یہ ہے کہ مشکل ہی سے یقین آتا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اُن کے فرزند نے واقعات و حالات کو بہت ہی مختصر کر کے اور بلا رنگ آمیزی اور مبالغہ کے بیان کیا ہے۔ غرض یہ کتاب نہایت سبق آموز واقعات کا ایسا حسین مجموعہ ہے کہ انسان پڑھ کر حیران ہو جاتا ہے اور بے اختیار سوچنے لگتا ہے کہ کیا دنیا میں ایسے بھی انسان ہوتے ہیں؟ نواب صاحب مرحوم کے بے نظیر واقعات و حالات اور شمائل و خصائل کے علاوہ یہ کتاب سقوط سے قبل ریاست کی سیاست پر بھی بہت کافی روشنی ڈالتی ہے۔ جن سے عجیب و غریب واقعات کا انکشاف ہوتا ہے۔ کتاب کی کتابت اور طباعت میں نفاست اور خوشنمائی کا بے انتہا خیال رکھا گیا ہے۔ کاغذ بہت اعلیٰ اور نفیس لگایا گیا ہے۔ جلد مضبوط اور خوشنما ہے۔ ستائیس اٹھائیس کے قریب فوٹو کتاب کی زینت ہیں۔ غرض کتاب اعلیٰ ترین، لکھائی چھپائی کا بہترین مجموعہ ہے۔ بلحاظ مضمون کے لحاظ سے بھی کتاب یقیناً اس قابل ہے کہ ہر پڑھا لکھا شخص اس کا مطالعہ کر کے اپنی زندگی میں اُس سے سبق حاصل کرے۔ قیمت پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک پتہ: نواب مشتاق احمد، فخر منزل، کوٹھی ۱۰۸ بلاک ڈی، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

(شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)


عالمی اعتماد
ہر جگہ موٹروں میں استعمال کے لئے
ایسو ایکسٹرا موٹر آئل
پر مکمل بھروسہ کیا جاتا ہے
ایسو ایکسٹرا موٹر آئل اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے ہر جگہ ممتاز ہے۔ بلاشبہ آپ اس ہیوی ڈیوٹی آئل پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ چاہے آپ کشادہ سڑکوں پر گذر رہے ہوں یا شہر کی اونچی نیچی مصروف ترین راہوں پر۔ آپ کے انجن کو ہر جگہ درست اور تسلی بخش حالت میں رکھنے کے لئے ایسو کا یہ تیل بہترین ہے۔ دنیا بھر میں ایسو ایکسٹرا موٹر آئل پر اعتماد کی وجوہ ہماری تحقیقاتی جدوجہد اور کوالٹی کنٹرول ہیں۔
ESSO
EXTRA
MOTOR OIL
Happy Motoring
"ہیپی موٹرنگ" کے نشان پر دستیاب ہے!
ایسو اسٹینڈرڈ ایسٹرن انکارپوریٹڈ
(محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ایس۔اے میں تشکیل شدہ)
ESSO
پاکستان

بارود اور پھول

محترمہ اختر جمال

کا

بے مثال ناول

جس کا

ایک باب بارود کے نام سے نقوش ہی میں
چھپ کر خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔ اب
یہ مکمل ناول کتابی صورت میں چھپ چکا ہے

قیمت: تین روپے

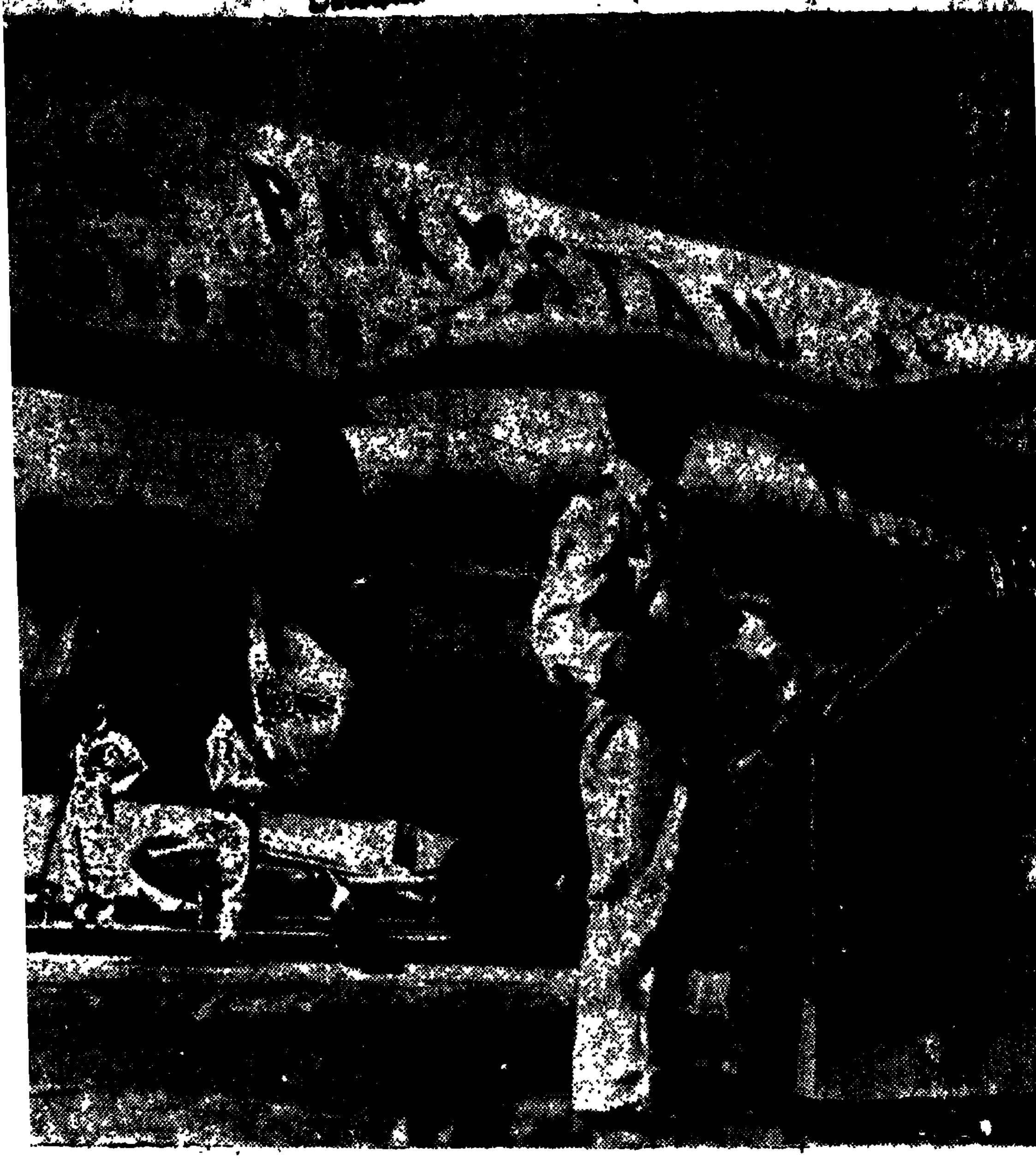
جاڑے کی آخری رات

ترجمہ احمد سعید

یہ اتنا بے مثال ناولٹ ہے کہ
ہی اُس سے پہلے اُردو میں کوئی مثا
نفسیاتی باریکیوں کا جس فنکارانہ تجسّ
کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے۔ وہ اپنی
آپ ہے۔

قیمت: تین روپے


RCA
THE Democrat
پاکستان
کی
فخریہ
پیشکش
دی ڈیموکریٹ
۳ بینڈ پورٹیبل ٹرانسسٹر ریڈیو
قیمت -/۲۳۵ روپے
(مقامی ٹیکس و سیلوں کے علاوہ)



پی آئی اے کی انجینئرنگ کا اعلیٰ معیار

دنیا کی ہر ایئرلائن اپنے ہوائی جہازوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں ہوائی سفر اس قدر بے خطر ہے۔ پی آئی اے کے ورکشاپوں میں سائنسدانوں اور انجینئروں کو ہوائی ساز و سامان جانچنے پرکھنے کی بہترین مشق دی جاتی ہے۔ اس کی بدولت پی آئی اے نے پچھلے پانچ سال میں اپنی پروازوں کی تاخیر کی شرح کو ۳۰۱ فیصد سے مزید گھٹا کر ۲۰۱ فیصد تک پہنچا دیا ہے۔ غرضیکہ نہ صرف پی آئی اے نے دیکھ بھال اور پابندی اوقات کے بلند معیار قائم کئے ہیں بلکہ دنیا بھر کے مسافر بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں کہ پی آئی اے باکمال لوگ ہیں اور ان کی پرواز لاجواب ہے۔

چین۔ پاکستان۔ افغانستان۔ مشرق وسطیٰ۔ روس۔ یورپ۔ برطانیہ



پاکستان
انٹرنیشنل
ایرلائنز


خوش نظر و باوقار
لٹھا ۹۵۰۰۰
رنگدار مرسرائزڈ پاپلین ۱۹۷۱
رنگدار مرسرائزڈ پاپلین نرگسی آنکھ
رنگدار مرسرائزڈ ڈریس نیلم
کالونی تھل ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
اسماعیل پور • جھنگ
کالونی تھل کے پارچات • خوش نظر و باوقار

اہم مطبوعات (انگریزی)

	قیمت فی جلد
	روپے
۱ ۔ دی پاکستان کوڈ ۔ حصے نمبر ۳ ، ۴ ۱۹۶۶ ایڈیشن	
کپڑے کی جلد	۹—۰۰
معمولی جلد	۷—۰۰
۲ ۔ کراچی اور سندھ اور مکران کے ساحلوں کی سمندری مچھلیاں	۵—۵۰
۳ ۔ بنجر یا نیم بنجر علاقوں میں زمینوں کا کٹاؤ اور اسکا تدارک	۱۳—۰۰
۴ ۔ پیشہ ورانہ عنوانات کی درجہ بندی	۶—۰۰

ملنے کا پتہ :—

۱ ۔ منیجر مطبوعات، حکومت پاکستان، بلاک نمبر ۴۴ ۔ شاہراہ عراق ۔ کراچی

۲ ۔ مغربی پاکستان میں تمام مجاز ایجنٹس ۔ (R.I.O. (K) 518)


میرا بینک
میرا
بھی تو ہے